



جناب محمد شاہد صدیقی اور جناب حسن چشتی کا ادارہ ادبیاتِ اردو میں خیر مقدم (۲ / جنوری ۱۹۹۰ء)

دائیں سے بائیں: ایک ریسرچ اسکالر، محترمہ ثریا مہر، محترمہ سلطانہ شرف الدین، محترمہ شفیعہ قادری، محترمہ فاطمہ عالم علی خاں، محترمہ دیبا الیاس قصور۔
پروفیسر مغنی تبسم، جناب حسن چشتی، پروفیسر جعفر نظام، جناب ذکی شاداب، جناب شاہد صدیقی، جناب قاضی معین الدین صدیقی، جناب مجتبیٰ صدیقی۔
پیچھے کی صف میں: جناب قدیر زماں، جناب غلام جیلانی، جناب سید صفی الدین قادری، جناب خان عمر خاں، اور جناب الیاس قصور۔

بیادگار سید محی الدین قادری زورؔ

سنِ اجراء : ۱۹۳۸ء
فون : 320469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۵۹ | جنوری، فروری، مارچ ۹۷ء | شمارہ : ۱-۲-۳

مدیر

مغنی تبسم

معاونین

غلام جیلانی — بیگ احساس

نمائندہ برائے سعودی عرب : غوث ارسلان
P.O.Box. No. 71 Riyadh 11411

اس شمارے کی قیمت ۳۰ روپے

فی پرچہ : ۱۰ روپے
زرِ سالانہ : ۱۰۰ روپے
کتب خانوں سے : ۱۲۵ روپے

مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ : ۲۵ ڈالر
پاکستان، سری لنکا، بنگلہ دیش : ۱۰ ڈالر
انگلستان : ۱۰ پونڈ

ناشر : ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۸۲ (اے۔ پی) انڈیا۔

کمپیوٹر کتابت : ... کمپیوٹرس ... حیدرآباد۔

رمن راج سکسینہ اعزازی پرنٹر و پبلشر نے ... سب رس کے لیے ... پریس ... میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیاتِ اردو ... سے شائع کیا۔

مضامین

نظمیں

غزلیں

افسانے

پہلی بات

ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں کہ بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے سب رس کی اشاعت میں تاخیر ہورہی ہے اور مشترکہ شمارے شائع کرنے پر مجبور ہوئے ہیں ۔ اس کے تلافی کے لیے رسالے کی ضخامت بڑھادی گئی ہے ۔ ہم کوشش کریں گے کہ آئندہ ماہ بہ ماہ سب رس شائع ہوا کرے ۔

روسی مصنفہ ڈاکٹر پری گلرینا کی کتاب مرزا غالب کا ترجمہ بالاقساط سب رس میں اشاعت پذیر ہوا ۔ اب یہ ترجمہ کتاب کی صورت میں بہت جلد ادارہ ، ادبیاتِ اردو کی جانب سے شائع ہو گا ۔

اس شمارے سے ایک نیا سلسلہ " یادوں کی سیرگاہ " شروع کیا جارہا ہے جو جناب اختر حسن مرحوم کی یادداشتوں پر مشتمل ہے امید ہے کہ اسے پسند کیا جائے گا ۔

(ادارہ)

سید خالد قادری

نئی تاریخیت

۱۹۸۲ء میں نشاۃ ثانیہ سے متعلق انگریزی ادب پر ایک معروف جریدے "Genre" کا خاص نمبر ترتیب دیتے ہوئے اپنے مقدمہ میں نئی تاریخیت (New Historicism) کی اصطلاح کے موجد اسٹیفن گرین بلاٹ (Stephen Greenblatt) نے ایک اہم اعلان کیا تھا کہ یہاں پیش کیے گئے مضامین میں نشاۃ ثانیہ کی تحریروں کا مطالعہ ایک نئے اور بہتر انداز سے کیا گیا ہے۔ ان میں سے بیشتر مضامین کی بنیاد اس نئی سوچ پر تھی کہ اس دور یا پھر کسی بھی دور کے آرٹ اور ادب کا بھرپور جائزہ لینے کے لیے یہ لازمی قرار پاتا ہے کہ اسے ان سماجی اقدار، عقائد و اوہام اور رسوم و قواعد وغیرہ سے مربوط کرکے دیکھا جائے جن سے اس دور کی معاشرتی زندگی عبارت تھی۔ مختصراً یہ کہ کسی بھی متن کو ایک الگ منفرد جز کے طور پر نہیں بلکہ کسی دور میں پائے جانے والے ہر قسم کے متون کے کل سے مربوط کرکے ہی دیکھا، سمجھا یا پرکھا جا سکتا ہے۔

یہ نیا زاویۂ نگاہ گرین بلاٹ اور اس کے حامیوں کے لیے پیش کرنا اس لیے بھی ناگزیر ہوگیا تھا کہ وہ آرٹ یا ادب کے تعلق سے New Critics کے اس تصور سے متفق نہیں تھے کہ وہ دوسرے اقسام کے متون سے جدا رہ کر خود مکمل ہوتا ہے اور اپنا ایک الگ علاحدہ دائرۂ عمل رکھتا ہے اس طرح وہ نشاۃ ثانیہ کے آرٹ اور ادب کو بھی اس دور کی دوسری کلچرل تخلیقات، روایات یا مظاہر سے جدا کرکے دیکھنے اور سمجھنے کے تنقیدی عمل کے مخالف تھے۔ ساتھ ہی وہ قبل از جنگ کے "Historicists" کے اس خیال سے بھی متفق نہ تھے کہ نشاۃ ثانیہ کا ادب ایک محفوظ فاصلے سے کائنات کا ایسا مربوط اور یک رنگ تصور پیش کرتا ہے جو اس زمانے کے عوام کی ایک بڑی تعداد کے ذہنوں میں موجود رہا ہوگا۔

ان دونوں ہی باتوں کو رد کرتے ہوئے گرین بلاٹ اور اس کے حامیوں نے یہ اعلان کیا کہ اب ادبی تنقید کے "مکتب" میں ایک "نئی تاریخیت" (A New Historicism) کا پیرایہ ڈھونڈ نکالا گیا ہے جو کسی دور کے ادب کی تفہیم خود اس میں موجود اس کے اپنے مفروضوں کی مدد سے سرانجام دے گا۔ جہاں ان نقادوں کے لیے جو سولہویں اور سترہویں صدی کے ادب کی بہترین تشریح و تفہیم سے دلچسپی رکھتے تھے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ان کا، ان تحریروں کا مطالعہ نشاۃ ثانیہ کی معاشرتی زندگی کی مجموعی صورت حال سے پوری طرح مربوط ہو۔

ویسے گرین بلاٹ کا یہ اعلان بھی ماضی میں کیے گئے ایسے دوسرے اعلانات کی طرح اپنے ساتھ کئی نئے مسائل، الجھنیں اور بے چینیاں لے آیا۔ ایک طرف جہاں تنقید میں استعمال کی جانے والی یہ یکسر نئی اصطلاح اس میدان میں مشق آزمائی کرنے والے نقادوں کے لیے غیر معمولی توجہ کے حصول کا ذریعہ بنی وہیں دوسری طرف جب نئی تاریخیت کے حامی (New Historicist) ان سے وابستہ توقعات کو پورا نہ کرسکے تو انھیں ہدف تنقید بنایا جانے لگا۔ اس کا شکار زیادہ تر وہ لوگ ہوئے جنھوں نے گرین بلاٹ کی نئی

تاریخیت کو ایک باقاعدہ نظریہ یا تحریک سمجھ لینے کی غلطی کی تھی۔ ان لوگوں کو اس بات کی قوی توقع تھی کہ بہت جلد اس سلسلے میں کوئی جامع تھیوری یا تنقیدی لائحہ عمل تیار کیا جائے گا۔ ایسا کچھ بھی سامنے نہ آنے پر اس قبیل کے نقادوں کا مختلف قسم کی غلط فہمیوں کا شکار ہونا ناگزیر تھا۔

اس صورتِ حال کے ازالے کے مقصد سے ۱۹۸۷ء میں گرین بلاٹ نے "Towards a Poetics of Culture" کے عنوان سے اپنا ایک اہم وضاحتی مضمون شائع کیا جو آنے والے دنوں میں نئی تاریخیت کے مفہوم کی بہتر ترسیل میں معاون ثابت ہوا۔ جہاں لیوٹارڈ (Leotard) اور فریڈرک جیمسن (Fedrecic Jameson) کے نظریات سے بحث کرتے ہوئے۔ اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان دونوں کا معرضِ بحث بنیادی طور سے ایک ہی ہے کہ کس طرح آرٹ یا ادب اور سماج باہم مربوط ہیں۔ یہ دونوں اس امر پر بھی متفق ہیں کہ مندرجہ بالا سوال کے تشفی بخش جواب کے حصول میں کسی ایک مخصوص تھیوری کا سہارا قطعی طور پر ناکافی ہوگا۔ اس طرح چوں کہ لیوٹارڈ اور جیمسن کم و بیش اسی سوال سے بحث کرتے ہیں جس سے کہ نئی تاریخیت کے تصور سے مطابقت رکھنے والے اس لیے آخر الذکر کے لیے یہ دانش مندی سمجھی گئی کہ وہ سرمایہ دارانہ جمالیات کے متضاد کردار کے ادراک میں مارکسی یا مابعد ساختیاتی (Post Structurist) مفکروں کی ناکامی کو اپنے لیے ایک طرح کی وارننگ تصور کریں اور نئی تاریخیت کو ایک باقاعدہ تنقیدی طریقۂ کار یا نظریے میں تبدیل نہ ہونے دیں۔

گرین بلاٹ کے مطابق نئی تاریخیت کوئی باقاعدہ ادبی یا تنقیدی تھیوری نہیں اور نہ کبھی ہوگی۔ اسے زیادہ سے زیادہ ادب کے تجزیاتی مطالعے کے چند ایک طریقوں کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ جو ادب کے ایسے قاری اختیار کرتے ہوں جنھیں اس کی بھرپور اور حقیقی تفہیم کی جستجو ہو۔

گرین بلاٹ کے پرزور دلائل کا اثر صرف ان کے رفقا پر ہی نہیں بلکہ ایسے تمام نقادوں پر پڑا جو (Cultural Poetics) کے میدان میں سرگرم عمل تھے۔ مثال کے طور پر Lonis Montrose لوئی مانٹروز جنھوں نے "The Poetics and Politics of Culture 1986" نامی اپنے مضمون میں ان مسائل کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ جہاں انھوں نے نہ صرف یہ کہ زیادہ تر ان ہی مسائل سے بحث کی ہے جو گرین بلاٹ اور اس کے حلیفوں نے اٹھائے تھے۔ بلکہ نئی تاریخیت کے سلسلے میں گرین بلاٹ کے خیالات میں کسی حد تک توسیع بھی کی ہے۔

وہ گرین بلاٹ سے اس امر پر متفق ہیں کہ نئی تاریخیت کا ایک اہم مقصد متن اور اس معاشرتی نظام جس کی وہ پیداوار ہے کے درمیان پائے جانے والے رشتے کی از سرِنو دریافت ہے۔ اس کے خیال میں اس کاوش کا ابتدائی مرحلہ یہ ہوگا کہ ادب کے ایسے رسمی اور مثالی تصور سے انحراف کیا جائے جس کے تحت اسے کسی ایسے الگ تھلگ خود کفیل جمالیاتی نظام کی تخلیق سمجھا جاتا ہے۔ جو انسانی معاشرے کی ضروریات اور تقاضوں سے ماورا ہو۔ اسی کے ساتھ ادب کے اس (Reflect ionist) تصور کو بھی رد کرنا ہوگا۔ جس کے مطابق ہر دور کا ادب ایک ایسے مستحکم اور مربوط نظامِ فکر (Ideology) کا عکاس ہے جو اس دور میں پائے جانے والے معاشرے کے بیش تر افراد کے لیے قابلِ قبول رہی ہوگی۔ آرٹ اور ادب کے تعلق سے ان پر فریب تصورات کی گرفت سے آزاد ہونے کے بعد ہی نقاد کے لیے مطالعے کا یہ نیا طریقۂ کار اس سچائی کو سامنے لائے گا کہ کس طرح کوئی بھی متن نہ صرف یہ کہ مختلف النوع سماجی علوم یا اقتدار کے مراکز کے معاشرتی مخزن ہونے کی بشارت دیتا ہے بلکہ اپنے قارئین کے ذہنوں کو بھی بڑی حد تک ان تمام اقدار اور رسوم و قواعد کا ہم نوا بنا لیتا

ہے جو اس متن میں مضمر ہوتے ہیں۔ شاید ان ہی وجوہات کی بنا پر نئی تاریخیت کا تصور اس بات کو ناگزیر بنا دیتا ہے کہ آرٹ اور کلچر کے باہم رشتے پر از سرِ نو غور کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ سماج کے دوسرے شعبوں میں سرگرمِ عمل لوگوں کے لیے بھی یہ ضروری قرار پاتا ہے کہ وہ بھی نہ صرف معاشرتی نظام بلکہ اس کے ساتھ ساتھ لسانی نظام اور اس سے اپنے اختلاط کے طریقوں کا دوبارہ جائزہ لیں۔

نئی تاریخیت آگے چل کر اس مسئلے کو بھی دائرہ بحث میں لاتی ہے کہ متن کے سیاسی اقتدار پر تنقید یا رجعت پسند قوانین کے خلاف آواز بلند کرنے کی کیا حد ہو سکتی ہے۔ نئی تاریخیت ان مسائل کو اپنے دائرہ عمل میں اس لیے لاتی ہے کہ وہ آرٹ اور ادب کے انسانی سماج پر مرتب ہونے والے اثرات کی حدوں کے تعین کی جستجو کرتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سلسلے میں ابھی تک کچھ قطعی طور پر نہیں کہا جاسکا۔

ایک طرف جہاں جوناتھن ڈالی مور (Jonathan Dollimore) اور ایلن سن فیلڈ (Alan Sinfield) جیسے نقادوں نے نشاۃ ثانیہ کے بیشتر ادب کو اس دور کی مذہبی اور سیاسی آئیڈیالوجی کا حریف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہیں چند دوسرے نقاد بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ اس دور کی ٹیوڈر (Tudor) اور اسٹوارٹ (Staurt) حکومتیں ہر قسم کے نظریاتی اختلاف سے نپٹنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ مانٹر (Montrose) نے ادب اور معاشرے کے درمیان جاری رہنے والے اس عمل کو (Containment Subversion Problem) کا نام دیا ہے۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نئی تاریخیت ادب میں پنہاں سیاسی قوت کے امکانات کا پتہ لگانے کی بھی سعی کرتی ہے۔

نئی تاریخیت کے سلسلے میں جہاں تک تھیوری کا سوال ہے۔ اس وضاحت کے بعد کہ یہ خود اپنے آپ میں کوئی باقاعدہ نظریہ نہیں گرین بلاٹ اور مانترو دونوں اپنے رفقا کو ادبی اور سماجی تھیوری سے پوری طرح واقفیت کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ وہ ادب اور کلچر کے اپنے مطالعے میں ان سے استفادہ کر سکیں۔ مابعد ساختیات اور ردِ تشکیل کا متنیت (Texuality) یا پھر متن کی تاریخیت اور تاریخ کی متنیت (The Historicity of Texts and the Textuality of History) کا تصور بھی تاریخی تنقید کے عمل میں انتہائی کار آمد خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اپنے تجزیات میں فوکو (Focanlt) اور کلفرڈ گوئیرٹز (Clifford Goertz) وغیرہ کی ذہنی بصیرت سے بھی اکثر مدد لیتے ہیں۔

نئی تاریخیت کے تین ممتاز علم برداروں میں جوناتھن گولڈ برگ (Jonathan Stephen Goldberg)، اسٹیفن گرین بلاٹ (Stephen Greenblatt) اور والٹر بینو مائیکلس (Walter Benn Michacls) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان تینوں نے ہی اس میدان میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی یورپ اور امریکہ میں ایسے نقادوں کی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ جو نئی تاریخیت کے تجزیاتی طریقہ کار سے ذہنی یگانگت رکھتے ہیں۔ جہاں ایک طرف شاید کم لوگوں کو اس بات سے اختلاف ہوگا کہ یہ ادبی تجزیے انتہائی پر مغز ہیں وہیں ایسے نقاد بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ نئی تاریخیت کے ہم نوا ادب اور معاشرے کے باہمی رشتے سے اپنی تمام دل چسپی کے باوجود کسی ایک دور کی سیاسی یا معاشرتی زندگی کے جس تصور کو اپنے مطالعے کی بنیاد بناتے ہیں وہ خود اپنے آپ میں بے حد سادہ اور مجہول ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ ماضی میں پائے جانے والے انسانی سماج اکہری مذہبی یا معاشرتی اکائیاں نہ تھے جیسا کہ بیشتر ایسے مطالعوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی دور کی معاشرتی زندگی میں ہمہ اقسام کی نہ صرف مذہبی اور سیاسی بلکہ معاشی اور جمالیاتی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں جن کا ادراک اسی قدر دشوار ہے، جس قدر انھیں

اختر حسن



جناب اختر حسن ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ حیدرآباد کی صحافت، سیاست اور علمی ادبی زندگی پر انھوں نے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

صحافت کو انھوں نے عوامی شعور کو بیدار کرنے اور سیاسی جدوجہد کو آگے بڑھانے کا موثر حربہ بنایا۔ وہ روزنامہ پیام، روزنامہ عوام، ماہ نامہ "آندھرا پردیش" اور ہفتہ وار بلٹز کے ایڈیٹر رہے۔

کچھ عرصہ پیشہ، تدریس سے بھی وابستہ رہے۔ ورنگل کالج، ویویکا نندا ودیالیہ اور انوار العلوم کالج میں بہ حیثیت لکچرار خدمات انجام دیں۔

محکمہ، تعلیمات عامہ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی خدمت پر فائز رہے۔ سالار جنگ میوزیم میں اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ انھوں نے وجہی کے فارسی دیوان کو روشناس کرایا اور وجہی کے بارے میں نئی معلومات بہم پہنچائیں۔ آخری زمانے میں آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر رہے۔

حیدرآباد کی ادبی اور تہذیبی زندگی میں ان کا سرگرم حصہ رہا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری رہے۔ شاعری کی، تنقید لکھی، تحقیقی کام انجام دیا اور ترجمے کیے۔ حرف ناتمام ان کا مجموعہ، کلام ہے۔ تنقیدی مضامین کا مجموعہ نقد ونظر کے نام سے شائع ہوا۔ "قطب شاہی دور کا فارسی ادب" ان کا تحقیقی کارنامہ ہے غالب کی فارسی مثنوی چراغ دیر کا منظوم ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ کئی کتابوں کے انھوں نے ترجمے کیے جن میں بنیادی تصورات قرآن (ڈاکٹر سید عبد اللطیف) میری دھرتی میرے لوگ (شیشندر شرما) راہل سانکر تیائن (پربھاکر ماچوے) جواہر لال نہرو (سروے پلی گوپال) اور بھول بھلیاں شامل ہیں۔ جواہر لال نہرو کے ترجمے پر انھیں ساہتیہ اکیڈمی اوارڈ دیا گیا۔

عملی سیاست میں بھی اختر حسن صاحب کی نمایاں خدمات رہی ہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۹ء میں چند ساتھیوں کے ساتھ ڈیموکریٹک پیپلز پارٹی قائم کی اور اس کے نائب صدر رہے۔ ۱۹۵۲ء میں اسی پارٹی کے ٹکٹ پر الکشن لڑکے اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اسمبلی کے اندر رہ کر اور اسمبلی سے باہر بھی عوامی مسائل کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ گوا لبریشن کمیٹی کے قیام اور گوا کی آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ انجمن طیلسانین کی جانب سے اختر حسن صاحب کو عثمانیہ یونیورسٹی کی سینیٹ کا رکن منتخب کیا گیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی ایگزکٹو کمیٹی

اور بورڈ آف جرنلزم کے رکن بھی رہے۔

اختر حسن صاحب کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ اردو اور فارسی کے ہزاروں شعر انھیں یاد تھے۔ ماضی کے بے شمار واقعات ان کی یادوں کے نہاں خانے میں محفوظ تھے۔

آٹھ برس کی بات ہے پروفیسر سید سراج الدین، قدیر زماں اور میں، اختر حسن صاحب سے ملاقات کے لیے ان کے گھر جاتے یا میرے گھر آتے۔ جب کبھی محفل جمتی ان کی یادوں کا دفتر کھل جاتا۔ ہم نے ان سے خواہش کی کہ وہ اپنی یادداشتوں کو ضبطِ تحریر میں لائیں لیکن وہ ٹالتے رہے۔ تب ہم نے طے کیا کہ مہینے میں دو ایک بار ان کے ساتھ مل بیٹھیں، کوئی تذکرہ چھیڑیں اور ان کی باتوں کو ٹیپ پر محفوظ کرلیں۔ چناں چہ کئی نشستوں میں تقریباً گیارہ کیسٹوں میں ان کی گفتگو ٹیپ کرلی گئی۔ پھر وہ علیل ہوگئے۔ علالت نے طول کھینچا جس کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ جو کچھ ریکارڈ کرلیا گیا تھا۔ اسے تحریری شکل دے کر اختر حسن صاحب کے حوالے کیا کہ وہ ایک نظر دیکھ لیں، جہاں جہاں مناسب سمجھیں ترمیم و اضافہ کریں۔ لیکن علالت کی وجہ سے وہ زیادہ توجہ نہ دے پائے، کہیں کہیں ردوبدل کیا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ صحت یاب ہوجانے کے بعد اس کام کو آگے بڑھائیں لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا، ۱۱/ستمبر ۹۵ء کو وہ انتقال کرگئے۔ یہ کام ادھورا ہی رہ گیا۔ اختر حسن صاحب نے کچھ نوٹس علاحدہ بھی لکھ رکھے تھے۔ اختر حسن صاحب کی بہن محترمہ ڈاکٹر رضیہ بیگم نے ہماری درخواست پر ان تحریروں اور نوٹس کی مدد سے یہ ادھوری خودنوشت مرتب کی جسے ہم بالاقساط سب رس میں شائع کر رہے ہیں۔ خودنوشت نامکمل ہے لیکن جتنا کچھ لکھا گیا ہے اس سے حیدرآباد کی سیاسی اور تہذیبی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور کئی ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جن سے آج بہت کم لوگ واقف ہیں۔

(مغنی تبسم)

اعلان محکمہ پریس رجسٹرار حکومت ہند

(فارم : ۴ رول نمبر : ۸)

ایڈیٹر پرنٹر، پبلشر کا نام	:	رمن راج سکسینہ
قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	ادارہ ادبیاتِ اردو "ایوانِ اردو"
نام و پتہ مالک	:	ادارہ ادبیاتِ اردو "ایوانِ اردو" پنجہ گٹہ حیدرآباد ۵۰۰۰۸۲

میں رمن راج سکسینہ تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

دستخط

بتاریخ ۳۱ / مارچ ۱۹۹۷ء

رمن راج سکسینہ

سید اختر حسن

یادوں کی سیر گاہ

(پہلی قسط)

موہان:

میرا آبائی وطن موہان ہے، اتر پردیش میں کان پور اور لکھنؤ کے درمیان یہ قدیم بستی سون ندی کے کنارے آباد ہے۔ کہتے ہیں بادشاہانِ اودھ کے زمانے میں اس کی آبادی ۲۴ ہزار تھی اور اس میں ۵۲ محلے اور ۷ اگوھیان تھیں اور گرد و نواح میں کثرت سے آموں کے باغ جن کی بدولت موہان ایک سرسبز و شاداب اور پر فضا قصبہ بن گیا تھا۔

بزرگوں سے سینہ بہ سینہ روایت چلی آرہی ہے کہ اکبر بادشاہ کے عہد میں ایک متبحر عالمِ دین جن کا نام محمود تھا، نیشاپور سے ہندوستان آئے تھے۔ کچھ دنوں گجرات اور پنجاب میں سیر و گشت کرتے رہے پھر دوآبہ، گنگ و جمن میں آئے اور یہ علاقہ ان کو اتنا بھایا کہ اس کو اپنی مستقل سکونت گاہ بنانے کا تہیہ کر لیا۔ گھومتے پھرتے جب موہان پہنچے تو وہاں ڈیرے ڈال دیے اور درس و تدریس کا مشغلہ شروع کیا۔ دھیرے دھیرے ان کے طریقِ تعلیم کا شہرہ سن کر اطراف و اکناف سے سینکڑوں خورد و کلاں ان سے فیض حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں پہنچنے لگے۔ کچھ ہی دنوں میں موہان علم و حکومت کا ایک بڑا گہوارہ بن گیا اور "موہان خطہ، یونان" کے نام سے مشہور ہوا۔

حسرت موہانی نے اپنے صرف ایک شعر میں محمود نیشاپوری کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کیوں نہ حسرت شعر ہوں تیرے نظیری کے نظیر
ہے تعلق ہم کو آخر خاکِ نیشاپور سے

محمود نیشاپوری کے سوانحی حالات و واقعات اب تک پردہ، خفا میں ہیں یہاں تک کہ حسرت موہانی کے سوانح نگاروں نے بھی ان کی چھان بین کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ یہ چند باتیں جو ہمارے چھوٹے چچا سید اکرم الحسن نے بتائی تھیں ان کا یہاں مختصر ذکر بے محل نہ ہوگا۔

"کہتے ہیں ایران میں مغلوں کی دوادوش کے زمانے میں جب نیشاپور بھی جو اس وقت علم و فن کا مرکز تھا زد میں آیا، اہلِ علم و فن کی محفلیں منتشر ہونے لگیں، لوگ جان بچا کر بھاگنے لگے تو اس انتشار و پریشانی میں ایک بزرگ سید محمود اپنی بیوی اور ایک صاحب زادے سید منتجب کے ہم راہ وہاں سے نکلے اور راہِ دور دراز طے کر کے ہندوستان پہنچے اور یہاں ضلع اناؤ کے ایک قصبے موہان میں آکر سکونت اختیار کی۔ کچھ زمین مل گئی کاشتکاری کو پیشہ بنایا اور ساتھ ہی درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ موہان کے ایک معمولی گھرانے میں ہی دوسری شادی کی جن سے ایک اولاد نرینہ سید جمال ہوئی۔ بہ تدریج مقامی لوگوں کے ساتھ میل جول بڑھا، رشتے قائم ہوے

اور خاندان کا دائرہ پھیلتا گیا۔ جب لکھنؤ میں شیعہ حکومت آئی تو عام طور پر اہلِ سنت کو کافی جبر و تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ شیعہ عقیدے کے پیروین کو زیادہ مراعات حاصل ہوئیں۔ ان کو زمینیں اور جاگیریں عطا ہوئیں۔ اس طرح موہان میں شیعہ خاندان زیادہ طاقت ور ہو گیا اور حنفی عقیدے والوں میں لازماً خوف وہراس پھیلا۔ مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر کچھ اہلِ سنت جماعت نے خود کو شیعہ تزئیلی کہنا شروع کیا جس کی رو سے شیعہ سنی میں شادی بیاہ کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

۱۱۰۸ھ میں موہان میں سید شاہ وجیہہ نامی ایک عالم بزرگ نے بہت شہرت پائی۔ یہ سید محمود نیشاپوری کی اولاد میں سے تھے اور ان کی پہلی بیوی بھی سید محمود کے ہی خاندان کی ایک لڑکی تھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے جو اور دو شادیاں کیں ان کا تعلق موہان کے مقامی باشندوں کے خاندان سے تھا۔ یہ شاہ وجیہہ، سید حسن رسول نما دہلوی کے مرید تھے۔ ۱۲۰۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے کل ۶ لڑکے اور ۴ لڑکیاں تھیں۔ لڑکوں میں پہلی بیوی سے دو لڑکے تھے مولوی غلام ابراہیم اور مولوی حسن بخش۔ مولوی غلام ابراہیم نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے ایک فرزند سراج الحسن ہوئے اور دوسری بیوی سے ۴ لڑکے: ضیاء الحسن، رضاء الحسن، محبوب حسن اور حافظ نیاز حسن۔ سراج الحسن کی اولاد میں تین لڑکے اور ایک لڑکی: عماد الحسن، الطاف حسن، سید حسن اور نعیم النساء جن کی شادی علی حسین سے ہوئی تھی جو امام باڑہ کے چوبھیا میں سے تھے۔ یہ امام باڑے یا عاشور خانہ ان چار بھائیوں کا بنوایا ہوا تھا جو غلام ابراہیم کی دوسری بیوی سے تھے اور چوبھیا مشہور تھے۔ امام باڑہ دلالوں کے محلے میں تھا اور سراج الحسن کا گھرانا مولوی محلے میں رہتا تھا، غالباً اسی نسبت سے "مولوی گھرانہ" مشہور تھا۔

سراج الحسن کے بڑے لڑکے عماد الحسن کی شادی مولوی حسن بخش کی لڑکی معز النساء سے ہوئی اور دوسرے دو لڑکوں کی شادیاں صفی پور کے غیر خاندان میں ہوئیں۔ مولوی حسن بخش غلام ابراہیم کے بھائی تھے۔ مولوی حسن بخش کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں: حافظ مظفر یوسف حسن، ضیا الحسن، صغیر النسا اور معز النسا۔ عماد الحسن کے تین لڑکے حافظ محمد ابراہیم، لطیف الحسن اور سلطان حسن تھے اور ایک لڑکی طیب النسا۔ سلطان حسن کی شادی امام باڑے کے اسحاق صاحب کی لڑکی کبریٰ بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کی اولاد میں تین لڑکے: سید اکبر حسن، سید نظام الحسن، سید اکرام الحسن اور دو لڑکیاں آمنہ بیگم، حمیدہ بیگم۔ غلام ابراہیم کی اولاد میں سے حافظ نیاز حسن کی دو اولادیں ہوئیں: حافظ شبیر حسن، ایک لڑکا اور ایک لڑکی شہربانو جس کی شادی مولوی گھرانے میں اظہر حسن سے ہوئی جو فضل الحسن حسرت کے والد تھے۔ اظہر حسن کے اور لڑکوں میں روح الحسن، کریم الحسن، افضل حسن، بین الحسن اور تین لڑکیاں سلیمہ بیگم، نسیمہ بیگم اور منیبہ بیگم تھیں۔ حسرت کی ان تین بہنوں میں سے دو بہنیں حیدرآباد میں بیاہی گئی تھیں ایک بڑی بہن نسیمہ بیگم جن کو ہم نسو پھوپھی کہتے تھے، ان کے شوہر حاتم الحسن وکیل تھے اور ان کی ایک ہی لڑکی تھی وسیمہ بیگم جو میری بڑی بہن باجی کی ہم عمر تھیں۔ وسیمہ بیگم کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں شمیمہ بیگم جو ڈاکٹر ہیں اور لندن میں مقیم ہیں دوسری لڑکی سلمیٰ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ایم۔ اے کیا اور ڈاکٹریٹ پھر سنٹرل لیب میں کام کرتی رہیں۔ اب حسن خدمت پر وظیفہ پاکر ریٹائرڈ زندگی سوشل ورک میں گزار رہی ہیں۔ ان کی شادی بھی حیدرآباد کے ایک صاحب سید جلیل سے ہوئی۔ لڑکوں میں ایک حبیب انصاری ہے جس نے نظام کالج سے گریجویشن کیا۔ بے حد ذہین لڑکا ہے بلبر کناڈا میں کئی سال ریسرچ کا کام کرتا رہا اب علی گڑھ یونی ورسٹی میں ریسرچ پروفیسر ہے اور دوسرا لڑکا محسن الحسن انجینیر تھا وہ ابھی چند سال قبل امریکہ میں گزر گیا۔

فضل الحسن حسرت کی شادی شبیر حسن کی لڑکی نشاط فاطمہ سے ہوئی جو ماموں زاد بہن تھیں۔ حسرت کے والد بڑے زمین دار تھے

بے حد نیک فدوی قسم کے آدمی تھے البتہ کہتے ہیں حسرت کی والدہ شہر بانو بہت تیز و طرار خاتون تھیں۔ حسرت کی ماں کے ماما مولوی نسن جنھوں نے بارہ دری بنوائی تھی بڑے عالم اور صاحب تصنیف تھے۔ اسی طرح سید اکبر حسن کے ماما کا شمار بھی بڑے عالموں میں نا تھا۔ وہ اچھے شاعر بھی تھے اور ان کی پر دادی فارسی زبان کی ماہر تھیں۔

دراصل امام باڑہ، بارہ دری، مولوی گھرانا سب ایک ہی خاندان تھا اور آپس میں افراد خاندان میں پردے کا رواج نہیں تھا اور دہ تر شادیاں آپس ہی میں ہوتی تھیں۔ مولوی گھرانے میں زمین داری تھی مگر کہتے ہیں مولوی گھرانے والوں کو پیسے سے بالکل لگاؤ نہیں۔ ہزاروں سے دوست احباب کو دے دیتے تھے اور ذرا پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ حسرت کے خاندان کا بھی زمین داروں میں شمار ہوتا تھا سلطان حسن کے خاندان میں بھی زمین داری تھی۔

ہمارے چھوٹے چچا کے پاس خاندان کا مکمل شجرہ بھی تھا۔ میں نے اس کی ایک کاپی بھی ان سے لی تھی مگر پتہ نہیں وہ کہاں ہو گئی۔

میں اپنی کم عمری میں پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۲۳ یا ۲۴ء میں موہان گیا تھا۔ لکھنو اور کان پور کے درمیان ایک چھوٹا سا اسٹیشن اگین وہاں سے کوئی ۲ میل کے فاصلے پر موہان کا قصبہ ہے۔ یہ فاصلہ اکے اور بیل گاڑی کے ذریعہ طے ہوتا ہے۔ پہلی بار میں اس راستہ سے تا۔

موہان کا یہ میرا پہلا سفر میری ابتدائی زندگی کا ایک ناقابل فراموش سفر ہے۔ میرے چھوٹے چچا میرے والد سے یہ کہہ کر مجھے اپنے تھ لے گئے تھے کہ ہم وہاں اختر کو ندوے میں شریک کرا دیں گے لیکن موصوف وہاں پہنچتے ہی بیمار پڑ گئے اور کوئی دو ماہ بعد جب وہ مجھے کر ندوہ پہنچے تو داخلے بند ہو چکے تھے۔ وہ مجھے لے کر حسرت کے پاس گئے کان پور، کہ ان کی سفارش سے کام بن جائے گا لیکن حسرت سامنے میرا مقدمہ پیش ہوا تو انھوں نے شدومد کے ساتھ اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو گئی جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہے اور وہاں اردو کے بہت اچھے اسکول بھی ہیں جہاں عمدہ تعلیم ہوتی ہے تو پھر وہیں پڑھنے میں کیا قباحت۔ ندوے میں حیدرآباد سے سیکڑوں میل دور تعلیم کے لیے سر کھپانے سے کیا حاصل۔ غرض یہ کہ ان کے دلائل نے کام کیا اور ویسے ندوے میں داخلے بند ہی ہو چکے تھے۔ یہ ۱۹۲۴ء کے پہلے مہینے کی بات ہے۔ اتفاق دیکھیے جس روز میں اور چھوٹے چچا کان پور پہنچے تھے روز تقریباً تین سال بعد حسرت جیل سے چھوٹ کر لوٹے تھے۔ اسٹیشن پر ان کے چاہنے والے ہزاروں لوگ ان کا استقبال کرنے جمع ئے تھے ان ہی میں ہم بھی تھے۔ حسرت جب اپنا تھیلا لیے ہوئے تھرڈ کلاس سے پلیٹ فارم پر آئے تو اللہ اکبر اور حسرت زندہ باد کے ں سے ساری فضا گونج اٹھی اور جب ان کی نظر ہم پر پڑی تو فرط مسرت میں انھوں نے آگے بڑھ کر مجھے تقریباً اپنی گود میں اٹھا لیا میری اس وقت کوئی ۱۲ / ۱۳ سال کی ہو گی اور پھر ہم ان کے ساتھ ان کے گھر گئے جہاں میں پہلی بار ان کی بیوی نشاط (نشاط النسا) سے ملا۔ بت ہم کو گھر پر چھوڑ کر اچانک غائب ہو گئے اور پانچ دس منٹ بعد لپنے کرتے کے دامن میں کچھ کھلونے اور بتاشے لیے ہوئے آئے اور لے: دیکھو یہ ہم اختر کے لیے لائے ہیں۔ اس طرح میری حسرت سے پہلی بار ملاقات ہوئی اور پھر ہم کوئی ایک ماہ تک ان کے گھر رہے۔ جانے کا ارادہ کرتے ان کا اصرار ہوتا کہ اب تو نہ یہاں اختر کی شرکت ہو سکتی ہے نہ حیدرآباد کے کسی اسکول میں شرکت کا وقت باقی ہے تو جلدی کیا ہے۔

مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے حسرت کا گھر تیسری منزل پر تھا۔ اس میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس

میں ایک تخت بچھا تھا اور ایک ٹوٹی سی میز اور دو چار ٹین کی کرسیاں۔ دیوار گیری میں اور تخت کے نیچے کتابوں کے انبار جن پر کئی کئی انچ گرد جمی ہوئی تھی۔ میرے لیے بھی اسی کمرہ میں ایک طرف ایک کھٹیا ڈال دی گئی۔ حسرت کی اکلوتی بیٹی نسیمہ سے میری دوستی ہو گئی جسے حسرت نے بالکل لڑکوں کی طرح اٹھایا تھا۔ نسیمہ کے ساتھ روز شام میں کوٹھے پر جاکر کن کوے اڑانا، دن بھر ادھر ادھر گھومتے رہنا یا حسرت کے کمرے میں بکھری کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہنا۔ اس طرح میرا وقت گزرتا تھا۔ تقریباً ہر روز مغرب کے بعد ایک صاحب آتے جن کے ساتھ شطرنج کی بازی جمتی تھی۔ حسرت بہت تیز کھیلتے تھے آدھ گھنٹے کے اندر بازی ختم ہو جاتی۔ حسرت نے ہی مجھے شطرنج کھیلنا سکھایا تھا۔ پھر ایک صبح حسرت چچا نے گویا ہمیں مطلع کیا کہ اگلے مہینے شاہ وجیہہ الدین کا عرس شروع ہوگا موہان میں، لیکن ہم ایک روز بعد آئیں گے۔ جہاں عرس سے پہلے ایک اہم میٹنگ ہے اس میں شرکت ضروری ہے، لہذا میں اور چھوٹے چچا عرس سے چند روز پہلے ہی موہان پہنچ گئے۔ جس روز ہم موہان پہنچے اس روز شام ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔ مغرب کے قریب ہم گھر سے نکلے ہی تھے مسجد جانے کے لیے کہ دیکھا لوگ لاٹھیاں لیے بھاگے چلے جا رہے ہیں مسجد کی طرف۔ کوئی کچھ بتاتا نہیں کہ قصہ کیا ہے آخر ایک صاحب جو کچھ لنگڑاتے ہوئے آرہے تھے ان کو روک کر پوچھا ماجرا کیا ہے؟ یہ جھگڑا کیوں مچی ہے؟ انھوں نے فرمایا "بھیا ہم تو اپنے گھر سے آوت ہیں، ہم خود نہیں جانت ہیں کہ کیا ہویا جس سے پوچھت ہیں یہی کہت ہے کہ بھیا اذاں میں کچھ بگڑ گوا ہے" پھر جب ہمارے چھوٹے چچا کچھ دیر بعد گھر لوٹ کر آئے تو انھوں نے بتایا، بڑا جاہل ہے مؤذن اس نے "حیّ علی الفلاح" کے بعد "قدقامت الصلوٰۃ" بھی دو مرتبہ کہہ دیا حالاں کہ یہ الفاظ اذان میں کہے نہیں جاتے اس پر ایک مولوی صاحب کو جلال آگیا اور جیسے ہی مؤذن ممبر سے نیچے اترا مولوی صاحب اس کے سر ہوگئے۔ ان کی دیکھا دیکھی سب ہی نمازی اس پر پل پڑے۔ جھگڑا رچ گئی۔ ہم تو کہیں گے اس مؤذن کو ہٹاکر کسی پڑھے لکھے آدمی کو بٹھایا جائے۔ دوسرے روز ہم بڑے شوق سے اس مؤذن کی زیارت کے لیے مسجد گئے۔ پتہ چلا وہ اسی رات فرار ہو گیا۔ ہم پھر اپنے مشغلے میں لگ گئے۔ روز صبح گھر سے غلیل لے کر جنگل کی طرف فاختاؤں اور کبوتروں کا شکار کرنے نکل جاتے، شام کو "بڑے گھر" کی چھت پر جاکر پتنگ اڑاتے اور کبھی اس گھر میں کبھی اس گھر میں گھومتے پھرتے۔ ان دنوں موہان میں ہمارے خاندان کے تین گھرانے بہت مشہور تھے: ایک "بڑا گھر" جو "مولوی گھرانا" بھی کہلاتا تھا حسرت موہانی کا کنبہ اس میں رہتا تھا، دوسرے "بارہ دری" جو شاید آج بھی موجود ہے ظفر مہدی اور ان کے بال بچے اس میں رہتے تھے اور "نیا گھر" جس میں پھوپھی اماں اور کچھ دوسرے رشتہ دار رہا کرتے تھے۔ القصہ وہ دن بڑی بے فکری کے تھے۔ اسی دوران عرس کی تقاریب میں بھی شرکت کی اور ایک رات، رات بھر قوالی سنی۔ حسرت چچا بھی آگئے تھے۔ اس طرح تقریباً ایک سال موہان میں وقت ضائع کر کے چھوٹے چچا کے ساتھ اورنگ آباد لوٹے۔ میرے والدین اس زمانے میں اعظمہ سے اورنگ آباد آئے ہوئے تھے۔ جہاں ہم سب سالار جنگ کی بارہ دری میں مقیم تھے اور میرے والد صاحب نے پہلے ہی اپنے ایک دوست خلیل اللہ صاحب ایڈوکیٹ سے بات کر رکھی تھی کہ ایک سال میں ان کے گھر رہوں گا اور ان کے لڑکوں کے ساتھ اسکول پڑھنے جاؤں گا۔ چناں چہ وہ سب لوگ تو کچھ دنوں بعد اعظمہ واپس چلے گئے اور مجھے اورنگ آباد چیلپہ پورہ محلے میں خلیل اللہ صاحب کے گھر چھوڑ گئے۔ مجھے چھٹی جماعت میں داخلہ ملا، خلیل اللہ صاحب کا بڑا لڑکا صفی اللہ میرا ہم جماعت تھا، چھوٹا بیٹا کلیم اللہ چوتھی جماعت میں تھا۔ صفی اللہ بعد میں سرکار نظام کے لیبر ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہوگئے اور لیبر کمشنر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ کلیم اللہ کمیونسٹ پارٹی میں چلے گئے اور اس تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ کئی بیرونی ملکوں کی سیاحت کی، عمر بھر مجرد رہے۔ چند سال پہلے تک تو کبھی کبھی کسی جلسے میں مل جاتے تھے پھر معلوم ہوا کراچی چلے گئے اور وہیں ان کے گزر جانے کی خبر ملی مگر صفی اللہ کب اور کہاں گزر گئے آج تک کسی کو کوئی خبر

نہیں ملی۔

تو یہ تھا میرا موہان کا پہلا سفر اور وہاں سے لوٹ کر اورنگ آباد کے اسکول میں شرکت۔

دوبارہ جب اتر پردیش اردو اکیڈمی کے صدر اور میرے دوست جناب علی جواد زیدی نے ۱۹۸۱ء میں حسرت کی جنم شتابدی میں شرکت اور مقالہ پڑھنے کی دعوت دی تو میں لکھنؤ گیا۔ میں نے اپنا مقالہ حسرت کے اردوئے معلّی پر لکھا تھا جو یو۔پی۔ اکیڈمی کے سہ ماہی رسالے میں شائع ہوا۔ لکھنؤ سیمنار میں شرکت کے بعد میں موہان گیا۔ میرے ہم عمر اور بہت پرانے یار عزیز ظفر مہدی کے اکلوتے صاحب زادے قمر مہدی مجھے لینے کے لیے لکھنؤ آگئے تھے۔ اس دفعہ بس کے راستے لکھنؤ سے دو گھنٹے کے اندر ہم موہان پہنچ گئے۔

میں تقریباً نصف صدی بعد دوبارہ موہان آیا تھا لیکن اتنے عرصے بعد بھی اس کا جو خارجی ماحول تھا میں نے اسے ویسا ہی پایا وہی ندی وہی باغ امرائیاں جلاہوں کی بستی۔ شاہ وجیہہ کا عرس سنا اب بھی اسی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا جس میں ہر فرقے کے لوگ جوق در جوق نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ شریک ہوتے تھے لیکن وہ دل نواز بستی جو کبھی خاندانِ سادات کے علما و حکما سے معمور بستی تھی اب وہاں خاندانِ سادات کا صرف ایک گھرانا رہ گیا تھا ظفر مہدی کا۔ ایک آٹے کی گرنی، ایک آموں کا باغ اور ایک کچا مکان یہ اب اس گھرانے کا کل اثاثہ تھا۔ ظفر مہدی میرے ہم سن تھے اور کچھ دنوں کے لیے حیدرآباد بھی آئے تھے۔ بہت کم آمیز خاموش طبع آدمی تھے۔ ان کا ایک ہی لڑکا قمر مہدی ہے جو اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں ایل ایل۔ بی کر رہا تھا۔ بڑی بہن کی شادی ہو چکی ہے دو چھوٹی بہنوں نے گریجویشن کیا ہے مگر ابھی بن بیاہی ہیں۔ قمر مہدی نے مجھے پورا موہان گھمایا۔ تین چار دن تک میں اپنے آبا و اجداد کا ذکر خاندان کی باتیں سنتا اور ماضی کے کھنڈروں میں گھومتا رہا۔ قمر مہدی نے اپنے مکان کے پیچھے کا کھنڈر خاص طور سے دکھایا کہ اس کی تاریخی اہمیت تھی کسی زمانے میں وہاں ایک عالی شان کوٹھی تھی جس میں مورخ امیر اعلیٰ جج ہائیکورٹ کلکتہ کا خاندان رہتا تھا۔ اب اس خاندان کا کوئی ایک فرد بھی وہاں نہیں رہتا۔ خدا جانے سب کہاں چلے گئے۔ قمر مہدی نے اپنا آموں کا باغ بھی دکھایا جو بہت بڑا ہے جس کے مختلف قسم کے نفیس آم آمدنی کا ذریعہ بھی ہیں اور ان کی آٹے کی گرنی۔ گرنی گھر سے قریب ہی ہے۔ قمر مہدی نے مجھے وہ جگہ بھی دکھائی جہاں پہلے مڈل اسکول تھا اب اسے ہائی اسکول بنا دیا گیا ہے اور پرانی عمارت کی جگہ وہاں ایک نئی شان دار عمارت نظر آتی ہے جو یو۔پی سرکار نے حسرت کی جنم شتابدی کے موقع پر تعمیر کروائی ہے۔

بچپن اور تعلیم:

میری تاریخ پیدائش بھی مجھے چھوٹے چچا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ان کی ایک نوٹ بک میں ملی۔ وہ دو شنبہ ۲۴ / جون ۱۹۱۲ء م ۹ رجب ۱۳۳۰ھ، ۱۰ امرداد ۱۳۲۱ف رات کے ۸ بجے ہے۔ ان دنوں میرے والد سید اکبر حسن نظام آباد میں تھے میں وہیں پیدا ہوا۔ مجھ سے سوا سال بڑی میری بہن باجی، جمال النسا بھی اسی شہر نظام آباد میں پیدا ہوئیں۔ میری والدہ بتاتی تھیں کہ وہاں ایک بہت اچھا مشن ہسپتال تھا۔ میری اور باجی کی پیدائش اسی ہسپتال میں ہوئی۔ وہاں کی نرسیں بہت اچھی فرض شناس تھیں بڑی نرس تو باجی کو "ہمارا بچہ" کہتی تھی کیوں کہ وہ بچپن میں بہت گوری تھیں۔ میں تین چار سال کا تھا تو امی کہتی تھیں، بہت بیمار پڑ گیا۔ اس زمانے میں نظام آباد چھوڑ کر میرے والدین بچوں کے ساتھ حیدرآباد آگئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد والد صاحب کا گھن پور پر تقرر ہو گیا۔ وہ اپنے بچوں اور بیوی کے ساتھ وہاں چلے گئے۔ گھن پور بہت چھوٹا سا ایک قصبہ تھا مگر بہت پر فضا۔ ہمارے گھر کے قریب ہی ایک ندی تھی۔ مجھے یاد ہے میں اور باجی وہاں رہتے

میں کھیلتے اور سیپیاں جمع کرتے تھے۔ میرے بچپن کا ابتدائی زمانہ وہیں گزرا۔ اس وقت ہم صرف تین بہن بھائی تھے باجی، میں اور رضیہ۔ مگر باجی کا کہنا ہے کہ رابعہ بھی ایک سال سوا سال کی تھیں۔ بہرحال میرے بچپن اور لڑکپن کے زیادہ تر ماہ و سال دیہاتوں، قصبوں میں گزرے، مرہٹواڑہ، تلنگانہ، کرناٹک کے مختلف صوبوں کے قصبوں میں جو اس وقت سرکارِ عالی میں شامل تھے۔ والد صاحب کی جہاں بھی پوسٹنگ ہوتی وہاں ہم ان کے ساتھ رہتے تھے۔ والد صاحب نے کچھ عرصہ سالارجنگ اسٹیٹ میں بھی کام کیا جس کے ناظم اس وقت امین الحسن بسمل موہانی تھے جو والد کے قریبی رشتہ دار بھی تھے اور بہت گہرے دوست بھی۔ انھوں نے سالار جنگ اسٹیٹ میں والد صاحب مجسٹریٹ کی حیثیت سے تقرر کر دیا۔ ان دنوں مجسٹریٹ تحصیل دار بھی ہوتا تھا۔ سالار جنگ اسٹیٹ کے کئی ہیڈ کوارٹرز تھے جیسے اجنتہ، کپل، کوسگی، سرور نگر اور ان چاروں مقاموں پر منصفی قائم تھی۔ والد صاحب سالار جنگ اسٹیٹ کی ملازمت میں کپل میں بھی رہے اور اجنتہ میں بھی۔ میری چھوٹی بہن ذکیہ کی پیدائش کپل کی ہی ہے۔ اجنتہ میں بھی کئی سال رہے۔ اجنتہ میں ایک بارہ دری تھی۔ سرکاری عمارت بہت خوب صورت اور بہت بلندی پر، اس کے بیرونی حصے میں عدالت ہوتی تھی اور اندرونی حصہ مجسٹریٹ کی قیام گاہ کے لیے دیا جاتا تھا۔

اجنتہ کی مجھے بہت باتیں یاد ہیں کیوں کہ اس وقت تک میں کافی بڑا ہو گیا تھا اور وہ بڑا عجیب و غریب زمانہ تھا۔ اس وقت کا خاص سیاسی شعور ہمارے پورے خاندان میں یعنی ہم سب بھائی بہنوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ آزادی کی تحریک اپنے عروج پر تھی ہمارے گھر میں مدینہ اخبار آتا تھا جو سہ روزہ تھا اور بجنور سے نکلتا تھا۔ اس کی پیشانی پر جلی حروف میں مجھے اب تک یاد ہے لکھا ہوتا تھا:

"معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں　　　مہہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

یہ وہ زمانہ ہے جب پہلی جنگ ختم ہو چکی تھی اور تحریک آزادی زوروں پر تھی اور حسرت موہانی کی حیثیت ہمارے فیملی لیڈر کی سی تھی۔ ہمارے والد صاحب اور اور وہ نہ صرف کزن برادر تھے بلکہ دونوں میں غیر معمولی قریبی ربط بھی تھا۔ بچپن دونوں کا کافی ساتھ گزرا تھا۔ دونوں جب علاحدہ ہوئے تو ایک دوسرے کو سو سو صفحوں کے خط لکھتے تھے۔ ان میں شعر و شاعری بھی ہوتی تھی۔ میرے والد شاعر تو نہیں تھے مگر بے حد شعر دوست تھے۔ ان کا ادبی ذوق بہت اچھا تھا۔ وہ خود بتاتے تھے کہ انھوں نے ایک ناول بھی لکھی تھی۔ افسوس کہ یہ سب سرمایہ تلف ہو گیا۔ بہرحال یہ زمانہ گویا ہماری غیر شعوری سیاسی بیداری کا تھا۔ میں روزانہ پابندی سے اخبار پڑھنے لگا تھا اور ہمارے چھوٹے چچا جو کٹر قوم پرست تھے، ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ ان کی صحبت کا بھی ہم پر بہت اثر پڑا۔ وہ بڑے لاابالی قسم کے زندہ دل، خوش مزاج انسان تھے۔ ہم سب بچے ان سے بے حد قریب تھے۔ رضیہ ان کی چہیتی تھیں کہ وہ ان کے ساتھ پانچوں وقت کی نماز پڑھتی تھیں۔ وہ نماز روزے کے بہت پابند تھے مگر مولویانہ قسم کے مذہبی نہیں تھے۔ وہ حسرت موہانی کے followers میں سے تھے۔ پکے کانگریسی تھے۔ ہمیشہ کھادی پہنتے اور گاندھی کیپ سے مختلف ایک خاص وضع کی کھادی کی ٹوپی۔ ان کی شادی کا قصہ بڑا دلچسپ ہے۔ میری چھوٹی چچی اصل میں بچپن سے میرے والد سے منسوب تھیں۔ وہ ان کی خالہ زاد بہن تھیں۔ جب میرے والد نے بڑے ہو کر ان سے شادی سے انکار کر دیا تو گھر والے بہت پریشان ہوئے۔ خاندانی عزت کا سوال تھا۔ ماں باپ نے سمجھایا مگر وہ راضی نہ ہوئے تو آخر اکرام الحسن کو بلایا گیا کہ دیکھو تمھارے بھائی نے تو "بٹیا" کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا ہے اگر تمھاری شادی "بٹیا" سے کر دی جائے تو کیسا ہے۔ انھوں نے بے ساختہ کہا: ایسے نصیب کس کے! اس طرح ان کی شادی بٹیا سے ہو گئی مگر وہ بہت کم بیوی کے ساتھ رہے۔ زیادہ تر ہمارے ساتھ رہتے تھے اور بیوی میکے میں۔ وہ زیورات کا business کرتے تھے گھر گھر پھر کر مگر اتنے لاابالی اور بے پروا تھے کہ

ئی چیز خرید کر نقد پیسے دینے بھی لگتا تو کہتے جلدی کیا ہے رہنے دیجیے پھر لے لیں گے ۔ اس طرح ہمیشہ نقصان اٹھایا ۔ آخر آخر میں بیوی کو یدرآباد بلوالیا تھا ۔ کچھ عرصہ دونوں ساتھ رہے پھر چچی کا انتقال ہو گیا ۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی ۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ والد صاحب کے کسی ایک جگہ مستقل نہ رہنے کی وجہ سے میری تعلیم بہت بے قاعدہ رہی ۔ موہان بھیجا گیا وہاں ایک سال خراب ہوا اورنگ آباد میں چھٹی جماعت میں شریک کیا گیا، وہاں کچھ سیکھا مگر سچ تو یہ ہے کہ دراصل جو کچھ میں نے سیکھا اپنے دادامیاں سے سیکھا ۔ وہ جب امرھنتہ میں ناظم تھے جو ایک رجواڑے کا صدر مقام تھا اور ناظم اس وقت پورے اسٹیٹ کا مالک سمجھا جاتا تھا ۔ راجہ صاحب سے ان کے بہت اچھے رواسم تھے ۔ وہ ایک بار حیدرآباد آئے تو انھوں نے اکبر حسن سے کہا کیوں لڑکے کی زندگی برباد کر رہے ہو اسے میرے پاس بھیج دو میں اسے پڑھاؤں گا تو والد صاحب نے مجھے ان کے پاس امرھنتہ بھیج دیا ۔ وہاں میں دو سال رہا ۔ جس مکان میں دادامیاں رہتے تھے وہ بہت بڑا تھا ۔ کئی الگ الگ حصے تھے ۔ اس کے اوپر بھی ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس میں ہماری پھوپھی اماں اور پھوپھامیاں رہتے تھے اور چھٹیوں میں تو ان کے سب ہی لڑکے اور کئی رشتہ دار ان کے پاس جمع ہو جاتے ۔ دادی اماں گھر کی منتظم تھیں ۔ نوکر چاکر تھے ۔ وہ اپنی پیڑھی پر بیٹھی سب کام اپنی نگرانی میں کرواتی تھیں ۔ کھانا آج کل کی طرح ایک میز پر یا دسترخوان پر نہیں ہوتا تھا، ہر فیملی کے خوان لگ کر الگ الگ ان کے پاس بھجوائے جاتے تھے ۔ اس مکان کا پورا نقشہ مجھے اب تک یاد ہے ۔ ایک بھنوار بھی تھا اس میں جس کے اندر سے سیڑھیاں تھیں اوپر جانے کی ۔ تو خیر اس سے قطع نظر ہمارے دادا عربی فارسی کے بہت بڑے عالم تھے اور ان کا درس کا طریقہ عجیب تھا کہ ایک بار جو پڑھاتے دل پر نقش ہو جاتا ۔ مجھے پہلے عربی پڑھانا شروع کیا ۔ حیدرآباد سے ابتدائی کتابیں نے میں دیر ہوئی تو صرف و نحو کی پوری دو کتابیں انھوں نے اپنی یادداشت سے لکھوا دیں جو حرف بہ حرف مطبوعہ کتابوں سے مطابق نکلیں ۔ عربی کے ساتھ اردو فارسی بھی سکھائی روزانہ صبح ۲ گھنٹے باقاعدہ سبق دیتے تھے اور شام میں ۔ آنگن میں ایک بہت بڑا نیم کا درخت تھا اور صحن بہت کشادہ ۔ گرمیوں میں وہاں چھڑکاؤ ہوتا، تخت بچھتے دادامیاں کا حقہ آجاتا اور وہ ہم کو باتوں باتوں میں تعلیم دیتے، لطیفے سناتے، قصے کہتے، شعر سناتے ۔ خود شعر موزوں کرتے تھے ۔ ان ہی سے میں نے پوری عروض سیکھی ۔ مجھے شعر کہنے کی مشق بھی کروائی ۔ تو شام میں ایک گھنٹہ باقاعدہ ان کے ساتھ گزرتا تھا ۔ فارسی سکھاتے ہوئے انھوں نے آمدن نامہ، گلستان، بوستان اس کے بعد کریما اور مثنوی مولانا روم تک پڑھادی ۔ پڑھاتے ہوئے وہ کبھی مارتے نہیں تھے، سبق یاد نہ کرنے پر ڈانٹتے البتہ تھے ۔ میں کوئی سوال کرتا تو بڑی رسانیت سے جواب دیتے ۔ ہمارے دادامیاں بہت روشن خیال تھے ۔ ان کا کہنا تھا ماڈرن ایج میں انگریزی پڑھنا بہت ضروری ہے ور لڑکیوں کو بھی اچھی تعلیم دی جانی چاہیے ۔ اپنی لڑکی حمیدہ بیگم کو خود عربی فارسی پڑھائی تھی اور خط کی مشق کرائی تھی ۔ ان کا خط بہت اچھا تھا ۔ رضیہ کو بھی فارسی انھوں نے ہی پڑھائی اور تھوڑی بہت عربی بھی ۔ اور جب والد صاحب نے اپنی لڑکیوں رضیہ، رابعہ کو ہائی سکول میں داخل کروایا تو خاندان والوں میں کھلبلی مچ گئی ۔ اکثر رشتہ داروں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا اس لئے کہ اکبر حسن لڑکیوں کو پڑھا رہے تھے ۔ لڑکیاں ریڈیو پر ٹاک دیتی ہیں نامحرم ان کی آواز سنتے ہیں ۔ حتیٰ کہ ہمارے چچا میاں سید نظام الحسن بھی بھائی سے برسوں خفا رہے ۔ مگر ایک ہمارے دادامیاں تھے کہ ان کو جب یہ خبر ملی تو انھوں نے اپنے بیٹے کو مبارک باد کا خط لکھا اور بے حد خوشی کا اظہار کیا کہ لڑکیوں کو بھی تعلیم دی جارہی ہے ۔ اور پھر جب میری بہنوں نے میٹرک پاس کیا تو پہلا مبارک بادی کا خط ان ہی کا آیا ۔ اس وقت وہ بست میں تھے اپنی بیٹی حمیدہ بیگم کے پاس ۔ نارو کی بیماری کی وجہ سے ان کا ایک پیر کاٹنا پڑا تھا ۔ ۱۵ سال تک وہ مفلوج حالت میں رہے ور کافی بڑی عمر میں رحلت فرمائی ۔ دادی اماں کا جب وہ امرھنتہ یں ملازم تھے تب ہی انتقال ہو گیا تھا ۔ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی بہ ہر حال

ہماری ابتدائی تعلیم گو آج کل کی طرح باقاعدہ اسکولوں میں نہیں ہوئی مگر اپنے دادا میاں سے اور گھر کے ماحول سے میں نے اس سے
زیادہ سیکھا جو اسکول کی تعلیم سے حاصل کرتا ۔ شعر و ادب سے دل چسپی ، مطالعے کا شوق اور سیاست سے لگاؤ اسی کی دین ہے ۔ او
جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۲۶ء سے میری باقاعدہ تعلیم کا بھی سلسلہ شروع ہوا جب مجھے اشرف المدارس میں شریک کرایا گیا ۔ یہ مد
آج بھی موجود ہے شاید پرانے شہر میں اس وقت ترپ بازار میں تھا اور اس کی عمارت بہت بڑی تھی ۔ اشرف علی صاحب اس کے
تھے ۔ جب پہلی بار شرکت کے لیے والد صاحب کے ساتھ میں ان کے کمرے میں گیا تو میں نے دیکھا سرسید کی طرح کے ایک داڑھی
بزرگ کرسی پر بیٹھے ہیں اور ان کے قریب ایک ٹب میں کوئی ایک درجن بید بھیگ رہے ہیں ۔ تو خیر میں اشرف المدارس میں شریک
دیا گیا ۔ اسکول کا ہاسٹل بھی تھا اس کے ایک کمرے میں مجھے رہنا پڑا ۔

یہ اسکول اشرف صاحب کا ان کا اپنا قائم کیا ہوا تھا اور صرف مڈل تک تھا ۔ سرسید کی طرح اشرف علی صاحب کا بھی یہ ایقان تھ
مسلمانوں کو انگریزی زبان پڑھنی چاہیے ۔ وہ خود بہت اچھی انگریزی جانتے تھے ۔ بہت سخت گیر آدمی تھے شاید اسی وجہ سے ان کا اس
نوابوں اور امیروں کے آوارہ مزاج لڑکوں کے لیے ایک خاص مرکز بن گیا تھا ۔ نواب اور امرا اپنے لڑکوں کو سدھارنے کے لیے ان ہی
اسکول میں بھیجتے تھے ۔ اور اس میں شک نہیں کہ اشرف المدارس کے کئی فارغ التحصیل آگے چل کر بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو
سیاست اور ادب میں بھی نام پایا ۔

اس وقت اس کے ہاسٹل کی فیس ، آپ کو سن کر حیرت ہوگی صرف ۱۸ روپے ماہانہ تھی جس میں کھانا بھی شامل تھا اور کھانا اچ
ملتا تھا ۔ اشرف علی صاحب کے دو لڑکے تھے ۔ نصرت میرا ہم جماعت تھا ۔ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد اسکول چلانے کی ذمہ د
اسی کو سونپی گئی مگر وہ چلا نہیں سکا تو گورنمنٹ نے لے لیا اس طرح وہ گورنمنٹ اسکول بن گیا ۔ وہاں ہاسٹل میں جو اور لڑکے تھے ان
زیادہ تر نوابوں کے بگڑے ہوئے لڑکے تھے مثلاً ایک جمیل نامی لڑکا تھا بے حد حسین ۔ اسم بامسمیٰ مگر بے حد بگڑا ہوا آوارہ مزاج اور
کے دو چار ساتھی بھی ایسے ہی تھے ۔ مولوی صاحب ان پر کڑی نگرانی رکھتے تھے ان کو اپنے کمروں سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی م
جمعہ کو جب ان کے والدین انھیں لینے آتے تو ان کے ساتھ جاسکتے تھے ۔ رات میں چوکیدار کا سخت پہرہ رہتا تھا اور مولوی صاحب
رات میں ہاسٹل کی گشت لگاتے تھے ۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے حسبِ دستور ہم لڑکوں کا قافلہ مغرب کی نماز پڑھنے مولوی صاحب کے
ترپ بازار کی مسجد گیا ۔ اس کی دیواریں بہت نیچی تھیں ۔ جمیل بھی ساتھ تھا ۔ جب ہم سجدے میں گئے تو وہ چپکے سے وہاں سے نکل گیا
دیوار پھلانگ کر ، کیوں کہ دروازے پر تو چوکیدار پہرہ دے رہا تھا ۔ مولوی صاحب بہت پریشان ہوئے ۔ دو تین دن کی تلاش کے
اسے پھر پکڑ کر لائے اور اس کے بعد کئی دن تک اسے زنجیروں سے باندھ کر رکھا گیا ۔ تو اس اسکول سے ہم نے مڈل پاس کیا ۔ مڈ
اس زمانے میں بہت اہمیت تھی ۔ وہ لطیفہ سنا ہوگا آپ نے ، ایک لڑکے نے اپنی ماں کو آکر یہ خوش خبری سنائی کہ اماں میں ایم ۔ اے
ہو گیا ہوں تو ماں نے کہا ، بہت خوشی کی بات ہے بیٹا مگر یہ تو بتاؤ مڈل بھی کیا کہ نہیں ؟

مڈل پاس کرنے پر مولوی صاحب نے مجھے بہت شاباشی دی اور جب میں اسکول سے رخصت ہو رہا تھا ، والد صاحب مجھے لینے
تھے تو انھوں نے ان سے کہا آپ کا لڑکا بہت ذہین ہے آگے چل کر یقیناً بہت ترقی کرے گا ۔ دو لڑکے ہیں جنھوں نے کبھی میری بید
کھائی ایک اختر دوسرے وحید الدین ، جنھوں نے بعد میں اردو میں ڈاکٹریٹ کیا ۔ اشرف المدارس سے نکل کر اب مجھے نام پلی ہائی ا

میں پری میٹرک کے لیے شریک کیا گیا اس زمانے میں میٹرک سے پہلے دو سال پری میٹرک کرنا پڑتا تھا ۔ یہ اسکول اس وقت سدی عنبر بازار میں تھا اور وہیں ہمارے ایک رشتے کے چچا رہتے تھے علیم الدین صاحب ۔ وہ ایڈوکیٹ تھے ۔ کرائے کے مکان میں رہتے تھے ۔ مجھے ان کے پاس رکھا گیا مگر میں یہاں ایک ہی سال رہا ۔ دوسرے سال کے لیے مجھے آصفیہ اسکول میں داخلہ لینا پڑا کیوں کہ اس زمانے میں [illegible] طاعون کی وبا پھیلی تھی اور میرے والدین وغیرہ سب سرور نگر میں چچا میاں کے گھر میں آگئے تھے جو سالار جنگ کے ہاں ملازم تھے ۔ وہ [illegible] سے قریب ترین اسکول بھی تھا ۔ میں گھر سے اسکول تک پیدل جاتا تھا ۔ اس پیدل سفر میں بڑا لطف آتا تھا ۔ سارے راستے کھیتی باڑی اور باغوں کے درخت اور سبزہ ۔ بڑا پر فضا ماحول تھا ۔ کچھ دنوں بعد جب والدین چلے گئے ، مجھے چھوٹے چچا اور چھوٹی چچی کے پاس رہنا پڑا تب بھی میں وہاں سے پیدل ہی آصفیہ جاتا تھا ۔ اس وقت اس کے ہیڈ ماسٹر حسین الدین قریشی تھے ۔ وہ بہت غیر معمولی شخصیت تھی ۔ بعد میں ان سے دوستی بھی ہو گئی ۔ آصفیہ سے پری میٹرک کر کے ، میٹرک کے لیے میں دار العلوم میں شریک ہوا اور میٹرک وہیں سے کیا ۔ دار العلوم میں ریاضی کے استاد عبد اللطیف صاحب کی شخصیت کا نقش آج تک میرے دل پر مرتسم ہے ۔ ان ہی کی بدولت میری ریاضی جو کم زور تھی اچھی ہو گئی ۔ ان کے سکھانے کا طریقہ ہی کچھ اتنا اثر انگیز تھا ۔ البتہ الجبرا کبھی حلق سے نیچے نہیں اتری ۔ دار العلوم کے ایک اور استاد صدق جائسی تھے جو اردو پڑھاتے تھے ۔ ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا ۔ بہت اچھی بامحاورہ ٹکسالی اردو بولتے تھے ۔ ان کا [illegible] مجھے بہت بھاتا تھا ۔ بعد میں ان سے اتنی دوستی ہو گئی تھی کہ تقریباً روز ملنا ہوتا تھا ۔ ان کا تفصیلی ذکر میں بعد میں کروں گا ۔ اردو ادب سے ہم کو شروع سے دل چسپی تھی ۔ والد صاحب ہم بچوں کے لیے پھول رسالہ پابندی سے منگواتے تھے اور ہم اسے بڑے شوق سے پڑھتے تھے ۔ اس کے علاوہ اردو کی جو کتاب بھی ہاتھ لگتی نثر ہو کہ نظم ، پڑھ ڈالتے تھے ۔ مجھے یاد ہے گھر میں ایک بہت بڑا صندوق تھا اس میں کتابیں بھری ہوئی تھیں ۔ دوپہر میں جب بالعموم سب بڑے سو جاتے تو میں اور باجی صندوق کھول کر اس میں سے اردو کی کتابیں نکالتے اور چھپ چھپ کر پڑھتے ۔ زہر عشق اور الف لیلیٰ اسی طرح پڑھی تھی اور بہت سی ایسی کتابیں جن کا لڑکپن میں پڑھنا منع تھا ۔ مطالعے کا شوق کچھ تو پہلے ہی سے تھا اب اور بڑھ گیا اور میری بڑی بہن باجی کو تو اردو کتابیں پڑھنے کا دیوانہ وار شوق تھا اور اب تو وہ انگریزی کی بھی ہر کتاب پڑھ لیتی ہیں حالاں کہ ان کی نہ مدرسے میں تعلیم ہوئی نہ کسی سے انھوں نے انگریزی سیکھی بس اپنے شوق اور مطالعے سے اس میں مہارت حاصل کر لی ۔ اور شروع سے آج تک مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے ۔ کوئی کتاب ان کے ہاتھ میں آجائے تو پھر انھیں دنیا جہاں کی خبر نہیں رہتی ۔ نگار ، نیاز فتح پوری کا ماہ نامہ جو لکھنؤ سے نکلتا تھا ان کو بہت پسند تھا اور ان ہی کی خواہش پر والد صاحب نے اسے ان کے نام جاری کروا دیا تھا ۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۲۸ء سے تقریباً ۲۵ سال تک رسالہ ہمارے گھر پابندی سے آتا رہا ۔ ہم سب بھائی بہن "نگار" بڑے ذوق شوق سے پڑھتے تھے اور نیاز فتح پوری کے خیالات سے بہت متاثر تھے ۔ ان کو اپنا گرو مانتے تھے جیسے سیاست میں نہرو جی ہمارے گرو تھے ۔

اسی زمانے میں مجھے بڑی شخصیتوں سے ملنے اور ادیبوں شاعروں سے ملنے دوستی پیدا کرنے کا جیسے خبط ہو گیا تھا ۔ جہاں [illegible] میں خط و کتابت کے سلسلے میں جن شاعروں سے میرا ربط قائم ہوا ان میں اختر شیرانی اور مجنوں گورکھپوری کے نام [illegible] پھر نیاز فتح پوری ، ساغر نظامی ، روش صدیقی وغیرہ بھی میرے حلقۂ احباب میں شامل ہو گئے ۔ اختر شیرانی کا "خیالستان" اور مجنوں گورکھپوری کا "ایوان" ہر ماہ ہم کو ملتا رہتا تھا ۔ اسی زمانے میں مجھے یاد ہے "ایوان" میں مجنوں گورکھپوری کی ایک غزل چھپی [illegible] ان کی ردیف تھی ۔ اس پر میں نے ایک مصرعہ بڑھا کر [illegible] مجنوں نے [illegible]

کے ساتھ اپنے رسالے میں شائع کیا تھا کہ "جو چیزیں رہ گئی تھیں اختر صاحب نے ان کو بے نقاب کر دیا" انھیں پتہ نہیں تھا کہ میری کیا ہے؟ نفسیاتی طور پر ہم اپنی عمر چھپاتے تھے کہ کہیں ہم کو لونڈا نہ سمجھا جائے۔ اس کے بعد ہمارے نام رسالوں کے اڈیٹروں کے خ شروع ہوئے مضامین کے لیے۔ اور جب میں ہائی اسکول میں پڑھ رہا تھا تو مجھے کچھ بڑی شخصیتوں سے ملنے، ان کو دیکھنے کا بھی موقع ملا جوش ملیح آبادی اور دار الترجمے کے بعض دوسرے اہل علم و فضل جیسے مولوی عنایت اللہ ناظم، مرزا بادی رسوا، قاضی تلمذ حسین؟ عبد عمادی، علی حیدر نظم طباطبائی اور ابو الخیر مودودی وغیرہ۔ پھر اسی زمانے میں جب علامہ اقبال کو مدراس اور میسو میں توسیعی لکچرز دینے بعد عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی یہاں لکچر دینے کے لیے بلوایا تو باغ عامہ کے جوبلی ہال میں ان کے دو لکچر ہوئے۔ اس میں شرکت کی تو راہ نہ نکل سکی اور نہ اتنا شعور تھا کہ ان دقیق علمی لکچروں کو سمجھ سکتا تاہم اقبال سے ملنے کا اشتیاق مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ کشاں کشاں اس عمارت میں لے گیا جہاں شاعرِ مشرق کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ اسے حسنِ اتفاق کہیے کہ اس صبح وہ اپنے کمرے میں موجود اور ان کے ساتھ ایک صاحب اور تھے وہ تھے جناب شروانی صاحب۔ ہم طالب علموں کو کسی نے اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے نہیں روکا۔ ہم خاموشی سے جاکر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ جب شروانی صاحب ان سے رخصت ہونے لگے، باتوں سے ہم نے اندازہ لگا تھا کہ موصوف اسی شام علی گڑھ جا رہے تھے۔ اقبال انھیں پہنچانے دروازے تک آئے تو مجھے یاد ہے شروانی صاحب نے اقبال کو خدا حا کہتے ہوئے یہ بھی کہا: دیکھیے اب اقبال سے کب ملاقات ہوتی ہے۔ اس اقبال نے برجستہ کہا کہ؟ "آپ کا اقبال تو ہمیشہ آپ کے ساتھ۔

اس کے بعد چند منٹ ہم ان کی خدمت میں اور بیٹھے۔ انھوں نے ہم سے کچھ رسمی سوال کیے کیا کرتے ہو؟ کہاں پڑھتے ہو؟ وغ اور پھر ان سے بہ ادب اجازت لے کر اسکول لوٹ آئے۔ اقبال سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ ان کی شاعری ہم طالب علمو کے لیے ایک سامانِ فکر و نظر تھی اور ان کی بہت سی نظمیں اس وقت بھی مجھے زبانی یاد تھیں۔ غرض دار العلوم ہائی اسکول سے درجہ د میں میٹرک کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں سے میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔

OO OOO OO

(سلسلہ ص ۶)

ادب کے تجزیاتی مطالعے کا حصہ بنانا..... اسی طرح نئی تاریخیت سے سرد مہری برتنے والوں میں خاصی تعداد تانیثی (minist نقادوں کی بھی ہے جن کا خیال ہے کہ جنسوں کے تعلقات (Gender Relations) کو نظر انداز کر کے ادب اور معاشر باہم رشتے کا تعین ناممکن ہے۔

OO OOO OO

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی

طٰہٰ حسین کے اسلوب پر ایک تنقیدی نظر

طٰہٰ حسین ایک فطری ادیب ہیں ۔ وہ ایک صاحب اسلوب مفکر ہیں ۔ ان کے یہاں ایک مخصوص اندازِ نظر ملتا ہے ۔ وہ جتنے اعلیٰ درجے کے ادیب ہیں اس سے بڑے ناقد ہیں ۔ علما کا خیال ہے کہ ناقد بڑا ادیب نہیں بن پاتا کہ اصول و نظریات اس کا دامن تھام لیتے ہیں اور وہ فنی قیود کو توڑ کر اختراع و ابتکار کے میدان میں نقش قائم نہیں کر پاتا ۔ اس کے برعکس ایک بڑا ادیب تنقید کی عائد کردہ پابندیوں سے بے نیاز ہو کر ابداع و اختراع سے کام لیتا ہے اور اس کی فطری عبقریت سے فن روشن ہو جاتی ہے ۔ طٰہٰ حسین کی تنقید پر ان کا حسنِ اسلوب غالب ہے ۔ ان کی عبارتوں میں حسن و نور کی دل کشی روز روشن کی طرح عیاں ہے جس کی وجہ سے تنقید کی خشکی یا روکھا پن ، سختی اور اکتاہٹ دور دور نظر نہیں آتی ۔ پڑھنے والا حسنِ کلام کی دل کشی سے مسحور ہو جاتا ہے ۔ ان کی تنقیدوں میں ادبی تحریروں کی مسرت کا احساس ہوتا ہے ۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ طٰہٰ حسین نے قدیم ادب پر خصوصاً قدیم اور کلاسیکی شاعری پر خاص توجہ مبذول کی اور اس کو اپنی تنقید کا محور قرار دیا ۔ جاہلی ، اموی اور عباسی شاعری پر بڑی تفصیل سے تنقید کی اور دل کھول کر لکھا اور اپنے معروف شگفتہ اور ادبی اسلوب میں ان کی کتابیں فی الجاہلی ، تجدید ذکری ابی العدہ ، المعری ، حدیث الاربعاء (۳ جلدوں میں) سب کلاسیکی شاعری سے متعلق ہیں ان کتابوں میں جو چیز سب سے ممتاز ہے وہ تنقیدی ، روشنی کے علاوہ اعلیٰ شاعرانہ ذوق ہے ۔ طٰہٰ حسین نے قدیم شاعری کا ذوق اپنے ازہری استاذ سید مرصفی سے حاصل کیا تھا ۔ طٰہٰ حسین کا ذوق تہذیب اور روایت میں رچا بسا ہے ۔ وہ شعر سے مزا لینا جانتے ہیں ۔ وہ اس سے لطف و لذت حاصل کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ لذت قاری کے دل میں اتار دیں اور اس مشن میں وہ یقیناً ایک کامیاب ناقد ہیں ۔

وہ ایک نفسیاتی اور ذوقی خاکہ بناتے ہیں اور شاعر کی ایسی عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں جس میں اس کا فکر و فن ابھر کر سامنے آ جاتا ہے ۔ وہ تحلیل کرنے کے ماہر ہیں ۔ ایک نظم پر پہلے وہ نظر ڈالتے ہیں ، سارے بنیادی نکات کا مطالبہ کر کے مضامین کا احاطہ کر لیتے ہیں پھر اس پر بحث شروع کرتے ہیں ۔ پوری بحث عالمانہ اور مطالعے پر مبنی ہوتی ہے ۔ کبھی کوئی قصہ بھی مناسبت سے بیان کر دیتے ہیں ۔ کبھی راویوں کے اقوال بھی نقل کر دیتے ہیں مگر حسنِ ذوق ، حسنِ زبان و اسلوب اور حسنِ تحلیل کی جلوہ گری ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے ۔ مثلاً معلقہ کی تحلیل ہے ۔ معلقات سبع میں سے ہر معلقے کی نہایت عالمانہ و ناقدانہ تحلیل انھوں نے " ادب جاہلی " مشہور کتاب میں کی ہے ۔ اس طرح کہ پورا معلقہ مصفیٰ و مجلی ہو گیا ہے ۔ جو قصائد عربوں نے ان کے حسن کے باعث خانۂ کعبہ پر لٹکائے تھے ان کو معلقات کہا جاتا ہے ۔ طٰہٰ حسین اس نظریے کے منکر ہیں کہ ان کو خانۂ کعبہ پر لٹکایا گیا تھا مگر تحلیل و تنقید نہایت عالمانہ انداز میں کی ہے ۔ وہ روایتی تنقید اور روایتی تحلیل اور روایتی طرز سے احتراز و اعراض کر کے نئے نئے نظریات قائم کرتے ہیں اور نئے انداز سے سوچتے ہیں ۔ قدیم ادب پر جدید نظریات کا اطلاق کرتے ہیں اور جدید انداز سے روشنی ڈالتے ہیں ۔ یورپ نے جو جدید طرز ادب کے مطالعے کا ایجاد کیا ہے

خصوصاً تاثراتی تنقید کا اثر ان پر غالب ہے جو یورپ میں انیسویں صدی میں رائج تھی ۔ ان کا ذاتی احساس اور شخصی ذوق اور جمالیاتی اندازِ نظر ان کی تنقید کے تانے بانے ہیں ۔ جمالِ فنی پر پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں اور قدیم متن اور نصوص کا مطالعہ کرتے ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں حسنِ ذوق یا حسنِ بیان یا حسنِ تعلیل ، عمیق تحلیل کے ساتھ ساتھ ان کے اندازِ فکر میں معروضیت ہوتی ہے ۔ وہ کسی نظم کی تحلیل میں اس کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں ۔ ان کی مزاجی کیفیت اور جذبات سے شاعر کی زندگی اور جذبات کا پوری طرح امتزاج ہو جاتا ہے اور اس تمام عمل میں وہ شاعر کی روح پیش کر دیتے ہیں اور عطر کھینچ لیتے ہیں ۔ اس کلچر اور روحِ عصر کو سامنے لے آتے ہیں جس میں شاعر نے سانس لی تھی اور زندگی کو رنگ و روغن بخشا تھا ۔ لیکن اس ساری کارروائی میں معروضیت اور ذوق پرستی دونوں کے امتزاج سے نہایت دل کش عبارت جنم لیتی ہے ۔ یہ گنگا جمنی انداز ان کی تخلیقی تنقید کی روح ہے ۔ طٰہ حسین کہتے ہیں کہ ذوق فہم کا نام نہیں ہے فہم ایک شئے ہے اور ذوق دوسری شئے ۔ اس لیے کہ ہم بہت سی چیزیں سمجھتے ہیں مگر ان سے لطف نہیں لے سکتے ، ان سے لذت حاصل نہیں کر سکتے ۔ اسی طرح ہم بعض چیزوں سے تسکینِ ذوق حاصل کرتے ہیں مگر ان کو سمجھتے نہیں ۔ اس مسئلے کو ثابت کرنا کچھ مشکل نہیں ۔ مثال کے لیے موسیقی کو لے لیجیے ۔ کیا جو لوگ موسیقی سے لطف لیتے ہیں تسکینِ ذوق حاصل کرتے ہیں ، ان پر اہتزاز کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ، کیا وہ سب موسیقی کو سمجھتے ہیں ؟ دوسرے الفاظ میں عقلی فہم ذوق کی اساس نہیں ہے ۔ ذوق شخصیت کی قوت و ضعف سے متعلق ہے ۔ پر ذوق کا تعلق اپنے زمانے کے اصول ، عوامل اور مقامی واقعات اور روحِ عصر سے بھی ہے ۔ علاوہ ازیں شخصی ذوق بھی اپنا اثر ڈالتا ہے ۔ ذوق ، عقلِ خالص ہے اور نہ شعورِ خالص وہ ذوقِ عام اور ذوقِ خاص کے امتزاج کے ذریعے وجود میں آتا ہے یعنی احوال و ظروف سے متاثر ہو کر پوری قوم کا ذوقِ عام بنتا ہے پھر اس پر فن کار کے اپنے ذاتی ذوق کا اثر منعکس ہوتا ہے جو مخصوص معاشرے اور مخصوص احوال سے مستعار ہوتا ہے ۔ یعنی ذوقِ عام اور ذوقِ خاص دونوں میں اشتراک مذکورہ بالا وجوہ سے پیدا ہوتا ہے ۔ طٰہ حسین حسنِ ذوق سے اس معاشرے تک پہنچ جاتے ہیں جس میں شاعر نے قصیدے کہے ۔ وہ ذوق کے ذریعے سے عناصرِ جمال کی تلاش کرتے ہیں ۔ جب وہ کلاسیکی نظم کا مطالعہ کرتے ہیں تو ذوقِ عام اس دور کا تلاش کرتے ہیں ۔ پھر اس فضا میں اس دور کو مخاطب کرتے ہیں اور اپنے ذوق سے روحِ عصر تک پہنچ جاتے ہیں ۔ وہ ان تمام نکات کو واضح کرتے چلے جاتے ہیں جہاں فنی حسن نظر آتا ہے ۔ وہ قاری کے دل میں جگہ بنانے کا فن جانتے ہیں وہ اپنے ذوق میں قاری کو شریک بنا لیتے ہیں ۔ وہ حسنِ ذوق کی کائنات بناتے ہیں اور ذوقِ جمالیات کے جلوے دکھاتے ہیں ۔

ان کا ذوقی اسلوب دراصل نصوصِ (متون) ادب کی تحلیل شعری میں واضح ہوتا ہے ۔ وہ اس تہذیب و ثقافت کو زندہ کر دیتے ہیں جس میں شعر کہا گیا تھا ۔ مثلاً شعرِ جاہلی کا مطالعہ مخصوص اشعار کی تفسیر و تحلیل نہیں ہے بلکہ وہ ادبی و معروضی تحریک ہے جو طٰہ حسین نے عربی ادب میں شروع کی ہے ۔ وہ ان قصائد کی نسبت کو صحیح تصور نہیں کرتے مگر ان کا مطالعہ فہم اور بصیرت سے کرتے ہیں ، اپنے ذوق سے قدیم اقدار کو جدید روشنی میں دیکھتے ہیں ، ہمارے سامنے نئے آفاق پیش کرتے ہیں اور شاعر کا پیغام جدید زبان میں ہم کو سناتے ہیں ۔ وہ جو ہر معنی پیش کرتے ہیں ۔ وہ فنی عظمت کی گرہ کشائی کرتے ہیں ایسے حسین اسلوب میں جہاں ستاروں کی ٹھنڈی روشنی ہے اور ذوقِ جمال کی چاندنی پھیلی ہے ۔ وہ تشبیہ ، استعارہ ، صنائع بدائع اور دوسرے نحوی ، لغوی اور علم بیان کے محاسن کا ذکر نہیں کرتے یعنی صناعتِ فنی سے تعرض کرتے ہیں وہ معنوی حسن ، جمالیاتی احساس اور روحِ عصر کو تلاش کرتے ہیں ، ذوقِ جمال سے لذت کا احساس دلاتے ہیں اور کلاسیکی شاعری کا رشتہ ہمارے ذوق سے قائم کرتے ہیں ۔ ہر چند کہ ان کا تنقیدی رجحان تاثراتی ہے مگر ان کے یہاں بہت سے

رجحانات کا عکس ملتا ہے جو دورِ جدید کے ترجمان ہیں ۔ طہ حسین کے تنقیدی ادب میں ابدیت کی وہ روح پوشیدہ ہے جو انسانی طبقات کا سرمایہ ہے جو ہر دور میں اور ہر نسل میں پائی جاتی ہے ۔ وہ ہر دور میں اسی دور کی مناسبت سے ادب کی تحلیل پیش کرتے ہیں اور معاشرے سے اس کا رشتہ قائم کرتے ہیں جس میں ابدیت کی جلوت گری ہے ۔

ان کا مطالعہ شاعر کی فطرت، نفسیات، معاشرے اور احوال کے پس منظر میں ہوتا ہے پھر وہ ان کلیات کا انطباق اس کی نظم پر کرتے ہیں ۔ (نظم کو عربی میں قصیدہ کہا جاتا ہے) اس طرح جدید نظریات کو بھی وہ قدیم ادب کے سمجھنے میں کام میں لاتے ہیں ۔ وہ قصیدے کے تمام اجزا کا تعین کرتے ہیں پھر ان کا الگ الگ مفصل مطالعہ کرتے ہیں اور اس طرح شاعر کو زندہ کرکے آپ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ شاعر کبھی ٹوٹے ہوئے کھنڈر پر کھڑا ماضی کی دل کش کہانی میں حسرت و عبرت کی داستان بن گیا ہے ۔ کبھی وہ اپنی اونٹنی پر سوار پہاڑوں، وادیوں اور دشوار راستوں سے گزر رہا ہے، کبھی جنگلی گدھی کو مخاطب کرتا ہے ۔ کبھی ہرن کی توصیف میں حسنِ بیان کے جلوے دکھاتا ہے ۔ کبھی شتر مرغ سے تعرض کرتا ہے کبھی اپنی بہادری کی داستان سناتا ہے، کبھی اپنی آبائی مہمان نوازی اور سخاوت کے قصے بیان کرتا ہے، کہانی سناتا ہے کبھی جنگ کے نقشے دکھاتا ہے اور کبھی اپنی محبوبہ سے سرشارِ محبت نظر آتا ہے اور کبھی اپنا بیانِ حسنِ طبیعت کرتا نظر آتا ہے ۔ مگر ان سارے مراحل میں حسنِ ذوق، اعلیٰ فنی اندازِ نظر، تشبیہہ و استعارے کی رعنائی، زبان و بیان کی دل کشی اور قوس قزح جیسی رنگینی کو طہ حسین اس طرح ہمارے سامنے لاتے ہیں جیسے گلاب کی پنکھڑی جس میں یہ کہنا مشکل ہے کہ کہاں رنگ ہلکا ہے اور کہاں سے شوخی شروع ہوتی ہے ۔ وہ صنائع و بدائع کے حسن کے بیان سے اکثر اعراض کرتے ہیں ۔ وہ حسنِ معنیٰ کے قائل ہیں مگر ذوقِ جمال سے بھی ان کا دامن مالا مال ہے ۔ ان کی تنقید اس شہد کی مکھی جیسی ہے جو رنگ برنگ کے پھولوں سے رس چوس کر شہد تیار کرتی ہے ۔

یہاں یہ بیان کرنا نہایت ضروری ہے کہ طہ حسین نے تنقید میں مکالمے کو داخل کر دیا ہے ۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کے ساتھ ان کا ایک رفیق بھی ہے اور اس کا ذکر صاحبنا (ہمارے ساتھی) کے نام سے کرتے ہیں ۔ وہ ساتھی نہایت باذوق اور صاحبِ نظر ہے وہ تنقیدی نقطے ابھارتا ہے اور طہ حسین کی تشریح تحلیل اور تفسیر پر تعلیق کرتا ہے ۔ یا کبھی وہ کسی جمالیاتی پہلو کی طرف طہ حسین کی توجہ دلاتا ہے جس سے وہ غافل تھے جس سے شاعر کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ صرف ایک دل کش، دل چسپ حسنِ بیان ہے اور حسنِ تنقید ورنہ وہ رفیق بھی وہ خود ہیں ۔

طہ حسین کے اسلوب میں دو عیب ہیں ایک تو وہ طوالت پسند ہیں بڑی طویل عبارتیں لکھتے ہیں مگر اس کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں بانٹ دیتے ہیں ۔ کافی عبارت پڑھ لینے کے بعد اصل مقصد اور فوائے کلام سمجھ میں آتا ہے ۔ یعنی ان کی عبارت اور ان کے اسلوب میں اطناب کا عیب ہے ۔ ایجاز پر وہ بالکل قادر نہیں اور مساوات کی صفت سے بھی وہ عاری ہیں ۔ مگر حسین و جمیل اسلوب نے اس عیب پر پردہ ڈال دیا ہے ۔

دوسرا عیب حسنِ بیانِ طبیعت ہے ۔ اپنا ذکر بہت کرتے ہیں اور اپنا بیان اور اپنے نفس کی داستان خوب پھیلاتے ہیں ۔ یہ بھی تطویل، حشو اور اطناب کی ایک قسم ہے ۔ لیکن ان کے اسلوب میں ایک خوبی قابلِ ذکر ہے وہ ہے صلات کا فنی استعمال ۔ وہ اسلوب دراصل صلات نگاری ہے وہ صلہ کا استعمال نہایت دل چسپی، فن کاری اور مہارت سے کرتے ہیں ۔ مثلاً لها، عنها، علیها، فیها ۔ یہ سب صلے Prepositions ہیں اور ان سے انھوں نے ایک بانکپن پیدا کر دیا ہے ۔

(باقی ص ۳۲ پر)

ڈاکٹر امتیاز احمد

شہریار کی شاعری ـــ ایک مطالعہ

۱۹۶۰ء کے بعد کے شعرا میں شہریار کے شعری امتیازات کے تعین کی کوشش کی جائے تو کلاسیکیت سے گہرے لگاؤ، دھیمے لب و لہجے، کچھ نہ کہہ دینے کے انداز، سماجی اقدار کے ایک واضح احساس، ان پر اصرار، ایک مخصوص استعاراتی نظام اور اس استعاراتی نظام میں جذبے کے نمایاں رول کے باعث وہ اپنے دوسرے ہم عصروں سے مختلف اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کے ابتدائی مجموعوں کے یہ اشعار پڑھیے:

بہانہ مل گیا اس کو ترے تغافل کا — وگر نہ دل کو تو ہونا تھا بدگماں یوں بھی

ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی — وہ زود پشیمان، پشیمان سا کیوں ہے

خوب دنیا ہے کہ سورج سے رقابت تھی جنھیں — ان کو حاصل کسی دیوار کا سایہ نہ ہوا

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ اشعار شہریار سے بہت پہلے کے کسی کلاسیکل شاعر یا شاعروں کے ہیں جو غلطی سے شہریار کے مجموعے میں آگئے ہیں یا ان شعرا کی روح شہریار کے اندر حلول کر گئی ہے۔ ورنہ ایک ایسا شاعر جس نے اور جس کی نسل کے دوسرے شعرا نے کلاسیکی شعریات کی بازیافت کے باوجود کلاسیکی رویے کا ایک طرح سے مذاق اڑانے کی کوشش کی ہو اس سے اس طرح کے اشعار کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ کلاسیکی رویے پر طنز کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ اشعار بھی دیکھیے:

مرکزِ دیدہ و دل میرا تصور تھا کبھی — آج اس بات پہ کتنی ہنسی آتی ہے ہمیں

افتخار عارف کے یہاں بھی یہی انداز ہے:

تجھ سے بچھڑتے وقت میں رویا تھا خوب سا — یہ بات یاد آئی تو برسوں ہنسا کیے

ان سب کے باوجود شہریار کے بعض شعروں پر کلاسیک کا گمان ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے بعض اشعار واقعی کلاسیکی ہو گئے ہیں۔

ہم نے خود اپنی رات کو اتنا طویل کر لیا — ورنہ ہمارے شہر میں جینے کا ڈھب کچھ اور ہے

سچ خود سے بھی خلوق نہیں بولتی یاں کی — اے اہلِ جنوں تم یہاں بے کار میں آئے

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے — ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے

یہ اور اس طرح کے دوسرے اشعار ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن گئے ہیں اور مختلف اوقات میں Crises سے دوچار ہوتے ہوئے اس طرح یاد آتے ہیں کہ ہمارے اور ہم جیسے اور بہت سے دوسروں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ مثلاً اگر شہریار کی اسی غزل کا مطالعہ کریں جس کی ردیف کچھ کم ہے، ہے تو اس خوبی کا بہ خوبی اندازہ ہو جائے گا:

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے — ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے — اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے
بچھڑے لوگوں سے ملاقات کبھی پھر ہوگی — دل میں امید تو کافی ہے یقیں کچھ کم ہے
اب جدھر دیکھیے لگتا ہے کہ اس دنیا میں — کہیں کچھ چیز زیادہ ہے کہیں کچھ کم ہے
آج بھی ہے تری دوری ہی اداسی کا سبب — یہ الگ بات کہ پہلی سی نہیں کچھ کم ہے

توقعات کے اس سلسلے کا تعلق خواہشوں اور آرزوؤں کے اس خاندان سے ہے۔ جس کی داستان شہریار کے یہاں آنکھ اور خواب استعاروں کے ذریعے سامنے آئی ہے۔ اور یہ استعارے ایک حد تک شہریار کی شاعری کی پہچان بن گئے ہیں۔

(۲)

خواب کا لفظ اردو میں نیند کے لیے، حقیقت کے برعکس حالت کے لیے ہوتا ہے، خواہش، تمنا اور آرزو کے لیے اور اپنے م[illegible] کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس اعتبار سے خواب دیکھنا، خواب ہونا، خواب کی دنیا میں جینا، خواب و خیال کی دنیا میں جینا، بے خو[illegible] ہونا، یا بے خوابی کا شکار ہونا وغیرہ محاورے بہ کثرت استعمال ہوتے رہے ہیں۔ شہریار نے اس سب کو نئے سرے سے استعاراتی [illegible] استعمال کیا اور زبان کے جامد محاوروں سے نکال کر انھیں استعاراتی پیکروں کی شکل دی۔ خواب کا در بند ہے، کے بعد کی ایک غزل ہے:

ہر خواب کے مکاں کو مسمار کردیا ہے — بہتر دنوں کا آنا دشوار کردیا ہے

اس میں "ہر" کے ذریعے شاعر نے مختلف قسم کے خوابوں کی طرف جو اشارہ کیا ہے اور دوسرے مصرع میں ان خوابوں کے ذریعے دا[illegible] میں رنگ آمیزی اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کے جس تصور کو پیش کیا ہے وہی ہر خواب کے پیچھے کارفرما ہوتا ہے۔ اکثر یہ خواب پورے نہیں ہوتے اور شاعر کو شکستِ خواب کا منظر دیکھنا پڑتا ہے۔ نظم "خواب کا در بند ہے" کے یہ مصرعے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

میرے لیے رات نے
آج فراہم کیا
ایک نیا مرحلہ

نیندوں سے خالی کیا
اشکوں سے پھر بھر دیا
کاسہ مری آنکھ کا
اور کہا کان میں

میں نے ہر ایک جرم سے

کو بری کردیا
سانے سدا کے لیے
کو رہا کردیا

جدھر چاہو تم
کہ سو جاؤ تم
خواب کا در بند ہے

خاص بات یہ ہے کہ تمام قیدوں سے رہائی اور تمام جرموں سے بری ہوجانے کے باوجود اگر انسان خواب کی دولت سے محروم ہے اس کی زندگی بے معنی اور بے مصرف ہے کہ خواب ہی انسان کو متحرک رکھتا اور اس کے اندر زندہ رہنے کی آرزو پیدا کرتا ہے۔ جہاں خواب تخلیقیت کا استعارہ بن جاتا ہے اور رات شہریار کے یہاں رات کے استعارے سے مختلف رول ادا کرتی ہے۔ عام طور سے شہریار کے یہاں رات خواب کو جنم دینے والے وجود کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔ لیکن اس کا ایک اور تصور تاریکی اور ظلمت کا بھی ہے جس سے بدی کا تصور وابستہ ہے۔ اسی لیے رات کو جنم دینے اور چھپانے والے کردار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں اس کی وہی نوعیت ہے۔ آنکھوں کا خواب سے خالی ہونا سکون و اطمینان کے ختم ہونے کا اشارہ ہے اور اس کا اشکوں سے بھرنا دشوار، پریشانی اور کرب کو سامنے لاتا ہے۔

شہریار کے یہاں خواب کے اس استعارے کو داستانوں کے اس خواب سے بھی جوڑا جا سکتا ہے جس میں شہزادہ کسی پری کو دیکھتا اور اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ مال و دولت دنیا سے دست بردار ہو کر صحرا صحرا مارا مارا پھرتا ہے مختلف قسم کے دشوار گزار حالات سے گزرتا ہے۔ اور بالآخر اس پری تمثال کو حاصل کرلیتا ہے۔ اس پری تمثال کو ہم ترقی پسندوں کے اس پری جمال میں بھی تلاش کر سکتے ہیں جس کے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں دار کی خشک ٹہنی تک بھی پہنچا جا سکتا ہے اور جس کے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں نیم تاریک راہوں میں موت سے آنکھیں چار کی جا سکتی ہیں۔ یعنی جب فیض یہ کہتے ہیں:

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

یا یہ کہ:

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

تو وہ بھی ایک خواب ہی کی بات کرتے ہیں۔ لیکن خواب کی بات کرنا اور خواب دیکھنا ایک الگ چیز ہے اور خواب کا استعارہ استعمال کرنا الگ۔ ترقی پسند دوستوں اور بزرگوں نے بلاشبہ ایک بہتر مستقبل کا خواب دیکھا۔ اس خواب کے لیے جیے، مرے ...

قربانیاں دیں لیکن اپنے اس خواب کو استعارہ نہیں بنا سکے یہ کام شہریار نے کیا۔ ان کے یہ اشعار دیکھیے:

قافلے نیندوں کے آئے ہیں انھیں ٹھیرالو
ورنہ یہ دور بہت دور چلے جائیں گے

اٹھو نیندوں سے آنکھوں کو جلائیں
چلو خوابوں کی پریوں کو پکاریں

نہ کوئی کھڑکی نہ دروازہ واپسی کے لیے
مکانِ خواب میں جانے کے سیکڑوں در ہیں

آنکھوں کو سب کی نیند بھی دی خواب بھی دیے
ہم کو شمار کرتی رہی دشمنوں میں رات

سورج کا سفر ختم ہوا رات نہ آئی
حصے میں میرے خوابوں کی سوغات نہ آئی

ہم پڑھ رہے تھے خواب کے بندوں کو جوڑ کے
آندھی نے یہ طلسم بھی رکھ ڈالا توڑ کے

کچھ بھی نہیں جو خواب کی صورت دکھائی دے
کوئی نہیں جو ہم کو جگائے جھنجھوڑ کے

آندھیاں آئیں تو سب لوگوں کو معلوم ہوا
پرچم خواب زمانے میں نگوں کتنا ہے

یہی ہے وقت کے خوابوں کے باد باں کھولو
کہیں نہ پھر سے ندی آنسوؤں کی گھٹ جائے

نظموں میں، خواب والی آنکھیں، ایک نظم، خوابوں کا بھکاری اور سفر کی ایک منزل وغیرہ خاص طور سے اہمیت رکھتی ہیں۔ سفر کی ایک منزل کے یہ مصرعے دیکھیے:

ہماری کشتی کے باد باں سے
ہوا الجھتی ہے پوچھتی ہے
کہ تم نے کشتی کے سب نشانات کیوں مٹائے
سمندروں کے سفر میں جی کا زیاں بہت ہے
سمندروں میں سفر کی منزل فقط سمندر
سمندروں میں سفر کا حاصل فقط سمندر
چراغ خوابوں کے کیوں بجھائے
ہماری کشتی کے باد باں سے
ہوا الجھتی ہے پوچھتی ہے
کہ تم نے کشتی کے سب نشانات کیوں مٹائے۔

سمندر جو وقت کا استعارہ ہے...... مسلسل، مستقل اور لازوال وقت...... بے پناہ، بے کراں اور لامتناہی وقت........ اس سمندر کی موجوں سے صرف دور کسی کنارے موجود خوابوں کے ذریعے ہی نکلا جاسکتا ہے کہ وقت پر فتح پانا سب کے بس کی بات نہیں یا یہ کسی کے بس کی بات نہیں........ وہ تو صرف مردِ خدا کا عمل ہوتا ہے جو عشق سے صاحبِ فروغ ہو کر اس کی موجوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ کشتی جو انسانی وجود کا استعارہ ہے، اس فانی جسم کا استعارہ ہے جو مٹی سے بنا ہے اور جسے مٹی میں مل جانا ہے۔ اس کے اب بھی اسی خشکی کے ہیں اور حقیقتیں بھی اسی خشکی کی ہیں۔ خوابوں کے ان چراغوں کو بجھا کر وہ بے سمت اور بے منزل ہو جاتا ہے..... ایک ایسا شخص جس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں کوئی حاصل نہیں، کوئی منزل نہیں۔ صرف مادی سطح پر زندگی گزار رہا ہے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب وہ خواب دیکھنا شروع کرتا ہے تو بے خوابی سے دوچار لوگوں کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے:

تمام خلقِ خدا دیکھ کے یہ حیراں ہے — کہ سارا شہر مرے خواب سے پریشاں ہے

خواب اور بے خوابی کی یہ کش مکش کبھی اسے اخترالایمان کا ایک لڑکا بنا دیتی ہے جو تند چشموں کے رواں پانی کی طرح آوارہ منش، آزاد او سیلانی ہے اور شاید اس کی وجہ سے ایک ایسی سحر کی آرزو کرتا ہے جو کبھی طلوع نہیں ہوتی اور اس آرزو میں بار بار دامن شب تھامنے مجبور ہو جاتا ہے۔ شہریار کے یہاں دامن تھامنے کا یہ تجربہ چادرِ شب سر پہ دیکھنے کے ذریعے بیان ہوا ہے:

سرخی ذرا سی خواب کے خنجر پہ دیکھ کر — سب رو رہے ہیں چادرِ شب سر پہ دیکھ کر
کہاں پہ دفن یہ پرچھائیاں کریں یارو — جو تاب لا نہ سکیں روشنی کے خنجر کی

رات کے اندھیرے کو اگر کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے کے اندھیرے اور سکوت سے ملایا جائے تو یہ صبح کی دلکشی کی جنم داتا کے طو پر سامنے آتی ہے اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے خواب کے استعارے سے مل کر یہ غنودگی اور نیند کی کیفیت سے دوچار ہونے کے وقت کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ لیکن اس کا دوسرا روپ خواب کے ساتھ وابستہ خوش گواری کے تصور کے برعکس ڈر اور خوف کے تصور بھی یہ ڈر اور خوف خواب کے لیے خنجر بھی بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس صورت دوسرے شعر میں سامنے آتی ہے جہاں خواب کو ختم کرنے یا اس کا خون کرنے کے اسلحہ کے طور پر روشنی کا استعمال ہوا ہے لیکن دونوں جگہ روشنی کے خنجر اور خواب کے خنجر میں استعارہ د استعارہ کی جو کیفیت ملتی ہے اور جس طرح اسے استعاراتی پیکر کی شکل دی گئی ہے وہ شہریار کا کارنامہ ہے۔

آنکھ اور خواب کے استعاروں کے علاوہ شہریار کے استعاروں کا ایک دوسرا گروپ ندی، چشمہ، سمندر، موج، ساحل، کشتی او اس کے تلازمات و انسلاکات پر مشتمل ہے۔ اس گروپ میں بنیادی استعارہ پانی اور پیاس ہے:

پانی کی ایک بوند سے پیاس کی ابتدا کرو — چشمے پہ جب رسائی ہو کہنا طلب کچھ اور ہے
میری بانہوں میں مچلتا ہے سمندر رات بھر — صبح ہوتے ہی ترس جاتا ہوں قطرے کے لیے
دیکھ لے تو خود سمندر آج ساکت ہے بہت — پیاس کا تیری تعلق تھا نہ کیا پانی کے ساتھ

ان اشعار میں پیاس، اس بنیادی جنسی اور جبلی خواہش کا استعارہ بن جاتا ہے جو فرائڈ کے مطابق ہمارے بیش تر تہذیبی کارناموں کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔ یوں مذہب، تہذیب اور جنس کا مرکب ہی انسان کی تخلیقی قوت کا محرک ثابت ہوتا ہے۔ مذہب سے مراد مذہبی عبادات سے نہیں بلکہ فن کار کے اندر اترے ہوئے مذہبی شعور اور احساس سے ہے۔ یہی حال تہذیب اور جنسوں کا بھی ہے۔ یعنی اگ جنسی جذبہ کو اپنی تمام شدت کے ساتھ تسکین ہو جائے اور تشنگی کا احساس ہی باقی نہ رہے۔ اس تشنگی سے پیدا کرب، پریشانی اور بے چینی نہ ہو تو اس کے ارتفاع کا بھی سوال نہیں اٹھتا۔ عام طور سے تو جنسی محرومی یا فاقہ کشی ہی کچھ کر گزرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر اس ارتفاع ہو جاتا ہے تو تخلیق کے شہ پارے وجود میں آتے ہیں بہ صورتِ دیگر یہ تخریب کی مختلف شکلوں میں سامنے آتا ہے۔ شہریار ہی کا شع ہے:

شدید پیاس تھی پھر بھی چھوا نہ پانی کو — میں دیکھتا رہا دریا تری روانی کو

یہاں دریا، سمندر اور چشمہ تینوں اپنی روانی، چمک اور اپج کی وجہ سے پیاس کے استعارے سے جڑ کر تسکین پہنچانے والے کی حیثیت سے اس توہمی وجود کا استعارہ بن جاتے ہیں جو اپنے مخالف وجود کے بغیر اور جس کا مخالف وجود اس کے بغیر نامکمل رہتا ہے:

پیاسا ہوں مقدر میں بس ایک ہنر آیا   دریا تری موجوں کی انگڑائیاں گنتا ہوں
رشتہ ہر ایک ختم کیا پانی سے پیاس کا ہوا   تکتا ہوں کتنی دیر سے دریا کو میں قریب سے

مذکورہ ایک ہنر، کی تعیین پر گفتگو کرنے کے بجائے ان استعاروں کی ہی معنویت پر کچھ اور گفتگو شاید زیادہ مناسب ہو کہ شہریار کے یہاں یہ استعارے خاصے طاقت ور لیکن سیال ہیں۔ مثلاً "خواب کا در بند ہے" کے بعد کی ایک نظم کا عنوان ہے "جسم کی کشتی میں آ........." اس کے آخری مصرے یوں ہیں:

مری پسلی سے پیدا ہو
وہی گندم کی بو لے کر
زمین اور آسماں کی وسعتیں
مجھ میں سمٹ آئیں
الوہی لذتِ نایاب سے سرشار کر مجھ کو
میں اک پیاسا سمندر ہوں
تو اپنے جسم کی کشتی میں آ
اور پار کر مجھ کو

جسم کے لیے کشتی اور خود اپنے لیے سمندر کا استعارہ اور اس کے ساتھ پیاسا کی صفت بہت اہم ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ "پیاسا سمندر" کی ترکیب خود اپنے اندر Paradox یا قولِ محال کی کیفیت رکھتی ہے۔ لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ سمندر کے جس استعارے کو فن کار نے اس سے پہلے پیاس دور کرنے والے وجود کی حیثیت سے استعمال کیا تھا۔ اسی کو خود اس کے برخلاف استعمال کر کے بہ ظاہر وہ ایک قولِ محال سے دوچار ہو رہا ہے۔ لیکن غور سے دیکھیں تو در حقیقت یہ ہے نہیں۔ یہ دراصل وہ رویہ ہے جو مرد اور عورت کو ایک ہی چکی کے دو پاٹ سمجھتا اور کسی ایک کو دوسرے سے کم تر یا برتر ماننے سے انکار کرتا ہے۔ اس طرح کے رویے جو بعض شاعرات کے یہاں سامنے آتے ہیں:

کسی کے پیاس کو شبنم بجھا سکی نہ کبھی   یہ بات کہہ کے مجھے شرم سار اس نے کیا

اس نقطہء نظر کے زائیدہ ہیں کہ جنسی اور جسمانی خواہش صرف مرد کے کردار کا حصہ ہے۔ اسی سبب سے معاشرے میں عام طور سے مرد / مردوں کی ہوس کا شکار جیسے فقرے استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی عورت کی اپنی کوئی جنسی یا جبلی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ وہ صرف مرد کی خواہش کو تسکین پہنچانے یا اس کی ہوس پوری کرنے کے آلے کے طور پر استعمال کی جاتی ہے جب کہ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ جنسی عمل میں دونوں پارٹنر ایک دوسرے کی جنسی خواہشات، ایک دوسرے کی قوت حیات Erose اور خواہشِ مرگ Thantose کی تسکین کر رہے، ایک دوسرے کو Sadistic یا Masochistic مسرت عطا کر رہے ہیں۔ اس لیے اگر ایک طرف عورت، مرد کے لیے دریا، سمندر یا چشمے کی حیثیت رکھتی ہے تو دوسری طرف مرد بھی عورت کے لیے یہی حیثیت رکھتا ہے۔ بات یہیں ختم ہو جاتی لیکن پسلی سے پیدا ہونے اور گندم کی بو نے اس میں وہ اساطیری جہت بھی پیدا کر دی ہے جو ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ ہے اور یوں فن کار کے تہذیبی پس منظر کو سامنے لاتی ہے۔ مزید یہ کہ یہ تہذیبی پس منظر اس مذہبی روایت کا عطا کردہ ہے جس سے

عملی سطح پر شہریار کو بہت زیادہ سروکار نہیں۔ یعنی مذہب، تہذیب اور جنس تینوں کا ایک خوش گوار امتزاج اس نظم میں موجود ہے جو شہریار کی شاعری کی قوت ہے۔ منقولہ اقتباس میں موجود کشتی کا استعارہ جسم کے لیے استعمال ہوا ہے جو شاعر کے الفاظ میں الوہی لذت نایاب سے سرشار کرنے کا ذریعہ بنتا ہے یہی کشتی کبھی رات کا بھی استعارہ بن جاتی ہے اور الوہی لذت نایاب سے سرشار کرنے کا ذریعہ بھی:

شام ڈھلتے ہی مری آنکھوں نے
اک سمندر کے خد و خال گڑھے
رات کی کشتی اتاری اس میں
اک کنارے پہ تجھے بٹھلایا
دوسرے پہ مجھے زنجیر کیا
باوجود اس کے مرے ہونٹوں نے
جسم پر تیرے بہت دیر تلک
حرفِ ناگفتنی تحریر کیا۔ (حرفِ ناگفتنی)

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہاں بھی سمندر جسم کا استعارہ ہے؟ شاید نہیں۔ یہاں سمندر اس بے کراں وقت کا استعارہ ہے جس کے دو کناروں میں سے ایک پر شاعر نے اپنے وجود کو اور دوسرے پر اپنے ساتھی کے وجود کو بٹھا کر رات کی کشتی کے ذریعے اس کے بعد کو پاٹنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے اس دوری کو پاٹنے کا عمل جسم پر حرف ناگفتنی تحریر کرنے کے عمل سے بہتر طریقے سے بیان کرنا مشکل ہے اور حرفِ ناگفتنی تحریر کرنے کے عمل سے بہتر طریقے سے بیان کرنا مشکل ہے اور حرف ناگفتنی کے ذریعے شاعر نے وہ ساری باتیں کہہ دی ہیں جن کا اس نظم میں بیان کیا جاسکتا تھا۔ یہاں بھی اسی الوہی لذت نایاب سے سرشار کرنے کے لمحے کا ذکر ہے لیکن ذرا مختلف انداز میں...... اور اس مختلف انداز کی خوبی یہ ہے کہ جنسی عمل کی شدت کو اس لطافت سے بیان کرتا ہے کہ اس میں جنسی عمل کے دوران آخری حد پر پہنچنے کی کیفیت میں دونوں کردار جس طرح اپنے آپ کو ایک طرح سے عرفان کی منزل پر پہنچا ہوا محسوس کرتے، ایک دوسرے کے الگ الگ وجود کو بھول کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے، اپنے اردگرد کی ساری دنیا کو فراموش کر دیتے اور وقت کی گرفت سے باہر نکل آتے ہیں اسے بھی بیان کر دیا اور یہی چیز اسے اہم بناتی ہے۔

شہریار کی ایک اور نظم جو "نیند کی کرچیں" میں شامل ہے اس کا عنوان "کچے رستوں..... " ہے۔ اس نظم میں شہریار نے کچے رستوں اور پکی سڑکوں کے استعارے کے ذریعے دیہات اور شہر کے فرق کو واضح کیا ہے:

جو کچے رستوں سے پکی سڑکوں کا رخ کیا تھا
کھڑاؤں اپنی اتار دیتے
بدن کو کپڑوں سے ڈھانپ لیتے
تمھاری سیراب پنڈلیوں پر نشان جتنے ہیں کہہ رہے ہیں
کہ تم نے راتوں کو رات سمجھا

ہر ایک موسم میں اس کی نسبت سے پھل اگائے
بدن ضرورت غذا ہمیشہ تمھیں ملی ہے
نہ جانے افتاد کیا پڑی ہے ۔
جو کچے رستوں سے پکی سڑکوں کا رخ کیا ہے ۔

لچا راستہ اس سیدھی سادی، چھل کپٹ سے دور اور فطرت سے نزدیک زندگی کا استعارہ ہے جسے ہم دیہاتی زندگی کے نام سے یاد کرتے یں اور پکی سڑک فطرت سے دور اس آلودہ، مصروف اور پریشان زندگی کا استعارہ ہے جسے ہم شہری زندگی کہتے ہیں ۔ یہ دونوں ایک وسرے کا الٹ ہونے کے ساتھ بعد المشرقین بھی رکھتے ہیں ۔ خاص بات یہ ہے کہ نظم میں فن کار کا رویہ اس سیدھی سادی دیہاتی زندگی ی طرف جسے اس نے کچے راستوں اور کھڑاؤں کے ذریعے پیش کیا ہے، جذباتی اور ہمدردانہ ہے ۔ اس کے برعکس شہرو تہذیب کے لیے ہ اس طرح کا کوئی لگاؤ جذباتی پن یا ہمدردی محسوس نہیں کرتا اور یہی چیز شہریار کی شاعری کو اہم بناتی ہے ۔ اپنے اس بنیادی کلچر سے ہری وابستگی جس میں اقدار و روایات کا ایک پورا نظام پایا جاتا ہے، شہریار کو ان کے دوسرے معاصرین سے مختلف اور ممتاز بناتی ہے ۔ پنے کلچر سے یہ وابستگی ہی ان سے اس طرح کی شعر کہلواتی ہے :

مانا کہ دوستوں کو نہیں دوستی کا پاس — لیکن یہ کیا کہ غیر کا احسان لیجیے

ری باتوں سے قطع نظر اگر اس نظم کی کہانی بنانے کی کوشش کی جائے تو کچھ یوں ہوگی کہ فطرت کی گود میں پلے بڑھے ایک دیہاتی کو جہ سے دیہات کو خیرباد کہنا پڑتا ہے ۔ پس منظر میں اس کرب کا پورا منظر موجود ہے جو اس دیہاتی کو اپنی زمین سے الگ ہونے کی ے ہو رہا ہوگا ۔ بہ ہر حال وہ دیہات تو چھوڑ دیتا ہے کہ ممکن ہے یہ اس کی معاشی مجبوری ہو یا سیاسی گرگوں کا کارنامہ لیکن اس ت سے وابستہ تہذیب سے وہ چھٹکارا نہیں حاصل کر پاتا ہے جس میں وہ پلا بڑھا ہے، جو اس کے خون میں رچا بسا ہوا ہے اور اس کی ت بن چکا ہے ۔ نظم میں اس کی شناخت لکڑی کی کھڑاؤں (جس کا کوئی تصور بھی آج کی نئی نسل کے ذہن میں نہیں ہوگا) ظاہری ب کی علامت بدن کو ڈھانپنے والے خوب صورت کپڑوں سے اپنے آپ کو کم سے کم آلودہ کرنا اور اسی سبب سے اس کی کھلی ہوئی ں پر نظر آرہے مختلف قسم کے نشانات اس کے محنتی جسم کو ظاہر کرتے ہیں کے ذریعے سامنے آتی ہے ۔ کہیں شہریار کے راستے میں سے اس کی ملاقات ہو جاتی ہے اور راوی جو شہری تہذیب میں پلا بڑھا ہوا شخص ہے لیکن اس کی بنیاد اسی دیہاتی تہذیب میں ہے مدردی اور محبت سے کہتا ہے کہ تم جہاں جا رہے ہو وہ تمھارے دیہاتوں جیسی بے ریا اور مخلص جگہ نہیں ہے، وہاں اندرون میں کے بجائے ظاہرداری پر اصرار کیا جاتا ہے ۔ اس لیے کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم اپنی کھڑاؤں اور لنگوٹ (یا جو کچھ بھی وہ پہنے ہوئے ہے) چھوڑ کر شہری تہذیب کی ملمع کاریوں کو اپنا لیتے کہ اس شہری تہذیب میں کامیابی کا یہی طریقہ ہے ۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ دیہاتی کردار اب دیتا ہے ۔ شاید وہ خاموش رہتا ہے یا مسکراتا ہے یا گردن ہلاتا ہوا چلا جاتا ہے جس میں اپنے دیہاتی پن پر اصرار بھی ہے اور بھی ۔ "نہ جانے افتاد کیا پڑی ہے" کہ مصرع اس تہذیب کے زوال کی نوحہ خوانی کرتا ہوا نظر آتا ہے جس سے وہ دیہاتی متعلق ہے ۔ ڑ کے پودوں کی طرح اپنے تہذیبی سوتوں سے کٹے ہوئے لوگوں کے درمیان اس طرح کی شاعری کر پانا شہریار ہی کا کارنامہ ہے جس منفرد اور یکتا ہیں ۔

ڈاکٹر حبیب نثار

"اردو میں سورداس کی رامائن و بھگوت گیتا"
(تعارف مخطوطہ)

سورداس ہندوستانی تہذیب کا ایک ممتاز اور متبرک نام ہے۔ سورداس کو عموماً ہندی / برج کا شاعر اور بھجن و پدنویس کہا جاتا ہے۔ سورداس کے بھجن آج بھی مشہور و مقبول ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اپنے گرو ولبھ آچاریہ کے آگے بھگوت گیتا شروع سے آخر تک گا کر سنایا کرتے تھے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ سورداس اپنے گرو کے آگے رامائن بھی سنایا کرتے تھے۔ جسے خود انھوں نے راگ / راگنی کے تحت موزوں و ترتیب دیا تھا۔ حالاں کہ تاریخ ادب اردو اور تاریخ ادب ہندی کی کسی تصنیف میں موسیقی کے راگ / راگنی کے تحت رامائن کے لکھے جانے کا تذکرہ نہیں ملتا بلکہ بھگوت گیتا ہی کے سلسلے میں اندراجات ملتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سورداس نے نہ صرف بھگوت گیتا کو اپنے بھجنوں کے پیکر میں ڈھالا ہے بلکہ رامائن کو بھی گل نغمہ کا نقش عطا کیا ہے۔

راقم الحروف کے اس خیال کا ماخذ ایک مخطوطہ ہے جس میں رامائن اور بھگوت گیتا کے تمام واقعات، کردار اور فلسفہ حیات کو راگ / راگنی کے تحت بطور بھجن لکھا گیا ہے۔ مخطوطہ پر "راگ بلاول" کا عنوان لکھا ہے۔ یہ نایاب مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ کے شعبہ مخطوطات کی زینت ہے جس کو فن موسیقی کے ضمن میں ۵۵ ہی نمبر پر درج کیا گیا ہے۔

"راگ بلاول" دراصل رامائن اور بھگوت گیتا کا مجموعہ ہے جس کو راگ / راگنی کے تحت بھجن کی صنف نغمہ میں سورداس نے موزوں کیا ہے۔ یہ مخطوطہ جملہ ۲۶۲ اوراق یعنی ۵۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ خط شکستہ نستعلیق ہے۔ کاغذ دیسی ہے۔ ہر صفحے پر تقریباً انیس سطریں ہیں بعض صفحات پر سطور کی تعداد کہیں کم اور کہیں زیادہ بھی ملتی ہے۔ اس مخطوطے میں تقریباً چھ سو سے آٹھ سو گیت موجود ہیں۔ گیتوں کی صحیح تعداد اس لیے نہیں بتائی جا سکتی کہ مخطوطہ ناقص الاوسط ہے یعنی درمیان مخطوطہ کے چند صفحات ضائع ہو گئے ہیں۔ (ا) مخطوطہ کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے۔

ہر ہر ہر	ہر ہر ہر
چرن کنول بندوں ہر ریا پائے	جاکی کرپا پنگ گر لنگیہ اندھی کون سب کچھ دریائے
ہر اسنہ کنک پن لولہ ایک جلے سر چھتر دہرائے	سورداس سوامی کرنامیہ بار بار بندون تہنہہ پائے

مخطوطہ زبان کے اعتبار سے گیارھویں صدی ہجری کا کہا جا سکتا ہے جیسا کہ فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ کے مرتب جناب مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے بھی اظہار کیا ہے لیکن اس مخطوطے کی کتابت ۲۳ شوال ۱۱۵۰ ہجری کو مکمل ہوئی ہے جو ترقیمے سے ظاہر ہوتی ہے۔ ترقیمہ اور اس سے قبل کا گیت / بھجن حسب ذیل ہے۔

ہر ہر ہی سمرن کرو	ہر چند مار بند اور مین دھر
جنجر جب پاہم رلج	ایک بار تج سبھا براج
حرب کے حرمینہ لیے آیو	جگ چھاو برہہ جیت

یہ تاریخ کاتب مخطوطہ ہی کے قلم سے لکھی ہوئی ہے لہٰذا یہ تاریخ کتابت مخطوطہ ہی سے متعلق ہے یہ تاریخ تصنیف نہیں ہو سکتی کہ سورداس گیارہویں صدی ہجری کے شاعر ہیں۔

راگ بلاول کے مخطوطے میں ورق ۱۱۱۹الف تک رامائن سے متعلق بھجن نقل کیے گئے ہیں۔ ہر بھجن کا عنوان سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ چند عنوانات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں جس سے مخطوطہ کے نفس مضمون پر روشنی پڑتی ہے۔

سری رام چندر اوتار برنن راگ کانڑا (۳) (کذا راگ کانڑا) جانکی بچن راگ مارو (۴)، ہنون بچن جانکی پرت راگ مارو (۵)، لچھمن سورچنا لورک راگ سارنگ (۶)، سیتا بچن سکھیہ پرت راگ سارنک (۷)، سری رام بچن جانکے پرت راگ کوری (۸)، (کذا گوری) راون بدھ لچھمن موچتا راک مارو (۹)۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے مخطوطہ کے ورق ۱۱۱۹الف پر رامائن ختم ہو جاتی ہے اور ورق ۱۱۱۹ب سے راگ بلاول، کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جو دراصل بھگوت گیتا کا بیان ہے۔ اس حصے میں سری کرشن کے بھجن جمع کیے گئے ہیں جو مضامین بھگوت گیتا پر مشتمل ہیں۔ چند عنوان ملاحظہ ہوں:

"کبنم اوہیای سری کشن کے جننے موہار برنن راگ سارنک" (۱۰) "پوتنا بچن کنس مون راک دہناسری (۱۱) "" سری کرشن کے رمس کا راک بلاول" (۱۲)

سورداس بنیادی طور پر کرشن بھگت تھے اور سری کرشن جی مہاراج کو وشنو کا اوتار سمجھا اور جانا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ وشنو بھگت رام کی بھگتی ضرور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورداس نے جو کہ کرشن بھگت مشہور ہیں، اسی نسبت و بھگتی کی بنا پر رامائن بھی موزوں کی ہے۔

مخطوطہ میں موجود ہر بھجن میں شاعر کا تخلص موجود ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"سورداس سوامی کرتا یہ مارنا" (۱۳) "سورداس تیوں ہنس کہہ کایو (کذا گایو) (۱۴) "" سورداس ماچت تیسیتی" (۱۵)

راگ بلاول کی زبان مخلوط ہے سنسکرت آمیز ہندی اردو اور فارسی سے مملو زبان ہے۔ مصنف فارسی سے بھی بخوبی واقف معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ قلم برداشتہ فارسی میں تعداد گیت لکھتا چلا گیا ہے۔ ذیل کی مثالوں میں فارسی کی گنتی کا بیان ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ "بست ہوم ادھیائے" یا "بست وچہارم ادھیائے" زبان کے سلسلے میں ایک مثال مزید دیکھیے:

پیہ کی سنگ کہلت ادھیک سرم بھیو اوری پاکو پیارے
اپنوں رنچر پی سکھودن سکھی ری اوچر بدن سرم کہہ کے داری
نرتت اولت کیسیتی انگ بہو کتیں ہستری الک باندھو سنوار
سہنو سور پیہ پیارے کو ملن جاہ نہ سہای تاہ وار دن واز۔" (۱۶)

یہاں اردو / ہندی کے ساتھ ساتھ برج کا اثر بھی نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ سورداس نے یہاں سور پیا تخلص باندھا ہے جو غالباً اس مخطوطے کے پہلے کہیں اور، اس طرح استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ راقم الحروف کی نظر سے اس مخطوطے کا کوئی دوسرا نسخہ نہیں گزرا اور اس مخطوطے کا علم بھی اہل ادب کو غالباً نہیں ہے۔

الحاصل سورداس متخلص بہ سورپیانے بھگوت گیتا کے ساتھ ساتھ رامائن منظوم بھی لکھی ہے جس کی زبان مخلوط ہے یعنی فارسی، سنسکرت، برج اور ہندی / اردو آمیز ہے لیکن رسم خط عربی / فارسی ہی ہے۔ اسی لیے اس مخطوطہ کو اردو سے متعلق کہا جائے گا اور اس طرح

یہ مخطوطہ کافی اہم قرار دیا جا سکتا ہے۔

دورِ حاضر میں لسانیات اور رسم الخط کے جھگڑے میں یہ مخطوطہ مشعل راہ بنتا ہے۔ اور اہلِ فکر و نظر کے لیے نئے افق مہیا کرتا ہے غور کیا جائے تو چند نکتے بے حد اہم معلوم ہوتے ہیں۔ (۱) بھگتی کال کرشن بھگت کوی / شاعر سورداس مشترکہ زبان یعنی اردو کا استعمال کرتا ہے۔ (۲) یہ زبان ذخیرہ الفاظ کی بنا پر اور رسم الخط کے لحاظ سے بھی اردو ہی کہی جائے گی۔

حوالے:

(۱) مثلاً ورق ۲۰ الف اور ورق ۹۲ ب کے بعد چند صفحات غائب ہیں۔ ملاحظہ ہو مخطوطہ "راگ بلاول" فن موسیقی مخزونہ سالار جنگ کتب خانہ۔ حیدر آباد

(۲) "راگ بلاول" ورق ۲۶۲ ب

(۳) ایضاً ورق ۶۹ الف۔

(۴) ایضاً ۷۹ الف۔

(۵) ایضاً ۷۹ ب۔

(۶) ایضاً ۸۵ ب۔

(۷) ایضاً ورق ۹۱ ب۔

(۸) ایضاً ورق ۹۳ الف

(۹) ایضاً ورق ۱۰۸ ب۔

(۱۰) ایضاً ورق ۱۱۶ ب۔

(۱۱) ایضاً ورق ۱۳۰ الف۔

(۱۲) ایضاً ورق ۱۴۴ ب۔

(۱۳) ایضاً ورق ۱۷۲ الف۔

(۱۴) ایضاً ورق ۹۲ الف۔

(۱۵) ایضاً ورق ۱۸۰ ب۔

(۱۶) ایضاً ورق ۱۹۶ ب تا ورق ۱۹۷ الف۔

(سلسلہ ص ۲۱)

طٰہٰ حسین خواہ قدیم شاعری کا مطالعہ کریں یا تخلیقی کام کریں جیسے کارواں، ناول یا تاریخ پر روشنی ڈالیں، ان کے اسلوب کی لطافت ہر جگہ ان کو امتیاز و افتخار عطا کرتی ہے۔ وہ فکر میں جدت اور نئے زاویہ نظر سے کام لیتے ہیں، گھسی پٹی راہ پر نہیں چلتے۔ نیا اندازِ نظر، نئے افکار اور تحلیل ان کی تنقید، تاریخ اور تخلیق میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ نظریات قائم کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ وہ قوتِ فکر رکھتے ہیں، وہ مطالعہ کر کے استنتاج کرتے ہیں اور فکر کے ذریعے ہم کو نئے آفاق دکھاتے ہیں۔ وہ فرانسیسی مفکر و فلسفی ڈیکارٹ کے پیرو ہیں جو فلسفہ شک کا قائل ہے۔ طٰہٰ حسین اس بنیاد پر مسلمہ ادبی حقائق پر اور تاریخی وقائع پر شک کی عمارت قائم کرتے ہیں۔ مگر شک کو کسی مسلمہ تاریخی حقیقت کے مقابلے میں ثابت کرنا آسان نہیں ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ شاعر متنبی نے کبھی دعوائے نبوت نہیں کیا حالاں کہ متنبی کے لفظی معنی ہیں بنا ہوا نبی۔ اس طرح وہ اسلامی تاریخ میں حضرت عثمان کی شہادت کے سلسلے میں عبداللہ بن سبا یہودی اور اس کی سازش اور فتنہ سبائی کا انکار کرتے ہیں۔ کبھی وہ کسی شاذ قول کو لے کر اس پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ عمر دسوقی نے صحیح لکھا ہے کہ طٰہٰ حسین کو شکوک ابھارنے میں کمال حاصل ہے مگر اپنے نظریات کو ثابت کرنے میں وہ معقول دلائل فراہم نہیں کرنے پاتے۔ یہی کمزوری ہے طٰہٰ حسین کی۔ بہر حال ان کی تحریریں معنوی عظمت اور فکر و نظر کی حامل ہیں اور وہ ہم کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ یہ نظریاتی مفکرانہ انداز ان کے اسلوب اور ان کی تحریروں میں ہر جگہ موجود ہے اور ستارے کی طرح چمکتا ہے۔ دراصل اسلوب شخصیت سے قوی اور پُر عظمت ہوتا ہے۔ اگر شخصیت کمزور ہے تو اسلوب بھی کمزور ہوگا۔ طٰہٰ حسین کا اسلوب ذوقِ جمال کا حامل ہے اور فکری بلندی و اختراع کا۔ مگر وہ تہذیب کے حامل مستشرقین کے متبع ہیں اور اسلامی اندازِ فکر سے کہیں کہیں بغاوت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ بغاوت کبھی کبھی شدت اختیار کر لیتی ہے اور وہ حقائق کو توڑ مروڑ کر اپنے انداز سے دکھاتے ہیں۔

00 000 00

امجد حسین بٹالوی

مطا

دشت سوس

"جاوید نامہ" میں فلکِ مشتری پر جن تین ارواحِ جلیلہ سے علامہ اقبال کی ملاقات ہوتی ہے، ان میں ایک حلاج ہے۔ اقبال حلاج سے جو سوال کرتے ہیں وہ حلاج کے جواب سے زیادہ اہم اور دلچسپ ہے۔ وہ حلاج سے پوچھتے ہیں:

آشکارا بر تو پنہانِ وجود   باز گو آخر گناہِ تو چہ بود

یعنی تاریخ نے حلاج کے انجام کے بارے میں جو اسباب بیان کیے ہیں، اقبال نہ ان سے متفق معلوم ہوتے ہیں نہ مطمئن۔ وہ اس رو برو کا پردہ اٹھاکر خود حلاج سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ کس گناہ سے مصلوب ہوا؟

کچھ تاریخی شخصیتیں اور کچھ واقعات حافظے میں بڑے بڑے سوالیہ نشانوں کی طرح زندہ رہتے ہیں اور ہر عہد یہ سوال از سرِ نو پوچھ کر ان کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سوال کو تو ثبات حاصل ہے البتہ جواب تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ علامہ اقبال بھی اس سوال تک بڑے لمبے رستے سے پہنچے تھے۔

مئی ۱۹۱۹ء میں جناب اسلم جیراج پوری کے نام اپنے ایک مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں:

"منصور حلاج کا رسالہ "کتاب الطواسین" فرانس سے شائع ہو گیا ہے۔ مؤلف نے فرنچ زبان میں نہایت مفید حواشی اس پر لکھے ہیں۔ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ حسین کے اصل معتقدات پر اس رسالے سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان منصور کی سزادہی میں حق بہ جانب تھے...... لطف یہ ہے کہ غیر صوفیہ تقریباً سب کے سب منصور سے بیزار تھے۔ معلوم نہیں متاخرین اس قدر دل دادہ کیوں ہو گئے؟"

فرانس کے جس محقق کا ذکر علامہ اقبال کے اس خط میں کیا گیا ہے، وہ لوئی ماسینوں ہے، جس نے حلاج کی "کتاب الطواسین" اپنے تشریحی حواشی کے ساتھ شائع کی تھی۔ اس میں حلاج کا جو بنیادی عقیدہ بیان کیا گیا ہے، اس کا ملخص یہ ہے کہ تخلیقِ کائنات سے پہلے خدا اپنی ذات میں گم تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہا تو آدم کو پیدا کیا۔ اس طرح خدا "لاہوت" میں حلول ہوا اور یوں خدا اور انسان ایک ہو گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ "جاوید نامہ" تک آتے آتے اقبال حلاج کے بارے میں اپنے خیالات تبدیل کر چکے تھے۔ ان کا نقطۂ نظر تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ فلکِ مشتری پر پہنچ کر جنت سے بالا اور جنت آزاد کا فرق نہیں دکھاتے ہیں اور حلاج کی روحِ جلیلہ کو جنت کے اندر بلکہ جنت کے پیرو سرگردش دکھاتے ہیں:

ہر دم آزادے کہ ناید خوب و زشت   نی بہ گنجد روح او اندر بہشت

جمیلہ ہاشمی کی تصنیف "دشتِ سوس" میں بھی ان کے سامنے بنیادی سوال یہی معلوم ہوتا ہے کہ حسین بن منصور حلاج کا گناہ کیا تھا؟ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سوال تک تصوف کے راستے نہیں، عقیدت کے راستے پہنچی ہیں۔ شعر کے پردے میں بہت سی باتوں کا اخفا ہو جاتا ہے۔ نثر کا پردہ زیادہ دبیز نہیں ہوتا۔ "دشتِ سوس" کی مصنفہ کو شعر کا پردہ میسر نہیں، اس لیے انھیں بات کھل کر کرنی پڑتی ہے۔ کتاب کے خاتمے تک پہنچتے پہنچتے اگر ایک سوال کا جواب ملتا ہے تو وہ جواب مزید کئی سوالوں کا راستہ کھول دیتا ہے۔ حسین بن منصور کے ابہام کی وجہ "انا الحق" کا نعرہ مستانہ تو نہیں ہو سکتا۔ ان نعرے کی گونج تو تاریخ تصوف کے ہر موڑ پر سنائی دیتی ہے۔ عقیدہ وحدت الوجود کا سلسلہ ہے کہ شروع سے آخر تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی۔ وجود صرف خدا کا ہے اس لیے ہر شے خدا ہے۔

صوفیائے بغداد کے بیش تر بزرگ جو حسین بن منصور کے ہم عصر تھے، اس عقیدے کے ماننے والے تھے۔ سلطان العارفین بایزید بسطامی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حج کے ارادے سے چلا۔ راستے میں مجھے ایک قطب ملے۔ انھوں نے فرمایا۔ "بسطامی، تو حج کو کیوں جا رہا ہے؟ جا گھر واپس چلا جا۔ تو نے مجھے دیکھ لیا تو جان لے کہ اللہ کو دیکھ لیا۔"

یہ سن کر بایزید حج کے بغیر راستے سے گھر لوٹ گئے۔ سلطان العارفین ابن الفارض نے اپنے قصیدے میں فرمایا کہ عرب کی مشہور معشوقائیں، لبنیٰ، لیلیٰ، شیبہ اور عزہ، یہ سب ذاتِ الٰہی ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی نے ان فانی معشوقوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور چاروں عاشق قیس، جمیل، کثیر اور عامر بھی ذاتِ الٰہی ہیں کیوں کہ خدا ان کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ حضرت جنید بغدادی اور ان کے مرشد بھی اسی عقیدے کے بزرگ تھے۔ بعد میں آنے والوں میں شیخ اکبر ابنِ عربی، کہ حسین بن منصور کا نام بڑے احترام سے لیتے ہیں ان کا ارشاد ہے۔ "پروردگار بھی حق ہے اور بندہ بھی حق۔ کاش میں معلوم کر سکتا کہ مکلف کون ہے"۔

پھر "فصوص الحکم" میں فرماتے ہیں۔ "پس فرعون کا حق تھا کہ وہ اپنے آپ کو ربِ اعلیٰ کہے کیوں کہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی سی تھی"۔

جمیلہ ہاشمی کے سامنے سوال یہ ہے کہ اگر صورتِ حال یہ ہے کہ تو پھر حسین ابن منصور "انا الحق" کہنے پر پابہ جولاں کیوں ہوئے؟ بندی خانے میں کیوں ڈالے گئے؟ کنارِ دجلہ مصلوب کیوں ہوئے؟ اور پھر اس جسمِ خاکی کو شہر کے چوک میں سپردِ آتش کیوں کیا گیا؟ اور جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو مدرسہ نظامیہ کے استادانِ کامل، فقیہانِ دوراں، عارفینِ کامل اور اربابِ توحید کیا کر رہے تھے؟ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ حسین نے ان سب کو رسوا کر دیا۔ شاید اسے دیوانگی کی سند دے کر اس کی جان بخشی کرانا چاہتے تھے۔ شاید یہ کہہ رہے تھے کہ اسرارِ جہاں برملا کہنا خود کو دعوتِ عذاب دینا ہے اور کہیں ان میں سے ایک کا فروشِ جہاں سارے فرقہ درویشاں کو جتلائے عذاب نہ کر دے۔ اگر خلقِ خدا کو فساد سے بچانے کے لیے شریعت کے تقاضے بڑھ گئے تو وہ کیا کریں گے؟ اگر دربار میں طلبی ہوئی تو وہ کونسا راستہ اختیار کریں گے؟ مدرسے اور خانقاہ کی دنیا ایک الگ دنیا تھی۔ وہاں ان پر کوئی گرفت نہ تھی۔ کیا حسین بن منصور کا گناہ یہ تھا کہ وہ اپنے نعرہ مستانہ کو خانقاہ کی فضا سے باہر لے گیا تھا؟

جمیلہ ہاشمی نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے اسے تو قاری اس چار سو صفحے کی کتاب میں خود تلاش کرے گا لیکن ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ادیب مؤرخ نہیں ہوتا۔ تاریخ کے دھندلکوں سے پرے محبوب کا سراپا، اس کی سرزمین اور اس کا عہد دیکھنے کی خواہش ابتدائی

تا اور بے پناہ محبت سے پیدا ہوتی ہے کہ چیزوں کو ان کی اصلی صورت سے دیکھا جائے۔ اس مرکزی کردار، اس فردِ خاص کے عہد کے
ی حقائق کے ساتھ باطنی حقیقتوں کو بھی دریافت کیا جائے۔ مگر کیسے کیا جائے؟ کیوں کر کیا جائے؟ وقت کا گزران ہر لمحہ واقعات کو مسخ
ا جاتا ہے۔ حقیقتوں پر وقت کی گرد اپنی تہیں جما چکی ہوتی ہے۔ پھر اگر تاریخ کا کوئی لمحہ، کوئی واقعہ کوئی کردار لکھنے والے کی سوچ کا محور
نے، اس کا دامنِ دل کھینچ لے تو وہ کیا کرے؟ مورخ تو حقائق کی ٹوٹی بیساکھیوں کے سہارے سفر پر روانہ ہو جائے گا مگر ادیب صرف
ت پر اعتبار نہیں کر سکتا کیوں کہ روایت میں واقعہ بھی ہے اور راوی کا تعصب بھی۔ پھر ادیب اپنے مشاہدے سے یہ بھی جانتا ہے کہ
ں اپنی زندگی میں دیکھتے ہی دیکھتے اس کا اپنا عصر واقعات کو داستانیں، افراد کو اساطیری کردار اور حقیقت کو افسانہ بناتا چلا جاتا ہے۔ اس
تخلیقی ادب لکھنے والے کے لیے تاریخ کی روایت تو محض آغازِ سفر ہے۔ وہ روایت کے ساتھ تخیل پر بھی بھروسا کرنا چاہتا ہے۔ اور جمیلہ
نے بھی کیا ہے۔

"دشتِ سوس" ۱۹۸۳ء کی ہم عصر دنیا میں ایک عاشق اور محبوب کا کوئی روایتی ناول نہیں ہے۔ یہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کا
عظیم الشان Passion Play ہے جسے قلم بند کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ یہ وہ موضوع ہے جسے انگریزی زبان میں Larger
than کہتے ہیں۔ اس موضوع پر ہاتھ ڈالنا دل گردے کا کام ہے اور اس سے جاں بر ہونے کے لیے خدائے بخشندہ کی دین تو ہوتی ہی
لیکن اس میں زورِ بازو کی سعادت بھی شامل ہوتی ہے۔ اس عہد کے اکثر لکھنے والے اس کو بھاری پتھر سمجھ کر چوم لیں گے مگر جمیلہ ہاشمی کو
ارزانی ہوئی تھی کہ انہوں نے اس کو اٹھا بھی لیا اور جاں بر بھی ہو گئیں۔ "دشتِ سوس" لکھ کر انہوں نے اپنے قلم کا کمال ہمارے
ادب میں محفوظ کر لیا۔ یہ داستان ہمارے ادب کی ایک کلاسیک ہے جسے ہمیشہ انتہائی سنجیدگی سے پڑھا جائے گا۔

ہم عصر زمانے کے واقعات، تعصبات اور مشاہدے، ہمارے خون کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ان کا تذکرہ کرنا اور ہو بہو تصویر کھینچنا نسبتاً
ں ہوتا ہے، مگر آج سے ہزار گیارہ سو سال پہلے کی داستان رقم کرنے کے لیے اس عہد کی فضا پیدا کرنا دقت طلب کام ہے۔ اس کے لیے اول
ان ایسی ہو کہ ہم عصری اور مقامی محاورے سے اجتناب کیا جائے، دوسرے ہزار سال پہلے کی معاشرت، انسانی رشتوں، کرداروں،
ں اور شاہراہوں، کارواں سراؤں، گلی کوچوں، شہروں اور درباروں کی ایسی تصویر کشی کی جائے کہ ماضی کا طلسم ٹوٹنے نہ پائے اور
ہ کہیں شتر گربہ کا شکار نہ ہو جائے۔ اس کے لیے زرخیز تخیل اور گہرے مطالعے دونوں کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ اس کے بغیر دشت
ں کا ریگ زار، اس کے کنارے آباد بستیاں، ان سے گزرتے ہوئے قافلے، قافلوں کے پڑاؤ، ان کی زود لق، جانوروں کے طبیب، مسجدوں
موذن ہر سو پھیلی ہوئی چاندنی کے غبار اونٹوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں اور ریگستان میں دور دور، اکا دکا جلتے چراغوں کا
ہ لکھنے والے کی گرفت میں آہی نہیں سکتا۔ یہ سب اس داستان طرازی کا سحر ہے جس کے خواب ناک ماحول میں اس کہانی کے کرداروں کو
ں چلنا اور وجود و عدم کے کھیل میں شریک ہونا ہے۔

جہاں تک کرداروں کا تعلق ہے، مرکزی کردار صرف ایک ہے۔ حسین بن منصور، جو ابتدا ہی سے موت کو للکارتی ہوئی نظروں سے
تا نظر آتا ہے۔ باقی سب اس کے کرب اور مشقت کو نمایاں کرنے، اس کی روح کے التہاب کو روشن کرنے اور اس سوختہ جاں کے
ں و انشراح کا اظہار کرنے کے کام آتے ہیں۔ لیکن ایک کردار کا تذکرہ بطورِ خاص ضروری ہے۔ اس داستان کے اکثر کردار اپنا تاریخی
رکھتے ہیں ماسوائے ایک کردار کے جو اس اعتبار سے داستان کا اہم ترین کردار بن جاتی ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو حلاج کا انجام ممکن ہی نہیں۔
رت اس افسانے کا محور ہے اس کا نام ہے "اخول"۔ اگر وہ نہ ہو تو نہ داستان چار قدم آگے بڑھ سکتی ہے نہ حسین بن منصور مصلوب

ہوتے ہیں مدان [illegible] کو جلائے جانے کا جواز قائم ہوتا ہے۔ حسین بن منصور سے وزیر مملکت حامد بن عباس کی تمام تر مخاصمت اور تمام تر حسد کا باعث اغول [illegible] کہ اغول کا کوئی حقیقی کردار تاریخ میں موجود نہیں۔ یہ کردار عقیل ہاشمی نے تراشا ہے۔ شاید اس معاملے میں مورخ اور محقق دونوں مل کر مصنف سے مجادلہ کریں گے لیکن قاری کو تو یوں لگتا ہے کہ اگر اغول نہیں بھی تھی تو اسے ہونا چاہیے تھا۔

حسین بن منصور کے دادا آتش پرست تھے۔ داستان کی ابتدا میں آقائے رازی کے ایک سوال کا جواب دینے کے لیے انہوں نے مقدس آگ کی مدد چاہی تھی اور اندرونی کمرے کے جتہ خانے کے معبد میں جاکر سلگتے کندے پر خوش بودار لکڑی رکھ کر اسے ہوا دی تھی تو شعلہ بلند ہوا تھا۔ پھر انہوں نے سپند کے چند دانے اس شعلے پر ڈالے تھے۔ انہوں نے ایک دم آگ پکڑی، چٹخے اور ننھے شعلے بڑے شعلے میں مٹ گئے۔ صرف ایک دانہ رہ گیا جسے دیکھ کر حسین کے دادا اداس ہوئے اور دعائیں پڑھنے لگے۔ آقائے رازی کے سوال پر انہوں نے کہا۔ "جو ہونا ہے، ہو کر رہے گا۔ آگ نے جس دانے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے وہ میرے گھرانے ہی کا فرد ہوگا، میرے خون کی امانت کے لیے مجھ سے باغی، میرا حصہ اور مجھ سے روگردانی کرنے والا۔" حسین کے والد منصور مسلمان ہوئے تھے۔

"دشتِ سوس" کی داستان آتش پرست کے اس معبد سے چل کر کنارِ دجلہ کی آگ تک ایک پورے دائرے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ سپند کا وہ دانہ جسے آتش پرست کی آگ قبول نہیں کرتی وہ کنارِ دجلہ ایک الاؤ روشن کر دیتا ہے...... مگر کیسا الاؤ کہ ہزار سال بعد آج بھی ہم اس الاؤ کے ارد گرد بیٹھے ہیں!

(سلسلہ ص ۱۰۱)

00 000 00

کتاب کا نام: بیاضِ نور مصنف: ڈاکٹر عقیل ہاشمی تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد انور الدین

ڈاکٹر عقیل ہاشمی حیدرآباد کے ایک پختہ مشق اور خوش فکر شاعر ہیں غزل، رباعی اور قطعہ جیسی اصناف کے علاوہ انہوں نے نعت گوئی پر بھی خاص توجہ کی ہے جس کی وجہ سے ان کا شمار حیدرآباد کے نمائندہ نعت گو شعرا میں ہوتا ہے۔ مدحتِ رسولؐ کے موضوع پر اس سے قبل ان کی دو تصانیف "ظہورِ قدسی" اور "آیاتِ پیغمبر نور اللہ" شائع ہو چکی ہیں۔ بیاضِ نور ان کی نعتوں اور منقبتوں کا مجموعہ ہے ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کا دل حبِ رسولؐ کے اعلیٰ و ارفع جذبے سے معمور و سرشار ہے اور وہ نبیؐ کی معرفت کے حصول اکتساب میں سرگرم سفر ہے۔ اس سفر میں اس کے شعور و وجدان نے جن لطیف اور نورانی تجربات کا ادراک کیا ہے اس نے انھیں نہایت سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ اشعار کے دل کش پیکر میں ڈھال دیا ہے۔

ڈاکٹر عقیل ہاشمی کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے وہ نعتیہ شاعری کے مختلف موضوعات کو سلیقے اور احتیاط کے ساتھ برتنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتوں میں زبان و ادب کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ پیش نظر مجموعے میں عقیل ہاشمی کی تضمینیں بھی شامل ہیں۔ جن میں امیر خسرو، آصف سابع، امیر مینائی اور امجد حیدرآبادی کے نعتیہ اشعار کی تضمینیں برجستہ، چست اور رواں ہیں جن سے ان کی مہارتِ فن کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں خلفائے راشدین اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی شان میں منقبتیں ہیں۔ اصل کتاب سے قبل پروفیسر طٰہٰ رضوی برق، پروفیسر اشرف رفیع اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید جیسے نقادوں نے ڈاکٹر عقیل ہاشمی کی نعتیہ شاعری کا نہایت خوب صورت اور بے لاگ جائزہ لیا ہے۔ پیش نظر مجموعہ اردو کی نعتیہ شاعری کے ذخیرے میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد

مطالعہ

حنظل

(مصنف : بیگ احساس)

فرانز کافکا نے ایک گفتگو میں کہا تھا کہ ادیب معاشرے کا سب سے ناتوان فرد ہے اس لیے کہ وہ اپنے کندھوں پر موجودات کا سب سے زیادہ محسوس کرتا ہے۔ اس سے کافکا کی مراد غالباً یہ تھی کہ ادیب معاشرے کا سب سے حساس فرد ہے۔ اس کی نظر معاشرے کے خارجی اور باطنی دونوں پہلوؤں پر رہتی ہے اور وہ انسان کے ظاہری وجود کے ساتھ اس کی روح اور اس کے محسوسات کو بھی پرکھتا ہے۔ سماجی و سیاسی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اس سطح پر ہونے والے مظالم کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے۔ احساس کا شمار ایسے ہی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ "خوشہ گندم" (۱۹۷۹ء) کے بعد ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "حنظل" ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ "حنظل" کے افسانوں میں سیاسی جبر، معاشی استحصال، فرقہ وارانہ فسادات اور اس کے علاوہ آج کے انسان کی ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی گتھیوں کو بھی بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان مسائل و موضوعات کی پیش کش میں بیگ احساس نہ فارمولا آف ترقی پسندی کے شکار ہوئے ہیں اور نہ ہی فارمولا آف جدیدیت کے۔ بلکہ ان مسائل کو سوالیہ نشان بنا کر چھوڑ دیا ہے اور ان کا کوئی مخصوص حل قاری کے سامنے پیش نہیں کیا ہے۔

"حنظل" کی بیش تر کہانیوں میں بیگ احساس نے دو فنی تدابیر اختیار کی ہیں۔ پہلی قسم ان افسانوں کی ہے جن میں علامتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لیے قرآن، ہندو دیومالا اور داستانوں سے کردار اور واقعات مستعار لیے گئے ہیں اور انھیں جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے افسانوں میں پرو دیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی وہ کہانیاں ہیں جن میں تمثیلی اور بیانیہ انداز کو گھلا ملا کر نیا خوش گوار تکنیکی تجربہ کیا ہے۔ تمثیلی فضا پیدا کرنے کے لیے مختلف جانوروں سے مدد لی گئی ہے۔

پہلی قسم کی کہانیوں میں "نیا شبنہ سوار"، "خس آتش سوار"، "آسمان بھی تماشائی"، "برزخ" اور "حنظل" شامل ہیں۔ ان افسانوں کے کردار کسی نہ کسی آشوب کے گرفتار ہیں اور انھیں اس اجتماعی آشوب سے نجات دلانے کے لیے کوئی نجات دہندہ نہیں آتا اور اگر کوئی نجات دہندہ آتا بھی ہے تو قریبے کے لوگوں کی خود غرضی سے مجبور ہو کر کچھ کر نہیں پاتا۔ "آسمان بھی تماشائی" میں پوری دنیا میں مختلف سطحوں پر ہونے والی جارحیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کہانی میں قرآن سے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے واقعات مستعار لیے گئے ہیں۔ کہانی کا آغاز دونوں کی ملاقات سے ہوتا ہے۔ دونوں سفر پر نکلتے ہیں۔ اس کے بعد الگ الگ تین منظر ہیں۔ پہلا منظر بابری مسجد کے انہدام سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں حکومت اور سیکولرزم کی فورسیز کی منافقت، اپنی قوم کے مختلف طبقوں (دانشور، بھی) کی بے حسی

اور بے لبسی کو دکھایا ہے ۔ دوسرا منظر بوسنیا کا ہے جس میں ایک مخصوص قوم کے ساتھ روا رکھا جانے والا ظالمانہ سلوک اور اس سلسلے میں بین الاقوامی برادری اور مظلومین کے ہم مذہب ممالک کی مجرمانہ خاموشی اور بے حسی کے رویے کو نشانہ ، طنز بنایا گیا ہے ۔ تیسرا منظر کہانی کی خلیج جنگی سے متعلق ہے ۔ قرآنی واقعے میں تو حضرت خضر پیش آئے ہوئے واقعات کی توجیہہ پیش کرتے ہیں ۔ لیکن اس کہانی میں وہ بزرگ واقعات کی توجیہہ نہیں کرتے بلکہ ان مسائل کا حل خود دریافت کرنے کا مشورہ دے کر غائب ہو جاتے ہیں ۔ " نیا شہہ سوار " میں یاجوج ماجوج اور سد سکندری کا کہیں ذکر تو نہیں ہے لیکن اس کو بنیاد بنا کر کہانی بنی گئی ہے ۔ کہانی میں داستانوں کا آشوب زدہ قریہ ہے اور قریے کے لوگ بڑی شدت سے .... کسی نئے شہسوار کے منتظر ہیں ۔ وہ نجات دہندہ آتا ہے لیکن لبستی والوں کی خود غرضی کے آگے وہ کچھ کیے بغیر واپس چلا جاتا ہے ۔ " خس آتش سوار " میں ہندو دیو مالا سے واقعات مستعار لیے گئے ہیں ۔ اس کہانی کے ساتھ انتظار حسین کی کہانی (پتے) کا یاد آجانا فطری ہے ۔ وہاں بھی جنسی جبلت کو دبا کر رہبانیت اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن بار بار کردار کے ذہن میں جنسی خیالات در آتے ہیں ۔ اس کہانی میں بھی یہی ہوتا ہے ۔ اس کہانی میں جانوروں کی تمثیل سے بھی کام لیا گیا ہے ۔ بیگ احساس نے اس کہانی کی زبان ہندی آمیز بنانے کی کوشش کی ہے جو کہانی کے تقاضے کے عین مطابق ہے ۔ " برزخ " میں اصحاب کہف کے واقعے سے مدد لی گئی ہے ۔ ان کہانیوں میں بیگ احساس نے اسطور سازی سے کام لیا ہے لیکن ان کے برخلاف " حنظل " میں اسطور سازی کا عمل گہرا ہے ۔ اس کہانی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ فطری آزادی کے ذائقہ دار پھل سے مستفید ہوتا تھا ۔ پھر بادشاہوں نے اس کی آزادی سلب کر لی ۔ ایک زمانے کے بعد جب جمہوریت کا دور دورہ ہوا تو اس نے بھی آزادی کا اعلان کیا لیکن اس آزادی نے آنے والی نسلوں کو گونگا بنا دیا ۔

اس کتاب میں دوسری قسم کی وہ کہانیاں ہیں جن میں تمثیلی اور بیانیہ انداز کو گھلا ملا کر ایک نیا تکنیکی تجربہ کیا گیا ہے ۔ ان کہانیوں میں بھی ایک پیراگراف اور کبھی ایک جملہ بیانیہ طرز پر ہوتا ہے اور دوسرا تمثیلی " کرفیو " ، " سوا نیزے پر سورج " ، " ملبہ " اور " بے سورج آسمان " اسی قبیل کی کہانیاں ہیں ۔ اس تکنیکی تجربے کی سب سے عمدہ مثال " کرفیو " ہے اس کہانی کا پس منظر فسادات ہے ۔ شہر کے کسی حصے میں فساد ہو گیا ہے جس کی وجہ سے کرفیو لگا دیا گیا ہے ۔ ایک خاتون کرفیو کی وجہ سے اپنے گھر نہیں جا سکتی اسے ایک مہذب افسر اپنے گھر پناہ دیتا ہے ۔ رات میں افسر کی نیت بدلتی ہے ۔ خاتون پہلے مزاحمت کرتی ہے لیکن وہ گھر سے باہر نکل نہیں سکتی لہذا اپنے جسم کا کرفیو اٹھانے پر مجبور ہو جاتی ہے ۔ کہانی کا پہلا جملہ ہی تمثیلی انداز کا ہے ۔

" خوف ناک عفریت نے پھر زندگی کے بدن میں اپنے ناخن گاڑ دیے ۔ زخموں سے خون رسنے لگا ۔
وہ سب وحشت زدہ جانوروں کی طرح سڑک پر نکل آئے ۔ "

پہلے ہی پیراگراف کی چھٹی سطر میں بیانیہ انداز گھٹا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔

" اس بھیڑ سے الگ تھلگ سنہرے بالوں والی خوب صورت نوجوان عورت نے ان وحشت زدہ انسانوں کو حقارت سے دیکھا اور ایک خاص ادا سے بالوں کو جھٹکا دے کر بڑبڑائی " سب جانور ہیں " ۔ "

اس کہانی میں عفریت اور جانوروں کی تکرار کے ذریعے وہ خوف ناک فضا تیار کی گئی ہے جو کہانی کے تاثر کو شدید بنانے میں پورے طور پر معاون ہے ۔ آگے چل کر سرکس میں کام کرنے والی مختلف لڑکیوں کی تمثیلوں کے وسیلے سے خاتون کے اندر ہونے والی کشمکش اور اس کی بے بسی اور افسر کی بوالہوسی کے مناظر کو شدید بنا دیا گیا ہے ۔ یہی صورت حال " سوا نیزے پر سورج " میں بھی ہے ۔

ہانی میں ایک لڑکی سیکو رینی نور سیز کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے ۔ ان کے علاوہ "ملبہ" اور " ـــ بے سورج آسمان " میں بھی مختلف تمثیلوں م کیا گیا ہے ۔ ان کہانیوں میں بیگ احساس نے تمثیلوں کے وسیلے سے نہ صرف کسی خاص منظر یا واقعے کی تصویر کشی کی ہے بلکہ ان ذریعے کرداروں کے محسوسات اور ان کے اندر ہونے والی اتھل پتھل کو بھی فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے ۔ ان کہانیوں کے لینے کے بعد اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر ابو الکلام قاسمی کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ آٹھویں دہائی کے افسانہ نگاروں نے بیانیہ ت کو آزمایا اور بیانیے کو علامتی اور استعاراتی تہہ داری سے ہم آہنگ رکھا ۔

اس مجموعے کی ایک اہم کہانی " اجنبی اجنبی " اس کہانی میں بیگ احساس نے علامت اور تمثیل دونوں سے سروکار نہیں رکھا بلکہ پوری توجہ بیانیے کو ہر وقت بنانے صرف کر دی ہے ۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو اپنا وطن اور اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر خلیج ـ میں روپیے بٹورنے جاتا ہے ۔ اور وہاں اجنبی چہروں ، اجنبی ماحول ، اجنبی زبان اور اجنبی فضا میں رہتے ہوئے ۔ خود کو بھی اجنبی ، لگتا ہے ۔ چار سال کے بعد وہ گھر آتا ہے اور اپنے کندھوں سے اجنبیت کا بوجھ اتار پھینکتا ہے لیکن یہاں پہنچ کر اس کی اجنبیت میں ہ ضافہ ہوتا ہے ۔ وہ اس بات کو شدت سے محسوس کرتا ہے اس کی بیوی اور اس کی نوجوان لڑکی نے اپنی اپنی رنگین دنیائیں آباد کر ہیں ۔ جہاں اس " بور اولڈ مین " کا گزر ممکن نہیں ۔ اس اجنبیت کو اپنے دوستوں اور رشتہ داروں میں جا کر بھلانا چاہتا ہے لیکن اس می اس کو ناکامی ہوتی ہے ۔ بالآخر وہ چھٹی ختم ہونے سے پہلے واپسی کا پروگرام بناتا ہے ۔ لیکن اس پر بھی اس کی بیوی نہیں روکتی اور ت کے وقت اس کے بیوی بچے اس طرح ہشاش بشاش نظر آتے ہیں جیسے وہ اسے رسیو کرنے آئے ہوں ۔ یہ کہانی صرف اتنی ہی نہیں س سے آگے بڑھ کر " پٹروڈالر " سے پیدا ہونے والی اخلاقی گراوٹ کی طرف بلیغ اشارے کرتی ہے ۔ بیگ احساس نے مرکزی کردار نی و جذباتی کیفیات کی تصویر کشی میں جس فنی چابک دستی کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی نسل کے کم افسانہ نگاروں کے یہاں دیکھنے کو ہے ۔ اس تجزیے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیگ احساس کا شمار آٹھویں دہائی کے ان افسانہ نگاروں میں بلا تکلف کیا جا سکتا ہے جنھوں پنی کہانیوں کو اپنے سے قبل کی کہانیوں سے الگ شناخت عطا کی اور اپنا ایک منفرد اسلوب بنایا ۔

OO OOO OO

ادب کا بدلتا ہوا منظر نامہ ۔ مابعد جدیدیت اردو کے تناظر میں

(اردو اکادمی دہلی کا سہ روزہ قومی سیمنار)

000 " اردو کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں یہ احساس عام ہے کہ اردو ادب کو نئے خون اور نئی حرارت کی ضرورت ہے ۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو ادب نوجوان ادیبوں کی خاموش بغاوت سے نئے دور میں داخل ہوچکا ہے ۔ نئے لکھنے والوں نے ابہام اور اشکال کی اس منطق کو رد کردیا ہے جس کی وجہ سے اردو ادب یک سرے پن اور یکسانیت کا شکار ہوگیا تھا ۔ ترقی پسندی کی رومانی نعرے بازی کی طرح جدیدیت کی فارمولا گزیدہ ذات پرستی بھی بے اثر ہوچکی ہے اور نئے فکشن نگار اور شاعر یاسیت کی فضا سے نکل کر نئے سماجی اور ثقافتی ڈسکورس میں شریک ہونا چاہتے ہیں جو اقلیتی مسائل کی بھی ترجمانی کرے اور وسیع تر ثقافتی ڈسکورس کا بھی حصہ ہو ان خیالات اظہار ممتاز دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو اکادمی دہلی کے سہ روزہ قومی سیمنار " ادب کا بدلتا منظر نامہ ... مابعد جدیدیت اردو کے تناظر میں " میں کلیدی خطبہ پڑھتے ہوئے کیا ۔ انھوں نے مزید کہا کہ " اس وقت پوری دنیا جدیدیت کے بعد کے دور میں داخل ہوچکی ہے اور ہم بھی اس سے باہر نہیں ۔ مابعد جدیدیت ہر قسم کی فارمولا سازی اور منصوبہ بند پروگرام کے خلاف ہے اور تخلیق کی پہلی آزادی ہی کو ادب کی شرط مانتی ہے ۔ تاہم اردو میں ہماری تبدیلیاں ہماری اپنی ادبی اور ثقافتی ضرورتوں کے مطابق ہوں گی اور اردو کا نیا ادب اپنی پہچان خود وضع کرے گا ۔ اس وقت شدید ضرورت قاری سے رشتہ جوڑنے ، علاحدگی کی تنگنائے سے نکلنے اور تخلیقی آزادی پر زور دینے کی ہے " ۔

اس موقع پر ڈاکٹر صادق سکریٹری اردو اکادمی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ اس سیمنار میں ہم نے اردو کے علاوہ دیگر ہندوستانی زبانوں یعنی ہندی ، پنجابی وغیرہ کے ادیبوں کو بھی دعوت دی ہے تاکہ ان کے ادب کی موجودہ صورت حال سے اردو کے ادیب بھی واقف ہوں ۔ اس سیمنار میں شرکت کرنے والے حضرات کو ملک کے مختلف صوبوں سے مدعو کیا گیا ہے ۔ ڈاکٹر صادق نے یہ بھی کہا کہ مابعد جدیدیت کے دور میں داخل ہونے والے نوجوان کسی بھی سیاسی شعبدہ بازی اور نعروں سے بے پرواہ ہوکر اپنی بات کہنے میں مشغول ہیں ۔ مابعد جدیدیت کا دور ہمارے ملک میں تقریباً پندرہ بیس سال سے شروع ہوچکا ہے ۔ مغرب کی بہت سی باتوں کو اب ہم قبول کر رہے ہیں ۔ دنیا میں تبدیلیاں بہت تیزی سے رونما ہورہی ہیں اگر صحیح معنوں میں ہندوستانی زبانوں کے ادب میں نیا ثقافتی ڈسکورس پیدا ہوگیا تو ہم نہ صرف مغرب سے آنکھیں چار کرسکیں گے بلکہ مغرب کا پنجہ بھی مروڑ سکیں گے ۔

000 افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے معروف ادیب اور نقاد پروفیسر وہاب اشرفی نے کہا کہ جب تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تو ان کو تھوڑے عرصے میں سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے ۔ اس میں بحث ومباحثے کی اور چھان پھٹک کرنے کی بہت ضرورت ہوتی ہے ۔ اردو میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے چلتے کچھ ہٹ دھرمی بھی آگئی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب لوگ ادعائیت سے ہٹ کر سوچنے لگے ہیں ۔ نئے فنکار اپنی نئی راہ وضع کر رہے ہیں ۔ سیمنار کا افتتاح پنجابی کے مشہور دانشور پروفیسر ستیندر سنگھ نور نے فرمایا ۔ انھوں نے کہا کہ فکری اور ثقافتی سطح پر پوری دنیا میں بنیادی تبدیلیاں ہورہی ہیں ۔ نوآبادیاتی نظام ختم ہونے کے بعد مشرق ، پیغام ...

قومیت بنام مقامیت کے ڈسکورس میں مشرق اب پوری طرح بیدار ہو چکا ہے۔ مابعد جدیدیت کی سب سے بڑی دین یہ ہوگی کہ فکری ثقافتی اور ادبی سطح پر ہم اپنے مابعد جدید ڈسکورس پیدا کر سکیں۔ مغرب کو زیر کرنے کے لیے ہمارے ہاتھ میں یہ بہت بڑا حربہ ہوگا۔

سمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے معروف ادیب شاعر جناب مظہر امام نے فرمایا کہ ہندی اور ملک کی دوسری زبانوں میں اور مغرب میں مابعد جدیدیت کے جو تصورات اور نظریات ہیں۔ ان سے ہم اردو والوں کو آشنا ہونا نہایت ضروری ہے البتہ جہاں تک اردو کا تعلق ہے، جدیدیت کے بعد ہمارے یہاں ایک نیا ادبی رویہ اور رجحان سامنے آیا ہے جس کی روشنی میں مابعد جدیدیت کی تعریف اردو کے تناظر میں وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس اجلاس میں معروف ہندی صحافی جناب سدھیش پچوری نے کہا کہ مابعد جدیدیت ایک بہت وسیع اصطلاح ہے۔ اقتصادی، سماجی، سیاسی، ثقافتی اور ادب و آرٹ کے حوالے سے اس کا پہلا بیج ہمیں مارکس کے خیالات میں ملتا ہے۔

000 دوپہر کے بعد کا اجلاس مابعد جدید غزل کے لیے وقف تھا جس کی صدارت ممتاز نقاد ڈاکٹر سید محمد عقیل نے کی جو خود مابعد جدید غزل پر ایک مبسوط مقالہ لکھ چکے ہیں۔ اس جلسے میں بہار سے آئے ہوئے نوجوان شاعر خالد عبادی اور علی گڑھ سے آئے ہوئے ڈاکٹر امتیاز احمد نے اپنے مضامین پڑھے۔ کانپور کے عشرت ظفر کا مضمون فیضان حسن نے پڑھ کر سنایا۔ خالد عبادی نے کہا کہ خوشی کی بات ہے کہ مابعد جدیدیت، ترقی پسندی یا جدیدیت کی طرح کسی تحریک یا کسی ایک قطعی رجحان کا نام نہیں اور اگر ایسے میں مابعد جدیدیت کی اصطلاح کسی اشکال کا سبب بن رہی ہے تو عرض کر دوں کہ ماقبل تاریخ کی اصطلاح کو ذہن سے محو نہ ہونے دیں۔ جس طرح یہ اصطلاح معلوم تاریخ سے پہلے کے ادوار پر محیط ہے اسی طرح مابعد جدیدیت کی اصطلاح جدیدیت کے بعد والے شعری منظر نامے کی آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر امتیاز احمد نے اپنے مضمون میں عنبر بہرائچی کے مجموعے "دوب" کے اشعار کا بطور خاص تجزیہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مابعد جدید فن کار ایک طرف غزل میں جزئیات نگاری کو راہ دیتا ہے تو دوسری طرف عربی اور فارسی بنیادوں کے ساتھ ہندوستانی روایات اودھی بھوجپوری جیسی علاقائی زبانوں کے اثرات قبول کرتا ہے اور تیسری طرف اپنے استعاروں اور پیکروں کے ذریعے فطرت سے ایک ناگزیر تعلق بھی استوار کرتا ہے۔ چوتھی طرف وہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر شعر کہتا ہے اور پانچویں طرف وہ کبھی کبھی استعارہ سازی یا علامت سازی کے بجائے دوسرے طریقوں کو آزماتا ہے جس سے بہ ظاہر برہنہ گوئی کا احساس ہوتا ہے۔

اس اجلاس میں خورشید اکبر، طارق متین، حسین الحق، شوکت حیات، صلاح الدین پرویز، شافع قدوائی، علی احمد فاطمی اور کئی دوسروں نے سوال اٹھائے اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اگر چہ میں ادب کے ترقی پسند نظریے کا موید رہا ہوں لیکن اب میرا ماننا ہے کہ ادب میں کسی طرح کی غیر مشروط وابستگی منفی نتائج کی طرف لے جاتی ہے۔ مابعد جدید دور کی واضح خصوصیت ذہنی آزادی کی بحالی ہے۔ پروفیسر عقیل نے مزید کہا کہ نئے ادیبوں میں خیالات بدل رہے ہیں، اسٹائل بدل رہے ہیں، عادات و اطوار یہاں تک کہ زندگی بھی بدل رہی ہے۔ میرے خیال میں یہ کھلا ڈلا پن یعنی Pluralism مابعد جدیدیت کی خاص الخاص دین ہے۔

اردو اکادمی دہلی کے اس سہ روزہ قومی سمینار کے دوسرے دن یعنی ۱۵/ مارچ کو صبح کے اجلاس میں اردو نظم اور اردو ناول پر بحث ہوئی۔ اردو نظم پر ہونے والے اجلاس کی صدارت ممتاز شاعر جناب بلراج کومل نے کی۔ مضمون پڑھنے والوں میں شاہد کلیم عزیز پربہار، شین۔ کاف۔ نظام اور حامدی کاشمیری شامل تھے۔ شاہد کلیم نے کہا کہ مابعد جدیدیت ایک مخصوص نکتے پر مرتکز نہیں اس کا

دائرہ لامحدود ہے ۔ یہ [redacted] بند خوں کو توڑ کر فن کار [redacted] خیال کی فطری آزادی عطا کرتی ہے ۔ عزیز پریہار نے نثری نظم پر پرچہ پڑ
ہوئے کہا کہ نثری نظم شعری روایت کی Subversion ہے ۔ نثری نظم شعری اظہار کے نئے امکانات کو سامنے لاتی ہے ۔ یہ آز
اظہار کی مظہر تو ہے ہی ساتھ ہی جنس اور مادی آزادی کے ساتھ ارتقا کا ثمر اور امکان بھی رکھتی ہے ۔ تیسرا مضمون شین ۔ کاف ۔ نظام
پڑھا ان کا خیال تھا کہ شاعری کسی طرح سیاست سے الگ نہیں ہے لیکن اسے سیاست کا آلۂ کار نہیں بننا چاہیے ۔ سیاست سیاست
شاعری کے باہمی تعلق کی بہترین مثال مہابھارت کے " شانتی پرو " سے دی جا سکتی ہے ۔ انھوں نے مزید کہا کہ " واک پدی " کیوں
کہ " واک " کے بغیر روشنی بھی روشن نہیں ہو سکتی ۔ آخری مقالہ پروفیسر حامدی کاشمیری نے پیش کیا انھوں نے کہا کہ مشرق مر
بالخصوص برصغیر میں بھی فکری اور ادبی سطح پر جدیدیت کے بعد اب مابعد جدیدیت کی صورت حال پیدا ہو چکی ہے ۔ اردو نظم میں آٹھ
دہائی کے آغاز ہی سے مابعد جدیدیت کے آثار و مظاہر قابل شناخت رہے ہیں ۔ مابعد جدید نظم نگار جدیدیت کے موبدین کی طرح کسی
شدہ فکری نہج کو قبول نہیں کرتا وہ مکمل ذہنی آزادی کو روا رکھتا ہے ۔ اس کے یہاں سماجی حالات کی بازدید کا رجحان ملتا ہے ۔ وہ
آگہی کے ساتھ ساتھ وجدانی ، جبلی اور نفسیاتی تجربات کی رنگارنگی کو پیش کرتا ہے ۔ اور نئی خواتین شعرا کے یہاں تانیثیت کا رجحان نم
ہے ۔

000 مابعد جدید ناول کا اجلاس ممتاز افسانہ نگار جوگیندر پال کی صدارت میں منعقد ہوا اس میں بھی چار مضمون پیش
گئے ۔ انیس رفیع نے یہ نکتہ پیش کیا کہ پچھلے دس برسوں میں جو ناول شائع ہوئے ہیں انھیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے
جدید دور سے گزرے بغیر ہی مابعد جدید دور میں داخل ہوگئے ۔ سوال یہ ہے کہ جدیدیت کیوں کر ناول کو چھوئے بغیر گزر گئی ۔ د
مضمون خورشید احمد نے پیش کیا انھوں نے کہا کہ مابعد جدیدیت کا آغاز ۸۰ ء کے آس پاس ہوتا ہے ۔ اس دور کے قابلِ ذکر ناولوں
حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے ۔ ایک تو وہ ناول جو حقیقت پسند روایت کو نیا تناظر دیتے ہیں ۔ دوسرے وہ ناول جو حقیقت پسندانہ رو
کو مسترد کرنے کے لیے مختلف نئی اور پرانی تکنیکوں کا سہارا لیتے ہیں ۔ انھیں مابعد جدید ناول کہا جا سکتا ہے ۔ مثلاً " قید " (عبداللہ حسـ
یا " نمبردار کا نیلا " (سید محمد اشرف) ۔ جناب انور خاں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو میں ناول کم لکھے جاتے ہیں لیکن ادھر کئی معن
ناول شائع ہوئے ہیں جیسے پیغام آفاقی کا ناول " مکان " عبدالصمد کا ناول " خواب خواب سویرا " الیاس احمد گدی کا " فائر ایریا " حسین
کا ناول " فرات " اور محمد اشرف کا " نمبردار کا نیلا " یہ ناول Establishment سے ٹکراؤ ، عالمی تشدد اور سماجی اور سیاسی صو
حال کو پیش کرتے ہیں ۔ یہ ناول ان معنوں میں یقیناً مابعد جدید ہیں کہ ان میں کسی اوپر سے لادے ہوئے نظریے ، رویے کی پیروی
ملتی ۔ ہر مصنف نے اپنی فکر ، اپنی ثقافت ، اپنے تشخص پر اصرار کیا ہے ۔ آخری مضمون پڑھتے ہوئے جناب بلراج کومل نے وضاحت
کہ اردو زبان کا مابعد جدید ناول بہ یک وقت روایتی رویوں کے تئیں اثبات و انکار کا آئینہ دار ہے ۔ جہاں اس میں بیانیہ کا جانا
انداز موجود ہے وہاں اس میں موضوع اور طریق کار کی فکری اور لسانی آمیزشوں کا انحراف آشنا رویہ بھی سرگرم کار ہے ۔ بڑھتی ہو
آبادی ، ہجرت اور نقل مکانی ، اقدار کا انہدام ، رشتوں کی نئی ترتیب ، سماجی سروکار مابعد جدید اردو ناول کی جزئیات و تفصیلات کا
بھی ہیں اور اسے ایک مابعد جدید جہت بھی عطا کرتے ہیں ۔ وقت کی تنگی کے باوجود ان مضامین پر زوردار بحث ہوئی اور نئی پیڑھی
ادیبوں اور شاعروں نے بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ مابعد جدیدیت کی فارمولائی تعریف کو رد کرتے ہوئے سیمینار کے ڈائرکٹر گوپی
نارنگ نے وضاحت کی کہ کسی بندھی ٹکی تعریف کی ضرورت ہی نہیں ۔ تعریفیں بھی دراصل فارمولا یا لیبل دینے کا دوسرا نام ہیں ۔ ا

نے جوگندر پال اور پروفیسر وہاب اشرفی سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ مباحث کی طرفیں بھی کھلی رہنی چاہئیں کیوں کہ ادب میں جہاں
زاف ہوتا ہے وہیں تسلسل بھی اپنی معنویت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صادق سکریٹری اردو اکادمی نے مباحثے کی رہنمائی کی اور ان ہی کے کلمات
کر کے ساتھ پانچواں اور چھٹا اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

ooo مابعد جدید اردو افسانے کے اجلاس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی زیر صدارت چار مضمون پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر
صادق نے اپنے مضمون میں اس بات پر زور دیا کہ اردو ادب میں ترقی پسند مصنفین کے زیر اثر حقیقت نگاری کے رجحان کو فروغ حاصل
ا اور جدیدیت کے زیر اثر تجریدی و علامتی رجحان کو فروغ ملا۔ مابعد جدیدیت دور کے افسانے کا کینوس ان دونوں سے زیادہ وسیع ہے
یوں کہ اس دور کے افسانوں میں حقیقت نگاری بھی ہے اور تجرید و علامت بھی۔ اساطیر بھی ہیں اور فنتاسی طلسم بعید از قیاس تصورات
ر سریت کے اثرات سبھی کچھ شامل ہیں۔ دوسرا مضمون سید محمد اشرف نے پڑھا ان کا خیال تھا کہ اردو افسانے نے سب سے پہلے سکہ
ر جدیدیت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ زبان و بیان کا زیور فقط شاعری کا اجارہ نہیں ہے۔ غزل کی مرکزیت تسلیم۔ لیکن زیادہ
اوت اور تجربے افسانے کی دنیا میں ہوئے۔ مابعد جدیدیت صرف انحراف کی نہیں انجذاب کی بھی مظہر ہے۔ بلاشبہ مابعد جدید افسانے
ید افسانوں سے موضوع، تکنیک اور رویے تینوں اعتبار سے مختلف ہیں۔ طارق چھتاری کے مضمون میں بعض نئے لکھنے
الوں مثلاً سید محمد اشرف، سلام بن رزاق اور نیر مسعود کے افسانوں کے تجزیے بھی شامل تھے، ان کا مضمون بہت پسند کیا گیا۔ ان کا
یال تھا کہ ان حضرات کے نئے افسانے رویے کے اعتبار سے مابعد جدید افسانے کی مثال قائم کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اب
سانہ ابہام کی پرپیچ راہوں سے نکل آیا ہے اور اس کا رشتہ تہذیب اور ثقافت سے مضبوط ہو گیا ہے۔ شوکت حیات کا خیال تھا کہ کہانی پن
واپسی اور سماجی سروکار وغیرہ واضح طور پر جدیدیت کی اشکال پسندی سے انحراف اور زندگی کو اس کی گہرائیوں میں دریافت کرنے کی
کششیں ہیں۔ اس اجلاس میں محمود ہاشمی، پیغام آفاقی، سلام بن رزاق، انور خاں اور بعض دوسروں نے سوال اٹھائے۔ بحث کو سمیٹتے
ہوئے صدر جلسہ گوپی چند نارنگ نے کہا کہ یہ حقیقت ہے کہ نثر میں افسانے کو وہ مرکزیت حاصل ہوتی جارہی ہے جو شاعری میں غزل کو
اصل ہے۔ اس لیے شاید سب سے زیادہ تجربوں کی زد افسانہ ہی پر ہے۔ عین ممکن ہے کہ اردو میں اکیسویں صدی فکشن کی صدی ثابت
ہو۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بیانیہ کو کہانی پن سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ بیانیہ فکشن کا طور ہے جب کہ کہانی پن اس کا صنفی تقاضا۔
رنگ صاحب نے اس بات کی تائید کی کہ اردو میں جدیدیت ناول کو تقریباً چھوئے بغیر گزر گئی۔ اس لیے کہ ناول میں معاشرتی اور
ثقافتی فریم ورک کے بغیر بات نہیں بنتی۔ مابعد جدید رویوں کی پرچھائیاں تو قرۃ العین حیدر ہی کے فن سے ملنے لگتی ہیں۔ انتظار حسین اور
ریندر پرکاش تک آتے آتے ثقافتی ڈسکورس کی جڑیں اور گہری ہو جاتی ہیں۔

ooo اس کے بعد مابعد جدید اردو تنقید کے اجلاس میں بہت گرما گرمی اور مباحث کی شدت رہی۔ علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی کے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے "مابعد جدید تنقید: اصول اور طریقہ کار کی جستجو" پر نہایت مدلل مضمون پیش کیا۔ انھوں
نے زبان کے بدلتے ہوئے استعمال اور زبان کے ذریعے جو کچھ گرفت میں آتا ہے اس کو ہی سچائی کا نام دیا جا سکتا ہے جیسے اصول کو مابعد
جدید رجحان کا بنیادی عنصر بتایا۔ زبان کی اپنی منطق اور طور کے علاوہ انھوں نے بین المتونیت اور ایک متن پر دوسرے متن کی تخلیق
کے رجحان کو بھی اہمیت دی اور کہا کہ مابعد جدیدیت معنی کی مرکزیت یا ادبی معیاروں کی آفاقیت سے مکمل انکار کرتی ہے اس رجحان کے
زیر اثر ماضی کی بازیافت، جڑوں کی تلاش اور تہذیبی حوالوں کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ان خیالات کے بعد پروفیسر قاسمی نے کچھ

اصولوں کا اطلاق اردو افسانے ، نظم اور غزل پر کر کے دکھلایا اور تجزیہ کرتے ہوئے ثابت بھی کیا کہ مابعد جدیدیت کے بعض رویے کہاں کہاں اور کیسے ڈھونڈے جاسکتے ہیں ۔ ڈاکٹر شافع قدوائی نے مابعد جدید کی پہچان اس بنیادی اصول کو قرار دیا کہ ادب حقیقت کو دریافت نہیں کرتا بلکہ اس کو خلق کرتا ہے ۔ انھوں نے وضاحت کی کہ مابعد جدید تنقیدی تصورات کے تعارف کا سلسلہ عرصے سے جاری رہا ہے اور اب اردو میں مابعد جدید تنقید کے اطلاقی نمونے بھی سامنے آنے لگے ہیں ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پہلی بار مابعد جدید تنقیدی تصور کا اطلاقی نمونہ " فیض کو کیسے نہ پڑھیں " لکھ کر پیش کیا بعد میں انھوں نے منٹو ، بلونت سنگھ اور محمد علوی کے مطالعات میں بھی نئی بصیرتوں سے کام لے کر خیال افروز تنقیدی نتائج اخذ کیے ۔ اسی طرح متن پر متن تعمیر کرنے کے رجحان پر بھی توجہ کی جانے لگی ہے ۔ رسالوں میں مابعد جدید تنقیدی Insights پر مبنی مضامین شائع ہونے لگے ہیں ۔ اس اجلاس کا آخری مضمون الہ آباد سے آئے ہوئے نظام صدیقی نے پیش کیا ان کے اس خیال کو بہت پسند کیا گیا کہ مابعد جدیدیت نئے عہد کی تخلیقیت کی نئی راہ ہے ۔ انھوں نے پروفیسر نارنگ کے اس خیال کی توثیق کی کہ مابعد جدیدیت کو اردو میں ضابطہ بندی کے چکر میں نہ پڑ کر تخلیق کے جشن جاریہ پر توجہ کرنی چاہیے انھوں نے مزید کہا کہ آج کے عالمی اور قومی تناظر میں ،ہمیں مردہ شعری روایت کی ساخت شکنی کرکے ، زندہ اور نامیاتی روایت کی جمپنگ بورڈ سے فکریاتی زقند بھر کر اور مابعد جدید صورتِ حال سے ہم آہنگ ہوکر نئی جمالیات کی تشکیل کرنی ہے ۔

ooo اکادمی کے سمینار کے تیسرے اور آخری دن کے اجلاس میں ادب کے نئے تخلیقی رویوں پر مضامین اور مباحث کا سلسلہ جاری رہا جس میں بمبئی ، بہار ، علی گڑھ اور ملک کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے نوجوان شعرا اور افسانہ نگاروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ فرحت احساس ، مہتاب نقوی ، شاہد جمیل ، شہناز نبی ، اقبال مسعود ، صلاح الدین پرویز ، خورشید اکبر ، نعمان شوق ، آشا پربھات شامل ہیں ۔ عالم خورشید نے " میرے تخلیقی محرکات اور آج کی ادبی فضا " پر شاعری کی حوالے سے گفتگو کی ۔ شاعری کے دونوں اجلاس کی صدارت بشر نواز اور شہریار نے کی ۔ فکشن کے دونوں اجلاس کی صدارت انور عظیم اور قاضی عبدالستار نے فرمائی ۔ افسانہ نگاروں میں کنور سین ، ساجد رشید ، سلام بن رزاق ، پیغام آفاقی ، شموئل احمد ، غضنفر ، حسین الحق ، حمید سہروردی ، انجم عثمانی ، محترمہ ترنم ریاض اور انور قمر نے اپنے تخلیقی محرکات اور فن پر اظہارِ خیال کیا اور بتایا کہ ان کے یہاں تخلیق کا منظرنامہ کس طرح تشکیل پا رہا ہے ۔ بیگ احساس کا خیال تھا کہ آج کا جینوین فن کار سابقہ تحریروں سے آزاد ہوچکا ہے ۔ اردو اکادمی مبارکباد کی مستحق ہے کہ موجودہ سمینار سے نئے تخلیقی رویوں کو سمجھنے کے لیے نئے ادیبوں کو روشنی ملے گی ۔ شموئل احمد نے کہا کہ اگر مہابیانیہ کا دور ختم ہوگیا ہے تو تخلیقی بیانیہ کا دور شروع ہوگیا ہے جس پر ہم لبیک کہتے ہیں ۔ سلام بن رزاق نے کہا کہ میرے افسانے دراصل میری نجات کا ذریعہ ہیں ۔ میں مسلسل زندگی کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں ۔ انور قمر نے کہا کہ جدیدیت ایک نعرہ بن گئی تھی ۔ مابعد جدیدیت کو نعرہ بنانے سے بچانا چاہیے ۔ صلاح الدین پرویز نے انکشاف کیا کہ بیس برس پہلے ایک دن ہردے پر کسی نے دستک دی اور اس دستک کا آہنگ ایک لفظ بول رہا تھا Deconstruction اور اس Deconstruction نے مجھ سے نثر تا لکھوایا ۔ جنگل ڈاڑ اور نگیٹو لکھوائے ۔ انجم عثمانی کا خیال تھا کہ تخلیق خود رو ہوتی ہے اور اکثر تخلیق کار کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا کہ اس کے محرکات کیا ہیں ۔ حسین الحق نے کہا کہ میں نے اور میرے معاصرین نے پندرہ برس پہلے جدیدیت سے آگے کی جو بات کی تھی ، وہ اب اجتماعی رجحان بننے کی منزل میں آگئی ۔ آج کی ادبی فضا واقعی ۶۰، اور ۷۰، سے مختلف ہے اور اس بدلاؤ کو تسلیم کرلینا ہی ہمارے عصری ادبی شعور کی بیداری کا ثبوت ہے ۔ مابعد جدیدیت کے پس منظر میں ادب پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ تخلیقات میں موجود مابعد جدید سوچ کے پس منظر میں بھی اس

اصلاح کے استعمال کا جواز تلاش کیا جانا چاہیے۔ شاید جمیل نے اس بات پر زور دیا کہ ہماری نسل کے لیے ضروری ہے کہ ہم مابعد جدید صورتِ حال عالم خورشید کا کہنا تھا کہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ادب کا رنگ روپ بھی بدلنا ناگزیر ہے۔

ooo تخلیق کاروں کے اختتامی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر قاضی عبدالستار نے کہا کہ دہلی اردو اکادمی کا حالیہ سمینار اس اعتبار سے نہایت یادگار اور کامیاب رہا کہ ایسی کوئی نظیر ماضی قریب کی ادبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس میں تمام شرکا کو اپنی بات کہنے کی آزادی تھی۔ پروفیسر نارنگ کا میں اس لحاظ سے بہت قائل ہوں کہ وہ بلند پایہ نقاد اور ماہر لسانیات تو ہیں، بلند پایہ نقاد اور ماہرِ لسانیات بہرحال دوسرے بھی ہیں لیکن جس پائے کے وہ منتظم ہیں، ویسا اردو دنیا میں دوسرا کوئی نہیں۔ سامعین نے پرجوش تالیوں سے اس بات کی تائید کی اور اس بات کو بھی سب نے پسند کیا کہ اس سمینار سے ایک نئے ادبی مکالمے کی فضا قائم ہوئی جس میں نئے لکھنے والوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کا سب کو احساس تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں آج سے پہلے نئی پیڑھی کے شعرا، ادیب اور افسانہ نگار کبھی کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہوئے۔ آخر میں پروفیسر نارنگ نے بہ حیثیت ڈائرکٹر سمینار تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ادب کی ترقی کے لیے جہاں انحراف ضروری ہے وہاں تسلسل کی بھی اہمیت ہے۔ مابعد جدید تخلیقی رویوں میں جہاں بعض باتیں مالی صورتِ حال سے ملتی جلتی ہوں گی وہاں بہت سی باتیں، ہماری اپنی ادبی اور ثقافتی صورتِ حال کی رو سے بھی ہوں گی۔ سماجی سروکار یا ثقافت پر زور دینے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اکہرے یا وضاحت و صراحت کے ادب کے لیے معنوی تہہ داری اور گہرائی شرط ہے۔ زبان بنیادی طور پر ہے ہی استعاراتی اور علامتی۔ البتہ ابہام اور علامت جب اہمال اور اشکال کی منطق پر چل نکلتے ہیں یا مقصود بالذات ہو جاتے ہیں تو ان کے میکانکی استعمال سے ادب میں یک سرا پن اور یکسانیت آجاتی ہے۔ چناں چہ مابعد جدید تخلیقی رویوں میں اس کے خلاف جو ردِ عمل ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے اس بات کو نظر میں رکھنا بھی بے حد ضروری ہے کہ ادب میں غیر مشروطیت ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔ خالص ادب یا خالص ادبی قدر کے نام پر اس مغالطے سے بھی بہت نقصان پہنچا ہے۔ سابقہ سیاسی نوعیت کے ہدایت ناموں کو رد کرنا برحق ہے لیکن سماجی معنویت کو رد کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ کوئی ادبی قدر زندگی کے معنی یا سماجی معنی کے بغیر قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ چناں چہ جہاں مسئلہ اپنی جڑوں پر اصرار، اپنے تشخص، اپنی ثقافت، اپنی شناخت یا اقلیت کے درد بھرے مسائل یا فرقہ واریت کے مقابلے کا ہوگا، غیر مشروطیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ان سب باتوں کے تئیں سینئر اور نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے حساس ہو جانے سے اور زبان اور فلسفہ، معنی کی نئی آگہی سے ایک نئی تخلیقی فضا ضرور بن رہی ہے۔ اس کے تئیں ذہن کو کھلا رکھنے اور موجودہ ادب کو قاری سے جوڑنے اور اردو کے لسانی تحفظ کی شدید ضرورت ہے۔ پروفیسر نارنگ نے کہا کہ اراکین گورننگ کونسل، سکریٹری اکادمی ڈاکٹر صادق، اسسٹنٹ سکریٹری مخمور سعیدی، پروگرام آفیسرز اور تمام اسٹاف کے تعاون کے بغیر اتنا بڑا سمینار منعقد کرنا ممکن نہیں تھا۔ تالیوں کی گونج میں انھوں نے سب کا نام بہ نام شکریہ ادا کیا۔ آخر میں ڈاکٹر صادق نے سمینار کے تینوں دنوں کی کاروائی کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا اور دہلی اور بیرونِ دہلی کے شرکا کا شکریہ ادا کیا جن کی شرکت نے سمینار کو نہایت بامعنی اور تاریخی حیثیت سے یادگار بنادیا

oo ooo oo

تبسم کاشمیری

ڈاکٹر تبسم کاشمیری ان دنوں جاپان کی اوسا کا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ شاعر ہیں، نقاد ہیں اور ناول نگار بھی۔ تنقید میں ان کی کتابیں لا = راشد اہمیت رکھتی ہے راشد پر انھوں نے اور بھی مضامین لکھے ہیں۔ وہ آج کل میراجی کے ادبی سوانح پر کام کر رہے ہیں اور تاریخ ادب ترتیب دے رہے ہیں۔ ایک ناول "قصہ کہانی" شائع ہوا ہے۔ انھوں نے مغربی زبانوں سے شاعری کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ جن میں پابلو نرودا کی طویل نظم ماچو بچو کی بلندیاں اور اوکتاو ریوپاز کی نظموں کے ترجمے قابل ذکر ہیں۔ شاعری کے چار مجموعے تمثال، نوحے تخت لہور کے، کاسنی بارش میں دھوپ اور بازگشتیں کے پل شائع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں "پرندے، پھول، تالاب" کے نام سے کلیات شائع ہوا ہے۔

تبسم کاشمیری منفرد رنگ اور مزاج کے شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں عصر جدید کی انسانی صورت حال کا گہرا ادراک ملتا ہے شگفتہ طرز ان کے اسلوب کا خاص جوہر ہے۔ تبسم کاشمیری کی چند منتخب نظمیں پیش کی جارہی ہیں۔

(م۔ت)

اک یاد کی دستک چھوڑ آئے

ہم چھوڑ آئے
ہم اس گھر کے دروازے پر
اک یاد کی دستک چھوڑ آئے
اک خوش بو بھی،
اک لمحہ بھی،
اک خواہش بھی
اک خواہش گزرے موسم کی
اک بارش نیلے بادل کی
ہم چھوڑ آئے
اس گھر کی بیلوں کے نیچے
سب خواب پرانے چھوڑ آئے

○

تبسم کاشمیری

چپ کا سناٹا

میرے جسم پہ چپ کے پرندے ، چپ چپ اڑتے رہتے ہیں
میرے جسم پہ چپ کی بارش ، چپ چپ ہوتی رہتی ہے
میرے اندر چپ کا اک سناٹا بجتا رہتا ہے
میرے سانس میں چپ کی خوشبو چپ چپ تیرتی رہتی ہے
میرے اندر چپ کے جنگل چپ چپ اگتے رہتے ہیں
میرے اندر چپ کا اک سناٹا بجتا رہتا ہے
میرے اندر چپ کی جھیلیں چپ چپ بہتی رہتی ہیں
میرے اندر چپ کے صحرا ، چپ چپ تپتے رہتے ہیں
میرے اندر چپ کا اک سناٹا بجتا رہتا ہے
میرے اندر چپ کے بادل چپ چپ تیرتے رہتے ہیں
میرے اندر چپ کے رستے چپ چپ چلتے رہتے ہیں
میرے اندر چپ کا اک سناٹا بجتا رہتا ہے

٥

تبسم کاشمیری

بھاری بھرکم لڑھکتے دن

یہ دن بھاری بھرکم لڑھکتے ہوئے دن
یہ دن اپنے بدنوں پہ ایسے گزرتے ہیں
جیسے کہ کوئی بہت بھاری انجن
پتھریلی سڑکوں پہ دن بھر چلا ہو
شب و روز ہم
اپنے جسموں کی ٹوٹی ہوئی کشتیاں
کالی سڑکوں کی جھیلوں میں
غرقاب کرتے رہے ہیں
یہاں بین کرتی ہواؤں میں کھلتے
گلابوں میں دکھ ہیں
یہاں سارے دکھ
تار جسموں کی سیاہی میں
بھیگی ہوئی سوما باؤلی ہڈیاں چوستی ہیں

یہ دن بھاری بھرکم لڑھکتے ہوئے دن
یہ سڑکوں کی جھیلوں میں غرقاب ہوتی ہوئی کشتیاں
ہر اک شے زمانے کے چلتے ہوئے زرد ساگر میں بہتی
تصادم کی صد منزلوں سے گزرتی
بہت خامشی سے
ابد کے سمندر میں
چپ چاپ اترتی چلی جا رہی ہے

O

تبسم کاشمیری

حیرت خاں ڈوب گیا حیرت میں

اس نے سنگترے کا رس نکالا
تو زور کا دھماکا ہوا
اس نے ٹماٹر چھیلا
تو دھواں نکلنے لگا
اس نے دوڑ کر آلو کاٹا
تو بھاپ نکلنے لگی
حیرت خاں، حیرت کے پانی میں
ڈوب گیا
ڈوبتا چلا گیا
اس نے کیکڑے کی ٹانگیں کاٹ کر
اپنی ٹانگوں سے جوڑ دیں
کچھوے کی پیٹھ اتار کر
اپنی پیٹھ پر کس لی
اور الو کی آنکھیں نوچ کر
اپنی آنکھوں میں جڑ دیں

حیرت خاں بازار میں نکلا
لوگ اسے حیرت سے تکنے لگے
بہت ہی حیرت سے

اب سب کچھ بدل گیا تھا
وہ الو کی آنکھ سے دیکھتا تھا
کیکڑے کی طرح چلتا تھا
اور کچھوے کی طرح سوچتا تھا
حیرت خاں، حیرت میں چلتا گیا، چلتا گیا

اس کے سنگترے سے نکلا ہوا دھماکا
ٹماٹر سے نکلا ہوا دھواں
اور آلو سے نکلی ہوی بھاپ
گھر میں اس کا انتظار کرتی رہی
مگر حیرت خاں حیرت میں
ڈوبتا گیا
حیرت خاں حیرت کے بہت گہرے پانی میں
ڈوبتا گیا
اور پھر بالکل ڈوب گیا

○

۵۰

تبسم کاشمیری

مسٹر جی۔ایس۔شاہ اور اس کی قبر

شب بارہ بجے ۔ ٹھیک بارہ بجے یا کبھی ساڑھے بارہ بجے بھی
وہ سوجاتا ہے ہر روز ۔ جاکر اپنی قبر کے عذاب میں
قبر بھی جلتی رہتی ہے رات بھر
چھت پہ ایک روشنی ۔ مدھم بے آواز روشنی
اس کی قبر میں سانپ نہیں ۔ بچھو نہیں ۔ ہزار پایے نہیں
چھپکلیاں نہیں ۔ کانٹے نہیں ۔ جھاڑیاں نہیں ۔ اور خار پشت بھی نہیں
پھر بھی اسے نیند نہیں آتی
اس کی قبر کے فرش پر ہے ریشم کی چادر
جس کے نیچے ایکرائیلیک کا کمبل ہے اور کمبل تلے فوم بیڈ
سرہانے سنبل کا تکیہ اور تکیے تلے خواب آور گولیاں
ایک کونے میں کاغذی پھولوں کا گل دستہ
اور کاغذی پھولوں کی خوش بو
...... دیوار کے ساتھ سٹیریو ڈیک اور وی سی آر
اور الماری میں لاس ویگاس کی عریاں فلمیں
جنھیں دیکھتا ہے وہ اپنے دوستوں
اور ان کی خوب صورت بیویوں کے ساتھ
یا کبھی اپنی داشتہ کی صحبت میں
جب وہ معلق ہوجاتا ہے کسی جنسی خلا میں

وہ اٹھتا ہے ہر روز اپنی قبر سے صبح سات بجے

بھونکنے لگتا ہے اس کے اندر سے ایک زرد کتا
سوا سات بجے اخبار ، ساڑھے سات بجے صبح کی چائے
پونے آٹھ بجے ٹائلٹ ، آٹھ بجے ناشتہ ....
اور ساڑھے آٹھ بجے گھر سے باہر
چھینا جھپٹیوں کی جھاڑیوں میں دن بھر کی جنگ
منافقتوں کے مورچوں کی تعمیر
زرگری کے برزخ
چاپلوسیوں کا گولہ بارود ، خوشامد کی سیڑھیاں
ضمیر فروشی کے مسلخ اور ان میں ہر روز ڈھیروں خون کے ڈھیر
سونے چاندی کے اوراق سے جگ مگ ، سجے سجائے ایمان کے تھال
پیٹ سے حلق تک نیتوں کے متعفن ، غلیظ ، درگند پانی
تنفس میں تنول کے گلے سڑے کیکڑوں کی تیز بدبو
اشتہاؤں کے پھنکارتے عفریت اور ان کے ان تھک خواب
چوراہوں میں ٹریفک کی آتش بازی
یہ سب کس لیے ؟
اپنے خاندانوں کو اعلیٰ پروٹین پر پالنے کے لیے ؟

اسے آتی ہے ہر روز اپنی قبر کی یاد رات دس بجے
پھر وہ زرد گوش لوٹتا ہے گھر کو
دن بھر کی الجھنوں ، گھبراہٹوں اور پشیمانیوں میں لت پت ،
ناکامیوں کے عرق میں شرابور اور خوشیوں کے کچھ سرخ پھولوں سے آراستہ بھی
ڈنر ٹیبل ، تازہ تازہ ذائقے ، پروٹین پر پلتے جسم ، گپ شپ ، قہقہے ......
اور کچھ دیر کے لیے مباشرت ، پھر تھکن اور نیند ......
اسے وقتِ مقررہ پر قبر آواز دیتی ہے
وہ کہتا ہے " آرہا ہوں ، ابھی آرہا ہوں ، ذرا انتظار کرو "
بارہ بجے ، ٹھیک بارہ بجے ، یا کبھی ساڑھے بارہ بجے بھی
وہ سوجاتا ہے ہر روز .... اپنی قبر کے عذاب میں
بد باطنی کی چادر کے تموّجات کے اوپر
منافقت ، ضمیر فروشی ، خوشامد ، لوٹ کھسوٹ
اور ، [illegible] کا [illegible] کمبل اوڑھ کر

میرہاشم

تمھاری مرضی

(۱)

کچھ اس طرح سے ہوا اچانک
کہ اک قیامت ہو جیسے برپا
پہاڑ سارے ہیں ریزہ ریزہ
زمیں سے لاوا ابل رہا ہے
دہکتا سورج بجھا ہوا ہے
دمکتے تارے ہیں سہمے سہمے
سمندروں میں ہے اک تلاطم
ہیں ناگ کی طرح پھن کو پھیلائے ساری موجیں

(۲)

یہ غم ہے ایسا کہ جس کا کوئی نہیں مداوا
یہ زخم وہ ہے کہ جس کا مرہم نہیں ہے کوئی
کسے ہے چارہ گری کا دعویٰ
کوئی بھی عیسیٰ نفس نہیں ہے
شکستہ کشتی کا کوئی بھی ناخدا نہیں ہے
مگر خدا ہے
تمھارے اوپر
تمھارے بھیتر

(۳)

ادھر کنارے کی سمت دیکھو
عروسِ نو کی طرح یہ دھرتی سجی ہوتی ہے
نکل کہ سورج بڑی تمنا سے دیکھتا ہے
ہر ایک گوشے میں نغمگی ہے
ہر ایک ذرے میں زندگی کا ہے رقصِ پیہم
زمین پہلے کی طرح محور پہ گھومتی ہے
وہی ہے ہنگامہ روز و شب کا
وہی ہے سب کچھ، تھا جیسا پہلے

(۴)

یہ غم کا ساگر
بہت ہی گہرا ہے
پر خطر ہے
مگر کنارا نہیں ہے حدِ نظر سے باہر
تمھاری مرضی پہ منحصر ہے

☆ ☆ ☆

میر ہاشم

معجزہ

ہ زمانے کی ہر بات سہتی رہی
ل ندی کوہساروں میں بہتی رہی
سنگِ خارا سے ٹکراتی، گرتی ہوئی
یزہ ریزہ بکھرتی، سنبھلتی ہوئی
ں کے امروز میں کوئی فردا نہ تھا
ت دن سانس لینے کی مہلت نہ تھی
ں کے دستِ دعا
ں سے واقف نہ تھے
ہے رنگِ حنا
یاں خوں چکاں
کڑی آزمائش میں ثابت قدم
ن و دل کی ہر اک جنگ میں
ش سنگ میں
ا کا سائباں اس پہ قائم رہا
ا بے مایہ میں خشک موسم سدا

تلخ فقروں کا زہراب پیتی رہی
دل نوازی کی چھوٹی سی آیت کبھی
اس پہ اتری نہ تھی
ایک دن اس کے غارِ سماعت پہ نازل ہوئے
"مہربانی" ... "محبت" کے دو بول تھے
اس کی آنکھوں کی چٹان سے
چشمے بہنے لگے
دم بخود میں کھڑا دیکھتا رہ گیا
معجزہ!

مصحف اقبال توصیفی

ایک نظم ـــــ تمہارے نام

خزاں کی آہٹیں سن رہی ہو
میرا جسم بجھ رہا ہے
میری سانسوں کے پھول پتے
مرجھا رہے ہیں

O

میں وقت کی شاخ سے نہ جانے کب ٹوٹوں
اور بکھر جاؤں
میری کتابیں، باتیں، تصویریں
کسی مائکرو فلم، آڈیو یا ویڈیو کیسیٹ پر
محفوظ کر لو
دیکھو اب بھی وقت ہے

O

مگر..... وقت بہت کم ہے
مجھے آخری بار چھو لو
میرے خیال کے سینے پر سر رکھ کر.....
کمپیوٹر سے میری فلاپی نکال کر
اپنے بلاؤز کے گریباں میں ڈال لو
نہ جانے کب.....
یہ پہاڑ، جنگل، شہر، سمندر، پاتال، خلاء
(جنھیں میں نے جی بھر کے دیکھا تک نہیں)
لکیروں میں ڈھل کر
گھٹتے ہوئے دائروں.....
ایک ایسے نقطے میں سمٹ جائیں
جو اپنے ہی مرکز کی گہرائی میں ڈوب جائے !!

***

علی ظہیر

نذرِ حافظ شیراز

(۱)

جب سے اس حسنِ بلاخیز نے دعوت دی ہے
اپنے عشاق کو دیداری کی
دل و جاں میرے
اک اندوہ میں غلطیدہ ہیں
نکلیں آخر کس طرح اس زلف کی زنجیر سے
کیا مجھے
اک سانس بھر بھی
وصل کی خوشیاں نہیں مل پائیں گی
دردِ تنہائی کا اب مجھ سے سہا جاتا نہیں

(۲)

آمادہ ، شباب جو ہے گلستان اب
خبریں پہنچ رہی ہیں یہ بلبل کے کان تک
ساقی تری شباب سے کر نور جام میں
مطرب کوئی ترانہ محبت کے نام پر
ب کار و بارِ دنیا ہے اپنے مزاج کا
ساقی اک اور جام مشیت کے نام پر

(۳)

جب مرے دل کو کر رہی تھی خوش
مطربِ خوش نوا کی خوش آواز
پچھلے پہر . . . . .
ناگاہ !
اک درد سے بھرا
جاں سوز
بانسری کا لہرا اٹھا
تقوا
اور رندی
دونوں
دھرے کے دھرے رہ گئے

OOO

قاسم ندیم

ویرانیِ دل

رات کے پرہول سناٹے میں
جب چھٹی حس جاگتی ہے
تب روح کے تار
جھنجھنا اٹھتے ہیں
کئی ہیولے سے
روبرو آکھڑے ہوتے ہیں
منتشر خیالوں کا ہجوم
قلانچیں بھرنے لگتا ہے
کسی خوف زدہ خرگوش کی طرح
جو ہلکی سی آہٹ پر بھی
سرپٹ دوڑ پڑتا ہے
پسینے کی چند بوندیں
میری پیشانی پر
ابھر آئی ہیں
تب میں آنکھیں کھول کر
روبرو دیکھتا ہوں اپنے
سائے کو

تب مجھے سورج کی تمازت
محسوس ہوتی ہے
اب سوچتا ہوں
وہ رات کا پرہول سناٹا
میرے اندر کہاں سے
در آیا تھا
آج کتنے ہی شناساؤں سے
ملاقات کی تھی میں نے
ان کے اندر کا سب خالی پن
میں اپنے اندر بھر آیا تھا
نہ جانے کتنے ہی
ویرانوں سے گزر کر
میں اپنے گھر آیا تھا ....

مظہر مہدی

زمین کا المیہ

ہزار ہا دنوں کے بیچ
وہ دن
اس دن کی وہ ساعت
سمندر اپنی
وسعتوں کو چیر کر
زمیں کی سمت یوں بڑھا
جیسے ایک فوج
دوسرے فوج پر حملہ آور ہو جائے
زمین اپنی مدافعت میں
ناکام
اندھیروں کے پردوں میں منھ چھپاتی رہی
بنی نوع انسان مویشیوں کی طرح
مویشی اشجار کی طرح
اشجار، حشرات کی طرح ہوئے
نہ ان کے لیے چراغ جلے
نہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھے
ہواؤں میں بس سسکیاں ہی رہ گئیں

☆☆☆

ایک نظم

درد کی رات ہے
چشم پرنم
مہتاب عکس مہتاب ہے
اشکوں کی کہکشاں
یخ بستہ ہواؤں کی طرح آہیں
کروٹ کروٹ
وقت بدلنے کا احساس
ہر سو
موت کا پہرہ
ہر گھر مرقد کی طرح خاموش
میری ہی تڑپ
جیسے زندگی ہے

☆☆☆

شہاب اختر

معدوم شناسائی

اب کبھی اچانک سامنا ہوتا ہے
تو کھنکتی مہکتی
یادوں کے دھندلکے سے
وہ سارے لمس
وہ ساری
خوشبوئیں
بکھرنے لگتی ہیں
ہم حیرت زدہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں
کہ اب کیا باقی بچا ہے
اسی بے نام شناخت کے سوا
جو
ہم
دونوں کے بیچ سے
دھیرے دھیرے
معدوم ہوتی جارہی ہے

O

برسات

برسات زوروں کی ہے
بارش نے
آج
شہر کی سبھی
بڑی عمارتوں سے
گندگی
اتار دی ہے
اور
صاف برستا پانی
آسمان کا
زمین تک
پہنچتے پہنچتے
بہت گندہ ہو گیا ہے
جھونپڑے کیچڑ میں اٹ گئے ہیں

O

عطیہ فاطمہ

ضرورت

ں بست
بے قرار تھی
یرے انگ انگ کو
لنے لگے جھٹکے
سارے زخموں کے منہ کھل گئے
ہستہ آہستہ
رہم لگتا گیا
خم بھرتے گئے
تد مجھے
رار آگیا
س کی شخصیت
میرے لیے
ہی ضرورت بن گئی ہے
یے
ا ، پانی اور
ا

سایہ

میں گزر رہی تھی
سنسان راہ سے
میری ملاقات ہوئی
اس سے
جس کے پاؤں الٹے تھے
آنکھیں پیچھے کی طرف
میں ساتھ چلنے لگی
دونوں چلتے رہے
راستے میں
ایک کنواں ملا
اس نے کنویں میں چھلانگ لگادی
میں نے اس میں دیکھا
وہ
کوئی اور نہیں
میرا ہی سایہ تھا

فتیلہ

میری حالت
اس
چراغ کے گیلے فتیلے سی
ہوگئی ہے
جو نہ تو
جلتا ہے
اور نہ
بجھتا ہے بلکہ
صرف
دھواں چھوڑتا ہے

ستیندر کمار

ترجمہ : فردوس گیاوی

تلافی

اس پرائے اور برے وقت میں
اپنی پرچھائیوں سے خوف زدہ
پاؤں میں درد کا غبار لیے
بہت بھٹکا ہوں ماں!
تمہارے غصے کی پرواہ کیے بغیر
کیا کچھ پانے کی چاہ میں اپنے ہی گھونسلوں کو نوچتا
بہت بھٹکا ہوں ماں!
یہ کیسے ہوا
کہ بلیوں کی آنکھوں سے بھی خوف زدہ ہو کر
تیرے آنچل میں چھپ جانے والا میں
بارود میں کیسے بدل گیا
اور تو دور کھڑی آنسو بھری آنکھوں سے مجھے
بدلتا دیکھتی رہی
سیاست کی چال کا مہرا بنتے وقت
میں گونگا، بہرہ اور اندھا تھا
الگ الگ ہاتھوں کا ڈنڈا تھا
میں تلاش کر رہا تھا ایک نئی دنیا
اس سے بے خبر کہ ڈنڈوں کی کوئی دنیا نہیں ہوتی
یہ سچ ہے کہ آج میں بہت دکھی ہوں ماں!
آج تیری انگلیاں پکڑے
دیودار چنار کے درختوں کے بیچ سے
دوڑ پڑنے کو بے چین ہے میرا من
ہزاروں بار
تیرے پاس جا کر لوٹ پڑتا ہوں ماں!
ماں!
آج میں پھر دوڑ کر جانا چاہتا ہوں
اگنی (۱) شیکھر کی کویتاؤں کے پاس
انھیں کے اندر سے جھانکتا ہے میرا بچپن

وہیں کہیں دیکھتے تھے اپنے بجرے میں سوار
گیت گنگناتے ابو
یہ سچ ہے ماں!
کہ وہ مجھ سے بے خبر
مجھے اپنے گیتوں میں ڈھالتا رہا
اور میں اس کے لفظوں کو لہو لہان کر
شیخ نور الدین میں نہیں
اسے ۰ کے چھپن (۵۶) میں بدلتا رہا
میں کتنا خود غرض تھا
اور جلاوطنی کے وقت وہ کتنا بے چین
وہ جاتے وقت سمیٹ لینا چاہتا تھا سب کچھ
وہ مٹی جس میں بسی تھی ہمارے بچپن کی خوش بو
وہ جھیل کا کنارا
جس پہ ہم دوڑتے دوڑتے ہانپ کر گر جایا کرتے تھے
اس کی ڈائری کے ورق میں
دو چار دلودار چنار کے پتے تھے
اور وہ اپنے لفظوں میں مجھے چھپا کر لے جانا چاہتا تھا
شاید وہ جانتا تھا
کہ اس کے لیے وہ صرف لفظ نہیں ہے
بلکہ اس میں پوشیدہ ہے ایک جیتا جاگتا سنسار
اسے یقین تھا کہ اگر وہ زندہ رہا
تو پھر سے بس سکتی ہے ایک نئی دنیا
پھر سے بکھیری جا سکتی ہے خوش بو
ماں!
میں لوٹ آنا چاہتا ہوں اپنے گھر
اور جانا چاہتا ہوں ان کوچاؤں میں
اور کہنا چاہتا ہوں کہ تم سے دور رہ کر
میں بھی بہت رویا ہوں یارا
ماں کیا تو مجھے معاف کردے گی
کیا میرا یار مجھے معاف کرے گا
ماں کالی رات کے اس آخری پہر میں
تیری گود میں سر رکھ کر
بہت رونا چاہتا ہوں ماں
ماں!
میں اب کب لوٹ کر آؤں گا تیرے پاس؟
اگنی شیکھر کے پاس
سیاست کی کارگزاریوں پر تھوک کر
شیخ نورالدین بن کر
اپنے روٹھے ہوئے بسنت کو منانے کے لیے
جو کہیں کھو گیا ہے
میلے میں کسی بچے کی طرح

---

(۱) اگنی شیکھر ہندی کے ایک مشہور و معروف جن کا تعلق کشمیر سے ہے۔

O

ماں بہادر سنگھ

ترجمہ : قاسم ندیم

ماں جانتی ہے

بیمار بچہ سوال کرتا ہے ۔ دودھ کا رنگ کیسا ہوتا ہے ؟
ماں جانتی ہے ۔ یہ سوال نہ جانے کب خون میں بدل جائے گا
بہت کچھ ہو رہا ہے ۔ کس کے لیے ہو رہا ہے ؟
ماں جانتی ہے ۔ بچے تب تک دودھ نہیں پائیں گے
جب تک اپنا خون نہیں بہائیں گے
سرمئی شام کی آنکھوں میں
اندھیرے کی سیاہ گائیں رنبھانے لگی ہیں
ڈوبتی راہیں صبح کا پتہ پوچھ رہی ہیں
بچے کا سوال چاندنی پھیلنے کے بعد
دم دار تارے کی طرح بے حرکت ہے
ماں دیکھتی ہے ۔ چاندنی کا دودھ
اس کی روشنی پی رہی ہے
آسماں کی ہریالی میں دم دار تارا لٹکا ہوا ہے
اس کے سینے میں سوال اتر گیا ہے

امریکہ میں دن ہے
یہاں کیسے رات ہے ؟
اس میں کہیں کوئی چمکتا ہے ..... نہیں ...... نہیں
پیار تو لا محدود ہے
وہ ہر سوچ کو چاندنی پلائے گا
اس کے توتلے سوال کے سکوت کو
جواب پانے کی سمت
خون کا گل ضرور کھلائے گا
اس کی آنکھوں کے جھل مل دم دار تارے سے
سفر بندھے ہیں
بیٹا اپنا سوال
ماں کی سوکھی چھاتیوں میں تلاش کر رہا ہے
وہ بھلے ہی نہ جانے ، ماں تو جانتی ہے
ممتا بھرے دودھ کا رنگ
خون کی سرخی سے ، سفید کیسے ہو جاتا ہے !!

***

میر ہاشم

O

ویسے کہنے کو تو یہ سارا جہاں ہے میرا
اب مری ذات سے رشتہ ہی کہاں ہے میرا

مضطرب وہ بھی ہے اس بات کا دل کو ہے یقیں
کوئی کہتا ہے کہ یہ صرف گماں ہے میرا

لاکھ کہتا ہوں کہ میں بھول چکا ہوں اس کو
میرے لہجے سے مگر جھوٹ عیاں ہے میرا

دور نظروں سے سہی ، دل سے وہ جائے کیسے
گھر تو دراصل اسی کا ہے ، مکاں ہے میرا

یہ غزل اس کی ہے ، گو میں نے کہی ہے ہاشم
ذکر سارا تو اسی کا ہے بیاں ہے میرا

☆ ☆ ☆

O

میں آگہی کے سفر میں ہوں ، جذر و مد میں ہوں
جنوں کی حد سے نکل کر خرد کی زد میں ہوں

خیال و خواب نہیں ہوں ، نہ کوئی افسانہ
میں اک حقیقتِ سربستہ خال و خد میں ہوں

میں تم سے دور ہوں ، لیکن میں تم سے دور نہیں
تمہاری حد سے نکل کر تمہاری حد میں ہوں

اسے بھی زیست میں اک روز زندگی تو ملے
یہ کہہ رہا تھا کوئی ، جیتے جی لحد میں ہوں

میں کوئی سایہ نہیں ہوں کہ قد سے بڑھ جاؤں
میں اپنے آپ سے واقف ہوں ، اپنے قد میں ہوں

☆ ☆ ☆

رئیس الدین رئیسؔ

O

مرے قدموں تلے افلاک کردے
جہاں ذرّوں مری املاک کردے

شجر شرما رہے ہیں یا الٰہی
عطا پھر سے انھیں پوشاک کردے

کھنڈر خوابوں سے اے غافل نکل آ
گریباں سحر کو چاک کردے

سراپا درد مجھ کو کردیا ہے
مری آنکھوں کو بھی نمناک کردے

وہ چاہے تو ڈبو دے سانے کو بھی
وہ چاہے سنگ کو تیراک کردے

سبھی سے چھین لے یہ چبھتے فقرے
ہر اک مخلص کا لہجہ پاک کردے

رئیسؔ اب جھوٹ کے پھل پک چکے ہیں
بس اک پتھر نشانہ تاک کردے

☆☆☆

اقبال متین

O

ہوا ہے تیز تو بے آب و گل ہی جائے
شجر کے ساتھ مرا جسم چھل ہی جائے

ندامتوں نے اسے بوکھلا دیا ہو
وہ میرے سامنے آکر خجل ہی جائے

ہری ہے شاخ تو کومل کلی کا اترانا
نہ راس آئے گا جب پھول کھل ہی جائے

ملو نہ تم تو مری زندگی نہ جائے گی
یہی تو ہوگا کہ آنکھوں سے دل ہی جائے

وہ آکے اپنا تصور بھی مجھ سے لے لے
سما کے مجھ میں مگر مجھ کو مل ہی جائے

نہ سینت سینت کے رکھو یہ غم کے سناٹے
قلم اٹھاؤ کہ ہر زخم سل ہی جائے

خطوط پا کے ستائش کے رک نہ جاؤ متینؔ
نوردِ دشت رہو کچھ تو مل ہی جائے

☆☆☆

مصطفیٰ شہاب

O

جنگ پھر اس سے ٹل گئی ٹھن کر
اور بگڑے گا وہ مگر من کر

صرف لَو میں میرا قیام نہیں
اڑتا جاتا ہوں دھواں بن کر

پسِ پردہ نہ تھا کوئی پھر بھی
ایک صورت سی رہ گئی چھن کر

ھر شکستہ سہی مگر اس سے
م نکلتے ہیں روز بن ٹھن کر

ن کے چقماق سے شہاب اپنی
ن کی اندھی گپھا کو روشن کر

☆ ☆ ☆

O

گواہی دل کی ہم تسلیم کرتے
تو اپنے فیصلے ترمیم کرتے

مجھے بکھرا دیا بے خوفیوں نے
مرے خدشے مری تنظیم کرتے

مری کشتی مرا ساحل نہ ہوتی
تو دریا کب میری تعظیم کرتے

نئے غنچے، پرانے آب و گِل کی
میرے بچے، میری تکریم کرتے

شہاب اپنی محبت کا خزانہ
کہاں تک جاؤ گے تقسیم کرتے

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر کرامت علی کرامت

(نذر غالب)

تو جو گل ہے تو جاہوں تنہ ناہا یا ہو
تو مرا ہے میں ترا ہوں تنہ ناہا یا ہو

کبھی میں خونِ وفا ہوں ، تنہ ناہا یا ہو
کبھی میں رنگِ حنا ہوں تنہ ناہا یا ہو

میں ہوں جگنو کی طرح دشت میں گم بعدِ سحر
اس طرح تجھ میں فنا ہوں تنہ ناہا یا۔ہو

مجھ پہ اسرار و معانی کا یہ گنجینہ کھلا
وقت کا جامِ بقا ہوں تنہ ناہا یا ہو

میری فطرت میں ہے شعلوں کا تموج پنہاں
گرچہ مٹی سے بنا ہوں تنہ ناہایا ہو

قطرہ دریا سے ملا ہے تو بنا ہے دریا
میں خودی ہوں کہ خدا ہوں تنہ ناہایا ہو

سیکڑوں بار میں پامال ہوا ہوں پھر بھی
پھول بن کر میں کھلا ہوں تنہ ناہا یا ہو

یہ دوئی اب ہے مرے واسطے سہنا مشکل
تو جدا ہے میں جدا ہوں تنہ ناہا یا ہو

مجھ کو سنتا نہیں کوئی بھی فقط تیرے سوا
ایک خاموش صدا ہوں تنہ ناہا یا ہو

مجھ کو لوٹا ہی نہیں سکتا کبھی بابِ اثر
ایک بے کس کی صدا ہوں تنہ ناہا یا ہو

مٹ گیا مجھ میں ہر اک فرقِ وجود و جوہر
صرف اظہارِ انا ہوں ، تنہ ناہا یا ہو

از ازل تابہ ابد میں ہوں عدم کی تصویر
تری رنگین ادا ہوں ، تنہ ناہا یا ہو

عارضِ شب پہ مچلتا ہوں میں آنسو بن کر
چاند تاروں کی ضیا ہوں تنہ ناہا یا ہو

تو ہے پوشیدہ کرامت ، مجھے ایسی دے نظر
میں تجھے دیکھنا چاہوں تنہ ناہا یا ہو

شکیل اعظمی

O

برہنہ سر ہوں اک دستار دے دے
مرے مولا ! مجھے گھربار دے دے

فلک کو چوم لینا چاہتا ہوں
مری بنیاد کو دیوار دے دے

غزل کی آبرو رکھنی ہے مجھ کو
مرے افکار کو معیار دے دے

میں تجھ سے بات کرنا چاہتا ہوں
زباں کو جراءتِ اظہار دے دے

ہوس کے ہاتھ بڑھتے جا رہے ہیں
گلوں کی ٹہنیوں کو خار دے دے

☆☆☆

O

ندی کو آب دیا ہے تو کچھ بہاؤ بھی دے
مری غزل کو نیاپن بھی دے رچاؤ بھی دے

چلا کے سرد ہوا مجھ کو منجمد بھی کر
پگھل کے پھیلنا چاہوں تو اک الاؤ بھی دے

کہ جس کے درد کا احساس میرے جیسا ہو
کبھی کبھی مری فطرت کو ایسا گھاؤ بھی دے

عذابِ سیلِ مسلسل جو دے رہا ہے مجھے
تو سطحِ آب پہ چلنے کو ایک ناؤ بھی دے

مسافرت کے کئی مرحلے تمام ہوئے
کہ میری خانہ بہ دوشی کو اب پڑاؤ بھی دے

☆☆☆

O

غلط تھا ، پر ہمارے نام تھا کچھ
بھیانک ہی سہی انجام تھا کچھ

ہر اک چہرے پہ مکاری لکھی تھی
ہمارے سر پہ بھی الزام تھا کچھ

میں پہنچا تو وہ واپس جا چکی تھی
مجھے بھی زندگی سے کام تھا کچھ

ملا تھا ایک خوش بودار چہرہ
گلوں سے ملتا جلتا نام تھا کچھ

ان آنکھوں میں جو ہم سے چھپ رہی تھیں
ہمارے واسطے پیغام تھا کچھ

یہی تھی انفرادیت ہماری
ہماری ذات سے بھی عام تھا کچھ

مگر یہ وسعتیں پہلے کہاں تھیں
غزل میں پہلے بھی ابہام تھا کچھ

☆☆☆

حمیدالماس

O

شفیق صبح سے منسوب زندگی ہوگی
تو شاخ شاخ پہ رقصاں شگفتگی ہوگی

تمھارا گھر بھی ہے شامل حصار بندی میں
عجب نہیں کہ دلوں میں کشیدگی ہوگی

نشاط لفظ و معانی نشانِ رحمت ہیں
ہمارے حصے میں شاید یہ سرخوشی ہوگی

تمھارے شہر سے آئی تو تھی ہوائے عزیز
بلندیوں سے وہ ٹکرا کے رک گئی ہوگی

کہا گیا ہے ہر اک دور میں کہ ساعتِ نو
بہت خراب رہے گی بہت بری ہوگی

سنا ہے حزبِ مخالف بھی ہوگیا قائل
دلیل آپ کی معقول ہی رہی ہوگی

تمام عمر کا حاصل اسی کو سمجھیں گے
وہ اک نگاہ جو الماسؔ سرسری ہوگی

☆☆☆

اکمل حیدرآبادی (مرحوم)

O

کس کو غزل سنائیں غزل آشنا ہے کون
شہرِ غزل بتا کہ یہاں رہ گیا ہے کون

عہدِ وفا کا پاس نہ ترکِ وفا کا غم
سب زلف کے اسیر، اسیرِ وفا ہے کون

ہم چپ رہے تو لوگ سمجھتے ہیں چپ ہوے
آنکھوں میں سب لکھا ہے مگر جانتا ہے کون

دستِ طلب دراز، نہ چاکِ قبا دراز
دیکھیں فقیرِ عشق کو پہچانتا ہے کون

ہم بستیاں بسا کے اکیلے ہیں آج بھی
کوئی یہ پوچھتا نہیں باہر کھڑا ہے کون

دنیا کو جستجو کہ تری جستجو ہے کیا
تو ہے کہ بولتا ہی نہیں بھاگیا ہے کون

ہر پل میں سوچتا ہوں کہ تو کس کا ہوسکا
تو بھی کبھی یہ سوچ کہ تیرا ہوا ہے کون

وہ آج پوچھتے ہیں کہ اکملؔ ہے کس کا نام
یوں ہے تو کل کہیں گے بتاؤ خدا ہے کون

☆☆☆

کاوش عباسی

O

شب و روز اک جدائی مرے دل میں جو بسی ہے
مجھے کاٹتی ہے سب سے مرا خون چوستی ہے

مرے آنسوؤں کی شورش ، مری جنگ سب شبوں کی
مری ہار سب دنوں کی مرے ساتھ جاگتی ہے

مرا جو بھی واقعہ ہے کوئی سخت سانحہ ہے
کوئی ات سیاہ بختی مرے بخت میں ملی ہے

سرِ راہ میں کھڑا ہوں ، وہی چہرہ دیکھنے کو
جسے جتنی بار دیکھا ہوس اور بھی بڑھی ہے

نہ بدن کا لطف بدلا ، نہ نظر کا عکس بدلا
وہی دل میں سو ستارے ، وہی پیچ ایک سی ہے

ہی سوچ کے ہمالے ، وہی خواب کوسوں پھیلے
وہی آسماں کی وسعت ، وہی اڑتی زندگی ہے

☆☆☆

O

کہنے کو میرے تن پہ جو ٹانکے رفو کے ہیں
ٹانکے نہیں جمے ہوئے قطرے لہو کے ہیں

ٹپکی زمیں پہ ہے مرے حصے کی ہی شراب
ٹکڑے زمیں پہ میرے ہی ٹوٹے سبو کے ہیں

سازش سے کیوں ہو سر مری ہر منزلِ نجات
کیوں میرے سارے حربے کسی حیلہ جو کے ہیں

دشمن ہو دشمنوں کے نہ تم دوستوں کے دوست
سب معرکے تمہارے فقط گفتگو کے ہیں

سنگت میں جن کی تم نے بہایا ہمارا خوں
وہ لوگ آج پیاسے تمہارے لہو کے ہیں

☆☆☆

ڈاکٹر محمد علی اثر

وقت ہی جب دلپئے آزار ہے
سانس لینا بھی بہت دشوار ہے

زندگی جیسے کہ زنداں ہوگئی !
وسوسوں کی ہر طرف دیوار ہے

پیڑ سے پھر سب پرندے اڑ گئے
پھر بلائے ناگہاں تیار ہے

اک کھنڈر ہے زندگی تیرے بغیر
تیرے دم سے دشت بھی گلزار ہے

سوچتا ہوں گفتگو یہ آپ کی
پھول کی پتی ہے یا تلوار ہے

ہاتھ میں تیرے ہے میری وسعتیں
میں ہوں نقطہ اور تو پرکار ہے

لے نہ ڈوبے تجھ کو تیرا انکسار
دیکھ یہ دنیا بڑی عیار ہے

بندشِ تارِ نفس ہے اے اثر
ڈور یہ ٹوٹی تو بیڑا پار ہے

O

فاطمہ تاج

میں ہوں دلِ مضطر ہے ترے غم کی گھڑی ہے
اے ہمدمِ دیرینہ ! مری جاں پہ بنی ہے

آہٹ ہے نہ جنبش ہے نہ پرچھائیں کسی کی
تا حدِ نظر ، چادرِ تنہائی بچھی ہے

اٹھتے ہیں دل و جاں سے دھوئیں کے کئی بادل
معلوم نہیں آگ ، لگی ہے کہ بجھی ہے

لگتا ہے کوئی بیٹھا ہے پلکوں کو بچھائے
تو ہے ، ترا سایہ ہے کہ پرچھائیں مری ہے

اس لوحِ تمنا کو توجہ سے پڑھو تم
میں نے یہ عبارت بڑی حسرت سے لکھی ہے

آئے تھے مری رہ میں مقاماتِ فغاں بھی
اس واسطے اب تک مرے ہونٹوں پہ ہنسی ہے

اک شہرِ وفا ہی میں سکونت ہے ہماری
کچھ دور مرے گھر سے ، ترے گھر کی گلی ہے

حالاتِ سفر تاج تمھیں کیسے بتاؤں
ہر شرطِ وفا ، جادۂ منزل کی کڑی ہے

O

اقبال متین

نامراد

وہ بلاشبہ اچھا آدمی تھا لیکن اب سبھوں نے اپنی ضرورتیں اس سے حاصل کرلی تھیں۔ اس کے باوجود بھی یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اب ں کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی اب اس سے بیزار سا ہوگیا تھا۔ چاہتا تو نہیں تھا کہ وہ کہیں مر کھپ جائے۔ اپنی زندگی آپ جیتا ہے را کیا بگاڑ لیتا ہے۔

اپنی جھولی میں سب کے واسطے محبت لیے لیے پھرنا اور یہ سمجھ لینا کہ اس ایک جذبے سے وہ اپنے پرائے کو جیت جائے گا، اسے بڑا نگا پڑ رہا ہوگا جسے وہ آسان سمجھتا تھا۔ وہ تھا ہی کچھ اس طرح اپنا بھی، پرایا بھی جو زمانے کے ساتھ رہ کر زمانے سے الگ چلنا چاہتا تھا۔

میں اس سے اپنی بیزاری کو تقویت دینے کے لیے اس کی کمزوریاں اور کوتاہیاں ڈھونڈنے لگا۔ جب ڈھونڈنے لگا تو مجھے پتا چلا کہ اس ے پاس سوائے اس کے کچھ اور ہے ہی نہیں جسے وہ تسخیرِ ذات و کائنات کا وسیلہ سمجھتا ہے اور اس کو ابھی تک یہ معلوم ہی نہیں ہوسکا ہے کہ وہ لت جس پر آج بھی وہ اترا رہا ہے وہی تو اس کی جان کا زیاں ہے، جس کی وقعت ٹھیکریوں سے زیادہ نہیں ہے۔ میں سچ کہوں میری کبھی ں سے بڑی شناسائی تھی۔ بلکہ جی کڑا کر کے اعتراف کرلوں کہ وہ بھی مجھے بہت پسند تھا اتنا کہ اس کے آدرش میرے اپنے بھی تھے۔ لیکن اب ں اعتراف سے کیا حاصل کہ وہ شاید اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

اب تو لوگ مجھ پر بھی شبہ کرنے لگے تھے۔ سرگوشیاں ہوتیں، کانا پھوسی ہوتی۔ ایسی نظریں جو جسم اور روح کو چھید دیتی تھیں، مجھے یرے میں لیے رہتیں۔

یہی ہے اس کا قاتل، یہی ہے۔

ہنستا پھرتا ہے۔

ہاں اس لیے ہنستا ہے کہ قتل پہچانا نہ جائے۔

کچھ بھی ہوگا، ہٹاؤ بھی۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ مکھیاں بھن بھنا رہی ہیں۔ جانے اتنی ساری مکھیاں کہاں سے آجاتی ہیں۔ اس طرح ٹ پڑتی ہیں جیسے سب کچھ انھیں کا ہے۔

لیکن وہ ہم سب کا دوست تھا یار۔ اتنا ہے ضرور کہ مذاق میں بھی چٹکی سے مسکنا اسے نہیں آیا۔ لوگوں نے اسے پاؤں کے نیچے روندا تو ں کے جوتوں میں اتنی کیلیں تھیں کہ لہولہان ہوگیا وہ۔ دھوپ میں بیٹھ بیٹھ کر اپنے زخم سکھائے۔ روندنے والے نے پھر محبت کی نگاہ ڈالی ر وہ اپنے آپ سے چھپنے کے لیے سو سو جتن کر کے اس کی طرف دوڑا۔ پھر لہولہان ہوا۔ پھر دھوپ تاپتا ہوا ملا۔ اپنے ہی لہو کی سرخی اور اللہ اں کی جھلسنے والی دھوپ سے بڑی رغبت تھی اسے۔ ایسا آدمی بھلا کیا کسی کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

سب یہی سمجھتے تھے۔ میں بھی یہی سمجھ کر خود اپنے کو بہلاتا۔ پھر اتنا چپ چاپ کیسے مرگیا وہ۔ ایسا چپ چاپ کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی میرا یہ خیال ہے وہ اپنی مرضی سے مرگیا ہے۔ اپنی خودکشی چھپالی اس نے۔ اپنی مرضی سے مرے یا کسی اور کی۔ موت بہرحال موت

ہے۔

لیکن اس کے بیٹے یہ کہہ رہے تھے کہ ہمیں تو بابا کی موت سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ وہ اچھے بھلے چلتے پھرتے زندہ تھے۔ اب رہ گیا
بے وقت تشنج میں مبتلا ہو جانا، بیٹھے بیٹھے گم صم ہو جانا، ایسا کھو جانا کہ لوگ انھیں خود کو ڈھونڈ رہے ہوں تو صاحب ہم یہ کہیں، اس ز
میں جب کہ بیسویں صدی چل چلاؤ پر ہے، یہ سب کون سوچتا ہے۔ کس کے پاس ہے وقت اتنا۔ چلیے ہم کچھ نہیں کرتے ہیں، آوارہ پھ
ہیں۔ لیکن یہ آوارگی بھی تو بے فرصتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس دور میں ہر شخص اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے جینا چاہتا ہے۔ نہ لوگ
کے ساتھ آتے ہیں، نہ کارواں بنتا ہے۔ سب بکواس ہے۔ ابھی جو آپ کے ساتھ ہیں وہ بھی ساتھ نہیں رہتے بس نظر آتے ہیں تو اس میں غ
بات کا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ زندگی اور موت کا کھیل آج کل اسی لیے تکلیف نہیں دیتا کہ نہ موت پہچانی جاتی ہے نہ زندگی۔ یہ بات ام
دوسرے بیٹے نے کہی تھی اور پہلا بیٹا ہنس رہا تھا۔

اس نے کچھ سوچتے ہوئے ذرا سے توقف سے کہا۔

اب بابا کے دوست احباب واویلا پکار رہے ہیں کہ کیا خوب آدمی تھا۔ اکثر اس کے احباب کی فہرست میں پہلا نام تھا اس کا۔ ہمیں
پڑھے لکھے حضرات کی سوچ سمجھ پر ہی شبہ ہے۔ بھئی محبت کی آبرو رکھنی تھی تو سوچ سمجھ کر کرتے محبت۔ یہ تمھاری عادت ہے اور
کمزوری کی نشانی بھی ہو سکتی ہے۔ دیکھیے صاحب، ہم نے ان کو محبت کرنے سے روکا نہیں لیکن ضروری کیا ہے کہ ہم بھی محبت کا جوار
محبت سے دیں جو اس کو نظر بھی آئے۔ کسی عورت سے محبت اور اولاد سے محبت میں بڑا فرق ہو گا ہی۔ ایسی کوئی محبت ہوتی جو بابا کو ا
جیسے لوگوں کو ہے تو کمپیوٹر محبت کا آدمی کیوں نہیں بنا سکتا۔

وہ جو چپ کھڑا تھا اس نے کہا۔

دیکھیے جناب یہ دھاندلی نہیں تو اور کیا ہے۔ بہتر سال کی عمر میں آپ اپنے باغیچے کی آبیاری کرتے پھرتے تھے۔ گجردم سے پہلے
کہے ہوئے آدمی کی طرح آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتے۔ پھر ان کی میز ہوتی، وہ ہوتے۔ یہ سلسلہ جانے کب تک چلتا۔ اندھیرے ماحو
لائٹ جل جانے سے ہم ذرا کسمسا کر جماہیاں لیتے اور پھر سو رہتے۔ پو پھٹتی تو شاید قلم اور کتاب سے جی اچاٹ ہو جاتا ہو گا ان کا۔ وہ۔
اپنے باغیچے میں۔ ہمیں تو پانی کی موٹر کی آواز بھی شاید ہی کبھی جگاتی۔ نیند آدمی کا طبعی حق ہے۔ اب جیسا کہ میں نے کہا ناشروع ہو گئی۔
کبھی جھک کر، کبھی اکڑوں بیٹھ کر پودوں کی کیاریاں صاف کیں۔ اٹھ کر کھڑے ہوئے تو کبھی ہانپ رہے ہیں، کبھی سرتاپا ہلکان؛
سیدھی سانسیں درست کر رہے ہیں۔ ہم نے منع کیا، ٹوکا تو مسکرا کر جواب دیا:

"میاں میرے پوترے پوتریاں ان درختوں کا پھل کھائیں گے۔ کہیں گے کہ ددو نے کیا آم لگائے تھے، میٹھے، رسیلے، کیسے
پھلدار کھڑے ہیں درخت"۔

ددو نے اچار تو اپنے درختوں کے کھائے ناڈیڈی، ارے آم نہیں کھائے، ناریل کا پانی نہیں پیا۔ خالص ناریل کا پانی تو ان
مطلب تھا۔ وہ پندرہ سولہ سال ہارٹ پیشنٹ رہے ناڈاڈ (Dad) ۔

الاپ شناپ لکھنے پڑھنے سے لے کر باغیچے کی آبیاری تک، ہم اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔ اب اس مکالمہ بازی میں بھلا کون اٹ
لگتا اور آج کون ان بچوں کے منہ لگے۔

پاکستان جو چھیں سال کا چھوٹا کھل کھل کر ہنس دیتا۔ پوتروں کے لیے خرید کر کھانے کو اتنے سارے آم مارکٹ میں کہیں کہیں بچھے ہیں اور بابا آم کے مزے کے پیچھے وہ گٹھلیاں گن رہا ہے جو کھائی بھی نہیں گئیں کہ پوتروں کے لیے ذائقہ انھیں میں ہے

بہر حال ہم نے اپنا فرض پورا کر لیا۔ جہاں جہاں ڈھونڈ سکتے تھے، ڈھونڈ آئے۔ زندہ ہیں تو آ بھی جائیں گے۔

میں اس کے بیٹوں کا منہ تکتا رہ جاتا۔

ایک دن اس کے بیٹے مجھے زندگی کا فلسفہ سمجھا رہے تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کسی خیراتی اسپتال سے بھاگ کر پھر آ گیا ہے۔ مجھے حیرت بھی نہیں ہوئی کہ لو زندہ ہے وہ تو۔

انہوں نے ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ وہ بھی کسی کونے کھدرے سے نکل کر میرے پاس آ بیٹھا۔ یہ جانے بغیر کہ اس کے بیٹے مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے وہ راست مجھ سے مخاطب ہوا، کہنے لگا:

"جس قوم نے یورپ کی صورت دیکھے بغیر ۱۲۳ کروڑ روپے بے حلق نگل لیے وہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرے تو کیا نہ کرے تو کیا"۔

لیکن جب اس نے اپنے بیٹوں کی طرف نظر کی تو مجھے ایسا لگا کہ وہ اپنے بیٹوں سے زیادہ مجھ سے سہما ہوا ہے۔ میں اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ قوم کے غم میں تم اتنے دن کہاں رہے کچھ پس و پیش تو مجھے بھی تھا۔ اگر وہ پوچھ بیٹھتا:

"کیا تم میرے ساتھ نہیں تھے؟" تو واقعی میں کیا جواب دیتا۔

اس کے بیٹے کہہ رہے تھے کہ ہم ۲۳ سال کے ہو گئے ہوں یا ۲۵ سال کے۔ بابا نے ہم کو دنیا میں لایا اسی لیے تھا کہ ہم بھی جوان ہوں اور اپنی زندگی جئیں۔ اب آپ کی اخلاقیات تو دم توڑنے کے قریب پہنچ کر اونگھ رہی ہے اور ہم آرام سے جی رہے ہیں، کیا یہی کافی نہیں ہے۔ ہم بھائیوں کا تو یہ حال ہے کہ ایک دوسرے کی جینس یا ایک دوسرے کی جرسی آنکھ بچا کر ہم میں سے کوئی پہن لیتا ہے تو آپس میں جھگڑ پڑتے ہیں۔ ایسی سخت لڑائی کرتے ہیں کہ بابا دم بخود ہو جاتا ہے۔ ہم یہ جینس یا جرسی اتروا کر ہی دم لیتے ہیں کہ یہ اپنا اپنا حق ہے اور جب پہن اوڑھ کر باہر نکلتے ہیں تو خواہ رات کا ایک بجے کہ دو بجیں آتے تو اپنے مکان کی چھت کے نیچے ہی ہیں کہیں فٹ پاتھ پر تو نہیں سو جاتے۔ پھر بابا کو کس بات کا دکھ ہے؟" وہ ذرا سا رکا، جماہی لی۔ پھر کہنے لگا:

"صبح ہوتی ہے تو ہم کو پتہ نہیں چلتا اور ہم دس گیارہ بجے دن تک بے سدھ سوتے رہتے ہیں۔ یہ ہماری عادتیں، ہمارا مزاج بن گئی ہیں اور ہم مطمئن ہیں۔ ہم نے کبھی آپ سے یہ نہیں کہا کہ آپ چار بجے، ساڑھے چار بجے یا رات کے پچھلے پہر اٹھ کر اپنی میز کا حصہ بن جائیں اور قلم گھستے رہیں۔ آپ نے اپنی نو عمری سے اگر یہی سب کچھ کیا ہے تو یہی آپ کی عادت بن گئی ہے۔ اس میں بھلا کسی فوقیت کا کیا مطلب نکلتا ہے۔ آپ اپنی طرح جیتے ہیں، ہم اپنی طرح"۔

میں نے اپنی نشست کو آرام دہ بنانے کے لیے دیوار سے ٹیک لگانی چاہی۔ ان کا بابا تو کچھ اس طرح بیٹھا سن رہا تھا جیسے کن سوئیاں لے رہا ہو یا کن کھلا ہو چاہو۔

میں نے بہ غور اس کی طرف دیکھا۔ لگتا تھا کہ وہ وہاں ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اس کے بیٹوں میں سے کسی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا:

"کبھی کبھی آپ بہت بے آرام نظر آتے ہیں۔ بابا سے یارانہ ہے آپ کا۔ ہمارا کہا برا تو نہیں لگ رہا"۔

میں نے اس کی بہ غور دیکھا تو اس نے بھی بہ وقت تمام مجھ سے آنکھیں ملائیں۔ لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں موت سے لڑ رہی ہیں۔ مجھے اس

جو پاگل مریض نہیں بنا۔ مریض تو اب مجھے اپنے آپ پر آنے لگا تھا۔ اس کا باپ تو تنہا مونس و غم خوار ہو کر بھی نہ میں نے اس کو ہنس لینے کے قابل بنایا نہ قتل کر کے شہادت کی فضیلت بخشی۔ میں شاید اسی لیے اب اس سے بیزار سا ہوتا جا رہا تھا کہ مجھ سے اس کی مجہولیت دیکھی نہ جاتی تھی اور وہ مجھ میں پناہ لینے کے لیے مجھ میں اترنے کے جتن کرتا رہتا تھا۔ میرا اور اس کا حد درجہ یارانہ ہی اب اس مقام تک دبے دبے لے آیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کی جان کے درپے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ہر جذبے میں محبت کی خوش بو ملانا چھوڑ دے، اس لیے کہ اب ہر خوش بو سے اس کی باس آرہی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ ہر جذبہ اپنے میں ایک نرم سی ایسی انسیت چھپائے رہتا ہے جس میں خوش بو بسائی جا سکتی ہے۔

زندگی جینے میں، زندگی کرنے میں، زندگی بھوگنے میں وہ کچھ ایسا محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ سب کچھ تج کر بھی ہار رہا تھا اور میں اس کے سناٹوں میں قہقہوں سے پتھراؤ کر کے نہ صرف بازی جیت رہا تھا بلکہ اس کو پے در پے زخم بھی لگا رہا تھا۔ اوچھے زخم، گہرے زخم اور وہ تڑپ تڑپ کر انکار کیے جا رہا تھا کہ وہ زخمی نہیں ہے۔ ہم دونوں کی یگانگت کیسی بے کاگی کے ہاتھوں لٹ گئی ہے کہ اس کو سسک سسک کر روتا ہوا دیکھتا ہوں تو بعض وقت میرا بھی جی بھر آتا ہے۔ اس وقت کوئی میرے دل کے قریب چٹکی بھر کر کہتا کہ تم اس نامراد کے چکر میں نہ پڑو ورنہ وہ تو جاوداں جیتا رہے گا، تم مر جاؤ گے۔

زندگی بھر سے کچھ کے لگوا کر جب اس نے یہ سوچا تھا کہ اس کے بیٹوں کے ہاتھ اس کے زخموں کے اندمال کے لیے مرہم فراہم کر لیں گے لیکن ان ہاتھوں نے کاغذی پھولوں کا ایک گل دستہ اپنے بابا کے ہاتھوں میں تھما دیا جو پہلے ہی سے تھر تھر کانپتے تھے۔

وہ ایک دن آپس میں کہہ رہے تھے کہ ہمارے باپ نام کے مسلمان سہی لیکن ان کو اتنا تو معلوم ہونا ہی چاہیے کہ اگر انہوں نے ہمیں پیدا کیا ہے تو رزق دینے والا خدا ہے۔ بابا کی پینشن اتنی تو ہے کہ ہم سب بھائی کھا پی کر گل چھرے اڑاتے پھرتے ہیں۔ بابا اس دنیا میں نہیں رہے گا تو دیکھا جائے گا۔ ایک دن تو اس کے کسی بیٹے نے اس سے مخاطب ہو کر صاف صاف کہہ بھی دیا کہ بھئی آپ کے بعد یہی ہوگا نا کہ بھیک کا ٹھیکرا ہمارے ہاتھ میں آجائے گا لیکن آپ ابھی سے اس کی فکر کیوں کریں۔

جب اس کے بیٹے اس کو یہ سب کچھ کہہ رہے تھے تو میں چھپ چھپ کر سب کچھ سب رہا تھا۔ نہ مجھ سے یہ کچھ سنا گیا نہ اس کا حال زار دیکھا گیا لیکن میں نے سب کچھ سنا بھی اور اس کا حالِ زار دیکھا بھی... شاید اس لیے کہ ایسے موقع پر مجھے محسوس ہوتا کہ میں اس کے مجہول وجود کا ایک توانا حصہ بن جاتا ہوں اور پھر اس میں اور مجھ میں تنازعہ سا شروع ہو جاتا ہے۔

چوں کہ میں نے سب باتیں سن لی تھیں جو نہ اب کلیجہ کاٹتی تھیں نہ رگوں میں خون کے انجماد کا سوال تھا لیکن میں جب اس کے پیچھے سے سامنے آگیا تو اس نے کہا۔

"کیا سارا عالمِ اسلام متحد ہو کر بھی بنجامن نیو تن یاہو کو سبق نہیں سکھا سکتا۔ اس کی حیثیت ہی کیا ہے۔ یروشلم اس کی ملکیت، گولان کی پہاڑیاں اس کی جاگیر، لیکن اہلِ اسلام کی منافقت اپنی جگہ........ اوں ہوں۔ سب بے کار"

وہ سمجھتا تھا میں نے اس کے بیٹوں کی باتیں نہیں سنیں۔ میں نے کہا تم کہنا کیا چاہتے ہو، کہہ کیا رہے ہو۔

ہنس پڑا........ کہا

"وہی کہہ رہا ہوں جو نہیں کہنا چاہتا"۔

میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے وجود کی کش مکش سے ہار کر یا تو مر کھپ جائے یا پھر فرار کا ایک ایسا راستہ چن لے جس سے وہ خوش ہو جائے ...
جانب گئے سایہ دار شجر ہوں۔ اگر وہ روز ایسا کر لہو لہان ہو جائے تو اس کو اپنے زخم سکھانے کے لیے وہ تیتی دھوپ نہ ملے جس کو وہ زخموں کا مرہم بنائے

ونے ہے۔

مجھے یقین ہونے لگا کہ اب اس کی موت یقینی ہے۔ میں نے بھی اس سے دور دور رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ لیکن ایک رات وہ بے تاریکی کے ایک ایسے سیاہ دھبے میں کھڑا ہوا تھا جہاں سڑک کی سرکیوری لائٹ دم توڑ رہی تھی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔

"ارے تم ہو؟"

"ہاں میں ہی ہوں"

یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو؟"

"انتظار......."

"بھلا اس وقت کس کا انتظار؟" اس نے میرے سوال کو ہوا میں اڑا دیا۔

"یلتسن نے گروزنی چیچنیا پر بہیمانہ مظالم کی حد کر دی۔ لاشیں زمین پر، لاشیں زمین کے نیچے، ملبوں کے ڈھیر ہیں۔ کیا کر لیا تمھارے بائیں بازو نے.... بایاں بازو اب دائیں بازو سے اپنی شناخت پوچھ رہا ہے..... سب بکواس۔"

"تو تم یہاں، اس وقت گروزنی کی حفاظت کے لیے ٹھہرے ہو؟"

وہ بوکھلا گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ نہیں چاہتا کہ یہ راز فاش کرے کہ وہ کس کا منتظر ہے۔ منٹ بھر بھی نہیں، لمحوں کی خاموشی کو اس نے روہانسا ہو کر توڑا۔

"بعض وقت راستے کی گرد پیروں پر اچھی نہیں لگتی، پلکوں پر اچھی لگتی ہے۔ دیکھو نا، شہر میں کیسا خون خرابا ہے اور اتنی رات گئے میرا کوئی بیٹا بھی ابھی تک گھر واپس نہیں آیا"۔

میں نے خوں بار آنکھوں سے اسے دیکھا اور کسی سوچ کا سہارا لیے بغیر نفرت سے کہا:

"وہ تو آجائیں گے مگر تم اسی طرح راستوں کی خاک چھان کر مرو گے" مجھے اپنا ہی کہا بڑا گھٹیا سا لگا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا تو اس نے کہا

"ذرا سنو تو......"

میں رکا بھی نہیں، وہ کہہ رہا تھا۔

"میں تو زندہ ہوں۔ میرا جو بھی ہوگا وہ تو ہوگا ہی لیکن تم جو میرے ساتھ بے موت مر رہے ہو"۔

میں راستے کی تاریکی میں ٹھوکر کھا کر زخمی انگوٹھے کو چھوئے بغیر، سوچ رہا تھا کہ واقعی وہ مر گیا ہے یا میں مر رہا ہوں۔ یا پھر ہم دونوں ایک دوسرے میں زندہ ہیں کہیں وہ میں ہی تو نہیں ہوں؟

00 000 00

جیلانی بانو

فاصلے

"امو، امو، ابھی آپ بالکل ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔"

ہم سمجھے کہ..... کہ..... "امو کے آس پاس کھڑے ان کے تینوں بیٹے، ان کی بیویاں، ان کے بچے، سب گھبرا گئے۔ امو زندہ ہیں.... ہم سمجھے کہ..... کہ ہم نے ان کے مرنے کا دکھ کتنی آسانی سے سہہ لیا........

امو سب کی طرف بڑے دکھ کے ساتھ دیکھ رہی تھیں۔

ان کے سب سے بڑے بیٹے نے کتنی جلدی سفید کپڑا ڈال کر امو کا منہ چھپانا چاہا تھا، اگر امو ہاتھ اٹھا کر چادر نہ ہٹا دیتیں تو شاید وہ سب دوسرے کمرے میں جا کر انھیں دفن کرنے کی تیاری شروع کر دیتے!

وہ سب نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ جیسے امو نے دیکھ لیا کہ ان کے مرنے پر کسی کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلے گا۔

دو برس ہو گئے، جب ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کینسر ان کے سارے بدن میں پھیل گیا ہے۔ کسی بھی وقت انہیں کچھ بھی ہو سکتا ہے جب سے یہ بات ان کی دونوں بہوؤں نے سنی تھی، وہ امو کا زیادہ خیال کرنے لگی تھیں۔ ہر مہینے فون پر امو کی خیریت پوچھتیں۔ دوسری بہو ادھر نہیں تھی۔ وہ انڈیا کی گرمی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ پھر بھی وہ ہر سال آتی۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرتی تھی۔ حیدرآباد کی سیر تفریح سے فرصت ملتی تو کسی دن امو کی مزاج پرسی بھی کر لیتی تھی۔ تینوں بیٹے ان کے علاج کے لیے بڑی پابندی کے ساتھ ڈالر اور ریال بھیجتے تھے۔ امو کے لیے بہت اچھا ڈاکٹر..... بہترین علاج..... گھر میں ہر طرح کا آرام.... دن رات خدمت کرنے والی خواجہ بی، جسے دور بیٹھی بہوئیں انعام اکرام سے نوازتی رہتی تھیں۔

شکاگو میں ایک دن صبح سویرے خواجہ بی کا فون آیا۔

"بیگم صاحب کی طبیعت بہوت خراب ہے۔ ڈاکٹر صاحب بولے ان کے بیٹوں کو فون کر دو۔ سب کو جلدی آجاؤ بولو۔"

اس فون سے سارے گھر میں ہل چل مچ گئی۔ سب کے پروگرام ڈسٹرب ہو گئے۔

"اُفوہ..... امو ہمیشہ اسی طرح پریشان کرتی ہیں، بھلا یہ کوئی موسم ہے انڈیا جانے کا۔ گرمی کے مارے مر جائیں گے ہم سب!" ان کی بہو نسیم گھبرا گئی۔

"بیلو..... بیلو.....!"

چاروں طرف سے فون آنے لگے۔

نیو یارک سے جمشید کہہ رہا تھا:

"بھائی جان! خواجہ بی کا فون آیا ہے کہ..... کہ چوبیس گھنٹے.... لیکن مجھے اس وقت لیو لینا بہت مشکل ہے۔"

"لیکن بیٹیا تمھیں یاد ہے کہ ہم سب نے امو سے پرامس کیا تھا کہ ہم چاروں بھائی مل کر ان کی ڈیڈ باڈی اٹھائیں گے۔ اس لیے جانا پڑے گا۔" رشید نے اسے سمجھایا۔

پھر دبئی سے تیسرے بھائی خورشید کا فون آیا:

"بھائی جان..... ہم سب مل کر امریکا تفریح کرنے جا رہے تھے۔ اب تنی کو بھی ساتھ لے جاؤں تو انڈیا میں گرمی بہت ہوگی۔ تب کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ہمارے لیے ریزرویشن کروا دیجیے۔"

"ہاں بھئی میرے لیے بھی اس موسم میں انڈیا جانا بہت مشکل۔"

"امو اچھی بھلی ہوں گی۔ ذرا دل گھبرایا تو خواجہ بی سے فون کروا دیا ہے۔"

"خورشید! ابھی میں نے ڈاکٹر عارف سے بات کی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ چوبیس گھنٹے۔"

"تو پھر میں آجاؤں گا۔ دہلی کے ایک سیمینار کا انوی ٹیشن بھی آیا ہے۔"

"ارے پھر تو ہم ایک ہفتے میں واپس آجائیں گے ماڈیڈ..... " پنکی نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں بے بی۔ ہم چاروں بھائیوں نے امو سے پرامس کیا ہے کہ ہم ان کی ڈیڈ باڈی....

"آفٹر ڈیتھ ...... کتنی معصوم سی خواہش ہے گرینڈ مم کی۔" بے بی نے منہ بنا کر انگلش میں کہا۔ "گرینڈ مم نے اپنے چاروں کے ساتھ زندگی ان جوائے کرنے کا کوئی پرامس کیوں نہیں لیا.....؟"

○ ○ ○

الجھی سانسوں کے درد کو دل میں تھامے، یہی بات امو بھی سوچ رہی تھیں۔ سنسان گھر، خالی کمرے، سونا آنگن۔ اندھیرے کمرے میں اکیلی لیٹی وہ درد سے تڑپ رہی تھیں۔ کسی دوا کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بدن کا کوئی حصہ قابو میں نہ تھا۔ کانپتے ہاتھ سے پانی کی بوتل اٹھانے کی کوشش کرتیں تو سارا بستر بھیگ جاتا۔

"پانی... پانی.... خواجہ بی.... خواجہ بی کہاں مر گئی.... کسی کا فون آیا ہے..... دروازے پر کون آیا ہے؟"

خواجہ بی کمرہ بند کیے اپنے میاں کے ساتھ سوتی رہتی تھی.... "بڑھی کو چلانے کی عادت ہو گئی ہے۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گی میاں۔ دوسری نوکری ڈھونڈ دیں جی اب..."

ان کے میاں کی وکالت بس یوں ہی چلتی تھی، مگر امو نے جائیداد بیچ کر چاروں بیٹوں کو ڈاکٹر، انجینئر بنا دیا۔ اچھی ڈگریاں ملتے ہی سب کے پنکھ نکل آئے اور انھوں نے امریکا کی طرف پرواز کی ٹھانی۔ امو کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ "اتنی دور؟ اللہ میاں کے گھر والے سب امریکا میں جا بسیں گے.....؟"

"ہم سب....؟ تمھیں کون لے جائے گا امریکا۔" بچوں کے ابا نے ہنس کر کہا تھا:

"امریکا میں ماں باپ نہیں رہتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کا ملک ہے۔"

"اچھا۔ تو ماں باپ کہاں جائیں؟" امو نے تعجب سے پوچھا تھا۔

"کوڑے کی ٹوکری میں!" ابا نے خفا ہو کر کہا تھا۔

ویران گھر کے آنگن میں بیٹھی، کبوتروں کو دانا ڈالتے ہوئے، امو سوچتی تھیں کوڑے کا ڈھیر ہی بن گیا ہے یہ گھر۔ بار بار لائٹ چلی جاتی ہے۔ اندھیرے میں ماچس نہیں ملتی۔ پوسٹ مین کوئی خط پھینک جائے تو وہ کسی کیاری کے پیچھے پڑا مہینوں کے بعد ملتا ہے۔ ویسے بھی ان کے بیٹے اب خط لکھنے کی پرانی رسم بھول چکے ہیں۔ کبھی ضرورت ہوئی تو فون کرلیتے ہیں۔ دودھ والا دودھ پھاٹک پر رکھ کر چلا جاتا ہے تو روز کتا اٹھا کر لے جاتا ہے۔ کبھی آنگن میں کسی بچے کی گیند گر جائے تو اندر آنے سے پہلے وہ امو کی صورت دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ رشتے داروں کو فرصت نہیں ملتی آنے کی۔

کئی بار وہ فون پر کہتی تھیں:

"رشید، اب میں تمھارے پاس آجاؤں گی۔ مجھے روز بخار آجاتا ہے، کھانسی بہت بڑھ گئی ہے۔ اکیلے گھر میں جی گھبراتا ہے۔"

"مگر امو آپ کی بیماری کا علاج یہاں بہت مہنگا ہے، گھر میں کوئی نہیں رہتا۔ آپ کی دیکھ بھال کیسے ہوگی۔" رشید، امو کو اپنی مجبوری سناتا تھا۔

"اچھا تو پھر جبی اور طارق سے کہو مجھ سے فون پر بات کریں۔ بچوں کو دیکھنے کو جی چاہتا ہے میرا۔" بچوں کو یاد کرکے انھیں رو گیا تھا۔

"وہ بات یہ ہے امو کہ بچوں کو اردو نہیں آتی۔ اس لیے وہ آپ کی بات نہیں سمجھ سکتے۔"

امو فون رکھ دیتیں۔ "میری بات کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ نہ بچے نہ ان کے ماں باپ۔"

جب چھوٹوں بھائی امریکا گئے تو امو، ابا کے پاس حمید کو چھوڑ گئے تھے۔

حمید کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ سارا دن نکمے دوستوں کے ساتھ گھومتا۔ کبھی اسٹوڈنٹس یونین کا جھنڈا تھامے سڑکوں پر گھوم رہا ہے تو کبھی کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ نعرے لگا رہا ہے۔ پھر ایک دن سنا، وہ کسی پارٹی میں شامل ہوگیا ہے۔

"تمھارے امتحان میں ایک مہینہ رہ گیا ہے۔ اسٹڈی کیوں نہیں کرتے؟" ابا اسے بار بار یاد دلاتے تھے۔

"ابا میں اس سال امتحان نہیں دوں گا۔ مجھے الیکشن کا کام کرنا ہے۔"

ابا بہت خفا ہوئے۔ امو نے رو رو کر سمجھایا۔ مستقبل کے بھیانک نقشے کھینچے، جب زندگی بھر بھائیوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ مگر حمید اب گھر بہت کم آتا تھا۔ پھر خبر آئی کہ کسی مخالف پارٹی کے ممبر کو مارنے کے جرم میں حمید گرفتار ہوگیا ہے۔ سنا ہے وہ آدمی اسپتال میں مر گیا۔

سارے محلے کے لوگ ابا، امو کو پرسہ دینے آئے۔ جانے کون سے گناہ کی سزا ملی کہ حمید اس گھر میں پیدا ہوا۔ اب اسے پھانسی کی سزا ملے گی۔ دوست رشتے دار تعزیت کے لیے آنے لگے۔

"پھانسی پر چڑھیں گے حمید کے دشمن۔ اب وہ تو ہمارا ہیرو ہے۔" حمید کے دوست کہہ رہے تھے۔ ان کی پارٹی اکثریت میں آئی تھی۔ اس لیے کچھ دنوں تک اس مقدمے کی کارروائی چلتی رہی۔ پھر معاملہ ٹھپ ہوگیا۔

ایک دن حمید کا ایک دوست آیا تو اس نے امو سے کہا:

"کوئی پارٹی ورکر دو چار مرڈر کر ڈالے تو پارٹی اسے الیکشن کا ٹکٹ دینے پر مجبور ہوجاتی ہے۔"

وہی ہوا حمید کے کارناموں کی لمبی فہرست نے اسے اپنی پارٹی کا سب سے اہم لیڈر بنا دیا۔

"اب دیکھتا ہوں کہ ہمارے حلقہ کا کون دولہا ہے جو مجھے ووٹ دیے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔"

اممو اور ابا دم سادھے بیٹھے رہتے تھے، جب گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے، ایک جلوس کے ساتھ حمید گھر آیا۔ ابا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے بیٹھے تھے۔ وہ ابا سے گلے ملنے کے لیے جھکا تو ابا پیچھے گر پڑے۔

پھر حمید منسٹر بن گیا اور ضد کی کہ اممو میرے ساتھ دہلی چلیے۔ سرکاری بنگلے میں رہنا۔ گورنمنٹ کے جھنڈے والی کار میں گھومنا۔ خوب ٹھاٹ کرنا۔ اممو نے "منسٹر کی اماں" بننے کے لیے کئی نئے جوڑے سلوائے، نئی چپل خریدی، مگر وہ منسٹر کے بنگلے میں فٹ نہ ہو سکیں۔ نوکروں سے گوشت ترکاری کا حساب مانگتیں، چوکیدار اور ڈرائیور کے سلاموں کے جواب میں "جیتے رہو، سلامت رہو" کہہ کر خوش ہوتیں، بنگلے کے لان میں دھوپ کے رخ کھاٹ ڈال کر پاپڑ سکھانے بیٹھ جاتیں۔ چناں چہ "منسٹر کی بیگم" نے انھیں پھر وہیں بھیج دیا جہاں وہ سر جھکائے اچار مربے بنانے میں جٹی رہتی تھیں۔

تین دن ہو گئے۔ سب اممو کے آس پاس ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ بار بار آکسیجن کی ٹیوب ٹھیک کرتے۔ اممو کو کچھ ہونے والا ہے اس آنے والے دکھ کو وہ اپنے چہروں پر مصور کر چکے تھے۔ اممو بڑی مشکل سے آنکھ کھول کر سب کو دیکھتیں۔

"حمید نہیں آیا؟..... میرا حمید.....!"

"شاید اممو کا دم حمید میں اٹکا ہوا ہے!"

خواجہ بی کہہ رہی تھی حمید دہلی میں ہے۔ اس بار اس کی پارٹی کو الیکشن میں اکثریت نہیں ملی۔ اب حمید منسٹر نہیں رہے گا۔ ایسے وقت وہ دہلی سے باہر کیسے جا سکتا ہے۔

"مگر ہم سب نے اممو سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے آخری وقت....." رشید بہت غصے میں تھا۔

اممو بار بار آنکھیں کھولتیں۔

"تم سب کو اپنے پاس دیکھ کر میرا جی چاہ رہا ہے کہ..... کہ بچوں کو اپنے ہاتھ سے بنا کر پلاؤ....."

"اللہ! اس وقت بھی اممو کا دل پلاؤ میں اٹکا ہوا ہے..... اللہ توبہ!" ان کی بڑی بہو نے گالوں کو چھو کر کہا۔

"اممو..... یٰسین شریف پڑھیے..... اللہ کو یاد کیجیے۔"

"میرا حمید۔ اب میرے جنازے کو کاندھا دینے....." وہ پھر رونے لگیں۔

"تم سب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میرے جنازے کو چاروں بھائی مل کر اٹھاؤ گے۔"

"ہیلو... ہیلو... اب اممو کا کیا حال ہے....." حمید کا دہلی سے فون آگیا۔

"کیا؟..... آکسیجن دی جا رہی ہے مگر اب آکسیجن دینے سے کیا فائدہ؟ جب ڈاکٹر کہہ چکا ہے..... بھائی جان میری بات سنیے، اگر خدانخواستہ اممو کو آج رات میں کچھ ہو گیا تو پرائم منسٹر بھی مجھے پرسہ دینے آئیں گے..... لیکن یہ سوں ہماری شہری ختم ہو رہی ہے۔ اس لیے آپ اممو کو فوراً کسی اچھے شاندار ہاسپٹل میں لے جائیے۔ انتقال کی خبر ٹی وی پر آئے تو اس ہاسپٹل کا نام بھی ہونا چاہیے۔" پھر اس نے کہا: ذرا ابا کو فون دیجیے۔

"ہیلو..... بھائی..... سب انتظام اچھا کیجیے۔ خرچ کی فکر مت کرنا۔ ممکن ہے ٹی وی والے بھی انھیں یعنی جنازہ شامل کرنے کے لیے گھر پر آئیں۔

"آپ فکر نہ کریں ممی خالہ۔ میں نے سب انتظام کر دیا ہے" شکیلہ نے اطمینان دلایا۔

"کیا ہو رہا ہے ممی؟ .... کب آ رہا ہے وہ؟" امو نے ڈوبتی سانسوں کو روک کر پوچھا۔

تب ڈرائنگ روم میں جاکر خورشید نے کہا: "کل مجھے دہلی میں ایک سیمینار اٹینڈ کرنا ہے۔"

"اور میں صرف تین دن کی لیو لے کر آیا تھا۔"

"ہم گرمی سے گھبرائے جا رہے ہیں۔" امریکن بہو نے منہ بنا کر کہا۔

صبح سویرے ..... امو کی آنکھ کھلنے سے پہلے، وہ سب چپکے چپکے گیٹ سے باہر نکلے۔ انھوں نے خواجہ بی کو امو کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنے کی ہدایت دی اور بہت سے ڈالر، ریال، روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔

"امو کی خیریت کے لیے ہمیں فون کرتی رہنا۔ بائی بائی۔"

خواجہ بی اداس تھی اور یہ دیکھ کر ڈر گئی کہ امو کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ شاید انھوں نے اپنے بیٹوں کو جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا

پھر اس نے ایک دکان کا فون نمبر ملایا۔

"ہیلو ..... میت لے جانے والی ایک لاری بھیج دیجیے اور ساتھ میں چار آدمی بھی ہوں اور کچھ نہیں چاہیے۔ ان کے لڑکے ہر چیز کا انتظام کر گئے ہیں!

00 000 00

مقصود الٰہی شیخ

دل نہ دریا، سمندر خالی

تیسرے دن اسے مٹھی بھر قرار نصیب ہوا۔ تھوڑا سا سکون میسر آیا۔ طبیعت ٹھہر سی گئی۔ وہ تین روز تک جلتا رہا تھا۔ اذیتوں میں با یہ سوچ سوچ کر مرتا رہا تھا کہ آخر وہ مرا کیوں نہیں؟ دل بند ہو جانا چاہیے تھا! دم گھٹ جانا چاہیے تھا! یوں بار بار پل صراط سے گزرنا اس جہنم کا ایندھن بننا جس میں سات دوزخوں کے انگارے جمع کر کے اسے جھونک دیا جائے، یہ تو اس کا مقسوم نہیں تھا۔ وہ ایسی قابلِ رت تقدیر لے کر تو پیدا نہیں ہوا تھا! اس بات کا اسے یقین تھا۔ یہ سب قسمت کا لکھا نہیں ہو سکتا، پھر کیوں؟ آخر کیوں، حقیقت اتنی نما اور بھدی بن کر سامنے آئی تھی؟ لگتا، جیسے شروع سے اس کی تقدیر میں لوہوں کے کچوکے ہی مرقوم تھے۔ اس کے نصیب میں زمانے بھر ے کانٹے کس نے بوئے تھے؟ دیکھو تو سنو تو، گنو تو۔ وہ گن چکا تھا۔ ایک ایک کر کے گنے تھے۔ پورے سولہ ہزار۔ اس کی رگ و پے ں چبھ رہے کانٹوں کی گنتی اتنی ہی تھی۔

وہ تین دن سے ایک ایک کانٹا چن رہا تھا۔ بڑی بے رحمی سے ایک ایک نوکیلا خار بدن کے گوشے گوشے سے نوچ رہا تھا۔ کئی ٹوں کی نوکیں اکھاڑتے ہوئے اس کی انگلیوں کی گرفت میں کپکپاہٹ سی آجاتی تو انتہائی باریک نوک کا سرا ٹوٹ کر وہیں پیوست رہ جاتا اں چبھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے لگتا جیسے یہ ٹوٹی نوکیں اپنی جگہ دبی دبی گل سی گئی ہیں۔ یہ بدل کر کچھ اور بن جائیں گی مگر ان سے چھٹکارا نہ لے گا۔ وہ لذتِ حزن کی اس منزل پر پہنچ گیا تھا جہاں درد، درد نہیں رہتا۔ بدن سے تو وہ ایک ایک کانٹا چن رہا تھا مگر آنکھوں میں جو ئیاں گھر بنا چکی تھیں ان سے نجات کا کوئی پہلو اس کے ذہن میں نہیں آرہا تھا۔

اس نے کتنے آورش کچل کر بڑے بھائی سے قرض مانگا تھا؟ اس ایک مانگنے کے فعل نے کس طرح اس کی روح کو داغ داغ کر کے لہان کر دیا! ہر زخم سے خون رس رہا تھا۔ لہو بہہ رہا تھا۔ نظر نہ آنے والے سرخ رنگ آبلے پھوٹ رہے تھے۔ وہ کرب سے کراہا، وہ یف سے بلبلایا، وہ درد سے تڑپا، وہ اذیت سے دریدہ ہو کر تار تار ہوا مگر نہ تو یہ بودا رشتہ ٹوٹا اور نہ ہی اس کا دم نکلا۔

وہ حیران تھا اس کے جسم میں ہنوز دم تھا۔ وہ کتنا سخت جان تھا اس پردیس میں وہ یہ صدمہ سہہ گیا۔ جس طرح اس کی ذات کے تھ اس کا نام چپکا ہوا تھا بالکل ویسے ہی اس کے ساتھ یہ رشتہ جڑا ہوا تھا کہ وہ چھوٹا بھائی ہے۔ یہ مقدروں کی بات ہے۔ اذیتوں کے تناہی سلسلے اور دکھ کی لامحوری فصیل نہ پھلانگ سکنے کے بعد بھی وہ محسوس کر رہا تھا اس میں ابھی دم ہے۔ کیا ہوا وہ یوسف نہ ہوا وہ ر کے بازار میں نہ بکا، کنوئیں میں نہ گرایا گیا!

اگر۔

اگر۔

اگر۔ واقعی اسے سولہ ہزار نہیں سولہ لاکھ کانٹے پڑ گئے ہوتے تو کیا وہ ان کو ایک ایک کر کے نہ چنتا؟

جینے کے لیے یہ سب تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

جیسے کایا پلٹ گئی، بادل پھٹ گئے اس کے دل سے ملامت کے دماغ سے کانٹوں کی چبھن محو ہونے لگی، کسی چور کی طرح جلدی سے دروازہ کھول کر نکلی۔

تب،

پل کی پل،

دل نے چٹکی برابر قرار پکڑا۔ وہ سنبھل سا گیا۔

پھر۔

یہی قرار۔ بڑھتے بڑھتے مٹھی بھر ہو گیا!!

اس کے منہ میں لعاب کے جمع ہونے سے تلخی غائب ہونے لگی اور شکر گھلنے لگی۔ وہ مجسم رحم بن گیا۔ بھائی سے گلہ خوشی کی لوزات بن گیا۔ اسے کیا غم، وہ آزاد ہے۔ وہ کتنا مہان ہے جو اس کے لیے کچھ نہ کر پائیں وہ ان کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ وہ چھوٹا تو ہے، کھوٹا نہیں!! جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے بھائیوں کی محبت کاغذ کی ناؤ نکلی، کاغذ کی ناؤ کو ڈوبنا ہی تھی۔ سو، ہزار قدم نہ سہی سولہ چپو سہی۔ ڈوبنے والے تو کنارے پر ڈوب جاتے ہیں۔ ایک بلبلہ نہیں اٹھتا۔ وہ بھی تو اسی دنیا کے باسی ہوتے ہیں۔ یہ تو سات سمندر پار کر آیا تھا۔ اوروں سے زیادہ حوصلہ رکھتا تھا۔

ہاں۔

اس نے سوچا،

اب میرا وہاں کون ہے؟

بھائی دیکھ لیے، بہن دیکھ لی، ان کے منگار دیکھ لیے، ان کے غرور، بڑائی میں ملفوف چھوٹائی، ان کے دکھاوے، ان کے برتاوے دیکھے اور کیا دیکھنا تھا......

رہ گئے۔ اماں ابا.. اب ان کی ہڈیاں بھی باقی نہ ہوں گی ورنہ.....

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ سوچ گہری ہوئی، دو دیلی ہوئی پھر کڑوی کڑوی ہو گئی۔ ورنہ، وہ ان کی قبریں اکھاڑ لاتا۔! ان کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لیے ہی تو وہ وطن جاتا رہا ہے۔ اماں کے مرنے پر کسی نے اطلاع تک نہ دی تھی۔ پردیس میں یہ غم اسے بہت دکھی کر گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا ہر زخم ابدی بن گیا! خدایا کسی کو چھوٹا نہ بنا۔ یہ چھوٹائی غربت کی ہو یا اخوت کی، اس جیسے لوگوں کی ازل سے دشمنی چلی آ رہی ہے! خلوص، سلوک اور پیار یک طرفہ ہوتا ہے۔ پلٹ کر پوچھنے کی روایت پر کوئی نہیں چلتا۔

ابا کا آخری وقت، رخصت، دائمی رخصت کا وہ منظر اس کی آنکھوں میں محفوظ تھا۔ ابا نے دو چار سانس لیے وہ بھی کھینچ کر۔ جنہیں لیتے بلکے کہ منہ تک نہ کھلا۔ اسے تو جب پتہ چلا کہ بہن نے بلند آواز میں اناللہ کہا، ابا کی آنکھیں، ہاتھ رکھ کر بند کیں اور رونے لگی۔

ان کے ابا کی بڑی عزت تھی، جدھر سے گزر جاتے حاجی صاحب سلام، حاجی صاحب سلام کی صدائیں آنے لگتیں۔ اسے اپنے ابا سے زیادہ محبت نہ تھی۔ کبھی اچھے لگتے کبھی بالکل اچھے نہ لگتے۔ لوگ کہتے اس کے ابا بڑے خوب صورت ہیں۔ لوگ کیا رشتے دار جو ہر کسی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے وہ بھی ابا کی تعریف کرتے۔ ان کے عزیزوں میں یوں تو کئی بڑے بڑے افسر وغیرہ تھے مگر ایک انکم ٹیکس کمشنر

وہ آتے جاتے تھے۔ شاعر تھے مشاعروں میں جاتے سے اخباروں میں آتے اور خاصے مشہور بھی تھے۔ ان کی ایک بیٹی تھی۔ دو ایک دن میں پلٹے بیک دے چکی تھی۔ اپنے ڈیڈی کو سگریٹ سلگا کر وہی دیا کرتی تھی۔ ہر جگہ، ہر محفل میں!! وہ بھی کہا کرتی "تایاجی بڑھاپے میں اتنے شکیل تو حسین نظر آتے ہیں تو جوانی میں تو بہت ہی زیادہ خوب صورت ہوں گے۔!!

اس نے تو ابا کو شروع سے، سر سے پیر تک روئی کے گالے ایسا ہی دیکھا تھا!

اماں کی شکل و صورت واجبی تھی۔ نقش موٹے موٹے تھے، رنگ بھی کلونس بھرا تھا۔ غیر برادری کی تھیں۔ غریب خاندان کی تھیں۔ وہ سب کے لیے ..... بس تھیں۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ اماں کا ماپنا دیہ تھا جو نبھ رہی تھی مگر کسی کو ان کی پرواہ نہ تھی۔ ویسے بھائی بھی رج کے بدصورت تھیں مگر مجال ہے کوئی ان کو فالتو سمجھتا۔ ایک تو وہ برادری کی تھیں دوسرے امیر گھرانے سے تھیں۔ لیکن یہ اماں شاید ہی کبھی بری لگی ہوں۔ وہ اماں سے قریب تھا۔ وہ خاصا بڑا ہو گیا تب بھی جب تک اماں اس کے منہ میں نوالہ نہ ڈلیں اس کا پیٹ نہ بھرتا۔ وہ پندرہ سولہ سال کا ہو گیا اس وقت تک اماں ہی آخری نوالہ بنا کر اسے دیتی تھیں۔ سب مذاق اڑاتے۔ پھر اماں ادھر ادھر دیکھ کر اسے نوالہ دیا کرتیں۔ اور جب اماں فوت ہوئیں تو وہ پردیس آچکا تھا۔ کسی نے بروقت اسے اطلاع بھی نہ دی۔ اماں کے مرنے کی اطلاع کافی دنوں بعد ملی۔ رو دھو کر چپ بیٹھ گیا۔ اس زمانے میں جانا آنا مشکل تھا۔ وہ کئی برسوں تک گھر نہ جاسکا۔ پھر جب گیا تو وہاں سب اماں کو بھول بھال چکے تھے۔ ابا اکیلے رہتے تھے۔ وہ چند دن ابا کے پاس ٹھیرا کوئی ملنے ملانے نہ آیا۔ ابا نے بھی کہا کہ وہ چھوٹا ہے، اسی کو بڑوں سے ملنے آنا چاہیے۔ وہ گیا بھائیوں سے ملا۔ ان سے لڑا۔ بہن سے شکایت کی کہ اماں کی بیماری کی اطلاع تک نہ دی اور نہ مرنے پر بلایا تک نہیں۔ اس نے دکھ اور درد سے گلہ کیا! جواب میں بے اعتنائی اور تعجب کا اظہار ہوا! بہن نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ "کتنے دن ہو گئے۔ بھول بھال گئے۔ اماں خاصی بیمار رہیں۔ بھئی سب نے خدمتیں کیں۔ دیکھا بھالا تھا۔ اگر تمہیں خبر بھی کرتے تو تم اتنی دور بیٹھے بھلا کیا کرتے۔" بہن کا مطلب تھا آخری وقت ٹال نہ سکتے تھے۔ انہوں نے کہا "سب نے سوچا تھا تمہیں بڑا دکھ ہوگا۔ جنازے پر پہنچ نہ سکو گے۔ تمہیں اماں سے بڑا پیار تھا۔ وہ تمہیں یاد بھی کرتی تھیں" لیکن انہوں نے باتوں میں سنایا تھا کہ اماں کو زیادہ پیار اسے بھیا سے تھا!! اسے دیکھتے ہی ہر کوئی کہتا "تم پر نظر پڑتے ہی اماں یاد آجاتی ہیں" دراصل وہ اماں پر گیا تھا۔ بچپن ہی سے اسے احساس دیا گیا تھا کہ وہ اماں پر ہے اور اماں تو ابا کی طرح خوب صورت نہ تھیں اس لیے وہ بھی کسی مغالطے میں نہ پڑے۔ اب اسے کسی نے تو بتلایا نہ تھا کہ وہ بھی اماں کی طرح غیر برادری کا لگتا ہے مگر سلوک وہ نہیں تھا جو آپس میں دوسرے بہن بھائیوں کا تھا۔ بڑے بھیا نے ایک مرتبہ اماں کو معمولی خاندان کی ان پڑھ خاتون کہہ دیا تھا۔ وہ جانے کس حوالے سے بات کر رہے تھے مگر اس سے برداشت نہ ہوا۔ بھائی سے لڑ پڑا، زبان درازی کی، بھتیروں ان سے بولا تک نہیں نہ اسے اماں ابا دونوں سے ہی پیار تھا۔ پھر جب وہ پردیس آگیا تو دونوں یاد میں رویا کرتا۔ یہ تمیز نہ رہی کہ اسے اماں زیادہ پسند ہیں یا ابا؟ ابا سے زیادہ قربت نہ تھی مگر اماں کی خوبیاں وہ خوب گنوا سکتا تھا۔ صلح پسند تھیں۔ لڑائی جھگڑے نہ دل صاف کر لیتا، کبھی کو برا نہ کہنا مگر تھیں بڑی خوددار، قوت برداشت بھی بہت تھی۔ میاں کو برداشت کیا تو کیا، رشتے داروں اور اولاد کا برا سلوک بھی سہہ جاتیں۔ غصہ پینے کی عادت تھی پلٹ کر جواب نہ دیتیں لیکن خودداری کے ساتھ خود اعتمادی بھی زبردست تھی۔ کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہ دکھائی دیں۔ کسی نے بہت تنگ کیا تو کہا "بندا تو نا مخالف کیا۔ پتہ وہ نہیں ملا صحرا کہیں پہاڑ کی دکس طرح کی صورت ہیں!!

شاید یہ پردیس کی تاثیر تھی اسے اماں ابا ہی یاد نہ آتے تھے بلکہ وہ پھر سے بہن بھائیوں سے محبت کرنے لگا تھا۔ ان کی اولادوں کو

چاہنے لگا۔ اسے لگتا وہ بھی اسی کی اولاد ہیں۔ ایک ایک کو خط لکھتا۔ تحفے بھیجتا۔ کھلونے بھیجتا۔ یہ دن وہ ٹریفک شاید جاری ہی ر: ایک روز احساس ہوا اس کے اپنے بچے بڑے ہو گئے ہیں اب وہ کزنوں کے بارے میں سوال پوچھتے ہیں۔ بیوی نے بھی پھنکارا "اور وا کچھ بھیجنے کی توفیق نہیں ہوئی کسی نے کبھی اپنی یا بچوں کی تصویر یں تک بھیجنا گوارا نہ کیا۔ مت کیا کرو میرے بچوں کو خط لکھنے کے۔ کس کو لکھیں خط؟ کوئی جواب نہیں دیتا۔ ان بچاروں کو کیا پتہ کون کس کا ہے، کیسا ہے؟ جن کی شکل تک نگاہوں میں نہ ہو ان کی: میرے بچوں پر خواہ مخواہ مسلط کرتے ہو۔"

واہ بھئی واہ!! اس نے سوچا ٹھیک تو ہے بچے سب کے برابر ہوتے ہیں۔ یکساں سلوک اور برتاؤ ہونا چاہیے۔ پھر یہ ریت ہ: کہ جو کوئی اسے اور اس کے بچوں کو یاد کرے گا یعنی کچھ بھیجے بھجوائے گا، اسی کو یہ بھی جواب دیا کریں گے۔

وہ، جو، اب بچوں کا باپ تھا، گھر میں اپنے بہن بھائیوں سے چھوٹا تھا۔ سب سے چھوٹا!! اس کا دل ان معنوں میں ذرا سا تھا کہ کی پل میں پگھل جاتا۔ بھئی وہ سب تو بڑے ہیں۔ ان کا ادب لازم ہے۔ ایک بار امریکہ سے طوفان شروع ہوا تو یورپ تک تباہی پ: چلا۔ اخباروں میں انڈریو ہری کین کے چرچے رہے۔ وطن کے اخباروں میں بھی خبریں چھپی ہوں گی۔ اس کے اپنے گھر کی چھت اڑ تھی۔ یہاں تو نظام ہی اور ہے۔ بھلا اس نے وطن کس کو لکھنا تھا کوئی امداد تو منگوانی مقصود نہیں تھی۔ ایک اور بیٹھے بٹھائے بر" سے ٹیلی فون آیا کوئی گرائیں بریڈ فورڈ آرہا تھا اور اس سے ملنا چاہتا تھا۔ "آؤ اجی آیاں نوں۔" وہ صاحب آئے تو گھر والوں کی طرف سے پونڈ دے گئے کہ آپ کے بڑے بھائی نے ان کو لکھا تھا تین ہزار روپوں کے برابر پونڈ میرے بھائی کو دے آؤ۔ وہاں تین ہزار، آج تین ہزار ہوں گے مگر پونڈ کتنے ہوئے؟ لیکن اس کے پیچھے جو جذبہ تھا وہ محبتوں میں گندھا ہوا تھا۔ اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بھئی، ہمیں سے ادھر بھیجتے ہیں۔ میرے گھر والوں نے تو بن مانگے بھیج دیا۔ رفتہ رفتہ روپوں اور پونڈ کا ذکر گفتگو سے نکلتا گیا بس کہتا "ہزار بھیجے ہیں" دیکھو تو مرگ ہو خوش ہوں یہاں سے جاؤ۔ خرچ کرو۔ میرے گھر والوں کی محبت دیکھو کہ اخبار میں خبریں پڑھ کر میری ما بھیج گئے۔ جن لوگوں کو خوشی غمی کے علاوہ مقدمے بازی کے لیے، قرض اتارنے کے لیے یہاں سے رقمیں بھیجنا پڑتی تھیں خطوط کے: تک کے لیے ترسنا پڑتا تھا وہ بھی اس کی باتیں سن کر حسرت سے تکا کرتے۔ بیوی بھی چپ سی ہو گئی۔

بیوی جب کی چپ ہوئی اس وقت بولی جب ڈائرکٹ ڈائیلنگ سسٹم شروع ہوا۔ اس نے تو کبھی میکے میں ٹیلی فون کیا نہیں: بھی اٹھتے بیٹھتے اپنے گھر والوں سے نمبر ملایا کرتا۔ ٹیلی فون کے یہ لمبے لمبے بل بنتے کہ ہوش اڑ جاتے۔ ادھر والے تو یوں ٹھہر ٹھہر کر کرتے جیسے جتنی دیر لگائیں گے اتنا ہی ثواب ملے گا۔ کس قدر سست رفتار لوگ ہیں اپنے وطن کے حالاں کہ وہاں بھی خوشی کا بے پا اظہار ہوتا تھا۔ دنوں آئے گئے کو سنایا جاتا کہ انگلستان سے ٹیلی فون آتا ہے تو ۴۵ منٹ سے کم بات نہیں ہوتی۔

پھر زندگی میں ٹھہراؤ سا آگیا۔ بچے یونیورسٹیوں میں گئے تو خط و کتابت کم ہو گئی۔ مصروفیتیں بڑھ گئیں لیکن وہاں کا حال تو ا والے جانیں، یا خدا جانے یہاں دلوں میں محبت پہلے سے کسی طرح کم نہ ہوئی تھی۔ اب تو بیوی بھی وطن جانے کے لیے ترسا کر بچوں کو پاکستان جانے کی زیادہ لگن نہ تھی۔ ایک بار گئے تو دوبارہ جانے پر آمادہ ہی نہ ہوتے تھے۔ بڑی بیٹی نے کہا تھا کہ آپ کا دل: جانے کو چاہتا ہے کہ وہ آپ کا وطن ہے۔ آپ کو اچھا لگتا ہے کبھی آپ نے سوچا یہ ہمارا وطن ہے۔ ہمیں یہیں رہنا اچھا لگتا ہے۔ آخ یہیں پیدا ہوئے یہیں پلے بڑھے۔ چھٹیاں ہوتی ہیں کہیں آنے جانے کی بجائے جب آپ ادھر کا پروگرام بناتے ہیں تو یہی ہمیں اچھا: لگتا۔

اب کے کئی سال بعد وہ اکیلا وطن آیا تو اسے بہت اچھا لگا۔

بہت سی تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ خود اس کے گھر میں جو اب اس سے زیادہ اس کے بھائی بہن کا گھر تھا اور کئی گھرانوں پر پھیل چکا تھا بہت کچھ بدل گیا تھا۔ بہن بیوہ ہو چکی تھی۔ ان کے بچے اپنے اپنے گھروں میں آباد تھے۔ بڑے بھائی ریٹائر ہو چکے تھے۔ دوسرے بھیا سینٹ کے ممبر بن چکے تھے۔ ان کا شمار تو اب وطن کے بڑے لوگوں میں ہونے لگا تھا۔ ساری عمر کلرکی کرتے رہے تھے۔ دانتوں سے پائیاں پکڑنے کی عادت تھی مگر اب کاروبار وسیع تھا۔ فراغت تھی۔ شہرت اور عروج پر تھے، تین تین کاریں تھیں پہلے ہی دن ایک کار اس کے سپرد کر دی گئی۔ بھابھی بھی واری صدقے ہو رہی تھی یہ اس کی پسند کی بھابھی تھیں۔ یہ بھی کیا رشتہ ہوتا ہے۔ تقدس اور رومان دونوں آمیز ہو کر بڑے مضبوط رشتے میں یک جان ہو جاتے ہیں لیکن اپنی عادتوں سے یہ بھابھی دور ہی رہی تھیں۔ اب کے ملیں تو جان پڑا ں تو اس کے خوابوں کی تعبیر والی بھرجائی تھیں۔ بھائی کے شانہ بشانہ سیاست میں، کاروبار میں، دلچسپی لیتیں۔ بھابھی نے جب اس پر توجہ دی تو پچھلے تمام گلے جاتے رہے۔ اسے لگتا سارے ملک کا نظام اس کے بھائی اور بھابھی چلا رہے ہیں۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں لیے لیے پھرے، بڑے بڑوں سے تعارف کرایا۔ یہی ترغیب دی کہ آؤ یہاں آکر بزنس شروع کر دو۔ وطن کا بھی تم پر حق ہے۔ اپنی صلاحیتوں سے یہاں اچھی کاروباری روایتوں کو فروغ دو۔

وہ اتنا خوش تھا اتنا خوش جیسے نیا جنم لیا ہو۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ یوں محسوس ہونے لگا اس کا دل لگ جائے گا۔ شاید وہ پھر سے یہیں بس جائے۔ بیوی بچوں کو یہیں بلا لے۔ یہ کوئی ناممکن اور ان ہونی بات تو نہ ہوتی مگر ان ہونی بات یہ ہوئی کہ ایک روز سو کر اٹھا تو لگا اماں اس کے آگے پیچھے ہیں۔ بڑا اداس ہوا۔ بڑا نادم ہوا۔ وہ تو وطن اماں اباجی کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے آیا کرتا تھا۔ اب یہاں اس کے لیے کیا رکھا تھا؟ سب اپنے اپنے گھروں کے ہو ئے۔ اس کا کوئی گھر نہ رہا تھا۔ ذرا بھائی نے لفٹ کرائی تو یہ سب کچھ بھول بھال گیا!! ۔ سخت ندامتوں میں گھرا قبرستان نکل گیا۔ کتنے ہی برس پہلے وہ آیا تھا تب ان قبروں کو درست کرا گیا تھا۔ اس کے بعد کوئی فاتحہ پڑھنے تک نہ آیا ہوگا۔ سخت خستہ حالت میں تھیں۔ اماں کی قبر آدھی دھنس گئی تھی۔ وہ سرہانے بیٹھا روتا رہا۔ اپنے کو کوستا رہا پھر قبرستان کے رکھوالے بابا کے ساتھ مل کر اماں ابا دونوں کی قبروں کو صحیح شکل و صورت دی۔ لیپا پوتا اور گھر آیا۔ اپنے کانوں وہ سنا جو اسے نہیں سننا تھا۔ بھابھی کی کوئی ملنے والی آئی بیٹھی تھیں۔ بھابھی ان سے کہہ رہی تھیں "لوگ باگ ولایت سے یوں منہ اٹھائے چلے آتے ہیں جیسے یہاں سب فرصت میں بیٹھے ہیں" اس نے سوچا میرے آنے سے جو کھٹکا ہوا تو بھابھی کو معلوم تو ہو گیا ہوگا کہ کوئی آیا ہے لیکن یہ پیاری سا بھی پہلے سے بدلی بدلی تھیں اور پہلے سے زیادہ نڈر اور بے باک ہو گئی تھیں انھیں اس کی پرواہ کب تھی کہ وہ کچھ کہہ رہی ہوں تو کوئی سن لے گا سن لے گا تو کیا بگاڑ لے گا۔ وہ اپنی دوست سے کہہ رہی تھیں "میں نے بچوں سے کہہ دیا ہے۔ وقت ہو، فرصت ملے تو آنا ورنہ کون سا قرآن حدیث میں لکھا ہے کہ کرایہ بھاڑا خرچ کر کے آؤ اور چاچا سے ملو۔ چاچا خود جا کر مل آئے نا......."

اس کا دل بیٹھ گیا۔ اسے اپنی اوقات اور حیثیت یاد آ گئی۔ وہ اپنا گھر، بیوی، بچے چھوڑ کر یہاں ایسے بیٹھا تھا کہ جیسے یہی اس کا گھر ہے!! اس کا قرار چھن گیا۔ کیا یہ سب طمع تھا؟ شاید اسی لیے اماں کی روح پھڑ پھڑا، پھڑ پھڑا کر اس کے پھیرے لے رہی تھی۔ اس پر صدق ہو رہی تھی۔ اس نے رات کھانے کی میز پر اعلان کیا "کل چلا جاؤں گا" اس نے بھابھی کی طرف دیکھا وہاں اتنا سا بھی ردعمل نہ تھا جتنا منہ پر سے مکھی اڑاتے سے ہوتا ہے۔ خود ہی اس نے وجہ بتائی جیسے جھینپ مٹا رہا ہو۔ بے بی بیمار ہے۔ بھائی بولے "کیا کوئی ٹیلی فون میری غیر موجودگی آیا؟ کیسے پتہ چلا" اس نے جواب دیا "اماں ابا کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے گیا تھا واپسی پر راستے میں بڑا ڈاک خانہ آیا وہاں

سے بات کی تھی۔ "بھائی ناراض ہو گئے" "یہ کیا غیریت ہے؟ ہزاروں کا بل آتا ہے۔ ہزاروں پڑوس کے لوگ آکر ہمارے یہاں سے ٹیلی فون کرتے ہیں اور میرا بھائی۔ چھوٹا بھائی اپنے گھر بھر سے ٹیلی فون کرتا ہے۔ واہ!! بھئی تمہاری کالوں سے کیا فرق پڑتا۔ ہمارے سامنے کرد تو ہم بھی اپنے بھتیجے بھتیجیوں سے بات کر لیا کریں کیوں بیگم؟" اور بیگم منھ پھیر۔ ہاتھ بڑھا کر اپنی پلیٹ میں کھانا پروسنے میں محو تھیں۔ سے تو بھابی بچی ہیں۔ بھائی منافقت سے کام لے رہے ہیں حالاں کہ وہ اپنی جگہ سچے تھے۔ ان کی طرف سے ہزاروں کا جس طرح ذکر آیا تھا وہ بھونڈی اور تفاخر دکھا رہا تھا اور بھابی کی اپنی دوست سے گفتگو کے دوران جو انکشاف ہوا اس میں یہ صداقتوں بھری سچائی تھی کہ اتنے دنوں میں ان کے بچوں میں سے کوئی آکر اس سے نہ ملا تھا۔ یہ وہ بچے تھے جن کو اس نے گودوں میں کھلایا تھا۔ ان کے پیار کے نام اسی نے رکھے تھے اور بچے ابھی تک گھر میں انھیں ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ کسی نے، کسی ایک نے نوٹس نہ لیا کہ ان کا چچا آیا ہے۔ جس سے چوٹی تلے سے کو وہ اسے ٹھا دیتے تھے!!

ہزاروں کے مقابلے میں اسے اپنے منجھلے بھائی سے ہمدردی اور محبت دونوں ہی جذبے مقابلتاً زیادہ محسوس ہوتے تھے کہ یہ ہزاروں کی نسبت زیادہ خوش حال نہ تھے۔ کلرکی سے آغاز کیا تو قلم گھس گھس کر سپرنٹنڈنٹ بنے تھے۔ ہاں جب وہ پردیس گیا تو ان کی ترقی کی ہوئی تھی۔ اس بیچ میں کتنے انقلاب آئے۔ پاکستان اور ہندستان کی دو جنگوں سے تھے ادھر ترقیوں کے بعد انتہا تک پہنچے۔ پھر بھائی ریٹائر ہو گئے! بزنس شروع کیا۔ سیمنٹ کے بھرتے۔ سچ ہے خوراک سے عقل اور پوشاک سے روپ آتا ہے۔ اب یہاں بھائی بھابی پر روپ بھی تھا اور عقل کی فراوانی بھی تھی۔ روپے کی ریل پیل تو تھی کہ اسے آتے ہی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ بے دریغ خرچ اور خاطر مدارات۔ کیا یہ سب؟ اس کے دماغ میں ایک کمینہ سا خیال چکا۔ کیا یہ سب ہوٹلوں کے چکر۔ سیر و تفریح، اونچے احباب سے تعارف و ملاقاتیں زیر تعمیر مکانات کے بارے میں مشورے کاروبار میں شراکت کی دعوت کیا یہ سب اسے دکھانے، سے مرعوب کرنے کے لیے تھا؟ اس نے نظر اٹھا کر بھائی کی طرف دیکھا۔ بھابی کی طرف دیکھا۔ بھائی کتنے سیدھے سادے ہیں۔ وہ جو محاورہ ہے کہ ہر کامیاب شخص کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے۔ یہ میری حسین بھابی وہی عورت تو نہیں جس نے بھائی کو کامیاب بنایا ہے؟ لیکن وہ جو کچھ صبح کہہ رہی تھیں اور جو بھائی تھوڑی دیر پہلے تک کہہ رہے تھے۔ اس تضاد کے پیچھے کیا ہے؟

کھانے سے فارغ ہو کر تو گرم گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کے اعصاب کا اکڑاؤ کسی قدر کم ہوا۔ کچھ راحت محسوس ہوئی اس نے کمینہ سا خیال جھٹک دیا۔ وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا کہ جب بھائی، بھابی اس کے یہاں گئے تھے تو وہ بچھ بچھ گیا تھا۔ وہ اس کی بیوی اور بچے بھولے نہیں سماتے تھے تو کیا وہ سب دکھاوا اور رکھاوٹ تھی، منافقت تھی یا انھیں متاثر کرنے کی کوشش؟ میل ملاپ میں جب آدمی حد سے بڑھ کر، خاطر تواضع کرتا ہے تو اس میں خلوص ہوتا ہے۔ خوش کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ کیا واہیات بات اس نے سوچی تھی؟ ایسا تو اس سے بھی نہیں سوچتے جب روز روز کی ملاقات ہو۔ دہلیز سے دہلیز ملی ہو۔ کون اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بیٹھتا ہے۔ تاہم اس کا دل صبح سے اچاٹ تھا۔ سوچ کا رخ اماں کے سائے کے احساس سے بدلا قبرستان میں قبروں کی حالت دیکھ کر گویا پھر اوپر سے بھابی کی باتوں نے مسوس کر رکھ دیا تھا۔ آخر روپے پیسے کی اتنی ریل پیل تھی تو کیا بھائی اماں ابا کی قبروں کی مرمت زندگی میں ایک بار بھی نہ کرا سکتے تھے؟ ایک روز جاکر فاتحہ پڑھی؟

وہ رات اس نے بے چینی سے سوتے جاگتے گزاری۔

دوسرے روز وہ دیر تک سوتے پر رکا لیکن اس حقیقت کے باوجود کہ بھائی نے خود دو تین بار ٹیلی فون کر کے اس کی خیریت

ریافت کی تھی۔ اس کی بیوی نے حالات معلوم کیے تھے۔ تسلی دی تھی وہ مزید رکنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کی بیوی دونوں بچے تذکرہ کر رہی تھی کہ آج کل کاروبار مندے کا شکار ہو چکا ہے۔ وصولیاں اٹکی ہوئی ہیں۔ اور ایشیائیوں کے تقاضے بڑھتے جا رہے ہیں۔ بچے امتحانوں کی ایکزامز میں مصروف ہیں۔ چار مہز دلچسپی نہیں لے رہا۔ کاروبار کی یہ نزاکتیں اور دشواریاں بھائی سمجھتے تھے۔ کہنے لگے اچھا جاؤ لیکن حالات درست کر کے جلدی آنا، دل نہیں بھرا۔ تاثر تو یہ تھا کہ ابھی ٹھہرو گے۔ اطمینان سے کئی باتیں کرنی تھیں ابھی۔ پروگرام بنانے تھے۔ بہت سے باہمی مشورے کرنے تھے۔ بھابھی نے بھی جس پیار محبت سے رخصت کیا وہ بھول گیا کہ اس کو "ان کی" کسی بات سے رنج پہنچا تھا۔ ——

دن بیتتے یوں خوش گوار گزرتے تھے جیسے وہ کسی نہایت آرام دہ نرم نرم بستر میں سہانے خواب دیکھتا رہا ہو۔ واپس لوٹ کر بچوں کو مزے لے لے کر ذرا ذرا سی تفصیل سناتا رہا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ انھیں احساس دلا دے کہ وہ جو کچھ وہ لوگ اپنے وطن کے بارے میں رکھتے ہیں وہ ٹھیک نہیں۔ تعصب پر مبنی ہے۔ لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ وہاں تو سمندروں سے گہری محبتوں کے خزانے کے منتظر ہیں۔ تھکی ٹوٹی بیوی بھی پوری دلچسپی سے یہ سب سنا کرتی۔ پردیس میں رہنے والے شاید محبت کے بھوکے ہوتے ہیں یا اپنے اصل سے فرار کے لیے انھیں اپنے تذکرے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر جب وہ دونوں علاحدہ اور تنہا ہوتے تو کاروباری مسائل پکڑ دبائے اور گھبرا گھبرا اٹھتے۔ دس سال میں دوسری مرتبہ ریسیشن نے چھاپہ مارا تھا۔ پہلی بار تو ایشیائیوں نے ان جانوں کی طرح اتنا زیادہ محسوس بھی نہ کیا تھا مگر اب کے تو ہر کسی کے لب پر یہی رونا تھا۔ ہر کوئی مہنگائی اور ناپیدی اور مندے کا نالہ شکوے شکایتوں سے ذرا خود رحمی میں مبتلا تھا۔ لگتا تھا بے روزگاری اور کڑکی نے خاص طور پر ایشیائیوں کو ہی نشانہ بنایا ہوا ہے۔

ایک روز اس کا ایک گرائیں وطن جانے سے پہلے ملنے آیا تو اس نے ایک رقعہ مانگا۔ بھائی کے نام ایک خط تاکہ وہ اپنے رسوخ سے اس کی خرید کردہ زمین پر حق شفع کا جو جھوٹا مقدمہ چل رہا ہے اسے نمٹانے میں مدد کریں [illegible] چھٹکارا ہو گا۔ وہ ہو گیا۔ خط دے کر گرائیں کو ٹٹولا۔ "ضرورت ہو تو بھائی کو کچھ رقم دینے کے لیے بھی لکھ دوں؟" وہ بولا "دراصل جو کچھ بھیجا تھا میں بیچ چکا ہوں۔ یہ لالچ پہلی بار کیا ہے۔ اب تو ہر کوئی یہی سوچتا ہے کہ بلیک سے رقم بھیجی جائے تو اتنے پیسے زیادہ ملیں گے۔" اس نے جاتے جاتے جیب سے چار سو پونڈ نکالے اور اس کے حوالے کر دیے کہ وہاں ضرورت تو پڑے گی بھائی کو لکھ دینا یا بلیک کروا دینا۔ "یہ اسے غیبی امداد لگا چار سو پونڈ لے کر مل میں ڈال دیے۔ ان دنوں "کیش فلو" بہت ہی کم ہو رہا تھا۔ اس کو یہ سوچ آئی کہ کمائی سے وہ زیادہ نہیں تین ماہ کے لیے وہ چار ہزار پونڈ قرض لے لے تو وہ جس گرداب میں پھنس چکا ہے اس سے نکل آئے گا۔ ادائیگیاں ہو جائیں گی، دباؤ کم ہو گا۔ تھوڑا چین ملے گا۔ وصولیاں تو یہاں ہو ہی جاتی ہیں آج کل سیاہ اور وصولیوں پر ہی تھا جو ہر طرف اس کی صورت بھی ہو رہی تھی کہ لوگ ادائیگی دبائے بیٹھے ہیں۔ اسی وقت رقم لکھتے ہیں جب کوئی عذر نہیں چلتا۔ کوئی چارہ نہیں رہتا بچے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو اس نے بیوی سے کہا تو بے فکر جاؤ۔ بھائی کو لکھنے کی دیر ہے۔ اپنی چرچائی کا ووٹ انشاءاللہ ہو رہے گا۔ بیوی نے کہا کہ زیادہ مانگتے ہچکچاتے ہیں۔ جو چار سو لے لیے ہیں ان کے لیے لکھ دو تاکہ کسی گرائیں کے سامنے شرمندگی نہ ہو معقول تھی۔ وہ کون سا بلیک کا دھندا کرتا تھا۔ صبح کے وقت فوراً اسی فون گھما دیا۔ خوش قسمتی سے بھائی نے اٹھایا اور بتایا کہ جاؤ بچے تا بھی پڑوس میں کسی کے یہاں رسم حنا میں شرکت کرنے گئی تھیں۔ خیر و عافیت کے بعد اس نے بے تکلفی سے کہا۔ بھائی آپ کو پتہ ہے آتے ہی کاروبار کو سنبھالنے میں لگ گیا۔ صرف ایک لاکھ روپوں کی ضرورت ہے۔ یہ ابھی تین مہینے کے لیے قرض کی صورت

میں ۔ فی الحال فتو پورے کا رفیق میرا رقعہ لے کر آئے گا اسے سولہ ہزار روپے دے دیجئے گا ۔ بھائی نے فوراً جواب نہ دیا تو یہ الجھن میں پڑ گیا ۔ پوچھا کوئی دقت ہو تو رہنے دیجئے ۔ میں جانتا ہوں بعض وقت کاروبار میں سے چھوٹی سی چھوٹی رقم نکالنی مشکل ہوتی ہے ؟ ادھر سے جواب ملا ۔ نہیں یہ بات نہیں ۔ میرا اصول ہے کسی کو دو ماہ سے زیادہ قرض نہیں دیتا اور بڑی رقم تو بالکل نہیں دیتا ۔ ویسے فکر نہ کرو ۔ بندوبست ہو جائے گا!! تم بھابی سے ذکر نہ کرنا ۔"

چہرے کے ردعمل سے بیوی پوری بات سمجھ گئی ۔ اپنے کو تو وہ تسلی دلاسا دے رہی تھی لیکن وہ بھی پچھتاوؤں میں پڑ گئی تھی بولی آپ جتنی جلدی خوش فہمی میں پڑتے ہیں اس سے بھی جلدی مایوسی کا شکار ہوتے ہیں ۔" جب ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو بولا" لعنت بھیجو خوش فہمی اور غلط فہمی پر میں ابھی ٹیلی فون کرتا ہوں اور بھائی کو منع کرتا ہوں ۔ رفیق کے پیسے جیسے تیسے بھجوا دوں گا ۔ مجھے نہیں کہنا کچھ بھائی سے " وہ جل بھن رہا تھا ۔ بیوی نے سہارا دیتے ہوئے کہا " جو ہو گیا سو ہو گیا ۔ " اب چپ چاپ بیٹھے خدا مسبب الاسباب ہے ۔ آخر آپ اس مرتبہ اس قدر بے حوصلہ کیوں ہو رہے ہیں ؟" دیکھو بیوی " اس نے کہا " کوئی بڑا ہوا سامنے آرہا ہے ۔ کبھی قرض نہیں لیا ۔ گھر والوں سے تو کبھی بھول کر کوئی پیسا نہیں لی ۔ یہ اتنی چھوٹی سی رقم کے لیے بھائی نے کیا کہہ دیا میں تو کہیں ڈوب مروں ا" وہ وحشت میں گھبرا گھبرا کر بول رہا" یہ تو پردیس ہے یہاں بھائی کی طرح بلڈنگیں نہیں کھڑی کیں مگر چلن ایسا رہا سا کہ ایسی ہے کہ کسی سے ہزار بارہ کڑے کڑے مانگ لوں تو انکار نہ ہوگا ۔ تن تنہا یہ دنیا بسائی ہے مگر وہ تو میرے بھائی ہیں ۔ لیے دین نہ ہوا ہو مگر عادت خصلت سے تو ضرور واقف ہوں گے ۔ انھوں نے ایک لاکھ روپوں کا اعتبار نہ کیا ۔ چھوٹا سا کاروبار ہے پر دھاگے ہے ۔ آندھیاں آئیں مگر چراغ جلتا رہا ۔ پلٹ کر گھر والوں کی طرف نہیں دیکھا ۔ کسی سے مدد نہیں مانگی ۔ کسی کو بھی زحمت نہیں دی سبھوں کے کام آیا ہوں ۔ کسی کا کچھ مارا نہیں ۔ " وہ بس بولے چلا جا رہا تھا جذبات میں ڈوب رہا تھا اور بیوی ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی ۔ اسے خطرہ تھا دل کی تکلیف عود نہ کر آئے ۔ اس نے کہا "آپ صبر اور حوصلے سے کام لیں ۔ اچانک ٹیلی فون کیا تھا پتہ نہیں بھائی بات سمجھے یا نہیں ۔ وہ تو سونے جا رہے ہوں گے ۔ یہاں سے وقت چار پانچ گھنٹے آگے ہی ہوتا ہے ۔ " " تم چپ کرو جی ، اس نے بیوی ڈانٹا " اب تو میں چند ملنے والوں سے چار ، چار سو پکڑ کر اپنا کام چلا ہی لوں گا یہ پریشانی اب نہیں رہی ۔ مجھے تو یہ غم ہے کہ بھائی کی نظر میری اتنی بھی وقعت نہیں ۔ پھر وہ تو واری اور نثار ہو رہے تھے تو اس کا کیا مقصد تھا ؟ وہ یوں ہی بولے چلے جا رہا تھا کہ نیند کا جھونکا آ گیا کوئی گھنٹہ بھر ہوا ہو گا کہ بیوی نے جھنجوڑ کر اٹھا دیا ۔ بھابی کا ٹیلی فون آیا ہے ۔"

چلے تو وہ سمجھا بھابی شاید کہیں گی کہ تم مجھے بتاؤ کتنی رقم چاہیے مگر انھوں نے اس کے تن سے روح تک کھینچ لی ۔ انھوں بڑی غیر جذباتی آواز میں کہا" میں تمھیں صاف بتا دوں یہ جو تم نے کسی کو رقم دینے کو کہا تو ہم کسی ایسے ویسے چکر میں پڑنے کے نہیں ۔ مہربانی کر کے وہ اپنے فتو پورے والے کو کہنا ہمارے یہاں نہ آئے ۔ مجھے امید ہے تم کوئی دوسرا بندوبست کر لو گے ؟" ٹیلی بند ہو گیا مگر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ۔ بھائی نے دھم سے گھونسا اس کے سینے پر کھینچ مارا تھا ۔ اس کی ضرب کون سی ہلکی تھی کہ رہی کسر بھابی نے پوری کر دی ۔ " وہ کیا سمجھتے ہیں میں ان کی رقم کھا جاتا ، واپس نہ کرتا ، کیا اتنا گیا گزرا ہوں ، لاکھوں کے مالک بنتے قرض کر دو میں کھا بھی جاتا تو کون سے کنگلے ہو جاتے ۔ ساری عمر میں پہلی بار کچھ طلب کیا تو ٹھینگا دکھا دیا ۔ سب کچھ دکھاوا تھا ، دکھاوا اس نے دیکھا بیوی وہاں نہ تھی ۔ اسے ایک دم اپنی بیوی پر غصہ آگیا ۔ جب اس کی رائے نہیں تھی منع کر رہی تھی تو اور زور ڈال کر روک دیا ہوتا ۔ بیوی کچن سے چائے کا کپ بنا کر لے آئی ۔ کہنے لگی " دیکھیے جو ہونا تھا وہ ہوا کم از کم بات صاف ہو گئی ۔ اب خدا

[illegible]

ہے کہ [illegible] ۔ [illegible] بات سے ہم [illegible] [illegible] تھا۔ اس نے [illegible] گروی رکھ

اور [illegible] کے ایک ایک فرد کو ٹیلی فون کروا دیا۔ اس نے بڑی لو فاداری سے [illegible] میں سب کو کہا میں ظاہر بھائی کو ٹیلی فون کر رہا ہوں۔ شاید لائین خراب ہے۔ ٹیلی فون کو ریسیو کرکے جاتا اور بھائی جان سے کہا میں نے کسی صاحب کو [illegible] ایک رقعہ دیا ہے کہ سولہ ہزار کی ادائیگی کر دی جائے مگر یہ رقعہ مشکل تھا۔ بھائی صاحب سے کہا رقعہ لے کر پھاڑ دیں۔ رقم نہ دیں۔ [illegible] کس کا رقعہ کس نے جا کر رقم طلب کرنی تھی وہ تو جب ضرورت پڑتی پھر اسے لکھا جاتا۔ تب اس نے رقعہ لکھا تھا۔ بیوی نے تڑپ کر ٹیلی فون چھین لیا۔ مطلب خدا کا پیارے سو تو تم نے ان کاموں پر ہی خرچ کر دیا ہوگا۔ "اب تم میرے ساتھ [illegible] ۔ تم کیا جانو میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ اس صدمے سے میرا ہارٹ فیل ہو جاتا تو کیا تمہارا اتنا پیسہ میرے فیونرل پر نہ اٹھ جاتا؟ سولہ ہزار، سولہ ہزار یعنی چار سو پونڈ۔ [illegible] اعتبار نہ کیا بھائی نے؟ حالانکہ وہ جو نوازشات ہو رہی تھیں۔ مجھ پر زندگی میں پہلی بار مہربانیاں دکھائی جا رہی تھیں محض اپنی شان دکھانا مقصود تھی؟ مجھے اپنی امارت سے مرعوب کر رہے تھے؟ کس لیے؟ کس لیے؟ میں تو سمجھا تھا ایک ایک دعوت پہ ہزاروں خرچ کرنے والا بھائی، وطن واپس بلانے والا بھائی میرے دکھوں کا مداوا بن جائے گا۔ میری مالی پریشانیاں دور کر دے گا۔ آخر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ کیا مجھے وہ اٹھائی گیرا سمجھتے ہیں۔ اتنا اعتبار نہ کیا۔ کیا میں ان کا کھا جاتا؟

پھر وہ بستر سے اٹھا۔

سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر برسوں پہلے بھائی کا لایا تحفہ پاکستانی [illegible] کا گل دان دھرا تھا وہ اٹھا کر سر سے اونچا لے گیا اور پھر زور سے دے مارا۔ زور کا دھماکا ہوا۔ بچے اپنے کمروں سے کان سمیٹے نکل آئے۔ وہ ٹکڑا ایک ایک سے کہہ رہا تھا۔ اٹھاؤ یہ کرچیاں۔ گنو۔ گنو تو ان کا [illegible] پوری سولہ ہزار نکلیں گی۔ بیوی نے بچوں کو کچھ ایسا تسلی آمیز اشارہ کیا کہ وہ حیران مگر چپ چاپ اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ تم اگر میری بیوی ہو تو ابھی گنو۔ گنو اور اٹھاؤ یہ کرچیاں کسی ڈبے میں جمع کرو اور پھر مجھے بتائے بغیر بھائی کو پارسل کر کے ساتھ خط لکھنا۔

بھائی

گن لیجیے

سولہ ہزار ہیں پورے سولہ ہزار

کرچیاں

چاہیے تو وہ بھی گن لیجیے

دیکھیے یہ کسی بھائی کے دل کے ٹکڑے ہیں

وہ نہیں گن رہا تھا۔ [illegible] دن جہاں پڑا تھا، پڑا رہا۔ دوسرے دن وہ کرچیاں بیوی نے اٹھا کر ایک ڈبے میں [illegible] [illegible] سے دن بھی بیوی نے پارسل نہ کیا تو وہ خود ہی کام کر گیا۔ بھائی کو معلوم [illegible] کہ وہ [illegible] [illegible] [illegible] زندگی میں [illegible] بھائی ہی [illegible]

[illegible]

صبح سویرے صبح صبح ٹیلی فون کی گھنٹی بجی
آپریٹر نے کہا پاکستان سے کال ہے
اس کا دل اچھل کر گلے میں آ گیا!
الٰہی خیر، الٰہی خیر!!

وہ چند لمحوں میں کئی قیامتیں گزر گئی ہوں گی۔ لائن کٹ گئی۔ پریشانی اور تجسس سوا ہو گیا۔ کئی منٹوں بعد دوبارہ گھنٹی بجی، فو
کی آواز آئی

"میں اور تمہاری بھابھی حج پر جا رہے ہیں۔"
"بھئی کہا سنا معاف کرنا۔"

اس نے اپنا سانس اندر کھینچا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ لگا اندر ہی اندر کایا پلٹ گئی آواز پر قابو پا کر دھیرے سے بولا "بھائی میرے
کچھ کہا۔" یہ کہتے کہتے آنسو جو جانے کہاں چھپے بیٹھے تھے پلکوں سے چھلک کر چپ چاپ ان جانی منزلوں کی طرف چل پڑے......

دل میں گندہ شکایتوں کے انبار دھلنے لگے۔ دل کے پاش پاش...... سولہ ہزار ٹکڑے...... سولہ ہزار نہ رہے۔ گھٹتے گئے
قصہ او دو چند سوں تک محدود ہو گئی۔ دو چند سے نہیں دو لفظوں میں سمٹ گئی۔

"معاف کیا، معاف کیا"

"بہ سلامت روی و باز آئی" (خیر سے جائیے، خیر سے واپس آئیے)

کدورتیں دور ہو گئیں، منہ میں مٹھاس گھل گئی۔ دل دھیرے دھیرے قرار پکڑنے لگا۔ سکون کا احساس پیدا ہوا۔ اسے لگا اس
کی جھولی صبر و قرار کی دولت سے بھری ہے!!

OO OOO OO

(سلسلہ ص ۹۳)

عزیز بہت ہنسے بہت دیر تک ہنستے رہے۔ میں تھی کہ کھولے جا رہی تھی۔ ان کی ہنسی رکی تو بولے جان عزیز یہ تو تم
ہونے کی سزا ہے۔ ذرا بھی یاد ہے تم کو ہم نے بھی تو لگاتار دو تین سال کالج میں تمہارے ساتھ یہی سب کچھ کیا۔ یار تم کچھ بھی کہو
یہ ہے کہ یہ توی میری طرح صاحب ذوق ہے صاحب ذوق۔

OO OOO OO

مصطفیٰ شہاب

ہم جنس

میں کمرہ صاف کر رہی تھی کہ اچانک کھڑکی کے باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ میں نے کھڑکی کھول کر جھانکا۔ ہمارے فلیٹ سے
لگل لگے ہوئے فلیٹ میں" جو ایک عرصے سے خالی تھا" نئے پڑوسی آگئے تھے۔ بالکنی کے تار پر کپڑے سوکھنے کے لیے لٹکے ہوئے تھے۔ کچھ
بچے ایک کونے میں کھیل رہے تھے اور وہیں بالکنی پر ایک عجیب نمونے کا مخنی شخص، کرسی پر نیم دراز گنگنا رہا تھا۔ میں نے جو آگے بڑھ
منظر کو وسیع کرنا چاہا تو اس شخص نے مجھے دیکھ لیا اور جھک جھک کر اتنی معنی خیز نظروں سے دیکھا کہ میں فوراً کھڑکی کے پیچھے ہٹ گئی
میں نے کھڑکی بند کر دی ساتھ ہی ساتھ میں نے ان گالیوں میں سے ایک گالی دھیرے سے دہرائی جو عزیز بلا تکان، بلا تکلف اپنی روزمرہ
گفتگو میں، خرید و فروخت کے درمیان، کسی کی اچھائیوں اور برائیوں کے آگے پیچھے اتنی نفاست اور چابک دستی سے لگاتے ہیں کہ لمحوں
میں سیٹی کی آواز گونجتی رہ جاتی ہے اور ٹرین اسٹیشن پار کر جاتی ہے......

آٹھ ماہ قبل تک عزیز ایک ٹھیک ٹھاک انسان تھے روز ٹی وی دیکھتے، دوستوں کے ساتھ بیٹھتے میں دو بار برج کھیلتے، باقاعدہ جمعہ
نماز پڑھتے، موسیقی کی محفلوں سے آخری پہر دیر سن کر آتے، خوب دعوتیں دیتے اور ہمیشہ اور دعوتیں دینے کے متمنی رہتے۔ اپنے
خاندان، تمام دوستوں میں مقبول تھے۔ جیسے ہی چھٹی کا دن آیا تو کوئی نہ کوئی مہمان موجود ہے۔ ہر پانچ منٹ کو چائے دم ہو رہی ہے،
ہو رہی ہیں، گفتگو میں ہو رہی ہیں، مسائل حل ہو رہے ہیں، سارا دن نکل جاتا۔ جب میں شام کو تھک کر لیٹتی تو سوچتی کہ کاش کسی
انسان سے شادی کی جاتی....

پچھلی اگست کو ایک صاحب جو صورت سے ہی غائب دماغ دکھائی دیتے تھے، اسٹیشن سے کسی اور مسافر کا سوٹ کیس اٹھائے
گھر وارد ہوئے۔ عزیز نے ان کا محبت بھری گالیوں کی بوچھاڑ میں استقبال کیا، گھنٹوں بغلگیر رہے۔ معلوم ہوا کہ لڑکپن کے یار
اور مستند صاحب دیوان شاعر ہیں۔ وہ تقریباً ایک ہفتہ ہمارے گھر ٹھہرے رہے۔ عزیز نے دفتر سے چھٹی لے لی اور سارا وقت اپنے
دوست کے ساتھ گزارا۔ ان کے جاتے ہی عزیز کے دل و دماغ پر یک لخت شاعری سوار ہو گئی۔ میرے چچا بھی شاعر تھے اور چچی بیگم کہتی
تھیں کہ شاعری اک بیماری ہے جس میں دماغ کے ایک نکمے خانے کو چھوڑ کر باقی سارے مکمے کام کرنا بند کر دیتے ہیں۔

ایک اتوار کو میں نے عزیز سے کہا کہ وسیم کا فون آیا ہے۔ تمہاری برج چوکڑی آج دوپہر کو ہمارے گھر جمع ہو رہی ہے۔ میں بازار
جا رہی ہوں۔ بتاؤ جانے پر کیا بنایا جائے۔ عزیز ایک دو منٹ تک ہکا بکا مجھے تکتے رہے۔ جیسے اپنے دماغ کو ایم بکمل مخلوق سے علاحدہ کیا۔ پھر
بولے یار ذرا آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم انہیں واپس فون کر دو۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ شخص جو اسٹریچر پر رہ کر بھی برج
کھیلنے پر اصرار کرتے آج ہاتھ پیر سلامت رکھتے ہوئے برج سے منکر ہو رہا ہے۔ مجھے خاموش پاکر عزیز اٹھے اور ڈرائنگ روم کی دیوار پر
لگے وائلن کو گردن کو جلن جلن کر اتار لیا۔

ایک چھٹی کے دن کسی شاعر کا دیوان لیے صوفے پر لیٹے گنگنا رہے تھے۔ فون بجا، میں نے عزیز سے کہا "سیما کا فون ہے۔ اس کی دوست کے گھر منی بیگم کا گانا ہے۔ وہ تمھیں ساتھ لے جانا چاہتی ہے"۔ عزیز نے یک لخت گنگنانا بند کر دیا ایک چھوٹی سی آہ کی۔ "کہیں درد ہو رہا ہو۔ بولے" زوبی آج طبیعت بالکل ٹھیک نہیں، بہانہ کر دو۔ میں نے بہانہ کر دیا۔ عزیز صوفے سے اٹھے کھڑکی کھولی۔ بچے حسب معمول بچے کھیل رہے تھے۔ عزیز نے پکارا بھاگ جاؤ غل نہ مچاؤ۔

عزیز اپنے کالج کے دنوں میں شاعری کرتے تھے اس کا پتہ مجھے شادی کے آٹھ دس سال بعد لگا جب میں نے اپنی ایک فرصت ان کے پرانے کاغذات کو ہوا دی۔ ان کاغذات سے ان کی شاعری کا ایک پلندہ دریافت ہوا۔ پڑھا تو عام سی رومانٹک شاعری نکلی وہی کا حسن اور مجنوں کی یاس۔ ان کے دوست کی روانگی کے ایک ہفتے بعد جب ایک رات سوتے سوتے میری آنکھ کھل گئی تو عزیز بستر پر موجود نہیں تھے۔ نیچے ڈرائنگ روم میں لائیٹ جلائے بیٹھے تھے۔ اس رات کوئی دس سال بعد ان کی پہلی غزل وجود میں آئی۔ پھر اس سے ان کا دل دوستوں، دعوتوں، برج کی پارٹیوں اور موسیقی کی محفلوں سے اچاٹ ہو گیا۔ کہیں چلنے کہو تو فوراً بہانہ تراش دیں۔ جب بھی موقع ملے میاں عزیز ایک کونے میں لیٹے یا تو دنیا سے بے خبر اپنے خیالات میں گم ہیں یا پھر گنگنا رہے ہیں۔ مجھے قریب پا کر جھنجھلا جاتے۔ میں جانتی کہ شاعری ہو رہی ہے۔

کچھ ہی مہینوں میں کئی غزلیں ہزار نظرثانیوں کے بعد تیار ہو چکی تھیں۔ "گھنٹوں" اپنے شاعر دوست سے ٹرنک کال پر لانبی لانبی گفتگو کی جاتی۔ الفاظ، بحروں اور عروض پر تبادلہ خیال کیا جاتا"۔ فون کا بل تگنا ہو گیا" میں نے بھی، شروع شروع میں دو چار غزلیں گا کر سنیں، پھر وہ گرمی سماعت باقی نہیں رہی۔ یہ شاعر حضرات بڑے حساس ہوتے ہیں۔ عزیز نے جلد ہی جان لیا کہ ان کے اشعار میرے پلے نہیں پڑ رہے ہیں۔ کانونٹ میں تعلیم حاصل کرنے کا پہلا فائدہ مجھے نصیب ہوا.........

اس اثنا میں مجھ میں اور میری پڑوسن میں کافی رابطہ ہو چلا تھا۔ وہ بار بار دروازہ کھٹکھٹائیں۔ کبھی کچھ پکا کر لا رہی ہیں تو کبھی ...... کبھی اپنی صحت کے بارے میں مشورہ لیا جا رہا ہے تو کبھی اپنے بچوں کی شکایت ہو رہی ہے۔ کبھی میرے لیے گوشت ترکاری شاپنگ کی جا رہی ہے تو کبھی دو عدد چائے کی پیالیاں چلی آ رہی ہیں کہ بھئی چائے پینے کا مزہ تو صرف آپ کے ساتھ آتا ہے۔ عزیز گھر پر ہوں جب بھی وہ آئیں اور عزیز گھبرا کر بیڈروم میں گھس جاتے۔

میرے اور میری پڑوسن کے درمیان کبھی ان کے شوہر کا ذکر نہیں ہوا۔ شاید ان کا ذکر کرتے ہوئے شرماتی تھیں یا میں خود ہی ذکر سے کتراتی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ پہلے دن ہی سے وہ شخص مجھے زہر لگتا تھا۔ اس کی چال ڈھال اور ڈھب سے ایک نمبر کا دکھائی دیتا تھا۔ اور اس پر حد یہ تھی کہ وہ شخص نہ جانے کیوں مجھ جیسی بیاہتا کے، جس کے چال چلن پر کوئی انگلی نہیں اٹھتی تھی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ہوا تھا۔ لفٹ میں، کوریڈور میں، راستے پر، بازار میں وہ شخص جہاں بھی ملتا تو مجھے ایسا لگتا جیسے اس کی نکیلی نگاہیں میرے جسم کے ہر حصے میں پیوست ہو گئی ہوں۔ کبھی آمنا سامنا ہوتا تو اس بھیانک طرح سے مجھے دیکھ کر مسکراتا کہ مجھے جھرجھری ہونے لگتی اور میں فوراً دوسری جانب دیکھنے لگتی۔ بعض دفعہ تو مجھے خواب میں اس کے پان کی پیک میں ڈوبے ہوئے بدنما دانت نمایاں کرتے ہوئے دکھائی دیتے اور میں چونک کر جاگ جاتی۔ دور سے کئی بار مجھے دیکھ کر ان حضرت نے کچھ فقرے بھی کسے جو میری سمجھ میں نہیں آئے۔ میں نے عزیز سے کئی بار ان کی شکایت کی اور بعض دفعہ تو بات کو بڑھا چڑھا کر سنایا۔ بس عزیز کی تھوڑی دیر غصہ آتا سالے کی ٹانگ توڑ دوں گا۔ یہ شریفوں کا محلہ ہے پھر کہتے کہ ایسے ذلیل لوگوں کے منہ لگنا بھی اچھا نہیں ہے۔ بات آئی گئی ہو جاتی

ایک دن خوش قسمتی سے وہ مردود لفٹ میں اکیلا مل گیا اور بالکل قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کی سانس سے شراب کی بدبو آرہی تھی۔ میں جو گھبرائی تو گڑبڑ میں میرا دوپٹہ لفٹ کے دروازے میں پھنس گیا اس ظالم نے ایسی شاطرانہ ترکیب سے میرا دوپٹہ لفٹ سے آزاد کیا کہ میرے ہاتھ سے جاتا رہا۔ لفٹ کی اگلی منزل پر لفٹ کے انتظار میں کھڑے لوگوں نے ہم دونوں کو اس حال میں دیکھا کہ میرے سر پیر کھلے ہیں اور اس کے ہاتھوں میں میری لال چنریا لہرا رہی ہے، میں بڑی نادم ہوئی، آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، گھر آکر عزیز کو میں نے یہ واقعہ سنایا۔ بہت لال پیلے ہوئے کہنے لگے میں ابھی جاکر اس کمینے کی ٹھاں ٹھاں کرتا ہوں۔ ہاکی اسٹک لے کر واقعی جارہے تھے میں نے سمجھایا تو تھمے مگر دیر گئے تک ناراضی کے عالم میں رہے۔ میں نے سیما کو یہ واقعہ فون پر سنایا تو وہ کہنے لگی کہ اب تو عزیز بھائی کی غزلوں میں جان آجائے گی کہ ایک عدد عدو بھی اطراف میں موجود ہے۔ یہ سن کر میں نے پھر ایک بار عزیز کی ایک گالی دہرائی جو بے چاری کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس واقعے کے کچھ دنوں بعد ایک صبح پڑوسن نے دروازہ کھٹکھٹایا کہنے لگیں کہ کل میری بڑی لڑکی کی منگنی ہے آپ اور بھائی صاحب ضرور رات کے کھانے اور تقریب میں شریک ہوں۔ میں بے حد ڈری سہمی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ میں اپنے شوہر سے پوچھوں گی کہ کل ان کا کیا پروگرام ہے۔ شام کو میں نے عزیز سے دعوت کا ذکر کیا۔ بولے لاحول ولا زوبی، مجھے ان بورنگ لوگوں میں نہ گھسیٹو یہ عورت ان پڑھ گنوار ہے اور اس کا شوہر..... تمھارا عاشق۔ اول درجے کا غنڈہ ہے اور خاندانی موچی لگتا ہے، اگر میں نے سامنے ا پٹائی نہیں کی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اس کم بخت ذلیل آدمی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھاؤں اور اس سے باتیں بھی کروں۔ بردار! جو تم نے ہاں کی۔ ہاں۔ نہ میں نے بہانہ بنایا ہے نہ ہم گئے بات آئی گئی ہو گئی۔

ایک شام عزیز دیر سے گھر لوٹے۔ میں ایک اہم خط لکھنے میں مصروف تھی، عزیز میرے قریب آئے۔ بولے، یار زوبی تمھیں کچھ پتہ ہے، میں نے کہا، ہٹو مجھے لکھنے دو، انھوں نے کہا، زوبی کیا تمھیں معلوم ہے کہ ہمارے پڑوسی کون ہیں میں نے کہا ایک منٹ رکو تو کہہ کر میں نے ایک نظر ان پر ڈالی۔ باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ آنکھیں چمک رہی تھیں چہرہ دمک رہا تھا۔ کہنے لگے بھئی یہ تو بہت بڑے ی نکلے۔ میں نے قلم روک کر پوچھا کون؟ عزیز بولے آج مزہ آگیا ہے پتہ چلا کہ ہمارے پڑوسی، میر ہمدانی ہیں۔

میں نے پوچھا "ہوں گے کوئی ہمدانی مگر ہیں کیا؟"

عزیز نے کچھ دیر میری کانونٹ کی تعلیم پر زہر اگلا پھر بولے "بھئی زبان اردو کے نمبر ایک بالکل ماپ یعنی عظیم ترین شاعر۔ میں نے لاحول بھیجی اور پوچھا، آپ کو کیسے پتہ چلا۔ بولے ابھی انجمن اردو کے سالانہ مشاعرے سے آرہا ہوں۔ وہاں ان کو دیکھا ان کا حلیہ دیکھ سمجھا کہ شاید ان کا چائے والے کا اسٹال ہوگا، مگر زوبی، وہ ظالم شخص تو صدر مشاعرہ نکلا۔ ایسی ایسی لاجواب غزلیں اور وہ بھی ایسے دل ا ترنم میں سنائیں کہ مشاعرہ لوٹ لیا۔ ابھی تک ان کے اشعار کی لذت سے میرا روآں روآں سرشار ہے۔ مشاعرے کے بعد میں ان سے انھوں نے لپک کر مجھے گلے سے لپٹالیا۔ بولے میاں میں نے تمھیں پہچان لیا میں خود تم سے ملنے کا مشتاق تھا۔" میں چپکی بیٹھی، عزیز کی ی کیفیت کا جائزہ لیتی رہی۔ عزیز بولے جناب، یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ میر صاحب ہمارے پڑوسی نکلے اور کل [illegible] ش مند۔ یار زوبی، ان کو اس جلسے ڈنر پر مدعو کرو۔ ہو جائے ضیافت ان کی ایک شاندار دعوت" میرا خیال ہے کہ میں [illegible] میں اتنی اونچی آواز سے چلائی میں نے کہا عزیز آر یو میڈ (کیا تم پاگل ہو) Are you mad - تم اس آدمی کو [illegible] ا صورت سے مجھے نفرت ہے۔ جو ہر بار مجھے دیکھ کر اپنی موچھوں پر تاؤ دیتا ہے۔ تم اس آدمی کو کھانے پر [illegible] سے سڑکوں پر [illegible] گھورتا ہے۔ [illegible]

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجی جائیں۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

کتاب کا نام: صحرا (مجموعہ کلام)   مصنف: حنیف ترین   تبصرہ نگار: اسلم عمادی

زیر تبصرہ کتاب جناب حنیف ترین کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر حنیف ترین ایک اچھے ادبی ذوق، جدید فکر رکھنے والے شاعر ہیں جن کی پابندی اور آزاد منظومات اظہار ذات کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی تخلیقات اکثر ادبی رسائل میں طبع ہو چکی ہے۔

حنیف ترین نے شستہ اور رواں زبان کا استعمال کیا ہے اور ان کی نظموں کا مزاج واضح ترسیل کی جانب مائل ہے۔ انھوں نے علامت کے مقابلے میں استعارے اور استعارے کی جگہ تشبیہ کو ترجیح دی ہے اس لیے وہ اپنے درون کا اظہار قاری کو انگیخت کرتے ہوئے بہت کامیابی تک کر سکے ہیں۔

حنیف ترین کی نظموں کے موضوعات متنوع تو ہیں لیکن وہ آپ کو کسی پراسرار، ان دیکھی اور گنجلک طرح کی صورت حال سے دوچار نہیں کرتے، وہ آپ کے سامنے پس منظر اور پیش منظر دونوں ہی کو تقابلی یا تتمہ ہوتی ہوئی تصاویر کی طرح پیش کر دیتے ہیں:

"میں تنہا ہوں صحراؤں میں
میرے چاروں جانب
ایسے پیڑ اگے ہیں
جن پر پیلے پھل لگے ہیں
گھر کا آنگن یاد آتا ہے
چپ چپ ساون یاد آتا ہے"   (صحرا)

"اس موسم میں آگ لگی ہے
تم کس موسم میں آؤ گے؟
آگ بجھانے
پھول کھلانے"   (ایک سلگتا سوال)

حنیف ترین نے عصری مسائل، عصری زندگی کی کامیابیوں اور ناکامیوں، حیات کی اداس صداقتوں اور یادوں اور خواب کے درمیان بھٹکتی مہاجر زندگی کے احساسوں کو اپنی شاعری میں بہت توازن اور سوجھ بوجھ کے ساتھ برتا ہے۔ انھوں نے نہ کوئی نئی لسانی ترکیب منتخب کیا ہے نہ کسی نئی عصری علامت کا استعمال۔ لیکن وہ باتیں جو ان کی زندگی سے قریب تر ہیں بڑی توضیح سے ان نظموں میں کہہ دی ہیں۔ کتاب کی طباعت معیاری ہے اور گٹ اپ بھی اچھا ہے۔

ناشر: مولانا ابوالکلام ریسرچ اینڈ ایجوکیشنل فاؤنڈیشن۔ بلند شہر۔ (صفحات: ۱۴۴   قیمت: سو روپے)

o ooo o

کتاب کا نام: حق تو یہ ہے کہ.... (افسانوں کا مجموعہ) مصنف: شعیب احمد کاف مرتبہ: آمنہ تحسین

تبصرہ نگار: اسلم عمادی

یہ مجموعہ شعیب احمد کاف مرحوم کا نمائندہ سماجی افسانوں کا انتخاب ہے جسے بہت سلیقے سے خوب صورت سرورق سے کر [illegible] کے محترمہ آمنہ تحسین صاحبہ نے اشاعت پذیر کیا ہے۔

کاف مرحوم جنوبی ہند کے اہم افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو حقیقت پسند تحریک سے متاثر تھے اور جنھوں نے فرد اور سماجی زندگی کی مختلف تصاویر کو متحرک طور پر اپنے افسانوں میں جمع کرنے کی کوشش کی۔ سلیس اور سادہ زبان میں کردار نگاری کے فن سے وہ واقف تھے اور امید کی جا سکتی تھی کہ وہ آگے جا کر فن افسانہ نگاری میں ممتاز مقام حاصل کر لیتے۔ لیکن موت نے یہ ہونہار ادیب ہم سے چھین لیا۔

کاف کے افسانوں میں بیدی، اقبال متین، انور رشید اور بالخصوص عاتق شاہ کی طرز نگارش کی چھاپ ملتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ غیر شعوری طور پر ہوا ہو۔ غربت، نامرادی، محنت کشوں کے مسائل، متوسط درجہ کی کشاکش دوراں اور اس طرح کے موضوعات ان کے افسانوں کے تار و پود میں ہیں۔ فسادات کے موضوع پر بھی ان کے افسانوں میں خاصی گرفت ملتی ہے۔ انسانیت پرستی اور عوام دوستی کے جذبات افسانے کے بیانیہ میں اکثر جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ ان احساسات میں نہ تو تعصب کی شر پسندی ہے نہ ہی بے جا شدت پسندی۔ اس طرح فسادات، حادثات اور تجربات کا نقش گر یہ افسانہ نگار سمت شناس بھی تھا، کامیاب بھی۔

کاف مرحوم کے اسلوب بیان کی ایک مثال لیجیے:

"اس کے ہاتھ میں چھتری بہ دستور تھی، صندوقچہ بھی تھا، ٹوپی حسب معمول ترچھی ہوئی تھی۔ پاؤں قاعدے کے مطابق چپلوں سے آزاد تھے۔ سب کچھ وہی تھا۔ فرق تھا تو ایک بہت بڑا فرق۔ اس ایک فرق نے اس کی شخصیت کی دل کشی ختم کر دی تھی۔ وہ خاموش تھا، چپ چاپ کھویا کھویا۔ اب لگتا تھا جیسے وہ ایک ہی وقت میں اپنی ساری اولادوں کو دفن کر کے آرہا ہے۔"

اس طرح نرم اور دھیمے بیانیہ انداز میں افسانہ نگار کردار بھی بنا رہا ہے اور اس میں وہ Shade بھی بھر رہا ہے۔ جن کے ذکر سے اس کا مافی الضمیر سے ترسیل ہم کنار ہو۔ شعیب احمد کاف نے بلاشبہ اپنے منتخب اسلوب میں اچھی اردو تحریر پیش کی ہے۔ یہ کتاب اس وجہ سے بھی اہم ہے۔

ناشر: آمنہ [illegible] بک پرووائڈرس، [illegible]، حیدرآباد۔ صفحات: [illegible] قیمت: چالیس روپے

o ooo o

کتاب کا نام: شام ڈھلے سویرا (غزلوں کا مجموعہ) شاعر: مصطفیٰ شہاب تبصرہ نگار: اسلم عمادی

[illegible] کی جرأت سے ہمیں روشناس کرتی ہے۔ اردو کے [illegible] کلام [illegible]

[illegible] بہ خوبی [illegible] ہونے ہے۔ مصطفیٰ شہاب نے اگرچہ [illegible]

[illegible] ہی ہے۔

[illegible] سے معترضہ تھا اس وقت کی زبان و بیان کی چاشنی ان کی شعری صلاحیتوں میں آج تک [illegible]
[illegible] ہیں۔ تشبیہات اور شاعری کی زبان میں مستعمل موضوعات اسی لب و لہجہ میں ہیں گرچہ نئی فکر [illegible]

[illegible] شاعری میں جو استعارے استعمال ہوئی ہیں وہ ترقی پسند تحریک میں اکثر و بیشتر [illegible] ہیں۔ مثلاً سفر، [illegible] دھوپ، صلیب، شجر وغیرہ۔ اب آپ خود ہی دیکھیں کہ ان موضوعات نے کیا روپ بدلے ہیں۔

جب ملک میں نہ ہوئے گزر اکثر سنسان رہ گزر تھی
اب تو اک طور سا ہا ہے ہر طرف آنکھوں سے دیکھا
خالی خالی لگ رہا تھا اس کے جانے سے مکان
ویسے تو سامان سے کمروں کے کمرے تھے بھرے
ہر دام رفاقت سے بچا لے گیا مجھ کو
تنہائی آدم کا وہ احساس پرانا
مگر ادھر تھی کہ اس نے تیری
خوبیاں دیکھیں نہ زیور دیکھا
بکھرا بکھرا سا ساز و ساماں ہے
ہم کہیں، دل کہیں، عقیدہ کہیں

مصداق شباب نے اپنے اندر شاعر کو بسا کر رکھا ہے لیکن لگتا ہے کہ انھوں نے سنجیدگی سے اپنے آپ کو شاعر کی طرح متعارف کرانے کی کوشش نہیں کی حالانکہ مندرجہ بالا اشعار ان کی فکری ندرت کے گواہ ہیں۔ اچھا شاعر ہمیشہ اچھا مانا جاسکتا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ مصداق شباب اس فن میں اور ارتقائی منزلیں طے کریں گے۔ کتابت اور طباعت، گٹ اپ اور پیش کش معیاری ہیں۔
ناشر: مکتبہ شعر و حکمت، سومانی گوڑہ، حیدرآباد۔ صفحات: ۱۰۷ قیمت:

o ooo o

کتاب کا نام: [illegible] (افسانوں کا مجموعہ) مصنف: تسنیم کوثر تبصرہ نگار: اسلم [illegible]
زیر تبصرہ کتاب تسنیم کوثر کے گھر آنگن قسم کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں انسانی جذبات اور [illegible] [illegible] اور اس طرح کے موضوعات کو انتہائی بے ساختگی اور تنوع کے ساتھ برتا گیا ہے۔
تسنیم کوثر افسانہ نگاری میں ایک ابھرتا نام ہے اور ان کے افسانوں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ [illegible] [illegible] گرفت اور [illegible] کی کرتب بازیوں کا گہرا جائزہ لیا ہے اور اس طرح ان کے [illegible]

کر گزرتے ہیں۔

تسنیم کوثر کے افسانوں کا اسلوب کہانی سے قریب تر ہے۔ وہ اس میں صلیہ پروین، واجدہ تبسم، امرت رائے اور کچھ حد تک رام کے طرزِ بیان سے مماثلت رکھتی ہیں۔ زبان پر نہ صرف قدرت رکھتی ہیں بلکہ روزمرہ اور بول چال کو بڑی چابک دستی سے تحریر تی ہیں۔ مثال کے طور پر:

"کسی نے ماں کہا کسی نے ماتا مگر اس چھوٹے سے لفظ کا تقدس ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اب وہ بے
حد تھک چکی تھی۔ اس نے اس عمارت کی دیوار سے لگ کر بیٹھ جانا مناسب سمجھا جس کے آنگن میں لگے نیم
کے پیڑ کی آدھی سے زیادہ شاخیں باہر کی طرف نکلی ہوئی تھیں۔"

تسنیم کوثر نے ہندوستانی زندگی کے ایسے عصری مسائل کو اپنے افسانوں کے موضوع کے لیے منتخب کیا ہے جو انسان کے انسان پر تنہ و فساد اور سماجی بلیک میل کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ان کی زبان میں ہلکی ہلکی اشاریت، زخموں کی طرف قاری کی توجہ کو موثر انتہائی کربہ صورتِ حال کو کچھ اس طرح بیان کر دیا گے ہے کہ جیسے حقیقتاً ایسا وارد ہو سکتا ہے یا ہوا ہے۔ جدید اردو افسانے کے ن کے لیے یہ کتاب ایک اچھا تحفہ ہے۔

تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ صفحات: ۱۳۵ قیمت: سو روپے۔

o ooo o

کتاب کا نام: ٹمل ناڈو کے صاحبِ تصنیف علما مؤلف: علیم صبا نویدی تبصرہ نگار: اسلم عمادی

علیم صبا نویدی بھی کیا غضب کے مخلص، محنتی اور خلاق قسم کے ادیب ہیں۔ شاعری میں بھی وہ ممتاز ہیں خصوصاً ہائیکو، نعت ،، اور سانیٹ، شعری اصناف میں کامیاب تجربے اردو کا اہم سرمایہ ہیں۔ ان کی تحریری قوسِ قزح میں افسانہ، غزل، نظم، تذکرہ اور اریخ جیسی اصناف اپنے، تیکھے رنگوں کے ساتھ روشن نظر آتی ہیں۔ ان پر بھی خوب لکھا گیا ہے۔ ان کے نام خطوط بھی شائع ہوئے، مقالات لکھے گئے ہیں جو اردو طالبانِ علم کے لیے حصولِ اسناد کا سبب بھی رہے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں ٹمل ناڈو (بلکہ اس کے قرب جوار) کے ۱۵۴ اصحابِ تصنیف کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ وہ ادبی، دینی اور علمی ت ہیں جنھوں نے ٹمل ناڈو میں اسلامی اور اردو تہذیب و تمدن کے ارتقا اور ترویج میں عملی بلکہ تحریری طور پر حصہ لیا۔ ایسی ؍اور بافضل شخصیات اس تذکرے میں شریک ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس تمام تذکرے کو مؤلف نے کس طرح مختصر کر کے جمع ۔ مذکورہ شخصیات کا تعارف ان کی تصانیف اور خدمات کی فہرست، ان کی علمی اہمیت اور تبصرہ، یہ سب مختصر لیکن جامع طور پر کتاب ہیں۔ زبان و بیان انتہائی ذمہ داری، متوازن اور خالص ادبی ہے نہ تو تحسین و تعریف کے پل باندھے گئے ہیں، نہ ہی بے جا تنقیص، نہ ہی صفات و کرامات کی کھتونی ہے۔ یہ کتاب ایک سلجھے ہوئے ادیب کے اسلوبِ بیان کی اچھی مثال ہے۔ حیدرآباد بلکہ پردیش کا ٹمل ناڈو سے جو علمی اور ادبی تعلقِ خاص رہا ہے وہ بھی اس کتاب میں شریک علما کے تذکروں سے واضح طور پر ملتا ہے۔

اردو زبان کے جنوبی ہند میں نشو و نما میں اہلِ ٹمل ناڈو کی خدمات کے مطالعے کے لیے یہ کتاب بڑی ممد و معاون ثابت ہوگی۔

، طباعت اور گٹ اپ معیاری ہیں۔

ناشر: ٹمل ناڈو اردو پبلیکیشنز مدراس ۶۰۰۰۰۲ صفحات: ۱۹۲ قیمت: سو روپے۔

o ooo o

کتاب کا نام: متاعِ ہنر (غزلوں کا مجموعہ) شاعر: محمود سروش ترتیب کار: عثمان غنی عادل، ندیم صدیقی

تبصرہ نگار: اسلم عمادی

محمود شروش ایک بزرگ شاعر ہیں جنھیں فن نعت گوئی میں فخرالدین برے بہائی اور فن غزل گوئی میں آرزو لکھنوی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ انھوں نے نثر اور نظم دونوں میدانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور اس کے علاوہ درس و تدریس کے لیے کورس کی کتابیں بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے لیے ترتیب دی ہیں۔ اس طرح ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور زبان و بیان کو اعتبار کا درجہ حاصل ہے

اپنے استاد آرزو لکھنوی کی تقلید میں انھوں نے رواں اور غنائی بحروں اور زمینوں کا انتخاب کیا ہے۔ ان کے موضوعات عام زندگی کے مسائل اور تجربے ہیں۔ نمونہ کلام:

آج ہے کس میں اتنا کس بل جو اوروں کا بوجھ اٹھائے
یہی بہت ہے مر کھپ کر ہم اپنی ہی گٹھری ڈھولیں ہیں

نہ پوچھ یہ ستم جبر اختیار کہ ہم
تڑپ تو سکتے ہیں لیکن سنبھل نہیں سکتے

دلِ برباد کی رونق کا عالم اور ہی کچھ ہے
حرم کی سیر کی ہے ہم نے بت خانے بھی دیکھے ہیں

اب تو محشر میں بھی ممکن نہیں دعویٰ ان پر
ہم سے چپ رہنے کی ایسی وہ قسم لے کے اٹھے

یہ کتاب ایک ایسے سخن ذوق اردو داں کے شعری اظہار کا روایتی طرز کا مجموعہ ہے جس نے شاعری صرف اور صرف اپنے شعری ذوق کو تازہ دم رکھنے کے لیے کی ہے۔ ان غزلوں میں رواں غنائیت اور لے بھی بدرجہ اتم موجود ہیں جو ترنم میں گھل کر اپنا رنگ چوکھا کرکے دکھاتی ہیں۔ مجموعے کی ترتیب مناسب اور طباعت اور کتابت متوسط ہیں۔

ناشر: قاران پبلیشرز۔ جوگیشوری ویسٹ بمبئی ۱۰۲ صفحات: ۲۲۴ قیمت: ایک سو بیس روپے۔

o ooo o

کتاب کا نام: علامہ عبدالحی احقر بنگوری (حیات اور کارنامے) مصنف: ڈاکٹر قدرت اللہ باقوی

تبصرہ نگار: اسلم عمادی

علامہ احقر بنگوری اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں کرناٹک میں اک اہم علمی نابغہ، روزگار بزرگ گزرے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ان کے سوانح پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر سید قدرت اللہ باقوی نے اس کتاب کی اشاعت سے یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ ٹیپو سلطان

شہید کے ہم عصر معاشرے میں کرناٹک میں علم و فضل و کمال کو بہت فروغ پہنچا۔ یہ بات مسلم ہے کہ اس عہد کے عالم، دین و دنیا، تصوف و معرفت، حکمت و شعر میں کامل ہوا کرتے تھے۔ اس عہد میں ایسے جید حاملینِ قرآن و شریعت پیدا ہوئے کہ دنیاءِ اسلام میں علماءِ ہند کا شہرہ ہوا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدیاں بلاشبہ بڑی مردم خیز اور رجال برپا صدیاں تھیں۔

اس کتاب میں علامہ احقر کی سیرت، ان کی خدمات، ان کی ادبی اور علمی تصانیف، ان کے اصحاب و احباب اور ان کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ سب ہی شریک ہیں۔

فاضل مصنف کے بقول علامہ کی علمی کاوشوں نے "ہیروز آف اسلام" جیسا ایک طویل سلسلہ جنوبی ہند میں جاری کر دیا، علم و فضل، شریعت و منقبت، حدیث و تفسیر، شعر و سخن، سوانح، کشف و کرامات، نثر و مثنوی اور درس و تدریس علامہ ان تمام جہات میں ایک اہم اور ناقابل تردید سرمایہ چھوڑ کر گئے ہیں۔

قدرت اللہ باقوی صاحب نے بہت سادہ اور سلیس زبان میں علامہ احقر کی سیرت نگاری کی ہے۔

ناشر: دارِ قدرت ادیا گیری میسور ۵۷۰۰۱۹ صفحات: ۳۸۳ قیمت: دو سو روپے

کتاب کا نام: ٹیچر کے بغیر (بچوں کے ڈرامے) مصنف: محمد خالد عابدی تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد علی اثر

"ٹیچر کے بغیر" بچوں کے چھے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہ سبھی ڈرامے ریڈیو سے نشر ہونے کے علاوہ اسٹیج پر بھی پیش کیے جا چکے ہیں۔ لیکن اگر صرف ان کا مطالعہ بھی کیا جائے تو یہ ڈرامے نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کی توجہ کو بھی اپنی جانب مبذول کر لیتے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف محمد خالد عابدی ریڈیو سے وابستہ ہیں اور ان کی ادبی دلچسپی متنوع ہے۔ انھوں نے تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی سپرد قلم کیے ہیں اور مدھیہ پردیش سے متعلق شعرا کے تذکرے بھی۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی لکھے ہیں اور فلم کی تاریخ اور مراسلاتی انٹرویوز بھی تحریر کیے ہیں۔

پیشِ نظر کتاب کے تمام ڈراموں میں بچوں کی عمر کے لحاظ سے ان کی ذہنیت اور نفسیاتی کیفیات کو بطور خاص ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ان ڈراموں میں کسی نہ کسی اخلاقی، تعلیمی اور سماجی مقصد کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض ڈراموں میں یہ مقصد کچھ زیادہ ہی حاوی ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی دل چسپی میں کمی نہیں آتی۔

ڈرامہ میں اگر چہ کچھ نہ کچھ عمل ضرور ہوتا ہے لیکن ڈرامے کا دار و مدار مکالموں کے سلسلے پر منحصر ہوتا ہے۔ محمد خالد عابدی کے ان ڈراموں کے مکالمے اکثر و بیشتر بڑے دلچسپ اور موقع کی مناسبت سے مزاحیہ انداز بھی لیے ہوئے ہیں۔

"ٹیچر کے بغیر" بچوں کے ادب کے سرمائے میں یقیناً ایک خوب صورت اضافہ ہے اور امید کی جاتی ہے کہ خالد عابدی آئندہ بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے بچوں کے ادب کی اس صنف کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

ناشر: مکتبہء عابدیہ ۵۳ ہوا محل روڈ بھوپال۔ (قیمت: بیس روپے)

o ooo o

مضامینِ خالد (تحقیقی و تنقیدی مضامین) مصنف: محمد خالد عابدی تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد علی اثر

پیشِ نظر کتاب محمد خالد عابدی کے بارہ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان میں سے نو مضامین کا تعلق کسی نہ کسی

پہلو سے ریاست مدھیہ پردیش سے ہے ۔ سوائے تین مضامین (رفعت سروش کے ڈرامے ، نازش پرتاپ گڑھی کی شاعری میں قومی یک جہتی اور رضا نقوی واہی کے منظوم خطوط) کے ۔ مصنف نے بڑی سعی و کاوش سے مدھیہ پردیش کے غیر معروف شعرا اور ادیبوں کے بارے میں معلومات اکٹھا کی ہیں ۔ پہلا مضمون " امین کے ہندو شعرا " ایک مختصر تذکرے کی نوعیت کا حامل ہے ۔ دیگر مضامین قدیم رسائل ... ، گلدستہ ، چمنستان خلیل " بہزاد لکھنوی اور رضا نقوی واہی کے منظوم خطوط " فراق کی تحریروں میں شعرائے مدھیہ پردیش ... معلوماتی ہیں ۔

مصنف کو شکایت ہے کہ اردو ادب کے مورخین نے مدھیہ پردیش کے ادیبوں اور شاعروں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے ۔ لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ حالیہ عرصے میں خود مدھیہ پردیش سے تعلق رکھنے والے اہل قلم نے اس ریاست کے مصنفین کے کارناموں کو متعارف کروانے کا ایک قابل قدر سلسلہ شروع کیا ہے ۔ خود محمد خالد عابدی مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب کے موضوع پر تحقیقی مقالہ سپرد قلم کرنے میں مصروف ہیں ۔ اس کے علاوہ حال ہی میں ڈاکٹر رضیہ حامد نے " فکر و آگہی " کا ایک ضخیم نمبر " بھوپال میں اردو " کے عنوان سے نکالا ہے ۔

ہندوستان میں اردو ہی ایک ایسی نمائندہ زبان ہے جو کسی علاقے یا ریاست میں محدود نہیں ۔ اس زبان کے نشو و نما کے سلسلے میں ہر ریاست کے اہل قلم نے حصہ لیا ہے ۔ اس بات کی اہمیت کو حالیہ عرصے میں شدت سے محسوس کیا گیا ہے ۔ چوں کہ اردو سارے ہندوستان کی زبان ہے ۔ اس لیے ہندوستان کی کسی ریاست کے نمائندہ ادیبوں اور شاعروں کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے ۔ اس اعتبار سے ریاست مدھیہ پردیش کے ادیبوں اور ادبی صورت حال کے بارے میں یہ کتاب زیادہ اہمیت اختیار کر لیتی ہے ۔

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ نئی دہلی صفحات : ۱۵۰ (قیمت : پچاس روپے)

0 000 0

کتاب کا نام : اَرضِ بے پیغمبر (شاعری کا مجموعہ) مصنف : مظہر مہدی تبصرہ نگار : مضطر مجاز

سو صفحات کے اس مختصر سے شعری مجموعے میں (۶۷) نظمیں شامل ہیں ۔ اس شاعری کو عرفِ عام میں نثری شاعری کہا جاتا رہا ہے جسے ہمارے ایک دانش ور دوست یوسف کمال نے " نثم " کا نام دیا ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان کی دوسری زبانوں بلکہ ساری دنیا میں بھی " بہی نثریہ شاعری " ہو رہی ہے ۔ مظہر مہدی نے اپنی اس شعری کاوش کا نام " ارضِ بے پیغمبر " رکھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس مذہبی عقیدے کے انکاری ہیں جس میں ہر خطہ ارض میں پیغمبر بھیجنے کی بات کہی گئی ہے ۔ لفظ " پیغمبر " یہاں دینی اصطلاح کے طور نہیں بلکہ لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ یعنی جس شاعری سے آپ متعارف ہونے جا رہے ہیں اس کا دین و آئین اس سے بہت مختلف ہے جس کی تقلید میں ہم نے عمریں بلکہ نسلیں گزار دی ہیں کہنا وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس آئین شعر میں کسی رشید و طواط یا قدر بلگرامی کے ورودِ مسعود کا امکان نہیں ۔ اس شاعری میں کہیں تقریر ، تلقین ، تحریص یا تحریک کا بیانیہ اور اکہرا اظہار نہیں لیکن اگر آپ لفظوں کی پرتوں کو ہٹا کر دیکھیں تو اس میں عصری زندگی کا وجودی کرب ، جوہری تابکاری کا عذاب ، فسادوں کی بہیمیت اور نسل کشی کا ننگا ناچ بھی ملے گا جسے ہم ترقی یافتہ میڈیا کی برکت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھے جا رہے ہیں ۔ یہ نظمیں ایک باشعور اور ہوش مند شاعر کے ذہنی بلکہ روحانی ارتسامات ہیں جنھوں نے " کاغذی پیرہن " زیب تن کر لیا ہے ۔ مثلاً ان کی نظم " وجود کا حصہ " ملاحظہ فرمایئے ۔

"ہمیں افسوس کے گھر میں رہنا ہے / اور خوش آئند مستقبل / دروازے کے باہر /
خوش آمدید کی تختی کے نیچے / کھڑا رہا ہو تو ایسے میں / دائمی مسرت کا تصور
کیا کسی کو فریب دے سکتا ہے۔ (ص ۵۶)

نیوکلیر ہولو کاسٹ کی ہولناکی پر کیا اس سے بہتر کوئی تبصرہ ہو سکتا ہے
میں اس دن سے ڈرتا ہوں / جب / کسی کو کوئی بھی دفنانے والا نہ ہوگا

س نظم سے خدا کا کوئی نیک بندہ وہ یوم موعود بھی مراد لے سکتا ہے۔ جو دنیا کا آخری دن ہوگا۔

نظم کے معروضی اظہار نے اس میں ایسی تہہ داری پیدا کر دی ہے جس سے قاری اپنی اپنی فراست اور ذہنی تربیت کے مطابق حظ
ٹھا سکتا ہے۔ مظہر مہدی کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ Ideas کا ترجمہ Images میں کرتے ہیں وہ خیالات کو منظوم نہیں کرتے بلکہ ان
ی قلب ماہیت کر کے انھیں پیکروں میں ڈھال دیتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کی نظموں میں "صفات" کا استعمال زیادہ ہے اور افعال کا کم
تذکرہ نظم میں "افسوس کا گھر" مستقبل کا دروازے پر کھڑے ہوئے رونا، خوش آمدید کی دکھاوے کی تختی، ایسے پیکر ہیں جن میں ایک
ہان معنی سمٹ آیا ہے۔ یہ چند سطور اپنی تعبیر اور تاثیر میں کئی کئی تقریروں اور تحریروں پر بھاری ہیں۔

اگر آپ لفظ کے تخلیقی استعمال کا ذوقِ لطیف رکھتے ہیں۔ اگر استعارہ (جسے ارسطو نے شاعری کی جان کہا ہے) آپ کو اپیل کرتا
ہے۔ اگر آپ کو نت نئے امیجز کی جلوہ گری سے سروکار ہے اگر آپ اچھوتے پیکروں سے حظ اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو یقیناً یہ شاعری
پ کو اپیل کرے گی کیوں کہ یہ آپ کے ذہن، فکر اور شعور کو خوابیدہ نہیں بلکہ بیدار کرتی ہے لیکن اس شراب کو تلخ تر ہونے اور
نوں کو ریش تر ہونے میں ابھی وقت لگے گا یہ بادہ ابھی نیم رس ہے اور قارئین کا ذوقِ نارسا اس کو کچھ اور کہن ہونا ہوگا تب جا کر شاید
ل اس سے سرمستِ سخن ہو سکیں گے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ یہ مجموعہ جدید نثریہ شاعری کا ایک مثالی مجموعہ ہے۔ اس میں حروف
نف و حروف جار کا کرائسس بھی ہے، زبان و بیان اور روزمرہ و محاورے سے کھلواڑ بھی ہے۔ مثلاً

میرے سر / جب پہلی بارش ہوی

ہونا ایک اور ہی معنوں میں ہے جو ظاہر ہے یہاں شاعر کی مراد نہیں کہیں کہیں غیر ضروری تعقیدِ لفظی بھی ہے:

اس کے بھیگے پانو کے جلتے نشان / آج بھی مجھ میں ہیں منجمد

اب اور اضافتوں کا غلط استعمال بھی ہے۔ اظہار کے ونگل میں کہیں نظم چاروں خانے چت بھی پڑی ہے۔

ان خامیوں اور کمیوں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں سامرسٹ مام، کی یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اکملیت اکتاہٹ بھی پیدا کرتی ہے۔
شاعری چوں کہ اسٹیریو ٹائپ نہیں اس لیے اکتاہٹ نہیں پیدا کرتی اور سچ تو یہ ہے کہ ناتمامی کا احساس ہی زندگی کو آگے کی جانب ڈھکیلتا
ہے۔ زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے! ہماری غرض بس اتنی ہے کہ معرکِ سخن کے اس کھلے بازار میں اس یوسفِ بے کارواں کو چشم
سے دیکھ کر خریدارانِ سخن اس کا اونے پونے مول تول نہ کریں۔ کیا عجب کہ یہ آج کا بے قیمیں نوجوان کل کلاں معرکِ سخن کے تخت
راہمان ہو جائے اور اس وقت ہمیں اپنی کم نظری پر شرمندہ ہونا پڑے!

ناشر: مکتبہء شعر و حکمت، سوماجی گوڑہ حیدر آباد صفحات: ۲۰ ((باقی ص ۳۶ پر)

وقار خلیل

ادارے کی خبریں

○○○ جناب شاہد صدیقی (کینڈا) اور جناب حسن چشتی (امریکہ) کا ایوان اردو میں خیر مقدم

۴ / جنوری ۱۹۹۷ء کو ایوان اردو میں جناب شاہد صدیقی (کینڈا) اور جناب حسن چشتی (شکاگو امریکہ) کے اعزاز میں خیر مقدمی محفل پروفیسر جعفر نظام صاحب صدر ادارہ کی صدارت میں آراستہ ہوئی۔ پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارہ نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ان کی اردو شعر و ادب اور حیدرآباد سے دیرینہ رفاقت کو خراج ادا کیا۔ پروفیسر مغنی تبسم نے ادارے کی سرگرمیوں پر اظہار خیال کیا مہمانوں نے ایوان اردو کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا اور ادارے کی کارکردگی پر خوش نودی کا اظہار کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً ادارے کی سرگرمیوں کے فروغ میں اپنے تعاون کا ارادہ ظاہر کیا۔ جناب شاہد صدیقی نے کارکنان ادارہ کی تنخواہوں میں اپنی طرف سے ایک سال تک فی کارکن سو روپے ماہانہ اضافے کا اعلان کیا۔ اس موقع پر ادارے میں اردو کے اساتذہ صاحبان اور اراکین مجلس انتظامی ادارہ اور اہل قلم ادیبوں، شاعروں نے شرکت کی۔

○○○ ہندوستانی بزم اردو ریاض کے عہدیداروں کا ایوان اردو میں خیر مقدم

ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام ہندوستانی بزم اردو ریاض کے عہدہ داروں کا خیر مقدم ۱۱ / فروری کی شام "ایوان اردو" پنجہ گٹہ میں کیا گیا۔ پروفیسر جعفر نظام صدر ادارہ ادبیات اردو نے صدارت کی اور جناب علی سردار جعفری نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ ابتدا میں پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارہ ادبیات اردو نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ سارے عہدہ داران بزم حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں اور سعودی عرب میں بہ سلسلہ معاش مقیم ہیں۔ انھوں نے جناب سکندر علی خاں صدر ہندوستانی بزم اردو، ڈاکٹر عابد معز، جناب غوث ارسلان اور محترمہ حلیمہ فاطمہ کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر مغنی تبسم نے مہمانوں کو ادارے کی سرگرمیوں سے واقف کروایا اور کہا کہ ڈاکٹر زور نے ۱۹۳۱ء میں اپنے چند رفقا کی مدد سے یہ ادارہ قائم کیا تھا ان کا مقصد دکنی زبان اور ادب کے علاوہ دکنی کلچر کا تحفظ بھی تھا وہ حیدرآباد کے ادیبوں کی تخلیقات کی شائع کروانا چاہتے تھے۔ ادارہ آج بھی اس مقصد کی تکمیل میں سرگرم عمل ہے۔ جناب سکندر علی خاں صدر بزم اردو نے سعودی عرب میں اردو کی موجودہ صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہماری بزم اردو نے بچوں کے مقابلوں کا انعقاد کیا جس کا بہت اچھا اثر پڑا۔ ستر سے زیادہ لڑکے اور لڑکیوں نے ان مقابلوں میں حصہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر اخلاص کے ساتھ کوشش کی جائے تو ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن خود اردو والے ہمارے ساتھی اپنے بچوں کو اردو پڑھانا نہیں چاہتے جب کہ بچوں میں اردو پڑھنے اور سیکھنے کی جستجو ہے۔ انھوں نے کہا کہ سعودی عرب سے روزنامہ "اردو نیوز" جاری ہوا۔ صرف دو سال میں اس کی تعداد اشاعت چالیس ہزار ہو گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ عابد علی خان ٹرسٹ اور ادارۂ ادبیات اردو کے مشترکہ امتحانات کے انعقاد کی کوشش سعودی عرب میں کریں گے۔ محترمہ حلیمہ فاطمہ نے اپنی چند نثری نظمیں پیش کیں جنھیں بے حد

پسند کیا گیا - جناب غوث ارسلان نے اس بات کا تیقن دیا کہ سعودی عرب میں وہ سب رس کی اشاعت اور اس کے فروغ کی کوشش کریں گے - مشہور مزاح نگار ڈاکٹر عابد معز نے مزاحیہ مضمون "عرض کیا ہے" پیش کیا جس میں سعودی عرب میں شعرا کی بڑھتی ہوئی تعداد اور نام نہاد شاعروں پر گہرا طنز تھا - اس مضمون کو بے حد پسند کیا گیا - جناب سردار جعفری نے سب رس کے ڈاکٹرز ور نمبر کی رسم رونمائی انجام دی - جناب سردار جعفری نے کہا کہ میں خلیجی اور یورپ کے اکثر ممالک جاتا رہتا ہوں - اس لیے وہاں جو اردو کی صورت حال ہے اس سے واقف ہوں - انھوں نے کہا کہ زبان ایک جگہ نہیں ٹھہرتی - انھوں نے کہا کہ بیجاپور سے ہو کر یہ زبان دکن پہنچی دکن اردو کا سب سے مستند مرکز تھا - زبان، محاورے اور تلفظ میں علاقائی رنگ شامل ہوتا ہے - مجھے حیدرآبادی تلفظ بہت اچھا لگتا ہے - حیدرآباد نے اردو کو دکھنی مزاج دیا - دلی کے بعد حیدرآباد اردو کا مرکز بنا - اردو تخت شاہی سے بازار میں نہیں آئی بازاروں سے تخت شاہی پہنچی - زبان عوام بناتے ہیں - خواص کی منزل بعد میں آتی ہے - انھوں نے دکن اور دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی خدمات کو سراہا - دلی کے زوال کے بعد لکھنو کی خدمات، پھر لاہور اور آخر میں حیدرآباد نے جو زبان کی خدمات انجام دی ہیں اس پر سیر حاصل گفتگو کی - انھوں نے کہا کہ آج اردو پر جو بپتا پڑی ہے اس میں پاکستان بھی ہندوستان کے ساتھ برابر کا شریک ہے - پاکستان میں اردو مجبوری ہے کیوں کہ پنجابی، سندھی اور بلوچستانی زبانیں ہمہ گیر نہیں ہیں لیکن پاکستان میں اردو کی جڑیں نہیں ہیں - پاکستان اپنی الگ شناخت بنانا چاہتا ہے - لیکن صرف پچاس برس میں تمدن اور تہذیب نہیں بنتے - قوموں کا تشخص نہیں ہوتا - اب دلی کا یہ حال ہے کہ وہاں کے لوگوں کی مادری زبان پنجابی ہے - وہ اردو بول رہے ہیں لیکن اسے ہندی کا نام دے رکھا ہے اور دفتر میں کام انگریزی میں کر رہے ہیں اور بچوں کو انگریزی پڑھا رہے ہیں - اب اگر سعودی میں اردو نہیں ہے تو کوئی تعجب نہیں - اپنے عہد کی ٹکنالوجی سے جب تک زبان کا رشتہ نہ ہوگا وہ زبان اعلیٰ درجے کی زبان نہ ہوگی پچاس برسوں میں ہندی زبان حاوی نہ ہو سکی کیوں کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ تریویندرم میں کوئی کانفرنس ہو آسام، کشمیر، بنگال اور آندھرا سے لوگ شریک ہوں اور اس کی کاروائی ہندی میں چلائی جائے اس لیے انگریزی ناگزیر ہے - گجرال کمیٹی کا شور ہوتا ہے - لیکن یہ نہیں معلوم کہ اس رپورٹ کی قانونی حیثیت کیا ہے - اردو والوں کی بے عملی عبرت ناک ہے - اردو والے صرف مشاعروں اور قوالی کے شوقین ہیں - انھوں نے کہا کہ بہار میں اردو کی صورت حال اچھی ہے - وہاں دفاتر میں اردو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت اختیار کر رہی ہے لیکن یو - پی میں ایسا نہیں ہے - اردو سکھا کر آپ کیا کریں گے - بچوں کو صرف حرف شناس بنا دیں گے - وہ ہلکی پھلکی غزلیں سمجھ لیں گے - لیکن غالب پر کوئی مضمون نہیں لکھ سکیں گے - اب کوئی انفراسٹرکچر نہیں ہے - اب نہ دلی اردو کا شہر ہے اور نہ لکھنو - البتہ مجھے ہندوستا کے جمہوری نظام پر اعتماد ہے - ہم کامیاب ہوں گے - پارلیمنٹ میں جتنے شعر پڑھے جاتے ہیں ان میں نوے فیصد اردو کے اعلیٰ درجے کے شعر ہوتے ہیں - اردو کی مقبولیت ہی ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے - پروفیسر جعفر نظام نے صدارتی تقریر میں کہا کہ جناب سردار جعفری نے جو عالمانہ تقریر کی اس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں - انھوں نے سکندر علی خان کی تقریر کے حوالے سے کہا کہ وہ حیدرآباد کے کارکرد اداروں سے ربط قائم رکھیں - ادارہ ادبیات اردو اور عابد علی خاں ٹرسٹ کے کام کو سعودی عرب تک وسعت دیں - ہم ان سے پورا تعاون کریں گے - انھوں نے عطیہ فاطمہ کی نظموں کی تعریف کی اور عابد معز کے مضمون کے بارے میں کہا کہ ان کے مضمون کا عنوان "عرض کیا ہے" ہم اس کے جواب میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ "مکرر ارشاد" اس جلسے میں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی - پروفیسر مغنی تبسم کے شکریے پر اس جلسے کا اختتام ہوا -

ooo امتحانات اردو دانی، زبان دانی اور انشاء

۱۶ / فروری ادارہ ادبیات اردو کے معتمد عمومی پروفیسر ڈاکٹر مغنی تبسم نے اردو امتحانات منعقدہ ۵ / جنوری ۱۹۹۷ء کے نتائج کرتے ہوئے۔ مندرجہ ذیل پریس نوٹ جاری کیا ہے۔

ادارہ ادبیات اردو اور عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام ۵ / جنوری کو منعقدہ اردو دانی، زبان دانی اور ا امتحانات کے نتائج شائع کیے جارہے ہیں۔ یہ امتحانات شہر کے ۲۶۰ مراکز اور اضلاع و بیرون ریاست کے ۱۶۸ مراکز پر ایک سا ہوئے تھے۔ تیس ہزار طلباء و طالبات نے امتحانات میں شرکت کی۔ ان میں تلگو داں امیدواروں کی قابل لحاظ تعداد شامل تھی۔ مدا ٹیچرس اور کالجوں کے پروفیسرس بھی امتحان دینے والے امیدواروں میں شامل تھے۔ جملہ کامیاب طلبہ کا فیصد 96.6 رہا۔ شہر حیـ سکندرآباد سے 19610 درخواستیں وصول ہوئی تھیں اور 15278 طلبہ و طالبات امتحان میں شریک ہوئے۔ دونوں شہـ کامیاب طلبہ کا فیصد 95.1 رہا۔ حیدرآباد کے دو بڑے مراکز ڈان ہائی اسکول ملک پیٹ اور برٹش اسکول دیوان دیوڑھی سے علی 1066 453 طلبہ و طالبات نے حصہ لیا۔ اضلاع سے 9380 درخواستیں وصول ہوئیں۔ امتحان میں شرکت کرنے والوں 7197 اور کامیاب ہونے والوں کی تعداد 7729 ہے۔ اضلاع کے نتائج کا فیصد 98 رہا۔ کرنول کے 45 مراکز کے تین و طالبات شریک امتحان رہے۔

شعبہ امتحانات ادارہ ادبیات اردو کے معتمد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ اور شریک معتمد ڈاکٹر محمد انورالدین نے اپنے ریسرچ اسکالرس کے تعاون سے امتحان کے انصرام اور پرچوں کی جانچ کا منظم طریقے پر اہتمام کیا تھا۔ امتحان کے دوران جناب خ خان گورنر کرناٹک و وزیر داخلہ کرناٹک جناب روشن بیگ اور آندھرا پردیش کے وزیر ٹرانسپورٹ جناب چندر شیکھر کے عا تعلیم نے بھی مختلف مراکز کا دورہ کیا۔

اس دفعہ نہ صرف آندھرا پردیش اور کرناٹک و مرہٹواڑہ کے مراکز کے طلباء نے امتحان دیا۔ بلکہ دہلی، اعظم گڈھ اور مراکز میں بھی امتحانات منعقد ہوئے تھے۔

تاثرات

ooo جناب شاہد صدیقی (اٹوا، کینڈا)

ادارہ ادبیات اردو میں اردو سے محبت کرنے والوں کی روح بسی ہوئی ہے۔ اس سے منسلک تمام افراد کو دلی مبارک باد پیش جو تن من دھن سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں

مجھے یقین ہے کہ جب تک ہے یہ دکن باقی   جیے گی اردو کہ اردو کا ہے وطن باقی

(۴ / جنوری؛

ooo جناب مجتبیٰ صدیقی (سابق پرنسپل انڈین ایمبسی اسکول سعودی عرب)

آج پروفیسر مغنی تبسم صاحب کی خواہش پر اس عظیم ادارے کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی مجھے معلوم ہوا کہ میرے چچا حضرت مولانا حامد صدیقی صاحب مرحوم نے بھی اس ادارے سے وابستہ رہ کر خدمت انجام دی ہے ۔ خدا کرے یہ ادارہ مزید ترقیاں کرے ۔ میری نیک تمنائیں اس کے ساتھ ہیں........ (۴/ جنوری ۱۹۹۷ء)

ooo جناب غوث ارسلان (ریاض سعودی عرب)

ادارہ ادبیات اردو کا کتب خانہ، میوزیم، شعبہ مخطوطات ہم اردو والوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہے....... (۲۷/ جنوری ۱۹۹۷ء)

ooo ڈاکٹر عابد معز (ریاض سعودی عرب)

ادارے کے معائنے کے بعد میری معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور اپنے ماضی سے واقفیت ہوئی ۔ جس سے فخر بھی محسوس ہوا ہمیں ہر قسم سے ادارے کی مدد کرنی چاہیے ، ادارے میں کام کرنے والوں اور اعزازی خدمات انجام دینے والے حضرات سے میں نیک تمناؤں کا اظہار کرتا ہوں...... (۲۷/ جنوری ۱۹۹۷ء)

oo ooo oo

وقار خلیل

وفیات

ooo نامور نقاد اور اپنے عہد کے معروف سخن ور **ڈاکٹر وحید اختر** کا ۱۳ / ڈسمبر ۱۹۹۶ء کو طویل علالت کے ایک ہسپتال میں بہ عارضہ قلب انتقال ہوا ، علی گڈہ میں تدفین عمل میں آئی ۔

ڈاکٹر وحید اختر ۱۲ / اگست ۱۹۳۵ء میں بہ مقام اورنگ آباد (مہاراشٹرا) پیدا ہوئے ۔ اتر پردیش کے قصبے نصیر آباد (را کے مذہبی گھرانے سے ان کا تعلق تھا ۔ ان کے والد مولوی سید نذر عباس بہ سلسلہ ملازمت اورنگ آباد منتقل ہوئے ، وحید اختر تعلیم اورنگ آباد ہی میں ہوئی ۔ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے عثمانیہ یونی ورسٹی سے فلسفے میں ایم ۔ اے کرنے کے بعد ۱۹۶۰ء میں خو کے تصوف پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڈہ میں فلسفے کے لکچرار مقرر ہوئے ریڈر اور پروفیسر کے عہدوں پر فائز رہے ۔ اگست ۱۹۹۵ء میں بہ حیثیت ڈین فیکلٹی آف آرٹس وظیفہ حسنِ خدمت پر سبک د

ڈاکٹر وحید اختر ترقی پسند تحریک سے عصری جدیدیت تک کے سفر میں صفِ اول کے نقاد ، دانشور اور سخن ور کی حیثیت رہے ۔ حیدرآباد اور یہاں کے علمی و ادبی حلقوں سے ان کا دیرینہ ربط و تعلق تادمِ آخر استوار رہا ۔ تین شعری مجموعے " پتھر د زنجیر کا نغمہ اور کربلا تا کربلا " شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں ۔ ان کے علاوہ سلیمان اریب کے ماہ نامہ " صبا " میں ان مضامین شائع ہوئے ۔ اردو اور انگریزی میں بھی ملک کے مقتدر رسائل و جرائد میں وحید اختر کی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں ۔ مقالہ " خواجہ میر درد تصوف اور شاعری " بھی شائع ہوا ۔

ooo ممتاز ادیب اور مجاہد آزادی **ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی** (ولادت ۱۹۱۶ء) لکھنؤ میں ۲۲ / ڈ کو انتقال کر گئے ۔ مرحوم نے آگرہ یونی ورسٹی سے ایم ۔ اے کیا اور لکھنؤ یونی ورسٹی سے " حالی بہ حیثیت شاعر " کے موضوع پر کی ڈگری حاصل کی تھی ۔ ۱۹۳۷ء سے معلمی کے پیشے سے منسلک رہے ۔ اور جون ۱۹۷۷ء تک درس و تدریس کے فرائض انجام د ڈاکٹر سندیلوی کی تقریباً دو درجن کتابیں چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں ۔ ہندو پاک کے معیاری رسائل و جرائد میں ان شائع ہوتے رہے ہیں ۔ مرحوم لکھنؤ کے علمی ، ادبی اور تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے ۔

ooo مشہور اور بزرگ شاعر **حضرت راز الہ آبادی** کا ۲۸ / ڈسمبر ۱۹۹۶ء کو طویل علالت کے بعد الہ آباد ہوا ۔ عمر تقریباً ۷۶ سال تھی ۔ کئی شعری مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں " منزلیں " اور " دھڑکنیں " قابلِ ذکر ہیں ۔ حیدرآباد ا اہم مقامات میں منعقد ہونے والے کل ہند مشاعروں میں اپنے کلام اور پڑھنے کے انداز سے راز مرحوم کی خاصی شہرت و عزت

ooo اردو کے مشہور ادیب ، صحافی اور مترجم **جلیس عابدی** ۲۹ / ڈسمبر ۱۹۹۶ء کی صبح بعارضہ قلب رحلت ک

اوکھلا قبرستان دہلی میں تدفین عمل میں آئی ۔ جلیس عابدی کا مشہور اردو ترجمہ روسی ناول " کینسر وارڈ " شہرت رکھتا ہے ۔ مرحوم ماہ تحریک دہلی سے وابستہ تھے ، انھوں نے بہت ساری کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا تھا ۔

ooo اردو کے معروف نقاد اور ادیب **ڈاکٹر عنایت اللہ منظر اعظمی** کا ۲۶ / جنوری ۱۹۹۷ء کو دہلی میں ل ہوا ۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے دہلی ۱۹۵۶ء میں بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ سے ایم ۔ اے پی ایچ ۔ ڈی کیا ۔ آپ نے جموں یونی ورسٹی سے ۱۹۸۳ء میں ڈی ۔ لٹ بھی کیا ۔ ابتدائی تقرر جامعہ ملیہ میں بہ حیثیت لکچرار ہوا اور پھر یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے اور وہیں سے بحثیت پروفیسر ریٹائرڈ ہوئے ۔ ڈاکٹر اعظمی کی مطبوعات میں " سب رس ی) ، کا تنقیدی جائزہ ، اردو میں تمثیل نگاری ، چراغ راہ اور اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ " قابلِ ذکر ہیں لمی مرحوم یکم جنوری ۱۹۳۴ء کو فیض آباد (یو ۔ پی) میں پیدا ہوئے تھے ۔ وہ اردو کے فعال خدمت گزار اور خوش فکر شاعر بھی تھے ۔

ooo معروف شاعرہ **بیگم ممتاز مرزا** کا ۲۹ / جنوری ۱۹۹۷ء کو جموں میں حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال یا ۔ پدم شری ممتاز مرزا ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے وہاں گئی ہوئی تھیں ۔ بیگم ممتاز مرزا ہند ایرانی تہذیب کا روشن عکس تھیں رسوں ایرانی سفارت خانہ فرہنگِ دہلی میں فارسی جدید کی استاد رہیں ۔ ان کا شعری مجموعہ " یادوں کے سائے " اردو اور ہندی دونوں ؤں میں شائع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکا ہے ۔ بیگم ممتاز مرزا ، ۲۰ / جولائی ۱۹۲۹ء کو دہلی میں پیدا ہوئیں ۔ ملک اور بیرونِ ملک کے روں میں مدعو کی جاتی رہیں ، ہندوپاک کے ادبی رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا ہے ۔

ooo مشہور شاعر اور ادیب **شمیم نصرتی** کا ۳۰ / جنوری ۱۹۹۷ء کو انتقال ہوا ۔ ان کا نام سید حمید تھا ۔ شمیم نصرتی ادبی نام سے جانے پہچانے جاتے تھے ۔ والد کا نام سید روشن تھا ۔ شمیم مرحوم ۳۰ / ستمبر ۱۹۳۸ء کو مہدوی گھرانے میں مشیر آباد میں ہوئے ۔ حضرت سید ہاشم خوند میری کے فرزندِ آغوشی تھے ۔ آرکیٹکچر کا ڈپلوما حاصل کیا تھا ۔ چیف انجینیر آفس میں گزیٹیڈ عہدے پر فائز رہ ظیفہ حسن خدمت لیا تھا ۔

شمیم نصرتی ، انجمن ترقی پسند مصنفین اور حلقے کے رکن تھے اور بزم کہکشاں سے بھی وابستہ تھے ۔ ادارہ تبلیغِ مہدویہ کے بانی اور ں کارکن تھے ۔ صدائے نور کے نام سے نعتیہ و منقبتی مجموعہ کلام ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا ۔ علمی و ادبی رسائل میں کلام اور مضامین نیز یے شائع ہوتے رہے ۔ ایوانِ اردو کے کتب خانے سے برسوں پابندی کے ساتھ استفادہ کیا ۔ نیک دل ، مخلص اور وضع دار انسان تھے

oo ooo oo

سید جلیل الدین

(مرتب)

اشاریہ ماہ نامہ سب رس حیدرآباد۔ جنوری تا ڈسمبر ۱۹۹۶ء

مقالے

	۲۔ قطب شاہی حکمران اور ان کے فرامین	خصوصی اشاعت	مئی و جون	ص۔ ۳۲
	۳۔ ادارہ ادبیات اردو۔ ریاست حیدرآباد کی مالی امداد	زور نمبر	نومبر و دسمبر	ص۔ ۲۵
راحت عزمی	۱۔ حیدرآباد میں محرم کی رسومات	دکنی کلچر نمبر	اپریل	ص۔ ۲۷
	۲۔ قطب شاہی دور کے چند امرا و وزرا	خصوصی اشاعت	مئی و جون	ص۔ ۴۰
راما نج راؤ۔ ڈی /				
نت ساجدہ، ڈاکٹر	قطب شاہی عہد میں تلگو شاعری	ایضاً	مئی و جون	ص۔ ۴۴
یب حیدر، ڈاکٹر	قطب شاہوں کی فارسی علماء، ادباء اور شعراء کی سرپرستی	ایضاً	مئی و جون	ص۔ ۹۸
لیمان اطہر جاوید، پروفیسر	۱۔ فراق کا اسلوب شعر		ستمبر	ص۔ ۱۰
	۲۔ ڈاکٹر زور اور آصف جاہی دور کا ادب	زور نمبر	نومبر و دسمبر	ص۔ ۱۳
سترا پارتھا سارتھی				
ترجمہ) اسامہ فاروقی	آندھرا میں رقص کی اشکال	دکنی کلچر نمبر	اپریل	ص۔ ۲۵
ید محمد، پروفیسر	قطب شاہی عہد کے چند بزرگان دین	ایضاً	ایضاً	ص۔ ۲۹
صادق نقوی، ڈاکٹر	حیدرآبادی تہذیب کے مذہبی اقدار	ایضاً	ایضاً	ص۔ ۳۳
فی الدین صدیقی، ڈاکٹر	وہ کتابیں جنھوں نے مجھے متاثر کیا		جنوری	ص۔ ۲۴
بدالمجید صدیقی، پروفیسر	گولکنڈے کا تمدن	دکنی کلچر نمبر	اپریل	ص۔ ۱۸
ابد حسین خاں، سید	قطب الملک سلطان قلی قطب شاہ	خصوصی اشاعت	مئی و جون	ص۔ ۶
بدالقیوم، محمد	قلعہ گولکنڈہ ۵۰۰ سال مکمل	ایضاً	ایضاً	ص۔ ۱۷
	۲۔ گولکنڈہ کی قطب شاہی مسجدیں	ایضاً	ایضاً	ص۔ ۳۱
قیل، معین الدین، ڈاکٹر	۱۔ دکن اور ایران	دکنی کلچر نمبر	اپریل	ص۔ ۳
	۲۔ سر آسمان جاہ کا سفر یورپ		ستمبر	ص۔ ۲
ام ربانی	قطب شاہی مقبرے	خصوصی اشاعت	مئی و جون	ص۔ ۵۳
ملی۔ مصطفی علی خاں، ڈاکٹر	نواب عنایت جنگ	زور نمبر	نومبر و دسمبر	ص۔ ۴۸
بس۔ نسیم الدین، محمد، ڈاکٹر	۱۔ ڈاکٹر زور۔ مکاتیب کے آئینے میں	ایضاً	ایضاً	ص۔ ۹

	۲۔ ڈاکٹر زور اور تدوینِ متن	ایضاً	ایضاً	ص۔ ۳۹
رفیع الدین قادری۔ سید	ڈاکٹر زور۔ یادوں کی انجمن	ایضاً	ایضاً	ص۔ ۳
عباس متقی۔ سید۔ ڈاکٹر	نقوشِ زور از خامۂ کرزور	ایضاً	ایضاً	ص۔ ۱۱
منظر امکانی و اختر سعیدی	پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد سے انٹرویو	ایضاً	ایضاً	ص۔ ۵۲
موہن پرشاد	قلعہ۔ گولکنڈہ اور گولکنڈے کے ہیرے	خصوصی اشاعت	مئی و جون	ص۔ ۱۹
احتشام احمد ندوی۔ سید۔ پروفیسر	دیارِ دکن کا ایک روشن چراغ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی	زور نمبر	نومبر و دسمبر	ص۔ ۵۶
فیاض الدین نظامی	قطب شاہوں کے عہد میں تشکیلِ شہری اور فنِ تعمیر	خصوصی اشاعت	مئی و جون	ص۔ ۳۵

سفرنامے

زیب حیدر۔ ڈاکٹر	خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا	فبروری و مارچ	ص۔ ۳۳
یوسف ناظم	چار دن مسقط میں	فبروری و مارچ	ص۔ ۲۱

تعارف

سراج الدین۔ سید۔ پروفیسر	فرنانڈو پیسوا	اگسٹ	ص۔ ۲۱

فکاہیہ

دلیپ سنگھ	رسالدار کا انٹرویو	اگست	ص۔ ۳۹
یوسف ناظم	جنگ میں سب کچھ کبھی روا نہیں رکھا گیا	اگست	ص۔ ۳۷

کتاب

تملیا پری گرتا۔ ڈاکٹر

(ترجمہ) اسامہ فاروقی　　کتاب : مرزا غالب

۱۔ ابرِ گہر بار　(باب ۱۲)　　جنوری　　ص۔ ۵

۲۔ دستنبو (باب ۱۴)	فروری و مارچ	ص۔ ۳
۳۔ شمع سحر (باب ۱۴)	جولائی	ص۔ ۴

افسانے

آصف فرخی	درخت کا ڈر	جولائی	ص۔ ۳۳
امراؤ طارق	اکیسویں صدی کا سقراط	جنوری	ص۔ ۴۴
خالد سہیل	جزیرہ	ستمبر	ص۔ ۴۲
شکیلہ رفیق	تابعدار	فروری و مارچ	ص۔ ۵۵
صغیر ملال	آگاہی	ستمبر	ص۔ ۳۳
ظہیر النبی	بوڑھا مسافر	جولائی	ص۔ ۳۹
عرفی۔ عرفان احمد	کھڑکی	اگست	ص۔ ۳۳
فاروق خالد	گڑیا	اکتوبر	ص۔ ۳۳
گیان پرکاش دیک (ترجمہ) قاسم ندیم	تصویریں	ستمبر	ص۔ ۴۴
مقصود الہی۔ شیخ	رگ سنگ	جنوری	ص۔ ۳۹
منوہر ملگانوکر (ترجمہ) ڈاکٹر یونس اگاسکر	چٹکی بھر نسوار	اکتوبر	ص۔ ۳۷
نشاط فاطمہ	یہ دنیا کیسی ہے۔؟	فروری و مارچ	ص۔ ۹۲

نظمیں

اشرف رفیع، پروفیسر	۱۔ آرزوئے ناتمام	۲۔ انجمن	ستمبر	ص۔ ۲۳
اکبر حیدرآبادی	۱۔ دیوار کے پیچھے	۲۔ تسخیر		

	۳۔ اٹوٹ اکائی	۴۔ خسارہ	جولائی	ص۔ ۳۵
انتونیو مچاڈو				
(ترجمہ) سید خالد قادری	زمین ممنہ ہے		ایضاً	ص۔ ۳۷
ثروت زہرا	۱۔ ایک نظم	۲۔ گھر	اگست	ص۔ ۳۳
حمید الماس	عرش سے پرے ہوتا		جنوری	ص۔ ۳۷
راشد آزر	۱۔ سلیہ		فبروری و مارچ	ص۔ ۴۸
	۲۔ زخم ... آنکھیں	۳۔ دائرہ	ایضاً	ص۔ ۳۹
	۴۔ لے گئے وہی خواب	۵۔ دوستی کی حد	جولائی	ص۔ ۳۶
راہی فدائی	انتقام		جنوری	ص۔ ۴۰
رفائیل البرٹی				
(ترجمہ) سید خالد قادری	ابد (ہسپانوی نظم)		جولائی	ص۔ ۳۷
رفعت سروش	۱۔ خوابوں کی دنیا	۲۔ جنم دن	اگست	ص۔ ۳۱
	۳۔ گم شدہ دوست	۴۔ ریت اور بگولے	ستمبر	ص۔ ۲۲
زہرا نگاہ	سنا ہے		فبروری و مارچ	ص۔ ۳۸
ساجد صدیقی	حرفِ کن		جنوری	ص۔ ۳۰
سلطانہ شرف الدین احمد	تحفہ		جنوری	ص۔ ۳۸
شکیل اعظمی	انتظار		فبروری و مارچ	ص۔ ۵۰
شہزاد احمد	اترے مری خاک پر ستارہ		فبروری و مارچ	ص۔ ۳۷
حلیمہ فاطمہ	۱۔ ملاقات ۲۔ جھوٹ	۳۔ خوش نصیب	اگست	ص۔ ۳
علی ظہیر	دلہن آفتاب		اگست	ص۔ ۳۲
فرنانڈو پسوا / آلبرٹو کیرو				
(ترجمہ) پروفیسر سید سراج الدین	بھیڑوں کا رکھوالا		اگست	ص۔ ۲۳

سلیم	تعمیر	ایضاً	ص ۔ ۲۹
عباسی	التماس	فبروری و مارچ	ص ۔ ۵۰
ہادر سنگھ / قاسم ندیم	۱۔ ماں جانتی ہے ۲۔ ویرانیِ دل	ستمبر	ص ۔ ۲۳
علوی	۱۔ رات ہزاروں آنکھوں والی ۲۔ بے چارہ چاند	اگست	ص ۔ ۳۰
اقبال توصیفی	کچھ بات نہیں کرتے ہم سے	جنوری	ص ۔ ۲۷
سعدی	۱۔ قدیم دوست کے لیے ۲۔ ایک نظم	ایضاً	ص ۔ ۳۹

غزلیں

احمد	آنکھیں اسے ڈھونڈیں گی، تماشا نہیں ہوگا	فبروری و مارچ	ص ۔ ۵۱
نذیری	۱۔ بغیر سرفروشی آدمی سے کچھ نہیں ہوتا		
	۲۔ واہ رے اپنے عشق کا عالم	ستمبر	ص ۔ ۳۱
عمادی	تماشائیوں بھی گراں مایہ ہے نہ ہونے کا	اگست	ص ۔ ۹۳
عبید	۱۔ یہ دن کیسے ستم گر ہوگئے ہیں		
	۲۔ تجو چشم نمی گواہ رہیو	اگست	ص ۔ ۲۸
عارف	۱۔ کوئی مژدہ نہ بشارت نہ دعا چاہتی ہے		
	۲۔ ہم نہ ہوئے تو کوئی افق مہتاب نہیں دیکھے گا	جولائی	ص ۔ ۲۸
	۳۔ حدودِ جاں سے پرے جانا ہے اور طرف		
	۴۔ آسمانوں پر نظر کر انجم و مہتاب دیکھ	اگست	ص ۔ ۲۷
نسیم	آسماں پر پردہ، ابر رواں کوئی نہ ہو	ستمبر	ص ۔ ۳۶
متین	پھیلے میرے بنیچے کا عجب منظر ہے	جنوری	ص ۔ ۴۱
ملک	جینا کیسا صبح و شام کا رونا ہے	فبروری و مارچ	ص ۔ ۵۳
نور	وفا کا کوئی صلہ نہیں ہے	فبروری و مارچ	ص ۔ ۵۱
بھدوریا	۱۔ اپنے پتھر سے ٹکراتے رہے		

	۲۔ یوں ہی روتا رہا آسماں رات بھر	ستمبر	ص۔ ۳۲
بانو طاہرہ سعید	مجھ پہ اتنی مہربانی کس لیے	فبروری و مارچ	ص۔ ۵۲
راشد آذر	تیور ان کے بتارہے ہیں	ستمبر	ص۔ ۲۶
رضا وصفی	۱۔ کھلی آنکھوں میں یسا خواب منظر کس لیے ہے		
	۲۔ ارادہ کیا ہے، کیا نیت ہے، کیا منصوبہ اس کا	جنوری	ص۔ ۳۲
رفعت سروش	۱۔ لالچ کھوٹ کپٹ کو تیاگ		
	۲۔ اے تنہائی کچھ تو بول	فبروری و مارچ	ص۔ ۵۲
	۳۔ شانوں پہ زندگی کے قصیدوں کا بوجھ ہے		
	۴۔ نفرتیں اور رنجشیں، حرص اور ہوس	اکتوبر	ص۔ ۳۲
رفعت صدیقی	پہلے یہ شکایت تھی کہ پتھر نہیں ملتا	ایضاً	ص۔ ۳۹
زبیر شفائی	۱۔ ہر کرن قلم کردے		
	۲۔ چاک سے وقت کی رفتار بڑھا سکتا ہے	اگست	ص۔ ۳۲
	۳۔ یہ کس طلسم تمنا کے بیچ اب کے ہیں۔	ستمبر	ص۔ ۲۶
	۴۔ پتھر اچھالتا ہوں		
	۵۔ نہایت سادگی سے چل رہا ہوں	اکتوبر	ص۔ ۴۴
سحر سعیدی	شاید لگی ہے شاخ پہ تازہ خراش پھر	فروری و مارچ	ص۔ ۵۳
سخاوت شمیم، ڈاکٹر	اس شہر میں تو عام یہ دستور ہوگیا	ستمبر	ص۔ ۲۹
[illegible]ی تسکین	تمہاری یدا جب بے حد ستائے	اکتوبر	ص۔ ۳۹
[illegible] شمیدی	۱۔ جو کرم آپ کے دامن کی ہوا کرتی ہے		
	۲۔ گھر جلتے ہیں، خون بہتا ہے، محشر کا سماں ہے		
	۳۔ دن گزرا اور آئی رات	ستمبر	ص۔ ۲۵
شکیل اعظمی	۱۔ ہوا نہ ختم سروں سے عذاب بارش کا		
	۲۔ چڑھا ہوا ہے جو دریا، اترنے والا ہے	ستمبر	ص۔ ۳۰

اشاریہ

اداریئے

مطالعہ

تبصرے

افضل الدین اقبال	مولانا باقر آگاہ ویلوری ۔ شخصیت اور فن (ڈاکٹر ذاکرہ غوث)		جنوری	ص ۔ ۵۹
بیگ احساس	۱ ۔ نگیٹیو سے پازیٹیو تک (ڈاکٹر عزیز اندوری)	خصوصی اشاعت	مئی و جون	ص ۔ ۱۳۲
	۲ ۔ پہاڑ پر آگ (انیتا دیسائی / م ۔ م راجندر)		ستمبر	ص ۔ ۵۲
	۳ ۔ پروفیسر مسعود حسین خاں کے ادبی خدمات (ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ)		اکتوبر	ص ۔ ۵۰
	۴ ۔ سہ ماہی "توازن" مالیگاؤں (عتیق احمد عتیق)		اکتوبر	ص ۔ ۵۱
راشد آزر	پہچان (عتیق انظر)		جنوری	ص ۔ ۴۰
رشید الحسن ۔ سید ۔ ڈاکٹر (مرحوم)	سیرۃ امیر المومنین حضرتِ عثمان بن عفان مولف: مورخ احمد بن یحیٰی بن جابر البلاذری مترجم: مولوی محمد حبیب اللہ نظرِ ثانی: ڈاکٹر محمد یوسف الدین		اکتوبر	ص ۔ ۴۸
رفعت النساء ۔ ڈاکٹر	۱ ۔ پیش رفت (محبوب راہی)		اگست	ص ۔ ۵۳
	۲ ۔ دائرہ در دائرہ (حیدر نایاب)		اگست	ص ۔ ۵۵
علی ظہیر	۱ ۔ شعر (اکرام نقش)		اگست	ص ۔ ۵۶
	۲ ۔ دھوپ دریا (شکیل اعظمی)		اکتوبر	ص ۔ ۵۲
	۳ ۔ قوس قزح (نظیر علی عدیل)		اکتوبر	ص ۔ ۵۳
	۴ ۔ سفر سانسوں کا (فاروق شکیل)		اکتوبر	ص ۔ ۵۳
	۵ ۔ آپ کے بعد (پروین ضابط بینش)		اکتوبر	ص ۔ ۵۴
غنی تبسم	۱ ۔ موجِ رواں (قمر ساحری)	خصوصی اشاعت	مئی و جون	ص ۔ ۱۳۹
	۲ ۔ نظم سمندر (کالی داس گپتا رضا / عبداللہ گل)	خصوصی اشاعت	ایضاً ایضاً	ص ۔ ۱۴۱
موہن پرشاد	قدیم دکنی سلطنتیں اور سمستان (حصہ اول و دوم) (رمن راج سکسینہ)		ستمبر	ص ۔ ۵۳
وقار خلیل	۱ ۔ ید بیضا (برق موسوی / پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ)		اگست	ص ۔ ۵۳
	۲ ۔ الانوار (محمد انوار اللہ فریس انصاری)		ستمبر	ص ۔ ۵۵
	۳ ۔ حیدرآباد کے ہنسی راجہ (ڈاکٹر بھاسکر راج سکسینہ)		ستمبر	ص ۔ ۵۶
	۴ ۔ بنام علیم صبا نویدی (ڈاکٹر محمد علی اثر)		ستمبر	ص ۔ ۵۶

خبریں

رپورٹ

خطبات و تقاریر

پیغامات

وفیات

بیگ احساس ڈاکٹر	۱۔ اختر الایمان ۲۔ صبا اختر ۳۔ نعیم زبیری			
	۴۔ دلیپ بادل ۵۔ رضا وصفی	دکنی کلچر نمبر	اپریل	ص۔ ۵۲
وقار خلیل	۱۔ سینی پربی ۲۔ بدر الدین طیب جی ۳۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔			
	۴۔ اوپندر ناتھ اشک ۵۔ پروفیسر نعیم احمد		فبروری و مارچ	ص۔ ۴۸
	۶۔ نسیم حجازی ۷۔ نذیر بنارسی ۸۔ نواب میر یسین علی خاں			
	۹۔ احمد جلیس ۱۰۔ اکمل حیدر آبادی ۱۱۔ شاہ نوری			
	۱۲۔ محترمہ زبیدہ یزدانی ۱۳۔ نذیر محمد خاں		جولائی	ص۔ ۵۵
	۱۴۔ ڈاکٹر سید محی الدین ظفر اودگانوی ۱۵۔ لاکٹر پرکاش چندر مونس			
	۱۶۔ محمود سروش ۱۷۔ حنیفہ فضا ۱۸۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی			
	۱۹۔ محترمہ نایاب سلطانہ ۲۰۔ محمد عبدالرحمان حلمی ۲۱۔ امرت رائے			
	۲۲۔ قوی سیف ۲۳۔ دلیپ سنگھ ۲۴۔ شین مظفر پوری			
	۲۵۔ صاحبزادہ میر معین الدین علی خاں مصر ۲۶۔ امیر احمد خسرو		اکتوبر	ص۔ ۵۵
وقار خلیل	۲۷۔ اسماعیل ظریف ۲۸۔ وجاہت سندیلوی ۲۹۔ رام لعل			
	۳۰۔ کالوجی رامیشور راؤ شاد ۳۱۔ خواجہ محمد سرور ۳۲۔ محمد عبدالرشید	زور نمبر	نومبر و دسمبر	ص۔ ۶۳

OOO

ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعرا

[illegible]

"ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعرا" کے عنوان سے اردو شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی ڈائرکٹری کا ایک محدود ایڈیشن اردو اکادمی دہلی نے شائع کیا ہے جو سات سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں ایک ہزار سے زیادہ اہلِ قلم کے کوائف شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ڈائرکٹری کے نئے ایڈیشن پر کام بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ جن مصنفین کے کوائف شامل ہیں اور ان میں کسی ترمیم و اضافے کی ضرورت ہے یا جن کے کوائف اس میں شامل نہیں ہیں، ان سب سے گزارش ہے کہ ذیل کی مدوں کے مطابق اپنے کوائف کی تفصیل یا ضروری ترمیم و اضافہ سکریٹری اردو اکادمی، دہلی کے پتے پر ایک ماہ کے اندر بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک روانہ فرمائیں۔

واضح رہے کہ اپنی کتب کے نام کے ساتھ سنہ اشاعت اور مقام اشاعت ضرور درج فرمائیں ورنہ کتب کا نام شامل نہیں ہو سکے گا۔ کتابوں کے اندراج کی زیادہ سے زیادہ تعداد پندرہ ہے۔ اگر آپ کی کتابیں پندرہ سے زیادہ ہیں تو کل تعداد لکھ کر فقط خاص خاص پندرہ کتابوں کا نام مع سنہ اشاعت و مقام اشاعت تحریر کیجیے۔

نئے مصنفین کے اندراج کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم ایک کتاب کی اشاعت کا ثبوت فراہم کریں۔

۱ شاعر / مصنف / ادیب / صحافی کا نام

۲ والد کا نام

۳ تاریخ اور مقام پیدائش

۴ مستقل پتہ مع ڈاک کوڈ

۵ فون / فیکس نمبر

۶ تعلیم

۷ مشاغل / ملازمت

۸ تصانیف (نام کتب) (صنف / موضوع) (ناشر) (سنہ اشاعت و مقام)

۹ اعزازات / انعامات

۱۰ بیرونی ممالک کا سفر یا کوئی اور قابلِ ذکر بات

ڈاکٹر صادق

سکریٹری اردو اکادمی دہلی گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بہ یادگار سید محی الدین قادری زورؔ

سنِ اجراء : ۱۹۳۸ء

فون : 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

یومِ محمد قلی قطب شاہ تقاریب ۔۔۔ خصوصی اشاعت

جلد : ۵۹ | اپریل ۱۹۹۷ء | شمارہ : ۴

فی پرچہ	:	۱۰ روپے
زرِ سالانہ	:	۱۰۰ روپے
کتب خانوں سے	:	۱۲۵ روپے

مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۷ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر : ادارہ ادبیات اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا ۔

کمپیوٹر کتابت : جے ۔ جے ۔ کمپیوٹرس مہدی پٹنم ۔ حیدر آباد ۔

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے او ۔ ایس ۔ گرافکس نارائن گوڑہ میں طبع کرواکے ادارہ ادبیاتِ اردو سے شائع کیا

اس شمارے میں

○ ○ ○

وقار خلیل

یوم محمد قلی قطب شاہ کا منظر نامہ

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور شہر حیدرآباد کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی ۹۷۳ھ، ۱۰۲۰ھ - ۱۵۶۵ھ) کی یاد میں ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام سہ روزہ تقاریب " یوم محمد قلی قطب شاہ " کا ۳۸ واں سالانہ افتتاحی اجلاس اتوار ۳۰ / مارچ ۱۹۹۷ء کی شام بہ مقام گنبد محمد قلی واقع گولکنڈہ پر منعقد ہوا۔ نواب شاہ عالم خاں صاحب صدر نشین انوار العلوم ایجوکیشن سوسائٹی نے سہ روزہ تقاریب کا افتتاح کیا۔ پروفیسر ٹی ۔ نونیت راؤ سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے اس تقریب کی صدارت کی جب کہ مہمان اعزازی جناب سید حمید بھائی (الفلاح کمپنی) تھے۔

جناب رائے موہن پرشاد کنوینر یوم محمد قلی نے مہمانوں اور شرکاء کا خیر مقدم کیا۔ فائن آرٹس اکیڈیمی کے فن کاروں نے وندے ماترم پیش کیا اور پھر اقبال کی نظم " سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا " ممتاز موسیقارہ گایتری راؤ نے سناکر سینکڑوں باذوق خواتین و حضرات کو مسحور کیا۔

ڈاکٹر زور مرحوم کے صاحب زادے جناب الحاج سید تقی الدین قادری نے مہمانوں کی خدمت میں گلدستے نذر کیے۔ ادارۂ ادبیات اردو کے صدر پروفیسر جعفر نظام صاحب نے خیر مقدمی خطاب کیا اور کہا کہ " ہم آج ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت کی یاد منانے کے لیے جمع ہوئے ہیں جو نہ صرف سلطنت قطب شاہیہ کا ایک نام ور اور بیدار مغز حکم ران تھا بلکہ وہ علم و ادب کا سرپرست، اردو، فارسی اور تلگو زبانوں کا سخن ور، دکنی تہذیب و تمدن کا معمار اور ہندو مسلم اتحاد کا حامی اور اس تاریخی شہر کا بانی بھی تھا۔

پروفیسر جعفر نظام نے کہا کہ " محسن زبان اردو پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم نے ۱۹۵۸ء میں ان تقاریب کا آغاز کیا تھا اور گزشتہ ۳۷ سال سے یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کو " جشن حیدرآباد " (کے طور پر عوامی مقبولیت حاصل ہورہی ہے ۔ " پروفیسر جعفر نظام نے نواب شاہ عالم خاں صاحب اور پروفیسر ٹی نونیت راؤ کی ان تقاریب میں خصوصی شرکت پر اظہار تشکر کرتے ہوئے ان حضرات کی علمی، ادبی اور گراں قدر تعلیمی خدمات کو زبردست خراج تحسین ادا کیا۔ موصوف نے ادارے کے محسنوں اور رفقاء بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور (الحاجہ تہنیت النساء بیگم) اور جناب محبوب حسین جگر جوائینٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست اور ڈاکٹر بی گوپال ریڈی کی وفات پر اظہار الم کرتے ہوئے مرحومین کی ادارے سے دیرینہ رفاقت اور سرپرستی کے جذبات کو خراج عقیدت پیش کیا۔

فائن آرٹس اکیڈیمی کے خوش نوا فن کاروں گایتری راؤ اور خان اطہر نے محمد قلی کی مشہور مناجات " مراشہر لوگاں سے معمور کر " سازوں پر سناکر اس خوش گوار تقریب کو مہکایا ان ہی فن کاروں نے محمد قلی کی شاہ کار غزل " پیا باج پیارا ۔ ۔ ۔ ۔ " بھی سنائی اور داد پائی۔

ادارے کے معتمد عمومی اور دانش ور، نقاد اور سخن ور پروفیسر مغنی تبسم نے یوم محمد قلی تقاریب کے انعقاد پر دانش ورانہ خطاب کیا اور کہا کہ یہ تقاریب ایسے دور اور حالات میں منائی جارہی ہیں جب کہ ہر سمت اور ہر موڑ پر بے یقینی اور شکست و ریخت کا عمل جاری ہے۔ ساری دنیا میں انٹرنٹ اور ٹی وی کلچر کی یلغار ہورہی ہے اور ہر طبقہ اور فرد ہوس زر کا شکار ہوگیا ہے۔ کرپشن کی گرم بازاری اور انسانی خون کی ارزانی کے اس عہد میں قتل و خون، دہشت گردی اور کالے قوانین کے سبب، ادب، تہذیب اور کلچر کی طرف عوام کا رجحان مفقود ہوتا جارہا ہے اور بے حسی عام ہوگئی ہے۔ پروفیسر تبسم نے اس تناظر میں کہا کہ ہم اعلیٰ اقدار کو کھو چکے اور قسطوں میں بھولتے جارہے ہیں محمد

قلی ایسے باکمال سخن ور اور حکم راں اور ایک شہر فرخندہ آثار کے بانی کی روایتوں کی یاد کو تازہ رکھنا ضروری ہے۔ اسی یاد کی روشنی اور حرکت کا نام یوم محمد قلی سالانہ تقاریب ہیں جنھیں ہم رد و قبول کے جذبات سے اونچے ہو کر فکر و احساس کو جھنجھوڑیں اور تاریخ سے سبق حاصل کرتے ہوئے کچھ کر گزریں اور تاریخ کے صفحات میں خود کو زندہ اور روشن رکھیں (پر زور تالیاں)

پروفیسر مغنی تبسم کے اس اہم خطاب کے بعد ممتاز موسیقار رکن الدین اور ریاض احمد نے سراج اورنگ آبادی اور ڈاکٹر زور کی غزلیں سنا کر تقریب کو سحر انگیز جذبات کا اسیر بنایا۔

شریک معتمد ادارہ الحاج سید صفی قادری (فرزند ڈاکٹر زور) نے ادارۂ ادبیات اردو کی سالانہ سرگرمیوں پر محیط رپورٹ سنائی اور ادارے کے شعبہ جات کتب خانہ، امتحانات، مطبوعات، مرکز خطاطی، اردو میوزیم اور ماہنامہ سب رس کے ساتھ ساتھ مختلف ادبی اجلاس، خواتین کی محفلیں، سیمنار کی تفصیلات پر اظہار خیال کیا۔

نواب شاہ عالم خاں صاحب نے افتتاحی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ' ڈاکٹر زور نے یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا اہتمام کرکے، نئی ادب اور کلچر کو نئی زندگی سے آشنا کیا۔ قطب شاہوں نے زبان اور تہذیب کی نشو و نما میں مقامی عناصر کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے قومی وحدت اور ملے جلے کلچر کو پروان چڑھایا اور مقامی زبانوں کی سرپرستی کی۔ حیدرآباد کی قدیم صحت مند اقدار کو زندہ و تابندہ رکھتے ہوئے قومی یگانگت اور یک جہتی کو قائم کیا۔ بانی شہر کی یاد کا اہتمام دراصل وقیع اقدار اور رفیع افکار کی پاس داری ہے۔ نواب شاہ عالم خاں نے کہا کہ محمد قلی اگر چہ کہ ایرانی النسل تھا مگر اس نے تلگو روایات کے مطابق اپنے رہن سہن اور وضع قطع کو تبدیل کرتے ہوئے آندھرائی کلچر کے لیے حیدرآباد میں ایک نئی طرز معاشرت کی بنیاد ڈالی۔ محمد قلی قطب شاہ حیدرآباد کا تعمیر کار ہی نہیں تھا، اس شہر میں اس نے باغات اور خوب صورت محلات کے علاوہ " دار الشفاء " جیسا دواخانہ اور " داد محل " ایسا انصاف گھر قائم کر کے فلاحی ریاست کا نمونہ پیش کیا۔ ادارۂ ادبیات اردو قابل مبارک باد ہے کہ اپنی گراں قدر علمی و ادبی نیز تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ دکنی ادب اور کلچر کی بقا اور ترقی کے لیے سرگرم عمل ہے۔ نواب شاہ عالم خاں کی افتتاحی تقریر کے بعد خان اطہر اور ان کے ہم نواؤں نے مخدوم محی الدین کی مشہور نظم "آج کی رات نہ جا، آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے" سنا کر داد حاصل کی۔

پروفیسر ٹی، نوئیت راؤ سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نے کہا تھا "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" مگر آج یوں محسوس ہوتا ہے کہ سارے جہاں میں ہندستان سب سے اچھا ہے تو ہندستان میں صرف حیدرآباد کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ سب سے اچھا شہر ہے۔ قطب شاہوں نے انسانیت کی بقا اور ترقی کے لیے ملے جلے کلچر کے تناظر میں جو کارنامے انجام دیے ہیں انھیں فروغ دینا آج کے سائنس اور ٹکنالوجی کے زمانے میں ضروری ہی نہیں ناگزیر بھی ہے، پروفیسر راؤ نے پروفیسر مغنی تبسم کے دانش ورانہ خطاب کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ عصر حاضر کی تابندگی اور فعالیت کے لیے قدیم ورثوں کی بازیافت ضرور قرار پاتی ہے۔ یوم محمد قلی تقاریب کا اختتام ظہیر احمد خاں وارثی اور ان کے ہم نواؤں کی قوالی سے ہوا۔ جناب رائے موہن پرشاد کنوینر یوم محمد قلی نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

افتتاحی اجلاس سے قبل ڈیڑھ بجے دوپہر گنبد محمد قلی پر ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کی طرف سے پاٹ لک لنچ ہوا اور پھر ۳ بجے سہ پہر غیر طرحی محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ جناب کبیر احمد اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے مشاعرے کی صدارت کی اور جناب سوز عابدی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ابتدا میں وقار خلیل معتمد نشر و اشاعت نے یوم محمد قلی نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر

زور نے اس پرشکوہ تقریب کا آغاز مذہبی یگانگت اور لسانی اتحاد کے تناظر میں کیا تھا اور آج یہ جذبات ریاست آندھرا پردیش کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ مشاعرے میں داود نصیب، جہاں دار افسر، ڈاکٹر غیاث صدیقی، وقار خلیل، ڈاکٹر صادق نقوی، محمد منظور احمد منظور، خورشید حسین منتظر، اکبر یوسفی، محمود شریف محمود، خلیل صدیقی، ڈاکٹر حسن، حمید آصف، بشیر انور، اعظم شفیقی، ساغر رومانی، خلش جگری، تراب گدوالی، فریدالدین صادق اور ممتاز عابدی نے کلام سنا کر داد پائی۔

۱۱ بجے دن گنبد محمد قلی کے اندرونی حصے میں سیرت الزہرہ کمیٹی کی طرف سے سالانہ مجلس ترحیم ہوئی۔ ادارے کی طرف سے مزار محمد قلی پر چادر گل چڑھائی گئی۔ ڈاکٹر صادق نقوی نے بیان کیا اور آغا عباسی نے نوحہ پڑھا۔

۱۲/ اپریل ۱۹۹۷ء کو ۱۱ بجے دن یوم محمد قلی قطب شاہ سلسلے کا ادبی اجلاس بہ عنوان "قطب شاہی عہد میں دکنی زبان و ادب، ایوان اردو میں منعقد ہوا۔ پروفیسر افضل محمد صاحب وائس چانسلر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد نے افتتاح کیا۔ ابتدا میں پروفیسر جعفر نظام صاحب صدر ادارہ نے معزز مہمانوں اور مقالے پڑھنے والوں کا خیر مقدم کیا۔ پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارۂ ادبیات اردو نے دکنی ادب اور کلچر کے موضوع پر ادبی اجلاس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے معزز مہمانوں پروفیسر افضل محمد صاحب اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب کی ادارے سے دیرینہ رفاقت اور دکنی آرٹ و کلچر سے ان حضرات کے تعلق خاطر کے جذبات کو خراج تحسین ادا کیا۔ پروفیسر جعفر نظام صاحب نے مہمانوں کی خدمت میں گل دستے نذر کیے۔

پروفیسر افضل محمد نے ادارے اور سب رس سے اپنی دیرینہ وابستگی کا تذکرہ کرتے ہوئے بانی ادارہ ڈاکٹر زور اور کنوینر ادبی اجلاس جناب محمد منظور احمد کے فیضان تربیت کو خراج ادا کیا اور کہا کہ ان ہی اساتذہ کی سرپرستی کے باعث ادب اور کلچر سے رشتہ مربوط اور استوار ہے۔ بانی شہر اور دکنی کلچر کے اولین معمار سلطان محمد قلی قطب شاہ ہندستانی زبان و ادب پر بڑا احسان ہے۔ قطب شاہوں کے اس گراں قدر ورثے کی بازیافت میں ڈاکٹر زور کے اس مہتم بالشان ادارے نے اپنی مطبوعات اور رسالہ سب رس کی خصوصی اشاعتوں کے ذریعے اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ پروفیسر افضل محمد صاحب نے امبیڈکر یونیورسٹی کے فاصلاتی طریقۂ تعلیم کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس یونیورسٹی نے اردو زبان میں بھی اپنے پراجکٹس کا آغاز کیا ہے۔ اردو والوں کو اس یونیورسٹی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ جناب افضل محمد نے اس موقع پر سووینیر یوم محمد قلی مرتبہ: وقار خلیل کی رسم اجرا بھی انجام دی۔

ڈاکٹر محمد انورالدین صدر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی، ڈاکٹر نسیم الدین فریس، ڈاکٹر حبیب نثار اور ڈاکٹر فاطمہ پروین نے علی الترتیب "محمد قلی کی مذہبی حسیت، دبستان گولکنڈہ کے شاعر میراں جی خدانما، قطب شاہی مثنویوں میں موسیقی اور ابن نشاطی کی صنعت نگاری پر علمی و تحقیقی مقالے پیش کیے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب نے صدارتی تقریر سے قبل ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات اردو فاضل، اردو عالم اور اردو ماہر منعقدہ اکتوبر ۱۹۹۶ء میں سب سے زیادہ نشانات سے درجہ اول میں کامیاب امیدواروں کو مسعود صدیقی میموریل ٹرسٹ کی جانب سے رقمی انعامات نذر کیے۔ ممتاز شاعر اور استاد حضرت مسعود صدیقی مرحوم کے صاحب زادے جناب شاہد صدیقی (مقیم کنیڈا) نے ان انعامات کا پیش کش کیا تھا۔

اسی اجلاس میں بین کلیاتی تحریری مقابلوں میں اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ و طالبات کو پروفیسر جعفر نظام اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے ہاتھوں انعامات عطا کیے گئے۔ ڈاکٹر محمد انورالدین کنوینر تحریری مقابلے نے اپنی تقریر میں دکنی ادب اور کلچر نیز محمد قلی قطب شاہ کی

شاعری سے طلبہ و طالبات کی دل چسپی کو فال نیک قرار دیا اور ادارے کی طرف سے مقابلوں کے انعقاد پر اظہار تشکر کیا۔

ڈاکٹر گوڑ نے کہا کہ دکنی زبان کا ارتقا بہمنی دور سے ہوا اور پھر عادل شاہوں اور قطب شاہوں نے اسے پروان چڑھایا۔ دکن پر مغلوں کے حملے کے بعد اس زبان کے ارتقا میں زوال سا آنے لگا اور شمالی ہند کی فصیح اردو نے اپنا اثر بڑھایا۔ دکنی زبان پر کھڑی بولی کے ساتھ ساتھ جنوبی ہند کی زبانوں تلگو اور مرہٹی کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر گوڑ نے ادبی اجلاس کے مقالوں کے معیار پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔ جناب محمد منظور احمد نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔ اس اجلاس کی ریڈیو رپورٹ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے ریکارڈ کی اور اسے اپنے نیرنگ پروگرام میں نشر کیا۔

۔۔۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں ۱۳ اپریل کو ساڑھے دس بجے دن "ایوان اردو" میں مقابلہ خوش نویسی کے انعامات پروفیسر جعفر نظام اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے ہاتھوں تقسیم کیے گئے۔ اس تقریب میں جناب سعید بھائی (الفلاح کمپنی) نے بہ حیثیت مہمان اعزازی شرکت کی۔ پروفیسر جعفر نظام نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ خوش نویسی اور خطاطی فنون لطیفہ میں اہمیت رکھتے ہیں، ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام گزشتہ ۲۴ برسوں سے مرکز خطاطی اہم کردار ادا کر رہا ہے اور سینکڑوں طلبا و طالبات اس فن کے حصول کے بعد روزگار سے مربوط ہوئے ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارہ نے کہا کہ ادارے نے ہمیشہ اس فن کی ترقی و ترویج میں اپنا مثبت کردار ادا کیا ہے۔ خطاطی کے ایسے مقابلے مستقبل قریب میں ابھی خصوصاً غالب صدی تقاریب کے موقع پر وسیع بنیادوں پر منعقد کیے جائیں گے تاکہ اساتذہ خوش نویسی اور نو مشق طلبہ و طالبات کمال فن کا بہتر مظاہرہ کر سکیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر کونسل برائے فروغ زبان اردو حکومت ہند و رفیق ادارہ نے بھی خطاب کیا اور ادارے کے مرکز خطاطی کی دیرینہ کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کتابت اور خوش نویسی کو نہ صرف اردو بلکہ دیوناگری، فارسی اور رومن رسم خط میں بھی فروغ دیا جانا چاہیے۔ اردو فارسی میں مروجہ آرائشی، طغروی اور جدید طرز خوش نویسی کی تدریس و تحصیل کی افادیت پر ابھی نصیر الدین حذری نظامی کی کتاب "تذکرۂ خوش نویسان حیدرآباد" کی رسم اجرا پروفیسر جعفر نظام صاحب کے ہاتھوں انجام پائی۔ مہمان اعزازی جناب سعید بھائی الفلاح نے فن خوش نویسی کی افادیت پر مخاطب کیا اور مرکز خوش نویسی ادارہ کی نمائش کو اردو زبان کے لیے فال نیک قرار دیا اور اپنی طرف سے اس فن کی ترقی میں معاونت کا پیش کش کیا۔

حیدرآباد کے مشہور خطاط سلام خوش نویس، ضمیر نظامی، محمد غالب اور نعیم صابری صاحبان کو ان کے فن کے اعتراف میں چار مینار ماڈل مومنٹو، اسناد توصیف اور مسرز بلال پن اسٹور کی طرف سے جدید طرز کی کتابت کی پتیاں (پن) اور قلم نذر کیے گئے۔

مرکز خطاطی کے طلبہ اور دیگر جواں عمر خوش نویس اصحاب و طالبات کو ان کے پیش کردہ نمونوں نقش بندی میں ۲۸ انعامات دیے گئے۔ مرکز خطاطی ادارہ کے طالب علم سردار علی کو بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور مرحوم کی طرف سے خصوصی رقمی ایوارڈ بھی دیا گیا۔ جناب رضی الدین اقبال۔

۔۔۔ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں ۱۳/اپریل کو ساڑھے گیارہ بجے "ایوان اردو" میں تلگو اجلاس منعقد ہوا۔ پروفیسر ین کرشنا کماری وائس چانسلر تلگو یونیورسٹی آندھرا پردیش نے افتتاح کیا اور پی جی کالج سکندرآباد کے پروفیسر ین گوپی نے صدارت کی۔ پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

ابتداء صدر ادارہ پروفیسر جعفر نظام صاحب نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں "قطب شاہی عہد

میں تلگو ادب" کے موضوع پر منعقدہ اس اجلاس کی افادیت اور مقصدیت پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر ایس، وی ستیانارائینا نے اپنے مقالے میں قطب شاہوں کی لسانی پالیسی اور تلگو، اردو زبانوں کی ترقی میں ان کے کردار کو خراج ادا کیا اور کہا کہ اس زمانے میں تلگو شعر و ادب ارتقائی منزلوں سے نہ صرف آشنا ہوا بلکہ ہم عصر زبانوں کے دوش بہ دوش ترقی کرتا رہا۔ آصف جاہوں کے زمانے میں تلگو شعر و ادب کا ارتقا کسی قدر جمود کا شکار ہو گیا۔ قطب شاہی حکم رانوں نے کسی لسانی یا مذہبی تعصب سے بلند ہو کر ادب، آرٹ اور کلچر کی خدمت کی۔

نام ور دانشور اور نقاد ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بھی اس اجلاس کو مخاطب کیا اور تلگو، اردو کے مشترکہ لسانی رشتوں کے تناظر میں دکنی شاعری کے روپ، رنگ اور ہندستانی عناصر کی مہک اور لطافت پر روشنی ڈالی۔

پروفیسر این گوپی نے خصوصی طور پر ابراہیم قلی قطب شاہ کے عہد میں تلگو اور دکنی ادب کی ترقی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تلگو کے شعرا گنگادھر، رام داس، کنداکوری رودرا کی شعری تخلیقات میں جگہ جگہ ابراہیم قلی کی مدح سرائی ملتی ہے۔

پروفیسر کرشنا کماری نے صدارتی تقریر میں ادارۂ ادبیاتِ اردو اور اس کے بانی ڈاکٹر زور کی خدمات کو زبردست خراج ادا کرتے ہوئے یوم محمد قلی کے موقع پر تلگو اجلاس کے خصوصی انعقاد پر کارکنانِ ادارہ کو مبارک باد پیش کی۔ قطب شاہوں کا دور لسانی ہم آہنگی اور بھائی چارگی کا نگار خانہ رہا ہے۔ آج کے آندھرا کلچر میں قطب شاہوں کی رواداری کے نقش روشن نظر آتے ہیں۔ تلگو، اردو کی ایسی ہی ملی جلی محفلوں کے ذریعے ہم نئی نسلوں کو عہدِ گزشتہ کے کارناموں سے واقف کرواسکتے ہیں، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کے شکریے پر یہ اجلاس برخواست ہوا۔

۱۳/ اپریل کی خوش گوار شام ۷ بجے "ایوانِ اردو" میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ جناب سید ولی قادری سابق شیخ الجامعہ جامعہ (ب) نظامیہ نے شمع روشن کر کے اس مشاعرے کا افتتاح کیا۔ جناب شفیق الزماں (آئی، اے ایس) سکریٹری مائینار یٹیز ویلفیر سوسائٹی آندھرا پردیش نے صدارت کی اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے نظامت کے فرائض انجام دیے، اس مشاعرے میں حضرت سعید شہیدی، پروفیسر مغنی تبسم، ولی قادری، علی ظہیر، وقار خلیل، سلیمان اطہر جاوید، علی الدین نوید، رؤف خیر، صادق نقوی، جهاندار افسر، رحمت یوسف زئی، محسن جلگانوی، حنا شہیدی، بانو طاہرہ سعید، محمد منظور احمد منظور، ذکی بلگرامی، ستار صدیقی، باقر محسن، مظہر مہدی، خورشید حسین مضطر، ذکی شاداب، بے حس الہ آبادی، تاج مضطر (ورنگل) اور یوسف الدین یوسف نے کلام سنایا۔

○ ○ ○

شاعری سے طلبہ و طالبات کی دل چسپی کو فال نیک قرار دیا اور ادارے کی طرف سے مقابلوں کے انعقاد پر اظہار تشکر کیا۔

ڈاکٹر گوڑ نے کہا کہ دکنی زبان کا ارتقا بہمنی دور سے ہوا اور پھر عادل شاہوں اور قطب شاہوں نے اسے پروان چڑھایا۔ دکن پر
مغلوں کے حملے کے بعد اس زبان کے ارتقا میں زوال سا آنے لگا اور شمالی ہند کی فصیح اردو نے اپنا اثر بڑھایا۔ دکنی زبان پر کھڑی بولی کے ساتھ
ساتھ جنوبی ہند کی زبانوں تلگو اور مرہٹی کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر گوڑ نے ادبی اجلاس کے مقالوں کے معیار پر اطمینان کا اظہار کرتے
ہوئے ادارۂ ادبیات اردو کی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔ جناب محمد منظور احمد نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔ اس اجلاس کی ریڈیو
رپورٹ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے ریکارڈ کی اور اسے اپنے نیرنگ پروگرام میں نشر کیا۔

،،،،، یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں ۱۳ ۔ اپریل کو ساڑھے دس بجے دن "ایوان اردو" میں مقابلہ خوش نویسی کے انعامات پروفیسر
جعفر نظام اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے ہاتھوں تقسیم کیے گئے۔ اس تقریب میں جناب سعید بھائی (الفلاح کمپنی) نے بہ حیثیت مہمان اعزازی
شرکت کی۔ پروفیسر جعفر نظام نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ خوش نویسی اور خطاطی فنون لطیفہ میں اہمیت رکھتے ہیں، ادارۂ ادبیات
اردو کے زیر اہتمام گزشتہ ۲۴ برسوں سے مرکز خطاطی اہم کردار ادا کر رہا ہے اور سینکڑوں طلبا و طالبات اس فن کے حصول کے بعد روزی
روزگار سے مربوط ہوئے ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارہ نے کہا کہ ادارے نے ہمیشہ اس فن کی ترقی و ترویج میں اپنا مثبت کردار ادا
کیا ہے۔ خطاطی کے ایسے مقابلے مستقبل قریب میں ابھی خصوصاً غالب صدی تقاریب کے موقع پر وسیع بنیادوں پر منعقد کیے جائیں گے تاکہ
اساتذہ خوش نویسی اور نو مشق طلبہ و طالبات کمال فن کا بہتر مظاہرہ کر سکیں۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر کونسل برائے فروغ زبان اردو حکومت ہند و رفیق ادارہ نے بھی خطاب کیا اور ادارے کے مرکز
خطاطی کی دیرینہ کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کتابت اور خوش نویسی کو نہ صرف اردو بلکہ دیوناگری، فارسی اور رومن
رسم خط میں بھی فروغ دیا جانا چاہیے۔ اردو فارسی میں مروجہ آرائشی، طغروی اور جدید طرز خوش نویسی کی تدریس و تحصیل کی افادیت پر ابھی
ضمیر الدین حذری نظامی کی کتاب "تذکرۂ خوش نویسان حیدرآباد" کی رسم اجرا پروفیسر جعفر نظام صاحب کے ہاتھوں انجام پائی۔ مہمان اعزازی
جناب سعید بھائی الفلاح نے فن خوش نویسی کی افادیت پر مخاطب کیا اور مرکز خوش نویسی ادارہ کی نمائش کو اردو زبان کے لیے فال نیک قرار
دیا اور اپنی طرف سے اس فن کی ترقی میں معاونت کا پیش کش کیا۔

حیدرآباد کے مشہور خطاط سلام خوش نویس، ضمیر نظامی، محمد غالب اور نعیم صابری صاحبان کو ان کے فن کے اعتراف میں چارمینار
ماڈل مومنٹو، اسناد توصیف اور مسرز ہلال پن اسٹور کی طرف سے جدید طرز کی کتابت کی پتیاں (پن) اور قلم نذر کیے گئے۔

مرکز خطاطی کے طلبہ اور دیگر جواں عمر خوش نویس اصحاب و طالبات کو ان کے پیش کردہ نمونوں نقش بندی میں ۲۸ انعامات دیے
گئے۔ مرکز خطاطی ادارہ کے طالب علم سردار علی کو بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور مرحوم کی طرف سے خصوصی رقمی ایوارڈ بھی دیا گیا۔ جناب رضی الدین
اقبال۔

،،،، یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں ۱۳ ؍ اپریل کو ساڑھے گیارہ بجے "ایوان اردو" میں تلگو اجلاس منعقد ہوا۔ پروفیسر ین
کرشنا کماری وائس چانسلر تلگو یونیورسٹی آندھرا پردیش نے افتتاح کیا اور پی جی کالج سکندرآباد کے پروفیسر ین گوپی نے صدارت کی۔ پروفیسر
مرزا اکبر علی بیگ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

ابتداء صدر ادارہ پروفیسر جعفر نظام صاحب نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں "قطب شاہی عہد

میں تلگو ادب" کے موضوع پر منعقدہ اس اجلاس کی افادیت اور مقصدیت پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر لیس، وی ستیانارائینا نے اپنے مقالے میں قطب شاہوں کی لسانی پالیسی اور تلگو، اردو زبانوں کی ترقی میں ان کے کردار کو خراج ادا کیا اور کہا کہ اس زمانے میں تلگو شعر و ادب ارتقائی منزلوں سے نہ صرف آشنا ہوا بلکہ ہم عصر زبانوں کے دوش بہ دوش ترقی کرتا رہا۔ آصف جاہوں کے زمانے میں تلگو شعر و ادب کا ارتقا کسی قدر جمود کا شکار ہو گیا۔ قطب شاہی حکمرانوں نے کسی لسانی یا مذہبی تعصب سے بلند ہو کر ادب، آرٹ اور کلچر کی خدمت کی۔

نام ور دانشور اور نقاد ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے بھی اس اجلاس کو مخاطب کیا اور تلگو، اردو کے مشترکہ لسانی رشتوں کے تناظر میں دکنی شاعری کے روپ، رنگ اور ہندستانی عناصر کی مہک اور لطافت پر روشنی ڈالی۔

پروفیسر ین گوپی نے خصوصی طور پر ابراہیم قلی قطب شاہ کے عہد میں تلگو اور دکنی ادب کی ترقی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تلگو کے شعرا گنگادھر، رام داس، کنداکوری رودرا کی شعری تخلیقات میں جگہ جگہ ابراہیم قلی کی مدح سرائی ملتی ہے۔

پروفیسر کرشنا کماری نے صدارتی تقریر میں ادارۂ ادبیات اردو اور اس کے بانی ڈاکٹر زور کی خدمات کو زبردست خراج ادا کرتے ہوئے یوم محمد قلی کے موقع پر تلگو اجلاس کے خصوصی انعقاد پر کارکنان ادارہ کو مبارک باد پیش کی۔ قطب شاہوں کا دور لسانی ہم آہنگی اور بھائی چارگی کا نگار خانہ رہا ہے۔ آج کے آندھرا کلچر میں قطب شاہوں کی رواداری کے نقش روشن نظر آتے ہیں۔ تلگو، اردو کی ایسی ہی ملی جلی محفلوں کے ذریعے ہم نئی نسلوں کو عہد گزشتہ کے کارناموں سے واقف کرواسکتے ہیں، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کے شکریے پر یہ اجلاس برخواست ہوا۔

(ل) ۱۴/ اپریل کی خوش گوار شام ۷ بجے "ایوان اردو" میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ جناب سید ولی قادری سابق شیخ الجامعہ جامعہ نظامیہ نے شمع روشن کرکے اس مشاعرے کا افتتاح کیا۔ جناب شفیق الزماں (آئی ، اے ایس) سکریٹری مائینارٹیز ویلفیر سوسائٹی اندھرا پردیش نے صدارت کی اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے نظامت کے فرائض انجام دیے، اس مشاعرے میں حضرت سعید شہیدی ، پروفیسر مغنی تبسم ، ولی قادری ، علی ظہیر ، وقار خلیل ، سلیمان اطہر جاوید ، علی الدین نوید ، رؤف خیر ، صادق نقوی ، جہاندار افسر ، رحمت یوسف زئی ، محسن جلگانوی ، حنا شہیدی ، بانو طاہرہ سعید ، محمد منظور احمد منظور ، ذکی بلگرامی ، ستار صدیقی ، باقر محسن ، مظہر مہدی ، خورشید حسین مضطر ، ذکی شاداب ، بے حس الہ آبادی ، تاج مضطر (ورنگل) اور یوسف الدین یوسف نے کلام سنایا۔

O O O

پروفیسر جعفر نظام
(صدر ادارۂ ادبیات اردو)

خطبۂ استقبالیہ

جناب نواب شاہ عالم خاں صاحب ، پروفیسر ﷲ ۔ نونیت راؤ صاحب ، جناب سعید بھائی صاحب ، محترم رفقائے ادارہ اور خواتین و حضرات!

ہم آج ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت کی یاد منانے کے لیے جمع ہوئے ہیں جو نہ صرف سلطنتِ قطب شاہیہ کا ایک ناموز اور بیدار مغز حکم ران تھا بلکہ علم و ادب کا سرپرست، اردو، فارسی اور تلگو زبان کا شاعر، دکنی تہذیب و تمدن کا معمار، ہندو مسلم اتحاد کا حامی اور اس تاریخی شہر حیدرآباد کا بانی تھا۔

آپ حضرات بہ خوبی واقف ہیں کہ محسنِ زبانِ اردو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم نے ۱۹۵۸ء میں یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا آغاز کیا تھا۔ یہ تقاریب قومی جشن کی صورت میں منائی جارہی ہیں۔ ۳۸ ویں یوم محمد قلی قطب شاہ کے اس افتتاحی اجلاس کا افتتاح نواب شاہ عالم خاں صاحب انجام دیں گے۔ نواب صاحب کی ہر دل عزیز شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے ان کی شخصیت میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک انسان دوست محسن میں ہوتی ہیں۔ نواب صاحب حیدرآبادی تہذیب اور روایات کے علم بردار اور سیکولر مزاج کی روشن مثال ہیں۔ آپ کا تعلق حیدرآباد کے جاگیردار گھرانے سے ہے۔ ۱۹۴۴ء میں آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے گرائیجویشن کیا اور ۱۹۴۹ء سے حیدرآباد دکن سگریٹ فیکٹری کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ نواب شاہ عالم خاں صاحب گذشتہ ربع صدی سے انوار العلوم ایجوکیشنل سوسائٹی کے صدر نشین ہیں۔ پانچ سال تک آپ عثمانیہ یونیورسٹی بورڈ آف مینیجمنٹ کے معزز رکن رہے اور آندھرا پردیش ریاستی اقلیتی فینانس کارپوریشن کے صدر نشین بھی رہے۔ ہم خوش ہیں کہ نواب صاحب آج ۳۸ ویں یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا افتتاح فرما رہے ہیں۔

اس تقریب کے صدر پروفیسر ﷲ ۔ نونیت راؤ، جامعہ عثمانیہ کے قابلِ فخر سپوت ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر چھ سال تک فائز رہے۔ پروفیسر راؤ حیدرآبادی گنگا جمنی تہذیب کے دل دادہ شخصیت ہیں۔ میں آپ کا تہہ دل سے آج یہاں تشریف آوری پر خیر مقدم کرتا ہوں۔

حیدرآباد کے ایک فلاحی ادارے الفلاح کمپنی کے مینیجنگ پارٹنر جناب سید سعید بھائی جو ہمارے مہمانِ اعزازی ہیں، گزشتہ چند برسوں سے حیدرآباد کی علمی و ادبی سرگرمیوں کے روحِ رواں کہلائے جانے لگے ہیں۔ میں ادارے کی طرف سے سعید بھائی کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

محترم خواتین و حضرات! یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر ان مرحوم اصحاب کی یاد کو بھی خراجِ عقیدت ادا کرنا میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں جو ادارے سے وابستہ رہے۔ بانیِ ادارہ ڈاکٹر زور کی بیگم صاحبہ حضرت تہنیت النساء بیگم کی وفات سے ادارے کو عظیم صدمہ ہوا۔ تہنیت صاحبہ ناموَر نعت گو شاعرہ اور ادارے کی سرپرست تھیں، ادارے کی ترقی کے باب میں وہ ہمارے لیے چشم نگراں کی مصداق تھیں۔ خدا مغفرت فرمائے۔ ڈاکٹر ہجواڑہ گوپال ریڈی صاحب سابق وزیر اور گورنر یوپی کی وفات بھی ادارے اور حیدرآباد کے ملے جلے کلچر کے لیے سانحہ

۔ڈاکٹر ریڈی یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے آغاز سے ادارے کے ساتھ رہے۔ بھگوان ان کی آتما کو شانتی دے۔

حضرت محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست کی وفات حسرت آیات بھی ادارے کے لیے المناک سانحہ ہے۔ جگر مرحوم ادارے کے رفیق تھے اور ادارے کی ہمہ جہتی ترقی میں ان کے مشورے ہمارے لیے مشعل راہ کے مانند تھے۔ خدا وند کریم ان کی مغفرت فرمائے۔

محترم خواتین و حضرات! میں زیادہ وقت نہ لیتے ہوئے آپ سب کا ان تقاریب میں شرکت کے لیے شکر گزار ہوں۔ یقین ہے ادارۂ ادبیات اردو کی علمی، ادبی، ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کے فروغ میں آپ سب کا اسی طرح فراخ دلانہ اشتراک و تعاون ہمیں ملتا رہے گا۔

شکریہ

○ ○ ○

نواب شاہ عالم خاں صاحب

خطبۂ افتتاحیہ

(اڑتیسویں یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقعہ پر پڑھا گیا)

جناب صدر، پروفیسر نونیت راؤ صاحب، پروفیسر جعفر نظام صاحب صدر ادارۂ ادبیاتِ اردو، پروفیسر مغنی تبسم صاحب، جناب سید صفی الدین قادری صاحب، جناب رائے موہن پرشاد صاحب، خواتین و حضرات!

یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے اس اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے مجھے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔ اڑتیس برس پہلے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے ان تقاریب کا آغاز کیا تھا۔ اس کا مقصد دکن کی قدیم تہذیبی روایات کو زندہ رکھنا اور انھیں فروغ دینا تھا۔ ان تہذیبی روایات میں اولیت قومی یکجہتی اور بھائی چارگی کو حاصل ہے۔ قطب شاہی سلاطین نے زبان، رنگ، نسل اور مذہب کے تفرقوں کو مٹا کر ایک قومی وحدت تشکیل دی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ نے ایرانی لباس ترک کر کے مقامی لباس زیب تن کیا۔ اس کے دور میں مسلمانوں کی عیدوں، تقاریب اور رسومات کے ساتھ ہندوؤں کے تیوہاروں کو سرکاری طور پر منانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ آدابِ معاشرت اور رسم و رواج میں نفاست اور شائستگی پیدا ہو چلی تھی۔ قطب شاہی سلاطین نے مقامی زبانوں کی سرپرستی کی اور فارسی کی جگہ دکنی کو رواج دیا۔ ایسے زمانے میں جب کہ شمالی ہندستان میں اردو بول چال کی سطح سے آگے نہیں بڑھی تھی، دکن میں ترقی کر کے علمی اور ادبی زبان بن گئی۔ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ قطب شاہی عہد میں اس زبان میں نہ صرف اعلیٰ پائے کی مثنویاں لکھی گئیں بلکہ دیگر تمام اصنافِ سخن میں شاعری کی گئی، نثر میں داستانیں لکھی گئیں، تصوف اور دیگر موضوعات پر رسالے تحریر کیے گئے۔ قطب شاہوں نے شعر و ادب کے ساتھ ساتھ دیگر فنونِ لطیفہ کو بھی ترقی دی۔ فنِ تعمیر اور فنِ مصوری میں ترکی، ایرانی اور ہندی عناصر کی آمیزش سے نئے اسالیب اختراع کیے۔

قطب شاہی دور کی تہذیبی روایات کو بعد کے حکم رانوں نے آگے بڑھایا اور یہ روایات ہمارے کلچر کی شناخت بن گئیں۔ ان کا تحفظ کرنا اور انھیں پروان چڑھانا ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر یہ روایات باقی نہ رہیں تو ہم اپنی شناخت کھو دیں گے۔

میں کارکنانِ ادارۂ ادبیاتِ اردو کو مبارک باد دیتا ہوں کہ وہ دکنی زبان و ادب اور دکنی کلچر کی بقا اور فروغ کے کام میں مسلسل سرگرمِ عمل ہیں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ گزشتہ چند برسوں سے ہمارے معاشرے میں بڑی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ تبدیلی اگر ارتقائی سمت میں ہو تو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے لیکن جس قسم کی تبدیلیاں ہمارے معاشرے میں رونما ہو رہی ہیں ان میں سے بیشتر ہم کو تنزل اور انحطاط کی طرف لے جا رہی ہیں۔

عزیز سامعین! آپ سے میری دردمندانہ درخواست ہے کہ جو قوتیں ہماری تہذیب کو مٹانے کے درپے ہیں ان سے چوکنا رہیں۔ آنے والی نسلوں کو ان کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے جو بھی تدابیر ہو سکتی ہیں اختیار کریں تاکہ ہمارے کلچر کو نیا مصافا خون ملتا رہے۔ اس گزارش کے ساتھ میں اڑتیسویں یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا افتتاح کرتا ہوں۔

شکریہ

مغنی تبسم

تقریر

یوم محمد قلی قطب شاہ کی معنویت

عالی جناب نواب شاہ عالم خاں صاحب، پروفیسر نونیت راؤ صاحب، پروفیسر جعفر نظام صاحب، جناب سعید بھائی صاحب، جناب سید صفی الدین قادری صاحب، رائے موہن پرشاد صاحب، معزز سامعین، خواتین و حضرات!

یوم محمد قلی قطب شاہ کی یہ تقاریب ہم ایک ایسے دور میں منارہے ہیں جسے عالم گیر بے یقینی کا دور کہا جاسکتا ہے۔ ایک طرف سائنس ور ٹکنالوجی کی بے مہار ترقی ہورہی ہے جس کی کوئی سمت متعین نہیں ہے۔ ساری دنیا میں انٹرنیٹ اور ٹی۔ وی کلچر کی یلغار ہورہی ہے۔ مادیت (کنزیومرازم) نے ہر طبقے کو ہوس زر کا شکار بنادیا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشی لوٹ کھسوٹ استحصال اور کرپشن کی گرم بازاری ہے۔ نسانی خون آج سے پہلے کسی دور میں اتنا ارزاں نہیں ہوا تھا۔ بڑے پیمانے پر نسل کشی، قتل و غارت گری اور دہشت گردی زندگی کے معمولات میں شامل ہوچکے ہیں جس کی وجہ سے بے حسی اس قدر عام ہوگئی ہے کہ بڑے سے بڑا حادثہ یا سانحہ بھی ہوجائے تو کسی کے دل پر وئی اثر نہیں ہوتا۔

دنیا کے زیادہ تر حکم ران استحصالی طبقے کے معاشی مفادات کے نگہبان بنے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال میں صرف ماضی کے اوراق لٹنے ہی پر اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ وہ کونسی اعلیٰ اقدار تھیں جنھیں ہم کھوچکے ہیں اور کھوتے جارہے ہیں۔

تاریخ ایسی کئی شخصیتوں کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جو ان اعلیٰ اقدار کی علامت بن چکی ہیں۔ انھیں میں سے ایک شخصیت محمد قلی طب شاہ کی بھی تھی۔ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کو محض ایک رسم کے طور پر منانے سے کچھ حاصل نہیں ہے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آج کے دور سے اس کی کیا مناسبت ہے۔ اس کی معنویت کیا ہے۔ یہ تقاریب ہمارے فکر و احساس کو جھنجھوڑتی ہیں تو ان کے انعقاد کا جواز پیدا تا ہے۔ تاریخ کے پہیے کو الٹا نہیں گھمایا جاسکتا لیکن تاریخ سے سبق حاصل کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ زندگی کی تیز رفتار تبدیلیوں کا ساتھ دینا اگزیر ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے شعوری کے ساتھ خود کو اس دھارے میں بہادیں۔ ہم کو چاہیے کہ رد و قبول کے مرحلوں سے زرکر ان تبدیلیوں کو ایک مثبت سمت دینے کی کوشش کریں۔ یہ ہماری اجتماعی ذمہ داری بھی ہے اور انفرادی بھی۔ اس ذمہ داری کا حساس دلانا ان تقاریب کے انعقاد کا ایک اہم مقصد ہے جو پہلے بھی ہمارے پیش نظر تھا اور آئندہ بھی رہے گا۔

شکریہ

○ ○ ○

سید صفی الدین قادری
(شریک معتمد ادارۂ ادبیات اردو)

رپورٹ

جناب نواب شاہ عالم خاں صاحب، پروفیسر نونیت راؤ صاحب اور جناب سعید بھائی صاحب، محترم پروفیسر جعفر نظام صاحب خواتین و حضرات!

آج سے تقریباً ۶۶ سال قبل ۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیات اردو کو اس کے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اس مقصود کے تحت قا گیا تھا کہ حیدرآباد اور جنوبی ہند میں اردو کا ذوق عام کیا جائے اور اس خطہ ملک کے موجودہ اور گزشتہ شاعر اور ادیب اردو دنیا میں اس طر روشناس ہوں کہ ان کا جائز حق ان کو مل سکے اور ساتھ ہی یہاں کے نوجوانوں میں خود اعتمادی اور شگفتگی پیدا کی جائے جس کے بغیر شعر و اد کی ترقی اور خوش گوار ارتقا کسی بھی ملک میں ممکن نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس مقصد میں ادارے کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ملک ا بیرون ملک کا شاید ہی کوئی قابل ذکر ادیب و شاعر ہوگا جس کے رشحات قلم ادارے کی طرف سے کتابی شکل میں یا اس کے ماہ نامہ "سب رس" میں شائع نہ ہوئے ہوں اور اس کا کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی طرح ادارے سے تعلق نہ رہا ہو۔

ادارے کا کام یوں تو دس شعبوں میں منقسم ہے اور ان میں سے ہر شعبہ بجائے خود ایک ادارے کا کام انجام دیتا رہا ہے لیکن ان چند شعبوں نے غیر معمولی ترقی کی ہے جن میں ایک مخطوطات اور مطبوعات کا کتب خانہ ہے جن میں ۳۵ ہزار مطبوعہ اور ۵ ہزار کے قریب نوادر شامل ہیں۔ ان کے چھ ضخیم توضیحی فہرستیں شائع ہو چکی ہیں۔ فہرست مطبوعات کی تین جلدیں بھی شائع ہو چکی ہیں اور تمام اردو دنیا سے مستفید ہو رہی ہے۔

چناں چہ برصغیر کے اہل قلم، اہل علم ارباب تحقیق ان سے استفادے کے لیے آتے یا مراسلت کرتے رہتے ہیں۔ ادارے کا ایک شعبہ تاریخ و آثار و ثقافت کے لیے وقف ہے۔ اس شعبے کا کام بھی رفتہ رفتہ اتنا ترقی کر گیا کہ ایوان اردو کا ایک بڑا حصہ اس کے لیے مختص کرنا پڑا۔ دکنی کے خطاطوں، فن کاروں اور نقاشوں کے اہم اور عمدہ نمونے اس میں محفوظ ہیں۔ آج ادارہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے کہ ا سرزمین کے علم و فضل آرٹ اور قلم کاروں کا جو ذخیرہ اس میں موجود ہے شاید ہی کسی اور جگہ یک جا مل سکے۔

ادارۂ ادبیات اردو کا ایک اہم شعبہ اردو امتحانات اور تعلیم بالغان کا ہے جو اردو زبان و ادب کی حفاظت بقا اور ترقی کے لیے ۶۰ سے سرگرم عمل ہے۔

ادارے کے بڑھتے ہوئے کاموں اور روز افزوں ذخیرہ کتب و نوادر نے شروع ہی سے محسوس کرا دیا تھا کہ اس کے لیے اس کی ا عمارت تعمیر ہونی چاہیے چناں چہ اس کے لیے ڈاکٹر زور اور ان کے رفقا نے ۱۹۴۴ء میں ۲۵ ہزار روپے جمع کر لیے تھے یہ رقم محاسب سرکار میں محفوظ تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد کی تاریخ نے پلٹا کھایا اور یہ جمع کردہ رقم بہ حق حکومت ہند ضبط ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تو وقت کے صدر ادارہ نواب لیاقت جنگ مرحوم نے بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور تہنیت النسا بیگم صاحبہ مرحومہ سے اس پیرائے میں زمین کے عطیے

واست کی ۔ بیگم ڈاکٹر زور (جن کا حال ہی میں انتقال ہوا) نے اپنی ملک میں سے ایک قطعہ اراضی ادارے کے نام رجسٹری کرادی اور
ن اردو کی عظیم الشان عمارت اسی زمین پر کھڑی ہے ۔

ادارے کا ایک ماہ نامہ "سب رس" ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے ۔ جس کا شمار برصغیر کے چند اہم ادبی رسالوں میں
ہے ۔ آج بھی پروفیسر مغنی تبسم صاحب کی غیر معمولی کد و کاوش سے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اہل علم و دانش کے ہاتھوں تک پہنچ رہا

ادارۂ ادبیات اردو کے تحت ایک خوش نویسی کا مرکز بھی کام کر رہا ہے جس میں طلبا اور طالبات خوش نویسی سیکھ رہے ہیں اور جسے
بیورو حکومت ہند کی امداد حاصل ہے ۔

حضرات یہ معلوم کر کے خوش ہوں گے کہ ادارۂ ادبیات اردو ہر سال یوم محمد قلی صرف نمود و نمائش یا ذوق نمائش یا شوق ہنگامہ کے تحت
مناتا آیا ہے ۔ اس کی یہ سالانہ تقریب کئی ٹھوس اور دیرپا کاموں اور علمی و ادبی یادگاروں کا نقطہ آغاز بنتی ہے ۔ اس سال ادارے کی
میوں میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے ۔

حکومت ہند نے اس سال میوزیم کے لیے دو لاکھ روپے کی گرانٹ منظور کی ہے ۔

ڈائرکٹر آف آکائیوز حکومت ہند نے تذکرۂ مخطوطات جلد اول کے مرتبہ ایڈیشن کے لیے گراں قدر گرانٹ منظور کی تھی ۔ ڈاکٹر محمد
علی اثر نے پروفیسر مغنی تبسم کی نگرانی میں تذکرۂ مخطوطات کی نظر ثانی کا کام مکمل کر لیا ہے ۔ اب یہ کتاب طباعت کے مراحل میں
ہے ۔

اس سال غالب کے پیدائش کی دو سو سالہ تقاریب منائی جارہی ہیں ۔ اس موقع پر ادارہ روسی مصنف ڈاکٹر پری گارینا کی تصنیف
"مرزا غالب" کا ترجمہ شائع کر رہا ہے ۔ جناب اسامہ فاروقی صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے جو بالاقساط ماہ نامہ سب رس میں
شائع ہوتا رہا ۔ یہ کتاب جلد شائع ہو جائے گی اور انشاء اللہ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے ادبی اجلاس ۱۳/ اپریل [illegible] کو اس کی
رسم اجرا عمل میں آئے گی ۔

کونسل فار پروموشن آف اردو لینگویج حکومت ہند نے ادارے کی ہمہ جہتی سرگرمیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سال [illegible] تالیس ہزار
روپے کی گرانٹ منظور کی ہے ۔

سال رواں میں ادارے کی جانب سے سینتیسویں یوم محمد قلی قطب شاہ اور یوم زور کے موقع پر سیمینار منعقد کیے گئے ۔ پروفیسر جگن
ناتھ آزاد ، جناب علی سردار جعفری اور جناب شمس الرحمن فاروقی نے توسیعی لکچر دیے ۔ اس سال ہندستان کے مختلف شہروں اور
بیرونی ممالک سے کئی ادیب ، شاعروں اور ریسرچ اسکالروں نے ادارے کا معائنہ کیا اور ادارے کے کتب خانے سے استفادہ فرمایا
جن میں چند قابل ذکر نام یہ ہیں: جناب وارث علوی (احمد آباد) ، جناب بلراج کومل (دہلی) ، ڈاکٹر خورشید احمد (علی گڑھ یونیورسٹی)
پروفیسر ابوالکلام قاسمی (علی گڑھ یونیورسٹی) ، جناب یوسف ناظم (بمبئی) ، جناب فاروق نازکی (کشمیر) ، حضرت دیوان صولت حسین
(اجمیر شریف) ، [illegible] ، محترمہ نور جہاں
ثروت [illegible] ن) ، محکمی اور
[illegible]

جناب محمد شاہد صدیقی (کناڈا) اور ان کے علاوہ بہار اور کرناٹک کے مختلف کالجوں کے اساتذہ شامل ہیں۔

ادارے کا شعبہ، خواتین بھی فعال رہا۔ اس کے ماہانہ اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ شعبہ، خواتین میں ڈاکٹر زور کی صاحب زادی محترمہ تہذیب یحییٰ فاروقی اور صحافی شاعرہ محترمہ نور جہاں ثروت کا خیر مقدم کیا گیا۔

آخر میں یہ عرض کرتا چلوں کہ قیام آندھرا کے بعد ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر زور صاحب نے یوم محمد قلی قطب شاہ منانے کی بنا ڈالی۔ انھوں نے یوم محمد قلی منانے کی وجہ یہ بتائی کہ محمد قلی کا دور سارے ہندستان کے لیے فخر و مباہات کا باعث ثابت ہو سکتا ہے۔ قومی یک جہتی، رواداری اور ترقیاتی نقطہ، نظر سے یہ دور قابل ستائش تھا۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب اس مقصد کے ساتھ منائی جاتی ہیں کہ اس بادشاہ شاعر نے اردو شعر و سخن کی جو قدریں متعین کی تھیں اور زبان و بیان کے جس اسلوب کی طرح اندازی کی تھی اس کی طرف بہ طور خاص توجہ کی جائے گی کہ عہد حاضر کی ہندستانی سیاست و سماج اس کی متقاضی ہے۔

وقت کی کمی کے باعث سلطان محمد قلی جیسے عظیم الشان بادشاہ شاعر، مدبر کے شایان شان یوم منانے دشواریاں پیش ہوئیں۔ ہم نے مخلصانہ جذبے سے امید کرتے ہیں کہ آپ تمام تقاریب میں شرکت فرمائیں گے۔

میں اپنی رپورٹ دکن کی مشہور شاعرہ محترمہ بشیر النسا بیگم بشیر کے شعر پر ختم کرتا ہوں کہ

ہے دکن کے زن و مرد ادب کے حلقہ بہ گوش
ادارۂ ادبیات کے دوش بہ دوش

ڈاکٹر نجمہ صدیقہ

قطب شاہی مورخین

بیسویں صدی کے ربع آخر تک پہنچنے کے بعد جب ہم لفظ " تاریخ " استعمال کرتے ہیں تو اس لفظ کا مفہوم بہت وسیع ، گہرا اور علمی ضابطوں سے منظم ہوتا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگلے وقتوں میں تاریخ کے وسیع اور علمی مفہوم کو سمجھنے اور اس کے مطابق تاریخ لکھنے والے موجود تھے ۔ ابن خلدون نے تاریخ کی جو تعریف کی ہے وہ غیر معمولی اور نہایت حکیمانہ ہے جس میں نظریہ ارتقا کا پورا شعور ملتا ہے ابن خلدون کے تصورات علم تاریخ کے علاوہ اب علم عمرانیات کے محکمات کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ۔ خود ہندستان میں منہاج سراج کی " طبقات ناصری " ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی " اور ابو الفضل کی " آئین اکبری " ایسے عظیم الشان تاریخی کارنامے ہیں کہ آج کے زمانے میں یہ کتابیں اپنے مواد کی وسعت اور پختگی اور اپنی ہیئت کی تنظیم اور آراستگی کے اعتبار سے متاثر کن ہیں ۔ ان اہم کارناموں کے بعد اب جب ہمارے سامنے کالنگ وڈ (COLLING WOOD) اور ٹائن بی (TOYNBEE) جیسے مفکرین اور مورخین کے تاریخ کے بارے میں عظیم الشان علمی تصورات سامنے آتے ہیں تو گزشتہ زمانے کے مورخین کی لکھی ہوئی تاریخیں اپنی ساری عظمت کے باوجود تاریخ کے بجائے محض تاریخی ماخذ معلوم ہوتی ہیں ۔

فارسی زبان میں تاریخ نویسی کا رواج قدیم زمانے سے ہے اور ہندستان میں یہ رواج اس وقت تک باقی رہا جب تک کہ یہاں فارسی زبان رائج رہی ۱۸۵۷ء میں جب مغل سلطنت کا خاتمہ ہوا تو اس زمانے میں بھی مرزا غالب شاہی مورخ کی حیثیت سے " مہر نیم روز " لکھ چکنے کے بعد " ماہ نیم ماہ " لکھنا چاہتے تھے ۔ اسی طرح جنوبی ہند میں جب تک فارسی زبان کا رواج رہا ۔ فارسی میں تاریخیں لکھی جاتی رہیں ۔ قطب شاہی دور بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے ۔ قطب شاہی سلطنت کی تاریخیں اس دور میں بھی لکھی گئیں اور اب تک لکھی جا رہی ہیں ۔

قطب شاہی سلطنت کی بنیاد ۱۵۱۸ء میں پڑی اور تقریباً پونے دو سو سال بعد ۱۶۸۷ء میں اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا ۔ اس کے خاتمے پر بھی تین سو برس کے لگ بھگ گزر چکے ہیں ۔ اس کے آغاز سے اب تک ساڑھے چار سو سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے اور اس تمام عرصے میں مورخین نے قطب شاہی سلطنت کے کسی نہ کسی پہلو کی تاریخ کو قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے ۔ قطب شاہی عہد کی تاریخ پر مواد کی اس قدر فراوانی ہے کہ ان سب سے استفادہ کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں ہے ۔ قلعہ گولکنڈہ اور بیسیوں قطب شاہی عمارتوں کے علاوہ اس زمانے کا فارسی ، دکنی اور تلنگی ادب اور پھر فارسی ، تلنگی ، ڈچ ، فرانسیسی ، انگریزی اور پرتگیزی اسنادی کاغذات ، سکے ، مہریں کتبے ، ظروف و آلات ، زیور اور لباس اور کتنے ہی ایسے ماخذ ہیں جن کی بنا پر قطب شاہی عہد کی مبسوط تاریخ لکھی جا سکتی ہے ۔ ایسے مواد سے استفادہ کرتے ہوئے ۔ شاہ رخ ، حکیم سید شمس اللہ قادری ، سید علی اصغر بلگرامی ، پروفیسر عبد المجید صدیقی ، نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے موجودہ دور میں محکمہ آثار قدیمہ کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں سے نئی نسلوں کو روشناس کرایا ہے ۔ نیز حال ہی میں گولکنڈے میں محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے جو کھدائیاں ہو رہی ہیں ان سے بھی غیر معمولی نئے انکشافات ہو رہے ہیں ۔

لیکن نئے زمانے میں اس دَور کی سب سے جامع اور مبسوط تاریخ لکھنے کا اہم ترین کارنامہ پروفیسر ہارون خاں شروانی نے انجام دیا ہے
کے باوجود نئے نئے ماخذ کا انکشاف ہو رہا ہے اور اس دور کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مختلف محققین تلاش و تحقیق میں مصروف
قطب شاہی دور کے خاتمے کے بعد سے اس دور کی تاریخ پر جو کچھ کام ہوا ہے ۔ اس کا جائزہ بجائے خود ایک اہم موضوع ہے ۔ تلاش و
کا یہ کارواں آگے بڑھتا رہے گا ۔ لیکن اس وقت ہماری گفتگو صرف ان تاریخی کارناموں تک محدود رہے گی جو قطب شاہی دور میں
مورخین نے انجام دی ہیں ۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قطب شاہوں کو شاہی مورخین کے تقرر کا مغل حکمرانوں جیسا شوق نہیں تھا ۔ بلکہ ان کے یہاں
نویسی کا کام جن لوگوں نے انجام دیا ہے وہ اگرچہ قطب شاہی امراء اور حکمرانوں کی کسی نہ کسی حد تک سرپرستی کا رہینِ منت ضرور ر
ان کارناموں کا محرک دراصل ان مورخین کی اپنی دل چسپی ہی معلوم ہوتی ہے ۔ قطب شاہی مورخین میں ایسے کم ہیں جو مستقلاً گولکنڈ
میں سکونت پذیر رہے ہوں یا جنھوں نے صرف قطب شاہوں کی تاریخ لکھنے پر اکتفا کیا ہو ۔ بیش تر مورخین نے قطب شاہی سلطنت
علاوہ نہ صرف دکن کی دیگر سلطنتوں اور سلطنتِ مغلیہ کی تاریخیں لکھی ہیں بلکہ ایران کی تاریخ بھی لکھ ڈالی ہے ۔ اس طرح قطب
مورخین دو زمروں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں ۔ ایک تو وہ جنھوں نے صرف قطب شاہی تاریخیں لکھی ہیں جن میں حدیقۃ السلا
مصنف میرزا نظام الدین احمد بن عبداللہ الصاعدی شیرازی ہے اور دوسرا تاریخِ قطب شاہی یا تاریخ محمد قطب شاہ جس کا مصنف خور
قباد الحسینی ہے ۔ دوسرے زمرے میں وہ مورخین ہیں جنھیں سولہویں اور سترہویں صدی کے بعد ایرانی پیشہ ور مورخین کی حیثیت
موسوم کیا جاسکتا ہے ایسے مورخین میں جنھوں نے گولکنڈے کے کسی نہ کسی عہد کی تاریخ لکھی ہے: خور شاہ، سید علی طباطبا، ا
فرشتہ، اسکندر منشی، علی بن طیفور السطا، محمد مفید مستوفی، محمد شریف وقوعی، عبدالباقی نہاوندی وغیرہ شامل ہیں ۔

قطب شاہی سلطنت کا پہلا مورخ خور شاہ بن قباد الحسینی ہے جو عراقی الاصل تھا ۔ اس نے ۹۷۱ء میں ایک تاریخِ عالم لکھ
تاریخِ عالم میں ایک حصہ قطب شاہی کے لیے مختص ہے ۔ اس تاریخ کے نام کا کوئی پتہ نہیں چلتا ۔ لیکن یہ بالعموم " تاریخِ ایلچی ن
کے نام سے موسوم کی جاتی ہے ۔ یہ تاریخ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں لکھی گئی ہے ۔

اسی طرح ملا محمد شریف نیشاپوری نے بھی عالمِ اسلام کی ایک جامع تاریخ " مجمع الاخبار " کے نام سے لکھی ہے جس میں گولک
تاریخ بھی شامل ہے ۔ محمد شریف نیشاپوری، جمشید قطب شاہ کے دَور میں گولکنڈہ آیا تھا اور یہاں اس نے چند دن ملازمت بھ
ابراہیم قطب شاہ کے انتقال تک گولکنڈے میں رہا ۔

ان دو تاریخوں کے بعد سب سے اہم کام سید علی طباطبا نے سمنانی کی " برہانِ مآثر " ہے " برہانِ مآثر " بنیادی طور پر دکن
ہے ۔ طباطبا کو قطب شاہی سرپرستی حاصل تھی ۔ اس نے دکن کی جو تاریخ ۹۹۹ء میں شروع کی وہ ۱۰۰۴ء میں مکمل ہوئی ۔ طباطبا اور
زمانہ کم و بیش ایک ہی ہے اور دونوں نے کم و بیش ایک ہی زمانے میں تاریخ لکھنا شروع کی لیکن فرشتہ کو سید علی طباطبا کی " برہا
سے استفادے کا موقع نہیں ملا ۔ حکیم ابو القاسم فرشتہ خود بھی ایک اہم قطب شاہی مورخ ہے ۔ فرشتہ کی تاریخ " گلشنِ ابراہیم
وسطیٰ کے ہندستان کی مکمل تاریخ ہے ۔

اسکندر بیگ منشی کی تاریخ " عالم آرائے عباسی " ، علی بن طیفور کی " حدائق السلاطین " محمد بن عبداللہ نیشاپوری کی مآثر قط
عبدالباقی نہاوندی کی مآثر رحیمی " محمد شریف وقوعی کی " مجمع الاخبار " اس لحاظ سے ایک ہی زمرے کی تاریخیں ہیں ۔ ان میں قطب

کے علاوہ ایران اور ہندوستان کی دوسری سلطنتوں کی بھی تاریخیں ہیں۔ اس زمرے کی ایک اور کتاب محمد مفید مستوفی کی " جامع مفیدی " ہے لیکن اس کو اس زمرے میں یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ ان سب کی بہ نسبت زیادہ علمی اور غیر رسمی انداز میں لکھی گئی ہے اس کا تیسرا حصہ ایران میں شائع ہوا ہے۔ وہ چھاپ کے باریک حرفوں میں ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کے باقی حصے دستیاب نہیں ہوتے۔

قطب شاہی دور کی تمام تاریخوں میں " حدیقۃ السلاطین اور تاریخ محمد قطب شاہ " کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ خالصتہً قطب شاہی تاریخیں ہیں اور مورخین نے بنیادی طور اس دور کی تاریخ بیان کی ہے جس کو انھوں نے خود دیکھا تھا یا اس ماضی قریب کی تاریخ لکھی ہے جس کے لیے وافر مواد اور اس ماضی کو دیکھے ہوئے افراد مورخ کے عہد تک باقی تھے۔ ان تاریخوں کے لکھنے والوں نے بھی اپنی زندگیاں گولکنڈے ہی میں گزار دیں لہذا ان کے مندرجات زیادہ معتبر سمجھے جاسکتے ہیں۔

" تاریخِ قطب شاہی " بھی محمد قطب شاہ کے دور ہی میں مرتب کی گئی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ کام بادشاہ کی فرمائش پر ہوا ہو۔ اس میں سلطان قلی قطب شاہ کے دور سے لے کر محمد قلی قطب شاہ کے اختتام تک چار قطب شاہی بادشاہوں کے دور کی مفصل تاریخ چار طویل ابواب میں قلم بند کی گئی ہے اور سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دورِ حکومت کے ابتدائی چند سالوں کے حالات پر ختم ہوئی ہے۔

حدیقۃ السلاطین میں اگرچہ ابتداء سلطان قلی سے لے کر عبداللہ قطب شاہ تک تمام بادشاہوں کی مجمل تاریخ درج کی گئی ہے۔ لیکن دراصل یہ ضخیم تاریخ عبداللہ قطب شاہ کی تخت نشینی سے پندرہ جلوس تک کے محاربات، خارجی تعلقات، تجارتی حالات اور امراءِ سلطنت کا تذکرہ ہے۔

قطب شاہی دور کی ان تاریخوں کے علاوہ فرسی کی ایک منظوم تاریخ جو " نسب نامہ قطب شاہی " کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے تذکرے کے بغیر یہ اجمالی جائزہ مکمل نہیں ہوگا۔ فرسی نے " نسب نامہ " میں قطب شاہی سلطنت کی ابتدا سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد تک کی تاریخ منظوم کی ہے۔ یہ منظوم تاریخ " واقعاتِ قطب شاہی " کے نام سے بھی موسوم کی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان میں کے تقریباً مورخین ایرانی الاصل تھے۔ خورشاہ اگرچہ عراقی الاصل تھا لیکن غالباً اس کی زبان فارسی ہی تھی ورنہ وہ یہ تاریخ فارسی میں نہ لکھتا۔ جہاں تک فنِ تاریخ نویسی کا سوال ہے، ان سب کے یہاں بنیادی اصول کم و بیش مشترک ہیں۔ ہر ایک بنیادی طور پر واقعات کی صحت کے درپئے ہے۔ ان مورخین کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقائع کو صحت و تفصیل سے بیان کریں۔ قابلِ ذکر سوانح اور وقائع کے انتخاب میں بھی ان مورخین کے درمیان زیادہ اختلاف اور تفاوت نہیں ہے۔ واقعات کے انتخاب میں رجحان کی یکسانیت کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے پہلا سبب تاریخ نویسی کی مہارت کا تسلسل ہے۔ یہ تسلسل کچھ تو ظاہر ہے کہ علمی اصولوں کے طور پر چلا آیا ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور سبب بھی ہے وہ یہ کہ ان مورخین نے معاصر تاریخ تو متعلقہ ماحول کی دید و شنید کے بعد مرتب کی ہے لیکن اپنے سے پہلے کے زمانوں کے بارے میں جو طریقہ کار اختیار کیا ہے وہ عموماً یہی ہے کہ اکثر مورخین اپنے پیش رو مورخین کی تاریخوں کے ابواب کے ابواب اپنی تاریخ میں نقل کر لیتے تھے۔ مثلاً علی بن طیفور البسطامی کی " حدائق السلاطین " میں بہمنیوں کا حال دراصل طباطبا سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح خورشاہ کے یہاں ساسانیوں اور کیانیوں کا حال دراصل اس کے پیش رو مورخین کے کارناموں سے ماخوذ ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی تاریخ کا ایک حصہ جو قدیم ماخذ سے نقل کیا گیا ہو اس کے اسلوب اور صحت کا اثر اس تاریخ پر بھی پڑے گا جو مورخ نے معاصر عہد کے بارے میں لکھی ہو۔

ماخذ سے استفادے میں بہت کم مورخین نے چھان بین کے بعد کسی واقعہ کی نسبت اپنا فیصلہ دیا ہے۔ سب سے زیادہ الجھن اس وقت ہوتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قطب شاہی مورخین اپنے ماخذ کے حوالے نہیں دیتے۔ بیش تر مورخین ماخذ کی نشان دہی سے بالکل بے نیاز ہیں البتہ ذمہ دار مورخین نے اپنی تاریخوں کے مقدمے میں ان مآخذ کی صراحت کر دی ہے۔ جن سے انھوں نے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً محمد مفید مستوفی اور سید علی طباطبا نے اپنے بنیادی مآخذ کی صراحت ابتدا ہی میں کر دی ہے اور متعدد واقعات کے معاملے میں ماخذ کی صراحت متن میں کی گئی ہے لیکن یہ کیفیت عام نہیں ہے۔

قطب شاہی مورخین کے فن و اسلوبِ تاریخ نویسی کو جس چیز نے زیادہ متاثر کیا ہے وہ کائنات کے بارے میں ان کے بنیادی تصورات ہیں جو درحقیقت ایک خاص دور کے مذہبی ذہن کے تشکیل کردہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان تاریخوں کا آغاز حمد، نعت، منقبت اور مدحِ سلطانی سے ہوتا ہے جو بظاہر اس زمانے کی کتابوں کی تصنیفی ہیئت کی محض ایک رسم سمجھی جاسکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تاریخ خدا، رسولؐ، علیؑ، آئمہ اطہارؑ اور سلطان سبھی سے ان کی عقیدت اور وابستگی کے اثرات ان کے انتخابِ واقعات، طرز استدلال، حقایق کی تعبیر اور تاریخ نویسی کے مقاصد پر نمایاں طور پر پڑتے ہیں۔ اس دور کے مورخ کے لیے تاریخ کا آغاز تخلیقِ آدم کے تعبیر اور تاریخ نویسی کے مقاصد پر نمایاں طور پر پڑتے ہیں۔ اس دور کے مورخ کے لیے تاریخ کا آغاز تخلیقِ آدم کے واقعے سے شروع کرنا مشکل نہیں ہے۔ اگر چہ آدم سے مورخ تک کے واقعات کسی مورخ کی کاوشوں سے نہیں ملتے تھے۔ لیکن مورخ کے عقیدے نے مقدس صحیفوں کے ان امثال و نظائر کو تاریخی طور پر قبول کر لیا جو ان صحیفوں میں ابلاغِ حکمت کی خاطر بہترین مثالوں کے طور پر پیش کیے گئے تھے۔ صحائفِ مقدس جن کا تعلق زمانِ الٰہی سے ہوتا ہے ان کے وقائع کو زمانِ تاریخی پر منطبق کرنے کے لیے جس مورخانہ تحقیق و جستجو کی ضرورت ہے وہ صرف ہمارے زمانے کا خاصہ ہے۔ قطب شاہی مورخین کا طرزِ عمل اس معاملے میں ایمان بالغیب سے زیادہ نہیں تھا۔ جہاں تک مقامِ نبیؐ اور مقامِ علیؑ کا تعلق ہے شیعہ اور سنی مورخین کے یہاں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ قطب شاہی دور کا مورخ اپنی تاریخ کا آغاز مذہبی عقیدے سے کرتا ہے اور واقعات کی تفصیل سلاطین اور ان امراء کے مزاجوں کے مطابق کرتا ہے جن سے وہ وابستہ رہا ہے۔ اس کے باوجود بہ حیثیتِ مورخ اس کی پیشہ ورانہ ذمہ داری اس کو بیانِ حق پر جس طرح اکساتی ہے وہ اپج بھی کچھ کم قابل محسوس نہیں ہے۔

بعض مورخین نے اپنی تاریخ کے مقدمے میں اپنی تاریخ نویسی کے اصولوں کے بارے میں وضاحت بھی کی ہے۔ جن میں محمد مفید مستوفی اور نظام الدین احمد شیرازی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ اور ان کے علاوہ دوسرے قطب شاہی مورخین نے تاریخ نویسی کے جن اصول و مقاصد کی صراحت کی ہے اس سے مذکورہ بالا تجزیے کی تردید نہیں ہوتی۔

دنیا میں ہر جگہ اور ہر زمانے میں مورخ کی زبان اعلیٰ ادبی اور علمی معیار کی رہی ہے۔ اکثر زبانوں میں تاریخی کتابوں کو ادبی کتابوں کا اعتبار حاصل رہا ہے۔ قطب شاہی دور کے مورخین نے تاریخ نویسی کے لیے جو زبان اختیار کی ہے اس پر عام طور پر فنِ تاریخ کے جدید ماہرین کا یہ اعتراض ہے کہ یہ زبان ثقیل، مبالغہ آمیز اور پر شکوہ الفاظ سے لب ریز اور تکلفات سے آراستہ ہے۔ اس تنقید کو کسی نہ کسی حد تک درست مانا جاسکتا ہے لیکن چند حقیقتوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا وہ یہ کہ اس زمانے میں تاریخ نویسی شعبہء ادب کا جزو تھی۔ کسی فن کے مصنف سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ معاصر معیارات سے منحرف ہو کر اپنے عملی موقف کو جوکھوں میں ڈال دے گا۔ دوسرے افراد کے ناموں کے ساتھ تفصیلی القاب اظہار پر گراں سمجھے گئے ہیں لیکن یہ بھی غلط ہے کیوں کہ اس زمانے میں القاب محض

ی آرائی کے طور پر نہیں لکھے جاتے ہیں بلکہ القاب کو بالعموم ایک سماجی اور قانونی حیثیت حاصل تھی اور القاب کے بغیر کسی کا نام لینا
ب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ معاصر مورخ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے معاصر امرا اور اکابرین کے ساتھ محض تساہل قلم کے
ی آداب ملحوظ رکھنے سے گریز کر جائے۔ تیسرے الفاظ کا شکوہ اس زمانے میں، ہم کو اس لیے زیادہ محسوس ہوتا ہے کہ اب ان الفاظ کا
ج کم ہوگیا ہے۔ لیکن عام طور پر مورخین نے اس سے زیادہ نہیں کیا ہے کہ رزم و بزم کے بیان میں رزم و بزم کے معتبر الفاظ اور
ی ترکیبیں برتی ہیں۔ عبارت کے مقفیٰ ہونے پر بھی اعتراض نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اس کا تعلق اسلوب سے ہے۔ مصنف کو
ب میں آزادی ہونا چاہیے۔ ویسے بھی فارسی زبان میں، ہم قافیہ الفاظ کی کثرت قدرتی طور پر مقفیٰ طرز تحریر کو الفاظ کا ایک فطری عمل
یتی ہے۔

قطب شاہی دور کی تاریخوں کی ترتیب و تدوین کم و بیش ہر صورت میں بہ لحاظ توقیت ہے اور ابواب کی ترتیب اس انداز میں
جس طرح کہ ناول کی ترتیب ہوتی ہے کسی خاص واقعے کو چند ابواب تک بیان کرنے کے بعد مورخ کسی نئے باب سے کسی نئی بات
ز کرتا ہے اور پھر ابواب گذشتہ کے واقعات کا تسلسل آیندہ ابواب سے قائم کرتا ہے۔ ابواب میں ایسی اوور لیپنگ
(OVER-LAPIN) اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ وقائع کی نوعیت معاصر حکومتوں کے تذکرے کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ یہ اوور
ـ محض واقعاتی اعتبار سے دکھائی دیتی ہے۔ لیکن بہ اعتبار توقیت تصنیف کا تسلسل نہایت ہموار ہوتا ہے۔

بعض مورخین نے مختلف معاصر سلطنتوں کی تاریخ ایک ساتھ بیان کی ہے جیسا کہ سید علی طباطبا نے "برہان مآثر" میں کیا ہے۔
ی فرشتہ اور علی بن طیفور نے ہر نسل کے حکمرانوں کے لیے علاحدہ شعبہ قائم کر دیا ہے۔ یہاں تاریخ نویسی کے جائزے میں صرف ان
ں کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو تاریخ کی تعریف میں آتی ہیں۔ کسی اور نوعیت کے تاریخی ادب خاص طور پر تذکروں سے یہاں بحث نہیں
لیکن۔ یہ بھی ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ بعض قطب شاہی مورخین نے اپنے تاریخی کارناموں کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے ایک
میں تو وہ عہد بہ عہد سیاسی تاریخ بیان کرتے ہیں اور دوسرا حصہ ٹھیٹ تذکرے پر مشتمل ہوتا ہے۔ محمد مفید مستوفی کی جامع مفیدی
ا ترتیب و تدوین کی بہترین مثال ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا واقعات کے انتخابات میں مورخ کی بساط فکر اور معتقدات کا بڑا دخل ہے۔ آج کا طالب علم جب قطب شاہی
نیں پڑھتا ہے تو بعض اہم واقعات کو تشنہ پاتا ہے اور بعض واقعات کا تو پتہ ہی نہیں چلتا۔ لیکن کئی غیر اہم واقعات ایسے ہوتے ہیں
ی تفصیل پڑھنے سے وقت اور توانائی کے زیاں کا اذیت ناک احساس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قطب شاہی مورخین کی نظریں
لین و امرا کی شخصیتوں پر مرکوز رہتی ہیں۔ اور تاریخ کی تعبیر مادی اور روحانی بنا پر کی جاتی ہے۔ جس کے سبب سے عوام کی تہذیبی،
ی اور معاشرتی زندگی کا صرف اچٹتا سا ذکر جہاں تہاں مل جاتا ہے لیکن ان کی پوری تصویریں بن نہیں پاتیں۔ اس کے بجائے کسی
ان یا امیر کے کسی محل یا کسی تقریب یا کسی کارنامے کا جب ذکر آتا ہے تو اس کی جزوی تفصیلات کو نہایت مبالغے کے ساتھ پیش کیا
ہے۔ سوائے محمد مفید مستوفی کے کوئی ایسا قطب شاہی مورخ نہیں ملتا جس نے تاریخ کی تعبیر میں روحانی اور اخلاقی اقدار کے ساتھ
ی اقدار کو ملحوظ رکھا ہو۔ ان حالات میں یہ سہل ہے کہ قطب شاہی عہد کے درباروں، امرا کے پڑھے لکھے طبقے کے تصورات، سیاسی
، دوانیوں اور ان سے متعلق دیگر امور کی مبسوط تاریخ مرتب کی جائے لیکن قطب شاہی مورخین کے کارناموں کی مدد سے اس دور کے
م کی معاشی تاریخ لکھنا اور خود اس سلطنت کی آبادی کی ساخت کا معتبر تجزیہ کرنا تقریباً ناممکن سا ہے۔

(باقی ص ۳۸ پر)

ڈاکٹر حبیب نثار

قطب شاہی عہد میں دکنی ادب اور موسیقی

ادب اور موسیقی میں گل و خوش بو کا رشتہ ہے ۔ ہندستانی موسیقی اور اردو ادب کا ربط باہمی اس قدر مشترک اور منفرد ہے ہندستان کی تاریخ کے تناظر میں دونوں کو کسی صورت ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا کہ دونوں میں جسم و روح کا معاملہ ہے ۔

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندستان میں فنِ موسیقی پر جمود طاری تھا تقریباً دو صدی تک یہ جمود قائم رہا ۔ اس جمود سے قبل ہندستان کی قدیم موسیقی میں، دھرو، بھجن، پد اصنافِ نغمہ اور وینا، بانسری، مردنگ، ڈھمرو، اکتارا، سنکھ وغیرہ ساز مروج تھے ۔

ہندستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد دسویں صدی عیسوی کے آخر اور گیارھویں صدی کی ابتدا میں موسیقی میں نئی زندگی آنے لگی ۔ اور جمود ختم ہوتا ہے ۔ اب موسیقی رفتہ رفتہ مقبول ہونے لگی اور تیرھویں صدی کے آخر میں ہندستان کی موسیقی نے اپنے ارتقا کے نئے افق چھو لیا ۔ ہندستان کی موسیقی کا یہی وہ سنہرا عہد ہے جب حضرت امیر خسروؔ نے ہندستان کی قدیم موسیقی کو جو کہ زیادہ تر الاپ پر انحصار کرتی تھ الفاظ کا پیرہن عطا کیا ۔ حضرت امیر خسروؔ نے خیال، سہیلا، قوالی، ترانہ اصنافِ نغمہ اختراع کیے اور ان اصنافِ نغمہ کے مزاج اور آہنگ کے تنا میں ستار، ڈھول اور طبلہ اختراع کیا (۱) ۔ چودھویں صدی ہی سے ہندستان کی موسیقی میں دو دبستان بن گئے کرناٹکی موسیقی اور ہندستا موسیقی ۔ ان دو دبستانوں کے وقوع پذیر ہونے کا بیان وینکٹا مکھی نے اپنی تصنیف "چترڈنڈی پرکاشیکا" میں کیا ہے جو ابتدائی پندرھو صدی عیسوی میں لکھی گئی ہے ۔ اسی پندرھویں صدی عیسوی میں لکھی جانے والی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں بھی افقِ موسیقی کے اس بدل ہوئے رنگ کو دیکھا جاسکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور قطب شاہی سلطنت سولھویں صدی کے دوسرے دہے میں وجود میں آتی ہے ۔

" پرت نامہ " قطب شاہی عہد میں لکھی جانے والی پہلی تخلیق ہے جس میں موسیقی کا بیان ملتا ہے ۔ اس مثنوی میں فیروز اپنے پیر الدین شالی مخدوم جیو کی مدح میں کہتا ہے:

جیسے پیر مخدوم جی راجتا طبل ، ڈھول اس دوار جم گاجتا (۲)

فیروز نے یہاں ڈھول کا بیان، طبل سے مختلف ساز کے لیے واضح انداز میں کیا ہے ۔ ڈھول کی ایجاد اور اختراع کے سلسلے میں دو نقطۂ نظر ملتے ہیں ۔ ایک کے مطابق ڈھول امیر خسروؔ کی اختراع ہے اور دوسرے نظریے میں اس ساز کو عہد اکبری کی ایجاد بتایا گیا ہے اور ضیاالد خسروؔ کو ڈھول کا موجد بتایا جاتا ہے جو ۱۵۰۷ء کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ پرت نامہ ۱۵۶۴ء سے قبل لکھا گیا اور فیروز کی اس مختـ مثنوی سے عہد اکبری میں ڈھول کے اختراع ہونے کا نظریہ ساقط ہوجاتا ہے ۔ اس طرح ابراہیم قطب شاہ کے عہد سے تعلق رکھنے والی یہ مثنو موسیقی کے ارتقا میں اہم سند فراہم کرتی ہے ۔

احمد گجراتی نے "یوسف زلیخا" ۹۸۸ھ ۔ ۹۹۸ھ کے درمیان لکھی ۔ احمد گجراتی نے بیانِ موسیقی میں زماں و مکاں کا پورا پورا خ رکھتے ہوئے عرب کی اس مقبول داستان کو بیان کیا ہے ۔ مثنوی میں زلیخا کے سفر کا بیان ہے ۔ عزیزِ مصر کو زلیخا کے سفر کی اطلاع تھی ۔ اور ا زلیخا کے استقبال کے لیے روانہ ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے ہم راہ فن کارانِ موسیقی بھی ہیں ۔ اس موقع پر احمد گجراتی نے موسیقی کے صرف ان سازوں کا بیان کیا ہے جو عرب میں بھی مروج ہیں (۳) ۔ مثلاً رباب، طنبور، کمانچہ، دف، طبل نفری، سنک (سنکھ) ۔ اس کے علاوہ دوسر

اب میں موسیقی کا جو بیان جہاں کہیں احمد گجراتی نے کیا ہے وہاں "مکاں" کی مناسبت سے موسیقی کے سازوں کے نازک طاقہ کو فراموش دیا ہے اور ایسے موقعوں پر وہ خالص ہندستانی داستان بیان کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔ دراصل یہاں عرب کا ترنم ہندستان کے ساز پر آواز ا ہے جو ہندستانی موسیقی کی روح ہے۔ مثنوی کا ایک اقتباس دیکھیے:

عزیز مصر رانی سات لے کر ۔۔۔ چلن لگیا کٹک سنگات لے کر
جھنتر بھار میں لاگے جو بجنے ۔۔۔ دھرت بدرے گگن لاگے گرجنے
سہیلے گائیں شہنایاں میں یہ دھات ۔۔۔ سہیلیاں بھی سہیلے گاؤ تیاں سات
جو اعلیٰ اونٹ ہانکنے اونٹ والے ۔۔۔ سو اونٹ ان بدلتے ہوئے متوالے (۴)

عربوں میں روایت عام ہے کہ "حدی" گانے سے اونٹ اپنی رفتار تیز کر دیتا ہے۔ احمد گجراتی نے اس مثنوی میں سہیلا گانے سے اونٹ متوالے ہونے کا ذکر کیا ہے۔ "سہیلا" ہندستانی موسیقی کو حضرت امیر خسروؔ کی دین ہے۔ اسے یقیناً حضرت امیر خسروؔ نے اختراع کیا ہے ن اس صنفِ نغمہ کو پروان چڑھایا دکن والوں نے اور اب یہ خالص "دکنی چیز" کہی جاتی ہے۔ سہیلا سن کر اونٹ کا متوالا ہونا اس بات کی ب اشارہ ہے کہ جو چیز اونٹ کو متوالا دے خود کرتی ہے وہ موسیقی کا ایک مخصوص آہنگ ہے نہ کہ کوئی زبان یا صنفِ نغمہ۔۔۔۔

احمد گجراتی نے اپنی مثنوی میں محمد قلی قطب شاہ کے "ذوقِ فنونِ لطیفہ" پر بھی روشنی ڈالی ہے:

سنگھن مسکاوتا ہے روپ سنگار ۔۔۔ سبھہ سنگار کوں اس تھے انکار
سنگیت ساہیت لولت گن ندھانی ۔۔۔ چتر چوسٹ او دھانی کہانی (۵)

"قطب مشتری" وجہی نے ۱۰۱۸ھ میں منظوم کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مثنوی میں ملا وجہی نے محمد قلی قطب شاہ کی داستانِ عشق کو نوع بنایا ہے۔ راقم الحروف اس رائے سے متفق نہیں۔ "قطب مشتری" میں وجہی نے "صفتِ مجلسِ طرب" کے عنوان سے شاہزادہ قطب محل کی مجلسِ طرب کا بیان کیا ہے جس میں موسیقی کے سروں اور تان کا بیان مہارتِ فن کے ساتھ کیا ہے:

شہنشہ مجالس کیے ایک رات ۔۔۔ وزیراں کے فرزند تے سب سنگات
ہر اک خوب صورت ہر اک خوش لقا ۔۔۔ سو ہر ایک دل کش ہر یک دل ربا
مہابت کے ساماں میں جم جم ہے جیوں ۔۔۔ شجاعت کے کاماں میں رستم ہے جیوں
ندیم ہور مطرب سگھڑ فہم دار ۔۔۔ اتھے شہ سوں مل کر یو سب ایک ٹھار
صراحی پیالے لے ہاتاں منے ۔۔۔ ندیماں تے مشغول باتاں منے
لگے مطرباں گانے یوں سازسوں ۔۔۔ کہ دھرتی ہلی مست آواز سوں
جو مطرب وہ صحرا میں اس دھات گائے ۔۔۔ تو پھر ان کوں اس شوق تے حال آئے
کتے تل سوں یوں لے خش ہوتان ۔۔۔ کہ سن کر سما دیو میں نو آسمان
جو گاون وہ شہ کوں گماتے اتھے ۔۔۔ سراں پہ وہ راگاں جماتے اتھے
ندیماں لطافت میں جو یک آئیں ۔۔۔ تو روستاں کوں خوش کر گھڑی میں ہنسائیں
شراب ہور صراحی نقل ہور جام ۔۔۔ ہوئے مست مجلس کے لوگاں تمام (۶)

وجہی نے یہاں صرف موسیقی کی مجلس اور اس کے تاثر ہی کا بیان نہیں کیا ہے بلکہ تال، سر اور تان کی کیفیت کا ذکر بھی ملتا ہے
وجہی کہتا ہے کہ جو گانے اس مجلس میں گائے جا رہے ہیں اگر یہی صحرا میں اسی "دھات (طرح) گائے جائیں تو پھر صحرا بھی وجد میں آکر ج
اٹھے گا۔ گویا فطرت، انسان کے تابع ہے اور فطرت کو وجہی کے خیال میں آواز کے ذریعے تسخیر کیا جاسکتا ہے۔

وجہی نے "سب رس" میں بھی "دل بادشاہ" کے دربار کی محفل موسیقی کا بیان ہے۔ وجہی کا خیال ہے کہ بادشاہ کی محفل میں راگ
ہی سب کچھ ہے "راگ کو اسم اور عشق کو جسم" کہتا ہے۔ بادشاہ دل کے دربار میں موجود مطربوں اور سازندوں کا بیان وجہی اس طرح کرتا

"القصہ ایک رات، دل بادشاہ، عالم پناہ، ظل اللہ صاحب سپاہ نے کماچ، طنبور، قانوں، عود، منگاکر، مطربان خوش سواد بلاکر، دف، داہرا، چنگ، رباب سوں، بے حجاب سوں دو چار پیالے شراب کے پیا تھا۔ ارکان دولت، ندیم، شاعر، قصہ خوں، شبہ نامہ خواں، خوش طبعاں، لطیفہ گویاں، حاضر جواباں، گل رویاں، خوش خویاں سب حاضر مجلس تھے۔ ر۔

مولوی عبد الحق کا قیاس ہے کہ وجہی نے "سب رس" میں خیالی دربار نہیں سجائے ہیں بلکہ اس نے گولکنڈے کی معاشرت ہی کا بیا
اپنی داستان میں کیا ہے (۸)۔ اردو کی اس پہلی داستان میں راگ کی تاثیر کا بیان وجہی یوں کرتا ہے:

"راگ میں عجب ہے تاثیر، عاشق کے دل کو یوں لگتا جوں تیر، بہتے پانی کوں کھڑا کرے، اڑتے جناور کوں پاڑے، بہتے کوں دیوانہ کرے، ہشیار کوں مست کر پچھاڑے، راگ ہو نچ میں عاشق زار زار روتا، بے اختیار روتا، ہانکاں مار مار روتا، پکار پکار روتا۔۔۔۔ درویشاں کوں حال آتا ہے، ہزار ہزار دل میں خیال آتا ہے" (۹)۔

وجہی نے راگ کی تاثیر سے بہتے پانی کے ٹھہر جانے کا بیان کیا ہے۔ غواصی نے بھی اپنی مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" (۱۰۳۵
میں "خیال" گائے جانے سے اور تان کی تاثیر سے "بہتا نیر بہتا نہ تھا" کی بات کی ہے:

وو عاشق ہو معشوق کے درمیان سوں — مست ہو اپس میں خوش الحان سوں
چھیا خیال اس دھات گاتا اتھا — جو ہر روکھ کوں حال آتا اتھا
پنکھی گم ہوئے تھے وو الحان سن — بہتا نیر بہتا نہ تھا تان سن
سنی وو گلا جیو بدیع الجمال — گلی اس گلے کے اُپر روکھ خیال (۱۱)

غواصی نے اس مثنوی میں نول عاصم کے لڑکے سیف الملوک اور سہ پال کی شہزادی بدیع الجمال کی داستان عشق کو منظوم کیا ہے
اس نے مثنوی میں موسیقی کے بیان سے پلاٹ کی تعمیر میں مدد لی ہے۔ سیف الملوک، بدیع الجمال کی تصویر دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے ا
اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ بہ ہزار دشواری بدیع الجمال کے ٹھکانے کا پتہ چلتا ہے لیکن اس تک رسائی کا کوئی وسیلہ نہیں۔ گھومتے گھا
سیف الملوک ایک "گل زار فرح بخش" پہنچتا ہے دیکھتا ہے کہ ایک باغ "صفادار ہور ہوادار" ہے جہاں کے درختوں پر پنکھی مست ہو ہو
اپنے محبوب حقیقی کے ذکر میں غل کر رہے ہیں۔ خود بھی "معشوق کے درمیان میں گانے لگتا ہے۔ جس کا اظہار غواصی نے مندرجہ بالا اشعا
میں کیا ہے۔۔۔۔ اور ان اشعار کے بعد کہانی آگے بڑھتی ہے:

کہی یاں یو کس کا ہے نادر گلا — کیا ہے مری روح کوں مبتلا
گلا یو نہ ہوئے پچ بلا ہے گنبھیر — کہ پانی کیا گال میرا سریر

رے روم مج ذوق سارا ہوا بھی روح کو میرے پیارا ہوا
کہی شاہزادے کی ماں تب اسے یو نادر گلا اس کسی کا دسے
جنے میری بیٹی کو لیایا اہے وسے جیو وان سرتے نچھایا ہے (۱۲)

اور اس طرح بدیع الجمال "سیف الملوک کے گانے سے متاثر ہوتی ہے۔ دونوں کے ملنے کا جواز کہانی میں پیدا ہوتا ہے اور پلاٹ کی تعمیر میں کسی قسم کا جھول آنے نہیں پاتا۔ غواصی نے مندرجہ بالا اشعار میں ہندستانی موسیقی کی مقبول صنف نغمہ "خیال" کا ذکر کیا ہے اور شہزادے کے عشق میں مجذوب ہونے کی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے "خیال" کی رعایت برتی ہے۔ کت خدائی سیف الملک و بدیع الجمال کے موقع پر محفل موسیقی کا اہتمام ہے۔ غواصی نے بڑی مہارت سے تمام محاکات کے ساتھ اس محفل کا بیان کیا ہے:

ہوئی مست مجلس خوش آواز سوں دیوانی کیا پاتراں ناز سوں
جو گت لے اٹھے منڈلے پھر تمام سنے ہوش جاگے پتے گھر تمام
منڈل کار منڈل بجانے لگے گتاں کار پکڑیا سولیانے لگے
جنتر کاڑ سوزاں اچائے یلوں سوں مجلس کوں مستی میں لیائے یلوں
جو کھولن لگے نغمے ہر نمارتے بلیاں سن چتر پتلیاں ٹھارتے
کتیاں جو انھیں تان پر تان کیاں رہیں ڈال پنک سور اسمان کیاں
سزاوار شاہی کوں یو سازوار ہنر مند جو سارے ہور رازدار
دیک اس بزم کا خوش سہاوا وہ نور لگے بھیجنے مرحبا چاند سور (۱۳)

منڈل پر "گیتاں" گائے جارہے ہیں اور اس کے سوز سے مجلس پر مستی کا عالم طاری ہے اور ایسے میں فن کار "کھولن لگے نغمے ہر مارتے" یعنی وقت کی مناسبت سے فن کار نغمے کھولنے لگے گویا نغموں کا "وستار" ہونے لگا اور تان پر تان اڑنے لگی اور سرپنکھ لگا کر آسمان کو ہونے لگے یعنی اونچے سر ادا کیے جانے لگے جس سے فن کار کی مہارت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ محفل کی جو یہ خوشی، سہاناپن، اور نور دیکھا تو چاند ر سورج بھی "مرحبا" کی داد بھیجنے لگے۔

یہاں غواصی نے فطرت کو محفل موسیقی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اور جہاں فطرت کی ہم آہنگی محفل موسیقی کو میسر ہو جائے وہاں ر قیامت ڈھاتا ہے۔۔۔۔ شادی کے بعد جلوے کی رسم کے موقع پر بھی غواصی نے محفل موسیقی کا بیان کیا ہے جس میں "آسمان" کے مجلس "زہرا اور مشتری" کے آنے اور گانے کا بیان ملتا ہے۔ یہاں شبانے، گاتے جاتے ہیں۔ "بدھاوا" گایا جاتا ہے وہاں سے نکلتے ہیں، نفیریوں کی ازسے مجلس گرم ہوتی ہے۔ غواصی نے حمد کے ایک شعر میں بھی موسیقی کے تلازمے کا بیان ہے اور خوب کیا ہے:

ہنرباتس گرہاں بیچ تارے حشم کریں نوبتاں سوں النگ دم بہ دم
جہاں لگ جو بادل کے ہیں گڑگوات تری فتح دولت دمامے کے ٹھاٹ (۱۴)

اس حمد میں چوں کہ غواصی نے خدا کو جگت کی بادشاہی کا "کرن ہار" کہا ہے اسی مناسبت سے "نوبت" اور "دمامے" کے ٹھاٹ کا ر کرتا ہے۔

غواصی کی دوسری مشہور مثنوی "طوطی نامہ" ہے۔ اس مثنوی میں بھی غواصی نے سیف الملوک و بدیع الجمال کی طرح ہر مناسب

موقع پر موسیقی کی مبادیات سے کام لیتے ہوئے اپنی بات کو تفہیم عطا کی ہے۔
سیف الملوک بدیع الجمال میں حمد کہتے ہوئے غواصی نے خدا کو حکمت کی بادشاہی کا کرن ہار بتاتے ہوئے موسیقی کا تلازمہ استعمال ہے۔ "طوطی نامہ" کی نعت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ختم رسولؐ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے قیامت تک نبوت کے طبل بجنے استعارہ برتا ہے:

ہوئے ختم اس پر نبوت کے گن   بجے طبل اس کا قیامت لگن (۱۵)

"طوطی نامہ" میں غواصی نے طوطی کی زبانی مختلف حکایات بیان کی ہیں۔ حکایت "بست و دوم" میں ایک ایسی عورت کا ذکر کر ہے جو بہت خوب صورت تھی۔ اس کے باپ نے اس کی شادی ایک ایسے مرد سے کردی جو "نہ صورت میں بنکانہ سیرت میں سند" اور جس کے پاس سوائے بخت کے کوئی ہنر نہ تھا۔ "جاہل اتھا ہور نادان سخت" (۱۶) یہ عورت بہت اچھا گاتی ہے۔ اپنے قسمت کا "لکھیا تھا سو اپڑیا کر (۱۷) وہ راضی بہ رضا رہتی ہے اور اپنے گانے سے دل بہلاتی ہے:

جنتر ہات میں لے جو گاتی اچھے   ولاں کے پنکھیاں کو کھلاتی اچھے
کہ تھا بھوت گانے پر اس کا خیال   سو اک رات وہ نار صاحب جمال
مہاری تلیں یک ہم سن جواں   جو دھرتا اتھا گیان نچ ناماں
خیالے خیال آپنے دھیان سوں   سنی راگ کرتا خوش الحان سوں
کہی ایسے الحان کے جوان کوں   دیا جائے خوش شرم ہور مان کوں (۱۸)

"جنتر" آج کے "تان پورے" (طنبورے) کا نام ہے جو اس زمانے میں مروج تھا۔ اس مثنوی میں بھی غواصی موسیقی کو وسیلہ بنا کہانی کو آگے بڑھاتا ہے چناں چہ یہ عورت اس ہمن شخص کا گانا سنتی ہے، اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور گھر سے بھاگ جاتی ہے۔
اس مثنوی میں بھی غواصی نے اپنے کردار سے "خیال" گوایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈے میں "خیال" گائیکی بہت مقبول معروف اور پسندیدہ تھی۔
خیال کے اختراع کے سلسلے میں امیر خسروؒ کا نام لیا جاتا ہے لیکن بعض مورخین اس سے اختلاف بھی کرتے ہیں اور خیال کے اختراع سہرا سلطان حسین شرقی کے سر باندھتے ہیں لیکن دکن میں خیال حسین شاہ شرقی کے معاصر عہد میں اپنی تمام آب و تاب کے ساتھ ملتا ہے اور یہ اس کی روایت برابر آگے بڑھتی ہوئی عہد بہ عہد ملتی جاتی ہے جب کہ شمال میں حسین شاہ شرقی کے بعد خیال محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں نظر آ ہے چناں چہ بعض ماہرین موسیقی اورنگ و سدارنگ کو اس کا موجد مانتے ہیں۔ قطب شاہی عہد کی مثنویاں متذکرہ بالا آخر کے دونوں نظریات کو غلط ثابت کرتے ہیں۔
جنیدی کی مثنوی "ماہ پیکر" (۱۰۶۴ھ) میں موسیقی کا بیان مزید ترقی یافتہ نظر آتا ہے۔ اس مثنوی میں "پیکر" کو قتل گاہ لے جایا جا ہے۔ اس موقع پر جنیدی نے قتل گاہ کی فضا کی منظر کشی بڑے اچھے انداز میں کی ہے اور فضا کی تعمیر میں موسیقی کے مختلف سازوں اور ان کی آوازوں سے مدد لی گئی ہے:

دماں ماں سولی تم سو بگی اناؤ   ہو بلسار کوں بیج بگی منگاؤ
کیتک سات میں لیا سو حاضر کیے   کہ شہبہ کا ڈنکا و مناسب دیے

سولی کاڑی دزبار کے جوں انگے دماں ماں دمامے بجانے لگے
اٹھیا کوسِ شاہی کا آواز جب زمیں سات اسماں ہلے سارے تب
کہ پیکر کے دک تے دوعالم بلیا کہ غم کی اگن تے سو عالم جلیا (۲۰)

یہاں انسان فطرت اور موسیقی کو مشترک بیان کیا گیا ہے کہ کوسِ شاہی کی آواز سے "زمین سات اسماں ہلے" (۷) تو پیکر کے دکھ سے عالم جلنے لگا۔ یہاں انسانی غم سے فطرت بھی غم زدہ ہو گئی ہے۔ مثنوی میں پیکر کا کردار "مرد مومن" کی مثال پیش کرتا ہے گویا کائنات اس کی سیرت کے آگے تسخیر ہو گئی ہے۔۔۔۔ دماں ماں دمامے اور کوسِ شاہی اس "عالم" کا منظر کشی کو کامیاب بنانے میں ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

"پیکر و ماہ" کی شادی کے موقع پر موسیقی کی بہار دیکھیے:

دمامیں او تالو نقارے تمام شنایاں او کرنای بجیں ہر مقام
نہ تھاواں سوکچ باجے کا انت پار بجیں باجا ہرجا بجا ٹھار ٹھار
کلاونت بلائے ہریک ٹھار کے خرد ہور بزرگ ہریک شار کے
سنوارے صحن صاف ہور خوب تر سماں عرش اس دیک دھریں خاک سر
گنائے کاج اس بھانت سوں راج نے دمامیں لگے ہر طرف باجنے
کہ قانو و برغم شہنائی کرنائے ہریک ٹھار ہر بھانت باجے بجائے
نہ تھا کان پڑتا کچ آواز یوں کلیجے سو بدریں سن آواز ڈھول
کلاونت لگے ناچنے تال بد اندر کی سبا ساری واں ہوئی تھی رد
الاپن لگیاں او جو سرتان لے کہ واود قینوس الحان لے
کہ سن راگ سب مست ہو انجمن کہ آواز پھٹ جائے ساتو گگن
ہوئی لوٹ پر لوٹ مجلس تمام دیے زر اور زرباف کے لاک دام (۲۱)

حسن شوقی نے "میزبانی نامہ" میں شہر گشت کے موقع پر موسیقی کا بیان کیا ہے۔ "میزبانی نامہ" بیجاپور میں لکھی گئی اور بیجاپور کی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ احمد جنیدی نے بھی پیکر کی شادی کے موقع پر شہر گشت کا تذکرہ اور بیان کیا ہے۔ گویا گولکنڈہ اور بیجاپورہ کی تہذیب، رسم و رواج ایک تھے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ وہ دکنی تہذیب تھی جو بہمنی سلطنت کے ختم ہونے پر دکن کی پانچ سلطنتوں میں منقسم ہونے کے باوجود اکائی بنی رہی۔

وجہی، غواصی اور احمد جنیدی نے اپنی مثنویوں میں محفلِ موسیقی کا بیان کیا ہے یا پھر ان محفلوں میں بجنے والی موسیقی کے تاثر کا بیان کیا ہے۔ اس کے بر خلاف ابنِ نشاطی اپنی مثنوی "پھول بن" مصنفہ ۱۰۶۷ھ میں نہ صرف محفلِ موسیقی اور اس محفل کے تاثر کا بیان کرتے ہیں بلکہ سازوں سے نکلنے والی آوازوں کو بھی الفاظ کا پیکر دے کر انھیں گویائی بخشتے ہیں:

کریا تھا شاہ بزم آراستہ خوب کھڑے تھے ساقیاں دو راستہ خوب
تھے بیٹھے مطرباں کر سازوسامان چھپے سو کھولتے نغمے کے رازاں

رباباں بجتے تھے تن تن تناتن　　طنبورے بولتے جھن جھن جھنا جھن
پرت تے تھے حقیقت کھولتے موں　　ہے توں توں توں ہی توں توں توں ہی توں
ولاں ہور دائراں سول جلاجل　　کتی تھی جھل جھلا جھل جھل جھلا جھل
اے ساقی دے مجے دو ساوہ ناب　　مہیا جس میں راحت کا ہے اسباب　(۲۲)

موسیقی کی آوازوں کو الفاظ کا پیکر دینے کا عمل ابن نشاطی کا خاصہ نہیں۔ اس کی روایت ہمیں محمد قلی قطب شاہ کے یہاں مل جاتی ہے۔ اپنے ایک قصیدہ میں وہ کہتا ہے:

" امنگاں آپ امنگاں سو اپس میں آپ مل ناچیں
تننا کا تنن ناچیں بوئے تن تن تنن سارا "　(۲۳)

محمد قلی قطب شاہ کے قصیدوں کی اس روایت کو غواصی نے بڑی کامیابی سے آگے بڑھایا ہے۔ غواصی نے عبداللہ قطب شاہ کی مدح میں کئی قصیدے لکھے ہیں۔ وہ جابجا موسیقی اور تلازمات موسیقی کو اپنے قصیدوں میں برت کر اپنے ممدوح کی شان و شوکت " لیاقت اور اس کے دوسرے مشاغل کا بیان کرتا ہے حتیٰ کہ مضمون شعر میں باندھتا ہے تو بھی تلازمہ موسیقی کی مدد سے باندھتا ہے:

جب لگ چندر ہور سور کے بجتے ہیں طاساں گگن اپر
بجنا اچھو تج دار انگے تب لگ بجنتر فتح کا !!　(۲۴)

پہلے مصرع میں طاساں دراصل آج کا " تاشا " .... " اور " گگن " گگن ہے۔ اس شعر میں غواصی نے گگن کو ساز مراد لیا اور چندر (چاند) اور سور (سورج) کو تاشہ کی دو چھڑیاں فرض کر لیا۔ جس سے گگن کے ساز پر تاشہ بج رہا ہے۔ دوسرے مصرع میں بجنتر کا لفظ آیا ہے یہاں غواصی نے ساز کے معنی میں اس کو باندھا ہے۔

دعا دیتا ہے کہ جب تک آسمان پر سورج اور چاند تاشہ بجاتے رہیں تیرے در پر فتح کے ساز بجتے رہیں۔

ایک دوسرے قصیدے میں " راگ رنگ تاناں ترانے " کی کیفیت دیکھیے:

راگ رنگ تاناں ترانے ناچ ہور پربندگیت
تار ہور منڈل دو تارے چنگ ہور وینی رباب
اس مدن بھوگی کی دولت پائے یوں رجحان جو
گر سنے دیو اندر تونا رہے کچ اس میں تاب　(۲۵)

بادشاہ کے دربار کی محفل موسیقی و رقص کا بیان کیا جا رہا ہے ۔۔۔۔ پہلے شعر میں صرف " ہور " کا لفظ موسیقی سے متعلق نہیں باقی تمام الفاظ موسیقی سے متعلق ہیں۔ شعر کی زمین میں موسیقی کے سازوں کا اس دروبست کے ساتھ بیان کرنا کسی استاد شاعری سے ممکن ہو سکتا ہے۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں غواصی نے " وینا " کو " وینی " لکھا ہے۔ دوسرے شعر میں بادشاہ کی محفل موسیقی کو اندر کے رشک کا باعث بتایا ہے۔

قطب شاہی عہد کا دکنی ادب ، ہندوستانی موسیقی ہی کا نہیں ، ہندوستانی تہذیب اور تاریخ کا بہترین ماخذ ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اس کے مطالعے کے بغیر ہندوستانی موسیقی کی تاریخ اور اس کی تدوین ادھوری ہوگی۔

حوالے و حواشی:

(۱) ہندوستانی موسیقی پر تحقیق کرنے والوں کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو حضرت امیر خسروؔ کی تمام اختراعات کو رد کرتا ہے اور ستار، خیال، طبلہ اور ڈھول کو عہدِ اکبری کے ضیاء الدین خسروؔ سے منسوب کرتا ہے چنانچہ مہاپندرا کور Mahapendra Kaur اور J.S. Prabhu نے اپنے مقالوں مطبع استاد شیخ داؤد ششتی پورتی سووینیر ۱۹۴۸ء میں، پروفیسر حسن عسکریؔ نے اپنے انگریزی مقالے "امیر خسرو اور موسیقی" مطبوعہ خدا بخش لائبریری جرنل اور جناب عرش ملسیانی نے "امیر خسرو عہد، فن اور شخصیت" جناب رشید ملک نے اپنے مقالے "امیر خسرو اور فنِ موسیقی" مشمولہ امیر خسرو اور فنِ موسیقی اور دوسرے مضامین میں اسی نظریے کو پیش کیا ہے۔ڈاکٹر سید اسد علی نے خیال کی اختراع کو حسین شاہ شرقی شاہ جون پور سے منسوب کیا ہے ملاحظہ ہو:
ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات "مترجم ڈاکٹر ماجدہ اسد ص ۲۲۹ سنہ اشاعت ۱۹۷۹ء۔

(۲) فیروز بیدری "پرت نامہ" مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں - ص ۳۹۰ - قدیم اردو جلد اول

(۳) احمد گجراتی "یوسف زلیخا" مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر-اشاعت ۱۹۸۳ء-ص ۲۷۰ و ص ۱۷۱

(۴) احمد گجراتی "یوسف زلیخا" مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر-اشاعت ۱۹۸۳ء-ص ۲۷۴

(۵) احمد گجراتی "یوسف زلیخا" مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر-اشاعت ۱۹۸۳ء-ص ۲۲۹

(۶) ملا وجہی "قطب مشتری" مرتبہ مولوی عبدالحق ص ۲۰-کراچی-۱۹۵۳ء

(۷) ملا وجہی "سب رس" مرتبہ شمیم انہونوی ص ۳۳-لکھنو

(۸) ملا وجہی "سب رس" مرتبہ مولوی عبدالحق، مقدمہ طبع اول انجمن ترقی اردو اورنگ آباد

(۹) ملا وجہی "سب رس" مرتبہ شمیم انہونوی ص ۳۴

(۱۰) ملا وجہی نے بھی سب رس میں یہی مضمون لکھا ہے-وجہی نے "سب رس" ۱۰۴۵ھ میں لکھی جب کہ غواصی نے سیف الملوک بدیع الجمال ۱۰۳۵ھ میں مکمل کرلی تھی-غالباً نہیں بلکہ یقیناً وجہی سے غواصی سے اخذ کیا ہے-میر حسن نے اپنی مثنوی سحرالبیان میں بدرِ منیر کے غم میں نہر کے بہتے ہوئے پانی کو ساکت بتایا ہے یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں غواصی کا ذکر کیا ہے اور مخفی مباد کہ میر حسن نے تذکرے کے بعد اپنی مثنوی ۱۱۹۹ھ میں مکمل کی۔

(۱۱) غواصی "سیف الملوک و بدیع الجمال" مرتبہ سعادت علی رضوی ص ۱۱۸ بار اول-سلسلہ یوسفیہ-

(۱۲) غواصی "سیف الملوک و بدیع الجمال" مرتبہ سعادت علی رضوی ص ۱۱۸ بار اول-سلسلہ یوسفیہ-

(۱۳) غواصی "سیف الملوک و بدیع الجمال" مرتبہ سعادت علی رضوی ص ۱۱۸ بار اول-سلسلہ یوسفیہ-ص ص ۱۹۶ و ۱۹۷

(۱۴) غواصی "سیف الملوک و بدیع الجمال" مرتبہ سعادت علی رضوی ص ۱۱۸ بار اول-سلسلہ یوسفیہ-ص ۱، ص ۳

(۱۹) The Journal of the Music Academy of Madras Vol. R. 1979.
article " Introduction to the Khayal " By N. Keshavram Iengar P.85.

(۲۰) احمد جنیدی "ماہ پیکر" مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر-۱۹۸۵ء-ص ۱۸۱

(۲۱) احمد جنیدی "ماہ پیکر" مرتبہ ڈاکٹر سیدہ جعفر-۱۹۸۵ء-ص ص ۲۰۸، ۲۰۹

(۲۲) ابن نشاطی "پھول بن" -مرتبہ عبدالقادر سروری ۱۳۷۵ھ-ص ۱۰۷

(۲۳) محمد قلی قطب شاہ "کلیات قلی قطب شاہ" مرتبہ پروفیسر سیدہ جعفر-بیورو ایڈیشن-ص ۲۱۲

(۲۳) غواصی "کلیات غواصی " مرتبہ پروفیسر محمد بن عمر مقدمہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور - شائع کردہ ادارۂ ادبیات اردو - حیدرآباد ۳۶

(۲۴) غواصی "کلیات غواصی " مرتبہ پروفیسر محمد بن عمر مقدمہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور - شائع کردہ ادارۂ ادبیات اردو - حیدرآباد ۳۶- اسی قصیدے میں یہ شعر بھی ملتا ہے۔

اس دکھن کے شاعراں میں تج شہنشاہ کے نزیک
ہے غواصی ہور وجہی شاعر حاضر جواب

(یہ مقالہ یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں ۱۲/ اپریل ۱۹۹۷ء کو منعقدہ سمینار میں پڑھا

سلسلہ ص ۱۹

○ ○ ○

جہاں تک صحت واقعات کا تعلق ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مورخین نے اپنی حد تک مخلصانہ کوشش کی ہے تاہم تاریخوں کی صراحت اور بعض دفعہ واقعات کی تفصیلات میں اس دور کے تقریباً سب ہی مورخین سے کچھ نہ کچھ لغزشیں ہوئی ہیں - اکثر قطب شاہی تاریخوں کا مطالعہ اس دور کے اسناد، کتبات اور دیگر تاریخی ماخذ کی روشنی میں کیا جائے تو ان جزوی تسامحات کی تصحیح ہو سکتی ہے - چناں چہ آج کا محقق جب فرشتہ، طباطبا، نظام الدین یا مستوفی سے دوسرے ماخذ کے ساتھ تقابلی طور پر استفادہ کرتا ہے تو وہ ان مورخین کی تسامحات پر تنقید بھی کرتا جاتا ہے - لیکن ان جزوی کوتاہیوں کی وجہ سے ان تاریخوں کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا - خاص طور پر اس لیے کہ یہ تاریخیں بہرحال ایک خاص دور کی معاصر تاریخیں ہیں اور اپنی ساری کوتاہیوں کے باوجود بھی وہ سارا سرمایہ ہے جو آج کے مورخ کو تاریخ نویسی کے لیے میسر ہے -

OO OOO OO

سلسلہ ص ۳۵

(۱۶) علی گڑھ تاریخ اردو ادب ص ۲۱۶

(۱۷) رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر اردو نثر کا آغاز و ارتقا ص ۱۳۶

(۱۸) شمس اللہ قادری، حکیم سید اردوئے قدیم لکھنؤ - ۱۹۳۰ء ص ۵۹

(۱۹) شمس اللہ قادری، حکیم سید میراں جی خدا نما ص ۴۸-۸۳

(۲۰) وضاحتی فہرست کتب خانہ آصفیہ جلد دوم - ص ۲۰۸

(یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں ۱۲ر اپریل ۱۹۹۷ء کو منعقدہ سمینار میں پڑھا گیا)

○ ○ ○

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس

شاہ میراں جی خدا نما

(دبستانِ گولکنڈہ کے ایک باکمال نثرنگار)

میراں جی خدا نما جن کا اصل نام سید میراں تھا گولکنڈے کے ایک باکمال صوفی بزرگ گزرے ہیں۔ دکن میں سید میراں نام کے بہت سے صوفیہ ہوئے ہیں مثلاً سید میراں حسینی حموی، سید میراں حسینی منزوی الجبلین، سید میراں خداوندبادی، سید میراں جی کاسب وغیرہ۔ ان میں سے بعض بزرگ صاحبِ تصنیف بھی تھے اس وجہ سے اکثر محققین کو ایک پر دوسرے کا التباس ہوتا ہے۔ "قدیم اردو" (۱) مولوی عبدالحق نے میراں جی خدا نما کے جو حالات بیان کیے وہ دراصل ایک اور سید میاں کاسب کے حالات ہیں جن کا مزار شاہ علی بنڈہ (حیدرآباد) میں ہے۔ "گلزارِ آصفیہ" اور "تذکرۂ اولیاء دکن" حصہ دوم میں دونوں بزرگوں کے حالات الگ الگ مرقوم ہیں۔

میراں جی خدا نما ۱۰۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان اور آباو اجداد کے بارے میں کوئی معلومات دست یاب نہیں ہوئیں البتہ تذکروں سے یہ ثابت ہے کہ وہ سید صحیح النسب تھے۔ غلام علی (۲) مولف "مشکوۃ النبوۃ" کی روایت کے مطابق میراں جی خدا نما قطب شاہی خاندان کے ساتویں فرماں روا سلطان محمد عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۲ھ) کے ہاں سررشتہ عالم روزگار میں ملازم تھے۔ بادشاہ کو ان پر بہت اعتماد تھا۔ اسی اعتماد کے سبب عبداللہ قطب شاہ نے انھیں سلطنت کے کسی کام کے سلسلے میں بادشاہِ بیجاپور کے دربار میں اپنا سفیر بناکر بھیجا۔ امورِ مفوضہ کی انجام دہی کے بعد میراں جی گولکنڈہ واپس ہوا چاہتے تھے کہ انھیں اطلاع ملی کہ بیجاپور کے مشہور صوفی شاہ امین الدین اعلیٰ ابن شاہ برہان الدین جانم اپنے حجرۂ خاص سے باہر تشریف لائے ہوئے ہیں اور ایک خلقتِ کثیر ان کی زیارت سے مشرف ہونے کے لیے جوق درجوق ان کی خانقاہ کی سمت گام زن ہے۔ میراں جی کے دل میں بھی ان کے دیدار کا اشتیاق پیدا ہوا اور وہ بھی سب کے ساتھ ان کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ اسی صحبت میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی بہ دولت میراں جی کو نہ صرف امین الدین اعلیٰ کی توجہ بلکہ بیعت و خلافت بھی حاصل ہو گئی۔ ہوا یوں کہ امین الدین اعلیٰ غلبہء حال سے فراغت پاکر حسبِ معمول سرنگوں بیٹھے تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک پتھر پر پڑی اور انھوں نے حاضرین سے پوچھا بتاؤ یہ پتھر کیا کہہ رہا ہے۔ اہلِ مجلس میں بہ شمول خلفاء و مریدین کے کسی کو جواب کا حوصلہ نہ ہوا۔ آپ نے تین مرتبہ اپنا سوال دہرایا اور ہر دفعہ مجلس پر سکوت طاری رہا تب میراں جی آگے بڑھے اور حضرت کا اذن پاکر عرض کیا کہ "خواجہ، من یہ پتھر کہہ رہا ہے کہ جو امین الدین تھا وہ خدا ہو گیا اور جو خدا تھا وہ امین الدین ہو گیا۔" اس دقیق جواب کو سن کر حضرت امین ان کا ہاتھ تھام کر اپنے حجرے میں لے گئے اور ان پر خاص توجہ فرمائی جس کی بہ دولت وہ ایک نظر میں فنافی الشیخ کے مرتبے کو پہنچ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے میراں جی کو باقاعدہ طور پر اپنے حلقہء ارادت میں داخل کیا اور کچھ عرصہ انھیں اپنے دامنِ تربیت میں رکھ کر انھیں خلافت عطا کی اور حیدرآباد جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حیدرآباد آکر میراں جی یکسوئی کے ساتھ تشنگانِ علم و معرفت اور طالبانِ ہدایت کی تربیت و اصلاح اور رشد و تلقین میں منہمک ہوگئے۔ ان کی ہدایت اور اصلاح کے کاموں سے بندگانِ خدا کو اس قدر فیض پہنچا کہ لوگ انھیں "خدا نما" کہنے لگے۔ ان کے مرید میراں یعقوب (۳) کی تالیف "شمائل الاتقیاء" کی روایت کے مطابق میراں جی نے ۱۰۷۴ھ میں بہ عمر ستر سال انتقال فرمایا۔ اورنگ زیب کے حملہ،

دکن کے وقت میراں جی خدانما حیات تھے۔ سید علی اصغر بلگرامی مصنف "مآثرِ دکن" ناقل ہیں کہ عالم گیر بادشاہ نے آپ سے پوچھا "کیا جنا نما ہیں۔" تو فرمایا "بابا اگر خدا نماند باشم پس خود نما باشم" (۴) خواجہ غلام حسین مؤلف "گلزارِ آصفیہ" نے بھی یہ روایت نقل کی ہے (۵)

بزرگانِ چشت کی روایات کے تسلسل میں میراں جی خدانما نے بھی تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کیا اور خانوادۂ گیسو در بزرگوں کی پیروی میں انھوں نے دکنی زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ دکنی میں انھوں نے منظوم اور نثری کارنامے اپنی یادگار چھوڑے۔ مشکوٰۃ، میراں جی کی تصانیف کے بارے میں رقم طراز ہے "اکثر رسالہ ہائے دکنی در معرفت سلوک انشا کرد" (۶) اس عبارت سے معلو ہے کہ میراں جی نے عوام الناس کو دین کی باتیں سمجھانے اور خاص اپنے مریدوں کو سلوک و معرفت کے اسرار و غوامض کی تعلیم دینے متعدد رسائل تصنیف کیے۔ ان رسالوں کا امتیازی وصف یہ تھا کہ یہ سب دکنی زبان میں تحریر کیے گئے تھے لیکن افسوس کہ ان کے صر نثری رسالوں، دو غزلوں اور تین مثنویوں کا سراغ ملا ہے۔ ان کی دیگر تصانیف جمور و مرورِ ایام کی نذر ہو گئی ہیں۔ ان کے نثری کارنام تفصیل یہ ہے:

(۱) شرحِ شرح تمہیدات عین القضاۃ (۲) رسالہ وجودیہ (۳) شرحِ مرغوب القلوب (۴) رسالہ قربیہ۔

شرح شرح تمہیدات عین القضاۃ: میراں جی کی یہ کتاب "تمہیدات عین القضاۃ" کا ترجمہ و تشریح ہے جو ابو الفضائل عبداا محمد میاں جی کی تصنیف ہے۔ یہ قاضی عین القضاۃ ہمدانی کے نام سے مشہور ہیں۔ قاضی ہمدانی امام غزالی کے بھائی احمد غزالی کے مرید اور مودود چشتی (جد اعلیٰ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی) کے فیض یافتہ تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے اسرارِ الٰہیہ کی تشریح میں حدود شرعی رکھا تھا جس کی وجہ سے علما نے ان کے قتل کا فتویٰ دیا اور وہ سلطان سنجر کے وزیر قوام الدین ابو القاسم درگزینی کے حکم سے قتل کر د۔ "تمہیدات عین القضاۃ" فارسی میں ہے اس کی ایک شرح حضرت گیسو دراز نے فارسی زبان میں لکھی میراں جی نے اسے دکنی پیرہن عط مولوی عبدالحق اپنے مقالے "شرح تمہید ہمدانی" میں لکھتے ہیں کہ میراں جی کی شرح "کسی شرح کا ترجمہ یا کوئی جدید شرح نہیں بلکہ تمہیدات کا دکنی ترجمہ ہے" (۷)۔ چوں کہ مولوی صاحب کو اصل تمہیدات اور خواجہ صاحب کی شرح کے نسخے دستیاب نہیں ہوئے لیے وہ اس بارے میں صحیح حکم نہیں لگا سکے کہ میراں جی کی تصنیف آیا اصل کتاب کا ترجمہ ہے یا اس کی شرح کا۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپن قدر تصنیف "میراں جی خدانما" (۸) میں اصل تمہیدات۔ شرح تمہید (گیسو دراز) اور شرح شرح تمہید (میراں جی خدانما) کی عبارتوں کا موازنہ کرکے ثابت کیا کہ میراں جی کی شرح شرح تمہیدات نہ اصل کتاب کا ترجمہ ہے اور نہ خواجہ صاحب کی شرح کا۔ میراں جی کے پیش اصل کتاب اور شرح گیسو دراز دونوں ہیں۔ وہ کبھی اصل متن کے قریب رہتے ہیں اور کبھی شرح کے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ عموماً و کے قریب رہتے ہیں مگر شرح سے وہ صرف مضامین اخذ کرتے ہیں زبان اور اندازِ بیان ان کا اپنا ہوتا ہے۔ متن کی بعض تشریحات ان فکری اپج ہیں۔ مسائل کی تفہیم کے لیے مثالیں دینے کا طریقہ ان کا اپنا وضع کردہ ہے۔ توضیحِ مطالب کے لیے انھوں نے درمیان میں کہیں دکنی شعر بھی نقل کیے ہیں۔ تمہیدات ہمدانی دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کی سرخی "تمہید اصل ----" کے الفاظ سے شروع ہوتی میراں جی کی شرح بھی دس ابواب پر مشتمل ہے لیکن اس میں ابواب کے عنوانات درج نہیں ہیں۔

میراں جی کی شرحِ شرح تمہیدات کے دو نسخے کتب خانہ نواب سالار جنگ (مخطوطہ نمبر ۱۳۲ و ۱۳۳) کی زینت ہیں جو علی الترتیب اور ۳۸۸ صفحات پر مشتمل ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اپنے محولہ بالا مضمون میں لکھا ہے کہ ان کے ہاں شرحِ شرح تمہیدات کے دو نسخے ان نسخوں کے علاوہ اس کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ روضتین گلبرگہ اور ایک نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں مخزونہ ہے۔ مولوا

ین ہاشمی مؤلف "دکن میں اردو" (۹) رقم طراز ہیں کہ میراں جی خدا نما کی اس تصنیف کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ اور ادارۂ ادبیات اردو
یدرآباد) میں موجود ہیں لیکن نہ تو انھوں نے ان نسخوں کی کوئی نشان دہی کی ہے اور نہ کسی اور محقق ہی نے ان کا ذکر کیا ہے۔ البتہ راقم
روف کی تحقیق کے مطابق کتب خانہ آصفیہ میں مخزونہ مخطوطہ ۳۴۸ جدید جس کا نام نصیر الدین ہاشمی نے وضاحتی فہرست میں "کتاب حسینی"
ایا ہے دراصل میراں جی کی شرح شرح تمہیدات کا مخطوطہ ہے۔ ایک سو اڑتیس صفحات پر مشتمل میراں جی کی شرح شرح تمہیدات کا یہ نسخہ
قص الآخر ہے۔ ہاشمی لکھتے ہیں: "یہ رسالہ مسائلِ تصوف میں ہے اور حضرت خواجہ بندہ نواز، حضرت جنید اور حضرت شاہ میراں جی شمس
شاق و عین القضاۃ و بایزید وغیرہ کے اقوال بھی ہیں۔ یہ رسالہ قدیم دکھنی زبان میں ہے۔ آخر سے ناقص ہے مصنف کے نام کا پتہ نہیں چلا۔
م کتاب ابتدائی صفحے کے بالائی حصے پر اس طرح لکھا ہے "ایں کتاب حسینی بہ تمہید معظم و مکرم بر و جہ پیر مرشد نام نہادہ" (۱۰) اس عبارت کو
ل کرنے میں ہاشمی نے "تمہید" سے پہلے "بہ" اضافہ کیا ہے۔ اسی طرح یہ مخطوطہ "تمہید ہمدانی" سے متعلق ہے۔ راقم نے جب "شرح شرح
ہیدات" کے نسخہ سالار جنگ (مخطوطہ ۱۳۳) کے متن کا اس سے تقابل کیا تو دونوں کو ایک پایا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتب خانہ آصفیہ
یہ مخطوطہ (۳۴۸) جدید "کتاب حسینی" نہیں بلکہ میراں جی کی شرحِ شرحِ تمہیدات کا ایک نسخہ ہے۔ ذیل میں کتب خانہ سالار جنگ کے
طوطے ۱۳۳ سے شرحِ شرحِ تمہیدات کی نثر کا نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

"اے معنی دیکھنے میں دیکھنا یعنی اس تن میں نورانی تن کوں دیکھنا۔ اے دوست اولوگاں جو دیکھتے تھے پیغمبر کوں اس تن سوں تو
بر صلی اللہ علیہ وسلم کو اے خطاب آیا خدائے تعالیٰ نے قولہ تعالیٰ و تراہم ینظرون وہم لا یبصرون خدا کہیا کہ اے محمد
لوکاں تن سوں تجے دیکھتے ہیں ولے تیرے نورانی تن سوں جیسا ہے ویسا نہیں دیکھتے۔ اے دوستاں ہو میں یوں کہتا ہوں مگر اے آپہ تے
ان نے سنے ہیں ہور دیکھتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین خدا کہیا تحقیق آیا ہے تمنا کنے کوں خدا نے محمد
ر قرآن ظاہر قرآن سو حدا کیاں باتاں ہور محمد کوں نور کہتے ہیں۔ قولہ تعالیٰ واتبعوا النور الذی انزل معہ خدا کہیا محمد جو کچ فرماتا ہے
تے کرو۔ بجے ہیں تمنا پر پند کہنے۔ اے دوست تے قرآن کے حرفاں کالے دیکھتے ہیں اجلے کاغذاں پر۔ اس کالے سطراں میں نور نا دیکھ سیں

سالۂ وجودیہ: امین الدین اعلیٰ نے جو میراں جی خدا نما کے مرشد و ہادی تھے اس نام سے دو رسالے نظم اور نثر میں تصنیف کیے۔ ان کی
قلید میں میراں جی نے بھی وجودیہ کے نام سے ایک رسالہ دکنی نثر میں تصنیف کیا جس میں امین الدین اعلیٰ اور برہان الدین جانم کے مخصوص
ہم تصوف کے بعض مسائل کی وضاحت کی ہے۔ میراں جی کے اس رسالے کا ایک مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد) میں مخزونہ ہے
مخطوطہ نمبر ۹۵۴) اس کے ترقیمے میں صراحت کے ساتھ درج ہے "رسالۂ وجودیہ من کلام سید میراں خدا نما خلیفہ شاہ امین الدین۔ دوسرا نسخہ
تب خانہ جامعہ عثمانیہ میں دکنی رسائل کی جلد الف ق ۶۱، ۲۲۷ میں ہے۔ اس مجموعے میں ایک شجرے کے علاوہ (۱۴) ناقص یا مکمل رسائل
یک ساتھ شیرازہ بند ہیں۔ ان میں چھٹویں نمبر پر میراں جی کا رسالہ وجودیہ ہے۔ تیسرا نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے (مخطوطہ نمبر ۱۸ تصوف)
س کے سرنامے پر غلطی سے "تصنیف پیر محمد چشتی" مرقوم کیا گیا ہے۔ چوتھا نسخہ جس کی نشان دہی کسی نے نہیں کی کتب خانہ آصفیہ ہی میں
ہے جس کا مخطوطہ نمبر ۳۳ تصوف شاملات ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے وضاحتی فہرست (۱۱) میں اس کو بیجاپور کے شاہ حبیب اللہ قادری
کے والد اور شاہ ولی اللہ قادری کے دادا پیر محمد چشتی کی تصنیف بتایا ہے اور اسے "پنج تن" سے موسوم کیا ہے۔ انھوں نے اس کا سنہ تصنیف
لغہ ۱۰۵۰ھ متعین کیا ہے۔ ترقیمے میں اس کا سنہ کتابت ۱۲۱۸ھ درج ہے۔ فی الحقیقت یہ رسالہ میراں جی خدا نما کا رسالہ وجودیہ ہے جو اس

مخطوطے میں تصوف کے ایک اور مجہول الاسم نثری رسالے کے ساتھ شیرازہ بند ہے۔ اس نسخے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اصل متن کے اِدھر اُدھر گرد حاشیے میں فارسی زبان سے دکنی متن کی بعض تشریحات مندرج ہیں۔ "بیان پنج تن" کی سرخی سے رسالے کا آغاز ہوتا ہے میراں جی کا رسالہ ختم ہوتے ہی "تمام شد" کے الفاظ کے بعد اسی سطر سے دوسرے رسالے کی کتابت شروع کی گئی ہے۔ اس مخطوطے میں میراں جی کا رسالہ وجودیہ ابتدائی چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ترقیمے میں کاتب کے نام اور مقام کتابت کی صراحت نہیں۔ صرف تاریخ درج ہے۔ تحریر فی التاریخ بست و ہشتم شہر ماہ ربیع الاول مبارک ۱۲۸۱ھ۔ آخر میں ایک مہر ہے جس میں "سید حسین علی قادری الجعفری شاہ معصوم سید عبداللطیف قادری الحسنی الحسینی ۱۲۸۱ھ" کے الفاظ قابل قرات ہیں۔

ذیل میں کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطے ۱۸ اشاطلات دکنی سے رسالہ وجودیہ کی نثر کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

"پیر کے مشاہدے میں خدا کوں اس واسطے سے کہتے ہیں کہ پیر کی بندگی کرنا۔ اے بندگی پیر کی نوی۔ اے بندگی خدا کچ۔ جوں باس کہ بدل پھول کا کرتا۔ اس بدل حضور ہور غیبت پیر کوں دیکھنا۔ اے راحت نیک بختاں جانتے ہیں۔ اے مشاہدہ نوی۔ اے مراقبہ نوی۔ اے معاینہ ہور مکاشفہ نوی۔ اے عین بہ عین ہے۔ سو اس بدل پیر کوں خدا کہتے ہیں۔ ہور پیر کا صورت دیکھنے میں بسراتا ہے بھی یاد آتا ہے۔ اس یاد بسر کے اوپر جانے اس یاد کوں پچھانتا ہے۔ اس یاد بسر پر دو سرپوش ہے۔ اس نور پر جوں رات آکر گیا ہور دیس آیا ہور بسرا کر گیا۔ بھی رات آیا۔ ولے عالم کو مثلاً آنا جانا ہے۔ یوں نور کوں قرار دائم قائم ہے۔ نور کوں فنا نہیں بلکہ ہر ساعت ہر وقت تازگی زیاست۔"

رسالہ قربیہ: خدا نما کے پیر و مرشد شاہ امین الدین نے قربیہ کے نام سے ایک عارفانہ مثنوی تصنیف کی تھی۔ خدا نما نے مرشد کے تتبع میں قربیہ کے نام سے ایک رسالہ نثر میں لکھا۔ ان کے اس رسالے کا ذکر مشکوۃ النبوۃ اور اس کے بعد بیش تر تذکروں میں ملتا ہے لیکن یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ میراں جی نے اس نام کا ایک رسالہ تحریر کیا تھا۔

شرح مرغوب القلوب: مرغوب القلوب فارسی زبان کی ایک مشہور اور مقبول مثنوی ہے جو کئی مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ عام طور پر اسے شمس الدین تبریزی کی تصنیف خیال کیا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر نذیر احمد (۱۳) نے اس کے سنہ تصنیف (۷۵۰ھ) کی داخلی شہادت سے اس خیال کی تردید کی ہے کیوں کہ شمس تبریز ۶۴۵ھ میں غائب ہوگئے تھے اور یہ اس کے بارہ سال بعد لکھی گئی ہے۔ بہر حال یہ مثنوی متصوفانہ مضامین کی بہ دولت سالکان طریقت میں بہت مقبول ہوئی۔ غالباً اس کی مقبولیت اور اس کے مضامین کی اہمیت کے پیش نظر ہی میراں جی خدا نما نے دکنی نثر میں اس مثنوی کی شرح لکھی۔ فارسی مثنوی کے دو قلمی نسخے ادارۂ ادبیات اردو میں محفوظ ہیں۔ یہ مثنوی دس ابواب پر مشتمل ہے جو یہ ہیں (۱) توبہ (۲) روح (۳) وضو (۴) ترک دنیا (۵) تجرید و تفرید (۶) معرفت (۷) عشق و محبت (۸) معشوق (۹) فنا و بقا (۱۰) سفر۔ میراں جی کے رسالے شرح مرغوب القلوب میں بھی اسی ترتیب سے دس باب ہیں۔ البتہ اس میں اصل رسالے سے قبل ایک تمہید بھی ہے جو خاصی طویل اور تفصیلی ہے جس میں قرآن و حدیث کے بیانات کی روشنی میں تصوف کے مسائل کی تشریح کی گئی ہے۔ میراں جی نے اس بات کا التزام بھی رکھا ہے کہ ہر باب کے آغاز میں منقولہ مسائل سے متعلق قرآنی آیات و احادیث درج کی جائیں اور ساتھ ہی ان کا ترجمہ اور مختصر تشریح بھی بیان کی جائیں۔ اصل مثنوی میں یہ اہتمام نہیں ہے۔

ایک عرصے تک شرح مرغوب القلوب کو میراں جی شمس العشاق کی تصنیف سمجھا گیا۔ مثلاً "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" (ص ۳۶) نیز مضمون "حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق" مشمولہ رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء میں مولوی عبدالحق نے شرح مرغوب القلوب کو میراں

جی شمس العشاق کی تصنیف قرار دیا ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" (۱۴) میں ڈاکٹر زور نے "اردو شہ پارے" (۱۵) میں ڈاکٹر نذیر احمد نے "علی گڑھ تاریخ ادب" (۱۶) میں اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے "اردو نثر کا آغاز و ارتقا" (۱۷) میں میراں جی شمس العشاق کو شرح مرغوب القلوب کا خالق بیان کیا ہے۔ سب سے پہلے حکیم شمس اللہ قادری نے مولوی عبد الحق کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے شرح مرغوب القلوب کو میراں جی خدا نما کی تصنیف قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں "ہمارے مخدوم مولانا عبد الحق صاحب نے اسے حضرت میراں جی شمس العشاق کی تصنیف بتایا ہے..... اس کا ایک نسخہ ہم نے ڈاکٹر محمد قاسم ماہر سمیات کے کتب خانہ میں دیکھا ہے اس کے خاتمے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت میراں جی خدا نما کی تصنیف ہے۔ یہ بزرگ عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے..... انھوں نے تمہیدات عین القضاۃ ہمدانی کی شرح بھی لکھی ہے" (۱۸) حکیم صاحب کے اس چشم دید ثبوت کے علاوہ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اس رسالے کی داخلی شہادت سے بھی اس کا خدا نما کی تصنیف ہونا ثابت کیا ہے۔ انھوں نے شرح شرح تمہیدات اور شرح مرغوب القلوب میں منقول قرآنی آیات اور احادیث کے ترجموں کی یکسانیت کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ یہ دونوں کتابیں ایک ہی مصنف کے قلم سے ہیں (۱۹)۔

شرح مرغوب القلوب کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے جس کا مخطوطہ نمبر ۶۱۲ حدیث ہے۔ دوسرا نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں مخزونہ اسی مجموعہ رسائل میں شیرازہ بند ہے جس کا حوالہ و ذکر گذشتہ اوراق میں آچکا ہے۔ تیسرا مخطوطہ جس کا تعارف حکیم شمس اللہ قادری نے کرایا ہے ڈاکٹر محمد قاسم کی ملک تھا۔ مولوی عبد الحق نے اپنے محولہ بالا مضمون "حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق" میں لکھا ہے کہ ان کے ہاں "شرح مرغوب القلوب" کے دو نسخے تھے۔ ان کے علاوہ اس رسالے کا ایک نامکمل نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے (مخطوطہ ۳۴ تصوف شاملات) اس کا ذکر اب تک کسی نے نہیں کیا ہے۔ اس مخطوطے میں دو رسائل مجلد ہیں جن میں پہلا میراں جی کا شرح مرغوب القلوب ہے اور دوسرا مجہول الاسم ہے۔ وضاحتی فہرست میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں "مصنف نامعلوم۔ تاریخ تصنیف قریب ۱۱۰۰ھ۔ مصنف کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئے" (۲۰)۔ راقم الحروف نے جب شرح مرغوب القلوب کے مخطوطے مخزونہ کتب خانہ آصفیہ (۶۱۲ حدیث) کا اس مخطوطے سے تقابل و موازنہ کیا تو پایا کہ زیر نظر مخطوطہ یعنی مخطوطہ ۳۴۔ تصوف شاملات۔ شرح مرغوب القلوب کا ناقص نسخہ ہے۔ اس میں ابتدائی تینتیس صفحات پر کاتب نے میراں جی رسالہ شرح مرغوب القلوب نقل کیا ہے اس کے بعد کسی اور رسالے کی نقل کی ہے جس کا نام ناقابل قراءت ہے۔ آصفیہ کے ان دونوں نسخوں میں متن کے بعض اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس مخطوطے کے آخر میں "سید محب حسین" کی مہر ہے جس میں ۱۲۸۵ھ درج ہے۔

ذیل میں میراں جی کے رسالے "شرح مرغوب القلوب" کی نثر کا نمونہ اس کے قلمی نسخے مخزونہ کتب خانہ آصفیہ (مخطوطہ نمبر ۶۱۲ حدیث) سے نقل کیا جاتا ہے۔

> "کل امر ذی بال لم یبدا بسم اللہ فھو ابتر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہے ہے کچ کام کرے گا کوئی خدا کا ناؤں نالے کر تو او کام پائمال ہوئے گا۔ الحمد للہ رب العلمین۔ سراہنا، نواز نا خدا کوں بھوت کہ او پالن ہارا ہے عالم کا۔ والعاقبۃ للمتقین اس کا معنی: ہور عالم میں خوبیاں دیوں گا کہیا اپس کے بچھانے سو لوگاں کوں۔ پرہیزگاراں کوں۔ والصلوۃ علی رسولہ محمد و آلہ اجمعین ہور درود اپنے رسول پر بھیجیا۔ ہور انوں کے فرزندان پر۔ ہور سب امت کے خاصاں پر بھیجیا۔ ہور پیغمبر کے فرزندان کو کہیا ہور سب امت کوں کہیا ہور محمد پر درود بھیجیا۔ سوائے معنی۔ ہور انو کے سب فرزندان پر اے تشریف بھیجیا۔ خدا کا صلت بھوت کرنا۔ بھوت سراہنا۔ بہت نوازنا۔ جنے پیدا کیا

ہے سب عالم کوں۔ ہور پالتا سب عالم کوں۔ ہور او ہمنا کوں عقل ہور دین دیا ہے دیدار دیا ہے۔"

اب تک کی تحقیق کے مطابق برہان الدین جانم کے رسالے "کلمتہ الحقائق" کو اردو کا اولین نثری کارنامہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ لیکن۔۔۔۔ کلمتہ الحقائق میں ٹوٹے پھوٹے انداز میں مخصوص صوفیانہ خیالات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں جابجا فارسی جملے ملتے ہیں اور آخر کے تین چار صفحات تو مکمل فارسی میں ہیں جس سے دکنی نثر کی "بے چارگی" اور عدم صلاحیتِ اظہار کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے مقابلے میں محمود خوش دہاں کے رسالے کی پوری عبارت دکنی میں ہے اور اس کی عبارت میں ربط و تسلسل پایا جاتا ہے۔ اسی طرح امین الدین اعلیٰ کی نثر خوش دہاں کی نثر سے ترقی یافتہ ہے۔ ان کے ہاں جملوں کی نحوی ساخت و ترتیب میں خوش دہاں سے زیادہ باقاعدگی پائی جاتی ہے لیکن ان سب کی زبان پر گجری اور بیجاپوری رنگ کی گہری چھاپ ہے۔ ان کے مقابلے میں میراں جی کی نثر میں زیادہ جماؤ ہے۔ ان کی عبارت کے ربط و تسلسل سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں اس کی تفصیلات ان کے ذہن میں آئینے کی طرح واضح اور صاف ہیں۔ پیش رو مصنفین کے بالمقابل ان کی نثر کے مزاج میں "ہندویت" نہیں ہے بلکہ یہ فارسی اسلوب اور فارسی رنگ و آہنگ سے زیادہ اثر پذیر ہے۔ انھوں نے فارسی اور عربی زبانوں کے خزائن سے استفادہ کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی نثر قوتِ اظہار کے علاوہ زورِ بیان اور وضاحتِ مطالب میں بھی اپنے پیش رؤوں سے آگے بڑھ گئی ہے۔

میراں جی کے معاصرین میں شاہ معظم بیجاپوری نے جو امین الدین اعلیٰ اور قادر لنگا کو تال کے فیض یافتہ تھے ایک مختصر نثری رسالہ شرح شکار نامہ لکھا لیکن اس کی نثر میں کوئی جدت نہیں ملتی۔ میراں جی کے ہم عصر گولکنڈے کے نثرنگاروں میں وجہی کی سب رس کو دکنی ادب کا مایہ ناز شاہ کار اور اردو نثر کا پہلا ادبی کارنامہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ سب رس کے ذریعے وجہی نے فارسی کے گہرے اثرات قبول کرتے ہوئے قدیم اردو نثر کو ایک ہی جست میں کئی ارتقائی منزلیں سر کرا دیں۔ زبان و بیان اور قوتِ اظہار کے معاملے میں میراں جی کی نثر وجہی کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن ان کی شرحِ شرحِ تمہیدات کو دو اعتبارات سے "سب رس" پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ضخامت میں سب رس سے بڑھ کر ہے۔ دوسرے یہ کہ "کلمتہ الحقائق" سے "سب رس" تک نثر شاعری کی بانہوں میں بانہیں ڈالے چلتی نظر آتی ہے۔ ہر جگہ نظم اور نثر کو بہ قول وجہی "ہلاگلا" کر بولنے کی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ مقفیٰ و مسجع عبارت۔ جملوں کا شاعرانہ آہنگ۔ تشبیہات اور خیالات نثر اور شاعری میں بہت کم فرق باقی چھوڑتے ہیں۔ میراں جی کی شرحِ شرحِ تمہیدات میں نثر کو نثر بنانے اور اسے شاعرانہ عناصر سے دور رکھنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ ان ہی کے زیرِ اثر یہ خصوصیت ان کے شاگردوں میراں یعقوب کی "شمائل الاتقیا" میں زیادہ نکھری ہوئی ملتی ہے۔ دونوں کے ہاں نثر سادہ بھی ہے اور روزمرہ کی زبانوں سے قریب بھی۔ ان کے یہاں نثر کے علاحدہ وجود اور اس کی ضرورت و اہمیت کا شعور نظر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میراں جی خدا نما اردو کے ان قدیم نثرنگاروں میں ہیں جن کی نگارشِ قلم نے اردو میں نثرنگاری کا معیار متعین کیا اور انشا کے نئے اسلوب اور اظہار کے نئے پیرائے سے دکنی اردو کو روشناس اور مالامال کیا۔ سینکڑوں صفحات پر مشتمل ان کا نثری کارنامہ "شرحِ شرحِ تمہیدات" جہاں ان کی اپنی قدرتِ بیان کا مظہر ہے وہیں دکنی نثر میں قوتِ اظہار کی اس وسعت اور اضافے کی نشان دہی بھی کرتا ہے جو اس کی بہ دولت پیدا ہوئی۔ میراں جی کی اس تصنیف سے قبل اردو نثر کی کل متاع محض چند مختصر رسائل تھے۔ ان کی یہ کتاب ان میں ایک گراں بہا اضافہ ثابت ہوئی۔ میراں جی کی نثرنگاری کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ اپنی بات کی وضاحت کے لیے مثالوں سے مدد لیتے ہیں۔ ان کی نثر اپنے دور کی عام فہم اور سلیس نثر ہے۔ تصوف اور معرفت کے دقیق مسائل کو انھوں نے اپنے دور کی سادہ اور آسان زبان میں پیش

نے کی کوشش کی ہے۔ ان کی زبان کی عام خصوصیات وہی ہیں جو دکنی سے مخصوص ہیں۔ اردو نثر کے ارتقا میں میراں جی خدا نما کی نثری سیف سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے نثری شہہ پارے ایک طرف ان کے سلسلہ طریقت کے بزرگوں کی قائم کردہ تصنیف و ب کی روایت کا تحفظ کرتے ہیں اور دوسری طرف اس روایت میں توسیع بھی کرتے ہیں اور اپنے طاقت و راثرات سے بعد والوں کے لیے ہمہ فیض ثابت ہوتے ہیں۔

میراں جی کی تصانیف میں دو کتابیں یعنی شرح شرح تمہیدات عین القضاۃ اور شرح مرغوب القلوب فارسی کتابوں کا ترجمہ ہیں۔ انھیں کے اولین نثری تراجم قرار دیا جاسکتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت میراں جی کا بنیادی مقصد تخلیقِ ادب نہیں تھا۔ وہ شریعت و طریقت اور ف و اخلاق کی ان تعلیمات کو جو فارسی تصانیف میں تھیں اپنے مریدین اور طالبانِ ہدایت تک دکنی زبان میں پہنچانا چاہتے تھے تاکہ وہ بہ) بجھ سکیں۔ لیکن ان کے تراجم نے اردو نثر کے ارتقا میں اہم حصہ لیا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں ترجمے زبان اور بیان کے اسالیب اور سانچوں نیر و تشکیل کرتے ہیں۔ ان کے ذریعے ایک زبان اور تہذیب کا علمی و فکری ورثہ اور طرزِ احساس دوسری زبان اور تہذیب کے ذہن و علم و تجربے اور طرزِ احساس کو متاثر کرتا ہے۔ گیارھویں صدی ہجری میں میراں جی نے فارسی تصانیف کو اردو کے قالب میں ڈھال کر ی محاوروں، روزمرہ لہجے اور آہنگ کو اردو میں اس طرح سمویا کہ یہ اردو کی زینت ہوگئے۔ ان کے ترجموں میں ان کے عصر کی عام روش برخلاف فارسی اور عربی الفاظ کا استعمال بہ کثرت ہوا ہے۔ جس سے نہ صرف زبان کی قدرتِ بیان اور ابلاغ کی قوت میں ترقی و نشو و نما ہوا پیرایہ اظہار میں بھی جاذبیت پیدا ہوئی۔ ان ترجموں نے قدیم اردو نثر کی ایک ایسی شکل بنانے میں واضح کام کیا جس پر چلنا آنے والوں لیے آسان ہوگیا۔

لہ جات و اشاریہ کتب:

عبد الحق، مولوی مقالہ شرح تمہیدات ہمدانی قدیم اردو ۱۹۶۱، ص ۲۰۸
غلام علی، مشکوۃ النبوۃ (قلمی) مخطوطات (۱۹۳) ص ۵۳۲ - مخزونہ کتب خانہ آصفیہ - حیدر آباد
میراں یعقوب، شمائل الاتقیا (قلمی) مخطوطہ نمبر (۱۳۵) تصوف ص ۳ - مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ - حیدر آباد
علی اصغر بلگرامی، سید مآثر دکن حیدر آباد - ۱۹۲۴، ص ۴۱
خواجہ غلام حسین گلزار آصفیہ ص ۵۳۴
مشکوۃ النبوۃ (قلمی) مخطوطہ آصفیہ ص ۵۳۴
قدیم اردو، ص ۳۱۰
حفیظ قتیل، ڈاکٹر میراں جی خدا نما - حیدر آباد ۱۹۶۹، ص ۵۱-۵۰
نصیر الدین ہاشمی، مولوی دکن میں اردو - لکھنؤ ۱۹۶۳، ص ۱۹۲
نصیر الدین ہاشمی، مولوی وضاحتی فہرست کتب خانہ آصفیہ - جلد دوم ص ۲۱۹-۲۱۵
نصیر الدین ہاشمی، مولوی وضاحتی فہرست کتب خانہ آصفیہ - جلد دوم ص ۱۰۰-۱۹۹
مشکوۃ النبوۃ (قلمی) ص ۵۳۴
نذیر احمد، ڈاکٹر علی گڑھ تاریخ اردو ادب علی گڑھ ۱۹۶۲، ص ۲۱۶
دکن میں اردو ص ۵۰
زور، سید محی الدین قادری، ڈاکٹر اردو شہ پارے حیدر آباد - ۱۹۲۹، ص ۲۱۹

(باقی ص ۲۸ پہ)

اشفاق حسین (مرحوم)

گولکنڈہ

(ریڈیائی تمثیل)

۱۔ یہ بالا حصار ہے ۔ گولکنڈے کی اس بلندی سے قطب شاہی بادشاہوں نے آندھرا دیس میں ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی ۔

۲۔ ایسا تمدن جس میں ترکستان اور ایران کے شان و شکوہ کے ساتھ تلنگانے کی سندرتا اور کوملتا بھی ہے ۔

۱۔ بلند اور عظیم الشان محلوں کے پاس ہی مندر اور مسجد کی تعمیر اس تمدن کی حقیقی آئینہ دار ہے ۔

۲۔ تلنگانہ کے نظر فریب مناظر ، دل کش تالاب اور حسین پہاڑیاں اور ان کے دامن میں دور دور تک پھیلے ہوئے دھان کے ہرے بھرے کھیت ۔

۱۔ اور کھیتوں میں گونجنے والے دل کش گیت ۔

۲۔ ان سب نے قطب شاہوں کے دل میں رس اور مٹھاس بھر دی اور انھوں نے ایسے تمدن کی داغ بیل ڈالی جس میں ایرانی نغمے کا سحر بھی تھا اور دکنی گیتوں کا رس بھی ۔

۱۔ گولکنڈے کی سلطنت کو ختم ہوئے ڈھائی سو سال ہو چکے مگر آج بھی ان کے تمدن کے نقوش سرزمینِ دکن پر ثبت ہیں اور اس زمانے کی یاد دلاتے ہیں جب یہ سرزمین آپس کے میل جول کا گہوارہ بن رہی تھی ۔

۲۔ گولکنڈے کا بانی سلطنت قلی قطب شاہ ترکستان کے حکمران خاندان سے تھا ، بہمنی سلطنت کے آخری دور میں وہ دکن آیا اور قابلیت اور ذہانت سے گولکنڈے کا صوبہ دار بنا اور جب بہمنی سلطنت ختم ہوئی تو اس نے گولکنڈے میں قطب شاہی سلطنت کی بنیاد ر

.....

۱۔ اس طرح ترکستانی اور بہمنی تمدن کا ملاپ تلنگانے کے تمدن سے ہوا اور قطب شاہی تمدن پر مقامی رنگ اس درجہ غالب آگیا کہ نصف صدی کے بعد گولکنڈہ ایک آندھرا راجدھانی بن گیا ۔

۱۔ اور قطب شاہی بادشاہ آندھرا کے راجہ معلوم ہونے لگے ۔ اہلِ تلنگانہ گولکنڈے کو اپنی سلطنت سمجھنے لگے ۔

۲۔ قطب شاہوں نے تلنگانے کو اپنا گھر بنالیا اور آندھرا کی معاشرت کو اپنا کر ترکستانی وضع قطع چھوڑ مقامی لباس اور طور طریق اختیار کیے ۔

۱۔ انھوں نے تلگو کی سرپرستی ہی نہیں کی بلکہ خود تلگو سیکھی اور اس میں شاعری کی ۔

۲۔ تلگو کے علاوہ صدیوں کے میل جول سے دکن میں جو نئی زبان دکنی بن رہی تھی قطب شاہوں نے اس کی ترقی میں دل کھول کر حصہ لیا ۔

نہ صرف شاعروں کی سرپرستی کی اور نثرنگاروں کو نوازا بلکہ خود شاعری کی اور ایک لازوال سرمایہ چھوڑ گئے ۔

گولکنڈے کی علم نوازی کے ساتھ اس کی دولت و ثروت کی شہرت دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گئی اور گولکنڈے کے ہیرے ن دنیا میں مشہور ہوگئے ۔ دنیا کے مشہور ہیرے کوہ نور کو گولکنڈے ہی کی چٹانوں نے اگلا تھا ۔

ایشیا اور یورپ کے دور دراز ملکوں سے تجارتی کارواں اور سیاح گولکنڈہ آنے لگے ۔

اور گولکنڈے کا شمار قرونِ وسطیٰ کے متمدن ترین ملکوں میں ہونے لگا ۔

گولکنڈہ کی تاریخ کا زرین دور ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے ۔

اپنے بھائی جمشید قطب شاہ کے عہد میں ابراہیم کو وجیانگر کے راجہ رام راج کے یہاں پناہ لینی پڑی ۔

راجہ رام راج نے ابراہیم کی غیر معمولی آؤ بھگت کی ابراہیم سات سال تک وجیانگر میں رہا ۔

، ہند کی اس عظیم الشان سلطنت میں رہ کر ابراہیم نے تمدنی بصیرت حاصل کی اور وہیں گولکنڈے کی سلطنت کو ایسی بنیادوں پر قائم نے کا عزم کیا جن میں ایران اور تلنگانہ کا حسین ملاپ ہو ۔

جمشید قطب شاہ کے بعد ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی تلنگانے کا ایک مسرت خیز واقعہ تھا ۔

وجیانگر سے چل کر جب ابراہیم کا کارواں گولکنڈے کے دیواروں کے قریب پہنچا تو گولکنڈے کا بچہ بچہ شادمانی میں ڈوبا ہوا تھا ۔

ابراہیم کے استقبال کے لیے گولکنڈے کے بوڑھے جوان بھی قلعے کے باہر نکل آئے اور شاہانہ جشن کا اہتمام کیا گیا ۔ (پس منظر میں کی آوازوں کے ساتھ باجوں اور تاشوں کی آوازیں)

جگ دیو راؤ اور اس کے ساتھیوں نے قلعے کی تمام کنجیاں ابراہیم قطب شاہ کے سامنے رکھ دیں اور قلعے میں داخل ہونے کی واست کی ۔

ان ہی جاں بازوں کی مدد سے ابراہیم کو گولکنڈے کا تخت نصیب ہوا ۔

ابراہیم کی تخت نشینی گولکنڈے کی تاریخ کا بہت ہی مبارک دن تھا ۔

دیور کنڈے اور وجیانگر کے قیام نے اسے تلگو زبان اور تلگو ادب سے روشناس کرایا ۔ ابراہیم نے صرف تلگو سیکھی بلکہ اس پر حاصل کیا ۔

تلگو ادب کے آسمان پر اس وقت جو تارے جھلملاتے تھے وہ ابراہیم کی توجہ اور سرپرستی سے تابناک ہوگئے ۔

اسی دور میں مشہور تلگو شاعر گنگا دھر نے تلنگانے کی حسین فضاؤں میں اپنے نغمے بکھیرے ۔ ابراہیم قطب شاہ کی سرپرستی میں اس ، تلگو ادب کی مشہور کتاب " تپتی سمورن ماکھیانم " لکھی ۔

تلگو ادب اور آندھرا کلچر سے بادشاہ کی اس دل چسپی کو دیکھ کر قطب شاہی امرا نے بھی تلگو ادب کو نوازا .....

پٹن چرو کے صوبہ دار امیر خاں کے دربار میں تلگو ادب کے ایک اور مشہور شاعر " ہنگر کنترتی تلنگا آریہ " کی قدرو منزلت ہوئی اور انے مشہور کتاب " یایاتی چرترا " اپنی یادگار چھوڑی ۔

ابراہیم قطب شاہ کے فیض سے جہاں علم و ادب سرشار ہوئے اس کے حسن نظر نے آندھرا دیس کے فطری مناظر کو حسین تر بنا دیا دلی کا تالاب ، ابراہیم باغ ، باغ گلشن ، ابراہیم پٹن اور حسین ساگر اس کے ذوق تعمیر کی یادگار ہیں ۔

۲۔ اور سب سے بڑھ کر موسیٰ ندی کا پہلا پل ہے ۔ دو محبت بھرے دلوں کی دھڑکن جس کی تعمیر کا باعث ہوئی اور دو بچھڑے دلوں کو ملانے کے لیے موسیٰ ندی کے کنارے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے مل گئے ۔

۱۔ ابراہیم کے سے صاحب کردار باپ نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد قلی کی سچی محبت کی خاطر شاہی کی ساری مصلحت پسندیوں کو قربان کر

۲۔ شہزادہ قلی اور بھاگ متی کے فسانہ عشق کی یہ اولین یادگار...... پرانا پل..... اپنی تعمیر کے لیے شہزادے کے جذبہ عشق ابراہیم کی بے مثل بصیرت کا رہین منت ہے ۔

۱۔ شہزادہ قلی اور بھاگ متی کی داستان عشق ۔ (چار پانچ لڑکیوں کے قہقہے)

شہزادہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اخلاص خاں ۔

اخلاص جہاں پناہ کے حکم کی تعمیل ۔ صاحب عالم

شہزادہ ہم تنہائی چاہتے ہیں ۔ ان سے کہو کہ یہاں سے چلی جائیں کہہ دو کہ یہ قہقہے ہمارا دل لبھانے کی بجائے ہمیں کچو کے رہے ہیں ۔

اخلاص عرب ، ایران ، ارمینیا ، ترکی اور گجرات کی یہ حسین دوشیزائیں جہاں پناہ نے یہاں اس لیے رکھی ہیں کہ شہزادے بہلے..... جہاں پناہ کا خیال ہے کہ صاحب عالم کا بھاگ متی سے لگاؤ جوانی کی ایک ترنگ ہے ۔

شہزادہ جوانی کی ایک ترنگ

شہزادہ جوانی کی ترنگ..... جو آگ ہمارے جسم و جان میں لگی ہوئی ہے اسے کون جان سکتا ہے ۔ یہ کم زور بند اس طوفان روک سکیں گے ۔ اخلاص خاں ہمارا جسم پھنکا جا رہا ہے ۔

اخلاص ایک رقاصہ کی خاطر یہ بے چینی صاحب عالم !

شہزادہ اخلاص خاں..... تم ہمارے پرانے رفیق ہو ۔ ہمارے غم کے شریک نہ بن سکو تو کچو کے تو نہ دو

اخلاص صاحب عالم ... دنیا کی حسین سی حسین دوشیزہ آج شہزادے کے نظر کرم کی منتظر ہے ۔

شہزادہ پر اب ہمارے پاس رکھا ہی کیا ہے ۔ ایک دل تھا سو وہ نذر ہو گیا ۔

اخلاص خوب سوچ لیجیے صاحب عالم ۔ جہاں پناہ کا خیال کیجیے ۔ اس عظیم سلطنت کا خیال کیجیے جس کی عنان ایک دن آ سنبھالنی ہے ۔

شہزادہ محبت کی اس راہ پر ہم اتنا آگے بڑھ چکے ہیں کہ لوٹنا ممکن نہیں ۔ اب کوئی آہنی دیوار بھی سر راہ ہو تو ہم اس ۔ لینے میں دریغ نہ کریں ۔ محبت کی خاطر ہم بڑی سی بڑی قربانی دینے کا عزم کر چکے ہیں ۔ آخری بار سن لو اخلاص خاں ہم سلطنت کو ٹھکر ہیں مگر بھاگ متی کو نہیں ۔

اخلاص صاحب عالم !

شہزادہ ہم جو عہد کر چکے ہیں اسے نبھانا ہمارا فرض ہے ۔ چاہے اس میں جان کی بازی ہی کیوں نہ لگا دینی پڑے ۔

اخلاص صاحب عالم !

شہزادہ (کھوئے ہوئے انداز میں) کسے خبر تھی کہ محبت کی ٹھنڈی چھاؤں ریگستان کی تپتی دھوپ بن جائے گی ۔ کون جانتا تھا کہ سکھ اور شانتی کی چند گھڑیوں کے بعد مسلسل اضطراب ہماری زندگی سے لپٹ جائے گا ۔ محبت کی وہ مسرت آگیں اولین گھڑی اب بھی ہمارے تصور کے گوشے میں امانت کے طور پر محفوظ ہے ۔ (پس منظر میں رقص) جب کسی کے جھومتے اور لہراتے قدم اپنی فن کارانہ حرکتوں سے ہمیں ایک نئی زندگی کی سوغات دے رہے تھے ۔ (رقص نمایاں) ..... زندگی کے یہ عزیز ترین لمحے ہمیں اب بھی یاد ہیں ۔ جب پہلی بار ہم نے اسے رقص کرتے دیکھا ۔ ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی رقص کر رہی ہے ۔ کائنات رقص کر رہی ہے اور اس وقت ہمارے دل کا ہر تار لرز اٹھا اور اس مدھرے سنگیت سے ایک نشہ سا چھا گیا ۔ پھر جب یہ لمحے بیت گئے تو زمانے نے ساری بے دردیاں ہم پر صرف کر دیں ۔ ہم اس محل کی چار دیواری بند کر دیے گئے اور ہمارا دل بہلانے کے یہ انوکھے سامان کیے گئے ۔ خداوندا!

اخلاص ہوش میں آئیے صاحب عالم

شہزادہ خداوندا یہ اضطراب ، یہ مسلسل اضطراب کبھی کم بھی ہوگا ۔

اخلاص صاحب عالم!

شہزدہ یہ شمعیں گل کر دو اخلاص خاں ۔ بجھا دو یہ شمعیں ۔ یہ روشنی ہمارے خیالات کی راہ میں تاریکی بن کر لہرا رہی ہے .... اور .. اور تم .... اور تم اب جا سکتے ہو .... ہمیں بالکلیہ تخلیہ چاہیے ۔ (پس منظر میں طوفان اور بارش) پر ٹھہرو ..... باہر یہ آوازیں کیسی ہیں؟

اخلاص صاحب عالم .... کئی گھنٹوں سے بارش اور طوفان نے فضاؤں کو گھیر رکھا ہے اور سنا ہے موسیٰ ندی میں بڑے زور کا سیلاب آیا ہے ۔

شہزادہ کیا کہہ رہے ہو اخلاص خاں .... اخلاص خاں یہ شمع اٹھاؤ اور جلد بالا خانہ پر چلو ..... جلدی کرو (تیز ساز) ..... ارے چچلم کا تو کہیں پتہ ہی نہیں کوئی چراغ تک نہیں ٹمٹا رہا ہے ۔ اف یہ بارش اور یہ طوفان .... اب کیا ہوگا اخلاص خاں .... اگر بھاگ متی کو کچھ ہو جائے تو ہم زندہ نہیں رہ سکیں گے .... زندہ نہیں رہ سکیں گے ..... محبت ہمیں آزما رہی ہے ۔ لو ہم اس آزمائش میں کود پڑتے ہیں ۔

اخلاص صاحب عالم ۔

شہزادہ تم ہٹ جاؤ اخلاص خاں .... ہماری اس سے بڑھ کر کوئی توہین نہیں ہو سکتی ..... لو ..... خدا حافظ ..... کسی کو خبر نہ ہو کسی کو خبر نہ ہو ۔

اخلاص صاحب عالم .... رکیے صاحب عالم ..... صاحب عالم .....

دوچار آوازیں اس بارش اور طوفان میں کون ہاتھی پر چلا آ رہا ہے ۔

۲۔ ارے شہزادہ قلی ..... اور یہ گھوڑے پر پیچھے کون ہے ۔

۱۔ یہ تو اخلاص خاں ہیں ۔

۲۔ ہاتھی تو ہوا کی طرح گزر گیا ۔

(سب چیخ کر) حضور شہزادے شہزادہ عالم ۔

سلحدار کیا ہوا پہرہ دار ۔

سب مل کر — شہزادہ محمد قلی ہاتھی پر سوار جھلپم کی طرف ہوا کی رفتار سے جا رہے ہیں

سلحدار — دوڑو گھوڑوں پر شہزادے کا تعاقب کرو (گھوڑوں) کی ٹاپوں کی آواز)..... جلدی کرو کہیں شہزادہ سیلاب کی زد میں نہ آجائے۔

اخلاص — صاحب عالم..... صاحب عالم..... خدا کے لیے آگے نہ بڑھیے۔

شہزادہ — تم پھر پہنچ گئے اخلاص خاں..... دیکھتے ہو موسیٰ ندی کس بے رحمی سے امنڈ آئی ہے۔ ارے یہ ہاتھی تو پانی میں کودنے ہچکچا رہا ہے۔

اخلاص — خدا کے لیے صاحب عالم..... ہم پر رحم کیجیے۔

شہزادہ — کچھ کہنے کا یہ وقت نہیں ہے اخلاص خاں۔ لاؤ مجھے اپنا گھوڑا دے دو۔ جلدی کرو۔ کہیں میں دیر سے نہ پہنچوں..... یہ گھوڑوں پر کون آرہے ہیں۔

اخلاص — پہرہ دار حضور۔

شہزادہ — ان سے کہو کہ یہیں رک جائیں..... میرا پیچھا نہ کریں۔

اخلاص — خدا کے لیے شہزادے..... صاحب عالم!

شہزادہ — (دور سے) تم لوگ جاؤ اخلاص خاں ... ہم تو سیلاب میں کود پڑے۔

صاحب عالم . صاحب عالم! (تیز ساز)

۱۔ اس طرح شہزادہ محمد قلی جان کی بازی لگا کر بھاگ متی تک پہنچ گیا۔

۲۔ جب دوسرے دن یہ خبر ابراہیم قطب شاہ کو ملی تو اس نے شہزادے کے اس بے پناہ جذبے کی قدر کر تے ہوئے موسیٰ ندی پر ایک پل کی تعمیر کا حکم دیا۔

۱۔ کچھ عرصہ بعد شہزادے نے بالا حصار کی بلندیوں سے دیکھا کہ موسیٰ ندی کے سینے پر اس کی محبت کا نقش امٹ ہو گیا ہے۔

۲۔ اس جذبہ محبت نے نہ صرف پرانے پل کی تعمیر کی بلکہ شہر حیدرآباد کی تخلیق بھی اسی باعث ہوئی (چار مینار ہمارکمانیں، بادشاہی عاشور خانہ اور دارالشفا محمد قلی ہی کی یادگاریں ہیں۔)

۱۔ ابراہیم قطب شاہ کے بعد جب شہزادہ محمد قلی کے سر پر چتر شاہی رکھا گیا تو گولکنڈے کے گلی کوچے جشن مسر . کے ترانوں سے گونج اٹھے۔

۲۔ ابراہیم قطب شاہ نے گولکنڈے کے چمن میں ملے جلے تمدن کے جو پھول کھلائے تھے وہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں مہک اٹھے اور ساری فضائیں ان کی خوش بو سے عطر بیز ہو گئیں۔

۱۔ ایران و تاتار کے لباس اب دکنی رنگ میں رنگ چکے تھے۔

۲۔ محمد قلی قطب شاہ نے اس رنگ کو اس درجہ چمکایا کہ وہ بالکل دکنی معلوم ہونے لگے۔

۱۔ اس نے تاتاری لباس کی بجائے دکنی لباس سے اپنے بدن کو زینت دی۔ سر پر سمور کی کلاہ کی بجائے دکنی وضع کی پگڑی، پوستین اور باماتی قبا کے بدلے ململ کا جامہ اور شبنم کا نیمہ پہنا۔ ہاتھوں میں جڑاو کڑے ڈالے اور ڈاڑھی منڈھائی جو بالکل تلنگانہ کی طرز

ما-

اور سب سے بڑھ کر محمد قلی نے اس زبان کو ترقی دی ۔ جو صدیوں کے میل جول سے دکن میں بن رہی تھی ۔

یہ دکنی زبان تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کی آئینہ دار تھی اور جو گولکنڈے کے تمدن میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے ۔

محمد قلی نے نہ صرف اس زبان کی سرپرستی کی بجائے فارسی کی بلکہ دکنی کو اپنا لیا اور اس زبان میں شعرا کے ایسے پیکر تراشے جن کا حسن اب تک ماند نہیں پڑ سکا ۔

اس نے دکنی میں پچاس ہزار شعر کہے اور فارسی اور تلگو میں بھی طبع آزمائی کی ۔

اس کی شاعری کا موضوع اس کی زندگی کی طرح رنگا رنگ رہا ہے ۔ اس کا تخیل سرزمینِ تلنگانہ کی طرح شاداب اور اس کا اسلوب سادہ، سلیس اور رنگین ہے اور جگہ جگہ اس نے اپنی شاعری میں تلگو کے لفظ استعمال کیے ہیں ۔

تلنگانہ کے ہرے بھرے کھیتوں، نظر فریب تالابوں اور حسین پہاڑیوں نے اس فکر کی آبیاری کی ۔

اس کی شاعری پر شکوہ محلوں میں بند نہ رہ سکی ۔ وہ محل کے شان و شکوہ کو چھوڑ کر عوام کے ساتھ کھلے میدانوں میں نکل آتا ہے ۔ جہاں وہ عوام کے رنج اور غم اور خوشی اور مسرت میں ان کا ساتھی بن جاتا ہے ۔

اس کے یہاں عیدوں، تہواروں، کھیل کود تماشوں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے عام رسم و رواج پر بیسیوں نظمیں ہیں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعرِ اعظم کا دل عوام کے ساتھ دھڑکتا رہتا تھا اور اس نے عوام کی زندگی کو اپنی زندگی میں سمو لیا تھا ۔ (پس منظر میں شور اور باجے)

۲۔ محمد قلی کی بصیرت نے یہ جان لیا تھا کہ یہاں ایک ملا جلا تمدن ہی زندہ اور پائندہ رہ سکتا ہے اور اس نے آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے اس تمدن کو معراج پر پہنچا دیا تھا ۔

۲۔ وہ عید اور بقر عید کے علاوہ نوروز، بسنت اور مرگ کی تقریبوں کے جشن بھی مناتا اور ان موقعوں پر وہ سب کے ساتھ مل کر خوشی کے نعرے لگاتا ۔

۱۔ نوروز پر وہ کہتا ہے ۔ " نورانی نوروز کے جلوؤں کے ساتھ آیا اور سارا چمن جگہ جگہ ایسی دکھائی دے رہی ہیں جیسے حسینوں کی انکھوں میں تل ۔

۲۔ پھولوں کے گچھوں میں کالے کالے بھونرے ایسے نظر آتے ہیں ۔ جیسے کالی کوئلیں ہری ہری ڈالیوں میں اڑتی پھر رہی ہوں ۔

۱۔ ایک بار عید اور نوروز مل کر آئے تو محمد قلی نے کہا ۔

۲۔ نوروز اور یوم عید آپس میں بھائی بہن کا صیغہ پڑھ کر ایک ہو گئے ہیں اور عید کی دہری خوشیاں اپنے ساتھ لائے ہیں ۔

۱۔ سخت گرمیوں کے بعد جب بارش شروع ہونے لگتی ہے ۔ تو زندگی کی ناخوش گواری خوش گواری میں بدل جاتی ہے ۔ محمد قلی نے بارش کے آغاز کو بڑی اہمیت دی کیوں کہ دکن میں بارش کا موسم ہی بہار کا موسم ہے ۔

۲۔ جس روز مرگ لگتا وہ بڑی دھوم دھام سے مجلس آرائی کرتا ۔

۱۔ شاہی محلوں میں زمردی رنگ کی مسندیں بچھائی جاتیں اور ہر طرف خوشی و مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے ۔

۲۔ عوام بادشاہ کو اپنا شریکِ مسرت دیکھ کر پھولوں نہ سماتے۔
۱۔ محمد قلی کا جذبہ تخلیق اس جشن کی مسرت میں شعر کے نئے نئے پیکر تراشتا۔
۲۔ برسات کی آمد پر وہ کہتا ہے۔
۱۔ بارش کا موسم آیا اور کلیوں کا راج شروع ہو گیا کیوں کہ اب ہری ہری ڈالیوں کے سروں پر پھولوں کے تاج پہنائے جائیں گے۔
۲۔ زمین نے سر پر جو ہری پگڑی باندھ لی اور آنکھ میں کانچ کے رنگ کا سرمہ لگا لیا۔
۱۔ ہرے بھرے جنگل دیکھ کر چاروں طرف سے مور کوک رہے ہیں۔
۲۔ ہرے جنگل میں لال لال پھول نہیں ہیں بلکہ زمرد کی لگنوں میں شبنمی تیل کی شمعیں جل رہی ہیں۔
۱۔ جب بسنت کا موسم آتا اور گولکنڈے کے حسین سبزہ زاروں میں بسنتی پھول کھل اٹھتے تو محمد قلی کی زندگی بھی جھوم اٹھتی۔
۲۔ گولکنڈے کے وسیع میدان ایک پر کیف منظر میں بدل جاتے جہاں محمد قلی سب کے ساتھ جشن میں شرکت کرتا.... (لطیف قہقہے

.....

۱۔ اور بسنت کے سوانگ میں محمد قلی کے دھڑکتے دل کی آوازیں شعر کے روپ میں اس طرح گونج اٹھتیں.... (کورس)

شاہ کے گھر میں سعادت کی خبر لایا بسنت — تین پتلی کے چمن میں پھول پھل لایا بسنت
سبز سارے نور تن کسوت کیے ہیں رنگ رنگ — سرو کی مینا میں بھی شبنم کی مے بایا بسنت
سارے پھولوں کی، بسنت کا پھول، مہمانی کیا — گل پیالہ بن کے خدمت کے لیے آیا بسنت
مہر کے رنگ میں بسنت کا رنگ جھلکتا نور سا — اور چندر کے حوض میں چندن سی مہکایا بنست
موتی اور یاقوت کے گھر گھر میں انباراں لگے — ہر گدا کو مثلِ خاقاں کر کے دکھلایا بسنت
شکر ایزد کر معانی رات دن آنند سے — تیرے مندر میں خوشی آنند سے آیا بسنت

۱۔ قلعہ گولکنڈہ کے پاس نئے قلعوں میں جو پر فضا تالاب اور وسیع مرغ زار ہے وہاں اب بھی بسنت پر ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔
۲۔ اس طرح بسنت کے شیدائی، محمد قلی کے جشن کی یادگار اب بھی منائی جاتی ہے۔
۱۔ محمد قلی نے شادی بیاہ کی رسموں پر بھی کئی نظمیں لکھیں ہیں۔ مہندی، سانچق، جلوہ یہ سب اس کی شاعری کا موضوع بنے ہیں۔
۲۔ جلوے کی نظم تو اب بھی دکن میں شادیوں کے موقع پر گائی جاتی ہے۔
۱۔ عوام کی زندگی میں گھل مل جانے کی یہ مثال تاریخ میں شاید ہی کہیں مل سکے۔
۲۔ محمد قلی کا عہد گولکنڈے کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔
۲۔ جہاں میر مومن اور مرزا محمد امین جیسے صاحبِ کمال اور صاحب تدبر اس کی دربار کی زینت بنے تو اسیر راؤ اور دھرما راؤ جیسے د
سورما اس کی سلطنت کی ترقی کا سنگ بنیاد ثابت ہوئے۔
۱۔ میر مومن نے گولکنڈے کی تمدنی قدروں میں اضافہ کیا تو اسیر راؤ سلطنت کے استحکام اور ملک کے امن اور امان کا باعث بنا۔
۲۔ کچھ یہی بات تھی کہ جب محمد قلی کے بعد اس کے بھتیجے اور داماد محمد قطب شاہ نے عنانِ سلطنت سنبھالی تو ملک میں ہر طرف خو
حالی اور امن امان کا دور دورہ تھا۔

۱۔ اور محمد قلی نے جو تمدنی ورثہ چھوڑا تھا۔ محمد قطب شاہ نے اسے سینے سے لگائے رکھا اور اس دور میں دکن کا گوشہ گوشہ علم و اد کی جوت سے جگمگا اٹھا۔ محمد قطب شاہ کو تعمیری ذوق بھی ورثہ میں ملا تھا۔ مکہ مسجد اسی کی یادگار ہے۔

۲۔ گولکنڈہ میں تالاب نما کٹورا حوض کے کنارے جو اب بھی عہدِ ماضی کی یادگار کے طور پر باقی ہے۔ شاعروں، ادیبوں اور ا پردازوں کے جمگھٹے رہتے اور حوض کے آس پاس کے سبزہ زار علم و ادب کے چرچوں سے گونج اٹھتے۔

۱۔ اس حوض کے کنارے ہر بڑے شاعر کا گروہ الگ الگ اپنی محفل جماتا۔

۲۔ اس طرح کٹورا حوض کے گوشے کئی شعری حلقوں میں بٹ گئے۔ کٹورا حوض کا مغربی حلقہ ملا وجہی کے نام سے منسوب تھا۔

۱۔ وجہی محمد قلی کے دربار کا ملک الشعرا اور سب رس اور قطب مشتری کا مصنف، دکنی کا سب سے بلند پایہ شاعر ہے۔

۲۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اس کا ستارہ عروج پر تھا۔ محمد قطب شاہ کے دور میں غواصی نے اس کی جگہ لے لی اور کٹورا حوض کا جنوبی گروہ غواصی کے نام سے منسوب تھا۔

۱۔ محمد قطب شاہ وجہی کی بڑی قدر کرتا تھا۔

۲۔ ان دو استاد شاعروں کے علاوہ طبعی، قطبی اور ابنِ نشاطی گولکنڈہ کی محفلِ ادب کی زینت تھے۔

۱۔ محمد قطب شاہ کے ذوقِ شعر کے باعث ہر مہینہ بالاحصار میں محفلِ شعر و سخن منعقد ہوتی جس میں بادشاہ خود شرکت کرتا اور صرف دادِ سخن سے نوازتا بلکہ خلعتوں سے بھی سرفراز کرتا۔

۲۔ اس محفلِ شعر میں عرش آشیانی محمد قلی قطب شاہ کا کلام بھی پڑھا جاتا۔ (پس منظر میں مجمع کا شور)

۱۔ سب شاعر اور درباری امرا اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے ہیں۔ ملا وجہی دیر سے پہنچے۔ انھیں سامنے کی نشست پر جگہ نہ مل سکی یوں بھی دربار کے ملک الشعرا ملا غواصی سے ان کی چشمک ہے۔

۲۔ لیجیے بادشاہ کی آمد آمد کا اعلان ہو رہا ہے۔ سب حاضرین کھڑے ہو گئے۔

چوب دار — جہاں پناہ، شاہِ دوراں، سلطانِ اقلیمِ سخن، سلطان محمد قطب شاہ۔

غواصی — جہاں پناہ..... سب شاعر حاضر ہیں اجازت ہو تو.....

سلطان — آپ ادھر یہاں آئیے۔ اتنی دور کیوں بیٹھے ہیں آپ۔

وجہی — بندہ نوازی۔

سلطان — ہاں ملا غواصی مشاعرہ شروع ہو، پر حضرت عرش آشیانی کا کلام پڑھنے کی سعادت کون حاصل کرے گا۔

غواصی — حضرت اجازت ہو تو بندہ.....

سلطان — نہیں بیاض ملا وجہی کو دی جائے۔ اس کا حق انھیں کو پہنچتا ہے۔

وجہی — بندہ اس سرفرازی پر نازاں ہے۔

غواصی — حضرت اجازت ہو تو گولکنڈے کے نوجوان شاعر طبعی اپنا کلام عرض کریں۔

سلطان — اجازت ہے۔

ہوا مجنوں برہ سے سدھ گنوا میں　　اتھا دانا سو دیوانا ہوا میں
تجھے دل میں چھپایا ہوں اپس کے　　خرابے میں لگایا ہوں دیوا میں
اچایا ہوں ترے غم کے پہاڑاں　　عجب ہے نیں لبسنا پھٹ کر موا میں
صنم تیرے بدل ہوکر برہمن　　گلے میں اپنے بھایا جھنوا میں
منجے کیا دیکھتی ازماں گل اندام　　پرانا ہوں نہیں عاشق نوا میں

خواصی　　اب ایک اور نوخیز شاعر ابن نشاطی اپنا کلام پیش کریں گے۔ انھوں نے برہ کے درد کو لفظوں میں سمو کر غم ایک دل گداز منظر کھینچا ہے۔ عرض کرتے ہیں۔

ابن نشاطی

گلے چھند ہوکر نیناں ابلنے　　لگیا جیوں شمع ہوکر جیو جلنے
دھواں آہاں کا سر پر ہوے دل چھائے　　گرم بھاپاں سوں ہوٹاں پر چھلے آئے
کلی منے ہوا دل تنگ و ناشاد　　ہوا ٹکڑے گریباں پھول کی ناد
برہ کی آگ سوں دل جل ہوا راک　　صبوری کا جو تھا دامن ہوا چاک

خواصی　　اجازت ہو تو اب فدوی کچھ عرض کرے۔

سلطان　　اجازت ہے۔

خواصی　　عرض کرتا ہے، جہاں پناہ۔ (یہ شعر تحت اللفظ پڑھے جائیں)

عشق میں جاناں کے ثابت اچھ توں اے جاں غم نہ کھا　　عہد و پیماں رکھ درست اپنا یہاں ہاں غم نہ کہ
درد منداں کا سو درماں عین اس کا لطف ہے　　ہوئے گا یک بارگی مشکل سب آساں غم نہ کہ
رات اندھاری ہوئے کہ ہرگز تو پشیمانی نہ کھینچ　　دن بی آوے کا نکل روشن ہو تاباں غم نہ کہ
یو دنیا دو دیس ہے مہماں اسے کچ ٹھیر نتیں　　دل نہ باند اس سات توں خوش حال رہ یاں غم نہ کہ
لا ابالی اچھ سدا ہور ذوق کر غواصیا　　ہے ترے سر پر قوی بارہ اماماں غم نہ کہ

سلطان　　"لگن اس یو کشتی ہو چلنے لگیا" اچھا کہا ہے کیوں ملا وجہی۔

وجہی　　جہاں پناہ نے بجا ارشاد فرمایا۔ اجازت ہو تو بندہ بھی کچھ عرض کرے۔

سلطان　　ضرور ضرور۔

وجہی

طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آمل رے پیا　　تج بن منجے جینا بہت ہوتا ہے مشکل رے پیا
کھانا برہ کیتی ہوں میں پانی انجھو پیتی ہوں میں　　تج سے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا
ہردم توں یاد آتا منجے اب عیش نین بھاتا منجے　　برہا یوں ستاتا منجے تج باج تل تل رے پیا
تو جیو مرا میں سو دل کے سات رہتا کیوں نہ مل　　دن رات میں میں ایک تل نیں تج سے غافل رے پیا

سلطان — واہ واہ لفظ لفظ میں درد بھر دیا۔ "تج سے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا" کیا خوب کہا ہے۔

وجہی — جہاں پناہ کی سرفرازی ہے۔

غواصی — اب حاضرین جہاں پناہ کا کلام سننے کی عزت اور قدردی پڑھنے کی سعادت حاصل کرے گا۔

آوازیں — ارشاد، ارشاد۔

چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا — کہ اس بن نئیں ہمن یک تل قرار
صبوری کو نہیں ہے ٹھار دل میں — صبوری کیوں کرے ہوکر تمھارا
میا کرنا کرے معشوق اپے ہو — گھونا کیا کرے عاشق بچارا
بسنت کھیلے ہمن اور ساجنا یوں — کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

وجہی — جہاں پناہ نے دل کی دھڑکنوں کو ایسا حسین جامہ پہنایا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

سلطان — آج کی محفل سے ہم بہت محظوظ ہوئے۔ سب شاعروں کو ہماری طرف سے خلعت عطا ہو۔ اب ہم حضرت عرش آشیانیؒ کلام سننے سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں.... حاضرین باادب ہو جائیں۔

پیا باج پیالہ پیا جائے نا — پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں — کہیا جائے اَمّا کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے — کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا
قطب شہہ نہ دے مجھ دوانے کو پند — دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

۱۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔

۲۔ گولکنڈے کی ان محفلوں نے جن شاعروں کو جنم دیا وہ زمانے کو بہت کچھ دے کر رخصت ہوئے۔

۱۔ محمد قلی قطب شاہ کی ہمہ گیر شعری صلاحیتیں اپنی تمام رنگا رنگیوں کے ساتھ اب بھی اس کے دیوان میں محفوظ ہیں۔

۲۔ وجہی کی سب رس اور قطب مشتری، غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال، ابن نشاطی کی پھول بن اور طبعی کی بہرام و گل اندام اب بھی دکنی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

۱۔ گولکنڈے نے شاعروں اور ادیبوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ ان کو بڑے بڑے عہدے دیے۔

۲۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جب بیجاپور سے گولکنڈے کا قدیم شاعر ملک خوشنود سفیر بن کر آیا تو گولکنڈے سے ملا غواصی کو سفیر بناکر بیجاپور بھیجا گیا۔

۱۔ محمد قطب شاہ کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جہاں علم و فن کی سرپرستی ہوئی۔ یہ دور گولکنڈہ کی تاریخ کا اختتامی باب بھی ثابت ہوا۔

۲۔ احمد نگر اور بیجاپور کے بعد اب مغل حکمراں گولکنڈے کو اپنانے کی فکر میں تھے۔

۱۔ اس دور میں حیات بخش بیگم کی شخصیت گولکنڈے کی تمدنی زندگی پر چھائی ہوئی تھی۔

۲۔ یہ خاتون محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی، محمد قطب شاہ کی بیوی اور عبداللہ قطب شاہ کی ماں تھی۔

۱۔ حیات آباد اور پانچویں محرم کا لنگر اب بھی اس کی یادگار کے طور پر باقی ہیں ۔
۲۔ پانچویں محرم کا لنگر حیدر آباد کے گاؤں گاؤں میں اب تک منایا جاتا تھا ۔

۱۔ ایک مست ہاتھی جس پر عبداللہ قطب شاہ سوار تھا جنگلوں میں بھاگ نکلا اور کئی دن تک عبداللہ قطب شاہ کی کوئی خبر نہ ملی حیات بخشی بیگم نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی بارگاہ میں منت مانی ۔
۲۔ (خاتون) اے امام شہید مظلوم ، آپ کی اس لونڈی کے جگر کا ٹکڑا خیرو خوبی سے لوٹ آئے تو دولت خانہ شاہی میں داخل ہونے سے پہلے چالیس من سونے کی زنجیر بنواؤں گی اور مست ہاتھی کے پاؤں میں لنگر کر کے آپ کے غلام سلطان عبداللہ کی کر میں باندھ کر قلعہ گولکنڈہ سے حسینی علم تک پاپیادہ لے جاؤں گی ۔"
۱۔ عبداللہ قطب شاہ جب صحیح سلامت لوٹ آیا تو حیات بخش بیگم نے یہ منت پوری کی ۔
۲۔ حیدر آباد میں یہ لنگر صدیوں تک جاری رہا ۔ عوام بھی ہر سال محرم میں یہ لنگر مناتے رہے ۔
۱۔ عبداللہ قطب شاہ شاعری کے علاوہ فنِ موسیقی کا بھی دل دادہ تھا ۔
۲۔ اس کے دربار میں لاہور ، آگرہ ، بیجاپور اور احمد نگر سے اہلِ کمال اور موسیقار آتے اور اپنے کمالِ فن کی داد پاتے ۔
۱۔ قلعے کے باہر پیمامتی پیٹھ اب بھی عبداللہ قطب شاہ کے ذوقِ سرود کی یاد دلاتا ہے ۔
۲۔ جب وہ امورِ سلطنت سے تھک جاتا تو پیمامتی پیٹھ میں رقص و سرود کی مجلسیں منعقد کرتا ۔
۱۔ پیمامتی پیٹھ کے محل کی تعمیر اس طرح ہوئی تھی کہ وہاں کے مدھر سنگیت کی آوازیں بالاحصار میں سنی جاسکتی تھیں ۔
۲۔ کبھی عبداللہ قطب شاہ پیمامتی پیٹھ نہ جاسکتا تو بالاحصار کی بلندیوں سے پیمامتی پیٹھ کے مطربوں کے نغمے سنتا ۔
۱۔ رات کے پچھلے پہر جب گولکنڈے کے عظیم الشان ایوان خاموشیوں میں ڈوب جاتے تو فنِ موسیقی کا رسیا عبداللہ قطب شاہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے رات بھر جاگ کر صبح کر دیتا اور پھر پیمامتی پیٹھ کے محل کے نغمے اس کے کانوں میں گونج رہتے ۔
۲۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مغل کئی بار گولکنڈے کی دیواروں تک چڑھ آئے اور اسے ہر بار صلح کر لینی پڑتی ۔
۱۔ گولکنڈے کے آخری بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ کا دور ان ہی ہنگاموں سے پُر رہا ۔
۲۔ تاناشاہ کے عہد میں تلنگانہ کے امیروں کو بڑے بڑے عہدے ملے ۔ تاناشاہ تلنگانے ہی کی سرزمین سے اٹھا تھا اور فطری طور پر اسے اس ماحول سے بڑی محبت تھی ۔
۱۔ ابوالحسن کے دور میں مادنا اور اکنا گولکنڈے کی سیاست پر چھائے رہے ۔
۲۔ اور ان دونوں وفاداروں نے آخر تک ابوالحسن کا ساتھ دیا اور اس کی خاطر اپنی جان کی بھی پروا نہ کی ۔
۱۔ آخر ۱۶۸۶ء میں مغل حملہ آور سیلاب کی طرح گولکنڈہ کی دیواروں سے ٹکرا گئے ۔
۲۔ مگر یہ دیواریں اتنی مضبوط ثابت ہوئیں کہ مغلوں کو آٹھ مہینے تک محاصرہ کرنا پڑا ۔ پھر بھی ابوالحسن اور اس کے جاں بازوں کے عزم و ہمت میں ذرا بھی لغزش نہ ہوئی ۔
۱۔ اس محاصرے سے تنگ آکر مغلوں نے گولکنڈے کے ایک سپہ سالار سے ساز باز کر لی اور اس نے رات کے پچھلے پہر مغل فوجوں کے

چور دروازے کی راہ قلعہ میں داخل کر لیا۔

مگر ابوالحسن کے جاں نثار اس پر بھی تلواریں سونت کر سامنے آگئے۔ ابوالحسن کے باہمت سپہ سالار عبدالرزاق لاری نے تو ت اور وفاداری کی مثال قائم کر دی۔

وہ چند جاں بازوں کے ساتھ اس مغل سیلاب میں کود پڑا جو قلعے کی سمت بڑھا آرہا تھا۔

اس کی اس بہادری اور وفاداری کو زمانہ اب تک سراہتا ہے۔

گولکنڈے پر پوری طرح مغلوں کا قبضہ ہوگیا مگر مغل شہنشاہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ اگر گولکنڈے میں عبدالرزاق لاری سا ایک سپہ سالار ہوتا تو شاید گولکنڈہ کبھی فتح نہ ہوتا۔

تقریباً دو سو سال تک ایک ملے جلے تمدن کو پروان چڑھا کر گولکنڈے کی حکومت ختم ہوگئی۔

مگر اس نے جو تمدنی ورثہ چھوڑا ہے وہ اب بھی دکن کے لیے سرمایہ امتیاز ہے۔

اور آنے والی نسلیں اس ورثے کو اپنے سینوں سے لگائے رکھیں گی۔

00 000 00

سب رس کتاب گھر کی چند کتابیں

تاریخ دکن کے چند گوشے	(تاریخ)	ڈاکٹر زیب حیدر	80=00
ارمغان ایران و ہند	(ادبیات)	ڈاکٹر زیب حیدر	80=00
رہبر طریقت	(تصوف)	حضرت محمد عمر حسینی قادری	15=00
بہار میں اردو طنز و ظرافت	(تذکرہ)	سلطان آزاد	50=00
صاحبزادہ میکش	(شخص اور شاعر)	سید جلیل الدین	40=00
غالب کے خطوط	(منظوم)	ہاشم عظیم آبادی	25=00
ماوراء	(ڈرامے)	قدیر زماں	100=00
مبادیات صحافت		ڈاکٹر جاوید حیات	60=00
ید بیضا	(شاعری)	برق موسوی	100=00
کلیات مسعود	(مجموعہ کلام)	الحاج مسعود صدیقی	25=00
نقوش حیات	(شاعری)	ریاست علی تاج	80=00
شام ڈھلے سویرا	(شاعری)	مصطفیٰ شہاب	65=00
فضائل سید المرسلین	(اسلامیات)	سید غوث محی الدین قادری	25=00
انتخاب کلام شہبہ زور کاشمیری		(مرتبہ) فرید پربتی	125=00
سوندھی مٹی کے بت	(خاکے)	اقبال متین	97=00
اردو کلاسک کہانیاں (جلد دوم)		(مرتبہ) وحید انور	125=00

ملنے کا پتہ

"سب رس کتاب گھر" ایوان اردو پنجہ گٹہ روڈ۔ حیدرآباد500082 (اے۔پی)

فون 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۵۹ مئی ۱۹۹۷ء شمارہ : ۵

ناشر : ادارہ ادبیات اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا ۔

کمپیوٹر کتابت : جے ۔ جے ۔ کمپیوٹرس مہدی پٹنم ۔ حیدر آباد ۔

سکینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے او ۔ ایس ۔ گرافکس نلان گوڑہ میں طبع کرواکے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا

اس شمارے میں

○ ○ ○

پہلی بات

محمود ایاز کی وفات سے ایک بے مثال اور مثالی شخصیت اس دنیا سے اٹھ گئی وہ ایک ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی ہونے کے اعلیٰ درجے کے ادب شناس تھے۔ روزنامہ سالار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے جہاں سیاست میں انھوں نے ایک تاریخ ساز رول ادا کیا بہ حیثیت مدیر سوغات اردو زبان و ادب کی گراں قدر اور ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی۔ زندگی میں، سیاست میں اور ادب میں ں نے ہمیشہ اعلیٰ اقدار کی پاس داری کی اور سچے رہ نما کا فرض انجام دیا۔ انھوں نے قلم کو وقار اور تحریر کو اعتبار بخشا۔ زندگی میں بھی ب میں بھی انھوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ نام و نمود سے بے نیاز رہے۔ انھیں نہ ستائش کی تمنا تھی اور نہ صلے کی پروا۔

اردو ادب میں جدید رجحانات کو پروان چڑھانے میں سوغات کا اہم حصہ رہا ہے۔ محمود ایاز نے سوغات کے دورِ اول میں ترجمے ریعے مغربی شعروادب کی اہم تخلیقات کے علاوہ جدید تنقیدی اور فلسفیانہ افکار کو اردو میں روشناس کیا جس کے اثرات نئے اور ئے لکھنے والوں کی تحریروں میں جھلکتے ہیں۔ بہت سے نئے لکھنے والے سوغات کے ذریعے متعارف ہوئے۔ سوغات کسی تحریک (ترقی ں یا جدیدیت) کا علم بردار نہیں تھا بلکہ وہ خود ایک تحریک تھی۔ محمود ایاز نے اپنی تحریروں کے ذریعے ادب کی ماہیت اور مقصد ز کرتے ہوئے جہاں ادیب کے انحراف کی آزادی کی حمایت کی وہیں حیات اور کائنات سے اس کے تعلق اور اپنے عہد اور معاشرے شتہ قائم رکھنے کی ذمہ داری پر بھی زور دیا۔

محمود ایاز اردو ادب کی موجودہ صورتِ حال سے غیر مطمئن تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ قاری سے ادیب کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ سے نئے ادیب اور شاعر زبان اور فن سے نابلد ہیں اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ ماضی کی اعلیٰ ادبی روایات سے بے بہرہ ہیں ان کے وہ نمونے ہی نہیں ہیں جن سے وہ کچھ سیکھ سکیں۔ چناں چہ انھوں نے سوغات کے تیسرے دور میں عہدِ گذشتہ کے صاحبِ طرز ں اور شاعروں کی بازیافت کا سلسلہ شروع کیا۔

محمود ایاز ایک شستہ ذوق کے بلند پایہ نقاد تھے۔ انھوں نے اپنے اداریوں کے ذریعے ادیبوں اور قارئین کی رہ نمائی کی۔ وہ ایک شاعر تھے۔ لیکن انھوں نے شعر گوئی کی طرف پوری توجہ نہ دی اپنے مجموعے کلام کی اشاعت سے بھی بے نیاز رہے۔ ان کا جو کلام ۔ ادبی رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو پوری طرح بہ روئے کار لاتے تو ، میراجی اور اخترالایمان کے بعد آنے والے شعرا کی صف میں ایک ممتاز مقام پیدا کر لیتے۔

محمود ایاز کی وفات سے اردو ادب کی تاریخ کا ایک ورق تمام ہوا جس میں ان کا نام اور کام محفوظ رہیں گے اور ان کی تابناک یں ہمیشہ اجالے بکھیرتی رہیں گی۔

مغنی تبسم

OO OOO OO

محمود ایاز

الفاظ اور شاعری

الفاظ جامد صورتیں نہیں ہیں۔ یہ جیتی جاگتی روحیں ہیں۔ ہر لفظ کے معنی کا دل دھڑکتا ہے لیکن یہ معنی قائم بالذات نہیں ہوتے "خبرے رسید امشب کہ نگار خواہی آمد" میں "خبر" کے معنی ہیں "اطلاع"۔ "آں را کہ خبر شد، خبرش باز نیامد" میں خبر کے معنی ہیں "عرفان" خبر سے آگے نظر کا تجربہ۔ یہ مفہوم کسی لغت میں نہیں ملتا لیکن ایک مخصوص نظام فکر اور اس کے تلازمات کا پس منظر "خبر" کو "اطلاع" سے "عرفان" بنا دیتا ہے۔ یہ لفظ کا زندہ استعمال ہے۔ یہ لفظ کا آواگون ہے، اس تبدیلی کے ساتھ کہ اصلی آواگون میں روح وہی رہتی ہے اور جسم بدل جاتا ہے لیکن اس آواگون میں شیشہ وہی رہتا ہے البتہ اندرون شیشہ مئے بدل جاتی ہے۔ الفاظ کے معانی بڑی حد تک معین ہوتے ہوئے بھی پھیلتے بڑھتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ ان کا تغیر و تبدل بدلتے ہوئے تلازمات کے ساتھ ہوتا رہتا ہے اور یہ تلازمات نئے عہد، نئے مسائل، نئے ذہن اور نئی فکر کے ساتھ پیدا ہوتے اور بدلتے ہیں۔ ایزرا پاؤنڈ جب یہ کہتے ہیں کہ ادیب اور شاعر اپنی نسل اور عہد کے ذہن و ضمیر کا مقیاس ہوتا ہے تو بڑی حد تک اس کا مفہوم یہی ہے کیوں کہ بہرحال ادیب اور شاعر اپنا اظہار الفاظ ہی کے ذریعے کرتے ہیں۔

شاعری میں ہر نیا عہد، ہر نئی تحریک، اپنے ذخیرۂ الفاظ، اپنی علامات اور اپنے استعاروں سے پہچانی جاتی ہے۔ ہر دور کا ایک اپنا IDIOM ہوتا ہے۔ فکر اور طرزِ احساس کی ہر تبدیلی لازمی طور پر نئے تلازمات اور متعلقات کے ساتھ الفاظ کی کیمیا گری کرتی ہے۔ ہر اسلوب اور طرز بیان، علامات اور استعارات کا ہر نظام مخصوص ذہنی ضروریات اور فکری پس منظر کے ساتھ وجود میں آتا ہے اور ان کے ساتھ اپنے اظہار کے سارے امکانات صرف کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ان الفاظ اور علامات کا استعمال CLICHES میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سچے سے سچا تجربہ ان الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر رسمی اور بے جان ہو جاتا ہے۔ اظہار کا معانی سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ ایسے دور میں زندہ الفاظ اور زندہ علامتوں کی تلاش دراصل ایک معنویت کی تلاش بن جاتی ہے۔ گذشتہ پون ایک صدی کی ادبی تاریخ میں ---- وہ فرانسیسی سمبالسٹ ہوں یا جوائس۔ دونوں کے ہاں یہی عمل ہوا ہے۔ الفاظ کا صوتی استعمال لفظ کو "آزاد" کرانے کی مہم، آزاد تلازم خیال، ایک نئی زبان کی تخلیق یہ سب کوششیں اسی بنیادی تلاش کا اظہار تھیں۔

ازمنہ قدیم کا عقیدہ تھا کہ الفاظ اور اشیا کا باہمی تعلق سحر اور جادو کے ذریعے تشکیل پاتا ہے۔ الفاظ کے ساتھ سحر و افسوں کا تصور ابتدائی لکھنے والوں کے ہاں کافی عام رہا ہے۔ اشیا کی درجہ بندی کرنے کے معنی تھی اشیا کو نام دینا اور کسی شئے کا نام ساحری میں اس شے کی روح ہوتا ہے۔ نام جاننے کا مطلب تھا اس شے کی روح پر مکمل قابو اور اس کی تسخیر۔ کوئی انسانی یا فوق الانسانی چیز الفاظ کی قوت کی دسترس سے بالا نہیں اور زبان خود حقیقت کے مکمل نظام کی روح کا پرتو اور اس کا نقش ثانی تھی۔ قرآن مجید میں آدمؑ کو اسماء کا علم سکھائے جانے کا جو ذکر آیا ہے اس کا بھی یہی مفہوم نکلتا ہے کہ اشیا کے نام جاننا اشیا کو مسخر کرنا ہے۔ آدمؑ نے کائنات کی چیزوں کے نام سنا دیے (فلما انباھم باسماءھم سورہ بقرع ۳) اور خلیفۃ الارض کا درجہ پایا۔

سحر و ساحری اور مذہب کے ان استعارات پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ بنیادی طور پر ایک بات دونوں جگہ کارفرما ہے۔ یعنی اشیا اور الفاظ کے درمیان ایک "تیسری چیز" ہوتی ہے جو ان دونوں کو منسلک کرتی ہے۔ اسے سحر و افسوں کہیے، وعلم آدم الاسماء سے تعبیر

یا استعمال کرنے والے کا خیال اور فکر کہیے۔ بات وہی نکلتی ہے کہ الفاظ بہ ذاتِ خود کوئی معنی نہیں رکھتے۔ الفاظ اور اشیا کا ربط "خیال"
Thou(سے قائم ہوتا ہے۔ الفاظ سے اشیا اور احساسات کی نشان دہی الفاظ استعمال کرنے والے کے خیال اور ذہن کے ذریعے ہوتی ہے

جدید اردو شاعری میں اسی "تیسری چیز" کا فقدان ہے۔ جدید شاعر اشیا کو اور کائنات کو پہچان کر الفاظ کے ذریعے اس کا اظہار نہیں
ہے ہیں بلکہ الفاظ کے ذریعے اشیا اور کائنات کو دیکھتے ہیں۔ جدید شاعر کے ہاں اگر کہیں ذاتی تجربہ موجود ہے تو اس کے پاس اپنے تجربات
ں میں مربوط و منسلک کرنے والا کوئی نظام نہیں ہے اور اس نظام کے بغیر ہر ذاتی تجربہ اپنی Isolation میں بے معنی بن جاتا ہے۔ اسی
سے جدید شاعری اپنی دروں بینی اور ذات پرستی میں اس حد تک بھی ٹھوس اور بامعنی نہیں بن پاتی جس حد تک ہماری بدنام متصوفانہ
ی ٹھوس اور بامعنی تھی۔ مثال کے طور پر اسی شعر کو لیجیے جس کا ایک مصرعہ اوپر نقل ہوا ہے:

این مدعیان در طلبش بے خبرانند
آن راکہ خبر شد، خبرش باز نیامد

رہ Pdrddox معلوم ہوتا ہے کہ جن کو "اس" کی خبر مل جائے پھر ان کی خبر دنیا والوں کو نہیں ملتی۔ شعر کے الفاظ اپنے لغوی
میں کسی سمت یا معنی کا پتہ نہیں دیتے لیکن ان الفاظ میں جس تجربے کا بیان ہے وہ تنہا یا علاحدہ نہیں بلکہ فکر اور احساس کے تجربات
ے مخصوص نظام کا حصہ اور اسی نظام میں اس کے معنی متعین ہوتے ہیں۔ اس نظام سے باہر یہ مصرعہ مہمل ہو جاتا ہے۔

ہمارے ہاں یہ کام اقبال کی شاعری میں ہوا۔ اقبال کے ہاں ہر صفت کے از سرِ نو تخلیق ہوئی ہے۔ ان کی شاعری میں علامات اور
ات کا سارا سلسلہ ایک لڑی میں پرو دیا ہوا ہے۔ حالی اور آزاد وغیرہ، الفاظ، موضوعات اور طریقۂ کار میں تبدیلی کی سفارش کر رہے تھے
ل نے مفاہیم و معانی ہی بدل کر رکھ دیے۔ سال ہا سال میں اردو شاعری نے الفاظ، تشبیہات اور استعارات کا جو سرمایہ قائم کیا تھا اس
ورثہ کی اقبال نے اپنی شاعری میں قلبِ ماہیت اس طرح کر دی کہ اردو شاعری کے ایک بڑے ذخیرۂ الفاظ و علامات پر اقبال کے بعد
وں کے لیے "ناقابلِ استعمال" کا لیبل لگ گیا۔

ہر بڑی شاعری ۔۔۔۔ ہمارے ہاں اقبال کی شاعری ۔۔۔۔ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ صرف شعری احساس Poetic sensibility
لفاظ کی بازی گری یا صرف ریاضت بلند شاعری نہیں پیدا کرتی۔ صرف شعری احساس جگر پیدا کرتا ہے۔ صرف ریاضت سیماب اکبر
پیدا کرتی ہے لفظی بازی گری اور شعری احساس کے امتزاج سے جوش ترکیب پاتے ہیں لیکن جب تک ایک پختہ اور مکمل شعری
کے ساتھ الفاظ اور اشیا کو مربوط و منسلک کرنے والا رشتہ ہاتھ نہیں آتا تب تک بڑی شاعری، یا اقبال کی شاعری، وجود میں نہیں آتی۔
عر ہے جسے "چیزے دگر" کہا جاتا ہے اور ان ہی معنوں میں ہر بڑی شاعری "ورائے شاعری" ہوتی ہے۔

(سوغات جدید نظم نمبر کے اداریے "نقشِ اول" کا اقتباس)

O O O

فرانز کافکا

فیصلہ

موسم بہار کے شباب میں اتوار کی ایک صبح کو جارج بنڈیمان ایک نوجوان تاجر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا کمرہ ندی کے کنارے پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے بوسیدہ مکانات میں سے ایک تھا۔ ان مکانات میں سوائے رنگ اور اونچائی کے اور کوئی چیز انھیں ایک دوسرے سے ممتائز کرنے والی نہیں تھی۔ بنڈیمان نے ابھی ابھی اپنے ایک پرانے دوست کے نام جو سمندر پار جاکر بس گیا تھا، خط مکمل کر لیا اور دھیمے پن سے ایک خوابناک انداز میں خط لفافے میں ڈالنے کے بعد وہ لکھنے کی میز پر اپنی کہنیاں پھیلائے ہوئے دریچے کے باہر نظر جمائے پل اور دوسرے کنارے کی سرسبز پہاڑیوں کو تک رہا تھا۔

اس وقت وہ اپنے اس دوست کے بارے میں سوچ رہا تھا جو چند سال پہلے اپنے وطن میں ایک روشن مستقبل کے امکانات نہ پاکر فی الواقعہ روس کو بھاگ گیا تھا۔ اب وہ سینٹ پیٹرس برگ میں ایک کاروبار چلا رہا تھا جو ابتدا میں تو بہت منافع بخش رہا لیکن اب بہت دنوں سے گھاٹے ہی میں چل رہا تھا، جس کی شکایت وہ کبھی کبھار وطن آتا تو اپنے دوست سے کیا کرتا تھا۔ اس کا اپنے وطن کو آنا بھی تدریجاً بہت کم ہوتا چلا گیا تھا۔ یعنی وہ ایک طرح سے ایک اجنبی ملک میں بغیر کسی فائدے کے اپنی جان کھپا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مانوس گھنی داڑھی اس کا وہ چہرہ پوری طرح چھپا نہیں سکی تھی جس سے جارج بچپن سے اچھی طرح آشنا تھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا تھا جس سے کسی چھپی ہوئی بیماری کا پتہ چلتا تھا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہاں اپنے ہم وطنوں کے محلوں میں بھی اس کے کوئی تعلقات نہیں تھے اور روسی خاندانوں سے تو اس کے سماجی روابط بالکل ہی نہیں تھے۔ اس طرح سے اس نے گویا مستقل طور پر تجرد کی زندگی کو قبول کر لیا تھا۔

ایک ایسے آدمی کو جو ڈگر سے ہٹ گیا جس سے ہمدردی کی جا سکتی ہو، لیکن جس کی مدد کرنا ممکن نہ ہو، بھلا کوئی کیا لکھ سکتا تھا؟

کیا اسے یہ مشورہ دیا جاتا کہ وہ اپنے وطن واپس لوٹ آئے اور یہاں از سرِنو اپنی پرانی دوستیوں کی تجدید کرے جو بہت آسانی کے ساتھ کر سکتا تھا اور مختصر یہ کہ اپنے دوستوں کے تعاون پر بھروسا کرے؟ لیکن اس مشورے کے معنے یہ ہوئے کہ بہت ملائم الفاظ میں اس سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس کی اب تک کی ساری کوششیں بے کار تھیں وہ اب اپنی ہار مان لے اور لوگوں کی تمسخرانہ نظروں کا ہدف بنے اور یہ کہ وہ دراصل ایک بڑا بچہ ہے جو خود سے کوئی کام نہیں کر سکتا اور صرف اس کے دوستوں کو اچھے اور برے کا علم ہے لہٰذا اسے اپنے کامیاب زندگی گزارنے والے دوستوں کو مشوروں پر عمل کرنا چاہیے؟ ان باتوں سے اسے جو تکلیف پہنچتی اس سے قطع نظر یہ بھی سوچنے کی بات تھی کہ کیا اتنی اذیت دینے کے بعد اصل مقصد پورا ہو جاتا؟ شاید اسے وطن لانا ممکن بھی نہیں تھا۔ وہ خود کہتا تھا کہ اپنے ملک کی تجارت سے وہ بالکل کٹ گیا تھا، اس صورت میں اسے یہاں واپس آنے کا مشورہ اس کے مزاج کی تلخی کو بڑھا دیتا اور وہ اپنے دوستوں سے زیادہ کشیدہ ہو کر پردیس میں اور بھی تنہائی اور اجنبیت محسوس کرنے لگتا لیکن اگر وہ اپنے دوستوں کی بات مان لے اور پھر کسی کینہ توزی کی وجہ سے نہیں بلکہ حالات کے دباؤ سے اپنے ملک میں بھی جمنے نہ پائے تو پھر؟ اپنے دوستوں کے ساتھ یا ان کے بغیر کام نہ چلا سکے یا ندامت اور خفت محسوس کرے، کسی بھی ایک ملک کو اور دوستوں کو اپنا نہ سکے تو پھر اس صورت میں اس کا اب جہاں ہے وہیں رہنا بہتر نہ ہوگا؟ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے کیسے یہ یقین کیا جا سکتا تھا وہ اپنے وطن میں آکر ایک کامیاب زندگی گزارے گا؟ ان وجوہات کی وجہ سے یہ مشکل پیدا ہو گئی تھی کہ اگر کوئی آدمی اس سے خط و کتابت رکھے تو وہ یہاں کی ایسی معمولی سے معمولی بات بھی اسے کھلے طور پر نہیں لکھ سکتا تھا جو ایک دور سے جان پہچان کے آدمی کو بھی بتا دی جا سکتی تھی۔ اسے اپنے وطن کو آئے ہوئے تین سال گزر چکے تھے اور اتنی مدت سے نہ آنے کا لنگڑا بہانہ یہ تھا کہ روس میں سیاسی حالات

ن غیر یقینی تھے۔ گویا یہ غیر یقینی حالات ایک معمولی سے تاجر کو مختصر سی غیر حاضری کی اجازت نہیں دیتے تھے، جب کہ ہزاروں روسی اطمینان ، ساتھ بیرونی ملکوں میں گھومتے پھر رہے تھے لیکن ان تین برسوں میں خود جارج کی حیثیت زندگی میں بہت بدل گئی تھی۔ دو سال پہلے اس اں مر گئی تھی اور وہ اور اس کا باپ گھر میں ساتھ رہتے تھے۔ اس سانحے کی اطلاع جارج نے اپنے دوست کو یقیناً دی تھی اور اس نے اپنی ہم ی کا اظہار خط میں اتنے خشک الفاظ میں کیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ایسے سانحے سے پیدا ہونے والے غم کا احساس شاید ایک اجنبی ملک میں نا ن ہے۔ ماں کی موت کے بعد سے جارج کاروبار میں اور ہر ایک چیز میں پوری مستعدی اور عزم کے ساتھ حصہ لینے لگا۔

شاید ماں کی زندگی تک باپ کا ہر معاملے میں اپنی بات منوانے پر اصرار اسے اپنے طور پر کوئی کام کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا اور شاید کی موت کے بعد اس کے باپ کا جارحانہ رویہ کم ہو گیا تھا، گو ویسے وہ اب بھی کاروبار میں عملی حصہ لیتا تھا۔ شاید اس کے رویہ میں تبدیلی ، بار میں خوش قسمتی سے یکے بعد دیگرے ہونے والی کامیابیوں کی وجہ سے تھی۔ یہی وجہ زیادہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بہرحال ہ بھی ہوا ان دو برسوں میں کاروبار غیر متوقع ترقی کر گیا تھا، ملازموں کی تعداد دوگنی کرنی پڑی، مجموعی آمدنی پانچ گنا بڑھ گئی تھی اور بلاشک یہ ترقی کے مزید امکانات روشن نظر آرہے تھے۔

لیکن جارج کے دوست کو اس ترقی کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ابتدائی برسوں میں اور پھر شاید آخری بار جارج کی ماں کی موت پر تعزیتی خط میں نے روس آجانے کی ترغیب دی اور خاص کر جارج کی تجارت کی روس میں کامیابی کے امکانات کو تفصیل سے واضح کیا تھا لیکن اس نے نع آمدنی کا جو حساب بتایا تھا وہ جارج کی حالیہ آمدنی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ پھر بھی جارج اپنے دوست کو ان تجارتی ابیوں کے متعلق اطلاع دینے سے گریز کرتا رہا اور اتنے دنوں کے بعد اب اس کا ذکر کرنا یقیناً بہت نامناسب تھا۔

لہٰذا جارج اپنے دوست کو ایسی گپ شپ کی غیر اہم باتیں لکھنے پر اکتفا کرتا رہا جو ایک پرسکون اتوار کو کاہلی سے ادھر ادھر کی باتیں بتے ہوئے ذہن میں آتی ہیں۔ جارج کی خواہش یہی تھی کہ اس کے دوست نے اپنی طویل غیر موجودگی کے عرصے میں اپنے شہر کے بارے میں یالات اپنے اطمینان کی خاطر بنا رکھے تھے انھیں برہم نہ کیا جائے اور اس کوشش میں یوں ہوا کہ جارج نے تین الگ الگ کافی تفصیلی خطوط اپنے دوست کو ایک غیر اہم اور معمولی آدمی کی اتنی ہی غیر اہم اور معمولی لڑکی سے منگنی کی اطلاع دی یہاں تک کہ اس کے ارادوں کے لس اس کا دوست اس غیر معمولی واقعے میں قابلِ ذکر دل چسپی لینے لگا۔

پھر بھی جارج ایسی ہی باتیں لکھنے کو ترجیح دیتا رہا اور یہ بات نہیں لکھی کہ ایک ماہ قبل داولن فریڈا امای ایک خوش حال خاندان کی ، سے خود اس کی منگنی ہو گئی تھی۔ اس نے اکثر اپنی منگیتر سے اپنے دوست کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس خط و ت نے اپنے دوست سے اس کے تعلقات کو کس قدر عجیب و غریب بنا دیا تھا" تو پھر وہ ہماری شادی میں نہیں آئے گا" اس کی منگیتر کبھی گو ، تمہارے تمام دوستوں کو جاننے کا حق ہے" "میں اسے زحمت نہیں دینا چاہتا" جارج جواب دیتا "مجھے غلط مت سمجھو، ویسے شاید وہ آئے کم م میرا تو یہی خیال ہے لیکن یہاں آکر اسے خوشی نہیں ہوگی اور شاید وہ مجھ سے رشک محسوس کرے اور یقیناً اس کے دل میں بے اطمینانی کا اس پیدا ہوگا اور چوں کہ وہ اس بے اطمینانی کا کوئی علاج نہیں کر سکتا۔ اس لیے اسے دوبارہ اکیلا واپس جانا ہوگا۔" "اکیلا" "تم جانتی ہو اس ، کیا معنے ہوتے ہیں؟" "وہ ٹھیک ہے لیکن کیا اسے کسی اور ذریعے سے ہماری شادی کی اطلاع نہیں مل سکتی؟" "میں اس کا تدارک نہیں سکتا لیکن وہ جس قسم کی زندگی گزار رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے اس کا امکان بہت کم ہے" "جب تمہارے دوست اس قسم کے تھے تو جارج نہ منگنی ہی نہیں کرنی چاہیے تھی" "منگنی کے تصور میں، ہم دونوں برابر کے شریک ہیں لیکن یہ بہرحال اب میں اپنے فیصلے میں کوئی تبدیلی ں کروں گا" اور جب اس کے بوسوں کے درمیان جلد جلد سانس لیتے ہوئے اس نے کہا "کچھ بھی ہو میں بہت پریشان ہوں" تو جارج نے یا کہ اگر وہ اپنے دوست کو یہ اطلاع دے دے تو ایسی کونسی مصیبت آجائے گی۔ "میں اسی قسم کا آدمی ہوں اور اسے میں جیسا ہوں ویسا ہی ل کرنا ہوگا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا" اس کی خاطر میں اپنے آپ میں ایسی تبدیلیاں نہیں لا سکتا جو مجھے اس کے لیے مناسبت و موزوں

دوست [illegible] تھیں۔

اور اس نے پچھلے اس اتوار کی صبح کو لکھے ہوئے طویل خط میں اپنے دوست کو منگنی کی اطلاع ان الفاظ میں دی۔ "میں نے تمھیں ، کے لیے سب سے اچھی خبر آخر تک محفوظ رکھی ہے۔ فراولن فریڈا اماہی ایک خوش حال خاندان کی لڑکی سے میری منگنی ہو گئی ہے۔ فراولن کے لوگ تمھارے روس جانے کے بہت دنوں بعد اس شہر میں آکر بسے ہیں اس لیے شاید تم نہیں جانتے۔ تمھیں اس کے بارے میں مزید بتانے کا ابھی وقت نہیں ہے، لیکن آج کے لیے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں بہت خوش ہوں اور تمھارے میرے درمیان صرف اتنا پڑے گا کہ آئندہ سے ایک بالکل عام قسم کے دوست کی بجائے تم مجھے ایک خوش و خرم دوست پاؤ گے۔ علاوہ ازیں میری منگیتر میں، جو اپنی بہترین تمنائیں بھیجتی ہے، تمھیں صنف نازک سے ایک سچا دوست ملے گا جو ایک کنوارے نوجوان کے لیے کچھ اہم بات نہیں ہے معلوم تمھارے یہاں نہ آسکنے کی کئی وجوہات ہیں لیکن کیا میری شادی ایسا موقع نہیں ہے کہ تم اپنی تمام مشکلات کو خدا حافظ کہہ کر یہاں لیکن پھر بھی تم سوچ کر اپنے مفاد کے پیش نظر جو ٹھیک اور مناسب معلوم ہو وہی کرو۔"

یہ خط ہاتھ میں پکڑے ہوئے جارج بہت دیر سے میز کے سامنے دریچے کی طرف منہ کیے ہوئے بیٹھا تھا۔ وہ اتنا کھویا ہوا تھا کہ سے گزرتے ہوئے ایک شناسا نے سلام کیا تو اس نے بہ مشکل ایک خفیف سے تبسم سے جواب دیا۔

آخر کار وہ خط جیب میں ڈال کر کمرے سے باہر نکلا اور چھوٹے سے پیش دالان سے ہوتے ہوئے اپنے باپ کے کمرے میں داخل جہاں وہ مہینوں سے داخل نہیں ہوا تھا اور در حقیقت اسے اپنے باپ کے کمرے میں جانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہوتی تھی۔ کیو کاروبار کے سلسلے میں وہ روز ایک دوسرے سے مل لیتے تھے اور دوپہر کا کھانا طعام خانے میں ساتھ ہی کھاتے تھے۔ ہاں البتہ شامیں وہ اپنے طور پر گزارتے تھے لیکن وہ بھی جب جارج اپنے دوستوں یا چند دنوں سے اپنی منگیتر کے ساتھ باہر جاتا جو اکثر ہوتا تھا۔ ورنہ باپ بیٹے د ملاقاتی کمرے میں بیٹھے ہوئے کچھ دیر کے لیے اپنے اخباروں کا مطالعہ کرتے۔

جارج کو حیرت ہوئی کہ اتنی روشن صبح میں بھی اس کے باپ کا کمرہ کتنا تاریک تھا۔ مختصر سے صحن کے اس کنارے کی اونچی دیوا اس کمرے پر اتنا زیادہ سایہ کر لیا تھا۔ جارج کا باپ دریچے کے قریب ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا جہاں جارج کی مرحوم ماں کی کئی یادگار ہوئی تھیں۔ وہ بصارت کے ایک نقص کی وجہ سے اخبار آنکھوں سے ایک طرف کو ہٹائے ہوئے پڑھ رہا تھا، میز پر صبح کے ناشتے کا پس خ پڑا ہوا تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ بہت کم کھایا گیا ہے۔ "اوہو جارج" اس کے باپ نے اس سے ملنے کے لیے فوراً اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے بڑھے تو وزنی ڈریسنگ گاؤن اس کے جسم سے لپٹا ہوا پھڑپھڑایا۔ میرا باپ اب بھی کیا قوی ہیکل آدمی ہے" جارج نے دل میں سوچا۔" بڑی ناقابل برداشت تاریکی ہے" جارج نے بلند آواز سے کہا۔

"ہاں کافی تاریکی ہے" اس کے باپ نے جواب دیا

"اور آپ نے دریچہ بھی بند رکھا ہے"

مجھے اسی طرح اچھا لگتا ہے"

"باہر اچھی خاصی گرمی ہے" جارج نے گویا اپنے پہلے جملے کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

اس کے باپ نے ناشتے کے برتن میز پر سے ہٹائے اور انھیں ایک طرف رکھ دیا، جارج نے جو اپنے باپ کی حرکات و سکنا خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہنا شروع کیا "میں دراصل صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں اپنی منگنی کی اطلاع پیٹرس برگ بھیج رہا ہوں"۔ اس اپنی جیب سے لفافہ ذرا سا باہر نکالا اور دکھاتے ہوئے پھر واپس ڈال لیا۔

"پیٹرس برگ کو؟" اس کے باپ نے پوچھا۔

"وہاں میرے دوست کو" جارج نے باپ سے آنکھیں ملانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کاروبار کے اوقات میں وہ کتنا مختلف ہوتا

جارج سوچ رہا تھا۔ جہاں اب وہ سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے کرسی پر کس مضبوطی سے بیٹھا ہوا ہے۔

"اوہ، ہاں تمہارے دوست کو" اس کے باپ نے الفاظ پر عجیب طور پر زور دیتے ہوئے کہا۔

دراصل آپ جانتے ہیں میں پہلے اسے اپنی منگنی کی اطلاع نہیں دینا چاہتا تھا صرف اس کے احساسات کا خیال کرتے ہوئے ورنہ اور کوئی وجہ نہیں تھی ورنہ آپ خود جانتے ہیں وہ بڑا مشکل آدمی ہے۔ پھر مجھے خیال آیا ممکن ہے کوئی اور شخص اسے یہ اطلاع پہنچائے، گو وہ کچھ ایسا گوشہ نشین قسم کا آدمی ہے کہ کسی دوسرے سے اسے میری منگنی کی خبر ملنا قرین قیاس نہیں تھا، اور میں اس کا تدارک بھی نہیں کر سکتا تھا، لیکن ویسے میں اپنی طرف سے اسے یہ خبر ہرگز نہیں دینے والا تھا۔"

"اور اب تم نے اپنا خیال تبدیل کر دیا ہے"؟ اس کے باپ نے لمبا چوڑا اخبار دریچے پر رکھا اور اخبار پر اپنی عینک کو ایک ہاتھ سے ڈھانپتے ہوئے دریافت کیا۔

ہاں میں اس بارے میں سوچتا رہا۔ اگر وہ میرا اچھا دوست ہے تو میری منگنی کی خبر سے اسے بھی خوش ہونا چاہیے۔ اس لیے اسے یہ اطلاع دینے میں مزید تاخیر کرنی چاہیے، لیکن خط پوسٹ کرنے سے پہلے میں نے آپ کو بتانا چاہا۔"

"جارج" اس کے باپ نے اپنے پھوپلے منہ کو لمبا کرتے ہوئے کہا" دیکھو تم میرے پاس اس معاملے پر گفتگو کرنے کے آئے ہو، یقیناً یہ تمہاری سعادت مندی ہے لیکن یہ کچھ بھی نہیں ہے، یہ قطعاً بیکار ہے اگر تم مجھے پوری سچائی سے ہر بات نہ بتاؤ۔ میں ایسی باتیں چھیڑنا نہیں چاہتا جن کا یہاں ذکر نہیں ہونا چاہیے۔ تمہاری عزیز ماں کی موت کے بعد سے یہاں کچھ ایسی چیزیں ہو رہی ہیں جو ٹھیک نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں گفتگو کا موقع آئے گا اور شاید ہماری توقعات سے جلد ہی آئے گا۔ کاروبار میں کئی ایک ایسی چیزیں ہو رہی ہیں جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ چیزیں مجھ سے چھپا کر نہ کی جا رہی ہوں، میں یہ نہیں کہتا میں اب تمام کام کاج سنبھالنے کے لائق نہیں رہا۔ میرا حافظہ جواب دے رہا ہے۔ کئی ایک چیزیں میں دیکھ نہیں سکتا۔ ایک تو عمر کی وجہ سے فطری طور پر یہ کمزوریاں آ رہی ہیں اور دوسری وجہ تمہاری عزیز ماں کی موت ہے جس کا صدمہ تمہارے مقابلے میں مجھے زیادہ ہوا ہے، لیکن اب جب کہ ہم اس خط کے بارے مین گفتگو کر رہے ہیں تو میں تم سے درخواست کرتا ہوں جارج، مجھے دھوکا مت دو، یہ بہت معمولی معاملہ ہے، بے حد ناقابل ذکر اس لیے مجھے دھوکا مت دو کیا سچ مچ پیٹرزبرگ میں تمہارا یہ دوست ہے؟"

جارج پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا میرے دوستوں کی پرواہ مت کیجیے، ایک ہزار دوست بھی میرے باپ کی جگہ نہیں لے سکتے، میں بتاؤں، میں کیا سمجھتا ہوں؟ آپ اپنی دیکھ بھال برابر نہیں کر رہے ہیں لیکن بڑھاپے کا ضرور خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میں آپ کے بغیر کاروبار نہیں چلا سکتا، اس کا آپ کو اچھی طرح علم ہے۔ لیکن اگر کاروبار آپ کی صحت پر اثر انداز ہو رہا ہے تو میں کل ہی اسے بند کر دینے کے لیے تیار ہوں۔ ہمیں آپ کی طرز زندگی میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی اور ایک مکمل تبدیلی۔ آپ یہاں اندھیرے میں بیٹھے رہتے ہیں، حالاں کہ ملاقاتیوں کے کمرے میں خوب روشنی ہوتی ہے۔ اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کی بجائے آپ برائے نام ناشتے پر اکتفا کرتے ہیں، آپ دریچہ بند کر کے بیٹھتے ہیں حالاں کہ تازہ ہوا آپ کو کتنا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ نہیں ابا میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں اور ہم اس کے مشوروں پر عمل کریں گے۔ ہم آپ کا کمرہ تبدیل کر دیں گے، آپ سامنے میرے کمرے میں آ جائیں میں یہاں منتقل ہو جاؤں گا، آپ کو کوئی فرق نہیں معلوم ہوگا۔ یہاں کی ساری چیزیں آپ کے ساتھ اس کمرے میں آ جائیں گی۔ اب میں آپ کو بستر پر لٹا دوں گا۔ یقیناً آپ کو آرام کی ضرورت ہے آئیے میں آپ کو کپڑے اتارنے میں مدد دوں گا۔ آپ دیکھیں گے میں مدد کر سکتا ہوں۔ یا اگر آپ ابھی سامنے کے کمرے میں چلے جائیں اور فی الوقت میرے بستر پر لیٹ جائیں تو سب سے اچھی بات ہوگی۔"

جارج اپنے باپ سے لگ کر کھڑا ہوا تھا اور اس کے باپ نے اپنا الجھے ہوئے سفید بالوں والا سر اپنے سینے پر جھکا رکھا تھا۔

"جارج" اس کے باپ نے نیچی آواز میں جنبش کیے بغیر کہا۔

جارج فوراً اپنے باپ کے بازو دو زانو ہو گیا۔ بوڑھے آدمی کے تھکے ہوئے چہرے پر پھیلی ہوئی پتلیاں اسے آنکھوں کے کنارے سے برابر گھورے جا رہی تھیں۔

"پیٹرز برگ میں تمہارا ایک دوست ہے۔ تم ہمیشہ دھوکا دیتے ہو اور تم نے مجھے بھی دھوکا دینے میں جھجک نہیں محسوس کی، پیٹرز برگ میں تمہارا دوست کیسے ہو سکتا ہے؟ میں اسے نہیں مان سکتا۔"

"ذرا پرانی باتیں یاد کیجیے ابا۔" جارج نے اسے کرسی سے اٹھایا اور وہ کمزور قدموں پر کھڑا ہوا تو اس ڈریسنگ گاؤن اتارتے ہوئے کہا: ابھی کوئی تین سال ہوتے ہیں جب میرا دوست گذشتہ بار یہاں آیا تھا۔ مجھے یاد ہے آپ اسے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ کم از کم دو بار تو میں نے آپ کو اسے دیکھنے سے باز رکھا حالاں کہ وہ میرے کمرے میں بالکل میرے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ آپ کی میرے دوست کو ناپسند کرنے کی وجوہات میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کیوں کہ میرے دوست میں عجیب و غریب عادتیں ہیں لیکن پھر بعد میں آپ میرے دوست سے گھل مل گئے تھے۔ مجھے فخر محسوس ہوتا تھا کہ آپ اس کی باتیں سن کر سر ہلاتے تھے اور اس سے سوالات کرتے تھے۔ آپ اگر پچھلی باتیں یاد کریں تو وہ آپ کو یقیناً یاد آجائے گا۔ مثال کے طور پر جب وہ ایک کاروباری دورے پر کہیں گیا ہوا تھا تو فسادات میں پھنس گیا اور وہاں اس نے دیکھا کہ ایک بالکونی پر ایک راہب نے اپنی ہتھیلی کو چیر کر صلیب کا نشان بنایا اور لوگوں کو یہ ہتھیلی دکھا کر جھگڑے سے باز آنے کی تلقین کی۔ آپ نے خود بھی یہ واقعہ دو ایک بار سنایا ہے۔"

یہ باتیں کہنے کے دوران میں جارج نے اپنے باپ کو دوبارہ بٹھایا اور اس کی اونی پتلون اور موزے اتارے، اس کا زیر جامہ کچھ میلا سا تھا جسے دیکھ کر جارج نے باپ سے اپنی اس لاپروائی پر اپنے آپ کو ملامت کی یقیناً یہ اس کا فرض ہونا چاہیے تھا کہ وہ اپنے باپ کے پاک، صاف زیر جاموں کی تبدیلی کا خیال رکھتا۔ اس نے اب تک اپنی ہونے والی بیوی سے کوئی واضح گفتگو نہیں کی تھی کہ مستقبل میں اس کے باپ کے بارے میں کیا انتظامات کیے جائیں کیوں کہ دونوں نے خاموشی کے ساتھ فرض کر لیا تھا کہ بوڑھا آدمی پرانے گھر میں، اکیلا اسی طرح بسر کرے گا لیکن اب جارج نے فوری اور مضبوط فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے ہونے والے نئے گھر میں باپ کو بھی ساتھ رکھے گا۔ قریب سے دیکھنے پر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنے باپ کو جو آرام پہنچانا چاہتا ہے شاید اس کا موقع بھی نہیں ملے گا۔

وہ اپنے باپ کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر پلنگ پر لے گیا، پلنگ کی طرف چند قدم اٹھاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ وہ اس کے سینے سے لگا ہوا اس کی گھڑی کی زنجیر سے کھیل رہا تھا یہ دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہیبت ناک احساس پیدا ہوا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اسے پلنگ پر نہیں ڈال سکا کیوں کہ وہ گھڑی کی زنجیر کو اتنی مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔

لیکن جیسے وہ پلنگ پر لیٹ گیا ہر چیز ٹھیک معلوم ہونے لگی، جارج نے اسے کمبل سے اچھی طرح ڈھک دیا بلکہ کمبل معمول سے زیادہ اوپر کندھوں تک چڑھا دیا اس نے جارج کو ایسی نظر سے دیکھا جو غیر دوستانہ نہیں تھی۔

"اب آپ کو میرا دوست یاد آرہا ہے نا۔" جارج نے ہمت افزائی کے طور پر سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا میں ٹھیک طور پر ڈھکا ہوا ہوں۔" اس کے باپ نے اس طرح پوچھا جیسے وہ خود دیکھنے کے قابل نہ تھا کہ اس کے پیر کمبل کے اندر تھے یا نہیں۔

"دیکھا آپ ابھی سے بستر کے اندر آرام محسوس کرنے لگے ہیں۔" جارج نے اور اچھی طرح اس کے بدن کو کمبل سے ڈھکتے ہوئے کہا

"کیا میں ٹھیک طور پر ڈھکا ہوا ہوں۔" باپ نے ایک اور بار سوال کیا وہ اس کا جواب پانے پر غیر معمولی طور پر مصر معلوم ہو رہا تھا۔

"فکر مت کیجیے آپ پوری طرح ڈھکے ہوئے ہیں۔"

"نہیں" اس کے باپ نے جارج کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے چیخ کر کہا اور کمبلوں کو اتنے زور سے اٹھا پھینکا کہ وہ اچھل کر جا پڑیں اور ایک لمحے میں چھلانگ لگا کر پلنگ پر استادہ ہو گیا۔ صرف ایک ہاتھ سے سہارے کے لیے چھت کو تھامے ہوئے تھا۔

"تم مجھے ڈھانک دینا چاہتے تھے، میرے نوجوان چھوکرے، لیکن میں ابھی ڈھکے جانے کی منزل سے بہت دور ہوں۔ اگر یہ طاقت کا سنبھالا بھی ہے تو کوئی بات نہیں کیوں کہ اتنی طاقت تمہارے لیے کافی ہے بلکہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ بے شک میں تمہارے دوست کو جانتا ہوں، وہ میرا اصلی بیٹا ہو سکتا تھا۔ اسی لیے تم اتنے برسوں سے اس سے جھوٹ بولتے رہے ورنہ اور کیا وجہ تھی؟" اور اسی لیے تم اپنے آپ میں بند رکھتے تھے، اس بہانے پر کہ صاحب مصروف ہیں، ان کے کام میں مداخلت نہ کی جائے۔ اور تم اپنے جھوٹ سے بھرے ہوئے روس کو لکھتے رہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے ایک باپ کو یہ سکھانے کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنے بیٹے کو کس طرح سمجھ سکے اور اب جب تم نے سمجھ لیا کہ بوڑھا پوری طرح زیر ہو چکا ہے، اس طرح گر گیا ہے کہ تم اپنا پورا وزن ڈال کر اس پر بیٹھ سکو اور وہ ہلکی سی آواز بھی نہ نکال سکے اس وقت میرا ہونہار بیٹا شادی کی تیاری کر رہا ہے۔۔۔۔!"

جارج اس آسیبی منظر کو تک رہا تھا جو اس کے باپ کی شعبدہ بازی نے سامنے کھڑا کر دیا تھا، اس کا پیٹرز برگ کا دوست جس سے اس کا اچانک گہرا واقف کار بن گیا تھا، اس سے پہلے کبھی اس طرح اس کے تخیل میں نہیں آیا تھا۔ روس کی وسعت میں وہ اسے کھویا ہوا نظر آیا خالی اور ٹوٹی ہوئی دکان کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ ٹوٹا ہوا فرنیچر، لوٹ کھسوٹ سے بچا ہوا تتر بتر سامان، دیواروں کا پلستر نکلا ہوا ان کے درمیان وہ بہ مشکل کھڑا ہو رہا تھا، اسے اتنی دور جانے کی کیا ضرورت تھی!"

"میری طرف توجہ دو" اس کا باپ چیخا اور جارج ایک لخت چونک کر پلنگ کی طرف لپکا، لیکن آدھی دور بڑھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔

"چوں کہ اس نے اپنا اسکرٹ اٹھا دیا" اس کے باپ نے سلسلہ شروع کیا "چوں کہ اس فاحشہ نے اپنا اسکرٹ اٹھا دیا اس لیے" اس کے باپ نے اسکرٹ اٹھانے کی نقل کرتے ہوئے اپنی قمیض چٹکیوں میں پکڑ کر اتنی اوپر اٹھائی کہ اس کی ران پر جنگ کے دوران میں آئے زخم کا نشان صاف دکھائی دینے لگا۔

چوں کہ اس نے اس طرح اور اس طرح اسکرٹ اٹھایا اس لیے تم اس پر مرمٹے اور اس کے ساتھ بغیر کسی مداخلت کے آزادانہ ملنے کے لیے تم نے اپنی ماں کی یاد کو دھبا لگایا اور اپنے دوست سے بے وفائی کی اور اپنے باپ کو پلنگ پر ٹھونس دیا تاکہ وہ چل پھر نہ سکے، لیکن وہ چل پھر سکتا ہے، ہے نا؟"

اور وہ بغیر کسی سہارے کے کھڑا ہو گیا اور زور زور سے ہوا میں ٹانگیں چلانے لگا، اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

جارج اپنے باپ سے زیادہ سے زیادہ دور ہٹ کر ایک کونے میں سہم کر کھڑا ہو گیا، بہت دیر پہلے اس نے سوچ لیا تھا کہ پتہ نہیں کس طرف سے یلغار ہو اس لیے ہر معمولی حرکت پر چوکنا رہنا چاہیے۔ اس لمحے اس نے پھر بہت دیر پہلے کیے ہوئے اور بھولے ہوئے اس فیصلے کو یاد کیا اور پھر اسی لمحے بھول گیا جیسے کوئی آدمی دھاگے کا ایک ننھا سا ٹکڑا سوئی کے ناکے میں پرونے کی کوشش کرے اور ہر مرتبہ دھاگا سوئی کے ناکے میں داخل ہو اور وہ ادھر سے نکل جائے۔

"لیکن تمہاری اپنے دوست سے دغابازی کامیاب نہیں ہو سکتی۔" اس کا باپ چیخا۔ میں یہاں اس جگہ اس کی نمائندگی کرتا رہا ہوں۔"

"کیا مزاحیہ ناٹک ہے۔" جارج کی زبان سے الفاظ گویا پھسل پڑے، فوراً اس نے اپنی غلطی کا احساس کر لیا، اس کا سر چکرا گیا اور اس نے اپنی زبان کاٹ لی لیکن الفاظ زبان سے نکل چکے تھے۔

ہاں بے شک میں ایک مزاحیہ ناٹک کھیل رہا ہوں! مزاحیہ ناٹک۔ بہت موزوں نام ہے، ایک بوڑھے رنڈوے کے لیے اس کے سوا اور کون سا آرام رہ گیا تھا، ہاں مجھے بتاؤ اور اب بھی میرے زندہ بیٹے کی طرح بتاؤ کہ میرے لیے تم نے باقی ہی کیا چھوڑا تھا۔ ان بوڑھی ہڈیوں کو نافرمان [illegible] تم [illegible]

دیا۔ جو کاروباری معاملات میں نے اس کے لیے طے کیے تھے انھیں مکمل کرتا ہوا کامرانی کے نشے میں پھولا نہ سماتا، ایک معزز کاروباری شکل بنائے ہوئے اپنے باپ کے ساتھ ہی ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا رہا۔ تم سمجھتے ہو مجھے تم سے محبت نہیں تھی؟ تم، جسے میں نے جنم دیا؟"

اب یہ آگے جھکے گا، جارج نے سوچا۔ یہ لڑکھڑا کر گرے اور ختم ہو جائے تو کیا ہو گا؟ جارج کے ذہن میں یہ الفاظ چکر کاٹ رہے۔

اس کا باپ آگے جھکا تو سہی لیکن لڑکھڑا کر گرا نہیں لیکن چوں کہ خلاف توقع جارج قریب نہیں آیا وہ دوبارہ سیدھا ہو گیا۔

"تم جہاں ہو وہیں رہو مجھے تمھاری ضرورت نہیں ہے، تم سمجھتے ہو تم میں یہاں تک آنے کی طاقت ہے اور تم صرف اپنی مرضی سے رکے ہوئے ہو، بہت زیادہ بر خود غلط نہ بنو۔ میں اب بھی ہم دونوں میں زیادہ طاقت ور ہوں۔ اگر مجھے صرف اپنے پر ہی تکیہ کرنا ہوتا تو کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا لیکن تمھاری ماں نے اس کی طاقت مجھے اتنی زیادہ دی ہے کہ میں نے تمھارے دوست سے رابطہ قائم رکھا ہے اور سارے گاہک میری جیب میں رکھے ہوئے ہیں۔"

"لوان کی قمیضیں میں بھی جیبیں ہوتی ہیں" جارج نے دل میں کہا اور مطمئن ہو گیا کہ اس ایک جملے سے وہ ساری دنیا کے سامنے باپ کا مضحکہ خیز کردار پیش کر سکتا ہے، صرف ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کیوں کہ وہ ہر چیز مستقل بھولتا جا رہا تھا۔

"تم اپنی دلہن کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نکلو اور ذرا میرے راستے میں آنے کی کوشش کرنا پھر میں بتاؤں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں اسے تمھارے پہلو سے نکال پھینکوں گا، کیسے یہ تمھیں ابھی پتہ نہیں چلے گا۔"

جارج نے بے یقینی کے انداز میں منھ بنایا۔ اس کے باپ نے سر ہلایا۔

"کیا مزہ آیا ہے آج، تم مجھ سے اپنے دوست کو اپنی منگنی کی اطلاع دینے کی اجازت لینے آئے ہو۔ ارے اسے تو سب خبر ہے، احمق اسے تو ہر بات کی خبر ہے، میں اسے سب لکھتا رہا ہوں، کیوں کہ تمھیں میرے لکھنے پڑھنے کا سامان مجھ سے چھیننا یاد نہیں رہا تھا، اسی لیے یہاں برسوں سے آیا نہیں ہے، یہاں کی ہر بات وہ تم سے سو مرتبہ زیادہ بہتر جانتا ہے۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے تمھارے خطوط بغیر کھولے کر پھینک دیتا ہے اور دائیں ہاتھ میں میرے خطوط پڑھنے کے لیے اٹھاتا ہے۔"

جوش میں اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر لہرایا۔ "وہ ہر چیز تمھارے سے ہزار گنا زیادہ بہتر طور پر جانتا ہے۔" وہ چیخا۔

"دس ہزار مرتبہ زیادہ ہی" جارج نے اپنے باپ کا مذاق اڑانے کے کہا، لیکن یہ بات اس کی زبان سے یوں نکلی جیسے سوفی صد

"میں برسوں سے منتظر تھا کہ تم اس کی کوئی بات لے کر میرے پاس آؤ! تم سمجھتے ہو میں نے اس کے علاوہ کسی اور چیز سے کو
دلچسپی لی ہے؟ تم سمجھتے ہو میں اخبار پڑھتا ہوں؟ دیکھو!" اور اس نے جارج کی طرف اخبار کا ورق پھینکا، جو وہ کسی طرح پلنگ پر اپنے ساتھ لے گیا تھا، کوئی بہت پرانا اخبار تھا جس کے نام سے بھی جارج مطلقاً آشنا نہ تھا۔

"تم نے پیٹ کے پاؤں نکالنے میں کتنا وقت لیا ہے! تمھاری ماں کو مرنا تھا، وہ یہ خوشی کا دن نہ دیکھ سکی، تمھارا دوست روس میں موت کے منھ میں جا رہا ہے، تین سال پہلے ہی وہ اتنا پیلا پڑ گیا تھا کہ اسے مٹی میں سونپ دیا جاتا اور میں ۔۔۔۔ میری جو حالت ہے وہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو یہ دیکھنے کے لیے تمھارے چہرے پر آنکھیں ہیں۔"

"تو تم میری گھات میں لگے رہے ہو۔" جارج چیخ اٹھا۔

اس کے باپ نے بے پروائی سے رحم آمیز لہجے میں کہا "میرا خیال ہے تم یہ بہت پہلے کہنا چاہتے تھے لیکن اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔"
پھر بلند آواز میں اس نے کہا "تو اب تمھیں پتہ چلا کہ دنیا میں تمھارے علاوہ اور کیا کچھ ہے۔ اب تک تمھیں صرف اپنی ذات کے بارے میں معلوم تھا۔ بالکل ایک معصوم بچے کی طرح۔ ہاں تم معصوم بچے ہی تھے بلکہ اس سے کہیں زیادہ تم شیطان کا انسانی پیکر تھے! لہٰذا سے سنو کہ میں تمھاری موت کا فیصلہ صادر کرتا ہوں۔ تم دریا میں ڈوب کر جان دو گے۔"

جارج نے محسوس کیا کوئی طاقت اسے کمرے سے باہر لے جا رہی تھی، بھاگتے ہوئے اس کے کانوں میں باپ کے پلنگ پر گر

محمود ایاز

نوحہ

سیہ رات میں ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے
خروشاں سمندر کی موجیں تجھے ڈھونڈتی ہیں
خروشاں ہوا کی صداؤں میں تیری صدا ہے
مرا دل تجھے ڈھونڈتا ہے
سیہ رات اشکوں کی شبنم میں سوئی ہوئی ہے
ہر اک پل، ہر اک لمحہ ماضی کا زندہ ہے
موجود میں جاگتا ہے
مگر تیرا پیکر
تہہِ خاک اندھیروں کے دامن میں سویا ہوا ہے
مرا دل کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے
تجھے ڈھونڈتا ہے
خروشاں سمندر میں ڈوبا ہوا چاند
کسی اجنبی سرزمیں پر تبسم کناں ہے
نقوشِ کفِ پا کی منزل کہاں ہے
یم زندگی سیل در سیل بہتا ہوا
ایک لمحہ کو رک کر، پلٹ کر نہ دیکھے
افق تا افق ٹمٹماتے ستاروں کے نیچے
فقط اک شبِ بے صدا جاگتی ہے
شبِ بے صدا پوچھتی ہے
بپھرتی ہوئی موجِ دریا کدھر سے چلی تھی
کدھر کو چلی ہے
ترا دل کہ ماتم گرِ رفتگاں ہے
کسے ڈھونڈتا ہے

○○○

محمود ایاز

شب چراغ

بسوں کا شور، دھواں، گرد، دھوپ کی شدت
بلند و بالا عمارات، سرنگوں انساں
تلاشِ رزق میں نکلا ہوا یہ جمِّ غفیر
لپکتی بھاگتی مخلوق کا یہ سیلِ رواں
ہر اُس کے سینے میں یادوں کی منہدم قبریں
ہر ایک اپنی ہی آوازِ پا سے روگرداں
یہ وہ ہجوم ہے جس میں کوئی کسی کا نہیں
یہ وہ ہجوم ہے جس کا خدا فلک پہ نہیں

اور اس ہجومِ سرِ راہ سے گزرتے ہوئے
نہ جانے کیسے تمھاری وفا، کرم کا خیال
مری جبیں کو کسی دستِ آشنا کی طرح
جو چھو گیا ہے تو اشکوں کے سوتے پھوٹ پڑے
سموم و ریگ کے صحرا میں اک نفس کے لیے
چلی ہے بادِ تمنا تو عمر بھر کی تھکن
سرِ مژہ سمٹ آئی ہے ایک آنسو میں

یہ وہ گہر ہے جو ٹوٹے تو خاکِ پا میں ملے
یہ وہ گہر ہے جو چمکے تو شب چراغ بنے

○○○

محمود ایاز

ایں نکتہ کہ ہستم من *

تم نے مجھ سے
کوئی اقرارِ رفاقت نہ کیا
یہ نہ کہا
"تم سے بچھڑ جاؤں تو زندہ نہ رہوں"
میں نے تمھیں
زیست کا سرمایہ، مرا حاصلِ یک عمرِ تمنا نہ کہا
اس قدر جھوٹ سے دہشت زدہ تھے ہم
کہ کوئی سچ نہ کہا
میں نے بس اتنا کہا
دیکھو، ہم اور تم، اس آگ کا حصہ ہیں
جو خاشاک کے مانند جلاتی ہے ہمیں
تم نے بس اتنا کہا
دیکھو اس آگ میں
ہم دونوں اکیلے بھی ہیں، ساتھی بھی ہیں
کہکشاں پھیکی ہے کچھ دیر کا مہمان ہے چاند
ڈوبتی رات میں ڈھلتے ہوئے سائے چپ ہیں
میری شریانوں میں یخ بستہ لہو حیراں ہے
اولیں قرب کی یہ آنچ کہاں سے آئی

اجنبی کیسے کہوں
تم تو مرے دل کے نہاں خانوں میں سوتے ہوئے ہر خواب کا چہرہ نکلیں

---

* از عشق ہوید اشد ایں نکتہ کہ ہستم من (اقبال)

محمود ایاز

ایک نظم

تری آرزوؤں کو گزرے ہوئے جن دنوں کا الم ہے
تری آرزوؤں کو جن آنے والے دنوں کی تمنا ہے
وہ دن یہیں ہیں۔
ہر اک فاصلہ، روز و شب، قرب و دوری کا ہر رنگ
یہ دوش و فردا کے سب مرحلے
ایک قیدِ زماں و مکاں کے حصلے ہیں
بہار و خزاں، وصل و ہجراں
ہمارے ہی اشک و تبسم کے جوڑے ہوئے سلسلے ہیں
شب و روز دو برق پا ساعتیں ہیں
جو اک دوسرے کے تعاقب میں گرداں چلی ہیں
یہ گردش شب و روز کی
میرے تیرے دکھوں کا مداوا نہیں ہے
کہ اس گردشِ روز و شب میں
کوئی دوش و فردا نہیں ہے
پس اک حسنِ مطلق
فضاؤں، خلاؤں میں پھیلی ہوئی روشنی ہے
جو تیری مژہ پر
مرے رنگ و آواز میں جاگتی ہے
یہی روشنی زندگی ہے
یہی لمحہ کل ہے
خدا ہے

○○○

کفارہ

چمپئی دھوپ میں پکتی ہوئی فصل
گھر کے آنگن میں مہکتے ہوئے پھول
عالمِ خواب کی بھولی ہوئی تصویریں ہیں
جسم کی آگ، خمِ لب، نفسِ مشک فشاں
پردہ، آب کی مٹتی ہوئی تحریریں ہیں
گردش جام، ہنسی، دورِ طرب، شورِ فغاں
ایک سناٹے میں ڈھلتی ہوئی آوازیں ہیں
اس سے پہلے کہ یہ ہنستے ہوئے لب
خاک کا رزق بنیں
اس سے پہلے کہ چمکتی ہوئی آنکھوں کے چ
قبر کی سرد و سیہ رات میں اندھی ہوجائیں
اپنی آنکھوں سے وہ آنسو مانگو
جن سے دامن کے یہ داغ
یہ ہاتھوں کا لہو دھل جائیں

○○○

محمود ایاز

○

حیرتِ جلوہ مقدر ہے تو جلوہ کیا ہے
مجھ سے وابستہ ہے دل ورنہ تماشا کیا ہے

کوئی دن اور غمِ ہجر میں شاداں ہولیں
ابھی کچھ دن میں سمجھ جائیں گے دنیا کیا ہے

دل تو اک اور ہی آہنگ پہ ہے رقص کناں
دل کا اس عمرِ فرومایہ سے رشتہ کیا ہے

ہم اسے بھول چکے ہیں مگر اے دورِ حیات
سامنے آنکھوں کے یہ صورتِ زیبا کیا ہے

جینے والوں سے کہو کوئی تمنا ڈھونڈیں
ہم تو آسودہ ، منزل ہیں ہمارا کیا ہے

○ ○ ○

○

ہوائے یاس چلی لے کے کن زمانوں میں
صدائے گم شدگاں آرہی ہے کانوں میں

یہ بند آنکھیں کھلیں گی نئے زمانوں میں
پرانے دوست ملیں گے نئے مکانوں میں

یہ مال و دانشِ دنیا بہائے عمر نہیں
میں خود کو ڈھونڈ رہا ہوں گئے زمانوں میں

نگار خانہ ، دنیا مرا زوال بھی دیکھ
زمیں سے ٹوٹ کے بے گھر ہوں آسمانوں میں

ہوائے دشتِ فنا چن کے لے گئی جن کو
انھیں کا ذکر بہت ہے مرے فسانوں میں

○ ○ ○

محمود ایاز

کروڑوں سال کا دیکھا ہوا تماشا ہے
یہ رقصِ زیست کہ بے قصد و بے ارادہ ہے

عجیب موجِ سبک سیر تھی ہوائے جہاں
گزر گئی تو کوئی نقش ہے نہ جادہ ہے

نشاطِ لمحہ کی وہ قیمتیں چکائی ہیں
کہ اب ذرا سی مسرت پہ دل لرزتا ہے

اکیلا میں ہی نہیں اے تماشہ گاہ جہاں
جو سب کو دیکھ رہا ہے وہ خود بھی تنہا ہے

اسی سے رشتہ، دل بھی اسی سے رو گرداں
اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں، اسی سے جھگڑا ہے

...

کون سا وہ لمحہ، محشر ہے جو گزرا
اب مرے امروز کو اندیشہ، فردا

دل کے ٹکڑوں کو سپردِ خاک کر کے
کاروبارِ زندگی چلتا رہا ٹھہرا

میں بھی سرگرمِ سفر ہوں، تو بھی سرگرم
موت سے منزل بدلتی ہے سفر رکتا

رات بھر کل رفتگاں سے گفتگو ہوتی
جانے والوں سے دل کا سلسلہ جاتا

ooo

محمود ایاز

٥

نہ کوئی برقِ تجلی نہ کوئی عرشِ بریں
فلک کو دیکھ کے بیٹھے ہوے ہیں اہلِ زمیں

سبھی کے درد جدا ہیں ، سبھی کے غم تنہا
کوئی شریکِ سفر اہلِ کارواں میں نہیں

خیالِ یار بجز تیرے کس سے بات کریں
ہوائے دشت بجز تیرے کوئی ساتھ نہیں

بہت قریب سہی دل سے یادِ دوست مگر
یہ ارتباطِ دل و جاں بھی عمر بھر کا نہیں

دلِ گداز کو حرفِ دعا نہیں آتا
رضائے دوست کو دستِ دعا کی شرط نہیں

٥٥٥

٥

آہ بھی نارسا نہ تھی ، درد بھی لادوا نہ تھا
دل پہ ہجومِ یاس تھا دست دعا نہ اٹھ سکا

تیری محبتیں بھی سچ ، میری وفا بھی بے غرض
پر اک انا تھی درمیاں جس نے ہمیں جدا کیا

ایک تڑپ تھی عمر بھر ایک طلب تھی جاں کے ساتھ
میں نہ جسے سمجھ سکا ، دل نے اسے خدا کہا

آج ہوائے صبح دم یاد تری جگا گئی
دل کہ سکونِ غم میں تھا ، آنکھ کھلی تو رو پڑا

٥٥٥

محمود ایاز

اشعار

یاد رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم
چاند تارے بھی شب گزیدہ ہیں
وہ نہیں ہے نہ سہی ترکِ تمنا نہ کرو
انھیں کے سائے سے بچ کر چلے ہیں عمر تمام
کیسی یادوں کے نقش دل سے مٹے
رفیق و یار کہاں اے حجابِ تنہائی
خاشاکِ آرزو سے جلائی ہے دل کی آگ
جلے تو راکھ ہوئے ہم ۔ مگر وہ ابرِ کرم
کرشمہ سازِ ازل کیا طلسم باندھا ہے
منظر ہر اک ، حیات کا ، پرچھائیوں میں ہے
ہوس وہ کاسہ ، سائل کہ ہر نفس خالی
وہ مرے ساتھ ہے سائے کی طرح
خانہ ۔ دل میں تھا کیا کیا نہ امیدوں کا ہجوم
غمِ حیات کی چوکھٹ پہ جھک رہی تھی زمیں
سکونِ کنج نشیمن کا لطف ملنے لگے

بھول جاؤ تو فاصلہ ہے بہت
سرِ مژگاں کوئی چراغ جلے
دل اکیلا ہے اسے اور اکیلا نہ کرو
گرہ کشائے زمانہ تھی عقلِ کل جن کی
وقت کے سارے زخم ، وقت علاج
بس اپنے چہرے کو تکتا ہوں آئینہ رکھ کے
میرے سبھی ہنر مری بربادیوں میں ہیں
ہے منتظر کہ ابھی کوئی آگ ہے نہ دھواں
پریدہ رنگ ہے ہر نقش ، پھر بھی پیارا ہے
اک عمرِ بے ثبات مرے آنسوؤں میں ہے
بہم ہے دولتِ کونین ، دل تہی مایہ
دل کو ضد ہے کہ نظر بھی آئے
خانہ ویراں ہے تو راضی بہ رضا بیٹھے ہیں
کہاں پہ آ کے تری یاد نے سنبھالا ہے
ابھی وہ بات گراں بارِ قفس میں نہیں

○ ○ ○

سید اختر حسن

یادوں کی سیرگاہ

(دوسری قسط)

کالج کی زندگی:

ایف ۔ اے میں ، میں نے اردو فارسی اور تاریخ اسلام مضامین لیے اور " مسرت منزل " ہاسٹل میں رہنے لگا " مسرت منزل " کی عمارت اس وقت عابد روڈ کے آخری سرے سے کچھ پہلے چراغ علی گلی سے ملی ہوئی سڑک پر تھی اور اس کے دو حصے تھے ان میں کوئی ایک سو طالب علموں کے قیام و طعام کا انتظام تھا اس کے مؤدب مقیم جناب وحید الرحمان صاحب بہار کے رہنے والے اک باوقار پر تمکنت شخصیت کے مالک تھے جو اپنے مخصوص لہجے میں اپنی ایجاد کردہ تراکیب پر مشتمل خصوصی اردو بولتے تھے ۔ ان کے لطیفے مسرت منزل سے نکل کر جامعہ عثمانیہ کے تمام حلقوں میں اور دوسرے اقامت خانوں میں بھی عام ہوگئے تھے ۔ ایک لطیفہ ان کا بہت مشہور ہوا ، ہر محفل میں دوہرایا جاتا تھا ۔ ہمارے اقامت خانے کے کسی ساتھی کا انتقال ہوگیا تو ہم نے ان سے جاکر کہا اس کا تعزیتی جلسہ کرنا ہے تو انھوں نے کہا اچھا میں ابھی نوٹس نکالتا ہوں چناں چہ بہ دست خود انھوں نے نوٹس نکالا: " کہ بہ تقریب انتقال ..... وغیرہ وغیرہ " ایسی باتیں وہ بہت کرتے تھے جو لطیفہ بن جاتی تھیں ۔ بہ ہر حال ہاسٹل کا ماحول بہت اچھا تھا ۔ میرے کمرے میں ہم کل چار ساتھی تھے ایک نجم الدین انصاری جو بعد میں سیول سروس میں آگئے ۔ پولیس ایکشن کے بعد حیدر آباد کے کلکٹر بھی رہے ۔ ان سے میری بہت دوستی تھی وہ بے حد ذہین تھے ، آخر زندگی میں خاکسار تحریک میں شریک ہوگئے تھے اور پاکستان چلے گئے ۔ سنا وہاں بہت بری حالت میں رہے ۔ وہ ضیاء الدین انصاری کے جو انجینیرنگ کالج میں لکچرر تھے چھوٹے بھائی تھے ۔ دوسرے روم میٹ ایک ہریش چندر استھانہ تھے جو حیدر آباد کی ایک مشہور کایستھ فیملی " استھانہ " سے تھے ۔ ان سے میرا بہت یارانہ تھا ۔ ہمارے خاندان کی کئی تصویروں میں بھی وہ موجود ہیں ۔ بہت کم عمری میں گزر گئے ۔ تیسرے ساتھی کون تھے ؟ یاد نہیں رہا ۔

میرے جو اب بہنوئی ہیں لطیف الحسن برنی کناڈا میں ان کا ۲۴ / ڈسمبر ۱۹۹۳ء کو انتقال ہوگیا ۔ وہ میرے ہم جماعت تھے اور ساتھ کے کمرے میں رہتے تھے ۔ ان کے مضامین سائنس کے تھے مگر ان کا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر ہمارے ساتھ ہی ہوتا تھا ۔ وہ نجم الدین انصاری اور ہریش چندر کو پہلے سے جانتے تھے ۔ اسی زمانے میں ہم کو سنیما کی لت پڑی اس وقت جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی ۔ ہر جمعہ کو ہم چار پانچ ساتھی ساتھ نکلتے ، راستے میں ایک ایک " ٹوما " یعنی سگریٹ خریدتے ، کہیں چائے خانہ میں بیٹھ کر چائے پیتے اور میٹنی شو سے لے کر سیکنڈ شو دیکھ کر لوٹتے ۔ ہاسٹل کا گیٹ بند ہوجاتا تو دوسرے راستے سے اندر داخل ہوتے ۔ وارڈن عبدالرحمان جانتے تھے کہ ہم اکثر جمعہ کو رات دیر سے آتے ہیں اور دیوار پھلانگ کر پچھلے کے راستے سے ۔ مگر انھوں نے صرف ایک دو بار تنبیہہ کی اور کچھ نہیں کہا ۔ اچھے آدمی تھے وہ ۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد ہمارا یہ سنیما بینی کا شوق بھی کم ہوگیا ۔ ہاسٹل میں میں نے قرات بھی سیکھی ۔ ایک بہت اچھے قاری تاج الدین صاحب

تھے ۔ وہ ہاسٹل کے بڑے ہال میں قرات سکھاتے تھے ۔ مسرت منزل میں سکندر علی وجد بھی تھے ۔ ان سے بھی بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی مخدوم بھی اسی زمانے میں ہاسٹل میں تھے مگر "فرحت منزل" میں ۔ مسلم ضیائی بھی ہمارے ہاسٹل کے دوسرے حصے میں تھے ۔ وہ تاریخ کے طالب علم تھے مگر ہمارے ساتھ ان کا بہت ربط ضبط تھا، کاکوری کے رہنے والے تھے ۔ اس زمانے میں ہم طالب علموں کی جو محفلیں ہوتی تھیں بہت شائستہ محفلیں ہوتی تھیں ۔ بحث مباحثے ہوتے تھے، تنقید بھی ہوتی تھی، اختلاف رائے بھی ہوتا تھا، کبھی تکرار بھی ہو جاتی تھی مگر شائستگی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹتا ۔ آج کی نسل میں یہ بات مفقود ہے ۔ اور بڑی یک جہتی تھی سب طالب علموں میں ۔ چناں چہ ایک دسمبر کی چھٹیوں میں جب طالب علموں کا ایک گروہ تعلیمی سفر پر میسور گیا تو باوجود مختلف الخیال طالب علموں کے کبھی کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہوئی ۔ اس تعلیمی سفر میں عبدالوہاب مسلم ضیائی بھی ساتھ تھے ۔ ان کی تاریخی معلومات بہت اچھی تھیں ۔ میسور میں ان کا ساتھ بہت فائدہ مند رہا ۔ ان کی تاریخی معلومات سے ہم نے بھرپور فائدہ اٹھایا ۔ میسور کی تاریخ، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی انگریزوں سے جنگ کی مہمات پر انھوں نے بہت تفصیل سے روشنی ڈالی اور دوران گفتگو میں پہلی مرتبہ انھوں نے تاریخ کے علاوہ کچھ بین قومی سیاست کے بارے میں بھی مجھے بتایا کہ پہلی جنگ عظیم کس طرح ہوئی اور کس طرح ترکی کی سلطنت عثمانی کو اس زمانے میں زوال سے دوچار ہونا پڑا اور پھر روس کے اکتوبر انقلاب کے بارے میں بھی انھوں نے بہت کچھ بتایا غرض میری بصیرت میں ان کی وجہ سے بہت وسعت پیدا ہوئی اور پہلی مرتبہ انقلاب روس اور دنیا کے ان ملکوں کی تاریخی مبادیات سے واقف ہوا جن کے بارے میں میرا علم نہ ہونے کے برابر تھا میسور میں وہ دسہرہ کے تہوار کا زمانہ تھا جو وہاں بہت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے ۔ ہر طرف چراغاں ہوتا ہے ۔ دو دن ہم نے اس کا خوب لطف اٹھایا، پورا شہر گھومے، دسہرے کا جلوس دیکھا پھر بسوں کے ذریعہ سرنگاپٹنم گئے ٹیپو سلطان کو جہاں شہید کیا گیا تھا وہ جگہ دیکھی ۔ اس کے مزار پر بھی گئے، پھر دریائے کاویری کے دامن میں واقع بہت ہی خوب صورت چمنستان اور اس کی پر فضا کیفیات سے لطف اندوز ہوئے ۔ مسلم ضیائی ہر جگہ ہمارے گائیڈ بنے رہے اور میں ان کی تاریخی معلومات سے بہت متاثر ہوا ۔ اس کے بعد سے برس ہا برس تک باوجود بہت سارے اختلاف کے یہ عبدالوہاب مسلم ضیائی میرے خاص رفیق، ہم دم و دم ساز بنے رہے بلکہ گہرے رازدار بھی ۔ گول چہرہ اور سانولے رنگ کا یہ پستہ قد نوجوان جس کے سر کا بہت بڑا رقبہ پیشانی بن گیا تھا، جو نئی باتیں اور ہنسی مذاق بہت کم کرتا تھا بالکل گنوار لگتا تھا مگر جب تاریخی اور علمی باتوں پر اتر آتا تو بہت دل کش اور بڑا اسکالر نظر آتا ۔ وہ میرا ایسا دوست تھا جو قدم قدم پر میرا حبیب لبیب بن کر ہر شکل میں میرے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوتا ۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ میرا سب سے اچھا ساتھی سب سے پیارا دوست اور سب سے مخلص و جان نثار رفیق تھا ۔ زندگی بھر مجرد رہا اور آخر آخر میں پاکستان چلا گیا ۔ جب ۱۹۷۸ء میں مجھے پہلی بار پاکستان جانے کا موقع ملا تو میرا یہ دوست مجھ سے پہلے دوسری دنیا میں پہنچ چکا تھا ۔ مسلم ضیائی، نظر حیدرآبادی، ابراہیم جلیس اپنے تین عزیز دوستوں سے پاکستان میں ملنے کی آرزو تھی لیکن وہ تینوں میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی عالم جاوداں کی طرف جا چکے تھے ۔

میسور کے تعلیمی سفر سے واپس آکر پھر ہم اپنی پڑھائی میں لگ گئے اور غالباً ۱۹۳۳ء یا ۳۴ء میں انٹرمیڈیٹ کیا اور اس کے بعد بی ۔ اے میں داخلہ لیا جہاں بھی میرے مضامین اردو فارسی اور اسلامک اسٹڈیز تھے ۔

بی ۔ اے میں جب میں آیا تو کلاس جامعہ عثمانیہ کی عارضی عمارت میں ہونے لگی تھی اور اب میرا قیام بھی ہاسٹل میں نہیں رہا تھا میری بڑی بہن باجی جمال النساء کی شادی ہو چکی تھی اور میرے بہنوئی عزیز الدین صاحب نے شاید عثمان پورہ میں ایک گھر کرایہ پر لیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ رہنے کو کہا تو میں باجی کے گھر منتقل ہو گیا تھا ۔

کالج کی آمد و رفت لوکل ٹرین کے ذریعے ہوتی تھی یا کبھی کبھی براہ راست سائیکل پر۔ بی۔ اے میں اردو کے میرے اساتذہ سید سجاد صاحب، زور صاحب اور سروری صاحب تھے۔ سجاد صاحب سے تو میرے بہت گہرے روابط پیدا ہو گئے تھے اور میں اکثر ان کے دولت کدے پر جایا کرتا تھا۔ زور صاحب کچھ ہی عرصہ قبل ولایت سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تھے۔ دکنی میں اردو ان کا خاص موضوع تھا ولایت کے کتاب خانوں میں ان کو دکھنی اردو کے تعلق سے بہت گراں قدر مواد ملا تھا جسے انھوں نے مختلف طریقوں سے برتا اور اس طرح اردو زبان کی علمی ادبی تاریخ میں گراں بہا اضافہ کیا۔ ایک بار زور صاحب نے مجھے ایک مضمون لکھنے کو دیا۔ اس زمانے میں میں بہت رنگین عبارت لکھتا تھا۔ شاید اختر شیرانی کا اثر تھا۔ وہ مضمون میرا اسی انداز کا تھا۔ ایک دن زور صاحب کے کمرے میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹاف کے اور بھی کئی لوگ جمع ہیں اور میرا مضمون پڑھ کر سنایا جارہا ہے۔ زور صاحب کو میرا وہ اسٹائل بہت پسند آیا۔ بعد میں زور صاحب سے اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ ان ہی کی مہربانی سے میں کشمیر کی سیر کر سکا اور جب حیدرآباد میں ابوالکلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تو پہلا اسکالر شپ انھوں نے مجھے دیا۔

سروری صاحب کا مطالعہ علم زبان میں بہت گہرا تھا اور اس موضوع پر انھوں نے ایک جامع کتاب بھی لکھی جو اردو میں غالباً اس موضوع پر پہلی کتاب ہے مگر شاعری سے ان کو کوئی خاص لگاؤ نہ تھا مگر ستم ظریفی یہ کہ غالب کا کلام جو نصاب میں تھا اس کی افہام و تفہیم کے فرائض ان ہی کے ذمے تھے جس کی وجہ سے وہ کبھی ذہین طالب علموں کے طنز و مزاح کا ہدف بن جاتے تھے۔

اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر جمیل الرحمان مجھے اب تک یاد ہیں۔ اپنے موضوع پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان سے درس لینے کے بعد تاریخ کی کسی اور کتاب کو پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی اور پروفیسر عبدالحمید خان فارسی کے بہت بڑے اسکالر تھے اور بے حد دوست آدمی۔ کلاس میں آتے تو پہلے ہر طالب علم کو ایک ایک نوٹ بک اور پنسل دیتے پھر لکچر شروع کرتے۔ قصیدے پڑھاتے تھے اور اس خوبی سے کہ مطلب دل پر نقش ہو جاتا۔ دادامیاں کے بعد کسی سے فارسی سیکھی تو وہ عبدالحمید خان صاحب تھے۔ وہ مجرد تھے اور سکندرآباد میں ان کا چھوٹا سا گھر بہت خوب صورت سجا ہوا تھا۔ کوئی طالب علم ان کے گھر جاتا تو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلاتے۔ بہت خاطر تواضع کرتے۔

میری بہن رضیہ کو باوجود بی۔ اے میں ٹاپ کرنے اور مستحق وظیفہ قرار پانے کے یونیورسٹی میں ایم۔ اے فارسی میں داخلہ نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ وہ واحد امیدوار تھی۔ اس کو مجبوراً پرائیویٹ ایم۔ اے کرنا پڑا۔ فارسی قصیدے وغیرہ پڑھنے وہ عبدالحمید خاں صاحب کے پاس سکندرآباد، ملک پیٹھ اسٹیشن سے لوکل ٹرین پکڑ کر جاتی تھیں۔ اس وقت ہم ملک پیٹھ کے ایک کرائے کے مکان میں اٹھ گئے تھے جو اسٹیشن سے قریب تھا... میں نے ۱۹۳۶ء میں بی۔ اے کیا۔ اردو فارسی میں ۹۰ فیصد نشانات لیے۔ لٹریچر میں اس سے پہلے کبھی کسی نے اتنے مارکس نہیں لیے تھے بعد میں البتہ میری بہن رضیہ نے مجھے اس میں beat کیا اس نے ۹۸ فیصد مارکس لیے۔ اردو فارسی میں فرسٹ آنے پر مجھے ماہانہ ۳۰ روپیے وظیفہ ملا اور میں نے ایم۔ اے فارسی میں داخلہ لے لیا۔ ایم۔ اے میں میرے اساتذہ لطیف فاروقی ڈاکٹر نظام الدین اور قاری کلیم اللہ تھے۔ فاروقی لٹریچر پڑھاتے تھے، ڈاکٹر نظام الدین تاریخ ادبیات ایران۔ وہ بہت دلچسپ آدمی تھے میں نے ان کا ایک لکچر جیسے وہ بولتے تھے پورا لکھا تھا جانے کہاں گم ہو گیا۔ ایران کا بڑا سا نقشہ دیوار پر لگا کر بتاتے دیکھو یہ زندہ رود ندی یہاں سے نکلی یہ چلی...... چلی...... آگے کو اوپر کو...... ارے کدھر گئی؟ اب ڈھونڈھ رہے ہیں نقشہ پر وہ کہیں ملتی نہیں...... شاید ادھر کہیں چلی گئی مگر گئی کہاں آخر۔ شاید ریگستان میں جذب ہو گئی...... یہ تھا ان کا انداز پڑھانے کا۔ وہ مولانا روم بھی پڑھاتے تھے۔ ایک دن

تصوف کے تعلق سے کچھ وضاحت کرتے ہوئے "قدم بہ قدم" کی جگہ ایک "قدیچہ سے دوسرے قدیچہ" پر کہا تو مجھے بہت ہنسی آئی مگر استاد کا لحاظ تھا، خاموش رہا..... قاری کلیم اللہ جاوید نامہ پڑھاتے تھے۔ وہ کلاس میں آتے مجھ سے کہتے "پڑھیے" میں جاوید نامہ پہلے ہی پڑھ چکا تھا فرفر پڑھتا اور اشعار کی تشریح بھی کر دیتا۔ وہ آنکھیں بند کیے سنتے رہتے پھر کہتے اچھا پڑھتے ہیں آپ، بس جائیے لیجیے کلاس ختم! وہ دراصل عربی کے ماہر تھے فارسی سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ اس زمانے میں ایم۔ اے میں thesis لکھنا لازمی تھا اور بڑی اہمیت تھی۔ میرے thesis کا عنوان "غالب کی فارسی شاعری" تھا میں نے بہت محنت سے مقالہ لکھا تھا اور وہ باہر کے ممتحن سر محمد اقبال کے پاس گیا تھا انھوں نے مجھے فرسٹ کلاس مارکس دیے۔ یہاں بھی رضیہ نے مجھے beat کیا۔ اس نے ایم۔ اے میں "نظامی گنجوی" پر مقالہ لکھا تھا جو چھپ بھی گیا ہے اور اس کے باہر کے ممتحن غالباً علی گڑھ کے پروفیسر ہادی حسن تھے۔ انھوں نے اس پر یہ ریمارک لکھا میں سو سے زیادہ نمبر دے نہیں سکتا ورنہ اس مقالہ نگار کو ۱۲۵ نمبر دیتا۔

ایم۔ اے میں جب یونس سلیم بھی آکر شریک ہوئے تو ایک دن انھوں نے کہا کہ اعظم صاحب اس لڑکے سے ملنا چاہتے ہیں جس نے اردو میں ٹاپ کیا ہے۔ وہ شاید اعظم صاحب کو پہلے سے جانتے تھے۔ تو وہ لڑکا میں تھا۔ یونس اور میں اعظم صاحب کے گھر گئے اس وقت ان کا گھر خیریت آباد میں تھا اور کہا جاتا ہے کہ جرمن طرز کا وہ پہلا گھر تھا جو انھوں نے خود بنوایا تھا۔ وہ بڑی خوش اخلاقی سے ملے۔ واصف وغیرہ اپنے سب بچوں سے ملایا اور اس کے بعد سے ان کا سلوک میرے ساتھ ہمیشہ بہت مربیانہ رہا اور ان کے لڑکے واصف اعظم سے تو بعد میں دوستی ہو گئی۔ وہ ہمارے جلسوں وغیرہ میں برابر شریک رہتے تھے۔ جب میں ورنگل کالج میں لکچرر تھا وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے تھے۔ میں ان کو مبارک باد دینے ان سے ملنے گیا تو کہا "تم کہاں پڑے ہوئے ہو۔ پی ایچ۔ ڈی کر لو تو میں تم کو حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی بلا لیتا ہوں۔ مگر نہ میں نے پی ایچ۔ ڈی کیا نہ وہ وائس چانسلر رہے، اسی سال انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ میں جب ایم۔ اے کے آخری سال میں تھا تب research assistant کی حیثیت سے مہدی نواز جنگ کے کہنے پر کتب خانہ سالار جنگ میں کیٹلاگنگ کا پارٹ ٹائم کام بھی کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کچھ کام کیے۔ مگر آئیے میں پہلے آپ کو اپنے بی۔ اے کے زمانے کی کچھ باتیں سناؤں یہ زمانہ میری زندگی کا بڑا پر لطف زمانہ تھا۔ کالج میں اچھے استاد۔ اچھا ماحول اور گھر کی فضا بھی بہت دلچسپ اور خوش گوار

اس وقت والد صاحب دھاؤڑہ میں تھے جو کسی نواب قطب الدین کا اسٹیٹ تھا اجنتا سے آگے۔ رضیہ، رابعہ میری بہنیں ابھی اسکول میں شریک نہیں ہوئی تھیں مگر گھر پر ہی اردو فارسی کے ساتھ ڈکشنری کی مدد سے انگریزی بھی سیکھ رہی تھیں اور ادبی مشاغل میں بھی لگی رہتی تھیں۔ بچپن سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ رابعہ کو شاعری سے زیادہ دل چسپی تھی اور رضیہ مضامین اور کہانیاں لکھتی تھی جو بعد میں کچھ مجلہ، عثمانیہ میں چھپیں بھی۔ دونوں نے مل کر اس زمانے میں ایک ناول بھی لکھا تھا۔ ایک ماہ نامہ "تعمیر" ہاتھ سے لکھ کر نکالتی تھیں جس کے سارے مضامین ان ہی کے ہوتے تھے مگر مختلف فرضی ناموں سے۔ افسوس نہ وہ ناول رہی نہ "تعمیر" کے ۸، ۱۰ نمبر جو انھوں نے نکالے تھے۔ میری بڑی بہن باجی کی شادی ہو چکی تھی ان سے خط و کتابت کے لیے ایک کوڈ قسم کا خط بھی ایجاد کیا تھا جسے صرف ہم سمجھ سکتے تھے اور کوئی دوسرا نہیں۔ دھاؤڑہ میں جو ہماری قیام گاہ تھی وہ بستی سے باہر کھلے میدان میں، کچھ خود ساختہ، ۲۰ گز لمبی ایک دیوار اٹھا کر اس پر بہت عمدہ چھپر ڈلوایا گیا تھا اور اندر بید کی جعفری سے پارٹیشن کر کے کمرے بنائے گئے تھے۔ میری بہنوں رضیہ، رابعہ نے اپنا کمرہ بہت عمدہ سجا رکھا تھا جن میں ان کی اپنی ایک چھوٹی سی لائبریری بھی تھی۔ کئی ماہ نامے جیسے خیالستان، الوان، ساقی،

سروش اور نگار ہر ماہ پابندی سے آتے تھے۔ اور سن کی کاڑیوں سے گھیر کر ایک بہت وسیع کمپونڈ بنالیا تھا جس کے تینوں طرف کنارے پر دیسی گلابوں کی باڑ لگائی تھی اور اچھی چمن بندی کی تھی۔ جوہی اور چنبیلی کے منڈوے پھولوں کی کیاریاں اور ایک طرف کچن گارڈن جس میں ہر طرح کی ترکاری لگائی تھی حتی کہ آلو بھی۔ اور باقاعدہ روشیں بنائی گئی تھیں جن کے کنارے سفید پتھر لگائے گئے تھے جو دھوپ میں چمکتے بڑے اچھے لگتے تھے۔ جہاں چمن کی چار روشیں ملتی تھیں وہاں بید کی جعفری کا ایک کمرہ بنایا تھا اس پر نیلے پھولوں کی بیل چڑھائی تھی اور اس کا نام "بیت المقدس" رکھا تھا۔ جب کسی مسئلے پر بحث کرنی ہوتی تو سب وہاں اکٹھے ہوتے اور اکثر ہمارے والدین بھی اس میں شریک رہتے..... چھٹیوں میں جب میں وہاں جاتا۔ باجی بھی آجاتیں تو بڑا لطف رہتا۔ ہر روز رات میں "بیت المقدس" میں شبینہ کی محفل جمتی تھی۔ والد صاحب اس کے صدر ہوتے تھے یہ "شبینہ" ہماری اپنی ایجاد تھی۔ اس میں ہم سب بھائی بہنوں کو روزانہ دو نئے شعر سنانے ہوتے تھے جو اچھے ہوں اور کسی دوسرے کو یاد نہ ہوں۔ کوئی غلط شعر پڑھتا یا شعر دوسرے کو یاد ہوتا تو صدر اسے القط کر دیتا تھا۔ ہم دن بھر ایک دوسرے سے چھپ کر نئے شعر تلاش کرتے رات کو محفل شبینہ میں سنانے کے لیے۔ والد صاحب پاس شعرا کے کئی دیوان تھے ان کی اپنی بہت ضخیم بیاض بھی تھی اور شاید وہیں ہم نے "شب ماہ" منانے کی بھی ایک رسم ڈالی تھی جو ۱۴ ویں کی شب منائی جاتی تھی اور اس میں یہ التزام ہوتا تھا کہ ہر شخص سفید لباس پہنے اور کھانے پینے کی چیزیں بھی سب سفید ہوں اور تقریباً پوری رات کھیل کود شعر شاعری بیت بازی وغیرہ میں جاگ کر گزاری جاتی تھی۔ یہ "شب ماہ" ہم بعد میں بھی عرصے تک مناتے رہے۔ جہاں کہیں والد صاحب ہوتے اور چھٹیوں میں ہم سب اکٹھے ہوتے تو "شب ماہ" ضرور مناتے۔ جھاڑوں کی کاڑیاں چھوٹی چھوٹی کاٹ کر اس سے کاغذی پھولوں کے ہار بنائے جاتے اور صحن میں اس کا منڈپ بنایا جاتا۔ غرض بڑا بے فکری کا زمانہ تھا وہ۔ دھاؤڑہ کا ایک اور واقعہ ہے۔ ایک بار چھٹیوں میں جب میں دھاؤڑہ گیا تو میرے ایک دوست صفی الدین بھی میرے ساتھ چند روز کے لیے آئے۔ دھاؤڑہ میں بہت گھنے جنگل ہیں پہاڑی علاقہ اور وہاں شیر بور بچے وغیرہ بھی اس زمانے میں تھے۔ ہم نے ایک دن شکار کا پروگرام بنایا اور ایک چپراسی کو لے کر کافی دور پہاڑی پر وہاں تک پہنچ گئے جہاں دوسری طرف خاندیس کا علاقہ تھا۔ ہمارے پاس چھرے کی بندوقیں تھیں۔ ہم ایک ٹیلے پر کھڑے تھے کہ یکایک چٹان کے نیچے سے ایک شیر نکلا۔ ہم نے فوراً بندوقیں تان لیں۔ چپراسی نے ہمارے ہاتھ پکڑ لیے اور اس طرح ہم سے لپٹ گیا کہ ہم ہل نہ سکے کہ کیا غضب کرتے ہیں صاحب آپ لوگوں نے بندوق چلائی تو شیر پلٹ کر حملہ کر دے گا۔ تو اس چپراسی کی وجہ سے ہم بچ گئے شیر سیدھا شاہانہ انداز سے چلتا چند ہی منٹ میں سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر غائب ہو گیا۔ شیر، بور بچے دھاؤڑہ میں بہت تھے۔ بور بچہ کبھی کبھی گاؤں میں آکر کسانوں کے بچھڑے، بکریاں اٹھالے جاتا۔ وہاں کے لوگ اتنے نڈر تھے کہ لاٹھیاں لے کر اس کے پیچھے دوڑتے اور اسے مار کر بھگا دیتے اور اپنے جانور چھڑا لاتے۔ ایک دفعہ تو ایک بور بچہ ہمارے ورانڈے میں آکر بیٹھ گیا جہاں چارپائی پر چپراسی سو رہا تھا اس رات بارش ہو رہی تھی۔ والد صاحب نے کسی کام سے دروازہ کھولا اور قندیل اونچی کی تو دیکھا وہاں بور بچہ صاحب چپراسی کی چارپائی کے قریب لیٹے ہیں۔ فوراً دروازہ بند کر کے چپراسی کو آواز دی۔ بتایا اس کو تو گھگھی بندھ گئی اور بور بچہ خاموشی سے اٹھ کر پیچھے جنگل میں جاکر اتنی زور سے دھاڑا کہ ہمارے دل دہل گئے۔

والد صاحب کوئی ۵ سال دھاؤڑہ میں رہے۔ یہ زمانہ سیر و تفریح کے ساتھ ہماری ادبی ایکٹیوٹیز کا بہت دلچسپ اور اچھا زمانہ رہا۔ میں نے اور رضیہ نے اسی زمانہ میں انگریزی سے اردو میں کچھ ترجمے بھی کیے۔ رضیہ نے ایڈورڈ کارپنٹر کی کتاب "Towords Democracy" کی کئی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا اور "ایوان" کو بھیجا جو مجنوں گورکھ پوری نکالتے تھے۔ انھوں نے اسے اپنے

رسالے میں چھاپا اور رضیہ کے خط کے جواب میں ایڈورڈ کارپنٹر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا اور مشورہ دیا کہ آپ کا ترجمہ بہت اچھا ہے، آپ اور نظموں کے ترجمے کیجیے اور کتابی شکل میں چھپوائیے۔ رضیہ کی مجنون گورکھپوری سے مستقل خط و کتابت تھی۔ مجنون کے بہت سے خطابیں رضیہ کے پاس ہیں۔ اسی دوران میں جب میری دونوں بہنیں رضیہ، رابعہ حیدرآباد آکر بائی اسکول میں شریک ہوگئیں اور ایک چھوٹا بھائی انور بھی پڑھنے کے لیے آگیا اور باجی کے گھر میں ہم سب بھائی بہن اکٹھا ہوئے تو یہاں بھی ہم نے " بزم احباب " نام سے ایک انجمن بنائی جس کے ایک دو کے علاوہ، ہم سب گھر والے ہی ممبر تھے۔ بعد میں جب ہم لوگ ملک پیٹھ کے بڑے گھر میں گئے تو اور بھی کچھ دوسرے افراد کو اس کا ممبر بنایا۔ لیاقت اور ریاست (جو اب میری بیوی ہیں) اسی اسکول میں پڑھتی تھیں جہاں میری بہنیں پڑھ رہی تھیں۔ ان سے دوستی ہوگئی تھی۔ ان کے والد آبکاری کے محکمہ میں ملازم تھے اور بہت روشن خیال تھے۔ ان کا کنبہ بہت بڑا تھا لیاقت، ریاست کے علاوہ شوکت (کیفی کی بیوی) سردار، ظفر، قمر کئی تو لڑکیاں تھیں اور تین چار لڑکے مگر شروع میں دو بڑی بہنوں سے ہی زیادہ ملنا جلنا رہا۔

ملک پیٹھ کا مکان بہت بڑا تھا اس کے دو حصے تھے اندر باہر۔ اندر بھی بہت وسیع آنگن تھا اور باہر بھی اور مکانیت بھی بہت زیادہ، دو تو بڑے بڑے دالان، ۷، ۸ کمرے، ایک طرف دو کمرے خاصے بڑے بالکل الگ سے تھے اس میں باجی اور عزیز بھائی رہتے تھے اور ایک کمرہ والدین کے لیے محفوظ رہتا تھا کہ جب بھی وہ شہر آئیں اس میں رہ سکیں۔ بہنوں کے پاس بھی ایک کمرہ تھا اور ہمارے اور کچھ رشتہ دار بھی وہاں ہمارے ساتھ رہے۔ میری والدہ کی بڑی بہن جن کو ہم نانی جان کہتے تھے وہ بھی عرصہ تک ساتھ رہیں۔ آنگن میں ایک بالکل الگ سا کمرہ تھا وہ اس میں رہتی تھیں۔ باہر ایک طرف دو کمرے تھے اس میں سے ایک میں میرے دوست مسلم ضیائی رہتے تھے اور ایک چبوترے پر ایک بہت بڑا کمرہ اور دراندہ تھا اس میں میں رہتا تھا۔ اتنا بڑا تھا وہ مکان اور کرایہ صرف ۵۰ روپیے۔ میری بہن رابعہ کی شادی اسی مکان میں ہوئی تھی۔ دالان میں دسترخوان بچھا تھا وقت واحد میں ۵۰، ٦۰ آدمی بیٹھتے تھے کھانے پر۔ تو یہاں ہماری " بزم احباب " انجمن کافی پھلی پھولی۔ یہاں ہم نے از سرنو اس کی تنظیم کی۔ قاضی عبدالغفار صاحب سے اس کا باقاعدہ افتتاح کروایا۔ اس میں اور بھی کچھ اہل ذوق ادیبوں کو بلایا تھا جیسے ماہر القادری، مسلم ضیائی، ہریش چندر استھانہ، لطیف الحسن برنی وغیرہ۔ اس جلسے میں رضیہ نے اپنی کہانی " دادی اماں " سنائی تھی جو بعد میں مجلہ عثمانیہ میں چھپی اور رابعہ نے اقبال کی شاعری میں جو " تصور نسواں " ہے اس پر بہت تلخ تنقیدی مضمون لکھا تھا اور میری سب سے چھوٹی بہن ذکیہ نے " کھیر " پر مزاحیہ مضمون پڑھا تھا۔ میں نے ایک نظم اور ماہر القادری نے ایک بہت پھڑکتی ہوئی نظم " نیند کی ماری ایک دوشیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے " سنائی۔ قاضی صاحب نے سب کی بہت تعریف کی۔ رابعہ کا مضمون ان کو بہت پسند آیا جیسے انھوں نے " پیام " کے سنڈے ایڈیشن میں چھاپا بھی۔

بزم احباب میں یوں تو ہم نے بہت سے مشاہیر کو بلایا۔ ان کی تقریریں رکھیں، لکچر سنے لیکن ایک خاص شخصیت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی ہے۔ قاضی صاحب کے توسط سے ہم نے ان کو اپنی " بزم احباب " میں بلایا تھا اور اس دن صرف ان ہی کی تقریر کا پروگرام رکھا انھوں نے برلن سے غالب کا ایک چھوٹا سا اڈیشن چھاپا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ باتیں کہیں اور اپنے برلن کے تجربات کا ذکر کیا۔ بڑی اچھی صحبت رہی تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ وہ ہمارے ساتھ رہے۔ ہماری بزم " احباب " کی بہت تعریف کی اور ہماری بے حد ہمت افزائی کی۔ ان ادبی محفلوں کے ساتھ اس گھر میں اور بھی ایکٹیویٹیز رہتی تھیں، " شب ماہ " منائی جاتی تھی، کچھ ان کے مقابلے ہوتے تھے، دعوتیں ہوتی تھیں والی بال ٹینس کھیلتے تھے، کبڈی بھی ہوتی تھی، احمد علی صاحب یعنی ریاست کے والد کے گھرانے سے بھی روابط پیدا ہوگئے تھے۔

ں طرف سے آنا جانا رہتا تھا ۔ اور ان کے توسط سے مشیر آباد والوں سے بھی روابط پیدا ہوگئے تو پھر وہاں بھی محفلیں جمنے لگیں، کبھی لک، کبھی پکنک، کبھی پتنگ بازی کے مقابلے ۔ لڑکے لڑکیاں سب مل کر خوب enjoy کرتے پردہ وردہ ختم ہو چکا تھا ۔

اور اس سب کے ساتھ ہماری تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا ۔ جیسا کے میں نے اوپر ذکر کیا جب میں ایم ۔ اے کے آخری سال میں تو میں نے کچھ اور کام بھی کیے مثلاً سالار جنگ لائبریری میں کٹیلاگنگ کا کام اور کچھ دنوں "پیام" اخبار میں بھی کام کیا جسے اس وقت ی عبدالغفار نکالتے تھے ۔ قاضی صاحب سے " بزم احباب " کے وقت سے جو رابطہ پیدا ہوا تھا وہ نہ صرف برقرار رہا بلکہ رفتہ رفتہ ہم ان ۔ اور قریب ہوتے گئے ۔ جب ۱۹۳۸ء میں میں نے ایم ۔ اے کر لیا تو صحافت سے دل چسپی کی بنا پر میں لندن اسکول آف جرنلزم سے ۔ سال کا ڈپلوما کورس کرنا چاہا ۔ درخواست دی ۔ داخلہ مل گیا ۔ والد صاحب اخراجات برداشت کرنے پر بھی آمادہ ہوگئے مگر ۳۹ء میں ۔ چھڑ گئی ۔ میرا خواب چکنا چور ہو گیا تو میں نے ایل ایل ۔ بی میں داخلہ لے لیا اور قاضی صاحب سے مل کر کہا اب باہر تو نہیں جا سکتا ۔ کے ساتھ ہی صحافت کا کچھ تجربہ حاصل کرنا چاہتا ہوں ۔ انھوں نے کہا "بہت شوق سے ۔ " اس وقت "پیام" کا دفتر وہاں تھا جہاں اب ۔ اکیڈمی ہے ۔ میں ان کے دفتر جانے لگا ۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کو مجھ پر اتنا اعتماد ہو گیا کہ وہ کسی آپریشن کے لیے مہینے ڈیڑھ مہینے چھٹی پر جانے لگے تو انھوں نے مجھ سے کہا "میری غیر حاضری میں ایڈیٹوریل تم لکھنا" اس وقت عبدالقادر جیلانی اور شبلی بھی "پیام" ں کام کرتے تھے مگر قاضی صاحب نے نہ جانے کیوں میرا انتخاب کیا ۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے حتیٰ کہ میرے لنچ کا انتظام بھی انھوں ۔ اپنے گھر سے کروا دیا تھا ۔

اسی زمانے میں ایک اردو لکچرر کی پوسٹ کے لیے اعلان ہوا مگر میں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی کیوں کہ میں نوکری کرنا یں چاہتا تھا ۔ ایک روز سید سجاد صاحب پروفیسر اور صدر شعبہ، اردو جامعہ، عثمانیہ جو قاضی صاحب کے بہت دوست تھے ان سے ملنے ز آئے ۔ وہ مجھے زمانہ، طالب علمی سے ہی بہت چاہتے تھے ۔ انھوں نے قاضی صاحب سے کہا ورنگل کالج میں اردو فارسی کی ایک پوسٹ کا ان ہوا ہے، آج آخری تاریخ ہے، اختر کی اب تک درخوست نہیں آئی ہے ۔ قاضی صاحب نے مجھے بلا کر پوچھا درخوست کیوں نہیں دی یں نے کہا مجھے اس سے کوئی دل چسپی نہیں ہے میں نے تو اعلان دیکھا بھی نہیں ۔ سجاد صاحب نے ڈانٹ کر قاضی صاحب کے توسط سے م دیا " اس سے کہو آج کی تاریخ میں کل مجھے درخواست لا کر دے ۔ " قاضی صاحب نے بھی ڈانٹا تو آخر میں نے درخواست دے دی ۔ ز یو کا بلاوا آیا تو دیکھا ایک پوسٹ کے لیے کوئی ۲۵، ۳۰ ۔ امیدوار تھے ۔ اردو فارسی کی combined پوسٹ تھی صرف ڈیڑھ سو ۔ پے ماہانہ مشاہرہ جو بعد میں ڈھائی سو ہو گیا ۔ انٹرویو ہوا ۔ قاضی محمد حسین وائس چانسلر، حسین علی خان (راشد آزر کے والد) اور سجاد احب تین ماہرین نے انٹرویو لیا ۔ میرے کلاس میٹ اشفاق حسین بھی ایک امیدوار تھے اور دوسرے کئی ساتھی تھے ۔ مختلف سوالات ئے ۔ میں نے سب کے برجستہ جواب دیے ۔ حسین علی خان صاحب نے اسپورٹ کے بارے میں بہت سوال کیے ۔ کرکٹ سے دل پی ہے ؟ فٹ بال کھیلتے ہو ؟ وغیرہ وغیرہ ۔ ہر ایک کا ہمارا جواب نفی میں تھا تو انھوں نے قاضی محمد حسین وائس چانسلر سے کہا " اس کا طلب یہ ہے کہ اس نے زندگی " لہو و لعب " میں نہیں گزاری ۔ " اب تک مجھے ان کی یہ بات یاد ہے ۔ تو غرض اس بنیاد پر کہ فارسی کا ایم ے اردو پڑھا سکتا ہے میرا انتخاب ہو گیا ۔ میری زندگی میں ایک نیا موڑ آیا ۔ یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے ۔ مگر اپنی زندگی کے ذکر سے پہلے ں آپ کو کچھ قاضی عبدالغفار صاحب کے بارے میں بتا دوں ۔ میں تقریباً ۶ مہینے قاضی صاحب کے گھر بھی رہا تھا اور ان کی زندگی کے ۔ سے میں ان سے میں نے جو سوالات کیے تھے اور انھوں نے جو باتیں بتائیں وہ میرے ذہن میں اب تک محفوظ ہیں اور چاہتا ہوں وہ بط تحریر میں آ جائیں ۔

قاضی عبدالغفار

قاضی عبدالغفار کے دادا کو ۱۸۵۷ء کی شورش میں بغاوت کے جرم میں پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ یہیں سے ا
زندگی شروع ہوتی ہے۔ "میرے والد نے اس کے بالکل برعکس انگریز سرکار سے خان بہادر کا خطاب حاصل کیا مگر میں شروع سے دا
نقش قدم پر چلتا رہا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی باغیانہ ذہن رہا۔ والد صاحب کی وجہ سے مجھے سرکاری نوکری مل گئی تھی" اس ضمن
انھوں نے ایک دل چسپ واقعہ سنایا کہ "ایک بار میں دورے پر گیا تو ڈاک بنگلہ میں ٹھیرا۔ سامان وہاں رکھ کر Inspection کے
چلا گیا۔ وہاں سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں ایک انگریز بہادر نیم برہنہ کرسی پر دراز ہیں نیم خوابی کی حالت میں اور میرا سامان انھوں نے ا
باہر پھنکوا دیا ہے۔ میری ان سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کچھ بدتمیزی کا جواب دیا۔ مجھے اتنا غصہ آیا کہ میں نے انھیں کی بید کی چھڑی جو کرسی
قریب رکھی تھی اٹھا کر ان کو مارنا شروع کیا اور دیر تک وہ آگے اور میں پیچھے دوڑتے رہے اور میں نے اتنا مارا کہ ایک درخت سے ٹکرا
تقریباً نیم بے ہوش گر پڑے۔ وہاں سے واپس آکر میں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور مراد آباد چلا گیا"۔

مراد آباد کے تھے قاضی صاحب اور بڑی عجیب زندگی تھی ان کی۔ انھوں نے بتایا کہ "میں نے میٹرک کے بعد زیادہ تعلیم حاصل
کی۔ علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ میں شریک ہوا مگر مجھے پڑھائی سے زیادہ اس زمانے کی سیاسی تحریکات اور صحافت سے دل چسپی تھی۔ میر
زمانے سے مضامین لکھنے لگا تھا جو مختلف اخبارات میں چھپتے تھے۔ چناں چہ جب ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی جوہر نے "ہمدرد" نکالا تو انھو
مجھے اپنے اسٹاف میں شریک کر لیا۔ میں ایک ۲۴ سالہ نوجوان اور وہاں ظفر علی خاں دہلوی جیسے بڑے بڑے لوگ۔ محمد علی نے مجھے صح
کی تربیت دی۔ "ہمدرد" دہلی سے ۱۳ء میں نکلا اور ۱۴ء میں پہلی جنگ شروع ہو گئی۔ مولانا محمد علی گرفتار کر لیے گئے۔ ان کے اشارے
کلکتہ چلا گیا۔ ظاہر ہے "ہمدرد" بند ہو گیا۔ کلکتہ جا کر وہاں سے میں نے ایک اخبار "جمہور" نکالا وہ میرا سب سے کامیاب اخبار تھا۔
سال کے اندر ہی اس کی اشاعت تیرہ ہزار سے زیادہ ہو گئی۔ بہت popular اخبار تھا وہ اور مجھے اس پر بڑا فخر تھا۔ لیکن ایک سال بعد
بھی گرفتار ہو گیا۔ وہ اخبار بھی بند ہو گیا۔

جیل سے رہا ہو کر دہلی سے میں نے "صباح" نکالا مگر ۶ ماہ بعد ہی اس کی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ ۱۳ء سے ۱۷ء، ۱۸ء تک میں قید فرنگ
رہا یا اخبارات نکالے۔ اس زمانے میں خلافت کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ "آپ کو یاد ہو گا خلافت تحریک کے سلسلے میں ایک وفد بہار
لندن گیا تھا۔ یہ وفد بحری راستے سے گیا تھا۔ قاضی صاحب نے اس سفر کی، انگریز حکمرانوں کی رعونت ان کے طرز عمل انداز گفتگو و غ
پوری روئیداد لکھی ہے جو "نقش فرنگ" نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اردو میں شاید ہی اتنے بلند معیار کا کوئی سفرنامہ ہو۔ وہ
تاریخ بھی ہے اور ایک سیاسی ڈاکومنٹری بھی۔ اس کا انداز بیان اتنا خوب صورت اور دل کش ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ قاضی صاحب
ادبی کارنامہ تھا۔ یہ کتاب اب ناپید ہے۔ شاید سری نواس لاہوٹی کے پاس ہو۔ میرا خیال ہے ۱۹۵۷ء سے لے کر آج تک کی بہت سی نا
کتابوں کو پھر سے چھاپنا چاہیے اور یہ کام اکیڈمی کو کرنا چاہیے۔ ایسی کتنی ہی نادر کتابیں ہیں جو ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کو محفوظ کرنے
ایک طریقہ ہے۔ قاضی صاحب کی اور بھی کئی کتابیں ہیں۔ کتاب "آئینہ" ہے وہ بھی ناپید ہے۔ اس کا تو موضوع تک نہیں معلوم۔

خلافت وفد ۱۹۲۲ء میں واپس آیا۔ اس کے بعد قاضی صاحب کو شوق ہوا کہ وہ یورپ میں جا بسیں تو وہ فرانس چلے گئے اور وہاں
زمانہ قیام میں ناکام تجارت بھی کی۔ وہ ۴ سال وہاں رہے۔ ۱۹۲۶ء میں ہندوستان لوٹے۔ اپنے فرانس کے دوران قیام میں انھوں نے بھی
و کاوش سے "آثار جمال الدین افغانی" کتاب لکھی جو اب تک مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ یورپ سے واپس آکر ۲۷ء میں صرف ۲۶ دن کے

اندر انھوں نے "لیلیٰ کے خطوط" لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ خود کہتے تھے "۲۶ دن میں مسلسل لکھتا رہا، مجھ پر لکھنے کا جنون سوار ہو جاتا ہے تو پھر کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ صرف ۲۶ دن میں وہ پوری کتاب لکھ ڈالی۔ اس کے بعد "مجنوں کی ڈائری" لکھی اور کچھ ترجمے بھی کیے۔ لیلیٰ کے خطوط "پہلے قسط وار نیرنگِ خیال میں چھپی تھی۔ اس کا انداز بیان بہت خوب صورت ہے اور اس کا موضوع اس وقت کا اہم سماجی مسئلہ عورت کی محکومی، محرومی اور مجبوری ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت کو جس طرح ذلیل و خوار کیا جاتا ہے اس کے اسباب انھوں نے خود اس کی زبانی بیان کیے ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کی "امراؤ جان ادا" اور "لیلیٰ کے خطوط" میں فرق صرف انداز بیان کا نہیں نقطۂ نظر کا بھی ہے۔ دونوں کی ہیروئن ایک طوائف ہے مگر دونوں میں بڑا فرق ہے "لیلیٰ کے خطوط" کی ہیروئن ایک روشن خیال ڈانسر ہے اور اس کی روشن خیالی خود مصنف کی پیدا کردہ ہے اور قاضی صاحب کے انداز بیان کا تو جواب نہیں وہ ایک عظیم صاحب طرز قلم کار تھے۔

پتہ ہے آپ کو قاضی صاحب ۱۹۳۳ء میں یہاں حیدرآباد کس کے اشارے پر آئے تھے؟ مولانا آزاد کے اشارے پر...... حیدرآباد سب سے بڑی آزاد خود مختار ریاست تھی جو جاگیرداری نظام میں جکڑی ہوئی تھی اور یہاں کے لوگ بہت پس ماندہ تھے۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کوئی ایسا شخص وہاں جائے جو اس کے اندھیروں کو چیرنے اور آزادی کی تحریک کو بڑھاوا دے تو قاضی صاحب سے بہتر کون ہو سکتا تھا۔ مولانا کے قاضی صاحب کے بہت پرانے روابط تھے۔ قاضی صاحب یہاں آئے کئی خطوط لے کر پھر بھی وہ بتاتے اخبار کا declaration ملنے میں کوئی ڈیڑھ سال لگ گیا۔ ۱۹۳۴ء میں انھوں نے اخبار "پیام" نکالا۔ وہ اپنے انداز کا پہلا اخبار تھا۔ یہاں سے اس وقت اور بھی کئی اخبار نکلتے تھے مشیر دکن، صحیفہ، رہبر دکن، صبح دکن، وغیرہ۔ اچھے اخبار تھے سب مگر پیام کا لہجہ، اس کی آواز بالکل نئی تھی۔ وہ روز نامہ تھا مگر ہفتہ میں ۶ دن نکلتا تھا۔ جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی۔ ہر اخبار کی قیمت اس وقت ایک آنہ تھی۔ پیام کا سرکیولیشن قاضی صاحب نے بتایا تھا کہ ۷ ہزار کے قریب تھا، رہبر دکن کا تقریباً ۲۰ ہزار...... وہ مخالف کمیونزم اخبار تھا اور قاضی صاحب نہ صرف comunism - Pro تھے بلکہ اتنے وسیع ذہن اور روشن فکر تھے کہ جہاں کہیں روشن خیالی، اقلیت دوستی اور یک جہتی کا سوال اٹھتا نظریں قاضی صاحب ہی کی طرف اٹھتی تھیں۔ ان کی شخصیت میں بڑا اجادو تھا اور ایک حلقے میں وہ بے حد مقبول تھے۔ وہ صحیح معنی میں ترقی پسند تھے۔ ریاست حیدرآباد کی ان ساری تحریکوں کی انھوں نے سرپرستی کی جو ترقی پسندانہ تھیں۔ مجھے یاد ہے شروع شروع میں جب وہ ابھی یہاں زیادہ مشہور نہیں ہوئے تھے انھوں نے میرے سامنے ایک تجویز رکھی کہ ایک ایسی محفلِ شعر و سخن ترتیب دی جانی چاہیے جس میں صرف نئے شاعروں اور ادیبوں کو بلایا جائے۔ وہ دراصل یہاں کے، خاص طور سے یونیورسٹی کے جو فارغ التحصیل طلبہ تھے اور ان میں جو ادیب و شاعر تھے ان سے ملنا اور حیدرآبادی تہذیب سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ چناں چہ انتخاب کا کام انھوں نے مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ تو اس طرح ان ہی کے گھر پر جس میں یہ محفل جمائی گئی، مخدوم شاہد صدیقی، حسرت ترمذی، مرزا ظفرالحسن، علی حسنین زیبا، جلال الدین اشک، ابو نصر فتح اللہ، عبدالقیوم باقی، شعیب حزیں اور کئی نوجوان اہل قلم کوئی ۵۰، ۶۰ لوگ تو جمع ہو گئے تھے۔ شعیب بڑا اچھا شاعر تھا۔ اسکول میں میرے ساتھ تھا بعد میں پاکستان چلا گیا اور وہاں ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ ہو گیا۔ شاعروں کے ساتھ کچھ نوجوان نثر نگار بھی تھے۔ ان کے نام اس وقت ذہن میں نہیں...

ورنگل کالج

تو دیکھیے یہاں کی یہ ساری دل چسپیاں پیام اخبار کی اپنی دل چسپی کی اچھی مصروفیت اور قاضی صاحب کا ساتھ چھوڑ کر مجھے ورنگل جانا پڑا۔ یہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ وہاں اردو فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے میرا تقرر ہو گیا تھا۔

میں بادلِ ناخواستہ ورنگل آ تو گیا مگر میرا دل وہاں بالکل نہیں لگتا تھا۔ بڑا عجیب ماحول تھا وہاں کا۔ سب ہی بالکل پرانے خیالات رکھنے

والے، ایک بالکل اجنبی فضا.... بہت کوشش کی میں نے اس سے ساز کرنے کی ۔ کئی لوگوں سے دوستی بھی کی، شعر شاعری کی محفلیں بھی جمائیں، جلسے کیے مگر..... بڑی عجیب ذہنیت تھی سب ساتھیوں کی ۔ سیاسی سوجھ بوجھ بالکل مختلف ۔ سوائے اتحاد المسلمین کے وہ کوئی اور بات نہیں سوچتے تھے ایک بڑے اڈوکیٹ تھے وہاں فضل حسین صاحب وہ مجلس کے صدر تھے اور قاسم رضوی کا اثر وہاں تک بڑھ گیا تھا ۔ اچھے پڑھے لکھے لوگ سب اس رو میں بہے جا رہے تھے ۔ جس کو دیکھو وہی باتیں مسلمانوں کی افضلیت کی ۔ قومی تحریک سے ربط کی کبھی نہ کوئی سوچتا تھا نہ بات کرتا بلکہ اسے بہت برا سمجھا جاتا تھا ۔ البتہ ہٹلر ضرور ان کی نظر میں "ہٹلر اعظم" تھا ۔ ۳۹ء میں جب جنگ شروع ہوئی تو مجھے یاد ہے ہر گھر میں صرف برلن ریڈیو سنا جاتا تھا اور ہمارے مسلمان بھائی صرف ہٹلر اعظم کے گن گاتے تھے ۔ دنیا میں نئی نئی تحریکیں اٹھ رہی تھیں نئے خیالات، نئی فکر ۔ مگر ہمارے مسلمان قدامت پرست بھائی وہی خواب دیکھ رہے تھے کہ حضور نظام ہندوستان کے بادشاہ ہوں گے اور ہٹلر ہماری سرپرستی کریں گے ۔ تو اب آپ سوچیے یہ ماحول میرے لیے کتنا بیزار کن تھا ۔ اسٹاف روم میں بیٹھو تو ہر وقت ہی قاسم رضوی کی باتیں، مسلمانوں کی برتری کا ذکر، ان کی بہادری کے قصے... میرا دم گھٹتا تھا اس قسم کی باتوں سے ۔ اس لیے ہر ہفتہ حیدرآباد بھاگ آتا تھا ۔ جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی اس زمانے میں ۔ میں جمعرات کی شام وہاں سے چلتا دو تین گھنٹے میں شہر پہنچ جاتا اور ہفتہ کی صبح سویرے مجھے ایسی ٹرین مل جاتی جو کالج کے وقت تک ورنگل پہنچا دیتی ۔ یہاں آکر قاضی صاحب سے ملتا، دوست احباب کے ساتھ وقت گزارتا ۔ اس زمانے میں ہمارے ایک نئے دوست عالم خوندمیری میدان میں آئے تھے ۔ ۱۹۳۹ء میں انھوں نے یہاں ایک Association قائم کی تھی (کامریڈ اسوسی ایشن) احسن علی مرزا، ابراہیم جلیس اور کچھ لوگ اس میں شریک تھے ۔ اسی اسوسی ایشن نے آگے چل کر کمیونسٹ پارٹی کی شکل اختیار کی... تو یہاں آکر اس ماحول میں بڑا سکون ملتا تھا ۔ بہرحال زندگی گزر رہی تھی اور آہستہ آہستہ نئے ماحول میں اپنی جگہ بنا رہا تھا پھر جب بالآخر اس لڑکی کے والدین جسے میں چاہتا تھا راضی ہوگئے اور ۱۹۴۳ء کی چھٹیوں میں جب میں حیدرآباد آیا ہوا تھا، بہت سیدھے سادے طریقے سے ریاست خانم سے میری شادی ہو گئی تو میری ذہنی اور جذباتی الجھنیں بھی ختم ہو گئیں ۔

کالج کھلنے پر پہلے میں تنہا ورنگل گیا ۔ اس وقت میں عنایت علی خان صاحب کے پاس رہتا تھا جو سائنس کے لکچرر تھے ۔ ان کا گھر بہت بڑا اور خوب صورت تھا اور انھوں نے بہت اچھا چمن بھی لگا رکھا تھا جس میں بہ کثرت گلاب کے تختے تھے ۔ بیوی کو میں پہلے ان ہی کے گھر لایا گلاب کی خوشبوؤں کے بیچ میری محبت کی پہلی شام اور پہلی رات شروع ہوئی ۔ کچھ دنوں بعد میں نے الگ گھر لے لیا ۔ ذہنی جذباتی سکون حاصل ہوا تو اب میں نے اپنے گرد و پیش میں دل چسپی لینا شروع کی ۔ اپنے ساتھیوں سے راہ و رسم بڑھائی ۔ ورنگل میں جو مجھ سے سینیر لوگ تھے ان میں زین العابدین صاحب تاریخ کے پروفیسر تھے ۔ عنایت علی خان کیمسٹری کے، ذکی الدین سائنس کے، محمود حسین صاحب انگریزی کے باقر فریدی صاحب معاشیات کے . . اور اس دوران میں وہاں ہم شاعر مشہور ہوگئے تھے ۔ ہر ہفتہ کسی ایک کے گھر محفل جمتی، کھانا ہوتا اور شعر شاعری زین العابدین صاحب کا ہم بہت مذاق اڑاتے تھے ۔ وہ بہت عجیب باتیں کرتے تھے بیوی کو "مکان" کہتے تھے "ہمارے مکان میں بہت اچھا پکوان جانتی ہیں" وغیرہ تو ہم نے ان کو گھیرا اور آخر ان سے بڑی شاندار دعوت لی ۔ پھر ہم نے ورنگل میں ایک بہت زوردار آل انڈیا مشاعرہ بھی کیا ۔ اس وقت احمد حسین پرنسپال تھے اور ہماری ان سے خاصی دوستی ہو گئی تھی ۔ وہ مجھے بہت پسند کرنے لگے تھے ۔ جب میں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے تو انھوں نے بھی حامی بھرلی ۔ ہم نے ایک انجمن "بزم ادب" نام سے قائم کی اور اردو فارسی کے طالب علموں کی طرف سے ایک سال نامہ "نقش اولین" نکالا ۔ اس کے دو پرچے نکلے ۔ اس کا ایک پرچہ اب بھی ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے ۔ اس میں مشاعرے کا تفصیلی ذکر ہے جو ہم نے وہاں کیا تھا ۔ اس آل انڈیا مشاعرے میں قاضی صاحب کے توسط سے جگر

مراد آبادی کو جو اس وقت حیدر آباد آئے ہوئے تھے بلایا تھا اور وہ آئے تھے۔ حسرت موہانی بھی آئے تھے۔ ساغر نظامی جو ہمارے دوستوں میں سے تھے ان کو بھی بلایا تھا۔ حفیظ جالندھری بھی آئے تھے اور کئی دوسرے شاعر... بڑا شان دار مشاعرہ تھا وہ۔

ورنگل میں ہم نے ایک بک اسٹال بھی قائم کیا تھا تاکہ نئی کتابیں پڑھنے کو ملیں۔ ہمارے ایک رشتہ دار تھے میرے ہم نام "اختر" ہمارے گھر ہی میں رہتے تھے۔ ذرا سنکی قسم کے نوجوان تھے۔ میں نے ان سے کہا یہاں ایک بک ڈپو قائم کرو وہ تیار ہوگئے۔ ۱۶ روپے کرائے کی ایک ملگی کرائے پر لی گئی۔ ایک ہزار کا بہت اچھا فرنیچر بنوایا۔ کتابیں حیدر آباد کے حکیم صفدر صاحب کی دکان سے منگوائیں۔ وہ بک ڈپو ایسا چلا کہ نہ پوچھیے۔ ورنگل کے لوگ جیسے اس کے بھوکے بیٹھے تھے۔ نہ صرف ورنگل بلکہ اطراف کے علاقوں سے بھی لوگ کتابیں خریدنے آتے تھے...... چھ مہینے کے اندر اندر یہ دکان اتنی چمک گئی کہ اس سے خاصا فائدہ ہونے لگا۔ محمود علی خاں اختر سب کاروبار دیکھتے تھے۔ میں نے پورا کام ان پر چھوڑ دیا تھا۔ انگریزی کتابوں کا انتخاب وہ کرتے تھے اور اردو کا میں۔ بہت چلی دوکان۔ ہزاروں کتابیں تھیں اس میں انگریزی کی بھی اردو کی بھی۔ اسی زمانے میں میرا سوشلزم کی طرف رجحان ہوا تو پہلی کتاب میں نے Dean of Canturbury کی پڑھی "6th of the Socialist World" ایک اور کتاب سوشلزم پر انگلستان کے کسی Dolton نامی کی تھی وہ پڑھی اس نے انقلاب روس کے بعد وہاں کا دورہ کیا تھا۔ اس سے ہم بہت متاثر ہوئے۔ پھر "Capital" پڑھی جو ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس بک ڈپو کا ایک بڑا فائدہ ہمارے لیے یہ بھی تھا کہ نئی نئی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں اور ہمارے شوق مطالعہ بھی ان دنوں بہت بڑھ گیا تھا۔

o o o

(سلسلہ ص ۱۲)

...ہما کا گونج رہا تھا، زینوں پر سے ڈھلوان میں دوڑتے ہوئے آدمی کی طرح اترتے ہوئے وہ گھر کی خادمہ سے ٹکرا گیا جو کمرے میں صبح کی صفائی کرنے کے لیے جا رہی تھی۔ اس نے چیخ مار کر پیٹیش بند سے اپنا منہ ڈھانپ لیا لیکن وہ جا چکا تھا اور سامنے کے دروازے سے نکل کر پانی کی طرف جانے والے راستے پر پہنچ چکا تھا۔ پل پر پہنچ کر کٹہرے کی سلاخوں کو اس نے اس طرح پکڑ لیا تھا جس طرح کوئی بھوکا آدمی روٹی کے ٹکڑے کو دبوچ لے۔ وہ اچھل کر کٹہرے کی دوسری طرف آگیا بالکل ایک مشاق کرتب باز کی طرح۔ نوجوانی میں اس کی کرتب بازی واقعی اس کے والدین کے لیے فخر و مسرت کا باعث تھی۔ کم زور ہوتی ہوئی گرفت کے ساتھ وہ ابھی کٹہرے کی سلاخوں کو پکڑے ہوئے لٹک رہا تھا، سلاخوں کے درمیان سے اس نے نظر دوڑا کر دیکھا ایک بس آرہی تھی جس کے شور میں پانی میں کودنے کی آواز گم ہو جا سکتی تھی، مدھم آواز میں اس نے پکارا "پیارے والدین میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی ہے، سب کچھ ہونے کے بعد بھی" اور اس نے اپنے کو پانی میں گرا دیا۔

اس لمحے برج پر ٹریفک کا لامتناہی سلسلہ گزر رہا تھا۔

(تلخیص و ترجمہ)

o o o

پروفیسر تقی علی مرزا

ہندستان کی انگریزی شاعری

اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے میں ایک دو باتیں واضح کر دینا چاہتا ہوں ۔ ایک تو یہ کہ میرا زاویہ ، نگاہ بڑی حد تک معروضی ہے ۔ ہندوستان کی انگریزی شاعری کی تاریخ ، اس کی موجودہ صورت حال کے بارے میں یا اس کے تجزیے میں میں نے اپنے آپ کو ان اختلافات ، علاقائی عصبیت اور بحث مباحثوں سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے جو اس شاعری کے بارے میں ہر وقت ابھر کر آتے ہیں ساتھ ہی ساتھ چند باتیں زور دے کر کہوں گا ۔ کیوں کہ ان باتوں کے کہنے کی ضرورت ہے ۔ دوسرے یہ کہ ہندوستانی انگریزی شاعری کے بارے میں جو باتیں کہنے جا رہا ہوں وہ ۱۹۸۰ء تک کی شاعری سے متعلق ہیں ۔ اس مضمون میں ان شاعروں کا حوالہ نہیں ملے گا ۔ جن کی شاعری ۱۹۸۰ء کے بعد شائع ہوئی ۔ ۱۹۸۰ء کے بعد کا دور ایک لحاظ سے ہندوستان کی انگریزی شاعری میں مابعد جدیدیت ۔ (Post modernism) کا دور ہے ۔ بہت سے نئے شاعروں کا تعلق اسی دور سے ہے ۔ ان میں بہت سے اہم نام بھی ہیں ۔ مگر میں نے ۱۹۸۰ء کو حد فاصل قرار دیا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ شاعری یا ادب کی دوسری اصناف کے جانچنے کے لیے تھوڑا سا بعد زمانی درکار ہے تاکہ ادبی تخلیقات کو صحیح تناظر میں دیکھا جاسکے ۔

(۱)

ہندوستان کی انگریزی شاعری یا انگریزی ادب کے متعلق سے پہلے مشکل تو اس اصطلاح کے بارے میں پیش آتی ہے جو اس ادب کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے یا کی جاسکتی ہے ۔ کیا یہ انگریزی شاعری ہے جو ہندوستان میں لکھی جاتی ہے یا یہ ہندوستانی شاعری ہے جو انگریزی میں لکھی جاتی ہے ؟ یہ شاعری اس انگریزی شاعری سے کس حد تک مختلف ہے جو امریکہ ، کینڈا ، جنوبی افریقہ ، آسٹریلیا یا دوسری نوآبادیوں میں لکھی جاتی ہے ؟ کیا ہندوستانی شاعر جو انگریزی میں شاعری کرتے ہیں محض اس لیے انگریزی شاعر کہلائے جاسکتے ہیں کہ وہ انگریزی میں لکھتے ہیں ؟ اگر چہ انگریزی زبان پندرہ سو سال قدیم ہے لیکن جدید انگریزی (Modern English) پانچ سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے ۔ کئی ہندوستانی زبانوں اور ان میں لکھے جانے والے ادب کی تاریخ جدید انگریزی ادب کی تاریخ سے کہیں زیادہ طویل ہے ۔ اس لحاظ سے انگریزی زبان اور ادب کو خود بہ خود ہندوستانی زبانوں اور ان کے ادب پر فوقیت حاصل نہیں ہو جاتی ۔ کیا ہندوستان کی انگریزی شاعری انگریزی ادب کا ایک حصہ ہے یا یہ دولت مشترکہ (Commonwealth) یا تیسری دنیا (The third world) کے ادب کا ایک جزو ہے ؟ یہ سب سوال اس لیے اہمیت اختیار کر لیتے ہیں کہ ان کے سمجھے بغیر ہندوستان کے انگریزی ادب کا صحیح اور متوازن محاسبہ ممکن نہیں ہے ۔ ہندوستانی انگریزی شاعری کے بارے میں کئی اصطلاحیں مختلف ادوار میں مستعمل رہی ہیں ۔ جن میں سے کسی کو بھی قطعی طور پر اطمینان بخش قرار نہیں دیا جاسکتا یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی صورت حرف آخر کی ہے ، اس شاعری کو اینگلو انڈین اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اصطلاح اس ادب کے لیے مختص ہے جو انگریز ادیبوں نے ہندوستان کے

بارے میں لکھا ہے ۔ جیسے M. M. Kaye یا Paul Scott ، E. M. Forster ، Kipling کے ناول یا شاعری ۔
اس ادب کو Indo - Anglican کے نام سے موسوم کیا گیا جو لسانی اور معنوی اعتبار سے غیر تشفی بخش ہے اور اس میں ایک طرح نسلی عنصر شامل ہے ۔ اب جو اصطلاح زیادہ رائج اور موزوں ہے وہ Indian Writing in English کی اصطلاح ہے جسے پروفیسر کے ۔ آر ۔ سرینواس آئنگار نے اپنی مشہور کتاب "Indian Writing in English" میں رواج دیا ۔ یہ کتاب ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی اور اس وقت سے یہی ترکیب زیادہ مروج اور قابلِ قبول بھی گئی ہے ۔ جہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ امریکہ کی National Library of Congress کے Classification میں اس شاعری کا اندراج پہلے سے اس طرح تھا : English Poetry ... India یعنی "انگریزی شاعری.... ہندستان" اور موجودہ Classification میں یہ اندراج اس طرح ہے : Indian Poetry .... English یعنی "ہندوستانی شاعری.... انگریزی" ۔ جدید اصطلاح شاید حقیقت سے زیادہ قریب اور زیادہ قابلِ قبول ہے ۔

(۲)

اصطلاحات کے بارے میں اس ساری بحث سے ہٹ کر ایک دوسرا اور کہیں زیادہ اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ کہ ہندوستان کے شاعر انگریزی میں شاعری کیوں کرتے ہیں ۔ یا انھیں ایسی شاعری کرنی چاہیئے یا نہیں ؟ کیا ایسا کرنا ایک غیر فطری یا غیر منطقی بات نہیں ہے ؟ اگر افریقہ کے شاعر یا West Indies کے Black writers انگریزی میں لکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے ان کی زبانیں یا بولیاں (Dialects) اتنی ترقی یافتہ نہیں ہیں کہ ان میں تخلیقی ادب پیدا ہو سکے ۔ پھر بھی کینیا کے مشہور انگریزی ناول نگار James Ngugi اور چند دوسرے افریقی ادیبوں نے اب یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ انگریزی میں نہیں لکھیں گے اور اپنی ہی زبانوں میں لکھنے کو ترجیح دیں گے کیوں کہ اس طرح نہ صرف بہتر ترسیل ممکن ہے بلکہ ایسا کرنا خلوص کا بھی ضامن ہے ۔ ہندوستان کے شاعروں کے لیے ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے ۔ ہندوستان کی سب ہی زبانیں کافی ترقی یافتہ ہیں جن کا اپنا ادبی سرمایہ ہے " یہ ایک پیچیدہ سوال ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا ۔ ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ چند شاعر ایسے ہیں جو کسی اور زبان میں لکھ ہی نہیں سکتے اور انگریزی ہی ان کا ذریعہ ٔ اظہار ہے ۔ جیسے Dom Moraes یا Nissim Ezekiel ، یا ایسے افراد جو انگلستان یا امریکہ میں رہ بس گئے ہیں ۔ اور جن کی حیثیت Expatriate ادیبوں کی ہے جو انگریزی میں لکھتے ہیں اور وہیں شائع بھی کرتے ہیں ۔ ان کے لیے بھی انگریزی ہی واحد ذریعہ ٔ اظہار ہے ۔ اس سوال کا ایک اور جواب یہ ہو سکتا ہے اور جسے شاید قبول بھی کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ ایک ہمہ لسانی (Multi - lingual) صورتِ حال میں انگریزی کا انتخاب ایک فطری اور منطقی عمل ہے ۔ کسی بھی ہندستانی زبان کے ادب کے لیے جو بہرحال ایک محدود اور علاقائی ادب ہے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ہندستانی فکر اور ہندستانی تہذیب کی مکمل نمائندگی کرے اور ایسی نمائندگی انگریزی زبان ہی میں ممکن ہے ۔ اس انتخاب کے منفی پہلو اس کے اثباتی پہلو سے زیادہ قوی ہیں ۔ کئی شاعر انگریزی میں شاعری اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے ذریعے انھیں زیادہ شہرت مل سکتی ہے اور ایسا کرنا پورے ملک بلکہ بین الاقوامی شہرت کا ضامن ہو سکتا ہے ۔ انگریزی میں طباعت اور اشاعت کا معیار ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ اونچا ہے ، اور انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد ہندوستانی زبانوں میں شائع ہونے والے ادب کے پڑھنے والوں کی تعداد سے کہیں آگے ہے ۔ اس سوال کا جواب

خود ہندوستان کے چند انگریزی شاعروں نے دیا ہے۔ آر۔ پارتھاسارا تھی کچھ اس طرح معذرت خواہ ہیں:

My tongue in English chains
return, after a generation, to you.
am at the end of my dravidian tether,
Hunger for you unassuaged
falter, stumble,
Speak a tired language
Wrenched from its sleep in the kural,
Teeth, palate, lips still new
To its agglutinative touch
Now hooked on celluloid, you reel
Down plush corridors

کملا داس کا کہنا ہے:

Why not let me speak in
Any language I like ? The language I speak
Becomes mine, its distortions, its queernesses
All mine, mine alone. It is half English, half
Indian, funny perhaps, but it is honest,
It.s as human as I am human, don.t
You see ? It voices my joys, my longings, my
Hopes, and it is useful to me.

مشہور ہندستانی انگریزی شاعر اے۔ کے راما نجم (جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے) کہتے ہیں: اصل سوال یہ نہیں ہے کہ ہندستانی شاعر انگریزی میں شاعری کریں یا نہ کریں ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر ہندستانی انگریزی میں شاعری کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو وہ ایسا ضرور کریں۔ خود اپنے بارے میں وہ لکھتے ہیں "یہ اتفاقی بات ہے کہ میں انگریزی میں لکھتا ہوں، اب دوسرے یہ فیصلہ کریں کہ میں جو لکھتا ہوں وہ اچھا ہے یا نہیں۔ اس معاملے میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہندستانی شاعر انگریزی میں معمولی شاعری کر لیتا ہے، لیکن یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ کسی بھی زبان میں اچھی شاعری کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ بہت سے ہندستانی شاعروں کے لیے ذریعہ۔ اظہار سے زیادہ یہ بات اہم ہے کہ ان کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب اور ہندستانی اقدار کی عکاسی ہوتی ہے یا نہیں۔

ہندستانی انگریزی شاعری کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انگریزی زبان کی تاریخ یعنی لگ بھگ پونے دو سو سال - ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے انگریزی تعلیم کا آغاز انیسویں صدی کے تیسرے دہے میں ہوا - اس وقت انگریزی حکومت کا دارالخلافہ کلکتہ تھا اور سب سے پہلے وہیں انگریزی تعلیم کی ترویج ہوئی - چناں چہ انگریزی زبان کے پہلے شاعر سب کے سب بنگالی تھے اور سب ہی انگریزی ادب اور تہذیب کے پرستار - ان شاعروں کے کلام پر انگریزی رومانی (Romantic) شاعری کا اثر بہت نمایاں ہے - Henry Derozio انگریزی زبان کا پہلا ہندستانی شاعر تھا جس نے اپنا کلام شائع کیا - ڈی روزیو کا بہت کم عمری میں انتقال ہوا، مگر اپنی مختصر ادبی زندگی میں اس نے کافی نام کمایا - اس کی شاعری پر بائرن، والٹراسکاٹ اور ٹامس مور (Thomas Moore) کی شاعری کی واضح چھاپ ہے - اسے اپنے ملک اور فطرت دونوں سے عشق تھا، اس کی شاعری کا ایک نمونہ پیش ہے:

There all in silence let him sleep
No dream shall flit into that slumber deep,
No wandering mortal thither once shall wend.
There nothing over him but the heaven shall weep
There never pilgrim at his shrine shall bend.
But holy storm only their mightly vigils keep.

ڈی روزیو کے ہم عصر شاعر کاشی پرشاد گھوش کے مجموعہ کلام کا عنوان بہت دل چسپ ہے - 'The Shair and other Poems' جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دور اول کے یہ سب شاعر اردو اور فارسی کے دل دادہ تھے اور ان کے شعری ذوق کی بنیاد وہیں قایم ہوئی تھی - اس زمانے کا ایک اور قابل ذکر شاعر من موہن گھوش تھا جس کا مجموعہ 'The Captive Ladie' کے نام سے ۱۸۴۹ء میں چھپا - ہم عصر انگریزی نقادوں نے گھوش کی شاعری کی کافی تعریف کی - Oscar Wilde نے اس کی ایک نظم کو کافی سراہا تھا، اس کی نظم کا ایک بند درج ذیل ہے:

Deep - shaded will I lie and deeper yet
In night, where not a leaf its neighbour knows;
Forget the shining of the stars, forget
The vernal visitation of the rose;
And far from all delights, prefere my hearts respose.

اس دور کے شاعروں میں سب سے ممتاز نام تورودت (Toru Dutt) کا ہے - جس کا انتقال نہایت کم عمری میں یعنی ۲۱ برس کی عمر میں ہوا - تورودت نے واقعی شاعرانہ مزاج پایا تھا اور اپنی مختصر شعری حیات میں اس نے بعد غیر معمولی نظمیں لکھیں - اس کی شاعری کا آہنگ بھی بڑی حد تک رومانی ہے جسے اس نے ایک ہندستانی رنگ دیا - اس کی ایک مشہور نظم 'Our Casaurina

"Tree" کا ایک بند درج ذیل ہے:

But not because of its magnificence
Dear is the casaurina to my soul
Beneath it we have played : though years may roll.
O sweet companians, loved with love intense,
for your sake shall the tree be ever dear!
Blent with your image, it shall arise
In memory, till the hot tears blind mine eyes!

ہندستان کی انگریزی شاعری کا دوسرا دور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد شروع ہوا۔ اس دور کو قومیت اور حب الوطنی کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیت شاعری کے موضوعات میں تبدیلی تھی، ہندوستان کے شان دار ماضی کا بیان، اس کے زوال کا ماتم، اس کی ہمہ رنگ تہذیب کی نغمہ سرائی، اس دور کی شاعری کے عنوانات بنے۔ مگر اسلوبِ بیان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ انگریزی رومانی شاعری کی گرفت ایک لحاظ سے اور بھی مضبوط ہو گئی۔ خود اس زمانے کی انگریزی شاعری میں انحطاط اور اضمحلال کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس کی سب سے نمایاں مثال Swinburne کی شاعری تھی اور یہی شاعری اس دور کے ہندستانی شاعروں پر زیادہ اثر انداز ہوئی۔ اس دور کے ممتاز شاعر آروبندو گھوش اور سروجنی نائیڈو تھے۔ ٹیگور کا نام اس فہرست میں اس لیے شامل نہیں ہے کہ وہ بنیادی طور پر بنگالی کے شاعر تھے۔ یہ شاعر انگریزی زبان پر کامل قدرت رکھتے تھے اور انگریزی شاعری کے سب ہی صنائع و بدائع کے استعمال پر انھیں دست رس حاصل تھی۔ آروبندو گھوش نے انگریزی شاعری کی سب ہی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ ان کا بڑا کارنامہ ان کی طویل رزمیہ نظم "ساوتری" (Savitri) ہے جو ۲۴ ہزار مصرعوں پر مشتمل ہے اور ملٹن کی رزمیہ نظم Paradise Lost کا چربہ ہے۔ اس کا ایک بند پڑھیے اور اندازہ لگائیے کہ انگریزی شاعری کا اثر اتنا سرایت کر گیا تھا کہ جدت طرازی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

His being like a huge fort of darkness towered.
Around it her life grew, an ocean.s siege.
Life like a turning tongue licked up her thoughts
Life was a luminous torture in his heart
Light coursed, a splendid agony throun his nerves:
His darkness muttered finishing in her blaze
His mastering word commanded every limb
And left no roon for his enormous will
(from "SAVITRI")

جنی نائیڈو نے کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا ۔ جب وہ انگلستان میں تعلیم پا رہی تھیں تو انھوں نے اپنی نظمیں مشہور نقاد Sir Edmund Go: کو دکھلائیں ۔ ان بزرگوار نے نوجوان شاعرہ کو مشورہ دیا کہ انگلستان کے پھولوں ، درختوں ، مرغ زاروں اور ۔وں کے بارے میں لکھنے کے بجائے ہندستان کے پھولوں ، پیڑوں اور چڑیوں کو اپنا موضوع بنائیں ۔ سروجنی نے یہ مشورہ قبول تو الیکن ان کی شاعری کا انگریزی رومانی رنگ ویسا ہی قائم رہا ۔ ان کی شاعری میں ایک فطری نغمگی ہے ، اس کی ایک مثال پیش ہے :

Lightly, o lightly we bear her along,
She sways like a flower in the wind of our song,
She skims like a bird on the foam of a stream,
She floats like a laugh from the lips of a dream,
Gaily, o gaily we glide and we sing,
We bear her along like a pearl on a string.

(The Palanquin Bearers)

۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء یعنی آزادی تک کا دور ایک لحاظ سے مجبوری دور ہے ۔ اس دور میں کوئی ممتاز نام نہیں ملتے چند نام جو قابل ہیں وہ شہید سہروردی ، ہریندر ناتھ چٹوپادھیا ، James Furtado ، Manjiri Iswaran کے ہیں ۔ یہ زمانہ آزادی روجہد کے نازک دور کا تھا ۔ ادیبوں اور شاعروں کی زیادہ تر توجہ قومی مسائل کی طرف تھی نہ کہ ادبی تخلیق کی جانب ، سروجنی نائیڈو شاعری چھوڑ کر آزادی کی جنگ میں صفِ اول کی مجاہد بن گئی تھیں ۔

(۴)

یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد یعنی انگریزی حکمرانوں کے ہندستان چھوڑنے کے بعد ہندستان میں انگریزی تخلیقی ادب کے ترویج و اشاعت میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا اور یہ بات ادب کی سب ہی اصناف کے بارے میں کہی جا سکتی ہے ۔ انگریزی ، کے اکابر ثلاثہ ملک راج آنند ، آر ۔ کے ۔ نارائینن اور راجہ راؤ نے آزادی کے پہلے لکھنا شروع کیا تھا لیکن وہ آزادی کے بعد بھی ، رہے ہیں ۔ دوسرے کئی اور ہندستانی ناول نگاروں نے کافی شہرت کمائی اور انھیں بین الاقوامی قبولیت بھی نصیب ہوئی ۔ اکثر نقادوں نود ان شاعروں کا جنھوں نے ۱۹۵۰ء کے بعد لکھنا شروع کیا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں انگریزی شاعری آزادی کے بعد ہی شروع اور وہ آزادی سے پہلے کے شاعروں کے مقام کو ماننے سے انکار کرتے ہیں ۔ یہ نقطۂ نظر کہاں تک قابلِ قبول ہے ایک بحث طلب امر مگر یہ صحیح ہے کہ جدید دور کے تین نمائندہ انگریزی شاعروں کا کلام ۱۹۵۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان شائع ہوا ۔ Nissim Ezek نے اپنا پہلا مجموعہ کلام "A Time to Change" ۱۹۵۲ء میں شائع کیا ۔ کملا داس کا شعری مجموعہ ۱۹۶۵ء "Summer in Calcu" میں شائع ہوا اور اے ۔ کے ۔ راما نجم نے اپنی پہلی کتاب The Striders ۱۹۶۶ء میں شائع ن شاعروں نے نہ تو آزادی کے پہلے کے شاعروں کا اثر قبول کیا اور نہ ہی ان پرانی روایات کو اپنایا جو ان سے پہلے ایک سو برس سے کی انگریزی شاعری نے قائم کی تھیں ۔ یہ تینوں شاعروں اور ان کے بعد کے آنے والے سب ہی شاعر انفرادیت کے علم بردار ہیں ، گو

ان کا یہ دعویٰ بھی بحث طلب ہے۔ بہرحال ان شاعروں نے اپنے لیے ایک نئی طرزِ نگارش متعین کرلی۔ ان تینوں شاعروں کی ایک ایک نظم کا اقتباس پیش ہے:

To force the pace and never to be still
Is not the way of those who study birds
Or women. The best poets wait for words.
The hunt is not an exercise of will
But patient love relaxing on a hill
To note the movement of a timid wing.
Until the one who knows that she is loved
No longer waits but risks surrendering....
In this the poet finds his moral proved.
Who never spoke before his spirit moved.

(Nissim Ezekiel : "Poet, Lover, Bird watcher")

Getting a man to love you is easy
Only be honest about your wants as
Woman. Stand nude before the glass with him
So that he sees himself the stranger one
And belives it so, and you so much more
Softer, younger, lovelier .... Admit your
Admiration. Notice the perfection
Of his limbs, his eyes reddening under
The shower, the shy walk across the bathroom floor,
Dropping towels and the jerky way he
Urinates. All the fond details that make
Him male and your only man. Gift him all.
Gift him what makes you woman, the scent of
Long hair, the musk of sweat between the breasts,
The warm shock of menstrual blood, and all your

Endless female hungers.

(Kamala Das : "The Looking - Glass")

They took their time to die, this dynasty
falling in slow motion from Aurangzeb's time:
Some of bone TB,
others of a London fog that went to their heads,
some of current trends, inported wine and women,
one or two heroic in war or poverty,
With ballads
To their names. father, uncles, seven
folk lore brothers, sister so young so lovely
that snakes loved her and hung dead,
ancestral
lovers, from her ceiling ; brother's many
wives, their unborn still born babies, numberless
cousins, royal mynahs or parrots
in the harem:
every one died, to pass into his slow
conversation

(A. K. Ramanujam : The Last of the Princes)

راما نجم کی شاعری کا مرکزی استعارہ خاندان ہے لیکن ان کا تاریخ کا احساس اتنا طاقت ور ہے کہ وہ نہایت چابک دستی سے اپنے ماضی کو ملک کے ماضی کا جزو بنا لیتے ہیں۔

شیو۔ کے۔ کمار انھی شاعروں کے ہم عصر ہیں لیکن وہ کسی قدر تاخیر سے شاعری کے میدان میں داخل ہوئے۔ وہ اپنے آپ کو late bloomer کہتے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام Articulate Silences ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا لیکن اس کے بعد ان کے چار اور شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سے آخری مجموعہ Trapfalls in the sky کے لیے ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی ملا ہے، اس کتاب کا اردو ترجمہ یوسف کمال نے نہایت مہارت اور خوب صورتی سے کیا ہے اور یہ "آسمان میں کمین گاہیں" کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں کمار کا فن اپنے عروج پر ہے اور ان کی پختگی کلام ہر نظم میں عیاں ہے۔ کمار کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ان کی غیر معمولی قوت مشاہدہ، ان کا لطیف طنز اور ان کا جذبہ انسانی ہے۔ ان کی شاعری کی دو مثالیں پیش ہیں:

Each week day the body.s two seasons
intersect at noon. the grey winter
of drudge that tempers
cement with sweat
and the green interlude of the sun
burst when toothless gums
Strike milk out of rock
Anger subsides.....
the day rests at anchor
Under her head - veil. now dropped
to cover two moons. wee hands
and feet flutter like a culver
Time that never ceases to nibble
at stone. wood or glass now pricks up its ears to listen
to a heart throb.

(A Woman Labour)

These barbed questionings
only test the tropical wind.s
virginit to sough through the yellow
zone of inquisition
The white raven perched on a high
stool behind the magic book.
can caw off the names
of all your ancestors
like the panda on the Ganges bank.
You.ll break through the sound
barrier only if your dart hit
the god.s eye. Otherwise. the silver

trawlers flying the royal ensign may
whirl you back to your genesis.

(Heathrow Airport : Immigration Checkpost)

اس دور کے چند اور اہم نام کیکی دارو والا، ارون کولٹکر، جینتا مہاپترا، عادل جسا والا، اے۔ کے۔ مہروترا اور آر۔ پارتھا سارا تھی ہیں۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کا دور جسے جدیدیت کا دور بھی کہا جاسکتا ہے کئی لحاظ سے ہندوستانی انگریزی شاعری کا سب سے اہم دور ہے۔ اس دور کے شاعروں نے روایت سے رشتہ توڑ کر اپنی نئی ڈگر بنالی۔ قومیت، روحانیت اور حب الوطنی کے جذبے جو ان کے پیش رو شاعروں کی شاعری کی نمایاں خصوصیات تھے، ان کی شاعری میں تقریباً مفقود ہیں۔ آزادی کے بعد کی ناکامیوں سے فرار اختیار کرکے وہ خود اپنی ذات میں گم ہوگئے۔ ذات ان کی شاعری کا محور ہے۔ سماجی شعور ان کے ہاں تقریباً غائب ہے۔ اور ان کی شاعری کا سب سے کارگر حربہ ان کا طنز ہے۔

(۵)

ہندستان کی انگریزی شاعری کا تجزیہ کرنے سے آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں؟ اس کوشش میں دو قسم کی غلطیوں کا امکان ہردم موجود رہتا ہے۔ مبالغہ آمیز تعریف یا مکمل مذمت، جب کہ حقیقت شاید ان دونوں کے بیچ میں کہیں موجود ہے۔ رسالوں کے شاعری کے صفحات، شاعری کے انعامات کا اعلان اور شاعری کے اداروں کا وجود فیصلہ سازی میں ممد ومعاون ہونے کی بجائے اور پے چیدگی پیدا کردیتے ہیں۔ ہندستان کی انگریزی شاعری پر سب سے پہلا اعتراض تو یہ کیا جاتا ہے کہ یہ انگلستان اور امریکہ کی معاصر شاعری کی بھونڈی نقل ہے۔ مزاحیہ انداز میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شاعری ایسی ہے جیسے Matthew Arnold ساڑی میں ملبوس ہو یا شکنتلا اسکرٹ پہنے ہوئے ہو۔ مختصر یہ کہ یہ شاعری پوری کی پوری اکتسابی ہے جس میں جدت کا شائبہ بھی نہیں۔

جدید ہندستانی شعرا نے اپنے پیش رووں پر یہ اعتراض کیا کہ وہ سب کے سب انگریزی رومانی اور وکٹورین شاعروں کے مرہون منت ہیں۔ لیکن اس کے جواب میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگر پہلے کے شاعر شیلی اور کیٹس، ٹینی سن اور سوئنبرن کی نقل کرتے تھے تو موجودہ دور کے شاعر Ezra Pound، T. S. Eliot اور W. H. Auden کی اور امریکی شاعروں میں Wallace Stevens، Robert Lowell، Sylvia Plath اور دوسرے Confesional poets کی نقل کرتے ہیں یعنی نقالی بہرحال مسلمہ ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ دور جدید کے شاعر انگریزی شاعری کی بحروں اور عروض (Prosody) سے بے بہرہ ہیں، سوائے چند ایک مستثنیات کے۔ وہ انگریزی شاعری کی بحروں سے یا تو ناواقف ہیں یا ان کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے۔ ان کی زیادہ تر شاعری آزاد نظم (free verse) کی شکل میں ہے۔ اب یہ تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ پہلے کی پابند تک بندی اور موجودہ آزاد نظم میں، جو کچھ زیادہ ہی آزاد ہے، کونسی شاعری نسبتاً زیادہ بہتر یا کم خراب ہے۔ ایک اور بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انگریزی میں شاعری کرنے والے زیادہ تر افراد انگریزی زبان اور ادب کے پروفیسر ہیں۔ ان کی ساری عمر یونیورسٹیوں میں انگریزی ادب پڑھنے اور پڑھانے میں گزری۔ اور اگر ان کی شاعری میں ایک طرح کا Academic رنگ پایا جاتا ہے تو کوئی تعجب کی بات

نہیں ہے ۔ یہ حضرات کامیاب دانش ور تو ہیں یا ہو سکتے ہیں لیکن ان کا کامیاب شاعر ہونا ضروری نہیں ۔ ان کمزوریوں سے نپٹنے کے لیے ہندوستان کا انگریزی شاعر کچھ ایسی ترکیبیں اختیار کرتا ہے جنھیں انگریزی میں gimmickry کہا جاتا ہے ۔ یعنی ابہام اور اشاریت پر ضرورت سے زیادہ تکیہ ، یا ایسے مشکل الفاظ اور محاوروں کا استعمال جنھیں سمجھنے کے لیے ڈکشنری کا سہارا لینا پڑے ، یا ہندستانی انگریزی (Indian English) کا مزاحیہ استعمال جس سے کچھ ہندستانی رنگ پیدا ہو جائے ۔ مثال کے طور پر نسیم ایزیکیل کی ایک نظم کا اقتباس پیش ہے:

Friends
our dear sister
is departing for foreign
in two three days,
and
we are meeting today
to wish her bon voyage.
You are all knowing, friends,
What sweetness is in Miss Pushpa.
I don.t mean only external sweetness
but internal sweetness.
Miss Pushpa is smiling and smiling
even for no reason
but simply because she is feeling.
Miss Pushpa is coming
from very high family
Her father was renowned advocate
in Bulsar or Surat,
I am not remembering now which place.

(Goodbye Party for Miss Pushpa T. S.)

یہ کہا گیا ہے کہ ایسے شاعر جو دو لسانی (Bi lingual) ہیں ، اس صورت حال سے زیادہ کامیابی سے نپٹ سکتے ہیں اور وہی زیادہ authentic بھی ہیں ۔ وہ اپنی زبان کے مسلمہ شاعر ہیں اس لیے شاعری کرنا ، خواہ وہ غیر زبان میں ہی کیوں نہ ہو ، ان کے لیے زیادہ فطری عمل ہے ۔ ان کے ہاں آورد کم اور آمد زیادہ ہے ۔ یہ خیال بڑی حد تک شاید صحیح بھی ہے ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک بات جو

(آ گے صفحہ ۵۵ پر)

محمود درویش (فلسطین)

ترجمہ: سید خالد قادری

ایک نظم

وہ نگاہیں ـــــ پیاری اور اذیت کوش
کانٹوں کی مانند پیوست ہیں
میرے قلب میں
میں انھیں ـــــ اپنے جگر سے کھینچ کر
چبھو دیتا ہوں
رات کے تاریک سینے میں
کہ رات
زخموں سے منور ہو جائے
اور اس روشنی میں ـــــ ہم دیکھ سکیں
اپنا مستقبل

تمھاری باتیں میرے گیت تھے
جنھیں میں گنگناتا تھا
تاآں کہ بہاروں کو
خزاں نے آگھیرا
اور تمھاری باتیں ـــــ اڑ گئیں
ان پرندوں کی طرح
جو ہمارے گھر کی منڈیر پر بسیرا کرتے تھے

آئینے سب ٹوٹے پڑے ہیں
کہ تمھارے جانے کے بعد
رنج و غم کے نرغے میں

وطن کے لیے ماتم کناں
ہم خود اپنی صداؤں کی کرچیاں چنتے ہیں

چلو انھیں کسی ساز کے سینے میں چھپا کر
ایک المیہ گیت بنائیں
جو چٹانوں کو پگھلا دے
اور آسمان کے چاند کو
بنا دے
زہریلا اور بد صورت

مگر شاید اب کچھ بھی نہ ہوگا
کہ تمھارے جانے کے بعد
تمام صدائیں گم ہو گئی ہیں
اور میں سنتا ہوں
صرف تمھاری آواز کی گونج

اس جاں کاہ تنہائی میں
میرے ہم راہ ہے
بس میری خاموشی
اور تمھاری جدائی کا طویل سناٹا

ooo

محسن جلگانوی

امر بیل

(۱)

خودروی نے مری
خود نمائی کا بھیگا ہوا پیرہن اوڑھ کر
اپنے آنگن کی لیٹی ہوئی دھوپ کو پی لیا
کچے دیوار و در کی سمٹتی ہوئی مٹیوں کا مزا
جنس جاں بن گیا
اور مری ذات خوش بو کا پیکر بنی
میرا پیکر گریزاں تھا ہر اجنبی لمس سے
وہ شجر کی حلاوت سے واقف نہ تھا
تیرے ہاتھوں کے مس نے سمیٹا مجھے
اور قربت کی الفافیت بخش دی
پھول پتے مرا سائباں بن گئے
تیری شاخیں، مری نگہباں
تیرے احساس کی لذتیں جسم و جاں

(۲)

سبز سائے کی شادابیاں چیر کر
دھوپ کی گرم جوشی کا دست جنوں
میرے پیکر کی دیوار تک آگیا
میں امانت تری
تو ضمانت مری
ہجر موسم کی ان ساعتوں میں سدا
میری شادابیِ جاں ترے ساتھ ہے
تو زمینوں سے اپنی اکھڑنا نہیں

○ ○ ○

رئیس الدین رئیس

○

ان شناس بھی لب آشنا نہیں ہوتے
اپنے آپ سے سب آشنا نہیں ہوتے

ت سے لوگوں کے سر آسماں تو چھوتے ہیں
وہ خود کے نسب آشنا نہیں ہوتے

لہروں کا ٹکراؤ سہتے رہتے ہیں
ی کنارے غضب آشنا نہیں ہوتے

ے عہد کی تہذیب مٹتی جاتی ہے
ے بچے ادب آشنا نہیں ہوتے

تے رہتے ہیں پلکوں میں محنتیں دن کی
ایسے لوگ بھی شب آشنا نہیں ہوتے

ل بارہا اس سے رئیس کرتے ہیں
کبھی بھی سبب آشنا نہیں ہوتے

○

زندگی سربسر اک دیدۂ حیراں ہے تو کیا
آج مانوس وفا چاک گریباں ہے تو کیا

سر ہتھیلی پہ لیے گھوم رہا ہوں میں بھی
یار ہر روز صلیبوں پہ چراغاں ہے تو کیا

وقت آئندہ تجھے کر تو دیا ہے آزاد
عمر بھر اپنے مقدر میں یہ زنداں ہے تو کیا

حاصل زیست بالآخر ہے بس اک مشت غبار
دست رس میں تری اورنگ سلیماں ہے تو کیا

کل یہ ممکن ہے تو انگشت بہ دنداں ہو جائے
آج ہر چند رئیس آسماں حیراں ہے تو کیا

○ ○ ○

شکیل اعظمی

○

شام کے دھندلکے سے اک خیال آتا ہے
چاند سا ابھرتا ہے اور ڈوب جاتا ہے

کیوں نہ چھپ کے دیکھا جائے کون ہے وہ، کیسا ہے
مجھ میں ایک سایہ سا روز آتا جاتا ہے

میری بند آنکھوں کے خواب خواب موسم میں
جلتے بجھتے ہونٹوں سے کون مسکراتا ہے

چاندنی میں ضم ہوکر، خوشبوؤں کے لہجے میں
کون میری غزلوں کے شعر گنگناتا ہے

جانے کیسا رشتہ ہے رہ گزر کا قدموں سے
تھک کے بیٹھ جاؤں تو راستہ بلاتا ہے

○ ○ ○

○

گر گئی چھت دراڑ ہونے سے
اک ذرا سا بگاڑ ہونے سے

ورنہ آندھی گھروں میں گھس آتی
بچ گئے ہم کواڑ ہونے سے

تیرے جاتے ہی تیری یاد آئی
رہ گیا دل اجاڑ ہونے سے

کتنے اسباب جنم لیتے ہیں
بے سبب بھیڑ بھاڑ ہونے سے

○ ○ ○

محسن جلگانوی

○

کیا شہر ہے یہ کوئی کسی سے نہیں ملتا
ملتا بھی اگر ہے تو وہ جی سے نہیں ملتا

ہاتھوں کے ملا لینے سے رشتے نہیں ملتے
دل کہتے ہیں جس کو وہ سبھی سے نہیں ملتا

ہے جیب اگر خالی تو گھر سے نہ نکلنا
بے دام یہاں کچھ بھی کسی سے نہیں ملتا

کاغذ پہ تو مشہور ترا نام بہت ہے
کیوں تیرا پتہ تیری گلی سے نہیں ملتا

دریا ہوں مگر تیرے کناروں سے جڑا ہوں
ہے جھوٹ کہ کچھ تشنہ لبی سے نہیں ملتا

آواز کی پہچان بڑی بات ہے لیکن
کچھ کم نہیں، لہجہ جو کسی سے نہیں ملتا

ملنا ہے اگر ہم سے تو یہ سوچ کے ملنا
کچھ نقدِ طلب، دستِ تہی سے نہیں ملتا

کچھ خاص ہے محسن جو یہ غالب نے کہا تھا
بس طرزِ سخن اپنا کسی سے نہیں ملتا

○ ○ ○

○

سب اثاثہ متاعِ آب ہوا
میرا ہونا بھی بس حجاب ہوا

زندگی پر نیا عتاب ہوا
سانس لینا بھی اک حساب ہوا

ہم جزاؤں کے مدعی کب تھے
بے سبب سارا احتساب ہوا

میں تو صحرا کا اک پرندہ تھا
سارا دریا مجھے سراب ہوا

کس کو دیتا حسابِ دربدری
وقت کب میرا ہم رکاب ہوا

وہ تو ویسے بھی - نور پیکر - تھا
اس کا سایہ بھی آفتاب ہوا

سب حصارِ طلسم ٹوٹ گئے
اسمِ محسن کلیدِ باب ہوا

○ ○ ○

مادر اسلوبی

○

آپ اپنے کو جو بیدار نہیں کرسکتا
جلوۂ صبح کا دیدار نہیں کرسکتا

امن کے نام پہ تلوار اٹھاکر یارو
اپنا مجروح میں کردار نہیں کرسکتا

آج مے خانے میں ہر رند کا ساغر ہے تہی
آج ساقی سے میں تکرار نہیں کرسکتا

میری نظروں پہ بھی پہرے ہیں تکلم پر بھی
دل کا کیا حال ہے اظہار نہیں کرسکتا

ہائے کیا وقت ہے، ماحول ہے کیسا نادر
پیار فن کار سے فن کار نہیں کرسکتا

○ ○ ○

بے حس الہ آبادی

○

ہر نئے گام پہ منت کش آزار ہیں ہم
زندگی تیرے لیے موت سے دوچار ہیں ہم

کل بھی حق بات کے اظہار پہ کٹتی تھی زباں
آج بھی عرض حقیقت پہ گنہ گار ہیں ہم

غیر ممکن ہے سکوں جہد مسلسل کے بغیر
امن کے واسطے آمادۂ پیکار ہیں ہم

غنچہ و گل کی زباں پر نہیں چرچا نہ سہی
باغباں جانتا ہے، رونق گل زار ہیں ہم

○ ○ ○

ڈاکٹر سلمان عباسی

(الب سے ہم طرح ایک غزل کے چند اشعار)

○

گرفتار جفائے صنم چند رہا
بھی ہرچند خیال کرم چند رہا

ں بڑھتی گئیں منزل مقصد نہ ملی
چند قدم تھا قدم چند رہا

اٹھیں تری یاد میں میری آنکھیں
۔ مے میں ترا عکس دم چند رہا

، اس کی ہے گنبد کی صداؤں کی طرح
جو شخص اسیر درم چند رہا

غالب کا تغزل میں نہیں کوئی جواب
بےکار اسیر قلم چند رہا

○ ○ ○

ڈاکٹر غیاث صدیقی

○

میں تیری ہر صفت ہوں ، ترا آفریدہ ہوں
کیا رنگ رخ ہوں میں کہ ازل سے پریدہ ہوں

تیغ عدو ، ستائش احباب سے ہے خوب
سن گوش دوست ، زہر غم جاں چشیدہ ہوں

لت جگر مرا ، سر مژگاں نہ رک سکا
اے آسمان پیر ، جواں مرگ دیدہ ہوں

مضمون صرف آپ ہیں ، عنواں الگ الگ
میں منقبت ہوں ، نعت ہوں ، حمد و قصیدہ ہوں

یک سود و صد زیاں کا حساب آج تک بھی ہے
خوف نشاط ہے کہ تبسم گزیدہ ہوں

○ ○ ○

صابر فخرالدین

○

ہم کو آیا نہ کبھی خوف و خطر میں رہنا
بند دروازوں کے ان دیکھے سے گھر میں رہنا

اس کا خط آئے نہ آئے وہ ضرور آئے گا
جس کی عادت ہے شب و روز سفر میں رہنا

آج ہر ایک کی قسمت کا نوشتہ ہے یہی
دیکھی ان دیکھی بلاؤں کے اثر میں رہنا

مجھ سے یہ بات بہ اصرار کہی ہے اس نے
تم بھی صابر کی طرح سب کی نظر میں رہنا

○○○

سید قمر حیدر قمر

○

سدا کسی نہ کسی چیز کی کمی ہی رہی
ضرورتوں کے الاؤ میں روشنی ہی رہی

اسے رتوں پہ نہیں ، پیار پہ بھروسا تھا
وہ مجھ سے روز نئے پھول مانگتی ہی رہی

وہ اس کے وعدے نہ تھے ، تھیں کپاس کی فصلیں
مرے یقین کے کھیتوں میں چاندنی ہی رہی

اسے مذاق کہیں ، یا اسے مزاج کہیں ،
دکھائے زخم بھی ہم نے تو شاعری ہی رہی

بڑے دیاروں سے گزرے ، بڑے جہاں دیکھے
ہمارے سامنے لیکن تری گلی ہی رہی

وہ تتلیوں کے پروں سے چرا کے رنگ قمر
ہتھیلیوں پہ گلستاں بکھیرتی ہی رہی

○○

مقصود الٰہی شیخ

چوتھی شرمندگی

دادا ابا نے اپنی سترویں سالگرہ خود ہی بڑی دھوم دھام سے منائی۔ انھوں نے اپنے دستور کے مطابق سب کو قطار میں کھڑا کر کے باری باری بلایا اور ہر کسی کو ایک ایک لفافہ دے دیا۔ لفافے میں بنک سے نکلوائے ہوئے نئے نئے کرارے کرارے نوٹ تھے۔ دادا ابا نے کہا کہ گنتی بعد میں کرنا۔ دادا عید بقرعید پر بھی اسی طرح لفافے دیتے تھے۔ کبھی بڑوں کو تھوڑے پیسے دیے اور چھوٹوں کو زیادہ اور کبھی اس کے برعکس۔ ایسا کرنے کا وہ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی بہانہ بھی گھڑ لیا کرتے تھے۔ دادا ابا کی کوئی اور بات گوارا ہو نہ ہو مگر ان کی خاص خاص موقعوں پر سخاوت کی یہ عادت سب کو اچھی لگتی تھی پھر اس میں ایک اسرار ہوتا تھا کہ دیکھو اس دفعہ کیا مل رہا ہے۔

کھانے پر انھوں نے بتا دیا تھا کہ سونے سے پہلے وہ اپنی زندگی کے تین ایسے واقعات سنائیں گے جب ان کو بڑی شرمندگی اٹھانا پڑی اور وہ آج بھی یاد کرتے ہیں تو وہی احساس طاری ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا میں یہ سب اس لیے بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم سب اپنے اپنے خول سے نکل کر بھی سوچا کرو۔ عام زندگی میں اونچ نیچ سے واقفیت رکھو اور کسی سے بے خبری یا کم علمی کی بنا پر آنکھ نیچی نہ ہو۔ کبھی کبھی ہم سے یہ نہ چھپایا تھا کہ وہ خود ساز و خود ساختہ "بندے" ہیں۔ ان کے والدین غریب تھے۔ وہ اپنی محنت، دیانت داری اور قسمت کی یاوری سے اس مقام پر پہنچے ہیں۔ وہ قہقہہ لگا کر کہا کرتے کہ ان کو اب منڈے لاٹ کی پرواہ نہیں۔ یہ منڈا لاٹ کیا ہوتا ہے، ہم نے کئی بار پوچھا لیکن دادا ابا کے مطابق ہمیشہ غلط موقع پر پوچھا۔ اب یہ قصہ سنانے لگے تو زیر لب بات رہ جائے گی۔ جب کبھی اپنے خاندانی حالات بیان کرتے تو ایک بات وہ کہتے نہ تھکتے تھے اور یہ تھی کہ اپنے والدین کے بڑے فرماں بردار تھے۔ اپنے اماں ابا کی باتیں وہ اس طرح کرتے کہ جیسے ہمیں سبق سکھا رہے ہوں کہ ہم بھی ان کے نقش قدم پر چلیں۔ ہم سبھی اپنے ابا اماں کا اور دادا کا احترام کرتے تھے۔ ان سے ہمیں محبت بھی تھی۔ فرق یہ تھا کہ اماں ابا ہم سے ذرا بھی توقع نہیں رکھتے تھے اور دادا کی بات یوں لگتی تھی جیسے وہ اپنے خیالات ہم پر زبردستی ٹھونس رہے ہیں۔ یہ ہم میں سے کسی کو ایک آنکھ نہ بھاتا۔ ہماری پرورش آزاد ماحول میں ہو رہی تھی۔ سب تعلیم پا رہے تھے، روشن خیال تھے، دوسروں کے حق اور اپنے حقوق سے واقف تھے۔ نہ کسی کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کے قائل نہ اپنی زندگی میں کسی کی بھی مداخلت پسند تھی۔

دادا ابا اکثر کہتے کہ ان کے ابا یعنی ہمارے پردادا ان کے لیے کچھ چھوڑ کر نہ گئے تھے۔ زمانہ بھی کتنا بدل گیا ہے۔ دادا کے پاس جو کچھ تھا اس کا اندازہ ایک ایک فرد کو تھا۔ امی نے قریب قریب حساب بھی کر لیا ہوا تھا کہ دوسروں کے علاوہ ہمارے گھرانے کا حصہ کتنا نکلے گا بلکہ امی نے تو ابا سے کئی مرتبہ یہاں تک کہا کہ اشاروں اشاروں میں دادا کے گوش گزار کر دیں کہ یہ جو ایک بات ہے کہ ہمارے پاس رہتے ہیں اور خاصے خوش رہتے ہیں تو کوئی وجہ تو ہوگی۔ اس بنا پر کیا ہمارا حق دوسروں سے زیادہ نہیں بنتا؟ یقیناً بنتا ہے اور بزرگوں کی وصیت میں اس کا اظہار ہونا چاہیے۔ انصاف بھی کوئی چیز ہے!

دادا ابا بھی بڑے ہوشیار تھے۔ جب ذرا علیل ہوئے سنا دیا کہ کوئی جدی پشتی جائداد تو ہے نہیں۔ شرع نے بھی ان کو اختیار دیا ہے کہ جس کو کچھ چاہیں دیں یا کچھ بھی نہ دیں۔ اس ملک کے قانون کے مطابق بھی وہ جو وصیت کر جائیں گے ویسا ہی ہوگا۔ کبھی کبھی تو لگتا وہ توجہ اور خدمت کی غرض سے مصلحتاً قصداً اپنی مٹھی میں رکھتے ہیں۔ ہمیں اس طرح کی دل چسپی نہ تھی جیسی وہ سوچتے ہوں گے مگر وہ ماشاء اللہ لتنے بڑے

آدمی بن چکے تھے کہ ہم سب کو ان کا وارث بننے میں خوشی اور مسرت تھی۔ بالفرض وہ کنگال ہوتے تو افسوس ہوتا۔ نہ جانے کیسے ہمارے گھر میں سب کو یہ شوق تھا کہ جیسے ہی کوئی شاہی خاندان میں یا ارسٹوکریٹس میں یا نوری ایم پی اس جہان سے رخصت ہوتا، ہم اخبار میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتے کہ کتنا کچھ چھوڑ کر گیا اور سٹیٹ ڈیوٹی کٹ کٹا کر کس کے حصے میں کیا آیا؟ ہم وہ اشتہار بھی شوق سے تلاش کرتے جن میں درج ہوتا تھا کہ فلاں فلاں کا کوئی عزیز رشتہ دار ہے تو مرنے والے کے وکلا سے رابطہ کرے۔ ایک دو بار تو دادا ابا نے ہمیں ایسے امور پر رائے زنی کرتے پکڑ بھی لیا مگر چپ چاپ کرے سے نکل گئے۔ یا وہی پرانی کتھا لے بیٹھے کہ ان کے ابا تو کچھ چھوڑ کر نہ گئے مگر آج بھی ان کی قبر پر جاکر دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں۔ ہمیں بھی ذرا ذرا سی بات یاد ہے۔ بہتیرا دل چاہتا کہ پوچھیں کس بات پر اتنا روتے ہیں۔ کچھ نہ چھوڑ جانے پر یا ان کے سخت رویے پر جس کا ذکر کرنا وہ کبھی نہیں بھولتے!

سال گرہ کا کیک کاٹ کر دادا ابا آتش دان کے پاس اپنی مقررہ جھولا کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ اب دادا ابا جھوم جھوم کر اپنے ماضی کے قصے سنائیں گے۔ آج انھوں نے یہ کہہ کر اشتیاق بھی پیدا کر دیا تھا کہ خاص تین واقعات پر گفتگو ہوگی جو الگ نوعیت کے ہیں اور جن کے یاد کرنے سے ان کو آج بھی شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ دادا ابا کی کرسی ہلنے لگتی تو ننھی کلثوم سو جاتی تھی۔ آج وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور آکر دادا ابا کی کرسی کو پکڑ کر جھولنے سے روک دیا۔ دادا ابا اٹھے اور جاکر کلثوم کی کرسی لے آئے۔ اتنے میں کلثوم ان کی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اسے ٹوکتا دادا ابا نے اشارے سے روک دیا کہ کوئی گھرکی یا جھڑکی نہ دینا۔ کرسی جھولی کلثوم تو سو گئی اور دادا ابا نے کہنا شروع کیا:

ان دنوں میں ایک اخبار میں کام کرتا تھا۔ جیسا کہ اردو اخباروں کا نصیب ہے، اخبار کی حالت پتلی تھی۔ اس کے مالک کی حالت اخبار سے بھی زیادہ پتلی تھی۔ اخبار نیا نیا چلا تو اسے انگریزی پریس میں خاصی پبلسٹی ملی۔ وہ انگریز جو اردو سیکھ رہے تھے اور ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے وہ متوجہ ہوگئے۔ دراصل وہی خرید کر پڑھتے تھے۔ اپنے لوگ نمونے کے طور پر مفت پرچہ منگواتے۔ پڑھتے، تعریف کرتے اور پھر بھول جاتے کہ کوئی اخبار نکلتا ہے یا اسے خرید کر پڑھنے سے اس ملک میں اپنی زبان کو تقویت ملے گی۔ ہم ورکروں کو اکثر تنخواہ نہیں ملتی تھی اور چوں کہ پبلک کی نگاہ میں آچکے تھے اس لیے بھتے لے کر پکڑے جانے کا خطرہ بھی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ ۔۔۔ دادا ابا رک گئے کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ جواد بیکاری الاؤنس لینا اپنا حق سمجھتا تھا اور اس وقت دادا ابا کسی قسم کی نکتہ چینی سے بچنا چاہتے تھے اور اپنی "شرمندگیوں" کی کہانی سنانا چاہتے تھے۔ ہم ڈر رہے تھے کہ دادا بھٹک کر ادھر ادھر نکل گئے تو رات بھر بیٹھنا پڑے گا۔
انھوں نے بات جاری رکھی کہ ایک روز دفتر میں ڈربی میں مسجد کے جھگڑے کے سلسلے میں اخبار کی حمایت حاصل کرنے کے لیے دونوں فریق آئے ہوئے تھے۔ ایک دو مقامی لیڈر بھی مدعو تھے کہ لینڈ لارڈ آیا اور اخبار کے مالک کی ستھری کر گیا۔ اس نے دھمکی دی کہ تین روز کے اندر اندر بقایا چھ ماہ، ساتھ آئندہ تین ماہ کا کرایہ یک مشت نہ دیا تو اس کی طرف سے نوٹس ہے اور وہ آکر تالے بدل جائے گا۔ وہ بڑے عجیب و غریب دن تھے۔ سب چاہتے تھے اخبار شائع ہو مگر پڑھنے کے لیے خریدنے سے گریز کرتے۔ جو ہے منہ اٹھائے چلا آتا اور وہیں پڑھ کر یا بغیر پیسے دیے لے کر چلتا بنتا۔ بات طول کھینچ رہی تھی اور بے چین جاوید بور ہو رہا تھا۔ اسے کسی سے غرض نہ تھی۔ بولا دادا ابا آپ کو اخبار چھوڑ کر کوئی دوسرا کام تلاش کر لینا چاہیے تھا۔ تم نہیں جانتے اخبار کا بھی ایک نشہ ہوتا ہے۔ کام کرنے والے بھوکے رہتے ہیں مگر جمے رہتے ہیں۔ مالک ہی بھاگ لے تو بھاگ لے۔ پھر لکھنے والوں کو مفت کی بیٹھک ملتی ہے۔ ٹیلی فون کی سہولت اور اپنے ملنے والوں کی خبریں اور کلام وغیرہ کو ترجیح دینے کا موقع ملتا ہے۔ یہ سیلزز اور سٹو والے ہاتھ نہیں ڈالتے تھے اس لیے اخبار مل ملا کر ہم خود ہی تقسیم کرتے تھے۔ ایک روز شدید برف

باری کی وجہ سے سب جگہ اخبار نہ پہنچا۔ ایک صاحب قریبی ٹاؤن سے ٹیکسی پر آئے۔ خوب برسے کہ یہی حال رہا تو اخبار بہت جلد بیٹھ جائے گا۔ چائے پی، اخبار لیا اور چلے گئے۔ ہم میں سے کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ کہتے ٹیکسی پر اتنی رقم خرچ کردی، اخبار کی معمولی سی قیمت بھی دیتے جائیے

یہ مجھے اس لیے یاد ہے کہ اسی روز ہمارے مدیر اعزازی نے یہ فیصلہ منوالیا کہ چند روز پہلے بیوہ ہونے والی شاعرہ کو مدعو کیا جائے اور کم از کم پانچ سو کی تھیلی یک جہتی کے اظہار اور وطنِ عزیز کی حکومت کو شرم دلانے کے لیے محترمہ کو پیش کی جائے۔ ویسے ان کے ساتھ حادثہ بھی عجیب ہوا تھا۔ وہ لندن کی سیر کرکے اپنے بے حد امیر کبیر شوہر کے ساتھ وطن جا رہی تھیں۔ ابھی جہاز ہیتھرو ایرپورٹ سے اڑا ہی تھا کہ شوہر پر قلب کا سخت حملہ ہوا اور وہ انتقال کر گئے۔ ہمارے مدیر اعزازی کو اطلاع تھی کہ سسرال والے جائداد سے بے دخل کرنے پر تل گئے ہیں پھر انھوں نے یہ واقعہ بیان کرکے رونا شروع کر دیا تو سب کے دل پگھل گئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ تھیلی کی رقم بڑی مشکل سے جمع ہوئی۔ دو دوستوں نے تو بنک سے اوور ڈرافٹ بھی لیا۔

کمرے کی فضا گمبھیر ہو رہی تھی۔ دادا ابا نے توقف کیا اور نیم خنداں ہو کر کہا کہ جب مجھے سات ہفتوں کی تنخواہ نہ ملی تو ترقی دے کر مینیجر بنا دیا گیا تھا۔ محترمہ کو سٹیشن سے لانے کا وقت ہوا تو میں حاضرین کی آمد کے خیال سے دفتر کھلا رکھنے کے لیے ٹھہر گیا اور میر صاحب اور شاہ صاحب کو مہمان کو لانے روانہ کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ایک مدبر سی خاتون اور ان کے ساتھ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا آگئے۔ میر صاحب اور شاہ صاحب دونوں گڑک رہے تھے جیسے ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو رہا ہو۔ ان کی ہنسی نکل جاتی تو خواہ مخواہ سراسیمہ ہوتے اس لیے میں بہانے سے دونوں کو باہر لے گیا۔ اب وہ ہنسے تو ہنستے چلے گئے۔ بڑی مشکل سے چپ ہوئے اور بتایا کہ لندن میں دیسی لوگ بھی اپنی عورتوں سے مصافحہ کر لیتے ہیں مگر یہ ہمارے شہر کا دستور نہیں۔ ہم نے محترمہ کو سلام کیا اور ان کے صاحب زادے کو گلے لگایا۔ وہ جھجک رہا تھا، کچھ شرما رہا تھا لیکن ہم خلوص دکھانے کو خوب خوب بھینچ بھینچ کر گلے ملے اور حیران ہوئے کہ کیا بات ہے؟ لڑکا اتنی رکھائی کیوں دکھا رہا ہے؟ کار میں محترمہ نے بتا کیا کہ "بھائی یہ دراصل میری بیٹی ہے۔ اس کے والد کو لڑکے کا شوق تھا اس لیے لڑکا بن کر رہتی ہے۔"

دادا ابا یہ یاد کرکے ہنسنے لگے۔ ہم سب خاموش تھے۔ کسی کو ہنسی نہ آئی۔ دادا ابا ہنسے تو ان کے ہاتھ میں لرزش سے مگ کی کافی چھلک گئی۔ اماں کا چہرہ دیکھنے والا ہو گیا۔ انھوں نے بولے بغیر زاہدہ کو اشارہ کیا جس نے ڈسٹر لا کر قالین پر گر پڑے قطرے کو جذب کیا۔ اتنے میں دادا نے اپنی ہنسی پر قابو پالیا اور کہا مجھے ہنسی اس لیے آئی کہ ابھی کل میر اور شاہ ملے تو موٹے سے لڑکے سے گلے ملنے کی بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔

دادا ابا نے کافی پی کر مگ خالی کیا اور آتش دان کے کنارے رکھا اور پہلو بدل کر کہا کہ میری پہلی شرمندگی اس شاعرہ کی آمد سے جڑی ہوئی ہے۔

دوسرے روز جب ہم لوگ ماں بیٹی کو سیر کرانے لے گئے تو شاعرہ نے مجھ کو ذمے دار سمجھتے ہوئے علاحدگی میں اعتماد میں لیتے ہوئے پوچھا یہاں کہیں اچھے سفون وغیرہ مل جاتے ہیں؟ میں نے جواباً کہا کہ مجھے تو کوئی شوق نہیں البتہ بچے ایک دو مرتبہ ساحل پر گئے تھے وہی وہاں سے رنگ برنگے پتھر اٹھا لائے۔ گھر چلیے تو دکھا دوں گا۔ انھوں نے بڑے غور سے مجھے دیکھا اور چپ ہو گئیں۔ موقع ملنے پر میں نے شاہ سے ذکر کیا تو وہ پھر بے تحاشا ہنسنے لگا۔ بڑا حضرت ہے۔ کم عمری میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے ہے۔ ہر دوسرے روز لندن پیرس کا چکر اور فرنگی شہروں میں اس کے ریستوران چل رہے ہیں۔ قابو میں آکر بولا "چودھری صاحب آپ بھولے بادشاہ ہیں۔ وہ کنکروں، سنگریزوں کی بات

نہیں قیمتی پتھروں یعنی ہیرے جواہرات کی بات کر رہی تھیں!"

دادا ابا نے کہا کہ ہم اپنی جگہ شرمندہ ہوئے وہ الگ مگر ان محترمہ نے بھی اپنی نظر سے ایسے گرایا کہ پلٹ کر بات تک نہ کی۔

ہم نے دیکھا کہ دادا ابا کا ایک اپنے دہنے ہاتھ کی دوسری انگلی میں بہت بڑے ہیرے کی انگوٹھی کو گول گول گھمانے لگے پھر انھوں نے انگوٹھی اتاری اور ہمارے ابا کی طرف اچھال دی کہ ذاکر میاں لو دکھاؤ سب کو۔ جو اس پتھر کا نام اور خواص بتادے اسی کو دے دینا۔ اماں پاس تھیں انھوں نے جلدی سے پکڑی اور اپنے انگوٹھے میں چڑھا پھنسا کر اپنے اس ہاتھ سے جس میں تین انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں ان میں سے ایک اتار کر ابا کو تھمادی کہ یہ دیکھو فیروزہ ہے۔ اماں کی دھاندلی پر ہم میں سے کوئی شرمندہ نہ ہوا اور ہمیں بھی سمجھ میں نہ آیا کہ دادا صاحب کیوں اتنے شرمندہ ہوئے کہ آج تک نہیں بھولے۔ ان کی باتیں وہ جانیں!

دادا ابا نے بیان جاری رکھا۔ کچھ عرصہ بعد جب ہم نے بزنس شروع کیا اور ہمارے دن کچھ پھرے تو زندگی میں دوسری مرتبہ اپنی سادہ لوحی پر شرمندگی اٹھانی پڑی۔ اللہ بخشے تمہاری دادی زندہ تھیں انھوں نے بھی بڑا فضیحتہ کیا تھا۔ ذاکر کی شادی تو ہمارے ہی جیسے لوگوں میں ہوئی تھی۔ اس پر اماں کسمسائیں مگر چپ رہیں۔ اس سے زیادہ وہ سن بھی نہیں سکتی تھیں۔ دادا ابا کو بھی اسی میں مصلحت نظر آئی کہ زیادہ تفصیل میں نہ جائیں۔ بولے، تمہارے چچا شاکر کی بات چیت چل رہی تھی۔ بڑے خاندانی لوگ تھے۔ اتنے کہ ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ شاکر کی ساس کی عادت بلند آواز میں گفتگو کرنے کی ہے۔ وہ کتنی آہستہ بولیں دیوار پر سے سن لی جاتی ہے۔ امریکہ سے ٹیلی فون پر بات ہو رہی تھی۔ میں پرے تو ہٹ گیا تھا مگر آواز پھر بھی کان میں پڑ گئی۔ میں نے پیش کش کی کہ دو چار ہزار کی کوئی بات نہیں اور اس سے بھی زیادہ درکار ہوں تو میں ابھی اپنے بنک سے بات کرتا ہوں۔ میری بات سن کر وہ لوگ خاموش رہے۔ شاکر میاں الگ لے گئے اور بتایا "ابا! ڈرافٹ ابھی پہنچا نہیں اور نیروبی سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ سوچ رہے ہیں کہ امریکہ میں بنک سے نکلوا کر کام چلالیں گے مگر مینیجر موجود نہیں۔ دوسرے کسی کو اختیار نہیں۔" میں نے کہا "پوچھو تو کتنا چاہیے ہم دیے دیتے ہیں۔" تب شاکر نے جواب دیا "ان کو سرسٹھ ہزار پونڈ کی رقم درکار ہے۔ اسی شہر میں ایک چھوٹے سے مکان کا سودا ہو گیا ہے۔ دلہن کے لیے خرید رہے ہیں۔" اس وقت سرسٹھ ہزار بہت بڑی رقم لگی۔ ہماری سٹی گم ہو گئی۔"

پھر انھوں نے تیسری شرمندگی کا قصہ سنایا۔

اس زمانے میں اللہ کا بڑا فضل تھا۔ پاکستان جا کر اکثر اپنے بہن بھائیوں سے ملتے تھے۔ ماشاء اللہ سبھی کے حالات اچھے ہو گئے تھے۔ ہماری آپا کو پرانے وقتوں کے حوالے سے بھی یہ سننا گوارا نہ تھا کہ ہم سفید پوشوں کے خاندان سے ہیں اور اب تو ان کے بچے کہیں سے کہیں پہنچ گئے تھے۔ ایک بار میں گیا تو کراچی میں مار اماری کے سبب تجارتی حالات اچھے نہ رہے تھے۔ میرے بڑے بھانجے کا کاروبار خاصا متاثر ہوا تھا۔ مجھے اس پر ترس آیا تو کہا کہ میرے پاس یہاں تھوڑی سی رقم پڑی ہے۔ ہم تو چلے جائیں گے یہاں پر بیکار پڑی رہے گی۔ چاہو تو کام میں لے آؤ۔ نہ مانا۔ میں نے کہا قرض حسنہ کے طور پر لے لو۔ اس وقت وہاں بنک میں میرے پاس دو لاکھ تھے۔ بتایا پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ بہت زور دیا کہ بتاؤ کتنی ضرورت ہے۔۔۔۔

دادا ابا نے رک کر شولور کا گلاس مانگا۔ چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ ان کا منہ پچ پچ ست گیا۔ ہم نے جانا سخت ٹینشن میں ہیں۔ دو ایک گھونٹ لے کر سلسلہ کلام جاری رکھا "ذاکر میاں! میں دو لاکھ کے برتے پر ترس کھا رہا تھا۔ معلوم ہے تمہارے فرسٹ کزن نے کیا کہا؟ کوئی شرمندگی سی شرمندگی ہوئی۔ میں تو سن کر سن ہو گیا۔ شان الٰہی نے کہا کہ ماموں مجھے تو پانچ کروڑ کی ضرورت ہے۔

ہم لوگوں کو آج معلوم ہو گیا کہ دادا ابا کے امیر ہونے کا راز کیا ہے ؟ اگر زندگی میں وہ یوں تین مرتبہ شرمندہ نہ ہوتے تو شاید آج اتنے دولت مند بھی نہ ہوتے کہ جواد بھائی کو کہنا پڑا کہ جس کے پاس اتنی دولت ہو اسے "ڈرٹی رچ" کہتے ہیں اور جب ان کا روئے سخن دادا کی طرف نہ ہوتا تو جواد بھیا "ڈرٹی ریچڈ" کہا کرتے ہیں۔

ہر شرمندگی پر دادا ابا کا رویہ بدل جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ دنوں پاکستان کے ایک بنک کے بہت بڑے افسر اور مشہور شاعر براہ راست دادا سے ملنے آئے اور آتے ہی کہا کہ یہ گزارش کرنے آئے ہیں کہ اخباروں میں بنکوں کے بارے میں چھپنے والی خبروں کا نوٹس نہ لیں ان کا دس کروڑ محفوظ ہے بلکہ بڑی مہربانی ہوگی اگر وہ اتنی ہی رقم اور ڈال دیں۔ ملک کی معیشت کا گراف اس وقت اونچا اٹھ رہا ہے۔ فورن کے مقابلے میں وطنِ عزیز میں سرمایہ کاری زیادہ سود مند ہوگی!

کلثوم جو بیٹھے ہی جھولے میں سو گئی تھی نہ جانے کب سے جاگ گئی تھی، آنکھیں مٹکا کر پوچھنے لگی "دادا ابا آپ بہت امیر ہیں ؟" دادا نے کہا ہاں بیٹی اللہ کا فضل ہے۔ "آپ مرنے پر یہ سب ساتھ تو نہیں لے جائیں گے ؟ ہمیں دے جائیں گے ؟" کلثوم کو ڈانٹ پڑ گئی مگر دادا ابا مسکراتے رہے۔ اس پر اماں گڑبڑا گئیں۔ انھوں نے ابا سے کہا اور جو کہا وہ دادا ابا نے سنا نہیں یا سنا تو کچھ نہیں۔ ہم میں سے جو قریب تھے انھوں نے سن لیا "اللہ! کلثوم کی بچکانہ بکواس پر بزرگوں کو کوئی شرمندگی نہ ہو" اماں کی آواز میں تشویش تھی "ورنہ اب وہ روپوں کے بدلے سال جمع کرنے لگیں گے اور۔ اور کبھی نہیں مریں گے۔"

○ ○ ○

(سلسلہ ص ۴۲)

یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ ایسے شاعروں کی شاعری میں ترجمے کا عنصر بہت نمایاں ہوتا ہے اور ایک لحاظ سے ان کی شاعری ترجمہ ہی کا ایک عمل ہے۔ ایسی شاعری کے پڑھنے اور لکھنے والے دونوں ہی دو لسانی ہیں۔

آخر میں ہندستانی انگریزی شاعری کے دفاع میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندستان کے فلسفے، انداز فکر اور تہذیب و تمدن کی جیسی عکاسی انگریزی میں ہو سکتی ہے وہ کسی ایک ہندستانی زبان میں ممکن نہیں ہے۔ ہندوستان میں انگریزی شاعری کے لیے ایک مقام ہے اور اس کا مستقبل بھی محفوظ ہے۔ میں کینیڈین نقاد Louis Dudek کے اس خیال سے متفق ہوں کہ "جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا جو شاعری زیادہ مقبول ہوگی اس کا معیار انتہائی پست ہوگا اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کیوں کہ آرٹ اور عوامی مقبولیت میں جو فاصلہ ہے وہ زیادہ واضح ہوجائے گا۔ اچھی شاعری کے قاریوں کی تعداد ویسے سے کم ہوجائے گی۔" بات دراصل یہ ہے کہ سخن گوئی اور سخن فہمی بہرحال ایک Elitist عمل ہے۔

OO O OO

وقار خلیل

وفیات

○ نامور صحافی، ترقی پسند ادیب اور حیدرآبادی روایات کے پاس دار حضرت محبوب حسین جگر ۸۰ سال کی عمر میں بہ عارضہ قلب ۱۱ مارچ ۱۹۹۷ء رحلت کرگئے۔ جگر مرحوم روزنامہ سیاست کے بانی جوائنٹ ایڈیٹر اور عابد علی خاں مرحوم کے دست راست تھے۔ روزنامہ سیاست کو ایک مکمل روزنامے کی شکل دینے میں عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر صاحب کی خدمات اور جذبہ ایثار کا بڑا دخل رہا ہے۔ جگر مرحوم نے حیدرآباد کی نصف صدی کی صحافتی، ادبی اور تہذیبی منظرنامے پر اپنے دست خط ثبت کیے ہیں۔ ایسی وضع دار، شہرت گریز شخصیت کا جانا وہ صدمہ ہے جسے بھلایا نہ جائے گا۔ حضرت جگر، ادارۂ ادبیات اردو کے رفیق اور ادارے کی سرگرمیوں سے گہری دل چسپی رکھتے تھے

○ اردو کے معروف صحافی اور ادیب ظل عباس عباسی کا ۲۳ مارچ ۱۹۹۷ء کو کانپور میں انتقال ہوا۔ عباسی مرحوم ۱۶/ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو اجمیر میں پیدا ہوئے۔ ترقی اردو بورڈ دہلی نے ان کا مرتبہ کلیات میر تقی میر کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تھا۔ ادبی اور تحقیقی مضامین معیاری رسائل میں شائع ہوئے۔ آخری دنوں میں وہ روزنامہ ملاپ دہلی اور روزنامہ "تیج" سے منسلک رہے۔

○○ نامور جدید سخن ور اور صحافی محمود ایاز کا ۲۹ مارچ ۱۹۹۷ء کو بہ عارضہ کینسر بنگلور میں انتقال ہوا۔ ایاز مرحوم کی عمر ۶۷ برس تھی۔ تقریباً بیس سال انھوں نے روزنامہ "سالار" بنگلور کی ادارت کی اور جدید ادبی موضوعات پر محمود ایاز مرحوم کے اداریوں اور سوغات کی مشمولات کو علمی و ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے پڑھا جاتا رہا ہے۔

○○ مشہور صحافی اور روزنامہ رہنمائے دکن کے سب ایڈیٹر حسینی جاوید (سید شاہ علی اکبر محمد محمد الحسینی) کا طویل علالت کے بعد ۱۲/ اپریل کو حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ جاوید مرحوم کو بہار اشتراردو اکیڈیمی نے صحافت کا ایوارڈ دیا تھا اور آندھراپردیش اردو اکیڈیمی نے ان کے شعری مجموعے کی اشاعت کے لیے اعانت بھی منظور کی تھی۔

○○ حیدرآباد کے جواں فکر شاعر نجم عبدالقادر، فکری بدایونی تقریباً ۵۰ سال کی عمر میں مختصر علالت کے بعد رحلت کرگئے۔ فکری مرحوم، مفتی عبدالقدیر بدایونی کے پوتے اور مولانا بادی القادری سابق استاد عربی نظام کالج کے فرزند تھے۔ ساؤتھ سنٹرل ریلوے میں ویلفیر آفیسر تھے اور بزم اردو سکندرآباد کے بانیوں میں تھے۔ حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں مقبولیت رکھتے تھے۔ فکری مرحوم نے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کیا تھا۔ شعری مجموعہ سنا ہے کہ زیر ترتیب ہے۔

○ ○ ○

بہ یادگار سید محی الدین قادری زورؔ

ابتداء : ۱۹۳۸ء فون , 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۵۹ جون ۱۹۹۷ء شمارہ : ۶

فی پرچہ	:	۱۰ روپے
زرسالانہ	:	۱۰۰ روپے
کتب خانوں سے	:	۱۲۵ روپے
مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ	:	۲۵ ڈالر
پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش	:	۱۴ ڈالر
انگلستان	:	۱۵ پونڈ

ناشر : ادارہ ادبیات اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ـ ۵۰۰۰۸۲ (اے ۔ پی) انڈیا ۔

کمپیوٹر کتابت ، جے ۔ جے ۔ کمپیوٹرس ، مہدی پٹنم ۔ حیدرآباد ۔

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے او ۔ ایس ۔ گرافکس نلدان گوڑہ میں طبع کرواکے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا

اس شمارے میں

اختر حسن

یادوں کی سیر گاہ

(تیسری قسط)

قاضی عبدالغفار محکمہ، اطلاعات عامہ کے ناظم مقرر ہوئے۔ انھوں نے خط کے ذریعے مجھے اطلاع دی کہ وہ اب اخبار کے ایڈیٹر نہیں رہ سکتے اس لیے پیام بند کر رہے ہیں۔ اس خط کے ملتے ہی میں نے استعفیٰ لکھا اور رحیم الدین صاحب پرنسپل کی میز پر رکھ دیا کیونکہ وہ حیدرآباد گئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی بیوی کو بھی نہیں بتایا صرف اتنا کہا کہ میں حیدرآباد جارہا ہوں قاضی صاحب سے ملنے۔ حیدرآباد آکر قاضی صاحب سے ملا اور کہا کہ میں استعفیٰ دے کر آرہا ہوں۔ کہنے لگے یہ کیا حرکت کی تم نے۔ میں نے جواب دیا آپ نے کہا تھا کہ تاریخ نے جو حرکت کی تھی وہی ہونی چاہیے۔ بہرحال وہ تھوڑا بگڑے اس کے بعد یونس سلیم کو بلایا۔ ایک ایڈوکیٹ سے معاہدہ تیار کروایا یہ طے پایا کہ پیام کے جتنے Assets اور Liabilities ہیں وہ اختر حسن صاحب کے ہیں۔ ڈکلریشن ان کے نام منتقل کیا جائے۔ آج سے وہ اخبار کے مالک ہیں۔ قاضی صاحب نے مجھے چارج دیا تو بتایا کہ یہ Assets ہمارے ہیں ۱۳ ہزار کے قریب اطلاعات اور دوسرے ذرائع سے وصول طلب ہیں۔ پیام کے ۱۳ سو یا ۱۴ سو خریدار تھے جب تک ہیں انھیں پیام بھیجنا ہے۔ یہ بس Liabilities ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ فرنیچر وغیرہ جس میں بڑے بڑے میز بھی تھے قاضی صاحب نے میرے حوالے کر دیے۔ اس میں دو دن لگے۔ تیسرے دن میں نے چارج لیا اور ایک دن کے لیے ڈیزل سے ورنگل گیا۔ بیوی کو تفصیل بتائی۔ دوستوں کو خدا حافظ کہا اور بیوی لے کر حیدرآباد آگیا۔

تین دن اخبار نہیں نکلا چوتھے دن جب میں دفتر پہنچا تو سری نواس لاہوٹی نے میرا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ ادھر اوپر کمرے میں آپ کے بیٹھنے کا انتظام کر دیا ہے۔ اوپر دو کمرے تھے ایک میں قاضی صاحب بیٹھتے تھے دوسرے میں مترجمین۔ لاہوٹی صاحب نے از راہ عنایت مجھے مترجمین کا کمرہ دیا تھا اور قاضی صاحب کا کمرہ اپنے لیے رکھا تھا میں نے ان سے کچھ نہیں کہا میں Conflict مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ خاموشی سے قاضی صاحب کی کرسی پر جاکر بیٹھ گیا اور لاہوٹی صاحب سے کہا کہ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ قاضی صاحب نے Assets و Liabilities کی جو بات کی ہے آپ مجھے اس کی تفصیلات دے دیں۔ انھوں نے کل کا وعدہ کیا اور دوسرے دن دفتر ہی نہیں آئے۔ میں سیدھا معلومات عامہ قاضی صاحب کے دفتر گیا اور ان کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ انھوں نے فون کر کے لاہوٹی کو بلوایا اور کہا آپ جلد سے جلد اختر صاحب کو سب تفصیل دے دیجیے اس میں تساہل نہیں ہونا چاہیے، اخبار بند رہے گا، اس کی ساکھ پر اثر پڑے گا۔ تو وہ بادل ناخواستہ دفتر آئے اور مجھ سے زبانی کہا کہ تفصیل میں آپ کو کل دوں گا مگر قاضی صاحب نے جو Assets بتائے ہیں تیرہ ہزار کیا تین بھی باقی نہیں، سارے Bills وصول ہو چکے ہیں اور میں پیسے قاضی صاحب کو دے چکا ہوں۔

یہ خبر سن کر میرے تو ہوش اڑ گئے۔ اب تیرہ پیسے بھی جیب میں نہیں ہیں تو اخبار کیسے نکلے؟ پھر قاضی صاحب سے ربط

(Contact) پیدا کیا انھوں نے بتایا کہ ابھی لاہوتی آیا تھا میرے پاس میرے پاؤں پڑ گیا اور رونے لگا کہ میرے پاس کچھ نہیں ۔
چوتھے دن بہ ہر صورت میں نے اخبار نکالا اور اپنے اخبار اور تمام دوسرے مقامی اخباروں میں یہ خبر شائع کرادی کہ سری نواس لاہوتی تک پیام کے جنرل منیجر تھے ان کا اب تعلق اس سے نہیں رہا ہے وہ پیام کے جنرل منیجر نہیں ہیں لاہوتی صاحب نے ہم سے بات چیت کر دی میں بھی خاموش رہا اخبار نکلتا رہا ۔

مجھے اتنا تجربہ تو تھا نہیں کہ قاضی صاحب کی طرح dominate کرتا ۔ ان میں ایک خاص قوت تھی اور ان کا حلقہ روابط اس وقت تک کافی وسیع ہو گیا تھا ۔ قاضی صاحب نے ۱۹۳۴ء میں حیدرآباد سے روزنامہ "پیام" نکالا تھا اس سے پہلے وہ کچھ عرصہ تک "درد" سے وابستہ تھے پھر دہلی سے "صباح" نکالا تھا اور کلکتہ سے "جمہوریت" تو ان کو کافی تجربہ بھی تھا اور دفتری سازشوں کا بھی علم تھا پیام کے سلسلے میں انھیں شروع میں ریاستی سازشوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا تھا ۔ مگر اپنے تجربے اور شخصیت کے اثر سے انھوں نے سب قابو پالیا تھا اور حیدرآباد میں سب سے پہلے قاضی صاحب نے ہی نظریاتی اختلافات کے باوجود مدیران جرائد اور اخبار نویسوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی تھی اور "انجمن صحافت" اور "انجمن مدیران جرائد" کے نام سے دو فعال تنظیمیں قائم کیں ۔ جن کی بہ دولت حیثیت مجموعی حیدرآباد کی اردو صحافت کو وقار و اعتبار حاصل ہوا تھا ۔ قاضی صاحب ایک قوم پرست اور بالکل سیکولر ذہن کے صاحب ادیب اور قد راول کے صحافی تھے۔ حیدرآباد کی ہر ترقی پسند تحریک سے بہ راہ راست یا بالواسطہ وابستگی ان کی زندگی کا معمول بن گیا تھا مجلس اتحاد المسلمین اور ہر قسم کی فرقہ پرست تحریکوں کی انھوں نے ہمیشہ شدومد کے ساتھ مخالفت کی ۔ قوم پرستی اور قومی شعور کو ب کرنے میں ان کا قلم مسلسل مصروف رہا ۔ مجھے قاضی صاحب کے خیالات اور پالیسی سے پورا پورا اتفاق تھا اور جب ۴۶ء میں میں نے ا ان سے لیا تو اس کی وہی پالیسی برقرار رکھی ۔ اس کی ترتیب میں کبھی زیادہ رد و بدل نہیں کیا ۔ پیام عموماً ۶ صفحوں پر حاوی ہو سنڈے ایڈیشن یا ہفتہ وار اشاعت البتہ ۸ صفحوں پر حاوی ہوتی تھی تیسرا صفحہ اداریہ کا ہوتا تھا اور اداریے کے آغاز پر "ہر روز کچھ سو" کے الفاظ کے نیچے کوئی زریں مقولہ ضرور لکھا جاتا اور ایک سیاسی سماجی طنز کا کالم "سرراہ" کے عنوان سے بھی قاضی صاحب لکھتے تھے اخبار کی پیشانی پر فارسی کا جو یہ شعر لکھا ہوتا تھا ۔

بہ آن گروہ کہ از ساغر وفا مست اند　　　زما پیام رسانید ہر کجا ہستند

اس کو بھی شروع میں اسی طرح باقی رکھا اور قاضی صاحب کی طرح اداریہ میں ہی لکھتا تھا جس کی پالیسی کلیتہً قوم پرستانہ ہوتی تھی کہ میں شروع سے پکا قوم پرست تھا اور ہوں مگر چوں کہ چند کمیونسٹ بھائیوں سے ہمارے دوستانہ تعلقات تھے بعض حلقوں میں میرے "پ" کو کمیونسٹ اخبار سمجھا جانے لگا حالاں کہ امر واقعہ یہ ہے کہ پیام کمیونسٹ اخبار بالکل نہیں تھا نہ میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا ۔ باو اپنے کمیونسٹ بھائیوں کی خواہش اور کوشش کے میں نے پارٹی کی ابتدائی رکنیت قبول کرنا بھی گوارا نہیں کی ۔ میں اخبار کو بہ ہر صور پارٹی لیبل سے آزاد رکھنا چاہتا تھا ۔ حتیٰ کہ شروع میں مسلم ضیائی بہت مصر رہے کہ اداریہ وہ لکھیں گے اور دو تین اداریے انھوں نے بھی مگر میں نے انھیں نامنظور کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ اخبار کا اداریہ صرف میں لکھوں گا جو میرے نقطہ نظر کا حامل ہوگا تو وہ نارا ہو گئے ۔ حالاں کہ وہ مجھ سے بہت قریب تھے ۔ برسوں ہمارے گھر میں رہے تھے۔ بہ ہر حال اخبار نکلتا رہا ۔ جب میں نے قاضی صاحب اخبار لیا تھا اس کا سرکولیشن صرف ۱۲۰۰ تھا لیکن باوجود مالی مشکلات کے میرے اخبار کو ہاتھ میں لیتے ہی اس کا سرکولیشن تیزی سے بڑھنے چنانچہ ایک سال کے اندر ہی اندر وہ ۵ ہزار تک پہنچ گیا اور میرا حلقہ احباب و روابط بھی کافی پھیل گیا ۔ عالم خوند میری سے میری

کچھ شناسائی تھی۔اب ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا تو گہری دوستی ہو گئی ۔بہت ذہین سلجھے ذہن کے نوجوان تھے اور ترقی دوست ۔ ان
دوستی میرے لیے بہت حوصلہ افزا ثابت ہوئی اور ان کے صائب مشوروں نے مجھے اکثر و بیشتر راہِ راست پر جمے رہنے کی ہمت دلائی ۔
ی کے ساتھ میں سب سے پہلے ڈاکٹر حسین ظہیر سے ملا جو اس وقت سٹی کالج کے پرنسپال تھے ۔ میری اور عالم کی ان سے کچھ ایسی بات
ہوئی کہ وہ ہمارے گرویدہ ہوگئے ۔ دوستی بڑھتی گئی اور آخر میں تو یہ ہو گیا تھا کہ جب کبھی وہ میرے دفتر پر سے گزرتے ہم سے آکر
رملتے اور کہتے نیچے کی چائے پلواؤ یعنی ایرانی ہوٹل کی چائے ۔ پھر لائق علی ناظم اطلاعات بنے تو ان سے بھی جلد روابط پیدا ہوگئے ۔

شروع میں بہت دنوں تک سرپرست اعلیٰ کی حیثیت سے اخبار پر میں نے قاضی صاحب کا نام لکھا ۔ پھر یہ ہوا کہ ابھی ایک سال
نہ ہوا تھا کہ لائق علی صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور یہاں سے چلے گئے حالاں کہ وہ تین سال کے Contract پر آئے تھے ۔ اس
بعد قاضی صاحب بھی چلے گئے اور ہم اپنے اچھے سرپرستوں سے محروم ہوگئے۔اب "پیام" کے ہر مسئلے سے مجھ ہی کو نمٹنا تھا تاہم اس وقت
میرا اپنا بھی ایک حلقہ بن گیا تھا اور میں نے کچھ تجربہ بھی حاصل کر لیا تھا ۔ سب سے اہم مسئلہ اخبار کی مالی حالت کا تھا جو شروع سے
ب تھی ۔ پرانے سرپرست تقریباً سب چلے گئے تھے ، بے شک کچھ نئے سرپرست ضرور مل گئے تھے جیسے ایک ڈاکٹر حسین ظہیر جو پہلے
کالج کے پرنسپال تھے بعد میں سائنس لیباریٹری کے ڈائرکٹر ہوگئے ۔ دوسرے ایل ۔ این گپتا ، ڈاکٹر جے سوریا ، سہیا ، منظور جنگ ، ملا
الباسط وغیرہ جو سب قوم پرست تھے لیکن ظاہر ہے محض گنے چنے چند افراد کی ہمدردی اور سرپرستی سے تو اخبار نہیں چل سکتا تھا مگر
نے ہمت نہیں ہاری یہ ہر صورت اخبار نکالتا رہا اور ایک سال میں ہی اس کی کافی ساکھ بندھ گئی تھی اور سرکولیشن تیرہ سو سے پانچ
تک پہنچ گیا تھا ۔ پھر جب ۴۷ء میں ہندستان کو آزادی ملی تو "پیام" میں ہم نے اس کا جشن منایا ۔ اداریے لکھے اس کا خیر مقدم کیا ۔ کچھ
ہوں کا نقطہ نظر یہ تھا بقول فیض احمد فیض کے "یہ آزادی "شب گزیدہ سحر" ہے مگر میرا نقطہ نظر اس سے مختلف تھا ۔ میری نظر میں یہ
دی حقیقی آزادی تھی اور اسے باقی رکھنا ہر قوم پرست کا فرض تھا ۔یہی اس وقت میں نے اپنے اداریے میں بھی لکھا تھا اور یہ کہ ہماری
داریاں بڑھ گئی تھیں اور ہمیں ان کو سمجھنا تھا ۔

۲۰ ویں صدی کے نصف اول کے دو آخری دہے بڑی تیز رفتار تبدیلیوں کے دہے تھے ۔ حیدرآباد ریاست کا ماحول بھی بدل رہا
۔ یونیورسٹی میں کچھ نئے ذہن ابھر رہے تھے جیسے عالم خوند میری ، نرسنگ راؤ وغیرہ اور نظام کالج میں بھی ہلچل پیدا ہو رہی تھی ۔
وانوں میں ایک بے چینی تھی ، اضطراب تھا ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی Activities بھی بڑھ رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ انجمن
لمسلمین کے اثرات بھی تیز ہو رہے تھے ۔ قاسم رضوی کا زور بڑھ رہا تھا ۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کے سر پر بھی جیسے ایک جنون
ار تھا ۔ بڑے بڑے پبلک سروس کے لوگ جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے بھی ممبر تھے ہم سے اکثر الجھتے رہتے تھے کہ آپ مسلمان ہیں
ر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد حیدرآباد میں کس نے ڈالی اور کب ؟ یہ تو میں نہیں بتا سکتا مجھے خود
یک سے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ۔ ابھی قمر رئیس نے اس ضمن میں جو کتاب چھاپی ہے اس میں عبدالوہاب مسلم ضیائی کو اس کا
نی بتایا ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ عابد علی خاں صاحب نے اس کی بنیاد ڈالی تھی اور کچھ ابراہیم جلیس کو اس کا بانی قرار دیتے ہیں۔بہ ہر
ن بانی کوئی رہا ہو ۴۵ء میں یہاں حیدرآباد میں اس کی جو کل ہند کانفرنس ہوئی وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۔ اس کے کنوینر عابد علی خاں
احب تھے اور اس کے انعقاد میں قاضی عبدالغفار صاحب نے بہت دل چسپی لی تھی ۔ یہ ۴۵ء کا سال بڑا اہم سال تھا ۔ صرف ہندستان اور
رآباد کے لیے نہیں بلکہ پوری عالمی تاریخ کے لیے یہ وہ سال ہے جب سات سالہ بھیانک جنگ ختم ہوئی جس میں صرف سوویٹ روس

کے دو کروڑ نفوس مارے گئے تھے اور لاکھوں زخمی ہوئے۔ اتحادی طاقتوں یعنی برطانیہ، امریکہ اور روس کو فتح حاصل ہوئی اور محوری طاقتوں یعنی جرمنی، اٹلی اور جاپان کو شکست۔ بڑی تباہی مچائی اس جنگ نے پوری دنیا میں آخر بعد از خرابی بسیار ناگاساکی اور ہیروشیما ایٹم بم گرانے کے بعد اس جنگ کا خاتمہ ہوا۔ ہندوستان کے حالات میں بھی اس سال بڑی تبدیلی آئی۔ آزادی کی تحریک منزل سے قریب ہو رہی تھی۔ غرض ۴۵ء کا سال بڑی تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ اس لحاظ سے یہاں ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کا انعقاد بے شک ایک اہم اقدام تھا۔ وہ ایک تاریخی کانفرنس تھی کہ اس میں جو شخصیتیں شریک ہوئی تھیں وہ آج بھی اردو ادب کا مینار نور سمجھی جاتی ہیں اردو کے بڑے بڑے نام ور شاعر، ادیب سب اس میں شریک ہوئے تھے۔ بنے بھائی (سجاد ظہیر) ڈاکٹر علیم، سبط حسن، ملک راج آنند مجروح سلطان پوری، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر اور حیدرآباد کے سب ترقی پسند ادیب شاعر۔ کرشن چندر کانفرنس کے صدر تھے۔ ان کا صدارتی خطبہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کانفرنس ریڈی ہاسٹل کے کمپاؤنڈ میں ہوئی تھی اور ۵ دن تک اس کے اجلاس چلے تھے۔ سروجنی نائیڈو نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ اس کانفرنس میں بہت اہم مسائل پر بحث رہی۔ آخری اجلاس میں قرار دادیں پیش ہو رہی تھیں۔ اتفاق سے حسرت موہانی بھی اس میں شریک تھے۔ انھوں نے بڑا ہنگامہ کیا۔ ڈاکٹر علیم نے ایک قرار داد پیش کی جس میں ترقی پسند ادب میں عریانی اور فحاشی کے خلاف کہا گیا تھا کہ یہ نہیں ہونی چاہیے۔ مولانا حسرت موہانی سامنے کی صف میں بیٹھے تھے کھڑے ہو گئے۔ کہا کہ ہم اس قرار داد میں کچھ ترمیم پیش کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں کون روک سکتا تھا وہ ڈائس پر آئے اور کہنے لگے آخر جملے میں کہ ترقی پسند ادب میں عریانی اور فحاشی نہیں ہونی چاہیے یہ بڑھا دیا جائے، "مگر لطیف قسم کی عریانی میں مضائقہ نہیں" اور ایک تقریر بھی جھاڑ دی کہ ادب میں عریانی اور فحاشی تو ہونی چاہیے اس میں کیا مضائقہ نہیں۔ دنیا کا جتنا بڑا آرٹ ہے سب میں آپ عریانی ملے گی۔ شاعری میں بھی ہوتی ہے۔ عریانی میں کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ شائستہ اور لطیف ہونی چاہیے۔ تو بڑی بحث ہوئی اس پر بہت سمجھایا لوگوں نے مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت قاضی صاحب کے مشورے پر قرار داد واپس لینی پڑی مجھے یاد ہے اس وقت سبطِ حسن نے کہا تھا "مولانا بہت صحیح بات کہتے ہیں مگر بہت غلط موقع پر کہتے ہیں" میں سمجھتا ہوں یہ کانفرنس ہمار ادبی زندگی کا ایک Turninig Point تھی۔ اور اس کا سب سے بڑا Contribution یہ تھا کہ نئے لکھنے والوں میں ایک خاص جذبہ اور جوش و خروش پیدا ہوا۔

اس کانفرنس سے واپس جاکر کرشن چندر نے اس پر ایک رپورتاژ لکھا اس میں اورنگ آباد، خلد آباد، ایلورہ، اجنتہ کی سیر کا طور خاص ذکر کیا ہے۔ یہ پروگرام اس طرح بنا کہ کانفرنس کے ختم پر حسبِ دستور جب ایک رات باجی کے گھر پر کیفی، مجروح، کرشن چندر، علی سردار جعفری، مخدوم وغیرہ کی دعوت تھی باتوں باتوں میں اجنتہ کی سیر کا پروگرام بن گیا۔ میری بیوی ریاست خانم کے وا اس وقت اورنگ آباد میں تھے۔ مخدوم کے سوا سب شاعر اور کچھ ہم لوگ، رضیہ، رابعہ، برنی، میں، ریاست، پورا قافلہ اورنگ آباد روانہ ہوا راستے میں وقت گزاری کے لیے بیت بازی ہوئی ہم بھائی بہنوں کو بہت شعر یاد تھے۔ تو ہم نے چیلنج کیا کہ ہم تین بھائی ایک طرف اور شاعر سب ایک طرف بہ شمول کرشن چندر۔

کرشن چندر تو دو تین شعر سنا کر سو گئے مگر جعفری، کیفی اور مجروح ڈٹے رہے۔ کوئی تین گھنٹے تک بیت بازی چلتی رہی ہار جیت کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ریاست کے والد نے ہم سب کو ایک بڑے مکان میں ٹھیرایا اور بہت خاطر تواضع کی۔ ہم دو دن وہا رہے۔ ایلورہ اجنتہ کی سیر کی دولت آباد کا قلعہ دیکھا۔ وہیں کیفی اور شوکت کا عشق شروع ہوا حالاں کہ شوکت کا رشتہ ان کے ماموز

طے ہو چکا تھا۔ مگر یہ دل کی بات تھی، دونوں اپنی جگہ اٹل رہے تو کچھ عرصہ بعد ایک دن شوکت کے والد اچانک بیوی سے یہ کہہ
ے پر جا رہا ہوں اور شوکت کو ساتھ لیے (وہ اکثر دورہ پر اپنے ساتھ بچوں کو لے جاتے تھے) سیدھے بمبئی پہنچے سجاد ظہیر کے مکان
کت اور کیفی کی شادی کرا دیجیے۔ جوش صاحب بھی اسی زمانے میں وہاں تھے۔ وہ شہہ بالا بنے اور اس طرح دو چاہنے والوں کا
لیا۔ تو خیر قطع نظر اس کے اس کانفرنس کا ذکر بنے بھائی نے بھی اپنی کتاب "روشنائی" میں کیا ہے اور خلیل الرحمان اعظمی نے
کے بارے میں کچھ لکھا ہے مگر اب تک بھی میرا خیال ہے کسی نے بھی اس کانفرنس کے تعلق سے جس طرح چاہیے تفصیل سے
اچھے نہ اس میں درپیش مسائل کا خاطر خواہ تجزیہ کیا ہے۔ میرے ذہن میں اس تعلق سے جتنا مواد محفوظ ہے "روشنائی" کی طرح
تین کتابیں لکھ سکتا ہوں بہ شرط فرصت و حیات۔ بہرحال یہ کانفرنس ختم ہو گئی اور نوجوان ذہنوں پر اس کا بہت اثر ہوا۔ مگر
کی اس زمانے کی علمی ادبی تہذیبی تاریخ کو سمجھنے کے لیے اور آگے کی راہیں نکالنے کے لیے، میرا خیال ہے یہاں کی دو تحریکیں اور دو
کو سمجھنا بہت ضروری ہے ایک رضاکاروں کا رجحان دوسرے ترقی پسندوں کا رجحان تو آئیے پہلے میں اس ضمن میں آپ سے کچھ
وں:

یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ ۴۷ء میں ہندستان کو آزادی ملی، ملک کا بٹوارہ ہوا۔ تو جاتے جاتے مونٹ بیٹن ایک پھلجھڑی چھوڑ
ریاستیں جو تھیں وہ چاہیں تو ہندستان کے ساتھ شریک ہوں یا پاکستان کے ساتھ۔ یعنی ان کو کسی ایک سے الحاق کا پورا اختیار دیا
تو ریاست حیدرآباد نے یہ اعلان کیا کہ ہم نہ پاکستان سے الحاق لیں گے نہ ہندستان سے۔ ہم خود مختار رہیں گے اور حضور نظام
کے سربراہ ہوں گے۔ ۱۵ / اگست کی صبح خود حضور نظام نے اعلان کیا تھا کہ "ہم نہ آزاد ہندستان میں ہیں نہ پاکستان میں، ہم آزاد
ستار ہیں" یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ وہاں ۴۷ء کی آزادی کا جشن منایا جا رہا تھا اور یہاں آزاد حیدرآباد کا.... اور یہ رجحان
ت ۹۰ فی صد مسلمان دانش وروں کا بھی ہو گیا تھا جس کا اندازہ آپ کو ابراہیم جلیس کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جو فصیح الدین کے
" پرچم" میں چھپا تھا۔ مگر جلیس کے بیان سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ جلیس جو ہمیشہ ترقی پسند مصنفین کے جلسوں،
ں میں سرگرم حصہ لیا کرتا تھا اس میں یہ کایا پلٹ کب آئی!!

جیسا کہ میں نے اوپر بھی اشارہ کیا ۳۹ء سے ہی حیدرآباد کی ٹھہری ہوئی زندگی میں کچھ ہلچل پیدا ہو رہی تھی۔ مختلف تحریکیں اٹھ رہی
ٹریڈز ایسوسی ایشن اس زمانے میں بنی ٹریڈ یونین کی بنا پڑی، کمیونسٹ پارٹی تشکیل پائی اور مجلس اتحاد المسلمین کا بھی تب ہی سے
جو شروع سے مسلمانوں کے اندر بہت غلط رجحانات پیدا کر رہی تھی اور ان کی صحیح رہنمائی کے بجائے ہم سمجھتے ہیں انھیں گم راہی
تے پر ڈال رہی تھی۔ عام مسلمانوں پر اس کا کافی اثر تھا۔ تاہم کچھ روشن فکر ذہن بھی تھے اقلیت میں ہی جو ترقی کے صحت مند
ں کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے جس میں پیام اخبار اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ ۴۵ء کی اس کل
نس نے جیسا کہ میں نے کہا نئے لکھنے والوں اور خاص طور سے نوجوانوں میں بڑا جوش و خروش پیدا کر دیا تھا اور انجمن کی ایکٹیویٹیز
ہ گئی تھیں۔ چناں چہ غالباً ۴۷ء میں جب ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا سکریٹری بنا تو اس وقت طے پائی میں میرے گھر کے وسیع
ں انجمن کے ہفتہ وار جلسے ہوتے تھے۔ کم و بیش سب ہی نوجوان لکھنے والے اس میں شرکت کرتے تھے۔ کئی خواتین بھی اس میں
ہوتی تھیں۔ ہر ہفتہ ۶۰، ۷۰ لوگ جمع ہو جاتے تھے اور یہ جلسے بڑے اچھے بلند معیار کے ہوتے تھے۔ مضامین پڑھے جاتے تھے،
سنائی جاتی تھیں، نظمیں پڑھی جاتی تھیں اور ان پر بحثیں ہوتی تھیں، تنقیدیں ہوتی تھیں اور بہت صحت مند انداز سے۔ ابراہیم

جلیس اور نظر حیدرآبادی اس کے بہت اہم پرانے ممبر تھے۔ جلیس کا پہلا مجموعہ "زرد چہرے" مسلم ضیائی نے چھاپا تھا اور میں نے مسلم ضیائی نے مل کر اس کی پروف ریڈنگ کی تھی اور ہم جلیس کو بہت اچھا ابھرتا ہوا ادیب سمجھتے تھے۔ میں جلیس کو بہت پسند کرتا ..... تو پھر کیا ہوا کہ ایک جلسے میں ابراہیم جلیس نے "اعلیٰ حضرت" کے عنوان سے ایک کہانی پڑھی اور نظر حیدرآبادی نے اس عنو سے ایک نظم سنائی، اس پر تنقید ہوئی دیر تک بحث چلی۔ انھوں نے جواب بھی بہت اچھے دیے مگر تیسرے دن جلیس نے انجمن رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ ہم نے مجلس عاملہ کی میٹنگ بلائی اس میں عالم خوند میری بھی تھے زینت ساجدہ بھی تھیں۔ طئے یہ پایا کہ کچھ جذبات کی رو میں بہہ گیا ہے اس کا استعفیٰ قبول نہ کیا جائے۔ چناں چہ سکریٹری کی حیثیت سے میں نے ان کو خط لکھا کہ کمیٹی نے کا استعفیٰ منظور نہیں کیا۔ اس کا انھوں نے بہت سخت جواب دیا اتفاق سے ان کا وہ خط آج تک میرے پاس محفوظ ہے اس میں جی بھر مجھے گالیاں دی ہیں...... یہ بہر حال جیسے ایک عجیب جنون کی ہوا چل پڑی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین میں جتنے دانش ور تھے اس میں سے فی صد جلیس کے ہم نوا بن گئے یعنی مجلس کے ساتھ رضاکار گروپ میں چلے گئے اور ساتھ ہی ابراہیم جلیس نے اپنی ایک نئی انجمن کا کر دیا اسی ترقی پسند مصنفین کے نام سے..... ہم نے یہ خبر اخباروں میں پڑھی کہ ابراہیم جلیس وغیرہ نے مل کر ایک نئی انجمن ترقی مصنفین بنائی ہے جس کا افتتاحی اجلاس فلاں فلاں تاریخ کو زمرد محل ٹاکیز میں ہوگا۔ جلسے کی صدارت عزیز احمد کریں گے اور قاسم رضوی آ فرمائیں گے.... تو یہ جلسہ بڑے دھوم دھام سے ہوا اور قاسم رضوی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا بلکہ یہ اعلان کیا کہ جو قلم ہما خلاف اٹھے گا قلم کر دیا جائے گا اور فصیح الدین کے ہفتہ وار "پرچم" میں اردو سے ہندستان میں ناانصافی کے عنوان سے ابراہیم جلیس مضمون چھپا تھا اس کے آخری حصے میں انھوں نے لکھا تھا۔

"اگر کشمیریوں کا نعرہ حق بہ جانب ہے تو حیدرآبادیوں کا مطالبہ کیوں ناجائز سمجھا جائے۔اس موقع پر حیدرآباد کے ادیب، اور فن کار بغیر کسی ذہنی تحفظ کے اس امر کا اعلان ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمیں مجلس کی موجودہ قیادت پر کامل اعتماد ہے اور مولوی قاسم رضوی کی خدمت میں پورے خلوص سے اپنی تمناؤں اور دعاؤں کا ہدیہ پیش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ قائد ملت کا لگایا ہوا پودا، پھلتا پھولتا رہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بعض پٹی ہوئی قیادتیں اور گری ہوئی عمارتیں پھر ایک محاذ بنانے والی ہیں لیکن ہم یقین دلاتے کہ ملک کی بقا اور مجلس کی بقا اور خود اپنی بقا کے لیے ہم ہر وار کا بھرپور جواب دیں گے اور علم و فضل کے تمام ذرائع اس کے خ استعمال کریں گے۔آزاد حیدرآباد پائندہ باد!"

یہ تھا ان کا اعلان اور اس پر کوئی ساٹھ، ستر ادیبوں کے دستخط ہیں جن میں سے کچھ اہم نام یہ ہیں:
نظر حیدرآبادی، شاہد صدیقی، میکش، تحسین سروری، مسلم ضیائی، اکبر وفاقانی، شاہین فاروقی، بیگم عبدالحفیظ، رشید قریشی، حبیب احمد یوسف زئی، علی اشرف، بشیر الدین، عبدالرزاق لاری، شاہ بلیغ الدین، بشیرالنساء بشیر، احمد مکی، صمد رضوی ساز، مرزا شکور، خیرات ندیم، سہام مرزا، حفیظ انجم خواجہ معین الدین وغیرہ..... تو دیکھیے یہ عام رجحان ہو گیا تھا اس وقت مسلمانوں کا اور قاسم رضو اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے تھے۔ تو غرض جب ایک نئی تنظیم بن گئی اور ترقی پسند ابراہیم جلیس، نظر حیدرآبادی وغیرہ رضاکار تحریک سرگرم رکن بن گئے اور ہماری طرف کے تقریباً بہت سے ساتھی ادھر چلے گئے صرف چند گنے چنے لوگ رہ گئے۔ قاسم رضوی رضاکا کے سرپرست بنے ہوئے تھے اور ریڈیو پر ظفرالحسن ان کے مربی تھے۔ رضاکار تحریک کا زور بڑھتا جارہا تھا۔ اب جو یہ دارالسلام ہے و کا اڈہ تھا اور ایک وقتی رو میں بہہ جانے والے سارے ذہین ادیب شاعر دن رات اس کے پروپگنڈے میں لگے ہوئے تھے۔ فصیح ا

صاحب نے اپنا ہفتہ وار پرچم ابراہیم جلیس کے حوالے کر دیا تھا کہ تم اس میں جو چاہے لکھو خود بھی کھاؤ ہم کو بھی کھلاؤ۔ ابراہیم جلیس اور ان کے ساتھیوں کو دارالسلام میں ایک بہت بڑا کمرہ دے دیا گیا تھا جہاں دس پندرہ آدمی، بس دن رات وہیں پڑے رہتے تھے کھانا پینا مفت ملتا تھا خوب بریانی اڑاتے۔ ریڈیو کے انچارج مرزا ظفرالحسن تھے۔ صبح ۷ بجے سے ۱۲ بجے رات تک حیدرآباد اور اورنگ آباد ریڈیو پر پروپگینڈہ تقریریں ہوتیں، نظمیں پڑھی جاتیں اور اس میں شک نہیں یہ پروپگینڈہ بہت موثر انداز میں ہوتا تھا۔ ہم بھی سنتے تھے۔ بڑے اچھے پروگرام ہوتے تھے کیوں کہ اس گروپ میں کئی اچھے اہل قلم تھے مگر ظاہر ہے عام مسلمانوں کے لیے یہ پروپگینڈہ زہرِ قاتل تھا۔ ہم اس کے خلاف لکھتے تھے۔ چناں چہ ملے پلی کے ہمارے جو دو تین گھر تھے، باجی کا، رضیہ کا میرا وہ ان کا نشانہ بنے رہتے تھے۔ باہر سے کبھی پتھراؤ بھی ہوتا۔ ایک بار والد صاحب ورانڈے میں نماز پڑھ رہے تھے باہر سے کسی نے ایک پتھر پھینکا جو ان کی پیشانی پر آکر لگا کافی خون گیا۔ تو یہ حالت تھی رضاکاروں کے جنون کی اور ابراہیم جلیس ان کے سرگروہ تھے..... آپ کو تو معلوم ہوگا کہ ابراہیم جلیس، محبوب حسین جگر صاحب کے بھائی تھے، مجتبیٰ حسین بھی ان کے بھائی ہیں۔ یہ گھرانا دراصل عثمان آباد کا ہے جو گلبرگہ میں آکر بس گیا تھا۔ ابراہیم جلیس نے علی گڑھ سے ایم۔ اے کیا تھا اور جگر صاحب کے کہنے پر ہی وہ حیدرآباد آئے تھے۔ جب ان کو "پرچم" سونپا گیا اور ابراہیم جلیس نے رضاکار تحریک کا پر زور پروپگینڈہ شروع کیا تو جگر صاحب اور مدیر سیاست عابد علی خاں نے ان کو سخت تنبیہہ کی جس کا ذکر جلیس نے خود اپنی کتاب "دو ملک ایک کہانی" میں کیا ہے اور ان کے کچھ خطوط بھی اس کے ثبوت میں موجود ہیں۔ مگر اس وقت تو ان کے سر پر قاسم رضوی سوار تھے..... پھر گاندھی جی کے قتل پر انھوں نے ایک تعزیتی جلسہ بلایا اور اعلان کیا کہ ڈاکٹر رضی الدین وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی اس کے صدارت کریں گے اور خلیفہ عبدالحکیم پروفیسر فلاسفی جامعہ عثمانیہ تقریر کریں گے تو ہم نے "پیام" میں ان کا خیر مقدم کیا مگر یہ ضرور لکھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے تو آپ استعفیٰ دے چکے ہیں، پھر اس کا Banner کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ اس پر موصوف نے طول طویل بیانات لکھے۔ وہ آج تک میرے پاس محفوظ ہیں۔ اختر حسن پر لعن طعن اور اعتراضات کی بوچھار! بہ ہر حال انجمن کا وہ جلسہ ہوا جس کی روئیداد تفصیل سے چھپی اس کے بعد ہی اردو کے ادیبوں شاعروں کی طرف سے جس پر کوئی سو سے زیادہ اہل قلم اور ممتاز شخصیتوں کے دست خط تھے۔ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے..... اسی زمانے میں میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے اورنگ آباد گیا۔ آپ کو شاید علم نہ ہو کہ نظام کے زمانے میں اچھے اخبار کے مدیروں کو ریلوے پاس ملا کرتے تھے ایک فرسٹ کلاس کا اور ایک تھرڈ کلاس کا۔ اورنگ آباد سے واپس آرہا تھا کہ رات کے ۲ بجے ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی اور اللہ اکبر کے نعروں سے میں جاگ پڑا۔ نیچے اترا تو دیکھا پلیٹ فارم پر بہت سے جانے پہچانے چہرے ہیں۔ معلوم ہوا قاسم رضوی اس ٹرین سے واپس حیدرآباد جا رہے ہیں وہ سارے لوگ انھیں رخصت کرنے آئے ہیں۔ قاسم رضوی کی آواز سن چکا تھا بہت چیخ کر جلالی انداز میں بات کرتے تھے اور دو بار فوجی وردی میں ان کو دیکھا بھی تھا مگر ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ کسی نے یہاں اسٹیشن پر میرا ان سے تعارف کرایا تو کہنے لگے آپ ہمارے ڈبے میں آجائیے ہم عوامی آدمی ہیں تھرڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ میں نے کہا "میں بھی عوامی آدمی ہوں مگر فرسٹ کلاس میں اس لیے سفر کر رہا ہوں کہ آپ کے حضور نے مجھے ریلوے پاس عنایت فرمایا ہے۔ اگر آپ وہاں آنا چاہیں تو ضرور آجائیے" تو قاسم رضوی اور ان کے دو چار ساتھی میرے ڈبے میں آبیٹھے اور باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ سیاست، صحافت، حضور نظام، مسلمانوں کے حقوق ہر طرح کی باتیں، اسلامی جنگ عزیت کا بھی ذکر چھیڑا۔ میرے بعض اعتراضات پر قاسم رضوی صاحب نے بہت صاف الفاظ میں کہا "اسلام میں شاہی نہیں ہے مگر ہم اپنے شاہ کو اس لیے زندہ رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کو باغیا کا انجکشن دے کر ہم مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت

کر سکیں اور ان کا مفاد اس میں ہے کہ یہ اسٹیٹ باقی رہے۔" میں نے کہا "کیسے باقی رہے گا جب مسلمان یہاں صرف ۱۰ فی صد ہیں" تو ا
طرح خوب باتیں رہیں۔ آخر انھوں نے کہا "اختر صاحب آپ اپنے نظریات کا پرچار کیجیے مگر ہمارے خلاف مت لکھیے، ایسا ایک کم
ہمارے درمیان ہوجائے تو اچھا ہے۔ اس کا جواب میں نے یہ دیا کہ "ہم بہت نازک دور سے گزر رہے ہیں اور میرے جو اصول ہیں م
اسی بنا پر کام کررہوں گا"...... اس کے بعد ہم کاچی گوڑہ اسٹیشن پر ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

دوسرے دن ایک جلسہ عام میں انھوں نے ہمارے اوپر خوب کیچڑ اچھالی..... قاسم رضوی نے بی بی نگر میں جو تقریر کی وہ ا
اشتعال انگیز تھی کہ اس کی رپورٹ چھپی تو پہلی بار میں نے بہت سخت اداریہ لکھا۔ یہ پولیس ایکشن سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ م
نے لکھا تھا کہ مسلمان جو اس طرح سے اپنے حقوق منوانا چاہتے ہیں ان کا مستقبل کتنا بھیانک ہونے والا ہے، میرا یہ اداریہ بہت مشہ
ہوا۔ نیشنل پریس یعنی انگریزی پریس نے بھی اسے نقل کیا اور جب قاسم رضوی پر مقدمہ چلا تو کورٹ میں وہ اداریہ پیش ہوا اور
بھی بلایا گیا...... اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک بڑا حادثہ ہوا۔ شعیب اللہ خاں کا قتل ہوگیا شاید ۱۳/ ستمبر کو وہ بی رام کشن راؤ کے اخ
کے مدیر تھے جو ان کے گھر کاچی گوڑہ سے نکلتا تھا۔

شعیب صاحب سے میری ایک دوبار ملاقات ہوئی تھی بہت خوب صورت آدمی تھے۔ اب ہر سال ان کی جو برسی منائی جاتی ہے
اس میں ضرور جاتا ہوں اور تقریر بھی کرتا ہوں۔

جس روز یہ حادثہ ہوا اس کے دوسرے دن صبح سویرے مانک لال گپتا جو میرے ایک دوست تھے عالم کے ساتھیوں میں سے،
بنجارہ ہلز پر رہتے تھے۔ صبح سویرے گاڑی لے کر آئے اور مجھے بہ اصرار اپنے گھر لے گئے اور پولیس ایکشن تک میں ان کے گھر میں روپو
رہا۔ ان کو سب خبریں ملتی رہتی تھیں اور یہ خبر بھی مل گئی تھی کہ میرے ساتھ بھی وہی سلوک ہونے والا ہے جو شعیب صاحب کے س
ہوا...... تو دیکھیے حیدرآباد میں اس وقت کچھ Sensable لوگ بھی تھے، ہمدرد دوست بھی اور روشن فکر بھی۔

پیام کا یہ خاص کارنامہ ہے کہ اس پرآشوب دور میں اس نے عوام کی صحیح رہنمائی کا فرض انجام دیا، بہت اچھے اداریے لکھے
حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی۔ اور یہ بہر حال سمجھ دار لوگوں کا بھی فقدان نہیں تھا بھلے ہی وہ گنے چنے کیوں نہ ہوں۔ میں نے اور
نے مل کر ایک Opinion Pole قائم کیا تھا اور تقریباً سو سے زاید شہر کے معزز اور معتبر مسلمانوں سے ان کی رائے حاصل کی تھ
ان میں ۷۰ فی صد نے مجلس اور رضاکار تحریک کی مخالفت میں رائیں تھیں اور صرف ۳۰ فی صد ان کی موافقت میں اور وہ ۷۰ فی
مسلمان ان ہی میں سے تھے۔ ملا عبدالباسط، منظور جنگ، باقر علی مرزا وغیرہ جنھوں نے ایک Statement لکھا تھا اور جے
منظور جنگ میرے پاس لے کر آئے تھے۔ میں نے اس کو "پیام" کے پہلے صفحہ پر چھاپا۔ یہ چند قوم پرستوں کا بہت تلخ و تند بیان تھا
اخبار نے اس کو چھاپنے سے انکار کردیا تھا حتیٰ کہ شعیب اللہ خاں نے بھی اپنے اخبار "امروز" میں دینا مناسب نہیں سمجھا۔ جب من
جنگ اسے خود میرے پاس لے کر آئے کہ اگر آپ چھاپ سکیں تو کل کے اخبار میں پہلے صفحہ پر چھاپیں، میں نے اس بیان کو جو کافی طو
تھا پیام کے پہلے صفحہ پر چھاپا۔ اس کے لیے زاہد کاغذ راجہ گنیر وال جی نے فراہم کیا تھا جو اسمبلی کے ممبر بھی رہے ہیں۔ مجلس کی پالیسی
کے خلاف وہ بہت سخت بیان تھا اور قاسم رضوی پر شدید تنقید کہ آپ پوری قوم کو تباہ کررہے ہیں، ہماری پوری تہذیب، علمی اور
زندگی کی تباہی کا باعث بن رہے ہیں، آج کے تقاضوں کو کیجیے آپ کی نافہمی، نادانی ہم سب کو ڈبو کر رہے گی وغیرہ وغیرہ..... ہندستا

ری کوئی نیشنل پریس اور اخبار ایسا ہو جس نے اس کا خلاصہ نہ چھاپا ہو۔

آزاد حیدرآباد یا رضاکار تحریک کے بارے میں ہمارا یہ تجزیہ ہے کہ یہاں کے جو کچھ بڑے سرمایہ دار تھے جیسے لائق علی نظام شوگر
ری اور سرپور پیپر ملز وغیرہ کے مالک، داؤد خاں، خان بہادر علاء الدین وغیرہ ان کے ذہن میں یہ تصور تھا کہ اگر حیدرآباد اسٹیٹ
ین یونین میں ضم ہو گیا تو وہ ٹاٹا، برلا سے مقابلہ نہ کر سکیں گے اس لیے وہ آزاد حیدرآباد کی تائید میں تھے اور در پردہ بعض بیرونی
ں سے ان کو ایسے تیقنات دیے گئے تھے کہ وہ اس معاملے میں ان کی پوری پوری مدد کریں گے۔ تو کچھ بڑے سرمایہ دار اس طرح سوچ
ہ تھے۔ لیکن قاسم رضوی اور ان کے پیروؤں کا جو رضاکار گروپ تھا ان کا نقطہ نظر خالص اسلامی تھا کہ اپنے مذہب کو بچانے کے لیے
آباد کو خود مختار اور نظام کو برقرار رکھنا ہوگا۔ اور وہاں حضور نظام گدی پر بیٹھے ڈبل Game کھیل رہے تھے۔ ایک طرف تو
ں نے لائق علی کی حکومت کو قبول کر لیا تھا اور دوسری طرف زین یار جنگ کے ذریعے انڈین یونین سے بات چیت کر رہے تھے۔
خیال ہے نظام نے لائق علی کی گورنمنٹ کو کسی شدید دباؤ کے تحت قبول کیا تھا۔ ان کو تو بس اپنے اقتدار کی برقراری کی فکر تھی۔ اس
کبھی لائق علی کی طرف اور کبھی قاسم رضوی کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی ڈر کر انڈین یونین کی طرف۔ ان کا جھکاؤ انڈین گورنمنٹ کی
زیادہ تھا۔ ایسا لگتا ہے سیاسی سطح پر پہلے سے ایک معاہدہ طے پاچکا تھا جس کی شرائط نظام کے حق میں تھیں اور وہ کوشش یہ کر رہے
کہ اس معاہدے کو ایک سال کی توسیع مل جائے۔ زین یار جنگ کے ذریعے یہی کوشش ہو رہی تھی مگر بات چھپی نہیں رہی۔ لائق علی
قاسم رضوی نے اس کی مخالفت کی اور زین یار جنگ کے خلاف ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ ان کے دماغوں میں تو بس ایک دھن سمائی ہوئی
اور سمجھ رہے تھے کہ بس ان کو آزاد حیدرآباد مل ہی گیا اور کوئی طاقت ان کو روک نہیں سکتی۔ یہ نہیں سوچتے تھے کہ وہ کس طرح
ے ہوئے ہیں ہر طرف سے۔ بالفرض ۱۵ لاکھ مسلمان سب رضاکار بن جائیں تو بھی کیا یہ ممکن تھا کہ وہ انڈین گورنمنٹ کی طاقت سے
ی فوجوں سے مقابلہ کر سکیں! وہ حملہ کر دے تو کیا حشر ہوگا نہتے رضاکاروں کا!! بس خواب دیکھ رہے تھے لال قلعہ پر اپنا جھنڈا لہرانے
عجیب بچکانہ تصورات تھے ان کے۔ اپنی تنظیم اور پروپگینڈے پر ان کو ضرورت سے زیادہ اعتماد تھا۔ اس میں شک نہیں کہ
کاروں کا پروپگینڈہ کچھ ایسا موثر اور شدید تھا کہ انڈین گورنمنٹ کو یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ ان کے پاس ہتیار کا وافر ذخیرہ ہے اور ممکن
پاکستان یا دوسرے اسلامی ممالک بھی در پردہ مدد کر رہے ہوں۔

دوسرے یہ کہ سڈنی کاٹن کی وجہ سے گورنمنٹ کو اور تشویش ہو گئی تھی۔ یہ سڈنی کاٹن ۷۰۲، سے اپنے ہوائی جہاز کے ذریعے یہاں
Smuggle کر رہا تھا۔ چناں چہ حکومت ہند نے جب بالآخر پولیس ایکشن کا فیصلہ کیا تو ۲۴ محاذوں سے کوئی اسی (۸۰) لاکھ فوجیں
۔ کہنا چاہیے یہ پولیس ایکشن نہیں بلکہ ملٹری ایکشن تھا اور فوجیوں نے یہاں جو تباہی مچائی، ہزاروں نہتے رضاکاروں کو جس طرح مارا
کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ پدمجا نائیڈو اس وقت یو۔پی کی گورنر تھیں۔ جب ان کو اپنے شہر حیدرآباد کے المیہ کی خبر ملی تو وہ رو پڑیں

رضاکاروں نے بیشک بہت غنڈہ گردی مچائی تھی، دوسرے فرقے پر بہت ظلم کیا تھا، عورتوں کو ستایا تھا لیکن لیکن بڑے دکھ
یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ رضاکاروں نے اس وقت جو کچھ کیا اپنے زعم میں، دوسرے فرقے پر جو مظالم ڈھائے۔ پولیس ایکشن کے
ن اور اس کے بعد دوسرے فرقے کی طرف سے اس سے دس گناہ زیادہ مظالم ہوئے جس کا ڈاکومنٹری ثبوت موجود ہے۔ جواہر لال
نے سندر لال جی کو یہاں بھیجا تھا پولیس ایکشن کے کچھ مہینوں بعد، قاضی عبدالغفار صاحب بھی آئے تھے ان کی رپورٹیں موجود ہیں۔

انھوں نے خاص طور سے عثمان آباد وغیرہ علاقوں کا دورہ کیا تھا جہاں ناقابل بیان مظالم ہوئے تھے۔ مرہٹواڑہ کا جو منسٹر تھا اس نے چن چن کر مسلمانوں کو قتل کروایا۔ باؤلیوں میں سے ہزاروں لاکھوں نعشیں نکلیں۔ سندرلال جی کی رپورٹ اس کی شاہد ہے۔ سندرلال جی، آپ کو معلوم ہے، بہت اثر انگیز تقریر کرتے تھے خود بھی روتے تھے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے۔ اسی زمانے میں اتفاق سے حسرت موہانی بھی آئے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا جلسہ تھا۔ اس میں حسرت اور میں بھی گئے۔ سندرلال جی مولانا روم کے شعر اپنی تقریر میں دہرا رہے تھے اور روتے جاتے تھے۔ حسرت کو سندرلال جی کا یہ انداز تقریر پسند نہیں تھا۔ کہنے لگے بات جو کہنا ہے کہے مگر یہ ٹسوے کیوں بہا رہا ہے۔ خیر تو سندرلال جی نے یہاں کی جو رپورٹ بھیجی وہ منظرِ عام پر نہیں آئی۔ قاضی صاحب نے اس کے کچھ اقتباسات مجھے بتائے تھے۔ بڑی بھیانک دل ہلا دینے والی رپورٹ ہے وہ۔ رضاکاروں نے اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں کیا ہوگا۔ اکثریت نے اقلیت سے جو بدلہ لیا وہ ناقابل بیان ہے خاص طور سے عثمان آباد اور بھناباد میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔

میرے والد جس زمانے میں راجھیشور میں تھے، وہاں کے ایک ۱۶ سال کے لڑکے نے کام کے لیے درخواست دی تھی۔ مستان نام تھا اس کا۔ ابھی کچھ دنوں پہلے اس کا انتقال ہوا۔ والد صاحب نے اس کا چپراسی کی جائیداد پر تقرر کردیا تھا۔ پولیس ایکشن کے وقت وہاں کیا ہوا، کس طرح مسلمانوں کو مارا گیا اور اس کے سارے گھر والوں پر کیا گزری اور وہ کیسے چھپتا چھپاتا ہزار مشکلیں اٹھا کر حیدرآباد پہنچا اس نے وہ سب باتیں ہم کو بتائیں۔ اس نے بتایا راجھیشور میں جتنے مسلمان تھے بوڑھے، بچے عورتیں، مرد سب کو قتل کردیا گیا۔ اس جیسے صرف چند ہی نوجوان کسی طرح بچ کر وہاں سے نکل سکے۔ بڑا محنتی آدمی تھا وہ مستان اور بے حد وفادار۔ میں نے اسے یہاں پیام میں چپراسی کے طور پر رکھ لیا تھا۔ جب تک پیام چلا وہ بڑی تن دہی سے کام کرتا رہا۔ جب پیام بند ہوگیا تو میں نے اس کو کہیں اور ملازمت دلانا چاہی مگر اس نے کہا "صاحب، میں نوکری کرنا نہیں چاہتا آپ مجھے پانچ سو (۵۰۰) روپے دے دیں تو میں کچھ کاروبار کرکے اپنا پیٹ پال لوں گا۔" تو میری بیوی ریاست نے اس کو یہ رقم دے دی۔ پہلے اس نے لکڑیوں کی ٹال لگائی، پھر مرغیوں کا کاروبار شروع کیا، چلی مارکٹ میں۔ شادی کرلی، گیارہ بارہ بچے پیدا کیے۔ اور آپ کو یقین نہیں آئے گا اس وقت نام پلی مارکٹ میں اس کی دومنزلہ نو دس کمروں کی بلڈنگ کھڑی ہے، نیچے مرغیوں کا دھندا چل رہا ہے، پچاس پچاس ہزار لگا کر لڑکیوں اور لڑکوں کی شادیاں کیں دو ایک لڑکیوں کو میٹرک تک پڑھایا بھی اور لڑکوں کو اسی کاروبار میں لگا دیا۔ لکھ پتی بن گیا مگر ہم سے جب بھی ملتا بڑی انکساری اور عاجزی سے ملتا ہمیشہ یاد کرتا کہ ہمارے والد صاحب نے اسے نوکری دلائی تھی اور آپ لوگوں کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ کرسکا۔ بڑا جفاکش احسان فراموش آدمی تھا۔ اسی سے ہم کو معلوم ہوا کہ پھول چند نامی وہاں ایک بڑا بدمعاش آدمی تھا وہ مخبری کرتا تھا مسلمانوں کی اور فوجی انھیں گولی سے اڑا دیتے تھے۔ خود میرے داماد جو انوار العلوم کالج میں تاریخ کے ریڈر ہیں وہ اور ان کا گھرانہ اس وقت عثمان آباد میں تھا۔ بال بچے تھے۔ وہ بتاتے ہیں فوج کا حملہ ہوا تو سڑک لاشوں سے پٹ گئی۔ ہم کسی طرح چھپ کر وہاں سے بھاگے اور چار دن پیدل چلتے مصیبتیں اٹھاتے، بھوکے پیاسے، برے حالوں حیدرآباد پہنچے۔ اسی طرح نلگنڈے کے ایک کلکٹر تھے وہ بھی کئی دن پیدل چل کر، بہ مشکل جان بچا کر یہاں پہنچے۔ وہ بھی بتاتے تھے کہ چن چن کر مسلمانوں کو مارا گیا۔ میری ایک خالہ زاد بہن بھی اسی طرح ماری گئی اور میرا ایک تایازاد بھائی بھی۔ غرض ہزاروں لاکھوں مسلمان مارے گئے۔ رضاکار کچھ لیڈر کراچی بھاگ گئے اور کچھ مارے گئے۔ اور اس کا اثر مسلمانوں پر یہ پڑا کہ ان میں شدید احساس کمتری پیدا ہوگیا۔ کل تک جن کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ ہم ہی سب کچھ ہیں، طاقت ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم بادشاہ ہیں، ہماری حکومت ہے، کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ان پر دفعتہً یہ آفت ٹوٹی، یہ کایا پلٹ ہوئی تو لازماً ان کے دل

یہ احساس پیدا ہوا کہ "ہم کچھ نہیں ہیں" اور سب جھوٹ تھا، ہمارا کوئی یار و مددگار نہیں، ہم بالکل بے بس و لاچار ہیں، ہماری جان مال کا کوئی محافظ نہیں، ہم دوسروں کے رحم و کرم پر ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا ۳ ستمبر ۴۸ء کو بمبئی سے انڈین فوجوں کا مارچ شروع ہوا اور ۳ ستمبر ۴۸ء ہی کو قائد اعظم جناح کی وفات کا دن ہے ی وجہ سے فوجوں کا مارچ ایک دن روک دیا گیا۔ ۴ ستمبر ۴۸ء کو اورنگ آباد اور عثمان آباد کے راستے انڈین فوجیں حیدرآباد میں ں ہوگئیں اور تاریخ کا ایک باب تمام ہوگیا۔ "تا ابد خالق عالم یہ ریاست رکھے" کی گونج ٹوٹ گئی۔

۱۵/ اگست ۴۷ء کو حضور نظام اعلیٰ حضرت نے مکہ مسجد میں جا کر نماز شکرانہ ادا کی تھی اور عابد س کے چوراہے پر بہت بڑا تہنیتی ہوا تھا کہ حضور His Excelency سے His Exalted Highness بن گئے تھے۔ وہاں انھوں نے نذریں وصول یں۔ مگر یہ جاہ و جلال ایک سال سے زیادہ نہ رہا اور نظام جن کی حکومت سطح مرتفع دکن کے ۸۶ لاکھ مربع میل کے رقبے پر پھیلی ہوئی س کی آبادی اس وقت ایک کروڑ ساٹھ لاکھ تھی، جس میں بیس لاکھ مسلمان (۱) تھے۔ باقی غیر مسلم، مگر حکمرانی مسلمانوں کی تھی۔ شاہ دکن تھے لیکن تاریخ کی کایا پلٹ سے اب وہ صرف راج پرمکھ رہ گئے تھے۔ اور بالآخر ۱۷ ستمبر ۴۸ء کو عثمان علی خاں نے اعلان کہ میری حکومت نے استعفیٰ دے دیا ہے اور میں انڈین یونین میں شریک ہو رہا ہوں۔ اس طرح ۱۷ ستمبر کو آصف جاہی سلطنت کے ں اور آخری فرمان روا میر عثمان علی پاشا نے حیدرآباد کی چار سو سالہ تاریخ کے آخری باب کے آخری صفحہ پر اتمام کی مہر ثبت کر دی ا ستمبر ۴۸ء کی صبح نے حیدرآباد کی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز کیا۔

ooo

ں:

قاسم رضوی نے بڑی تعداد میں مہاجرین کو بلایا تھا، کہتے ہیں پولیس ایکشن سے پہلے یہاں کوئی ۸ لاکھ کے قریب مہاجرین آگئے زیادہ تر ناگپور اور بہار سے آئے تھے اور ان کے شہر میں باقاعدہ کیمپ قائم ہوئے تھے تو اس طرح شہر میں مسلمانوں کی تعداد میں ںافہ ہو گیا تھا۔

ooo o ooo

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

حی بن یقظان کا معروضی مطالعہ

(ابن طفیل کا فکری نقطۂ عروج)

عربوں کے علمی سرمائے میں تین فلسفیانہ قصے ملتے ہیں جن کے نام میں یکسانیت ہے، مگر قصے الگ الگ ہیں۔ یعنی حی بن یقظان۔ یہ نام بھی معروضی فکر کا ترجمان ہے۔ تاریخی تسلسل کے لحاظ سے سب سے پہلا رمزیاتی فلسفیانہ رسالہ حی بن یقظان کے نام سے ابو علی بن سینا نے لکھا (حی کے معنی ہی خود اپنی قوت سے زندہ رہنے والا اور یقظان کا مطلب ہے بیدار) دوسرا رسالہ اسی موضوع پر اندلس کے مشہور فلسفی ابو بکر بن طفیل نے تحریر کیا اور تیسرا رسالہ حی بن یقظان کے نام سے شہاب الدین سہروردی نے قلم بند کیا۔ یہ تینوں رسائل صرف نام میں یکسانیت رکھتے ہیں اور ان کے قصے بھی الگ الگ ہیں خصوصاً شہاب الدین سہروردی کا رسالہ فلسفہ سے کوئی مس نہیں رکھتا وہ تصوف کی ترجمانی کرتا ہے۔

ان رسالوں میں سب سے اہم رسالہ وہ ہے جو ابن طفیل نے تصنیف کیا ہے۔ اس قصے میں دراصل انسان کے اندر جو جستجو اور معروضیت ہے اس کو کہانی کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ابن طفیل کا اصل نام ابو بکر محمد بن عبدالملک بن محمد بن محمد طفیل قیسی ہے۔ وہ بنو قیس کے قبیلے سے تھا۔ اس کے آباء و اجداد اندلس میں جاکر بس گئے تھے۔ وہ اندلسی، قرطبی اور اشبیلی بھی کہلاتا ہے۔ شہر قرطبہ سے شمال کی طرف ۵۳ کلومیٹر دور ایک مقام گواڈکس (Guadix) میں ابن طفیل پیدا ہوا۔ فلسفہ اس نے ابو بکر بن صائغ معروف بہ ابن باجہ سے حاصل کیا۔ اس نے ان کی شاگردی تو اختیار نہیں کی مگر ان کی کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا۔

اب میں سب سے پہلے اصل قصہ پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد اس قصے پر عرب مفکرین کی آراء پیش کی جائیں گی۔

ابن طفیل کہتے ہیں کہ ہمارے سلف صالح رضی اللہ عنہم نے بیان کیا کہ ہندستان کے جزیروں میں سے ایک جزیرہ ایسا ہے کہ جہاں انسان بغیر ماں باپ کے پیدا ہوتے ہیں۔ وہاں ایک درخت ہے جس میں عورتیں اگتی ہیں۔ ایک دوسری روایت کے مطابق موجوں نے اس صندوق کو اس جزیرے میں پھینک دیا جس میں اس کی ماں نے اس کو رکھا تھا۔ ابن طفیل نے دونوں روایتوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلی روایت کے مطابق اس جزیرے کی مٹی میں خمیر اٹھتا رہا صدیوں تک حتی کہ گرم، سرد، رطب اور یابس عناصر باہم مل گئے۔ جس کے باعث باہم اعتدال پیدا ہوگیا۔ مزاج اور قویٰ کے اعتدال کے باعث یہ سب عناصر باہم مل گئے۔ اس مٹی میں صلاحیت اس وقت پیدا ہوئی جب مٹی میں گرمی کی پھونک کا اثر ہوا تو میاں اور بیوی کے درمیان ایک ہوائی لطیف جسم نمودار ہوا اور اس میں خدا کے حکم سے روح کا ظہور ہوا۔

حی بن یقظان اور ہرن: اوپر کی تخلیق انسانی کی توضیح سے ابن طفیل پر کفر کا الزام عائد ہوتا ہے لہذا انھوں نے خدا کے حکم کا اضافہ کر دیا تاکہ وہ الزام سے بچ سکیں۔ دوسرا بیان حی بن یقظان کی ولادت کا یہ ہے کہ وہ ایک شخص مسمیٰ یقظان کا بیٹا ہے۔ یقظان اپنی ایک عزیزہ سے شادی کرنا چاہتا تھا جو بادشاہ کی بہن تھی۔ یہ شادی اس نے خفیہ کی۔ ایسا کرنا اس جزیرے کے رواج کے مطابق جائز تھا اور وہ حاملہ ہوگئی۔ اس طرح حی وہاں پیدا ہوا۔ مگر والدین کو بدنامی کا ڈر ہوا۔ اس بنا پر اس کی ماں نے اس کو ایک صندوق میں رکھا اور اس کو خوب

دودھ پلادیا۔ پھر سمندر میں ڈال دیا۔ موجیں اس کو ایک جزیرے تک لے آئیں۔ وہاں ہرنیں تھیں جو اپنے کھوئے بچے کی تلاش میں تھیں۔ جب ان کو حی مل گیا تو انھوں نے اس کو پال لیا اور اپنے ضائع شدہ لڑکے کی محبت کا اس میں بدل پالیا۔ اس طرح وہ ہرنوں کی تربیت میں پلتا رہا۔ وہ اس کو درختوں کے پھل کھلاتی تھیں، پانی پلاتی تھیں۔ اس نے ہرنوں کے ریوڑ میں رہ کر جانوروں کی زبان سیکھ لی۔ اس نے دیکھا کہ ہرنیں تو اپنے بالوں کی وجہ سے ننگی نہیں ہیں ان کے بال ان کے کپڑے ہیں اور یہ اپنے دفاع کے لیے اپنے دانتوں اور کھروں کو استعمال کرتی ہیں تو اس نے درختوں کے پتوں سے اپنے لیے کپڑا بنایا اور درختوں سے چھڑی بنائی تاکہ اس سے اپنی مدافعت کرسکے۔ جب اس کی ماں ہرن مرگئی تو وہ کچھ نہ سمجھ پایا کہ یہ کیا ہوا۔ اس نے پکارا مگر کوئی آواز نہ آئی وہ نہایت حسرت و قلق میں رہنے لگا۔ اس نے بار بار پکارا مگر کوئی جواب نہ پایا اس وقت زندگی کا راز معلوم کرنے کا سودا اس کے سر میں سمایا کہ وہ معلوم کرے کہ زندگی اور موت کا راز کیا ہے اور جسم میں کس طرح ان کا وقوع ہوتا ہے۔ وہ اس ادھیڑ بن میں رہنے لگا۔ وہ آگ سے گرمی حاصل کرتا، روشنی پاتا۔ حیوانات کی کھالوں کا کپڑا پہنتا، بالوں کو بطور دھاگا استعمال کرتا۔ اپنے لیے ایک گھر بنالیا۔ اس میں جانور پالتا۔ شکار کرتا۔ جو کائنات کے مظاہر اس کے گرد پھیلے ہوئے تھے وہ ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ وہ حیوانات، نباتات اور جمادات کو دیکھتا اور محسوس کرتا کہ ان سب میں اپنی فطرت کے مطابق حرکت ہے۔ اس نے جسم کا مطالعہ کیا تو محسوس کیا کہ جسم میں مادہ ہے جو صورت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے پر جسم میں حواس ہیں اور عقل موجود ہے۔

اس نے محسوس کیا کہ جسم میں اختلاف زیادہ نہیں ہے مگر اصل اختلاف صورتوں میں ہے۔ اس نے یہ دیکھا کہ ایک ہی مادہ کس طرح صورت بدلتا ہے۔ جیسے پانی ہے کہ وہ کبھی بخار، کبھی بھاپ بن جاتا ہے اور کبھی جما ہوا برف ہو جاتا ہے۔ اس نے اجرام سماوی پر خاص طور سے غور کیا اور عالم پر اس نے مجمل نگاہ ڈالی کہ عالم محدث (جدید) ہے یا قدیم۔ یعنی یہ کہ عالم پہلے تھا ہی نہیں قدیم زمانوں میں کبھی بھی یا وہ گزشتہ ادوار میں بھی موجود تھا اور عدم اس کو کبھی پیش نہیں آیا۔ رسالے میں بحث و مباحثہ، علم و عرفان اور فلسفیانہ سوالات اور ان کے جوابات برابر اور تسلسل سے جاری رہتے ہیں جن میں اصل مسائل کا محاکمہ بھی ہوتا ہے۔ ان مباحث سے قاری کے سامنے بصیرت کی نئی راہیں کھلتی ہیں اور مصنف ابن طفیل کچھ حکیمانہ انداز سے ان تمام امور کو مفصل پیش کر دیتا ہے جو قاری کی الجھن کو دور کر دیتی ہیں۔

اس کے بعد حی ابسال سے ملاقات کرتا ہے۔ ابسال ایک شخص ہے جس کا تعلق باطنی فرقے سے تھا۔ وہ پہلے ایک جزیرے میں تھا مگر اس کو چھوڑ دیا اور اس جزیرے میں آگیا جس میں حی رہتا تھا حالاں کہ پہلے والے جزیرے میں آبادی تھی۔ وہ تلاش عزلت اور لوگوں سے الگ رہنے کی خواہش کے باعث اس دوسرے جزیرے میں جہاں انسان نہ تھے آگیا۔ اس کو بالکل علم نہ تھا کہ وہاں ابسال رہتا ہے۔ ابسال جن جزیرے میں رہتا تھا اس پر سلامان حاکم تھا۔ سلامان ایک مذہبی آدمی تھا۔ مگر وہ دین کے ظاہری احکام پر عمل کرتا تھا۔ عقلی مباحث اور تاویلات سے قطعاً معریٰ تھا۔ وہ ظاہری نصوص پر عمل درآمد کرتا تھا لیکن ابسال جس ذہن و فکر کا انسان تھا وہ سلامان سے قطعاً مختلف تھا۔ وہ ظاہری امور پر اکتفا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ عقلی کاوش، بحث و مباحثہ اور تنقید و تاویل کا قائل تھا لہٰذا دونوں میں نبھ نہ سکی۔ اس بنا پر ابسال سلامان کا جزیرہ چھوڑ کر اس غیر آباد جزیرے میں آگیا جہاں حی مقیم تھا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حی کو زبان سکھائی اس لیے کہ وہ ہرنوں کے ساتھ رہتا تھا اور ہرنوں کی زبان سے واقف تھا۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا قصہ سنایا اور اپنی داستان زندگی بیان کی۔ اس کے بعد ابسال اور حی دونوں لوگوں کی ہدایت کے لیے باہر نکلتے ہیں اور جو حقائق کون و مکان انھوں نے سمجھے ہیں ان کو دوسروں کو سمجھاتے تھے۔ مگر یہ دیکھ کر لوگ ان کی باتیں نہیں سمجھ رہے ہیں اور ان کو ان کے مشن میں کامیابی حاصل نہیں ہو رہی ہے، مایوس ہو کر دونوں اپنے جزیرے کو واپس آجاتے ہیں۔

حی کا سفر ہندوستان کے ایک جزیرے سے شروع ہوتا ہے۔ ایک روایت کے لحاظ سے وہ خود پیدا ہوا مگر دوسری روایت کے لحاظ سے وہ دوسرے پڑوسی جزیرے سے یہاں آیا۔ اس طرح گویا انسان کا سفر شروع ہوتا ہے اور دراصل انسان کا سفر اس کی تاریخ علم و عرفان کا سفر بن جاتا ہے جہاں اس کا تعلق حقائق حصہ سے قائم ہوتا ہے اور فکر معروضیت اختیار کرتا ہے۔

اس جزیرے میں انسان خود پیدا ہوتا ہے۔ نہ اس میں کوئی دین ہوتا ہے اور نہ قبیلہ۔ اس آزاد ماحول میں حی نے زندگی گزارنی شروع کی اور اس نے علم سیکھنا اور امور و اشیا کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ یہاں ایک انسان تھا جو انسان کی اس زمین پر ابتدائی زندگی کے مسائل سے الجھا ہوا تھا۔

اس نے دیکھا کہ فطری زندگی میں اور اشیا میں سلبی انداز جاری ہے۔ کھانا انسانی زندگی اور عمل کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ فطری تغیرات اور فطرت میں عمل کی کیفیت جس کا تعلق فکر کی نمو سے ہے وہ امر واقع کی عالم کون و فساد میں موجود ہے وہ باہم بالکل مختلف انداز کے ہی نباتات، معدن، پتھر کے اقسام، مٹی، پانی اور برف وغیرہ۔ اس نے محسوس کیا کہ ان کے اوصاف اور افعال مختلف ہیں۔ ان کی حرکات میں اختلاف بھی ہے اور کہیں اتفاق بھی۔ اگر ان کا مطالعہ بہ امعان نظر کیا جائے تو ان کی صفات میں کہیں اتحاد اور کہیں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر بعض لحاظ سے ان میں اتحاد ہے تو بعض وجوہ سے ان میں غیر معمولی فرق بھی پائے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر طیب تبریزی لکھتے ہیں کہ "ابن طفیل نے نہایت گہرائی سے فلسفے کے ایک نہایت بنیادی قضیے کو پیش کیا ہے یعنی مادی عالم کی وحدت۔ اس نے حی کی عملی و فکری زندگی سے، کام کے آلات اور قدرت کی طاقتوں کے انکشاف سے، جاندارون اور فطری مظاہر کے ذریعے اس نے عالم مادی کی وحدت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اس نے حی کی شخصیت کے خلاقانہ انداز سے اس کی نظریاتی و فکری قوتوں کے ظہور سے اور عملی انداز و اطوار پیش کر کے بغیر کسی خارجی مدد کے اپنی فلسفیانہ کاوشوں کو استکمال کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔"

"حی کے نزدیک نباتات، حیوانات اور جمادات سب میں ایک اتحاد موجود ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ سب اجسام ہیں، ان کے اندر لمبائی، چوڑائی اور عمق موجود ہے۔ وہ گرم ہیں یا سرد ہیں۔ جمادات بھی ان اجسام کی طرح ہیں جو نہ تو احساس رکھتے ہیں اور نہ غذا کھاتے ہیں یہ صرف اس امر میں حیوانی اجسام سے الگ ہیں کہ ان سے افعال کا ظہور نہیں ہوتا۔ کوئی دوسرا فرق نہیں ہے۔" وہ افعال جو ان اجسام سے ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ ان کے ذاتی افعال نہیں ہیں بلکہ یہ نتیجہ ہیں دوسری چیزوں کا اگر یہ دوسری چیزیں جمادات کے اجسام میں پائی جائیں تو ان سے بھی اسی طرح کے افعال کا ظہور ہوتا۔

مادی عالم کی وحدت: ابن طفیل کا دور ایسا تھا کہ وہ علم طبیعات، کیمیا اور حیوانات کے ان انکشافات سے قطعاً بے بہرہ تھے جو صدیوں بعد ظہور پذیر ہوئیں اور جنھوں نے ثابت کر دیا کہ مادہ سب ایک ہے اور پورا مادی عالم ایک ہی اکائی کی ترجمانی کرتا ہے بس اس کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ ابن طفیل نے یہ کوشش کی کہ وہ اجسام جن میں زندگی ہے اور وہ اجسام جن میں حرکت و زندگی نہیں ہے فعلوں کے اندر مادی اتحاد کو ثابت کریں۔ ابن طفیل نے حی کی شخصیت کے ذریعے اپنے بنیادی نتیجہ فکر کو ظاہر کیا کہ اجسام خواہ زندہ ہوں یا جمادات کی شکل میں ہوں سب برابر ہیں اور اتحاد رکھتے ہیں ہر ایک کا وجود یکساں ہے اور مادی ہے۔

اتنے قدیم دور میں عالم مادی کے مظاہر میں تنوع کے باوجود یہ فلسفیانہ استنتاج جو موجودہ سائنس کے بالکل موافق ہے نہایت اہم ہے اس نے سارے مادی موجودات میں جسمانی وحدت کو ثابت کیا ہے یہ ایک ایسا بنیادی نکتہ ہے جس تک نہ فارابی پہنچ سکے اور نہ شیخ الرئیس ابن سینا۔ ابن طفیل نے ایسے عمدہ قصص و فلسفیانہ انداز سے اپنے ہیرو حی کو اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ وہ حسی مظاہر سے غیر حسی مظاہر کے

اور موجود وحدت کا مشاہدہ کر سکے تاکہ وہ محسوس اشیا کے اندر موجود وحدت سے گزر کر ان اشیا کے اندر وحدت کا جلوہ دکھا سکے اور اس کو سمجھ سکے جو وحدت تو رکھتی ہیں۔ اس کو سمجھا جاسکتا ہے مگر دیکھا نہیں جاسکتا۔ عقلِ عام کے ذریعہ۔ ڈاکٹر طیب تیزینی کا خیال ہے کہ علم کی تاریخیت کی تشکیل عالم کی مادی وحدت سے متعلق ہے۔ یہ ایک غیر معمولی مادی فکری انکشاف ہے انسانی افکار کی تاریخ میں جس کو ابنِ طفیل نے پیش کیا ہے۔

صورت اور ہیولیٰ کے بارے میں بھی حی بحث کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جسم دونوں سے بنا ہے وہ ایک دوسرے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ وہ دونوں ایک وحدت بناتے ہیں جو ٹوٹ نہیں سکتی۔ ہیولیٰ مثلاً اس زمین پر مٹی ہے لیکن شکل طول، عرض اور گہرائی کی حامل ہوگی۔ ہیولیٰ یعنی مٹی تو باقی رہے گی مگر اس کی شکلیں بدلتی رہیں گی۔ وہ بار بار بدلتی ہیں۔ ان کے نزدیک صورت کی حرکت ہے جو مادے اور زمانے سے اس طرح مرتبط ہے کہ وہ جدا نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ اس زمین پر ہے اپنی صورت پر باقی نہیں رہ سکے گا بلکہ اس کے اوپر دوسری شکل اور بگاڑ برابر آتا رہے گا۔ ہمیشہ تسلسل کے ساتھ۔

اس طرح صورت جو در حقیقت حرکت ہے مادہ کے اندر پوشیدہ زندگی کے اصول میں واضح ہے۔ اس بارے میں ابنِ سینا اور ابنِ طفیل متفق ہیں۔ جس سے اسلامی فکر کے درمیان ایک فکری استمرار کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔

عالم کی قدامت یا حدوث (پرانا یا نیا پن): ایک دوسرا مسئلہ ابنِ طفیل نے حی کی زبان سے پیش کیا ہے کہ عالم قدیم ہے اور ہمیشہ سے تھا یا وہ پہلے نہیں تھا پھر بعد میں وجود آیا ہے یعنی وہ حادث ہے۔ حی نے اپنے ذہنی سفر میں اس امر کو واضح کیا ہے۔ حی نے سوچا کہ یہ عالم مع جملہ موجودات کے حادث ہے پہلے نہیں تھا پر بعد میں عدم سے وجود میں آیا یا وہ پہلے سے موجود تھا اور اس پر عدم کبھی نہیں آیا؟ کسی شکل میں بھی۔ اس بارے میں وہ شک میں پڑ گیا ان دونوں خیالات کے بارے میں اس کے پاس برابر کے دلائل تھے کسی کو دوسرے پر ترجیح دینا آسان نہ تھا۔ اگر وہ یہ تصور کرتا کہ عالم قدیم ہے تو بہت سے مواقع تھے جن کو تسلیم کرنے میں قباحت تھی۔ یہ تصور کرتا کہ عالم حادث ہے تو اس بارے میں بھی بہت سے دلائل اس کے خلاف سامنے آئے۔

اس بنا پر وہ اس مسئلے سے اس طرح باہر نکلا کہ:

"اگر یہ مانا جائے کہ عالم حادث ہے تو اس کے لیے ایک محدث یعنی پیدا کرنے والے کی ضرورت ہے مگر اس پیدا کرنے والے نے اس عالم کو ابھی پیدا نہیں کیا ہے اور نہ اس سے پہلے؟ یہ عالم اچانک پیدا ہو گیا اور کوئی اور چیز وہاں نہ تھی یا پھر کوئی تغیر اس کی ذات کے اندر پیدا ہوا؟ اگر اس کی ذات میں تغیر پیدا نہ ہوئی تو پھر کس نے اس کو پیدا کیا؟" ان سوالات کا جواب ابنِ طفیل نے اس طرح دیا ہے کہ:

اگر عالم محسوس خدا کے عالم کے تابع ہے اور اس کے سائے کے اندر ہے اور عالم الٰہی، عالم مادی علم محسوس سے مستغنی اور الگ ہے تو ایسی صورت میں عالم محسوس کو عدم فرض نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ وہ عالم الٰہی کے تابع ہے۔ اس کا فساد صرف یہ ہے کہ وہ تبدیل ہوتا ہے مگر اس کو عدم تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں خود قرآن مجید نے بتایا ہے کہ پہاڑ روئی کے گالے بن کر اڑیں گے اور لوگ پتنگوں کی طرح بکھر جائیں گے۔ سورج اور چاند زمین کے قریب آجائیں گے الٹ پلٹ جائیں گے۔ سمندر بہہ نکلیں گے، زمین اور آسمان بدل جائیں گے۔

اگر کچھ نہ ہو تو اس سے کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک یونانی مقولہ ہے کہ لاشئی سے لاشئی پیدا نہیں ہوتی۔ اس مقولے پر کچھ اضافہ کیا ابنِ سینا نے پھر ابنِ طفیل نے، ان اجتماعی، فکری اور مذہبی تعقیدات کے سبب جن کو زمانے نے اور احوال نے پیدا کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ عالم تو باقی ہے اور باقی رہے گا مگر کبھی اس پر تعمیر ہوگی اور کبھی تخریب۔ یعنی تعمیری و تخریبی دونوں قوتیں کام کرتی رہیں گی۔

بہر حال اس بحث میں ابن طفیل اور ان سے قبل ابن سینا نے بالآخر یہ فیصلہ کیا یا اس طرف میلان ظاہر کیا کہ عالم قدیم ہے اس لیے کہ خدا قدیم ہے۔ اس عالم میں زمین و آسمان، ستارے و چاند و سورج اور جو بے شمار مخلوقات ہیں اس میں وہ بہ حیثیت ذات کے خدا کے بعد کی مخلوق ہیں۔ خواہ یہ تاخر زمانے میں نہ ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ آپ کسی جسم کو لیجیے اور اس کو حرکت دیجیے تو وہ جسم آپ کے جسم کی حرکت کے تابع ہو کر متحرک ہوگا۔ وہ حرکت کرنے میں آپ کے ہاتھ کی حرکت سے متاخر ہوگا یعنی ذات کی تاخیر ہے اگرچہ زمانے میں تاخیر نہیں ہے۔ دونوں نے حرکت کرنے کا عمل ایک ساتھ شروع کیا مگر حرکت دینے والے کو تقدم حاصل ہے جو چیز حرکت کر رہی ہے وہ موخر ہے مگر زمانہ دونوں کا ایک ہے اس لیے کہ جب حرکت شروع ہوئی تو وہ چیز ہاتھ کے اندر۔ اس طرح پورا عالم، معلول اور مخلوق اس فاعل کا ہے جہاں کوئی زمانہ نہ تھا۔ اس کا معاملہ صرف یہ ہے کہ کہا "ہو جا" بس ہو جاتا ہے "کن فیکون" پس ساری مخلوق خدا کے بعد کی ہے۔

ابن طفیل نے اپنے اس فلسفیانہ عمل میں در حقیقت اس امر کی کوشش کی ہے کہ جامع انسانی علم کی ترجمانی عقل و فکری انداز سے کی جائے۔ انھوں نے یہ کام اس معاشرے میں کیا جو عباسی دور کی اجتماعی زندگی پر حاوی تھا اور فکری زندگی کی لہریں بڑھ رہی تھیں جس میں معتزلہ کا ظہور ہوا پھر ابن رشد نے فلسفے کی جلوہ نمائی کی۔ اگرچہ ابن رشد نے رمز و تقیہ کا راستہ بھی اختیار کیا جس کے ذریعے ان دقیانوسی عناصر کا انھوں نے مقابلہ کیا جو اس دور کے معاشرے پر حاوی تھے۔ (بدور عبدالکریم، حی بن یقظان، ماہنامہ البیان، کویت مارچ ۱۹۸۶ء، ص ص ۱۱۲-۱۱۳)

دراصل مسلم فلاسفر کے سامنے ایک بڑی مشکل تھی۔ یونانی فلسفہ کے ذریعے جو فکر ان کو ملتا تھا اور اس بنیاد پر جو فکری نظام وہ قائم کرتے تھے اس کا تصادم خدا، آخرت، جنت، دوزخ، شیطان، ملائکہ اور تمام اسلامی عقائد سے ہوتا تھا۔ اس موقع پر وہ یہ کوشش کرتے تھے کہ خدا کا ذکر کر کے مادہ کی حاکمیت کم کر دیں تاکہ انکار ذات باری لازم نہ آئے اور ان کو زندیق و کافر قرار نہ دیا جائے۔ یہ جراثیم اکثر فلاسفہ کے یہاں ہیں۔ حی بن یقظان کے یہاں بھی یہی انداز ہے۔ مگر خدا کا ذکر کر کے اس کو قابل قبول بنایا گیا ہے۔ ابسال در حقیقت باطنی ذہن کی پیداوار ہے۔ اخوان الصفا کے رسائل بھی در حقیقت باطنی فلسفہ اور ذہن کے ترجمان ہیں۔

حی ابن یقظان پر مشہور مستشرق ر۔ ا۔ نکلسن نے اس طرح تبصرہ کیا ہے:

اس قصے میں مصنف ابن طفیل دو جزیرے کو اپنے تصور میں پیش کرتا ہے کہ ایک وہ جس میں آبادی تھی اور دوسرا وہ جو غیر آباد تھا۔ آبادی رکھنے والے جزیرے میں لوگ تقلید پرست تھے اور بہت مذہبی۔ وہاں دو افراد نے امتیاز حاصل کیا۔ ایک سلامان اور دوسرے ابسال۔ سلامان وہاں کا حاکم تھا اور ظاہری شریعت کے مطابق حکومت کرتا تھا مگر ابسال نے زندگی کی فکری حقیقتوں کو پالیا تھا اور وہ مزید علم حاصل کرنے کی فکر و دو میں رہتا تھا۔ اس نے دوسرے قریبی جزیرے کا سفر کیا جس میں کوئی انسان نہ تھا خالی تھا۔ وہاں اس نے ایک شخص حی بن یقظان کو پایا جو بچپن سے تنہا یہاں رہتا تھا اور فطری طور پر اس کے اندر قوائے عقلیہ نشو و نما پاتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ اعلیٰ فلسفیانہ نقطہ عروج تک پہنچ گیا اور اس نے مقدس خوابوں کو پالیا۔ وہ معرفت کے تمام مراحل سے گزر لیہاں تک کہ کائنات اس کے سامنے واضح ہو گئی۔ اب اس نے ایک مکمل فلسفہ حیات پالیا جو بغیر کسی نبی یا وحی کے اس کو حاصل ہوا تھا۔ ابسال نے پاکیزہ دین کی دولت پائی۔ وہ اپنے نئے دین کی تبلیغ کے لیے آبادی والے جزیرے میں پہنچا۔ وہاں اس نے تقلید کا اندھیرا پایا۔ اپنے دین کی بشارت دی۔ مگر وہاں اس کو احساس ہوا کہ عوام الناس کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہی مناسب ہے اور کوئی طریقہ ایسا نہیں جس سے لوگوں کو اس نئے دین سے آگاہ کیا جائے۔ لہٰذا اس نے اپنے دین کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے حسی رموز کا طریقہ اختیار کیا تاکہ وہ حقائق کا ادراک مادی محسوسات کے قالب

ِ آسانی سے کر سکیں۔ اس آبادی والے جزیرے میں ٹھہرنا اس کو عبث معلوم ہوا۔ لہٰذا وہ دوبارہ ویران جزیرے میں واپس چلا گیا تاکہ
ت کی زندگی میں اپنے شب و روز بسر کرے (نکلسن، ن۔ الف۔ تاریخ الادب العباسی۔ مکتبہ اہلیہ بغداد ۱۹۶۷ء ص ص ۵۳۔ ۲۵۲۔ عربی
مہ از ڈاکٹر صفا خلوصی)

اب میں فلسفہ کے مشہور عالم اور عین شمس یونیورسٹی قاہرہ کے مشہور مفکر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بدوی کا عالمانہ تبصرہ ابن طفیل کے
الے حی بن یقظان پر پیش کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"جب حی بن یقظان کی ماں مر گئی تو اس نے اس کے تمام اعضا کا جائزہ لیا۔ اس نے قلب کو دیکھا تو محسوس کیا کہ قلب اور دیگر اعضا
نے نہیں ہیں بلکہ سب موجود ہیں۔ مگر جو چیز ان سے نکل گئی ہے وہ قابل قدر ہے اور اصل ہے۔ جو چیزیں باقی رہ گئی ہیں وہ بہت نکمی ہیں
۔ ناقابل التفات ہیں۔ غور کرنے پر اس کو معلوم ہوا کہ جس چیز نے اس کو پالا اور جو اس کی ماں تھی وہ جا چکی جس سے یہ تمام افعال دودھ
نے اور پالنے کے صادر ہوئے تھے وہ ختم ہو چکے۔ پر اس نے دیکھا کہ وہ جسم بھی سڑ گیا۔ بدبو آنے لگی اور گدھ اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کو
انے کے لیے ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ حتیٰ کہ ایک کوے نے دوسرے کوے کو مار ڈالا پھر اس نے مردہ کوے کے جسم کو مٹی میں دبا
۔ یہ دیکھ کر حی بن یقظان نے اپنی ماں ہرن کے جسم کو زمین میں گڑھا کھود کر اس میں رکھ دیا اور اوپر سے مٹی ڈال دی۔

وہ تعجب سے موت کے واقع ہونے کا اور مختلف تغیرات کا مطالعہ کرتا رہا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ دو پیڑوں کی رگڑ سے آگ پیدا
گئی۔ اس نے اس کو تعجب سے چھو لیا اور اس کا ہاتھ جل گیا۔ اب اس نے اک طرف کونے سے لکڑی پکڑی اور دوسرے حصے میں آگے جلتی
ی۔ وہ آگ سے دل بہلاتا رہا اور یہ تصور کرنے لگا کہ شاید آگ سب سے افضل شئے ہے۔ اس نے سوچا جو چیز اس کی ماں کے دل سے نکل گئی
ہ وہ آگ ہے۔ اس لیے کہ اس نے محسوس کیا کہ زندہ چیز گرم رہتی ہے اور مردہ چیز ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ اس نے بعض حیوانات کے دل
رے اور ان میں ہاتھ ڈالا تو ان کو گرم پایا۔ اس میں اس کو کچھ بخار کی سی کیفیت نظر آئی۔ اس نے تصور کیا کہ بخار شاید باعث زندگی ہے جب
بخار یا گرمی ختم ہو جاتی ہے تو انسان اور حیوان مر جاتے ہیں۔ اس نے جسم کے ایک ایک عضو کا تشریحی مطالعہ کیا اور اس نے سمجھ لیا کہ اصل
ز روح ہے سارے اعضا خادم ہیں اور روح مخدوم ہے۔ سارے اعضا روح کے حکم سے کام کرتے ہیں۔ حی بن یقظان ۲۵ برس اس جزیرے
ں قیام پذیر رہا۔ اس نے حیوانوں کی کھالیں پہنیں اور ان کے جوتے بنائے۔

پھر اس نے تفکر سے یہ سمجھا کہ جسم کے علاوہ صورت اور صورت کے علاوہ عقل تمام اجسام سے الگ شئے ہے۔ اس نے معلوم کر لیا کہ
ی ہی نفس حیوان ہے۔ نباتات میں نفس نباتاتی ہے اور جمادات میں مادہ اور صورت ہے پھر اس نے تفکر کے ذریعے معلوم کر لیا یہ سب کے
ب محدث ہیں (بعد یہ ہیں قدیم سے موجود نہ تھے) اور محدث کے لیے ضروری ہے کہ اس کا فاعل ہو۔ جب فاعل کا معاملہ اس کے سامنے واضح
و گیا تو اس نے محسوس کر لیا کہ ہر جاندار کا کوئی فاعل ہے۔ اب اس نے آسمان اور اجسام کو اک پر غور کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ سارے
یارے باہم ایک نظام میں مرتبط ہیں۔ گویا ساری کائنات ایک شخص کی طرح ہے اس نے سوچا کہ ہر حرکت کے لیے محرک ضروری ہے اور ہر
رک کے لیے لامتناہی ہونا لازم ہے۔ اس لیے کہ اس کا مادہ سے بری ہونا ضروری ہے اس بنا پر کہ اگر یہ فاعل حواس سے نہیں پایا جا سکتا۔
سی لیے جو چیز حواس سے پائی جائے گی وہ مادی ہوتی ہے اور فاعل کے لیے مادے سے بری ہونا لازمی ہے۔ قدم عالم اور حدوث عالم دونوں
شکلوں میں نتیجہ ایک رہا کہ ایک فاعل ہے جو جسم سے متصل نہیں ہے یعنی مادہ نہیں ہے مگر جسم سے جدا بھی نہیں ہے۔ اس میں داخل ہے نہ
س سے خارج ہے۔ اس نے یہ علم ۳۵ برس کی عمر میں حاصل کر لیا۔ اس طرح ہر مصنوع کو دیکھ کر اس کی عقل صانع کی طرف جانے لگی۔ حتیٰ

کہ اس نے ساری مصنوعات سے قطع نظر کر لیا اور سارے علائق ختم کر کے اس نے اپنے دل میں اور اپنے فکر میں صرف ایک ذات کا جلوہ دیکھا۔ اب حی ابن یقظان کی عمر ۵۰ برس کی ہو چکی تھی اور اب ان تمام مراحل کو طے کر کے ابن طفیل کا ہیرو مادی عالم کی طرف لوٹتا ہے۔ اور جہاں اس کا ساتھ ایک شخص مسمی ابسال کا ہوتا ہے۔

اس جزیرے سے قریب جہاں حی بن یقظان پیدا ہوا تھا ایک دوسرا جزیرہ تھا جہاں انبیا علیہم السلام کی تعلیمات و شرائع موجود تھیں۔ اس جزیرے میں کچھ اہل فضل و خیر نوجوان موجود تھے ان میں سے ایک کا نام ابسال تھا اور دوسرے کا نام سلامان۔ ابسال کی نظر میں تعمق تھا وہ باطنی امور پر غور و فکر کرتا تھا اور روحانی اشیا اس کے لیے محل فکر تھیں۔ اس کے برعکس سلامان ظاہری اشیا پر نظر رکھتا تھا اور تاویل و تفکر سے گریزاں تھا۔ ابسال نے گوشہ نشینی اختیار کی اور سلامان عوام کے ساتھ مخالطت رکھتا تھا۔ اس معاشرے میں دونوں کو رہنے کی اجازت تھی۔ حی نے جب ابسال کو دیکھا تو سمجھ گیا کہ وہ کوئی خدا رسیدہ بندہ ہے۔ مگر ابسال حی کو دیکھ کر بھاگا اور ڈر گیا۔ حی کی طبیعت میں تجسس تھا لہذا اس نے ابسال کا تعاقب کیا۔ اب ابسال نے نماز پڑھنی شروع کی جب حی قریب آیا تو اس نے قرأت و تسبیح سنی اس کو قرآن کی آواز دل کش معلوم ہوئی مگر ابسال نے حی کی قربت محسوس کر کے فرار اختیار کیا۔ حی بھی دوڑا اور اس کو پالیا۔ اس موقع پر حی نے اپنی خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ ابسال کو کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی بلکہ اس نے مہارت حاصل کر لی تھی۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔ ابسال نے پہلے حی کو زبان سکھائی۔ اس کے بعد حی نے ابسال کے سامنے ان تمام مدارج علم کی تشریح کی جن تک وہ غور و فکر کے ذریعے اب تک پہنچ چکا تھا۔ ابسال نے یقین کر لیا کہ حی نے جو مشاہدہ کیا وہ شریعت الٰہی ہے۔ اس نے حی کو اولیاء اللہ میں شمار کیا اور اس کی صحبت میں رہنے لگا۔ ابسال نے انبیاء علیہم السلام کی شرائع، اسلامی عقائد اور جنت و دوزخ کا ذکر حی بن یقظان سے کیا۔ حی نے ان عقائد کو سن کر ان کی تصدیق کی۔ پر حی نے صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ اور حج جیسے ظاہری فرائض کے بارے میں دریافت کیا اور اس نے ان فرائض کو سیکھ لیا اور ان پر عمل کرنے لگا۔ مگر اس کے دل میں دو معاملے ایسے تھے جن کو وہ حل نہ کر سکا۔

(۱) بعض احادیث میں کیوں ایسی مثالیں پیش کی گئیں کہ بعض لوگ تجسیم میں پڑ گئے۔

(۲) کیوں ان فرائض پر اکتفا کیا گیا حتی کہ لوگ کھانے پینے میں پڑ گئے اور باطل میں مبتلا ہو گئے اور حق سے دور ہو گئے۔

حی بن یقظان کی رائے یہ تھی کہ صرف اتنا کمانا چاہیے جس سے کمانے والا زندہ رہ سکے بس۔ مال رکھنا اور جمع کرنا اس کے نزدیک فعل عبث تھا۔ اس بنا پر سود، زکوٰۃ، صدقات اس کے نزدیک بے معنی تھے۔

اس نے لوگوں پر مہربانی کے خیال سے یہ سوچا کہ وہ جا کر اس جزیرے میں رہے جہاں پہلے ابسال تھا اور جہاں انسان رہتے تھے۔ پھر دونوں یعنی حی اور ابسال اس جزیرے میں پہنچے جہاں سلامان کی حکومت تھی۔ ابسال نے لوگوں کو اپنے نئے خیال سے آگاہ کیا مگر لوگ اس تعلیم سے خوش نہ ہوئے اور ان کے اندر شوق کا جذبہ پیدا نہ ہوا۔ حی بھی ان لوگوں سے مایوس ہو گیا اور عام لوگوں کو وہ مثل حیوان تصور کرنے لگا جن کے اندر تفکر کا مادہ بالکل نہ تھا۔ لہذا حی سلامان کے پاس گیا اور اس نے ظاہری شریعت پر عمل اختیار کر لیا اور سلامان سے اجازت لے کر وہ اور ابسال دونوں حی کے خالی اور ویران جزیرے میں آ گئے اور وہاں رہنے لگے۔ بالآخر دونوں نے اس جزیرے میں وفات پائی۔

بنیادی مقصد اس قصے کا یہ ہے کہ دین اور فلسفے میں توافق پیدا کیا جائے۔ حی بن یقظان آزاد خیال اور سائنسی ذہن رکھتا تھا۔ ابسال مذہبی انسان ہے وہ معانی میں تعمق اختیار کرتا ہے۔ مگر سلامان ایک ایسا شخص ہے جو ظاہر پرست ہے اور تاویل سے اجتناب کرتا ہے۔ اس طرح ابن طفیل چار طبقات انسانوں کے پیش کرتا ہے (۱) فلسفہ داں (۲) صاحب بصیرت عالم (۳) ظاہر پرست صوفی و فقیہہ (۴) ظاہر پرست

(باقی ص ۳۸ پر)

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی

خطوط بنام ڈاکٹر رضی الدین صدیقی

[یہ انگریزی خطوط جن کا ترجمہ میں اردو میں پیش کر رہا ہوں اب سے کوئی ستر سال قبل والد صاحب مرحوم نے اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کو ان کے قیام یورپ کے زمانے میں حیدرآباد اور اس کے بعد مدراس سے لکھے تھے۔ عم محترم ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ۱۹۲۶ء کے اوائل میں اعلیٰ تعلیم کے لیے سرکاری وظیفے پر لندن کو روانہ ہوئے تھے (اس وقت میری عمر مشکل سے ڈھائی تین سال کی ہوگی) لگ بھگ چھے سال بعد برطانیہ اور جرمنی کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم مکمل کر کے ڈاکٹر صاحب جولائی ۱۹۳۱ء میں بہ راہ مدراس اپنے وطن حیدرآباد لوٹے تھے۔ مدراس میں ان کا استقبال کرنے والے احباب اور اعزہ میں میں بھی موجود تھا۔

میرا خیال ہے کہ ۱۹۲۶ء سے لے کر جولائی ۱۹۳۱ء تک ڈاکٹر صاحب کے قیام یورپ کے زمانے میں والد صاحب مرحوم نے اپنے برادر خورد کو اردو اور انگریزی میں متعدد خطوط لکھے ہوں گے لیکن ڈاکٹر صاحب کے محفوظ کیے ہوئے مسودات اور خطوط کے انبار میں سے صرف ۷ انگریزی خطوط مجھے دست یاب ہو سکے ہیں۔

ترجمہ کرتے وقت میں نے نجی نوعیت کی باتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔۔۔ صفی الدین صدیقی]

(۱)

حیدرآباد دکن

۱۸/ اگست ۱۹۲۸ء

پیارے بھائی! تمہارا ۲۶/ جولائی کا لکھا ہوا خط ملا۔ ایک بار پھر میرے تعلق سے اپنے بہترین جذبات کا اظہار کر کے تم نے مجھے اکسایا ہے۔ یقین جانو میں تم کو اپنا چھوٹا بھائی ہی نہیں بلکہ اپنا بہی خواہ اور گہرا دوست سمجھتا ہوں جس پر میں ہر وقت بھروسا کر سکتا ہوں۔

اس میں شک نہیں، کہ اپنی ذہنی تھکاوٹ کی طرف اشارہ کر کے تم نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی ہے اس کے باوجود مجھے تمہارے بارے میں تشویش ہے۔ تمہارے تفصیلی خط کا منتظر ہوں تاکہ تمہاری مختلف دشواریوں سے میں واقف ہو سکوں۔

مسز سروجنی نائیڈو ۳/ اگست کی صبح کو حیدرآباد میں وارد ہوئیں۔ اپنی یورپ سے واپسی کے بعد ایک تا دو ہفتے شمالی ہند میں گزارنے کے بعد وہ حیدرآباد پہنچی ہیں۔ حیدرآباد لٹریری ایسوسی ایشن کے نوجوان ممبروں نے مسز نائیڈو کے دولت کدے، گولڈن تھریشہولڈ پر ان کا شان دار سواگت کیا۔ انھوں نے مسز نائیڈو کی خدمت میں ایک اڈریس بھی پیش کیا جس کا متن یہ ہے۔

"میڈم! حیدرآباد لٹریری ایسوسی ایشن کے ہم سب اراکین اس قدیم تاریخی شہر میں آپ کی آمد پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہم نے آپ کے حالیہ دورۂ امریکہ کے سلسلے میں نہ صرف غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کیا ہے بلکہ آپ کے ہم وطنوں کو اس بات پر فخر ہے کہ اس ملک (امریکہ) کے دانش وروں نے آپ کو انگریزی شاعری کی ملکہ کے خطاب سے نوازا ہے۔

ہم میں سے وہ لوگ جو ہندو مسلم اتحاد پر ایقان رکھتے ہیں، ہمارے لیے آپ کی ہستی ہمیشہ ہی سے مثالی رہی ہے جس سے ہم متاثر رہے ہیں۔ ہندوستان کے بارے میں آپ کی یہ پیغمبرانہ پیش قیاسی ہے کہ جذبۂ حب وطن محض فرقہ وارانہ نہیں رہے گا بلکہ بین الاقوامیت کے اعلیٰ

مرتبہ تک پہنچے گا۔

"میڈم! آج کی دنیا بڑی بے چینی کے ساتھ ایک اچھے عہد کی جگمگاتی صبح کے انتظار میں ہے جس میں مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا ملاپ ہوگا اور آپ چوں کہ مشرق کی بیٹی ہیں اور مغرب کی بہترین روایات نے آپ کو پروان چڑھایا ہے آپ کے نزدیک یہ زندگی اور یہ دنیا ایک ایسی جوئے رواں ہے جو ملک و ماحول کو خاطر میں نہیں لاتی بلکہ ہمیشہ آگے کی سمت میں رواں دواں رہتی ہے تاکہ اس کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل ہوسکے۔ وہ آپ ہی کی آواز ہے جس نے مادرِ ہند کے پیغام کو دنیا کے چاروں کونوں میں پہنچایا ہے۔ وہ آپ ہی کا قلم ہے جس نے چمک کی روح میں چھپے ہوئے حسن، قوس قزح کے جادو اور شبنمی صبح کی بے پناہ کشش کو اپنے جگمگاتے الفاظ میں سمیٹا ہے۔"

"میڈم! ہم آپ کا سواگت ایک بہن کے روپ میں کرتے ہیں، ایک استاد کی حیثیت میں آپ کا احترام کرتے ہیں اور ایک ماں سمجھ کر آپ کے حضور عقیدت سے اپنا سر جھکاتے ہیں۔"

اس کے بعد موصوفہ کی گل پوشی کی گئی۔ مسز سروجنی نائیڈو نے اپنی جوابی تقریر میں حیدرآباد کے نوجوانوں کا، سپاس نامے کے لیے شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ نوجوانی کی منزل اصل میں تیاری کی ایک منزل ہے۔ بجائے اس کے کہ مشرق کے کلچر سے مغربی کلچر کے ملاپ پر زور دیا جائے یہ زیادہ ضروری ہے کہ نوجوانی کی قوت کو اپنے عہد کے تجربوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ حیدرآباد سے باہر ہندو مسلم اتحاد ایک متھ (Myth) ہے اور اب حیدرآبادی نوجوانوں کا اولین فریضہ ہونا چاہیے کہ وہ اس اتحاد کو حقیقت میں تبدیل کریں۔

چار پانچ روز قبل میں نے مسز محی الدین قادری زور کو تانگے میں میرے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ وہ میری طرف گھور رہے تھے چوں کہ وہ انگلستان سے لوٹے ہیں اور سر سے پیر تک انگریزی لباس میں تھے اسی باعث مجھے پہچاننے میں شاید انھیں تکلف ہورہا تھا۔ ایسا سننے میں آیا ہے کہ وہ اپنے کورس کی تکمیل کے بعد لوٹے ہیں اور یورپین گریڈ کی کوئی اچھی سی ملازمت کے لیے کوشاں ہیں۔ اگر انھیں اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تو وہ مزید تعلیم کے لیے انگلستان لوٹ جائیں گے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ چھٹیاں گزارنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔

امید ہے کہ تم بہ خیر و عافیت ہوگے

میں ہوں تمھارا عزیز بھائی

زکی الدین صدیقی

(۳)

حیدرآباد (دکن)

۱۴/ ستمبر ۱۹۲۹ء

برادر عزیز! برلن سے تمھارا، ۲۵ جولائی کا لکھا ہوا خط اسی ہفتے موصول ہوا یہ معلوم کرکے کہ اب تم بہتر ہو اور مکمل آرام لے رہے؛ تمھارے بارے میں میری تشویش بڑی حد تک دور ہوئی۔

میں سمجھتا ہوں اس وقت تک تم لندن اور مارسیلز اسے لوٹ چکے ہوگے اور لندن میں انتظار سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ یقیناً انتظار۔ تم کو وہ خط دیا ہوگا جو میں نے ان کے ذریعے بھیجا تھا۔ انتظار کے انگلستان کے لیے روانہ ہونے کی اطلاع مجھے دو یا تین دن پہلے ملی تھی اس لیے تو میں ان کی اچھی طرح خاطر کرسکا اور نہ میں تمھارے لیے کوئی چیز بھیج سکا۔ اس کے باوجود جب وہ اپنا بینک ڈرافٹ حاصل کرنے آفس آتے تھے

ں نے چائے اور پیسٹری سے ان کی تواضع کی تھی۔ انھیں الوداع کہنے کے لیے میں اسٹیشن بھی گیا تھا جہاں احباب کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ ان کی
سی کا منظر دیکھنے کے لائق تھا۔ ہم سب کو بے حد خوشی ہے کہ انھیں اپنی زندگی کا اتنا اچھا موقع ملا ہے۔

معلوم ہوتا ہے مسٹر قادری زور یہاں شعبہ اردو کی صدارت کے لیے کوشش کرنے آئے تھے لیکن بدقسمتی سے انھیں یہ موقع نہ مل
ا۔ مولوی عبدالحق پر انھیں ترجیح نہیں دی گئی۔ اب وہ مزید تعلیم حاصل کرنے انگلستان واپس جانا چاہتے ہیں (۱)۔ اس تقرر کے سلسلے میں
ان کافی نزاعی بحث چل رہی ہے۔ مقامی اخباروں میں صرف "رہبر" زور صاحب کی حمایت میں ہے جب کہ دوسرے تمام اخبار مولوی
احب کی حمایت کر رہے ہیں۔

مسٹر ضیاء الدین انصاری پچھلے ہفتے لوٹے ہیں اور میں نے سنا ہے کہ ماہانہ چار سو روپیہ کے مشاہرے پر انجینیرنگ کالج میں ان کا تقرر
ا ہے۔

بی اماں اچھی ہیں اور تم کو اکثر یاد کرتی ہیں اور ان کی عین تمنا ہے کہ تم جلد اپنے وطن لوٹ آؤ اور ایک کامیاب اور خوش حال زندگی
ارو۔

انتظار اور مقبول (۲) تک میرا اسلام پہنچا دو۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

تمھارا بھائی

انگلستان کے لیے روانہ ہونے سے چند ماہ قبل ڈاکٹر صاحب کا حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے کی خاتون سے نکاح ہوا تھا مگر دسمبر ۱۹۲۹ء میں ان
خاتون کا اچانک انتقال ہو گیا۔ انتظار الدین مرحومہ کے حقیقی بھائی تھے اور انجینیرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن گئے تھے۔
۱ حیدرآباد کے مشہور سول سرجن ڈاکٹر مقبول علی

(۳)

یدرآباد (دکن)
۱۲/اپریل ۱۹۳۰ء

عزیزم رضی! تمھارا ۱۳/اپریل کا لکھا ہوا خط ملا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے تم کو ریلوے ہڑتال کے بارے میں بالتفصیل لکھ دیا تھا۔
ام ریلوے مزدور اب کام پر رجوع ہو چکے ہیں اور پرامن ہیں۔ سبھوں کو اس امر کی خوشی ہے کہ ریلوے اب ہماری ریاست کی ملکیت ہے
رہماری حکومت کے مینیجر کی نگرانی میں آگئی ہے۔

جہاں تک ریلوے کی خریدی کا تعلق ہے میں نے تم کو مختصراً لکھ دیا تھا۔ یکم اپریل کو کاچی گوڑہ اسٹیشن پر جشن مسرت کا احوال بھی
ں نے تم کو لکھ دیا تھا۔ اس خط کے ساتھ غیر معمولی گزٹ کی ایک کاپی بھی روانہ کر رہا ہوں جس میں ڈیڈ کی تفصیل درج ہے۔ اس سے تم کو
یڈ کے بارے میں صحیح اندازہ ہوگا اور ساتھ ہی مینیجمنٹ کے بارے میں بھی تم بہت کچھ جان پاؤ گے۔

بہت پیار کے ساتھ

تمھارا بھائی

(۴)

حیدرآباد (دکن)
یکم مئی ۱۹۳۰ء

برادر عزیز! تمہارا ۱۹/ اپریل کا لکھا ہوا خط ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم تن درست ہو۔ قبل ازیں میں نے تم کو لکھا تھا کہ والد صاحب ایک اچھے اور ماہر ڈاکٹر کے زیر علاج ہیں۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ انھیں آنکھ کے Simns کی شکایت ہے۔ ڈاکٹر نے زنک لوشن کے استعمال کی ہدایت دی ہے جس پر عمل کیا جا رہا ہے۔

فرانس کے عظیم فلسفی پروفیسر برگساں کی تصویر بھیجنے کا شکریہ۔ تمہاری یہ رائے کس قدر درست ہے کہ پروفیسر موصوف اپنے چہرے کے نقوش سے دانش ور دکھائی دیتے ہیں اور ان کی آنکھیں دلوں میں پیوست ہو جانے والی ہیں۔

برطانوی ہند میں مجھے مزید ٹریننگ کے لیے بھیجنے کا مسئلہ بالکل طے ہو چکا ہے۔ محکمہ فینانس نے مدراس کے اے جی آفس میں کام کرنے کی منظوری دی ہے اور اگلے نومبر تک مجھے وہاں پہنچنا ہے۔ مدراس کے قیام کے دوران میں میری موجودہ تنخواہ بی جی کرنسی میں ادا کی جائے گی۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس یہاں عیدالضحیٰ کے دنوں میں یعنی ۱۲/ اور ۱۳/ مئی کو منعقد ہوگی جس کی صدارت عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے پرنسپل عبدالرحمن خاں کریں گے۔ پہلے تو انھوں نے مسز سروجنی نائیڈو سے صدارت کی درخواست کی تھی مگر مسز نائیڈو نے اسے قبول نہیں کیا کیوں کہ وہ نمک کے قانون کے خلاف سیول نافرمانی مہم میں مشغول ہیں اور فی الحال بمبئی میں مقیم ہیں۔

نیک تمناؤں کے ساتھ
تم سے پیار کرنے والا بھائی

(۵)

حیدرآباد (دکن)
۱۵/ ۱۹۳۰ء

میرے عزیز تر جن بھائی! تمہارا ۲۴/ اپریل کا لکھا ہوا خط ملا۔ میرا خیال ہے کہ اب تک تم جرمنی کو لوٹ چکے ہو گے اس طرح کی تبدیلی کے باعث تمھیں کچھ روز کے لیے آرام ملا ہوگا اور تم اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کر رہے ہو گے۔

آیا ریلوے کا یہ کاروبار ملک کے حق میں مفید ہے یا غیر مفید اس بارے میں اختلاف رائے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ فینانس ڈپارٹمنٹ کی رپورٹ دیکھنے کے بعد تم کو صورتِ حال کا صحیح اندازہ ہو گیا ہوگا۔ کچھ برادرانِ وطن مخالف پروپگنڈہ، بڑے شد و مد کے ساتھ کر رہے ہیں اور خاص طور پر ایک مخصوص فرقے سے تعلق رکھنے والے ریاست کے افسران حکمرانِ وقت کے خلاف ہیں۔ چناں چہ شمال کے اثرات میں آکر کچھ لوگ فرقہ وارانہ ذہنیت کو ہوا دینا چاہتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر حکومت کے کچھ ذمہ دار افسران کو وہ دھمکی آمیز خطوط لکھ کر یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ان کا تعلق ریاست روس کی پارٹی سے ہے اور یہ کہ حال ہی میں جس اخبار پر پابندی لگائی گئی ہے وہ انھیں کا آرگن ہے۔

اس خط کے ساتھ خطبہ۔ صدارت کا انگریزی ترجمہ روانہ کر رہا ہوں جو عبدالرحمن خاں صاحب نے ۱۲/ مئی کو حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے دسویں اجلاس میں پڑھا تھا۔ یہاں میں مختصراً انھیں نکات پر روشنی ڈالوں گا جن پر تنقید کی گئی ہے۔

"خطبہ ، صدارت میں دو طرح کی فروگزاشتوں سے واسطہ پڑتا ہے اور ہم نہیں مانتے کہ فاضل صدر ان سے بالکلیہ طور پر لاعلم ہیں۔ ول تو یہ کہ وہ مسائل سے سرسری طور پر گزر گئے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ غیر ضروری طور پر پر امید نظر آتے ہیں۔ دوسرا اہم تنقیدی لۂ یہ ہے کہ اپنے جائزے میں انھوں نے ایسے موضوعات کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا ہے جن سے آج کی تعلیمی دنیا دوچار ہے۔ انھوں نے یہ ہیں بتلایا کہ حیدرآباد میں تعلیمی ترقی کی رفتار اس قدر سست کیوں ہے؟ خواتین تعلیمی اداروں سے آخر کیوں کتراتی ہیں۔ پبلک خواہ ہندو ہو مسلمان تعلیمی حالت سے غیر مطمئن کیوں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ فاضل مقرر نے بعض مابہ النزاع مسائل کا ایمان دارانہ جائزہ لیا ہے یکن محض اس بنا پر ہم انھیں مبارک باد کا مستحق نہیں سمجھتے۔ کیا ہمارے دار الترجمے کی کارکردگی اطمینان بخش ہے؟ کیا وظائف اور دوسری علیمی سہولتوں سے صحیح معنیٰ میں مستحق افراد فائدہ اٹھا رہے ہیں جو کہ حکومت کا عین منشا ہے۔ کیا اردو زبان کو عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعہ علیم قرار دینے کے سلسلے میں ہمارے عوام کے ایک خاص طبقے کا نقطہ نظر صحیح ہے، یوں بھی صدارتی خطبے میں اس طرف واضح اشارہ ملتا ہے یکن ان لوگوں کے لیے جو تحصیلِ علم میں معروف ہیں اس میں کوئی عملی فائدہ نظر نہیں آتا۔

خاں صاحب نے اپنی اختتامیہ تقریر میں ان تمام اعتراضات کا شافی جواب دینے کی کوشش کی اور کہا کہ انھیں بہ آسانی رد کیا جاسکتا ہے۔ یہ بتلانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ کس طرح عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے وجود کو منوالیا ہے اور یہ کہ پنڈت نہرو اور سرتیج بہادر سپرو جیسے محبانِ وطن کے تعریفی مراسلے انھیں (خاں صاحب کو) موصول ہوئے ہیں۔ اب رہا دار الترجمے کی کارکردگی کا معاملہ سو ان کی رائے میں ی اطمینان بخش ہے جس کا اندازہ اس کے کام سے بہ خوبی ہو سکتا ہے۔ جہاں تک مستحق طلبہ کو وظائف دیے جانے کا سوال ہے اس میں شک نہیں کہ بورڈ کے اراکین نے بعض اوقات بڑے افسروں کی خدمات کو سامنے رکھ کر ان کے فرزندوں کو وظائف سے نوازا ہے۔"

نیک تمناؤں کے ساتھ

تمھارا بھائی

(۶)

نس بلڈنگ، ہالی کرافٹ روڈ

رولاپیٹ، مدراس

۱۵/ جنوری ۱۹۳۱ء

میرے بہت پیارے بھائی! تمھارا ۲۳/ ڈسمبر ۱۹۳۰ء کا خط راست میرے مدراس کے پتے پر ملا۔ اس بلڈنگ میں جہاں میں رہتا ہوں مجھے ایک بہت ہی آرام دہ کمرہ مل گیا ہے۔ مینیجر جسے تم بلڈنگ کا مالک بھی کہہ سکتے ہو ایک بہت ہی نیک اور شریف انسان ہیں اور ایک اچھے خاندان کے فرد ہیں۔ ان کا سلوک اپنے سبھی کرایہ داروں سے شریفانہ ہے بالخصوص حیدرآبادیوں کے ساتھ کیوں کہ ان کے بعض رشتہ دار حیدرآباد میں سرکاری ملازم ہیں۔ لہذا میں نے طے کیا ہے کہ جب تک میں یہاں رہوں اسی بلڈنگ میں ٹھیروں گا۔

ابھی ابھی میں ایک مختصر ٹرپ (Trip) سے لوٹا ہوں۔ اس بلڈنگ کے مینیجر اور دوسرے بعض اصحاب سے مل کر جنوبی مدراس کے ساحل پر کوئی پچیس میل کے فاصلہ پر واقع ایک گاؤں کو دیکھنے گئے تھے۔ سفر کافی پر لطف تھا۔ یہاں پونگل (جسے ہم تل سنکرات کہتے ہیں) کے تہوار پر دو دن کی چھٹیاں تھیں۔ تمام سفر ہم نے کشتی میں ایک کنال کے ذریعے کیا جو حال ہی میں ساحلِ سمندر کے متوازی بنائی گئی ہے۔ اس گاؤں میں ایک مزار ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ ایک صحابی تمیم انصاری کا مزار ہے۔

جب میں یہاں آیا تھا تو ابراہیم* نے ضروری چیزوں کی خریدی کے سلسلے میں بہت مدد کی تھی۔ آج کل وہ امتحان کی تیاری میں بے حد مصروف ہیں۔ بہ ہر حال انھوں نے میری خاطر جو بھی تکلیف اٹھائی اس کے لیے میں ان کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔

مسرز مقبول، انصار اور قادری زور تک میری طرف سے نئے سال کی مبارک بادہنچا دو۔

تم سے پیار کرنے والا بھائی

* جناب محمد ابراہیم ڈاکٹر اور والد مرحوم کے دوست جو ناظم تعمیرات کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ موصوف نے اردو میں کنٹراکٹ برج نامی ایک کتاب لکھی تھی۔

(۷)

مدراس

یکم اپریل ۱۹۳۱ء

بہت ہی پیارے رضی! تمھارا ۱۰/ مارچ کا بروسیلز سے بھیجا ہوا خط ملا۔ جیسا کہ میں نے اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا جمعہ ۲۷/ مارچ کو میں نے وہ کیس (صندوق) حاصل کر لیا۔ حالاں کہ میں نے اس صندوق کی ڈیلوری کے لیے ایک ایجنٹ کو مقرر کیا تھا اس کے باوجود مجھے کسٹم ہاؤز جانا پڑا کیوں کہ کسٹم افسران اس صندوق میں رکھی ہوئی تمام چیزوں کو دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اوپر کا ڈھکنا توڑ کر ایک ایک چیز کو بہ غور دیکھا۔ ایک افسر نے تو Broken Earth نامی کتاب کے کئی اوراق الٹ پلٹ کر دیکھے۔ جب اسے کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہیں آئی تو اس نے وہ کتاب واپس کر دی لیکن اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہے۔ ایک اور افسر نے تو حد کر دی۔ وہ تمام خطوط اور مراسلات دیکھنا چاہتا تھا اس لیے کہ صندوق جرمنی سے بھیجا گیا ہے لیکن جب میں اس پر معترض ہوا اور سخت احتجاج کرنے لگا تو وہ اپنے ارادے سے باز آیا۔ قاعدے کی رو سے مراسلات اور کتابوں پر کوئی ڈیوٹی نہیں لگائی جاتی اس کے باوجود کہ تمام کپڑے استعمال شدہ ہیں چار و ناچار مجھے ڈیوٹی کی رقم ادا کرنی پڑی۔ بہ ہر کیف میں وہ صندوق گھر لے آیا۔ اس میں کی تمام چیزیں جوں کی توں محفوظ ہیں البتہ وہ کیس جو ڈیل لکڑی کا بنا ہوا ہے اوپر کا ڈھکنا توڑ کر کھولنے کے باعث بالکل شکستہ ہو گیا تھا لہٰذا میں نے یہ تمام چیزیں حفاظت کے خیال سے ایک مضبوط ٹرنک میں منتقل کر لی ہیں۔ برادر عزیز! یقین جانو تمام کاغذات اور چیزیں بڑی احتیاط کے ساتھ اسی طرح ٹرنک میں منتقل کی گئی ہیں جیسی کہ وہ ڈیل لکڑی کے بکس میں رکھی ہوئی تھیں۔

والد صاحب قبلہ* کے سلسلے میں تمھاری رائے سے میں بھی متفق ہوں کہ اب عمر کی اس منزل میں انھیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اگلے دو سال کے اندر والد صاحب اپنی ملازمت کے پچیس سال پورے کرنے کے بعد آخری تین سال کے دوران ایصال کی جانے والی تنخواہ کا نصف بہ طور وظیفہ پانے کے مستحق ہوں گے۔ ابھی اس بارے میں غور کرنے لیے کافی وقت ہے اور یہ معاملات تمھاری واپسی پر طے پا سکتے ہیں۔

تمھارا بھائی

زکی الدین صدیقی

* ڈاکٹر صاحب کے والد اور میرے دادا حضرت قاضی مظفر الدین صدیقی تھے۔ صدر محاسبی سے وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہونے کے بعد اعلیٰ حضرت حضور نظام کے فرمان سے دو سال کے لیے تھے۔ صرف خاص میں محاسب کے عہدے پر مامور ہوئے تھے (م ص)

منیر نیازی

میرے آس پاس خواب کی کیفیت ہے

سارے آسمان پر بادل چھائے ہیں
مجھے اپنا گھر بھول گیا ہے
گھر سے باہر نکلنے کے بعد مجھے اپنا گھر بھول گیا ہے
اب میں اسے تلاش کر رہا ہوں
سمجھ میں نہیں آتا اسے کیسے تلاش کروں
اکا دکا کوئی درخت
کبھی کبھی کوئی شنا سا چہرہ
اور دور دراز میں کوئی مانوس عمارت
سمجھ میں نہیں آتا
ایسے نامکمل نشانوں کی معرفت اپنے گھر تک کیسے پہنچوں گا
میرے آس پاس خواب کی کیفیت ہے
اور میرا دل گھر واپس جانے کو چاہتا ہے

ooo

راشد آزر

تم سے یہ بھی نہ ہوا

وہ بھی دن تھے کہ مری روح کا آئینہ تھا
اب تو ٹوٹی ہوئی اک قبر ہے چہرہ میرا
کس نے دیکھا مری چہرے پہ مری روح کا کرب
دوست ہو، تم ہی گھڑی بھر کے لیے رک جاتے
اور پڑھ لیتے کبھی میرے بدن کا کتبہ
لیکن اب تم سے شکایت بھی کروں تو کیسے
تم سے یہ بھی نہ ہوا ایک تبسم کی کلی
پھینک جاتے کہ بس اک لمحے کو میں جی اٹھتا۔

ooo

ساحل احمد

یہ آنسو روشنی کے ہیں

رات کی گرہیں
ستارے ہی کھول پاتے ہیں
ستارے جو ہمارے آس پاس کے ماحول کے نگہ دار ہیں
ماحول کی تشکیل
رات کی تاریکی
اور ستاروں کی روشنی نے مل کر کی ہے
لیکن!
ستاروں کی رفتار پر رات نظر رکھتی ہے
ستاروں کی روشنی بے خبری میں سفر کرتی ہے
رات ایسا اس لیے کرتی ہے
کہ کوئی روشنی آتشِ سیاہ کی خوراک نہ بن جائے
کیوں کہ اکثر رات کے وقت
"کیتو" سرگرم سفر ہوتے ہیں
کبھی کبھی ایسی نیل گوں رات آتی ہے
جب "نیلاپا" سفر کرتا ہے ... بچے کی طرح
اور عموماً راستہ بھٹک جاتا ہے
"کیتو" کی سراغ رسی بڑھ جاتی ہے
اگر کوئی "نیلا پا" اس کی گرفت میں آجاتا ہے
آسماں کا درد سوا ہوجاتا ہے
رات اور زیادہ سیاہ ہوجاتی ہے
روشنی بوند بوند روتی ہے
پھول کی پنکھڑیاں
رنگین ہری بھری پتیاں
آنسوؤں کو سمیٹ لیتی ہیں
- آنسو ہاں روشنی کے ہیں

افتخار نسیم

○

غم سے آزاد بھی نہیں کرتا
وہ مجھے شاد بھی نہیں کرتا
میں اسے بھول ہی نہیں سکتا
وہ مجھے یاد بھی نہیں کرتا
شہرِ مفتوح میں مرا فاتح
مجھ کو برباد بھی نہیں کرتا
قفلِ دل کھول دے، کچھ ایسا طلسم
وقت ایجاد بھی نہیں کرتا
پہلے دل احتجاج کرتا تھا
اب تو فریاد بھی نہیں کرتا
جیسی تنقید اس نے کی ہے نسیم
ایسی نقاد بھی نہیں کرتا

☆☆☆

○

ملنے والے بچھڑ بھی جاتے ہیں
کام بن کر بگڑ بھی جاتے ہیں
اتنی دوری ہی بس غنیمت جان
فاصلے اور بڑھ بھی جاتے ہیں
مان اتنا نہ کر درختوں پر
یہ جڑوں سے اکھڑ بھی جاتے ہیں
اس کا اظہار کر نہیں سکتے
ورنہ ڈر تو نڈر بھی جاتے ہیں
مانگنے شہر بھر سے جاں کی اماں
کچھ شجر کچھ کھنڈر بھی جاتے ہیں
شام ہوتے ہی دل کے صحرا میں
غم کے خیمے سے گڑ بھی جاتے ہیں

☆☆☆

افتخار نسیم

○

غم سے پاگل جو ہونے لگتے ہیں
وقت بے وقت سونے لگتے ہیں

بے سبب قہقہے لگاتے ہیں
بات بے بات رونے لگتے ہیں

کل کے اونچے پہاڑ جیسے لوگ
آج قد سے بونے لگتے ہیں

اس کے ہونے سے رات دن اپنے
سانولے اور سلونے لگتے ہیں

○ ○ ○

○

آر سے پار سے نہیں نکلا
عکس دیوار سے نہیں نکلا
شہر بنتے گئے مگر انساں
آج تک غار سے نہیں نکلا
ہونٹ پتھر کے ہوگئے میرے
چشمہ کہسار سے نہیں نکلا
اس کنویں میں پڑا ہوا صندوق
ایک دو چار سے نہیں نکلا
ایک موتی سا خواب شب بھر میں
چشم بیدار سے نہیں نکلا
لوگ دفتر چلے ہیں اور نسیم
گھر سے اتوار سے نہیں نکلا

○ ○ ○

احمد فراز

☆

غم تمھارا تھا زندگی گویا
تم کو کھویا اسے نہیں کھویا
فرطِ گریہ سے جی نہ ہلکا ہو
بس یہی سوچ کر نہیں رویا
اشک تو اشک ہیں شراب سے بھی
میں نے یہ داغِ دل نہیں دھویا
میں وہ کشتِ نشاط کیوں کاٹوں
جس کو میں نے کبھی نہیں بویا
آبلہ تھی جاں پھر بھی
بارِ ہستی کو عمر بھر ڈھویا
دیدہ و دل گواہ ہیں جاناں
سکھ سے جاگا نہ چین سے سویا
دوسرا کوئی ساتھ ہو کہ نہ ہو
تم میرے پاس ہوتے ہو گویا۔

○○○

اکبر حیدرآبادی

☆

میری محبت زندہ، میرا درد مثالی تھا
اس کے علاوہ جو کچھ بھی تھا صرف خیالی تھا
شاید اس کی قسمت میں تھی ازل ابد کی پیاس
آنکھ اور ہونٹوں کی صورت دل بھی سوالی تھا
پتّا پتّا افسردہ اور اپنے پیڑوں سے برہم
یعنی وداعِ گل کا ماتم ڈالی ڈالی تھا
ہار کے بھی وہ دیکھ رہی تھی اپنی انا کے خواب
شب کو خبر تھی سورج کا پندار زوالی تھا
روشن آنکھوں کے پیچھے سے جھانک رہے تھے سائے
بدن تھا اس کا سچا لیکن چہرہ جعلی تھا
حدِّ خیال سے آگے لا محدود مناظر تھے
کائنات کے آئینے میں عکس اجمالی تھا
تنہائی یوں پھیل گئی تھی سارے جسم میں اکبرؔ
میرے ہوتے ہوئے بھی میرا کمرہ خالی تھا

●●●

ذکی بلگرامی

(۱)

بس ایک دھیان تمھارا ہے اور کچھ بھی نہیں
اسی پہ اپنا گزارا ہے اور کچھ بھی نہیں

کرن امید کی آنکھوں میں ، پیاس ہونٹوں پر
یہی اثاثہ ہمارا ہے اور کچھ بھی نہیں

اسے تو وقت کا جھونکا بجھا کے رکھ دے گا
یہ جسم ایک شرارہ ہے اور کچھ بھی نہیں

فلک پہ کیسی گھنی تیرگی ہے آج کی شب
کہیں کہیں کوئی تارا ہے اور کچھ بھی نہیں

مری بیاضِ رفاقت کے گوشوارے نہ دیکھ
کہ اس میں صرف خسارہ ہے اور کچھ بھی نہیں

بھٹک رہی ہے خلاؤں میں بوجھ اٹھائے ذکی
زمین کیا ہے ؟ غبارہ ہے اور کچھ بھی نہیں

○○○

(۲)

یا رانِ گم شدہ کی نہ یادوں کی آہٹیں
تنہائیوں کی قید میں کس طرح دن کٹیں

آیا تھا پچھلی رات کوئی اجنبی سا دھیان
بستر پہ میرے چھوڑ گیا گہری سلوٹیں

بیداریوں کا زہر لہو میں اتر گیا
پلکوں پہ جم کے رہ گئیں خوابوں کی تلچھٹیں

لہرا رہی ہیں گھر کی منڈیروں کے دوش پر
بارش میں سبز بیل کی بھیگی ہوئی لٹیں

کرتا ہے کون رات گئے خوش خرامیاں
آتی ہیں آسمان سے قدموں کی آہٹیں

کس طرح ایک ساتھ ذکی ہم گزارتے
دونوں کے بیچ میں تھی انا کی رکاوٹیں

○○○

اسعد بدایونی

○

نہ مہر و ماہ نہ سیارگاں سے روشن ہے
تمام خانۂ دل رفتگاں سے روشن ہے

دلوں میں درد کے جگنو بھی جلتے بجھتے ہیں
ستم کی رات بھی شورِ سگاں سے روشن ہے

چراغِ لالہ جو روشن ابھی نہیں ہے تو کیا
جنوں کا باغ تو آوارگاں سے روشن ہے

جہاں میں یوں تو سبھی آب و گِل کے پتلے ہیں
ترا جمال کسی کے بیاں سے روشن ہے

کتابِ عشق و محبت کے حاشیوں پہ نہ جا
بیاضِ ہجر و ہوس درمیاں سے روشن ہے

کہاں پہ تیرہ و تاریک ہے یہ عرصۂ دہر
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہاں سے روشن ہے

ہمارے سامنے جلتا نہیں عدو کا چراغ
ہماری فکر حدِ لامکاں سے روشن ہے

●●●

○

فصیلِ قصرِ انا عشق نے گرادی کیا
شکست کھاگئی پھر قوتِ ارادی کیا

تمھارے شہر کی شب دن کو مات دیتی ہے
یہاں سبھی نے چراغوں کی لو بڑھادی کیا

نہ کوئی نعرۂ ہو، ہے کہیں نہ جام و سبو
اجاڑ دی گئی اب کے جنوں کی وادی کیا

جو معرکے میں نہ جائے وہ بادشاہ نہیں
جو عشق ہی نہ کرے پھر وہ شاہ زادی کیا

دیارِ درد میں تھا جس سے روشنی کا وجود
وہ آگ بارشِ حالات نے بجھادی کیا

نہ کوئی پھول، نہ چہرہ، نہ چاندنی، نہ چراغ
یہاں ہر ایک ہے بدصورتی کا عادی کیا

مسائلِ دل و دنیا پہ غور کرتے، لوگ
ضرورتوں نے یہ زنجیر ہی ہلادی کیا

●●●

اقبال متین

دو عورتیں

زمانہ سکون سے سونے دیتا اور نہ وقت پر جاگنے۔ ہنسی میں غموں کی ڈھکی چھپی آمیزش نہ ہوئی۔ جیسا نام ویسے ہی شاہانہ دن ر
ہوتے شہزادی بیگم کا چہرہ ڈھلتے سورج کا توانہ بن جاتا۔
کئی بار یوں ہوا کہ میں پوچھتی رہی اور وہ ٹالتی رہی۔ مجھے بھی کرید کرید کر راکھ ہٹانا اور چنگاری ڈھونڈھنا بی کو نہ بھایا۔ یوں
اپنی ملازمہ کا اتنا کچھ خیال کم ہی بی بیاں کرتی ہیں۔ مجھے احساس تھا اور یہ احساس کچھ اس طرح جڑ پکڑتا گیا کہ شہزادی بیگم جیسے میں کچھ لاڈ
اختصار کی سہولت کے لیے شہزاد پکارتی تھی نہ عورت کا دل اپنے سینے میں رکھے ہے نہ دوسری کے سینے میں ٹٹولے۔ اچھی بھلی قہقہے
شہزادی، پلک جھپکاتے پتھر کی ایسی مورت بن جاتی جیسے صدیوں بعد کھدائی میں زمین کی تہیں کھول کر نکال گیا ہو۔۔۔ چہرے ر
ہوئے دنوں کی خراشیں۔۔۔ جی چاہتا، بس چلے تو اٹھا کر آثار قدیمہ کی طرح گھر کے کسی گوشے میں اس تمثیلی عورت کو رکھ دیا جائے
پلٹ کر کوئی نہ دیکھے، گرد سے اٹی ہوئی، مکڑی کے جالوں سے چھپی ہوئی شہزاد ہاتھ بڑھا کر کوئی گرد تک جھاڑے۔ جی جل کر رہ جاتا۔
بچوں کے اسکول سدھارنے کے بعد جب وہ بھی دفتر چلے جاتے تو میں کسی نہ کسی کتاب میں پناہ لیتی۔ اس وقت میں دنیا ب
خود کو تسلیم کروالینے والے عظیم اور بے ریا آرٹسٹ ام۔ اف۔ حسین کی پینٹنگس کے ساتھ احمد آباد میں کیے گئے غیر انسانی سلوک کی د
پڑھتے ہوئے محسوس کر رہی تھی کہ افغانستان کی طالبانی بنیاد پرستی میرے وطن میں تو بہت پہلے ہی روپ بدل کر داخل ہو چکی ہے۔
شہزاد جب دیکھتی کہ میں اپنی مصروفیات ختم کر کے کتاب اٹھا لیتی ہوں تو پھر اس کے ہتھے نہیں چڑھتی اور اس کا موڈ:
فراغت کے لمحے کچھ میری دل جوئی کے بہانے اس کے اپنے دل بہلاوے کا سامان بھی مہیا کریں تو وہ مجھے چھیڑتی "

"کچھ سنا بی بی آپ نے؟"

"انسان جانور سے بدتر کوئی مخلوق ہو گیا ہے"

"کوئی سیکل پر جا رہا تھا۔ روکا۔ بڑے چاؤ سے نام پوچھا۔ چاقو لگا دیا۔"

"کوئی غریب کسی سینما ہال کا ملازم تھا۔۔۔ سنا کہ اپنی ہی دنیا میں مست کھڑا دیوار پر پوسٹر چپکا رہا تھا۔ پہناوا دیکھا ا
گھونپ دیا پیچھے سے۔"

یہ مردانگی نہیں ہوئی۔ یہ تو درندگی سے بھی گھٹیا کوئی شے ہے۔ مجھ سے اگر کوئی کہے کہ۔۔۔ "شہزادی بیگم تیرے شوہر
نہ خواستہ، خدا نہ کردہ کسی کا سر پھاڑ دیا ہے تو بی بی، میں اتراؤں گی نہیں۔ مرجاؤں گی شرم سے۔۔۔ میرا خاوند بھیڑیا نہیں ہو سکتا
ہو سکتا ہے تو اللہ میں اس کی بیوی نہیں ہوں"

بی بی آپ نے وہ تقریر سنی ہوگی نا۔۔۔ سرکار امن کمیٹیاں بنا رہی ہے۔ گھر گھر پھر کر لوگوں کو امن کمیٹی والے دلاساد

گے کہ مل جل کر، پیار سے رہنے میں ہماری بھلائی ہے۔"

میں نے کہا "شہزاد تو نے یہ کب کی پرانی باتیں بسار رکھی ہیں اپنے ذہن میں۔"

شہزاد نے کہا۔۔۔ بی بی اچھی اور سچی باتوں کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔"

ہاں تو بی بی میں کہہ رہی تھی آپ نے ریڈیو سے وہ تقریر سنی ہوگی۔ کچھ اچھا سا نام تھا بولنے والے کا۔۔۔"

کچھ دیر شہزاد سوچتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔

"اونہہ! مٹی پڑے اس بھول پر۔۔۔ اچھا سا نام تھا۔ خیر نام سے کیا کام ہمیں بی بی۔۔۔ لیکن بات کیا پتے کی بتلائی ہے۔"

کہا۔۔۔ "سرکار فرماتے تھے۔"

"کیا سمجھیں۔۔۔ سرکار سے مراد گورمنٹ سرکار نہیں۔ سرکاروں کے سرکار۔۔۔ ہمارے سرکار۔۔۔ ہمارے نبیؐ، کہا۔۔۔ تے تھے کہ۔۔۔

"مومن وہی ہے جس کا پڑوسی دن کو سکون و اطمینان سے رہے اور رات چین کی نیند سوئے۔"

اللہ ان مردوں نے مذہب کو سمجھا ہی نہیں۔ کون سا مذہب ہے جس نے نفرت کرنا کبھی سکھلایا ہو۔ رام لچھمن کو لے لو۔۔۔ ، کو لے لو۔۔۔ ہمارے نبیؐ کا فرمان تو سنا ہی دیا ہے۔ اصل بات یہ ہے بی بی کہ مت ماری گئی ہے اس مرد ذات کی۔۔۔ میں تو ادا کرتی ہوں کہ عورت پیدا ہوئی"

"بی بی اور بی بی۔۔۔ ماں جنم دیتی ہے تو کس کس طرح دعائیں دیتی ہے اپنے ننھے کو۔۔۔ سوچتی ہے کہ بڑا ہوگا تو پڑھ لکھ کر بنے گا۔۔۔ مدرسے، کالج سب کچھ دن دونی بڑھ رہے ہیں۔ پھر بھی یہ کیا ہے بی بی، کہ مرد میں چھپا ہوا بھیڑیا اپنے خوں خوار دانت پھر تا ہی رہتا ہے۔ آدمی پہلے آدمی بن لے، بس اور کچھ نہیں، انسان بننا تو بڑی بات ہے۔۔۔ میں کہوں، بھیڑیا تو نہ رہے۔"

"بی بی سچ کہتی ہوں نا۔"

میرے جواب دینے سے پہلے اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"لیکن بی بی ادھر سنا ہے کہ چند عورتیں چبائی ہوئی ہڈیاں جبڑوں میں دبائے مرد درندوں میں مل گئی ہیں۔"

"میں کہوں یہ سب کیوں ہے؟

چھاتیاں چوا کر ماں بچے کو دودھ پلائے اور اپنا دودھ سکھا کر ڈبوں کا دودھ اس کی رگوں میں دوڑائے تو نہ ماستا رہتی ہے نہ پوت۔۔۔"

"بی بی سچ کہتی ہوں نا؟"

میں نے کہا "ہاں شہزاد بالکل سچ کہتی ہو"۔۔۔ شہزاد ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

میں نے رسالہ رکھ دیا اور لمبی لمبی ابھرائے ڈری کی سوئیوں کے ساتھ وہ میز پوش اٹھا لیا جس کے بارڈر میں نے مکمل کر لیے تھے ، پر پھولوں کے پنسل اسکیچ بھی بنا لیے تھے۔

شہزاد اپنے کام میں لگ گئی۔

میں میز پوش پر جھکی ہوئی سوچ رہی تھی کہ شہزاد جو ہنستے بولتے دکھی ہو جاتی ہے۔ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی اس کی زندگی کی ایسی

محرومی چھپی ہوئے ہے جس کا اظہار وہ کبھی نہیں کرتی۔ سارے ہی مردوں کے تعلق سے اس کے جانب دارانہ خیالات سن کر میں سو
گی کہ شہزاد کے شوہر کا سلوک شاید اس سے اچھا نہیں ہے جو وہ اندر سے دکھی ہے۔ ویسے شہزاد نے کبھی اپنے شوہر کی برائی نہیں کی تو
کبھی ذکر آبھی جاتا تو میرے خاوند میرے خاوند کہہ کر وہ اپنے میاں کی تعریف ہی کرتی۔

کچھ دنوں سے میں ایک بات محسوس کر رہی تھی۔ شہزاد ذرا زیادہ ہی کھوئی رہنے لگی تھی۔ عید جیسی عید اور شہزاد تھی کہ جیسے
بھر کا دلدر چہرے پر پوت رکھا ہو۔

میں نے کہا "چائے کے لیے پانی چڑھا دو۔"

وہ مجھے پلانے کے لیے گلاس میں پانی لے آئی۔

میں نے کہا "شہزاد، بچوں کے کپڑے الگنی سے اتار لو۔ سوکھ گئے ہوں گے۔"

اس نے صاف ستھرے کپڑے جو خود اس نے دھوئے تھے الگنی سے اتار لیے اور انھیں پھر سے دھونے بیٹھ گئی۔

میں نے ذرا تلخی سے تیز آواز میں کہا۔

"کیا کرتی ہو شہزاد؟"

اس نے چونک کر اپنے حواس درست کیے۔ میرے سامنے اس طرح آکر کھڑی ہو گئی جیسے مجسمہ نصب کر دیا گیا ہو۔

میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ اپنے آنچل سے آنسو خشک کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔" میں نے پوچھا۔

شہزاد نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔۔۔ بی بی میں بہت مجبور ہو گئی ہوں۔ ورنہ میں آپ سے کبھی نہ کہتی۔ بابا لوگوں کی چھٹ
بھی ختم ہو گئی ہیں۔ صاحب کا دفتر بھی ہے۔ میں جانتی ہوں لیکن کیا کروں"

"لیکن بات کیا ہے شہزاد۔"

مجھے پانچ چھ روز کی چھٹی دے دیجیے۔"

تم اسی ماہ دو روز کے لیے جا چکی ہو۔ یاد ہے نا تمھیں"۔۔۔

اسی لیے تو پوچھ نہ سکتی تھی بی بی۔۔۔ آپ جانتی ہیں کہ میں کام سے پیچھے نہیں ہٹتی۔"

"پھر ایسی کیا ضرورت آپڑی ہے تمھیں؟"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے کہا "بیٹھ جاؤ۔"

وہ بیٹھ گئی۔ ذرا سنبھلی تو میں نے اسے پانی پلایا۔

شہزاد نے ایسی احسان مند نظروں سے مجھے دیکھا کہ میرا جی بھر آیا۔

"کہو کیا دکھ ہے تمھیں؟"

اس نے تھم تھم کر کہنا شروع کیا۔

"میرے خاوند برے آدمی نہیں ہیں بی بی۔۔۔ وہ تو محلے بھر کے جھگڑے چکاتے پھرتے ہیں۔ کہیں کسی پر ظلم ہوا کہ لوگ

ے اپنا دکھڑا لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور وہ بیچ میں پڑ کر دکھ بانٹ لینے کے لیے نکل جاتے ہیں ۔ محلے میں سر پھٹول ہو، پندرہ بیس اول ۔ ہوئے اکٹھا ہو گئے ہوں اور انھیں معلوم ہوا کہ دلاور خاں آرہا ہے کہ ہوئے سب کے سب چھپت ۔ ۔ ۔ لیکن وہ چوکتے نہیں ۔ پڑے ان کے ماجرا بیان کر دیتے ۔ پھر وہ دونوں دشمنوں کے گھر جاتے ۔ جانے کیا تدبیر کرتے کہ وہ دونوں دشمن بہ ظاہر دوست تے، لیکن بی بی دلوں کا حال سوائے اللہ کے کس نے جانا ہے ۔"

شہزاد اس میں برائی کیا ہے ۔ وہ تو دوسروں کے لیے نیک آدمی ہیں ۔ جو شخص اپنے سے زیادہ دوسروں کا غم کھاتا ہے اس کو اللہ ں عزیز رکھتے ہیں ۔"

" وہ تو ٹھیک ہے بی بی ۔ ۔ ۔ لیکن میں کہتی ہوں دلاور اپنے کام سے کام رکھو ۔ دوسروں کے معاملے میں کیوں دخل دیتے ہو ۔ دو ، تو دس دشمن بھی ۔ ۔ ۔ میں نے کئی بار یوں بھی کہا کہ دلاور دیکھو بیٹی بڑی ہو گئی ہے ، تم اس کا اچھا برا کیوں نہیں سوچتے ۔ رکی تمھیں کیا پڑی ہے ۔"

وہ مسکراتے ہیں ۔ کہتے ہیں ۔ " میری بیٹی کو کیا کمی ہے ۔ دلاور خاں کی بیٹی ہے وہ ۔ ۔ ۔"

میں نے دلاور سے پوچھا ۔

" شہزاد آخر وہ کس دفتر میں ملازم ہے ؟ "

شہزاد نے بھول پن سے کہا ۔

" کسی دفتر میں نہیں بی بی ۔ ۔ ۔ " میں پوچھتی ہوں تو وہ کہتے ہیں ۔ " مجھے ضرورت بھر معمول ملتا ہے ۔ مجھے کیا کمی ہے ۔ بستی میری ، دادا ہوں بستی بھر کا ۔ ۔ ۔"

میں نے پوچھا ۔ " شہزاد کیا دلاور خاں تیرے دیس کا نہیں ہے ؟ "

شہزاد نے شرما کر لجا کر کہا ۔

" نہیں بی بی ۔ میں تو ابا کے ساتھ مراد آباد سے آئی تھی ۔ ابا مراد آبادی پیتل کا سامان لے کر گھر گھر پھرتے تھے ۔ ماں تو تھی نہیں ہے یاد نہیں ہے وہ ۔ ۔ ۔ میں بھی ابا کے ساتھ ساتھ پھرتی تھی ۔ دلاور خاں کے گھر گئے تو اس نے مراد آباد کے سامان کے بہانے مجھے فورا پھر دوسرے ہی دن اس کی ماں ہمارے گھر چلی آئی ۔ پھر دلاور نے مسجد میں دو بول پڑھے اور ابا کے ساتھ میرے گھر آیا اور ، اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا ۔ میں اس کے گھر جا کر بڑی ہوئی ۔ آنکھ کھولی تو میں اس کی تھی اور وہ میرا تھا ۔"

اس کی آواز پھر بھرا گئی ۔ اس نے سنبھل سنبھل کر کہا ۔

اس کی آواز بہت سریلی ہے بی بی ۔ ۔ ۔ وہ قوالی بھی گاتا تھا ۔

ایک رات جب اس نے درگاہ میں قوالی گائی تھی ۔ بستی بھر کو یاد ہو گئی ہے ۔ لوگوں نے بتایا کہ جب وہ قوالی گا رہا تھا تو اس کی ، بھیگ گئی تھیں ۔

شبیہ ہو کے دلوں میں اتر گئی مسجد
نکلی زمیں پہ تو ہر اک کے گھر گئی مسجد

اللہ ہو ، اللہ ہو ، اللہ ہو ، اللہ ہو

پھر ایسا آدمی، ایسا آدمی۔ دلاور خاں اچھا آدمی ہے۔ دلاور خاں اچھا آدمی ہے بی بی۔۔۔ میری لن ترانی سنی بھی تو مجھ پر کبھی ہاتھ تک نہیں اٹھایا۔ میں غصہ کرتی رہی اور وہ مسکراتا رہا۔"

میں مت مت شہزاد کا اس منہ تکتی رہ گئی۔ جب اس کے آنسو ختم ہوگئے تو میں نے بہت نرمی سے پوچھا۔

"شہزاد آخر ہو کیا گیا ہے جو۔۔۔"

"بی بی دلاور بہت زخمی ہوگیا ہے۔ وہ کسی پارٹی کی طرف سے کسی زمین کا قبضہ چھڑانے گیا تھا۔ اب اس پارٹی کے لوگوں نے اسے پولیس سے چھپا رکھا ہے۔ مجھے ایک رات اس تک لے جایا گیا تھا۔ میں اسے دیکھ آئی ہوں۔ بغیر روئے دیکھ آئی ہوں بی بی۔ بہت برا ہے وہ۔۔۔ میری ضرورت ہے اسے۔۔۔ میں اپنی بچی کو آپ کے پاس چھوڑ جانا چاہتی ہوں۔۔۔ یہ مذہب نہیں ہے بی بی۔۔۔ یہ کوئی مذہب نہیں ہے۔۔۔ کچھ اور ہے یہ۔۔۔ اور ہی ہے کچھ۔۔۔

میں سکتے میں آگئی تھی۔

میں نے صرف اتنا کہا۔۔۔ "شہزاد تم چلی جاؤ۔"

مجھے ڈر لگ رہا تھا جیسے پولیس نے میرے گھر کو بھی محصور کر لیا ہے۔

"جاؤ شہزاد۔۔۔ جا سکتی ہو تم۔۔۔"

لیکن وہ بت بنی کھڑی تھی۔

00 000 00

(سلسلہ ص ۲۰)

عامۃ الناس۔ (رسالہ تراث الانسانیۃ ج ۱، ش ۳، ص ۱۲۱)

اصل واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ اور مذہب میں جو کشمکش تھی یہ قصہ اس کی ترجمانی کرتا ہے۔ لوگ ظاہر پرست ہیں۔ وہ فکر و استنتاج سے جو افکار و خیالات سامنے آتے ہیں وہ ان کو برداشت نہیں کر سکتے چوں کہ فقہا سخت گیر تھے لہذا ان کی پکڑ سے بچنے کے طفیل شریعت، روح اور خدا کا ذکر کر رہا ہے مگر اصلاً وہ یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہے کہ جو شخص فکر و نظر کی بنیاد پر اور فلسفے کی بنیاد رہنا چاہتا ہے اس کو حکومت اور ظاہر پرست علما برداشت نہیں کر سکتے لہذا اس کو تنہائی میں جا کر زندگی گزارنی چاہیے۔

حی بن یقظان دراصل فلسفی ہے ابسال صاحب بصیرت مذہبی شخص ہے۔ بصیرت اور فلسفہ دونوں، معاشرے کو اور ظاہری کو برداشت نہیں لہذا دونوں خالی جزیرے میں لوگوں سے دور زندگی گزار دیتے ہیں۔

000

ڈاکٹر شیمل اوستھی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

اجگر

کتنے چھوٹے گاؤں سے کتنے بڑے شہر میں نوکری ملی۔ نہیں ملی تھی تو کہیں بھی کسی شرط پر نوکری کرنے کو تیار تھا۔ گاؤں میں تھا کہ کنویں میں گرا ہوا ہوں اور کسی بھی طرح، چاہے سانپ کو ہی پکڑ کر، جیسے بھی ہو باہر نکل آؤں۔

اور اب گاؤں چھوڑنے کا وقت آیا تو لگا کہ شادی کے بعد لڑکی کو بار بار ڈولی تک لے جایا جاتا ہے اور وہ کیوں ہر دفعہ روتے ہتے گھوم گھوم کر ماں سے، بہن سے، بھائی سے، باپ سے، گاؤں کی سہیلیوں سے ملنے ڈولی سے بھاگ آتی ہے۔

لگتا تھا، گاؤں ماں کی باہنہ کی طرح رات میں ایک ڈرے ہوئے بچے کو کسے ہوئے ہو۔ اسی لیے گاؤں سے نکلنے کا وقت شام ہونے بعد طے کیا تاکہ میرے اور گھر کے تمام لوگوں کے بیچ لالٹین کی مدھم روشنی ہو۔ کسی کی آنکھ میں کیا ہے، کسی کو پتہ نہ چلے۔

کس طرح کے شہر میں آگیا جہاں دفتر، کالونی، مشین جیسی زندگی، مشین جیسے آدمی، پارک یا میدان نہ کہیں کھیت نہ کھلیان۔ پیڑ ے بھی قدرتی نہیں، جانور مویشی بھی پالتو۔ کبھی کبھار طوطے کبوتر کے جھنڈ کے آجاتے تو کسی درخت یا چھت پر بیٹھنے سے پہلے ہی یوں کی آواز یا دفتر، فیکٹری کے کھلنے بند ہونے کے سائرن سن کر پھڑپھڑا کر اڑ جاتے۔ کبھی کبھی کسی مداری یا نٹ کو دیکھ کر لتنے ے اکٹھا ہو جاتے کہ بندر بھالو اپنا کھیل بھول جاتے۔ مار کھا کر بس ٹکر ٹکر بھیگی، ڈری ہوئی آنکھوں سے آس پاس کھڑے لوگوں کو بھتے رہتے کہ یہ کون ہیں!

جب تک اکیلا تھا تو ایک دو دن کی چھٹی ملنے پر بھی گھر بھاگ جاتا تھا۔ تب لگتا تھا کہ پھیپھڑے میں دھوئیں کی جگہ ہوا ہے، پیٹ ، گیس کی جگہ بھوک ہے، نل کے بے مزہ پانی کی جگہ میٹھا پانی ہے، جاڑے میں جی بھر کر گرمانے کے لیے دھوپ ہے، گرمی میں کھلی ت کی ہوا ہے جیسے کوئی پانی بھگو کر پنکھا جھل رہا ہو، گاؤں میں بتانے کے لیے دوست ہیں، کھانا کھلانے کے لیے ماں ہے، کسی بھی ورت کے لیے باپ ہے۔ بڑے بھائی ہیں، پورا خاندان ہے۔

پھر سب کچھ چھوٹتا گیا، گھٹتا گیا، ایک ندی کی طرح سوکھتا گیا اور ایک وقت ایسا آگیا کہ گھر جانے سے پہلے نفع نقصان، جوڑ گھٹاؤ چنے پر مجبور ہو جانا پڑا۔ بیوی تیار ہوتی تو بچے راضی نہیں ہوتے۔ سب تیار ہوتے تو کوئی پڑوسی گھر کی رکھوالی کے لیے نہیں ملتا۔ شہر ، لگتا کہ بس دیواریں ہیں، اگر کھڑکی دروازے ہیں تو کسی مقصد یا ضرورت کے تحت کھلتے ہیں اور بند ہو جاتے ہیں اور انتہا یہ ہوئی کہ تہوار میں بھی گھر جانا بند ہو گیا۔ کچھ روپے بھیج دیتا تو لگتا کہ ماں کے دودھ، باپ کے پسینے، بھائی بہنوں کے پیار محبت کا دام چکا رہا ہوں

اور آج چھٹ کے تہوار کی چھٹی ہو جانے کے دن کرسی سے اٹھنے کو من نہیں کر رہا ہے۔ لگتا ہے ملیریا کا اٹیک ہونے والا ہے۔ ر کپکپی ہے، جسم بھاری ہے، منھ کا مزہ تلخ ہے۔ لیکن کب تک یوں ہی بیٹھا رہتا! سبھی لوگ جا چکے ہیں۔ دفتر سے باہر آیا تو دیکھا کہ

کوے اور چیل کا جھنڈ ہے، اپنی ماند سے نکل آئے پنکھ والے دیمک، چیونٹی کو کھاتے ہوئے، نیچے زمین پر ان کے پنکھ بکھیرے
بغیر پنکھ کے رینگتے ہوئے۔ ان کے بیچ سے، انھیں کچلنے سے بچتا ہوا، ان ہی کی طرح رینگتا ہوا چوک تک چلا آیا۔

اب یہ کاتک کی شام ہے یا میری آنکھ کی کمزوری کہ میرے اندر اٹھا ہوا دھواں، باہر کچھ زیادہ ہی دھندلا نظر آرہا ہے
چاروں طرف گہرا دھواں سا نکل کر ہر سمت پھیل رہا ہو۔ کچھ ہی دوری پر چوک ہے جہاں رکشا، ٹمپو، ٹم ٹم کے ساتھ ساتھ ار
پڑاؤ ہے کبھی کبھی تو کئی ارتھیاں نظر آتی ہیں اور لگتا ہے کہ سامنے کا ہوٹل نہیں لاشوں کا گھر ہے۔ آج سواریاں کم ہیں اور ار
رکشے والے کی گھنٹی، ٹمپو والے کی آواز سنے بغیر میں فٹ پاتھ پر آجاتا ہوں۔ چپ چاپ پیدل چلتے ہوئے گھر تک جانے کی خو
اٹھتی ہے۔ یہ سڑک بہت بھیڑ بھاڑ والی ہے اور فٹ پاتھ پر بھی کافی لوگ چلتے ہیں۔ زیادہ تر بوڑھے، ریٹائرڈ لوگ، ٹہلنے جا
ٹہل کر آتے ہوئے۔ لیکن آج سڑک بھی خالی سی ہے، فٹ پاتھ بھی۔ سڑک کے دونوں طرف پتہ نہیں کب کے لگائے ہوئے ا
ہیں جن کی ڈالیاں ایک دوسرے سے اس طرح لپٹی ہوئی ہیں جیسے ایک دوسرے کے بغیر پتہ نہیں کب گر پڑیں۔ ان کے نیچ
اکثر کوئی پتا اس طرح گر پڑتا ہے جیسے کسی بوڑھے کی آنکھ سے آنسو یا منھ کی لار۔ پتہ نہیں کب کس نے جگہ جگہ پیڑ کے نیچ
بنچیں بنوادی تھیں۔ لیکن اب زیادہ تر بنچیں اس کنارے، اس کنارے، بیچ میں اس طرح ٹوٹ کر دھنس گئی تھیں کہ د با
پرانی قبریں ہیں جن پر کبھی کبھی بہت دن پہلے ریٹائرڈ ہوگئے ایک آدھ دفتر کے بابو یا افسر تک کر بیٹھے مل جاتے تھے۔

کچھ دور چلنے پر اس سڑک کے ایک طرف کچھ سرکاری کوارٹر ہیں جن کے لان میں سکولی بچے یا دراز عمر کے لیکن اچھ
لوگ بیڈ منٹن یا والی بال کھیلتے نظر آتے تھے۔ اس سڑک کی دوسری طرف ایک بڑا سا میدان ہے جس میں کچھ نوجوان لڑکے ک
بال کھیلتے دکھائی دیتے تھے۔ کہیں کہیں پر دو چار نوجوان بیٹھے ملتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ نشہ کرتے ہیں۔ اکثر جوان لڑ
ایک ساتھ دکھائی دیتے تھے۔ ان کے بارے میں سننے میں آتا ہے کہ ماں باپ سے نظر بچا کر ملنے جلنے والے ہیں۔ مگر آج سڑک
طرف عجب خاموشی اور ویرانی تھی۔ کچھ دور جا کر یہ سڑک ایک چوک کی طرف مڑتی ہے جہاں ایک مجاہد آزادی کی قد آدم مور
اس مورتی کو دیکھ کر لگتا ہے کہ شاید یہ دھول سے بنی ہوئی ہے مگر کھڑی ہے، پتہ نہیں کب گر پڑے۔ اس چوک سے آگے بڑ
دائیں بائیں دیکھنا پڑتا ہے کیوں کہ کسی بھی طرف سے کوئی بھی گاڑی آسکتی ہے۔ لیکن شاید اسی مجاہد آزادی کے بھروسے ٹر
کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

میرے محلے سے پہلے بڑے بڑے افسروں، ڈاکٹروں کی کالونی ہے۔ اس کالونی کے کوارٹر کے لان کی گھاس اور پھو
من کرتا ہے کہ گھاس پر لیٹ کر پھولوں پر نگاہ جمائی جائے جس طرح ایک مزدور عورت کام سے فرصت نکال کر زمین پر ا
دودھ پیتے بچے کو دیکھتی ہے۔ مگر آج یہ لان بھی خالی ہے، صرف کرسیاں پڑی ہیں، لاش جلا کر پھینک دی گئی ارتھیوں ک
کالونی کے بیچ سے گزرتے ہوئے کبھی کبھی لگتا ہے جیسے دور چل لینے کے بعد، اب وہاں سے لے کر یہاں تک کی خاموشی۔ سڑ
لوگوں کے کمرے میں قید رہنے کی وجہ سے یکایک شبہہ نے سر ابھارا ہے کہ آخر آج بات کیا ہے؟ کیا شہر میں کچھ ہوا؟ دنگا فساد
کوئی حادثہ ہنگامہ؟ یہ سب ہوتا ہی رہتا ہے۔

اب وقت بھی کافی ہو چکا تھا۔ پیچھے سورج ڈوب رہا تھا، سامنے سے اندھیرا آرہا تھا جیسے کسی چمنی کا دھواں آسمان سے
کی طرف آرہا ہو۔ اب میں اپنے محلے میں داخل ہو رہا تھا۔ لیکن نہ تو محلے کے چوک پر نوجوانوں کی جماعت تھی، نہ گلی میں بچا

[illegible]

[illegible]

پروفیسر محمد میاں کی

ہندوستان، اسلام اور مغربی ایشیا

مصنف: پروفیسر محمد شفیع آگوانی

یہ کتاب کا مطالعہ نہ صرف ذوقِ مدح کا سامان مہیا کرتا ہے بلکہ ذہن و فکر کی کئی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے فکر کو نئی جہات عطا کرتا ہے۔ کتاب کو اچھا ہونے کے لیے کم از کم مذکورہ صفات سے متصف ہونا ضروری ہے۔ کتابوں کی اشاعت و ترویج کا موجودہ دور ایسا ہے کہ قاری کو انتخابِ کتب کے دشوار مراحل کا سامنا ہوتا ہے۔ یعنی کتاب کا مطالعہ تو صاحبِ فکر و رجحانِ ذہنی کا محرک ہوتا ہے، کتاب کے انتخاب کے لیے بھی صاحبِ ذہن اور صاحبِ فکر ہونا ضروری ہو گیا ہے۔ ایسے ماحول میں ایک اچھی کتاب کی اشاعت پر آنا یقیناً کرم کتابی کے لیے از حد مسرت کا باعث ہو گا۔ ہماری مراد پروفیسر محمد شفیع آگوانی کی تازہ تصنیف "ہندوستان، اسلام اور مغربی ایشیا" سے ہے جو ان کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔

پروفیسر محمد شفیع آگوانی ہندوستان کی ممتاز جامعہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ اپنے لمبے کیریئر میں پروفیسر [illegible] تقریباً چالیس برس کے دوران علمی کاموں کے ضمن میں مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کا بار بار دورہ کیا۔ وسیع مطالعہ اور دقیق مشاہدہ، فکر و نظر، تحریر کی خوش بو سے اذہان معطر تو ہوتے ہی ہیں افکار کو بھی اعتبار ملتا ہے۔ زیرِ نظر تصنیف اسی طرح کا رد عمل رکھتی ہے۔

"ہندوستان اسلام اور مغربی ایشیا" دو حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول میں تین چھ اور دوم میں چھ مضامین شامل ہیں ہر مضمون اپنی [illegible] ل تصنیف کا وزن رکھتا ہے۔ جیسے کسی قدر مختلف اور متضاد فکر کے سوتے پیدا کیے گئے ہیں۔ خود مصنف کے الفاظ میں "یہ کتاب اس داستان (مغربی ایشیا کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کی داستان) کے عصری خد و خال، مغربی ایشیا کی داخلی [illegible] اور [illegible] پر روشنی ڈالتی ہے تو دوسری طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی فکری ثقافتی اور سیاسی تحریکوں کی ایک جھلک پیش کرتی ہے۔

پہلے مضمون (پیش لفظ) میں پروفیسر آگوانی نے مکمل اسلامی پس منظر پیش کرتے ہوئے خلافت کی لازمی ضرورت کے حق میں لکھا ہے [illegible] مرکزی سیاسی اقتدار ہونا چاہیے جو کہ شریعت پر عمل درآمد کرائے لیکن اہم طریقہ تو یہ ہے کہ سابق عثمانی خلفاء کے عہد میں بھی [illegible] کی پابندی پر ڈھیل دی جانے لگی تھی۔ اسلامی تحریکات کی عمومیت سے بحث کرتے ہوئے شیخ محمد بن عبد الوہاب [illegible] دین محمد رشید رضا ([illegible]) اخوان المسلمین، ایران کے اسلامی انقلاب، [illegible] تحریک [illegible] کے [illegible] ان دونوں کے عمل ردعمل سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس مضمون میں [illegible] زوال کی تاریخ کے [illegible] سے بحث کی گئی ہے۔ [illegible] ۱۹۲۴ء میں عثمانی خلافت [illegible] نے ایک عالم کو شش کی کہ مغربی ایشیا کی ریاستوں [illegible] ایک [illegible] نظریات کے [illegible] پر [illegible]

مطلب ہے فرون ہو گا ہے۔ اسی ضمن میں خلیجی جنگ کے اثرات پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ "یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ حالیہ خلیجی جنگ سے مشرق وسطیٰ میں بنیاد پرستی کی تحریک پر کیا اثر ہوا ہے لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس نے عرب اور مسلم دنیا کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے" (ص ۳۸)۔ آگے چل کر ان کے کلمات فکر کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں "حقیقت تو یہ ہے کہ آج اسلامی ریاستوں کے مابین اتنے ہی اقتصادی روابط نہیں ہیں جو ایک اسلامی ریاست اور کسی غیر اسلامی ریاست کے مابین پائے جاتے ہیں۔ بلکہ اکثر ایک اسلامی ریاست دوسری اسلامی ریاست کے ساتھ شدید آویزش یا جنگ کرتی نظر آتی ہے" (ص ۴۰)۔ کتاب کے دوسرے مضمون میں پہلے مضمون کی فکر کے تسلسل کے طور پر خلیجی جنگ کے بعد عرب ممالک کی صورت حال سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ۱۹۴۵ء میں قائم کردہ عرب لیگ پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ "عرب لیگ آزاد ریاستوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا سا اتحاد ہے" (ص ۴۳)۔ سارے مضمون میں یہ اور اس طرح کی حقیقت پسندانہ تصویر منعکس ہے۔ جنگ کے بعد عراق کی صورت حال بس ایک جملے میں ظاہر کر دی گئی ہے "صدام کا عراق گویا اپاہج ہو چکا ہے" (ص ۴۸)۔ اس سلسلے میں مشورے کے طور پر مصنف نے لکھا ہے کہ "خلاصہ یہ کہ خلیج کی جنگ نے جو عظیم مادی اور جذباتی تباہ کاری پھیلائی ہے عربوں کی طرف سے اس کے اندمال کی کوئی کوشش اب تک سامنے نہیں آئی۔ گو کہ انھیں علی الاعلان یہ احساس ہو جانا چاہیے کہ اگر عربوں کو برقرار رہنا ہے اور ترقی کرنی ہے تو اس نقصان کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ بلکہ فوری طور سے ضروری ہے" (ص ۴۵)۔ اسی مضمون میں جنگ کے پس منظر میں امریکہ کے رول کا بھی باریک بینی کے ساتھ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ "فلسطینیوں کا سوراج" کے عنوان سے لکھا گیا مضمون فکر انگیز ہے۔ اس مضمون میں جس قدر امور پیشین گوئی کے طور پر شامل ہیں، امتداد زمانہ نے ان میں سے بیشتر کو سچ ثابت کر دکھایا ہے۔ "اسلامی عسکریت کے مختلف روپ" سے بحث کرتے ہوئے امر، خلافت، شریعت کے نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں بنیاد پرستی کے ورود اور اس کے عمل کی جزئیات سے سیر حاصل بحث کرتے ہوئے بنیاد پرستی کے نئے مراکز مصر (اخوان المسلمین کا قیام، تحریکات مصر میں شاہی شاہی حکومت کا خاتمہ وغیرہ) الجیریا (اسلامک سالویشن فرنٹ (FIC) کا قیام، کارکردگی) سوڈان (محمد محمود طہ کی مساعی وغیرہ) اور ان کی کارکردگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مغربی ایشیا اور ہندستان کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں مغربی ایشیا میں گذشتہ صدی میں ہوئی سیاسی، سماجی، تہذیبی تبدیلیوں سے تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ "جارج ٹاؤن یونیورسٹی واشنگٹن کے پروفیسر ابراہیم ابولغد نے لکھا ہے کہ اگر موجودہ رجحانات کو نہ روکا گیا تو عرب دنیا کے سامنے صرف دو متبادل ہوں گے وہ یا تو جنوبی امریکہ کے ممالک کی طرح ہو جائیں گے جہاں چند دولت مند لوگوں کی حکومت ہوگی جو امریکہ کے سہارے قائم رہیں گے یا پھر وہ افریقی ممالک کی طرح کے ہو جائیں گے جہاں صرف نراج کا بول بالا ہے" (ص ۸۸)۔ سلسلہ بیان کے ایک موڑ پر مصنف نے ہندستان کی اسرائیل کے ساتھ حالیہ دوستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے (ص ۹۲)۔ ہندستان اور عالم اسلام کے عنوان سے شامل مضمون میں اسلامی جنگ جوئی کے مختلف روپ، ہندستانی زاویہ۔ نظر اور مسائل سے بحث کرتے ہوئے جو انوکھا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ایک اور مضمون میں سر سید احمد خاں کی فکر اور شدید جذبے کو قابل رشک بتایا گیا ہے لیکن جس طرح مولانا الطاف حسین حالی نے سر سید کے سوانح پر مشتمل "حیات جاوید" میں بیان کے جس قدر سقم کو جگہ دی ہے مصنف نے اپنے مضمون میں ان اسقام کو جگہ نہ دیتے ہوئے سر سید کی کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے۔ "ان (سر سید) کو اندیشہ تھا کہ ہندو کی جماعت میں سب ہندو ایک طرف ہو جائیں گے اور مسلمانوں کے خلاف مسلمان جمع ہو جائیں گے۔ یہ سر سید کے فکر کی ایک بڑی کمزوری تھی" (ص ۱۰۹)۔ "مذہب کا تصور، مذہب و اخلاق" کے عنوان سے شامل مضمون میں یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ اودیت، ویدانت اور اسلام کے بنیادی عناصر میں بعض مماثلتوں کی نشان دہی کی

سامنے۔

کتاب کا ایک اور خاص مضمون "جماعت اسلامی، نظریہ اور تحریک" کے عنوان سے شامل ہے۔ دراصل اس کی حیثیت ایک مقالے کی ہے۔ جس میں نہ صرف جماعت کے اصل محرکات، فلسفہ، کارکردگی، دستور اور دیگر جماعتوں سے تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے بلکہ ہر ایک موضوع کو deal کرتے ہوئے جو میانہ روی اور احتیاط ملحوظ رکھی گئی وہ حقیقت پسندانہ کہی جا سکتی ہے۔ "جیسا کہ مودودی کے معترضین بار بار کہتے آئے ہیں، چوں کہ مودودی کا اولین مدعا سیاسی اقتدار حاصل کرنا تھا لہذا انھوں نے اس کے لیے قرآن کی معروف اصطلاحوں کو کھینچ تان کر من مانے مفہوم دینے کی کوشش کی ہے" (ص ۱۲۳)۔ بالخصوص فکر مودودی سے مولانا علی میاں کے اختلافات کی جزئیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "ہندوستان میں اسلامی بنیاد پرستی" کتاب کا دسواں مضمون ہے۔ اس مضمون میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں بنیاد پرستی سے متعلق جو خاص خاص تنظیمیں ابھریں جیسے ندوۃ العلماء، تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی وغیرہ، کے رول سے بحث کی گئی ہے۔ "جہاں تک ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کا سوال ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان جیسے کثیر المذہب معاشرے میں مسلمانوں کا وجود بلاشبہ ایک چیلنج ہے اور جب وہ اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنالیں گے تبھی وہ غیر مسلموں کا دل جیتنے کے قابل اور قومی زندگی میں اپنا صحیح مقام پانے کے اہل ہو سکیں گے" (ص ۱۹۲)۔ کتاب کے آخری مضامین میں "پچھڑے طبقوں اور مسلم اقلیت کے مسائل اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب" کے عنوان سے شامل ہیں، جنھیں مصنف نے موضوع سے متعلق کئی لحاظ، فکر سے لکھے ہیں۔

کتاب کی ابتدا ہی میں مصنف نے علامہ اقبال کا ایک شعر پیش کیا ہے۔ اس شعر کا معنی و مفہوم اس کتاب میں شامل ہر مضمون پر صادق آتا ہے اور پوری طرح صادق آتا ہے:

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ان قومی اور عالمی سیاسی اور مذہبی، تعلیمی، سماجی، اقتصادی اور اعتقادی مسائل پر گہرا فکر کرکے افکار کی ایسی جہان تازہ کی نمود کی گئی ہے جو لائق صد تحسین اور ہم لکھنے والوں کے لیے قابل رشک و قابل تقلید بھی ہے۔ کئی مضامین شدید عرق ریزی پر منتج ہیں "جماعت اسلامی نظریہ اور تحریک" کے عنوان سے لکھا گیا مضمون ۶۷ کتابوں کے حوالے رکھتا ہے۔ یہ کتاب اسلامی ممالک کے انتظام انصرام اسلامی معاملات، مذہبی تحریکات اور غرض مرور ایام اور امتداد زمانہ کے ساتھ بااختیار انسانی فکر کے بدلتے تیور کی بہتر نشان دہ ہے۔

محمد شفیع آگوانی کی پیدائش ۱۹۲۸ء میں اوسے پور میں ہوئی۔ تعلیم راجستھان اور ہالینڈ میں حاصل کی اور اپنے کیریر کا آغاز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔

۱۹۵۷ء میں وہ دہلی کے انڈین اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز میں مغربی ایشیا کے شعبے میں لکچرر مقرر ہوئے۔ وہیں ۱۹۵۹ء میں ریڈر اور ۱۹۶۳ء میں پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں یہ اسکول جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں شامل ہو گیا اور اگلے سال ان کا تقرر چیئر پروفیسر کے عہدے پر ہوا۔ [illegible] سے ۱۹۹۳ء تک وہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ انھوں نے قومی اقلیتی کمیشن کے رکن کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

پروفیسر آگوانی نے گذشتہ پچاس برسوں میں مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے کئی ملکوں کے تعلق سے کئی بار دورہ کیا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں [illegible]
[illegible]

یوسف ناظم

مطالعہ

مت سہل ہمیں جانو

۱۹۹۹ء میں چھپنے والی کتابوں میں "مت سہل ہمیں جانو" ایک توجہ طلب کتاب ہے جس کے مصنف انور ظہیر خاں ہیں۔ چوں کہ ان کی پہلی تصنیف ہے اس لیے انھیں نوجوان مصنف کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ اصل کتاب "سات ادبی شخصیات پر خاکے" ہے۔ مطلب یہ کہ ان سات خاکوں کے علاوہ جو شخصیات کے نہیں بلکہ شخصیات پر خاکے ہیں۔ فاضل مصنف نے صنف خاکہ نگاری کے تعلق سے ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے اور کہا ہے کہ خاکہ نگاری کی صنف ایک پامال اور فراموش کردہ صنف بن کر رہ گئی ہے "…. ایسا معلوم ہوتا ہے یہ مصنف کی سوچی سمجھی رائے ہے بجائے اس کے کہ میں اس رائے کی تردید کروں یہ کہنا پسند کروں گا کہ کم سے کم مصنف نے اس پامال صنف کو فراموش نہیں کیا۔ خاکسار مصنف کی علمی قابلیت اور تنقیدی بصیرت کا بھی بڑی حد تک قائل ہے۔ ادب میں کہیں جمود نہ آجائے اس خیال سے مصنف کی دوٹوک رایوں کی تردید کرنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ لیکن جب خاکسار نے زیرِ نظر خاکوں کا تفصیلی مطالعہ کیا تو اس مطالعے کے خوش گوار اور دل پذیر تاثر نے بہ آواز بلند کہا۔ مقدمے کو بھول جاؤ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مقدمے کو سرے ہی سے نظر انداز کر دیا جائے۔ مصنف نے اپنی رایوں کے اظہار میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا ہے۔ یہ جراءت رندانہ بھی ہے اور زندہ دلی بھی۔ خاکسار کو یہ بہرحال اس "پامال" صنف سے عشق للّٰہی رہا ہے اور تھوڑا بہت یعنی رسمی تعلق بھی۔ زیرِ نظر خاکوں کے مطالعے سے مجھ پر یہ بھی کھلا کہ خاکہ نگاری کے کئی اسلوب ہو سکتے ہیں۔ انور ظہیر نے اپنے لیے ایک نیا اسلوب تلاش کیا ہے اور اس سے وہ مطمئن بھی ہیں۔ ادب میں طمانیت بڑی چیز ہے۔ بہتوں کو یہ حاصل ہی نہیں ہوتی۔

جہاں تک کتاب اور نفسِ کتاب کا تعلق ہے انور ظہیر نے اسے اپنی غیر معمولی محنت، جسے محنتِ شاقہ (حالاں کہ یہ محنت شوقیہ ہوئی ہے) کہا جاتا ہے، مکمل جسمانی اور ذہنی لگن، خلوص اور قلبی وابستگی کی خصوصیات کی بنا پر بے حد پرکشش اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ ایک نشست میں پڑھی جانے والی کتاب نہیں ہے اور نہ ایک مرتبہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ مصنف نے اپنے "محمود حسین" کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اور اپنے مشاہدے، مطالعے اور حافظے کی بوقلمونیت کا دل خوش کن مظاہرہ کیا ہے۔ کہیں کہیں جولانی طبع کی بلند پروازی بھی ہے۔ کہیں رمستانی دھوپ ہے تو کسی جگہ سرِشام کا جھٹپٹا۔ مصنف نے ہر شخصیت کو اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھا ہے اور اپنی پسند و ناپسند کو خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ ظ۔ انصاری کا خاکہ تو کئی انکشافات کا حامل ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ انور ظہیر خاں، ظ۔ انصاری سے کتنے قریب تھے اور ظ۔ انصاری انھیں کتنا عزیز رکھتے تھے۔ (محمود حسین کو گلے لینے کی بات بھی ایک انکشاف ہی ہے)۔ انور ظہیر خاں نے عبارت آرائی سے گریز نہیں کیا ہے اور کہیں کہیں تو عبارت خوب صورت چھے لگے ہیں مثلاً

[illegible]

[illegible] کی [illegible] گئی تھی۔ [illegible] پر [illegible]

[illegible] محبت کی مرحلے نے جکڑ لیا تھا..... مرحوم [illegible] کی تو صدقی منہ ہو گئے تھے "...... (ظ۔ انصاری [illegible] ص ۱۲۳)

انور ظہیر خاں نے مجھے ایسا شبہ ہوتا ہے جملہ بازی کی صنعت کا ایک [illegible] خاکہ [illegible] کے نمونے پر کھول رکھا ہے (یہ صنعت [illegible] ترقی کے زینے طے کرے گی)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے انور ظہیر خاں اپنے مضمون کا تانا بانا تیار کرنے میں کافی وقت صرف کرتے ہیں اور ان کے پاس الفاظ و تراکیب کی یوں بھی کمی نہیں تھی لیکن وہ نئی تراکیب کے وضع کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی رواں دواں تحریر میں اچانک کوئی موڑ یا تاری کے لیے رک جانے کا سگنل آجاتا ہے لیکن تحریر میں کوئی خلا پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا یہ جملہ [illegible] کا سا انداز دیکھیے..... "دھوپ اپنا سنہرا سنہرا ملائم اور جھینی آنچل سمیٹ رہی تھی۔ شام کا چہرہ لمحہ لمحہ کالا ہوا جا رہا تھا۔ شام کی دہلیز سے گزر کر رات کی گداز باہوں میں سما جانے کے لیے ہمک رہا تھا" (ص ۱۴۳)۔ اسی کے ساتھ یہ جملہ بھی دیکھیے "ایک آنکھوں دیکھا واقعہ یادوں کے آسمان پر ٹنگا ہوا ہے" (ص ۱۰۴)۔ کس نے کہا کہ دریا کے دو کنارے مل نہیں سکتے۔

جن شخصیات پر انور ظہیر خاں نے یہ تذکرے نما خاکے لکھے ہیں وہ ہیں ظ۔ انصاری، علی سردار جعفری، اختر الایمان، باقر مہدی، حسن نعیم، عزیز قیسی اور ندا فاضلی..... انور ظہیر خاں نے ان تذکروں میں اپنے ممدوحوں کی ادبی کاوشوں سے متعلق بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور اپنے کہیں گہرے کہیں موقتی اور کہیں رسمی روابط کا تو ذکر کیا ہی ہے، بعض واقعات کسی راوی کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں ورنہ پورا معاملہ "چشم دید" اور موقعہ واردات پر شخصی حاضری کا ہے۔ جو لوگ ان شخصیات سے بذات خود واقف ہیں ان کے لیے ان خاکوں میں بعض باتیں اچنبھے کی ہیں اور جو لوگ ان شخصیات سے "سماجی" طور پر واقف ہیں ان کے لیے اس کتاب میں [illegible] سے زیادہ مسالہ موجود ہے جو چٹپٹا بھی ہے اور بعض جگہ ہری مرچ دانتوں تلے آجاتی ہے۔ انور ظہیر خاں نے اپنی اس پہلی تصنیف کو [illegible] حیثیت دی ہے جو ہمارے خالص مشرقی معاشرے میں نئی نویلی دلہن کو دی جاتی ہے۔ کتاب ظاہری اعتبار سے بھی دل آویز ہے۔ [illegible] رنگ کے سرورق نے اسے گل کدہ بنا دیا ہے اور ان کی تحریر نے ہر پھول میں "گل زر" کی افشاں چھڑک دی ہے۔ (گل زر کی [illegible] خاص خیال رکھا ہے لہٰذا پھول کو پوری طرح کھلنے دیا ہے)۔

مجھے معلوم ہے کہ کتاب کی خاصی پذیرائی ہوئی ہے جس سے خوشی اس بات کی ہوئی کہ ممبئی کے ایک [illegible] کے [illegible] ہے [illegible] کے بعد ایک مصنف پیدا ہوا ورنہ آنکھیں ترستیاں تھیں۔ انور ظہیر خاں بمبئی میں تنہا شخص ہیں جو اپنے آپ کو [illegible] "میں لکھتا ہوں اس لیے [illegible]" سے بہتر ہے جو "[illegible] کے علاوہ کسی اور کو دیکھتا نہیں [illegible]" [illegible]

[illegible] کے ساتھ ادب میں داخل ہوئے [illegible]

[illegible] حاصل کر سکتے ہیں۔

[illegible]

ول ڈیورانٹ [illegible] THE LESSONS OF HISTORY [illegible]

مترجم: [illegible] تاریخ کا سبق — تبصرہ نگار: [illegible]

[illegible] ان کا فلسفہ و تاریخ کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ ان [illegible] ہاتھوں

[illegible] کتابیں انگریزی [illegible] سے [illegible] ہو چکی ہیں اور [illegible]

[illegible] مشہور تصنیف The Story of Philosophy ہے [illegible]

[illegible] اس کتاب کا اردو ترجمہ حکایات فلسفہ کے نام سے احسان احمد نے کیا تھا [illegible]

[illegible] نے اس کتاب کا ترجمہ داستان فلسفہ کے نام سے کیا جو کراچی سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر [illegible] صدیقی

[illegible] نے اس کتاب کے نمونے پر [illegible] (تبصرہ: روزنامہ سیاست، حیدرآباد۔ ۲۸

[illegible] دیگر تصانیف کا بھی اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ جس کی تفصیل [illegible] صاحب نے کتاب کے [illegible]

[illegible] ول ڈیورانٹ اور ان کی رفیقہ حیات ایریل ڈیورانٹ کی مشترکہ تصنیف The Lessons of

[illegible] مترجم نے "تاریخ کا سبق" رکھا ہے۔ [illegible] تقی علی مرزا کے خیال میں "تاریخ [illegible]" [illegible] سکتی ہے

[illegible] (مراسلہ: روزنامہ سیاست، حیدرآباد ۵ مئی ۱۹۸۸ء) — یہ کتاب [illegible] کی تصنیف

The Story of [illegible] کی گیارہ [illegible] جلدوں میں گزشتہ دس [illegible] ہے۔ The Story of [illegible]

[illegible] Our Oriental Heritage کے نام سے [illegible] دوسری جلد

[illegible] Roman [illegible] منظر عام پر آئی [illegible]

[illegible]

روزمرہ کے بر محل استعمال نے ایسی چاشنی پیدا کر دی ہے کہ قارئین اس سارے ترجمے کو دل چسپی سے پڑھ سکتے ہیں۔ میں نے انگریزی متن کے کئی صفحات کا اردو ترجمے سے مقابلہ کیا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ کتاب کی روح اردو ترجمے میں اچھی طرح در آئی ہے اور یقیناً یہ بڑی کامیابی ہے۔"

ہم اپنی زبان کے تخلیقی ادب پر کتنا ہی ناز کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ علمی اعتبار سے اردو آج بھی ایک مفلس زبان ہے۔ مختلف علوم کے ماہرین جن کی مادری زبان اردو ہے، اردو میں لکھنے سے کتراتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مادری زبان سے ان کی واقفیت صرف بول چال تک محدود ہے۔ اگر وہ اپنی زبان میں اظہار کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں تو شاید اس لیے اردو میں لکھنے سے گریز کرتے ہیں کہ اس زبان کے پڑھنے والوں کا حلقہ محدود ہے۔ کوئی مقالہ یا کتاب انگریزی سب لکھتے ہیں تو اس کی پذیرائی ساری علمی دنیا میں ہو سکتی ہے۔ اس صورت حالات میں اردو کو علمی اعتبار سے قابل وقعت بنانے اور اردو دانوں کو گوناگوں علوم سے روشناس کرنے کے لیے ترجموں کی ضرورت اور اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اردو والوں کو باوہاب صاحب اور ان جیسے مترجمین کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ وہ اپنے گراں قدر ترجموں کے ذریعے اردو کے علمی سرمائے میں اضافہ کر رہے ہیں۔

جہاں تک زیر نظر کتاب The Lessons of History کا تعلق ہے یقیناً یہ ایک معلومات آفریں کتاب لیکن مصنفین نے تاریخ سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ ہر جگہ درست نہیں ہیں۔ کہیں کہیں مصنفین کے بیانات میں تضاد بھی ہے جیسے ایک طرف وہ ملوکیت کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں: "تاریخ کے مطالعے سے یوں لگتا ہے کہ ملوکیت ہی سب سے زیادہ فطری طرز حکومت ہے جس میں حکمران طبقے پر انہی اختیارات کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی خاندان میں باپ کو یا پھر کسی جنگ جو قبیلے کے سردار کو حاصل ہوتے ہیں"۔ دوسری طرف وہ جمہوریت کو بہترین طرز حکومت قرار دیتے ہیں: ""جمہوریت کے کھاتے میں سارے جمع و خرچ کا حساب لگانے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی اور طرز حکومت کے مقابلے میں جمہوریت کے فوائد اس سے پہنچنے والے نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں۔ جمہوریت نے انسان کی زندگی میں ایک ایسی چاشنی ہمدردی اور باہمی رفاقت اور دوستی کا ایسا احساس پیدا کر دیا کہ اس کی ساری خرابیاں اور اس کے راستے میں حائل سارے خطرات ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔"

مصنفین لامذہب تو ہیں ہی، انھوں نے انسانی تہذیب کی تاریخ میں مذہب کا جو مثبت رول رہا ہے اسے کم ہی اہمیت دی ہے۔ اہل مشرق اور بالخصوص اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ نہایت تعصب برتا ہے۔ باوہاب صاحب نے حرف آغاز میں اور کتاب کے ضمیمے میں ان امور پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس سے کتاب کے گم راہ کن اثرات بڑی حد تک زائل ہو جاتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں "تشریحات و شخصیات" کے عنوان سے مترجم نے جو باب شامل کیا ہے وہ نہایت مفید ہے۔ اصل کتاب میں جن شخصیات اور واقعات کے حوالے آئے ہیں ان کی تشریح و توضیح اس باب میں کی گئی ہے ان تشریحات کی مدد سے عام قاری کو کتاب کے مطالب کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس کی وجہ سے جیسا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے "یہ ترجمہ اپنی موجودہ صورت میں اصل کتاب سے بھی زیادہ مفید و کارآمد ہو گیا ہے۔"

ο سائز ۱۸/۲۲ ڈیمائی   ο صفحات ۲۲۲   ο قیمت ایک سو پچاس روپے

ο دسمبر ۱۹۹۹ء   ο ناشر یونائیٹڈ بک کارپوریشن، کراچی۔

ο

○ کتاب کا نام: "یادوں کی رہ گزر" ○ مصنف: کے۔ ایس۔ شفیق ○ تبصرہ نگار: مغنی تبسم

کم کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو زندگی کا ایک وسیع اور کشادہ منظر نامہ پیش کرتی ہے اور جو قاری کے ذہن پر اس طرح اثر ہوتی ہیں کہ ان کی مطالعے کے بعد پڑھنے والے کی شخصیت اور فکر و احساس میں قابل لحاظ تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ ایسی ہی ایک کتاب ایم۔ شفیق کی تصنیف "یادوں کی رہ گزر" ہے۔

یہ کتاب کچھ آپ بیتی ہے اور کچھ پر بیتی۔ بہ ظاہر اس مجموعے میں آپ بیتی کے ابواب کے ساتھ متفرق مضامین یک جا کر دے ہیں لیکن مصنف کی شخصیت، اس کا زاویہ نگاہ اور طرز احساس انھیں اس طرح ایک لڑی میں پرو دیتا ہے کہ وہ تسبیح کے دانوں کی یک جا ہو کر ایک وحدت تشکیل دیتے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ایک ایسی انسان دوست شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے جو اپنے مذہبی عقائد میں نہایت پختہ ہے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو تعصب کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ حقیقی سیکولرازم کی مثالیں اس کتاب میں جابجا نظر آئیں گی۔

ابتدائی پانچ ابواب میں مصنف نے اپنی زندگی کے حالات بیان کیے ہیں چھٹے باب میں نگارشات و تراجم کے عنوان سے انھوں اپنے وہ مضامین اور ترجمے یک جا کر دیے ہیں جو مختلف رسائل اور اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین کے موضوعات متنو جن سے مصنف کے مطالعے کی وسعت کے ساتھ گوناگوں سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی اور دابی مسائل سے دل چسپی کا اندازہ ہوتا۔ کے۔ ایس شفیق ماہر معاشیات ہیں، وہ ایسے عہدوں پر فائز رہے جن کا تعلق منصوبہ بندی، دستوری امور اور لیبر مسائل۔ وہ ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ شفیق صاحب کے مضامین سے مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے قرآن کا بھی غائر نظ مطالعہ کیا ہے۔ دورِ حاضر کے مختلف مسائل کا انھوں نے بعض مضامین میں قرآنی نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ مضامین مختصر ہیں اور کی نوعیت اخباری مراسلوں کی ہے۔ اگر وہ اپنی پسند کے کسی موضوع پر مستقل کتاب تصنیف کریں تو اردو کے علمی ذخیرے میں اہم ا ہوگا۔

کتاب کے ساتویں باب "شخصیات" میں مختلف شخصیتوں کے بارے میں تاثرات قلم بند کیے گئے ہیں۔ جن اصحاب کی یاد کی گئی ہے ان میں وہ شخصیتیں بھی ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں جیسے دل سکھ رام، (فینانشیل اڈوائزر آرمی ڈیفنس اینڈ پوسٹ پلاننگ) مخدوم محی الدین، نواب بہادر یار جنگ، محمد رفیع الدین احمد انصاری (چیف جسٹس جموں و کشمیر ہائی کورٹ) پی۔ وی راجو (ڈائرکٹر ناگر جنا انٹرپرائزس) دیو دیا چڈھا (لیبر ونگ نمبر (۲) عہدہ کانٹکس آئیل ریفائنری)، یو۔ بی۔ راگھویندر راؤ آئی۔ اے۔ ایس، ہرمزجی بروزجی فوجدار (ڈی۔ ایس۔ پی)، بلونت راؤ ملہوترا (سپرنٹنڈنٹ پولس) لوکیندر شرما (آئی۔ پی۔ ایس) اور ملا قیصر۔ ز شخصیتوں میں عبدالرحمن انتولے اور شری۔ بی۔ این رامن (سابق چیف سکریٹری حکومت آندھرا پردیش) شامل ہیں۔ ان اصحاب کسی نہ کسی سلسلے میں شفیق صاحب کا ربط رہا۔ انھوں نے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ان کے کردار کی خوبیوں کو اجاگر کیا خاص بات یہ ہے کہ زیادہ تر شخصیتیں غیر مسلم ہیں اس سے شفیق صاحب کی وسیع المشربی کا اندازہ ہوتا ہے۔

شفیق صاحب قدیم حیدرآبادی تہذیب کے دل دادہ ہیں جس کا نمایاں وصف بھائی چارگی اور مذہبی رواداری تھا۔ کے۔ ایم۔ شفیق کو اردو زبان پر قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے یہ مضامین شگفتہ اور دل کش اسلوب میں تحریر کیے ہیں۔ امید ہے کہ اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

○ سائز ۲۰×۳۰/۸ ڈیمائی ○ صفحات : ۲۴۸ ○ اشاعت اول: یکم جنوری ۱۹۹۷ء
○ ناشر: کمرشیل بک ڈپو چار مینار حیدرآباد ۔ ۲ ○ قیمت: ۱۲۵ روپے

○

کتاب کا نام : "دبستان گولکنڈہ کی شاعری میں ہندستانی عناصر"

مصنف : ڈاکٹر عبدالستار ساحر تبصرہ نگار : ڈاکٹر محمد علی اثر

عصرِ حاضر میں دکنی زبان و ادب کا مطالعہ غیر معمولی اہمیت اختیار کر چکا ہے ۔ جنوبی ہند کی جامعات کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کی جامعات میں بھی قدیم دکنی ادب سے متعلق کتابیں شامل نصاب ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ دکنی اردو کے مخطوطات اور مطبوعات کا مطالعہ اور ان کی تنقید اور تفہیم جوئے شیر لانے سے کم نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی ادب کی تحقیق و تنقید کے سلسلے میں موجودہ دور قحط الرجال سے دوچار ہے ۔ ڈاکٹر عبدالستار ساحر قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے دکنی اور دکنیات کو عموماً اور قطب شاہی دور کے شعر و ادب کو خصوصاً اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے ۔

پیشِ نظر کتاب ڈاکٹر عبدالستار ساحر کا پی ایچ ۔ ڈی کا مقالہ ہے جسے انھوں نے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی نگرانی میں سپردِ قلم کر کے ، ایس ۔ وی ۔ یونیورسٹی تروپتی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تھی ۔ کتابی صورت میں شائع کرتے ہوئے انھوں نے اس مقالے میں ترمیم و اضافے بھی کیے ہیں ۔ اس کتاب سے قبل ڈاکٹر ساحر کی ایک اور کتاب "محمد قلی کی شاعری میں ہندستانی عناصر" شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے ۔

زیرِ نظر کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے ۔ پہلے باب میں ہندستانیت کے معنی و مفہوم کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے مصنف نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "ہندستانیت ایک ادبی اور فلسفیانہ تصور ہے جو برِصغیر کی نت نئی تہذیبوں کے میل ملاپ معاشرتی بندھنوں اور معاشرتی رابطوں سے جنم لیا ہے اور مجموعی طور پر ہندستانیت کا ظہور مسلمانوں اور ہندوؤں کے لسانی اور تہذیبی اختلاط کا نتیجہ ہے ۔"

دوسرے باب میں اردو شاعری میں ہندستانی تہذیبی عناصر کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اردو شاعری ، ہندستانی عناصر سے ہر دور میں مالا مال رہی ہے ۔

تیسرا باب دکن میں اردو شاعری کے آغاز و ارتقا سے متعلق ہے ۔ اس باب میں اردو زبان و ادب کے ارتقا کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے بہمنی ، قطب شاہی ، عادل شاہی اور مغلیہ دور کے دکنی شعرا کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

چوتھا باب دبستانِ گولکنڈہ کے عمومی جائزے پر مبنی ہے ، جس میں ابتداء قطب شاہی سلاطین کی سرگرمیوں اور شعر و ادب کی سرپرستی کا حال قلم بند کیا گیا ہے اور پھر اس عہد کے تمام شاعروں اور نثر نگاروں کے ادبی کارناموں کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے ۔

پانچواں باب پیشِ نظر کتاب کے لب لباب کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس میں قطب شاہی دور کی تہذیب و معاشرت کا سیر حاصل جائزہ لیتے ہوئے مقامی رہن سہن کے طور طریقوں ، رسوم و رواج ، آرائش و زیبائش اور عقائد و توہمات کی نشان دہی کرتے ہوئے ڈاکٹر ستار ساحر نے بالکل درست لکھا ہے کہ "گولکنڈے کے شاعروں کے کلام میں ہندستانی عناصر پوری آب و تاب اور اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں ۔"

ڈاکٹر عبدالستار ساحر نے پیشِ نظر کتاب میں بڑی خوش اسلوبی اور ہنرمندی سے اپنے موضوع کا احاطہ کیا ہے ۔ ان کا اندازِ بیان سلجھا ہوا اور موثر ہے اردو زبان و ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب قابلِ مطالعہ ہے اور دکنی ادب کے تحقیقی اور تنقیدی سرمائے میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے ۔

o سائز ۱/۸ ڈیمائی   o صفحات: ۲۶۶   o سنہ اشاعت: ۱۹۹۷ء   o قیمت: ۱۲۰ روپے

o

o کتاب کا نام: "لہو کی آنچ"   o مصنف: علی احمد جلیلی   o تبصرہ نگار: وقار خلیل

ڈاکٹر علی احمد جلیلی بہ حیثیت شاعر، نثرنگار اور بہ اعتبار شخصیت اردو تہذیب اور کلاسیکی مزاج سے عبارت فرد ہیں۔ فصاحت جنگ جلیل کے فرزند دل بند ہونے کے ناطے ان کے فکر و فن میں ایک طرح کی تہذیب اور رکھ رکھاؤ ملتا ہے جو انھیں ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔

علی احمد جلیلی کی غزلیہ شاعری کا یہ مجموعہ کلام "لہو کی آنچ" آج کے ماحول اور بنتے بگڑتے معاشرے اور عہد ناتمام کی سماجی بھری حقیقتوں کی تعبیر و تصویر پیش کرتا ہے۔ علی احمد جلیلی صاحب نے اپنی اس غزلیہ شاعری میں زبان و بیان کی سلاست اور نزاکت پیش نظر رکھتے ہوئے قدیم کلاسیکی روایات کی پاس داری بھی کی ہے۔ ان کی غزلوں میں نئی اور مروجہ تخلیقی شعور کی حامل شاعری کے امکانات بھی اپنا تاثر چھوڑتے ہیں۔

زندگی جینے کے آداب اور امکانات کی جھلکیاں ان کی غزلیہ شاعری میں جہاں جہاں روشن نظر آتی ہیں، اشعار مزہ دے جاتے ہیں

اگر آجائے جینے کا سلیقہ — تو اک لمحہ بھی جینے کا بہت ہے
سورج طلوع ہو تو حقیقت مری کھلے — وہم و گماں کی دھند میں لپٹا ہوا ہوں میں
روشنی وہ مرے ضمیر کی تھی — دیر کا تھا دیا نہ شمعِ حرم
چاند سورج تراشنے والو! — ہم کو بھی روشنی ذرا دے دو

روایتی غزل کے بیش تر مضامین کو علی احمد جلیلی نے ذرا نئے انداز اور کسی قدر نئے لہجے میں نظم کرنے کی سعیِ مشکور کو بھی اپنی فکر کا حصہ بنایا ہے اور ایسے شعر بھی کہے ہیں:

خوب صورت کوئی سزا دے دو — مجھ کو جینے کی بد دعا دے دو
چھین لو مجھ سے یہ محل میرے — سانس لینے کو کچھ ہوا دے دو
آپ چادر تان کر سوتے رہے — شہر میں بد نام ہم ہوتے رہے

تقریباً ایک سو تیس غزلوں پر مشتمل مجموعہ، کلام کی بیش تر ابیات غزلیہ شاعری کے باذوق قاری کے لیے سرمایہ انبساط ہیں۔

o سائز ۱/۸ ڈیمائی   o کارڈ بورڈ سرورق   o سنہ اشاعت: ۱۹۹۶ء   o قیمت: ۶۰ روپے

o ملنے کا پتہ: جلیل منزل 22-1-733/1 سلطان پورہ، حیدرآباد - 500024

o

o کتاب کا نام: "بہار میں اردو طنز و ظرافت"   o مرتبہ: سلطان آزاد   o تبصرہ نگار: وقار خلیل

زندہ دلانِ پنجاب کے بعد ایک اور ادارہ "زندہ دلانِ حیدرآباد" بھی آزادی کے بعد علمی و تہذیبی حلقوں میں اپنی سرگرمیوں کے باعث فعال کردار کا حامل رہا ہے۔ دہلی، بمبئی اور لکھنؤ میں بھی فکاہی ادب نے اپنے طور پر خود کو منوایا۔ اسی طرح صوبہ بہار میں بھی طنز و مزاح سے عبارت تحریروں اور تقریبوں نے زندگی اور زندہ دلی کے امکانات کو روشن کیا ہے۔

زیر نظر کتاب "بہار میں اردو طنز و ظرافت" بہار کے جواں سال نثر نگار سلطان آزاد کی تالیف ہے۔ تذکرہ نما اس گلدستہ نظم و نثر میں صوبہ بہار کے ... ساتھ یک جا کیا گیا ہے۔

صوبہ بہار کے طنز و مزاح لکھنے والوں میں یگانہ چنگیزی، سریر کابری، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، رضا نقوی واہی، فضل امام اقف، مظہر امام کے ساتھ ساتھ نثر نگاروں میں شین مظفر پوری، ڈاکٹر نذر امام، احمد جمال پاشا، وہاب اشرفی، اعجاز علی ارشد اور سلطان آزاد ایسے قلم کار بھی شامل ہیں۔

اس تذکرے میں ایک مکمل اور جامع مقالہ بہار میں اردو طنز و ظرافت بھی شامل ہے۔ جس کی شمولیت سے اس تذکرے کی ادبیت اور اہمیت کو چار چاند لگے ہیں۔

○ سائز ۸/۱ ڈیمائی مجلد معہ گرد پوش ○ صفحات: ۱۲۸ ○ سنہ اشاعت: ۱۹۸۹ء ○ قیمت: ۵۰ روپے

ناشر: مکتبہ آزاد، پتولائین، گلزار باغ پٹنہ (بہار) 800007

○

کتاب کا نام: "اردو بک ریویو" دہلی ○ مئی، جون ۱۹۹۷ء ○ تبصرہ نگار: وقار خلیل

اخبارات اور رسائل میں عموماً اردو کی نئی مطبوعات پر تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں، جن سے کتابیں خرید کر پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ویسے کتابوں پر مبسوط تبصروں پر مشتمل رسالے بھی شائع ہوتے رہے، جن میں کتابیں (ماہنامہ۔ حیدرآباد) ، ... تبصرے (دہلی) اور کتاب نما (دہلی) اپنی مشمولات کے باعث یاد آ رہے ہیں۔ زیر نظر ماہنامہ "بک ریویو" جو پابندی سے دو ماہی ... اشاعت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، ایک وسیع منظر نامے کا حامل، مفید اور معلومات آفریں جریدہ ہے جس کے مشاورتی بورڈ میں ... خلیق انجم، ڈاکٹر عبد المغنی، ڈاکٹر منور حسین اور محمود عالم کے نام شامل ہیں۔ عصرِ حاضر میں اردو بک ریویو کے اداریے عموماً اردو میں تصنیف و تالیف، ناشرین کے مسائل اور اردو کتابوں سے اکیڈمیوں، اشاعتی اداروں اور اردو پڑھنے والوں کے وسائل و مسائل اور ... اداروں کی سرد مہری جیسے حل طلب امور پر توجہ اور امکانات کے جائزے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہند و پاک کی تقریباً درجن بھر نئی مطبوعات پر مشہور مبصرین سے تبصرے لکھوائے جاتے ہیں یا پھر دیگر اخبارات و رسائل سے شکریے کے ساتھ نقل کیے جاتے ہیں ... کی اشاعت پر مختصر اور معلوماتی مضامین بھی اس رسالے کا نمایاں وصف ہیں۔ ملک کی جامعات سے ایم۔ فل، ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی میں کامیاب امیدواروں کی موضوعات سے منسلک فہرست بھی ہر اشاعت میں شامل رہتی ہے۔ علاوہ ازیں علمی و ادبی رسائل و جرائد ... مطبوعہ اہم مقالات کی تفصیلات بھی درج کی جاتی ہیں۔ اس سلسلے کو مفید اور مکمل بنایا جانا ضروری ہے۔ اہم اور ادبی رسائل کی ... کی طرف توجہ بھی ضروری قرار پاتی ہے۔ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے ماہ نامہ "سب رس" کی مشمولات کسی پرچے میں نظر ... نہیں گزریں حالاں کہ سب رس پابندی سے بک ریویو کو تبادلے کی اساس پر بھیجا جاتا رہا ہے۔ بک ریویو کا ایک اہم کالم ادبی خبریں ... یات اور موصولہ کتب بھی ہے۔ اس کالم کو بھی ذرا سی توجہ اور محنت سے وسیع اور مکمل بنایا جا سکتا ہے۔

مجموعی طور پر "اردو بک ریویو" اردو والوں کے لیے ایک معلوماتی گلدستہ ہے اس کی خریداری اردو والوں کے لیے ادب شناسی کی مظہر ہوگی۔

○ سائز ۸/۱ ڈیمائی مجلد معہ گرد پوش ○ صفحات: ۹۴ ○ سنہ اشاعت: ۱۹۸۹ء ○ قیمت: ۲۰ روپے

ملنے کا پتہ: 739/3 نیو کوہِ نور ہوٹل ۔ پٹوڈی ہاؤس دریاگنج ۔ نئی دہلی 110002

O

O کتاب کا نام: "تجلیات" (شاعری) مدنا منظر O اشاعت: ۱۹۹۳ء O تبصرہ نگار: وقار خلیل

ڈاکٹر کے مدنا منظر نے عثمانیہ یونیورسٹی سے یم بی بی یس اردو ذریعہ تعلیم سے کیا ۔ ان کے ہم مکتب عثمانین میں ڈاکٹر چنا ریڈی ، سابق گورنر تامل ناڈو اور ممتاز ادیب اور سیاسی رہنما ڈاکٹر راج بہادر گوڑ قابلِ ذکر ہیں ۔ جامعہ عثمانیہ اور قدیم ریاست حیدرآباد کے ادب اور تہذیبی نیز لسانی ماحول کے پروردہ ہونے کے باعث ان کی شخصیت اور شاعری میں سیکولر روایات اور رجحانات کے ساتھ ساتھ اگلے وقتوں کے بزرگوں کی صفات نمایاں ہیں مدنا منظر ، اردو ہی نہیں کنڑ ، ہندی اور انگریزی زبانوں میں بھی شعر کہتے ہیں ۔ ہندی اور انگریزی میں ان کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔ اردو میں بھی اب سے دس سال پہلے منظر صاحب کے پانچ شعری مجموعے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں ۔ زیرِ نظر مجموعہ کلام ان کی اردو شاعری کا کلیات ہے ۔

اس مجموعے کا آغاز حمد یا نعت اور پھر منقبت خواجہ بندہ نوازؒ سے ہوا ہے ۔ منظر کی نعتیں ہوں کہ غزلیں یا پھر گیت سب مجموعی طور پر صوفیانہ انداز روشن نظر آتا ہے ۔ فکر میں فلسفیانہ جذبات بھی تاثر چھوڑتے ہیں ۔ بہ قول ڈاکٹر راج بہادر گوڑ "ڈاکٹر مدنا تصوف کے اس گلشن کے خوشہ چیں ہیں ، جہاں رام اور رحیم ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں " زندگی ، ماحول اور معاشرے کی بدلتی قدروں پر منظر کی فکرِ سخن سادگی اور سلاست کے تناظر میں خوب صورت اشعار سے قاری کو متاثر کرتی ہے ۔ قومی جذبات کی پذیرائی کی نظموں میں اپنا تاثر چھوڑتی ہے ۔ چند اشعار پڑھیے اور منظر کی سخن وری کی داد دیجیے:

کس کو معلوم تھی منظر یہ حقیقت تیری
ڈاکٹر ہوتے ہوئے صاحبِ عرفاں ہوگا

کبھی ظلمت میں بھی اک روشنی دیکھی ہے منظر
یہ کیسا نور سا رقصاں پسِ دیوار ہے ساقی

عرفانِ حسن ، ذوقِ جنوں ، سرِ بے خودی
تحفہ ہے سب یہ دوست ترے التفات کا

جو دیا تو نے دیا جو لیا تو نے لیا
کیا حسابِ زندگی بتلاؤں کیا رکھتا ہوں میں

پابندیِ حیات میں کیسے جئیں گے وہ
دو دن کی زندگی میں جو سو بار مر گئے

کہاں ہے جنونِ محبت کی آندھی
یہاں تو خرد کا ابھی نقشِ پا ہے

O سائز ۸/۱ ڈیمائی کارڈ بورڈ سرِورق O صفحات: ۲۲۴ O سنہ اشاعت: ۱۹۸۳ء O قیمت: ۶۰ روپے

ناشر: شری پربھو پرکاش 656.I اسٹیج ۔ اندرانگر ، بنگلور 560038 (کرناٹک)

O

کتاب کا نام: "الماس ربا" (مجموعہ رباعیات) ساغر جیدی O اشاعت: ۱۹۹۷ء O تبصرہ نگار: وقار خلیل

ساغر جیدی آندھرا پردیش کے خوش فکر سخن ور ہیں ، جدید اور عصری لب و لہجے کے اس شاعر کی اب تک پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں غزلیہ شاعری ، دوہے مشہور ہیں ۔ ساغر نے علیم صبا نویدی کے اردو ہائیکو کا تلگو ترجمہ بھی شائع کیا تھا ۔

"الماس ربا" میں ساغر کی ۲۸۸ رباعیات شامل ہیں ۔ صنفِ رباعی میں ساغر کی فکر رسا روشن نظر آتی ہے ۔ اس صنف کی توسیع ساغر نے امجد حیدرآبادی کی روایاتی صالح اقدار کو رہ نما بنایا ہے اور عصرِ حاضر کی زندگی اور نیز انسان کی ذہنی ، نفسیاتی اور معاشی مسائل

کشمکش پر روشنی ڈالی ہے۔ بہ قول علیم صبا نویدی "ساغر کی رباعیات اختصار لفظی، ایجاز بیان اور اثر سخن پر دال ہیں" بلاشبہ وہ اپنی رباعیات کے بین السطور میں حیات و کائنات کے اسرار و رموز اور نشیب و فراز سے واقف نظر آتے ہیں اور معاشرے میں پروان چڑھنے والے خیر و شر کے بارے میں ایک سوچنے والا نظریہ اور تڑپنے والا جذبہ رکھتے ہیں۔

چند رباعیات پڑھیے، خوب ہی نہیں بہتر اسلوب و اظہار کی حامل ہیں:

جنگلی تتلی کی رعنائی ہوں میں
پیاسی مکڑی کی دانائی ہوں میں
ساغر ہر زاویے سے مجھ کو پہچان
شاعر کے قلم کی روشنائی ہوں میں

ooo

قریوں سے تباہی کی سند ملتی ہے
شہروں سے فسادات کی حد ملتی ہے
ہر لمحہ، ضرورت کے مطابق ساغر
بارود کو شعلوں کی مدد ملتی ہے

ooo

بے وجہ کوئی کسی سے کب ملتا ہے
اپنی ہی غرض سے روز و شب ملتا ہے
مطلب کی ہے آشنا جہاں کی ہر شے
دو گھونٹ ملیں تو لب سے لب ملتا ہے

سائز ۸/۲۰ ڈیمائی کارڈ بورڈ سرورق کتابت طباعت اور کاغذ معیاری o صفحات: ۱۱۲ o قیمت: ۶۰ روپے

o سنہ اشاعت: ۱۹۹۷ء o بہ اعانت آندھرا پردیش اردو اکیڈمی

ناشر: تامل ناڈو اردو پبلی کیشنز 26 امیر النسا بیگم اسٹریٹ۔ چنائی (مدراس) 600002

oo ooo oo

سلسلہ ص ۴۵)

(۱۹۸۹ء) Fundamentalism in India (۱۹۹۵ء) Islamic Contemporary West As
ملکی اور۔ شامل ہیں (۱۹۶۹ء) Communism in the Arab East اور (۱۹۶۸ء) Politics in the G
ل جرائد میں ان کے پچاس سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

ہر آنند پبلیکیشن پرائیویٹ لمیٹیڈ، نئی دہلی کی جانب سے ڈمائی سائز عمدہ اور نفیس کاغذ پر دیدہ زیبی کے ساتھ چھاپی گئی ۱۹۰ صفحات پر ل اس تصنیف کی قیمت ۱۵۰ روپے رکھی گئی ہے۔ جی A، 364 - چراغ دہلی۔ نئی دہلی 1100017 ہر آنند پبلیکیشن سے حاصل کی لتی ہے۔

o o o

نتائج امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اُردو، منعقدہ جون ۱۹۹۷ء

اُردو ماہر: درجہ اول بہ لحاظ رول نمبر۔ ۵۰، ۷۵، ۸۷، ۱۱۴، ۱۵۷، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۸۳، ۱۹۰، ۲۱۸ درجہ دوم۔ ۱ تا ۱۱، ۱۵ تا ۱۹، ۲۳ تا ۲۸، ۳۳ تا ۳۵، ۳۷ تا ۴۲، ۴۴، ۴۶ تا ۴۸، ۵۱ تا ۶۷، ۶۹، ۷۲ تا ۷۴، ۸۱، ۸۳ تا ۸۶، ۸۸ تا ۹۰، ۹۲، ۹۵ تا ۱۰۰، ۱۰۲ تا ۱۱۵، ۱۱۹ تا ۱۲۱، ۱۳۴ تا ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۵۱، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۷، ۱۸۵، ۱۸۸، ۱۹۲، ۱۹۶، ۱۹۹ تا ۲۰۲، ۲۰۶، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۴۰ تا ۲۴۲ درجہ سوم۔ ۳۹، ۴۰، ۴۵، ۶۸، ۷۱، ۷۶، ۹۱، ۱۴۴، ۱۴۷، ۱۶۲، ۱۹۵ درجہ تکمیل۔ ۱۵۰، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۱۱، ۲۳۲۔

اُردو عالم: درجہ اول بہ لحاظ رول نمبر ۱۳۹، ۲۵۸۔ درجہ دوم۔ ۱ تا ۷، ۹ تا ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۶، ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۸، ۲۹، ۳۱ تا ۳۸، ۴۱، ۴۳، ۴۴، ۴۷، ۴۹ تا ۵۳، ۵۵ تا ۵۸، ۶۰، ۶۱، ۶۴ تا ۶۸، ۷۰، ۷۱، ۸۲ تا ۸۶، ۸۸ تا ۹۳، ۹۵ تا ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵ تا ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۱۷، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۶ تا ۱۳۸، ۱۴۲، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۸ تا ۱۶۰، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۷، ۱۶۸، ۲۱۷، ۲۲۳، ۲۲۵، ۲۴۵، ۲۴۸، ۲۶۵، ۲۶۹۔ درجہ سوم۔ ۱۲، ۱۵، ۱۶، ۱۹، ۲۲، ۲۴، ۲۶، ۴۰، ۴۵، ۴۶، ۴۸، ۵۴، ۵۹، ۶۲، ۶۳، ۷۳ تا ۸۱، ۸۷، ۱۰۴، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۲، ۱۱۴ تا ۱۱۶، ۱۱۸ تا ۱۲۰، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۵، ۱۴۴، ۱۵۰، ۱۶۶، ۱۹۶، ۲۲۲، ۲۲۷، ۲۳۷، ۲۶۰۔ تکمیل۔ ۸۲، ۱۲۲، ۱۵۵، ۱۶۵، ۲۵۲، ۲۳۲

اُردو فاضل: درجہ اول بہ لحاظ رول نمبر۔ ۸۳، ۱۳۷۔ درجہ دوم۔ ۱ تا ۷، ۹ تا ۱۵، ۱۷، ۲۰، ۲۳ تا ۲۵، ۳۱ تا ۳۵، ۴۱، ۷۰، ۷۵، ۷۶، ۸۰، ۸۱، ۸۴ تا ۸۷، ۸۹، ۹۰، ۹۳، ۹۵ تا ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۰۷، ۱۰۹، ۱۱۱ تا ۱۲۸، ۱۳۳ تا ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۴۹، ۱۵۱ تا ۱۵۴، ۱۵۸ تا ۱۶۱، ۱۶۳ تا ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۶۹ تا ۱۷۷، ۱۷۹، ۱۸۱ تا ۱۸۴، ۱۹۰، ۱۹۲ تا ۱۹۴، ۱۹۶ تا ۱۹۹، ۲۱۲، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۴، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۳۱، ۲۳۴، ۲۳۸، ۲۵۰، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۶۴، ۲۶۶، ۲۷۰ تا ۲۷۲، ۲۸۰، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۵، ۲۸۷ تا ۲۸۹، ۲۹۴، ۲۹۸، ۳۰۰، ۳۰۳، ۳۰۷ تا ۳۰۹، ۴۰۲ تا ۴۰۸، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۴ تا ۴۲۳، ۴۲۵، ۴۲۷ تا ۴۳۹، ۴۴۱، ۴۵۴، ۴۵۷ تا ۴۶۴، ۴۶۷ تا ۴۷۴، ۴۷۶، ۴۷۸ تا ۴۹۳، ۴۹۶، ۴۹۸، ۵۰۰ تا ۵۰۲، ۵۵۵ تا ۵۶۰، ۵۶۳ تا ۵۶۴، ۵۶۸ تا ۵۷۰۔ درجہ سوم۔ ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۱۸۰، ۱۸۹، ۲۱۰، ۲۱۵، ۲۲۹، ۲۳۷، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۴۵، ۲۵۱، ۲۶۱، ۲۶۹، ۲۷۸، ۲۹۱، ۲۹۳، ۳۰۲، ۴۰۱، ۵۹۱۔ تکمیل۔ ۷۹، ۱۰۳، ۱۶۸، ۳۲۵، ۳۵۵، ۴۱۰، ۵۰۵ تا ۵۰۷، ۵۰۹، ۵۱۳ تا ۵۱۴، ۵۱۶ تا ۵۲۰، ۵۲۲، ۵۲۹، ۵۳۱، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۷، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۵، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۶۱۔ کامیاب پارٹ I : ۱۴، ۳۱۵ تا ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۳ تا ۳۳۵، ۳۳۸ تا ۳۴۰، ۳۴۲، ۳۴۴ تا ۳۵۴، ۳۶۱، ۳۶۳، ۳۶۵ تا ۳۷۱، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۸۰، ۳۸۲، ۳۸۴، ۳۸۹ تا ۳۹۱، ۳۹۶ تا ۳۹۸، ۴۰۰۔

مرزا اکبر علی بیگ

(معتمد شعبۂ امتحانات)

سنِ اجراء : ۱۹۳۸ء

فون : 3310469

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۵۹ — جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۹۷ء — شمارہ : ۷، ۸، ۹

مغنی تبسم

معاونین

غلام جیلانی — بیگ احساس

سعودی عرب میں ہمارے نمائندے

- خورشید ارسلان : P.O.Box. No. 71 Riyadh -11411
- سلیم فاروقی : اردو اکیڈمی جدہ فون : 6855698
- شریف اسلم : بزمِ اردو جدہ

اس خصوصی شمارے کی قیمت : فی رسالہ Rs. 30=00

فی پرچہ : ۱۰ روپے

زرِ سالانہ : ۱۰۰ روپے

کتب خانوں سے : ۱۲۵ روپے

مشرقِ وسطیٰ اور امریکہ : ۲۵ ڈالر

پاکستان، برما، سری لنکا و بنگلہ دیش : ۱۶ ڈالر

انگلستان : ۱۵ پونڈ

ناشر : اِدارہ، اَدبیاتِ اُردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۸۲ (اے۔ پی) انڈیا۔

کمپیوٹر کتابت : جے جے۔ کمپیوشن ..مہدی پٹنم۔ حیدرآباد۔ ۲۸

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے او۔ ایس۔ گرافکس ملاپ گوڑہ میں طبع کروا کے ادارہ ادبیاتِ اردو سے شائع کیا

اس شمارے میں

مضامین

مطالعے

نظمیں

غزلیں

افسانے

پہلی بات

سب رس کی اشاعت میں بہ وجوہ تاخیر ہوئی ۔ ہم چاہتے تھے کہ " محبوب حسین جگر نمبر " اور " تہنیت النساء بیگم زور نمبر " جلد شائع کریں لیکن بعض مضامین کے انتظار میں ان کی اشاعت کو ملتوی کرنا پڑا ۔ سب رس کا یہ عام مشترکہ شمارہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس کی ضخامت میں اضافہ کیا گیا ہے تاکہ سب رس کے معاونین کو شکایت نہ ہو ۔

سب رس کے معاونین کو جن کا زرِ سالانہ ختم ہوچکا ہے کئی بار یاد دہانی کی گئی ۔ سب رس ان کے نام پابندی کے ساتھ ارسال کیا جا رہا ہے ۔ ہماری درخواست ہے کہ وہ توجہ کریں ساتھ ہی ساتھ سب رس کی توسیع اشاعت میں دل چسپی لے کر ہماری مالی مشکلات کو دور کرنے میں مدد کریں ۔

(ادارہ)

اختر حسن

یادوں کی سیر گاہ

(چوتھی قسط)

بہمنی سلطنت اور قلی قطب شاہ کے زمانے سے لے کر آصف جاہی دور تک کی جو چھ سو سال کی تاریخ تھی، حیدرآباد کی اپنی جو ایک شائستہ تہذیب تھی۔ ختم ہوگئی۔ ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں ایک شاہی یا ایک دور کے خاتمے کے ساتھ دفعتہً تہذیبی اقدار ختم نہیں ہوجاتیں مگر دراصل تہذیبی انحطاط و زوال کے آثار آصف جاہی دورِ آخر سے ہی نظر آنے لگے تھے۔ قطب شاہی دور میں تہذیب کی جو بلند و ارفع اقدار بن تھیں جیسے آپسی اتحاد یگانگت۔ بلاتفریق مذہب و ملت ایک ملی جلی معاشرت، اس میں بہ تدریج آصف جاہی دور آخر سے ہی رخنے پڑنے لگے تھے۔ علم و فن میں، فنِ تعمیر میں مقامی اور بیرونی امتزاج سے جو نیا حسن پیدا ہوا تھا، گنبدانِ قطب شاہی جس کے زبانِ حال سے گواہ ہیں، اس میں بھی انحطاط رونما ہورہا تھا۔ بہ ظاہر آپسی میل ملاپ اب بھی جاری تھا مگر دلوں میں جو مذہبی جنون گھر کر رہا تھا وہ آزادی کے بعد ابھر کر سامنے آرہا تھا اور ہندوؤں کے دلوں میں یہ احساس جاگ رہا تھا کہ اب تک ان کو Neglect کیا گیا تھا۔ بے شک عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام اور اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جانا ایک بہت مستحکم اقدام تھا لیکن میں کہتا ہوں اگر حضور نظام واقعی یہ مانتے تھے کہ ان کی حکومت کی ایک آنکھ ہندو اور دوسری آنکھ مسلمان ہے تو کیوں انھوں نے اردو یونیورسٹی کے ساتھ یہاں ایک تلگو یونیورسٹی بھی قائم نہیں کی اور کیا یہ امرِ واقعہ نہیں کہ نظام کے زمانے میں دوسرے فرقے کے لوگوں کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کیا گیا ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا ا، ۱۸۸۰ء میں یہاں مسلمانوں کے صرف دو اور ہندوؤں کا ایک اسکول تھا اور تعلیمی بجٹ سب سے کم ہوتا تھا۔ اس وقت سرسید کی تحریک بہت بڑھ گئی تھی اور اس سے بنگالیوں نے بہت استفادہ کیا مگر حیدرآباد میں اس تحریک کے بہت کم اثرات نظر آتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ دکن کے مسلمان تعلیمی لحاظ سے بہت پیچھے رہے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آصفیہ حکمرانوں نے اکثریت اور اقلیت کے درمیان جو توازن برقرار رکھنا چاہیے تھا اس پر توجہ نہیں کی۔ چند ایک افراد جیسے سر راس مسعود وغیرہ نے اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی مگر نظام نے اس کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ صفات جو قطب شاہوں میں تھیں آصفی حکمرانوں میں خاص طور سے نظام میں باقی نہیں رہی تھیں، ان کی شاہی بالکلیہ ایک مجہول قسم کی شاہی تھی جس کی قوت نمو مرچکی تھی۔ عثمان علی خان کے زمانے میں آخر آخر میں یہاں کچھ ہلچل پیدا ہوئی۔ بیسویں صدی شروع ہوچکی تھی اور پوری دنیا کے حالات بدل رہے تھے۔ سائنٹفک علوم کا چرچا بڑھ رہا تھا۔ مشرق وسطیٰ بھی جاگ رہا تھا اس کے اثرات لازماً دکن پر بھی پڑے اور عثمان علی پاشا کو کچھ مشیر بھی اچھے ملے تو اس زمانے میں یہاں کچھ ترقی ہوئی۔ تو خیر آئیے اب پولیس ایکشن کے بعد کی کچھ باتیں کریں۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو پولیس ایکشن ہوا۔ اسی دن میں ۸ دن کی روپوشی کے بعد گھر آیا تو عجیب سماں

دیکھا ۔ میرا شہر ، میرے خوابوں ، میری آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ حسین گہوارہ جس کے دامن میں میری زندگی نے فراغت و آسودگی ، محبت و دل نوازی کے بہترین ماہ و سال بسر کیے تھے اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر میں دم بہ خود رہ گیا ۔ اس کے گلی کوچے سنسان تھے ۔ ہر طرف ایک ہو کا عالم ۔ لوگوں نے کسی نامعلوم خوف سے سہم کر اپنے گھروں کی بتیاں بجھادی تھیں ۔ ہر طرف اندھیرا تھا سوائے ملے پلی کے ہمارے گھروں کے ۔ ۔ ۔ رات ہم سب رابعہ برنی کے آنگن میں جمع تھے اتفاق سے گپتا صاحب ، ڈاکٹر حسین ظہیر اور ڈگمبر راؤ بندو بھی آگئے (جو بعد میں حیدرآباد کی پہلی عوامی حکومت کے وزیرِ داخلہ بنے) دیر تک ہم سب یہی باتیں کرتے اور سوچتے رہے کہ اب حالات کی اس کایاپلٹ میں ہمیں کیا کرنا ہوگا ؟

حیدرآباد کی تاریخ میں جو یہ تبدیلی آئی تھی وہ ہماری نظر میں تو ہونے والی بات تھی ۔ معمولی سیاسی بصیرت رکھنے والا بھی سوچ سمجھ سکتا تھا کہ یہی ہوگا مگر ہمارے نادان دوستوں نے اس کو نہیں سمجھا جس کا نتیجہ آج ان کے سامنے تھا ۔ ۔ ۔ دفعتاً پانسہ پلٹ گیا تھا اور وہ حیران و ششدر سہمے ہوئے تھے کہ اب کیا ہوگا ، ہمارے مخالف ہمارے محلے کے مسلمان سب ، اب ہمارا منھ دیکھ رہے تھے ۔ ہم سے رجوع ہو رہے تھے کہ اب کیا کریں ؟

دوسرے دن صبح ہی صبح آغاپورہ ، ملے پلی ، آصف نگر کے سینکڑوں نوجوان میرے گھر آئے کہ " بتلایئے اب ہم کیا کریں ؟ ہمارے رہنماؤں نے بڑا دھوکا دیا ہمیں ؟ ہم نے بے شک آپ کے خلاف بہت باتیں کیں مگر ہماری اس میں کوئی خطا نہ تھی ۔ ہمارے لیڈروں نے جیسا ہم سے کہا وہی ہم نے کیا ۔ انھوں نے کچھ ایسے سبز باغ دکھائے کہ ہم سب ان کے چکر میں آگئے ، بہت دکھ اٹھانے پڑے ہم کو کتنے ہی ہمارے ساتھی سب مارے گئے ، بھائی ، باپ ، چچا ، دوست ، اب ہم کیا کریں ؟ کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ؟ " بڑی درد انگیز داستانیں تھیں ان کی ۔ ہم کیا کرسکتے تھے سوائے اس کے کہ ان کو تسلی دیں اور امن کمیٹیاں قائم کریں ۔ چناں چہ ہم نے جگہ جگہ امن کمیٹیاں قائم کیں اور ان میں زیادہ تر مقامی لوگوں کو رکھا اور محلے محلے میں میٹنگیں کرتے تھے اور لوگوں کو سمجھاتے تھے ۔ حتی الامکان ان کو تسلی دینے اور ان کا حوصلہ بنائے رکھنے کی کوشش کرتے ۔ اضلاع کے بھی دورے کیے اور وہاں بھی امن کمیٹیاں بنائیں ۔ پولیس ایکشن کی تباہی کے بعد ہمارے سامنے امن و امان قائم رکھنے کا یہی ایک راستہ تھا ۔ اسی طرح حالات پر کچھ قابو پایا جاسکتا تھا ۔ اور بھی بہت لوگ اس طرح کام کر رہے تھے اور میں پیام کے ذریعے بھی لوگوں کو ایک صاف نیا راستہ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا ۔ اسی زمانے میں ایک دن میں دفتر میں تھا کہ چپراسی نے آکر کہا نیچے علی یاور جنگ صاحب گاڑی میں بیٹھے ہیں اور آپ کو بلاتے ہیں ۔ میں علی یاور جنگ کا نام سن چکا تھا ان سے ایک دوبار ملا بھی تھا اور ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھا ۔ فوراً نیچے گیا ۔ انھوں نے کہا فرصت ہو تو میرے ساتھ چلو ۔ میں ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا وہ مجھے سیدھے سورہ کے گھر لے گئے " گولڈن تھرش ہولڈ " (سنہری آستانہ) راستے میں باتیں کرتے ہوئے انھوں نے " پیام " اخبار کی بہت تعریف کی ، کہنے لگے میں روزانہ صبح سب سے پہلے آپ کا ہی اخبار پڑھتا ہوں ۔ آپ کے اداریے بہت اچھے ہوتے ہیں ۔ آپ بہت صحیح سیاسی تجزیہ کرتے ہیں ۔ اس وقت جو سب سے اہم مسئلہ ہمارے سامنے ہے ، وہ تو آپ جانتے ہیں مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنا ہے ۔ ہمارا پانچ سو سال کا قدیم کلچر ، زبان سب کو شدید دھکا پہنچا ہے اور مسلمانوں میں شدید احساس کمتری پیدا ہوگیا ہے ، اس کو

کیسے دور کیا جائے ؟ اس پر سوچنا اور غور کرنا ہے ۔ مسلم قیادت نے جو غلطیاں کیں اس کی سزا یہ بچارے عام مسلمان کیوں بھگتیں۔ ۔۔ تو جے سوریہ کے ساتھ بیٹھ کر بڑی دیر تک اس مسئلے پر بحث رہی ۔ یہ تو ہم ملتے تھے کہ ۔کچھ کرنا چاہیے " مگر سوال یہی تھا کہ کیا ؟ اور کیسے ؟ جے سوریہ نے کہا چلیے باقر علی مرزا صاحب پاس ہیں ان سے مشورہ کریں ۔ ہم تینوں ان کے گھر گئے اور وہاں کوئی تین گھنٹے تک سماجی ، سیاسی ، تہذیبی ، ماضی ، حال اور مستقبل ہر مسئلے پر بات چیت چلی پھر بھی کچھ طے نہ ہوسکا تو دوسرے دن پھر مل بیٹھنے کا وقت مقرر کیا گیا ۔ ۔ ۔ چناں چہ دوسرے دن شام ، بجے پھر ہم چاروں کی بیٹھک ہوئی اور کافی بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ ایک میمورینڈم تیار کیا جائے اور ہم خود گورنر چودھری کے پاس جاکر یہ میمورینڈم ان کو دیں اور بتائیں کہ حیدرآباد کی یہ تہذیبی تاریخ رہی ہے یہاں کبھی فرقہ واری فساد نہیں ہوا ۔ ہندو مسلم مل جل کر رہتے آئے ہیں مگر اب پولیس ایکشن میں جو کچھ ہوا اس سے مسلمان بہت سہمے ہوئے ہیں اور ان کے معاشی مسائل بھی ہیں ۔ روزگار کا سوال ہے اس پر خاصی توجہ کی ضرورت ہے ۔ ان کی زبان و تہذیب کی حفاظت کرنی چاہیے ۔ تو میمورینڈم ڈرافٹ کرنے کا کام ڈاکٹر جے سوریہ کے سپرد ہوا انھوں نے میمورینڈم تیار کیا ۔ ہم لوگ چوتھے دن پھر ملے میمورینڈم پڑھا اس میں کچھ کانٹ چھانٹ کی اور اسے باقر علی مرزا کے حوالے کیا گیا کہ وہ اسے ٹائپ کروا کر گورنر سے ملاقات کا وقت لیں تو ہم سب جاکر ان سے ملیں گے اور میمورینڈم پیش کریں گے ۔ اس کے پانچویں یا چھٹے دن اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ علی یاور جنگ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنادیے گئے ہیں ۔

ڈاکٹر جے سوریہ بہت جذباتی قسم کے آدمی تھے یہ خبر پڑھ کر کہ علی یاور جنگ وائس چانسلر ہوگئے ہیں انھیں اتنا غصہ آیا (کیوں کہ یہ طے ہوا تھا کہ میمورینڈم پیش کرنے تک ہم کچھ اور نہیں کریں گے ۔ ۔ ۔) کہ انھوں نے گورنر کے ہاں جانے سے انکار کردیا اور کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی کہہ کر میمورینڈم پھاڑ کر پھینک دیا ۔ ۔ ۔ اس طرح یہ بات وہیں ختم ہوگئی ۔

علی یاور جنگ نے وائس چانسلر بننے کے کوئی چار پانچ دن بعد ہی مجھے فون کیا کہ کل چھٹی ہے ۔ فرصت ہو تو دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ ۔ میں چلا گیا کھانے پر ۔ باتوں باتوں میں انھوں نے مجھے بتایا کہ میں نے محسوس کیا کہ وائس چانسلری قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ وہاں رہ کر میں زیادہ بہتر اہم کام انجام دے سکتا ہوں ۔ آپ لوگوں نے اس کام کو روک کیوں دیا ۔ ایک میرے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ، آپ لوگوں کو وہ کام کرنا چاہیے تھا ۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ اس کام کو کرنا چاہیے تھا مگر اب تو وہ بات ختم ہوچکی تھی ۔ اور پھر ہم لوگ گرفتار ہوگئے ۔ اس کی تفصیل تو بعد میں سناؤں گا اس وقت تو میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس موقع پر علی یاور جنگ نے وائس چانسلر کی حیثیت سے بہت بڑا اقدام کیا ۔ رضیہ ، عالم ، زینت ساجدہ یونیورسٹی میں کارگزار تھے ۔ زینت تو خیر حوالات سے ہی چھٹ گئی تھیں مگر عالم اور رضیہ جیل میں تھے اور ملٹری گورنر نے وائس چانسلر کو Order دیا تھا کہ ان دونوں کی Services ختم کردی جائیں ۔ علی یاور جنگ نے حکم کی تعمیل کے بجائے اس کا یہ جواب دیا کہ ان پر مقدمہ چلایا جائے اگر وہ مجرم ثابت ہوں تو میں فوراً ان کی Services ختم کردوں گا چناں چہ کیس تو چلا نہیں اور جب وہ لوگ بری ہوئے تو Continuityof services باقی رکھتے ہوئے رضیہ اور عالم دونوں کو یونیورسٹی میں برقرار رکھا گیا اور یہی نہیں علی یاور جنگ نے یونیورسٹی کا وائس چانسلر بن کر اور بہت اچھے کام کیے ۔ وہ بڑے اچھے منتظم تھے ۔ یونیورسٹی کے بہت سے مسائل کو انھوں نے

بڑی عمدگی سے سلجھایا اور اس کی بھائی چارگی کی فضا کو برقرار رکھا ۔

مہدی علی جو یونیورسٹی میں زوالوجی کے پروفیسر تھے ۔ علی یاور جنگ کے بہت مداح تھے اور میں تو طالب علمی کے زمانے میں ان کی وجیہ ، خوب صورت اور دانش ورانہ شخصیت سے بہت متاثر تھا ۔ وہ اس زمانے میں آکسفورڈ سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تھے اور یونیورسٹی میں Modern History کے لکچرر مقرر ہوئے تھے مگر عجب تیز رفتاری سے انھوں نے ترقی کی ۔ ایک سال کے اندر ہی لکچرر سے ریڈر اور پھر پروفیسر بن گئے اور چند ہی سال میں وائس چانسلر عثمانیہ کے پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ۔ اس کے بعد باہر چلے گئے ۔ کئی ملکوں مصر ، چیکوسلاواکیہ ، فرانس اور امریکہ میں سفارت کے عہدے پر فائز رہے ۔ ناصر تو ان پر جان چھڑکتے تھے ۔ آخر میں بمبئی کے گورنر بھی رہے ۔ علی یاور جنگ سے میری آخری ملاقات بمبئی میں ہی ہوئی اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ۔ اکتوبر سوویت انقلاب کے جشن میں وہ گورنر کی حیثیت سے شریک تھے میں بھی جلسے میں تھا ۔ پتہ نہیں کیسے مجمع میں ان کی نظر مجھ پر پڑگئی اور بعد میں انھوں نے مجھے بلا بھیجا کہ تم یہاں کیسے ؟ میں نے بتایا کہ پانچ سال سے اردو بلٹز میں کام کررہا ہوں ، پھر میرا ٹھکانہ پوچھا اور پتہ لکھوا دینے کو کہا اور کہا کہ کسی دن آؤ تم میرے پاس کہ اطمینان سے باتیں کر سکیں ۔ اس کے تیسرے دن فون آیا کہ کل جمعہ ہے تم لنچ پر آجاؤ ، میں گاڑی بھجوادوں گا ۔ چناں چہ انھوں نے گاڑی بھیج دی ۔ میں گیا اور چار بجے تک ان سے باتیں ہوتی رہیں ۔ ان کو پرانی باتیں کرنے کا بہت شوق تھا ۔ ۔ ۔ وہ میری ان سے آخری ملاقات تھی ۔ ۔ ۔ اسی دن اندراگاندھی بمبئی میں ایک جلسے کو مخاطب کرنے والی تھیں مگر وہ اس میں نہ جاسکے ، قلب پر اچانک حملے کی وجہ سے ۔ اندرا جی کو پتہ چلا تو وہ خود آئیں مزاج پرسی کو ۔ نہرو گھرانے سے ان کے خاص روابط تھے ۔ کہتے ہیں جب وہ آئیں سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور جاں بحق ہوگئے ۔ یہ ۱۹۷۶ء کی بات ہے ۔

بڑی اعلیٰ شخصیت تھی ۔ حیدرآباد کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ باقی رہے گا ، بہت ہی انسان دوست ہم دردِ قوم و ملک آدمی تھے ۔ مجھے یاد ہے اس دن جب وہ حیدرآبادی مسلمانوں کے لیے بہت فکر مند تھے ۔ بے سوریہ کے گھر میں بڑی شستہ اردو میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا اس اقلیت کے لیے جس کا اس ریاست کی تہذیب و تاریخ بنانے میں بہت بڑا حصہ ہے ، ہم کو کچھ کرنا چاہیے ، یہ ہمارا فرض ہے ۔ غلط قیادت نے ان کے اندر جو احساسِ کمتری پیدا کردیا ہے اس کو دور کرنا اور ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنا ہے جس کے لیے ہم کو مختلف طریقے اختیار کرنے ہوں گے اور بہت کوشش کرنی پڑے گی ۔ ۔ ۔ افسوس کہ یہ کام جیسا ہونا چاہیے تھا نہیں ہوا ۔ حیدرآباد کی اقلیت آج تک احساس کمتری کا شکار ہے اور آج بھی غلط قیادت ان کو گم راہی کی طرف لے جارہی ہے ۔ اور وہ ایک درد مند دل خوابِ عدم میں ہے ۔

آپ کو بھی اعتراف ہوگا کہ پولیس ایکشن کے بعد مسلمانوں کے اندر جو شدید احساس کم تری پیدا ہوگیا تھا وہ اب تک بھی ہے ۔ مسلمان جو برسوں سے جہالت و غربت میں گرفتار تھے مگر اپنے آپ کو " بادشاہ " سمجھتے تھے ، سب سے " برتر " ، ان کے قوائے عمل مضمحل ہوچکے ہیں اور وہ تہذیب جس کا بڑے زور شور سے ذکر کیا جاتا ہے وہ سچ پوچھیے تو صرف عیدوں تہواروں اور اونچے طبقے کے لوگوں میں محفوظ تھی ۔ عوام بچارے اس تہذیب سے کوسوں دور تھے ۔ ان کے سامنے تو اپنے روٹی روزی کا سوال

تھا ان کے معاشی مسائل تھے اور وہ ان کو حل کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے ۔ چناں چہ یہاں جب آندھرا مہاسبھا اور ایسی ہی دوسری تحریکیں شروع ہوئیں تو کسانوں میں ایک جاگرتی پیدا ہوئی ہندو مسلم دونوں میں اور تلنگانہ تحریک شروع ہوئی خاص طور سے نلگنڈہ اور ورنگل میں اور اس کا Base مخالف رضاکار تھا جو بعد میں وسیع ہو کر مخالف کانگریس حکومت ہوگیا ۔

تلنگانہ تحریک : یہ تحریک ایک بہت اہم تاریخی واقعہ تھا اور جس زمانے میں وہ اٹھی اس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔ آزادی کے بعد یہاں کمیونسٹ تحریک اپنے عروج پر تھی اور ادھر چین میں ماؤ نے تنگ کی قیادت میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوگئی تھی غالباً ۴۹ ء میں اور وہاں جو Longmarch ہوا تھا اس کا ہمارے عام نوجوان ذہنوں پر بہت گہرا اثر پڑا تھا اور یہاں کی کچھ بڑی شخصیتیں جو تھیں ان کا رجحان بھی بائیں بازو کی طرف تھا ۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر حسین ظہیر ۔ ایل ۔ این ۔ گپتا اور شیڈول کاسٹ کے ایک لیڈر ہے ۔ سی ۔ سبیا جو بہت ذہین پڑھے لکھے آدمی تھے ۔ تو اس وقت یہاں کی جو فضا تھی جو تاریخی تبدیلیاں آرہی تھیں لازماً پڑھے لکھے حساس ذہنوں پر اس کا بہت اثر پڑا اور حیدرآباد کی جاگیر شاہی کے خلاف کمیونسٹ پارٹی کی رہنمائی میں جو کسان تحریک اٹھی تھی وہ اس وقت تک بہت آگے بڑھ گئی تھی خاص طور پر کچھ مخصوص اضلاع میں ۔ دوسرے حیدرآباد اسٹیٹ ابھی انڈین یونین میں ضم نہیں ہو تھا اور رضاکار تحریک بھی زوروں پر تھی ۔ ۔ ۔ تو یہ حالات تھے جس نے کچھ ذہنوں میں یہ خیال ابھارا کہ جس طرح چین میں انقلاب کے موقع پر وہاں کے بڑے بڑے سرکاری عہدہ داروں نے اپنی خدمات سے استعفیٰ دے دیا تھا ہم کو بھی تلنگانہ انقلاب کے خیر مقدم میں یہی کرنا چاہیے ۔ ایسے وقت میں خاموش تماشائی بنے رہنا جرم ہوگا ۔ یہ خیال چند پڑھے لکھے ذہنوں میں بھی تھا چناں چہ ڈاکٹر حسین ظہیر کے ہاں بیٹھکوں میں اس پر کئی بار ہماری اور عالم کی ان سے بحث و تکرار بھی ہوئی تھی ۔ ڈاکٹر حسین ظہیر کا رجحان بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ ایسے موقع پر خاموش تماشائی بنے رہنا غلط ہوگا ۔ اور ایل ۔ این گپتا صاحب نے تو بہت واضح طور پر اس امر کا اظہار کیا تھا کہ تاریخ میں کچھ ایسے موڑ آتے ہیں ۔ اس وقت اگر دانش ور بالخصوص سائنس داں خاموش تماشائی بنے رہیں تو تاریخ میں وہ بہت بڑے مجرم قرار پائیں گے ۔ اس لیے ہم کو اپنی خدمات سے استعفیٰ دے دینا چاہیے ۔ سبیا کو اس خیال سے اختلاف تھا اور انھوں نے ہی ایک دن ہم سے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ وہ پاگل لوگ کچھ اس طرح سوچ رہے ہیں اور استعفیٰ دینے پر تلے ہوئے ہیں اس ذکر سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس زمانے میں انقلابی جوش و خروش کیا تھا اور تلنگانہ تحریک کا اثر ذہنوں پر کتنا شدید تھا ۔ آپ کو یاد ہوگا طلبہ میں " اسکول کالج چھوڑو " کا نعرہ بلند ہوچکا تھا ۔ اور سینکڑوں طالب علم کالجوں سے نکل کر میدانِ عمل میں آگئے تھے ان میں خود میرے چھوٹے بھائی ظفر ۔ قمر ۔ مرحومین بھی شامل تھے ۔ ہم اسے ایک وقتی رو سمجھ کر خاموش تھے مگر جب دیکھا کہ کچھ ذمہ دار لوگ بھی اس انداز سے سوچ رہے ہیں تو ہم نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا ضروری سمجھا ۔ میں نے اور عالم نے یہ طے کیا کہ ہم کو کہیں مل بیٹھ کر اس پر کھل کر بات چیت کرنی چاہیے چناں چہ عثمان ساگر کا بنگلہ ریزرو کروایا ۔ کھانے پینے کا انتظام کروایا اور اتوار کے دن ان سرگروہ حضرات کو جو اس طرح سوچ رہے تھے دعوت دی کہ کچھ اہم سیاسی مسائل پر بحث کرنی ہے ۔ ڈاکٹر حسین ظہیر ۔ ایل ۔ این ۔ گپتا ۔ سبیا ۔ عالم اور میں اکٹھا ہوئے ۔ کھانے پینے کے بعد رات کو بات چیت شروع ہوئی کہ انقلاب کیسے آتا ہے ؟ دانش وروں کا اس میں کیا رول ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ ۔ گفتگو کے دوران ڈاکٹر ظہیر اور یل ۔ این ۔ گپتا کا جو رجحان تھا کہ ہم کو خاموش

ور کا اس میں کیا رول ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ ۔ گفتگو کے دوران ڈاکٹر ظہیر احمد یل ۔ این ۔ گپتا کا جو رجحان تھا کہ ہم کو خاموش تماشائی نہیں بنے رہنا چاہیے کھل کر سامنے آیا ۔ ہم تین نے اس کی مخالفت کی اور صبح کے پانچ بجے تک ہم اس پر بحث کرتے رہے ۔ اپنے اپنے دلائل پیش کیے ہم نے اعتراف کیا کہ بے شک آپ لوگوں کو استعفیٰ دے دینا چاہیے مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے اس لیے توقف کرنا چاہیے ۔ فی الحال تو آپ لوگ جہاں ہیں وہیں رہ کر زیادہ مفید کام کرسکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ہمارا یہ مشورہ لوگوں کو درست معلوم ہوا ۔ ۔ ۔ تو دیکھیے تلنگانہ تحریک نے کچھ ایسی فضا پیدا کردی تھی جس میں دراصل اس وقت کے حالات کو بھی بہت دخل تھا ۔

ہندستان کی آزادی ، یہاں کا جاگیرداری نظام ، قاسم رضوی کی قیادت ، مجلس اتحاد المسلمین کی پالیسی ، رضاکاروں کی تحریک اس پس منظر میں تلنگانہ میں جو ایک کسان تحریک ابھری تھی جلد ہی کمیونسٹوں کی تحریک بن گئی تو جو بائیں بازو کا رجحان رکھنے والے تھے وہ لہٰذا اس سے بہت متاثر ہوئے ۔ صرف حیدرآباد ہی کے نہیں بلکہ حیدرآباد سے باہر بھی دانش وروں کے ذہن اس سے متاثر تھے ۔ کرشن چندر نے اس کے بارے میں ایک کتاب لکھ ڈالی ، "جب کھیت جاگے" ۔ دوسرے کچھ اور ادیبوں نے بھی اس پر لکھا ۔ عصمت چغتائی نے تو عملاً تلنگانہ تحریک کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی کہ مجھے اس کا موقع فراہم کیا جائے ۔ چناں چہ "قرعہ فال بہ نام من دیوانہ زدند" کہ میں اپنیConstituency میں اپنے الکشن پروگرام کے سلسلے میں جاؤں اور ان کو بھی ساتھ لے جاؤں ۔

اور ٹلا رام چندر ریڈی ، کملا دیوی کے شوہر میرا الکشن Campain چلا رہے تھے وہ آلیر کی طرف کے رہنے والے تھے انھوں نے آٹھ دن کا ہمارا پروگرام ترتیب دیا کہ اس میں ہم فلاں فلاں دیہاتوں کا دورہ کریں گے عصمت چغتائی کو اس کی اطلاع دے دی گئی وہ آئیں اور حسب پروگرام آٹھ نو دن تک میرے ساتھ رہیں اور جتنی بھی معلومات حاصل کرسکتی تھیں کرید کرید کر ہمارے ساتھی کارکنوں سے حاصل کیں ۔ ان سب کی زبان تلگو تھی مگر ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتے تھے ۔ تحریک کیسے شروع ہوئی ؟ کتنے دیہات کتنے علاقے اس کے زیر اثر ہیں ؟ کہاں کون لیڈر ہے ؟ کتنے دلم ہیں ؟ وغیرہ وغیرہ یہ سب معلومات جمع کرکے انھوں نے واپس جاکر ایک بہت اچھا رپورتاژ لکھا ۔ بمبئی میں مجھے سنایا بھی مگر پتہ نہیں کیوں چھپوایا نہیں ۔

ہمارے دورے کا پروگرام شام میں شروع ہوتا تھا ۔ دن بھر آرام کرتے تھے ۔ مختلف دیہاتوں میں جو دو دو یا تین تین میل کے فاصلے پر آباد تھے جلسے ترتیب دیے جاتے اور یہ پروگرام رات کے بارہ ایک بجے تک چلتا ۔

اور ٹلا رام چندرا ریڈی پروگرام کے انچارج تھے وہ جس گاؤں میں جلسہ بلاتے اس میں ہم کو تقریر بھی کرنا پڑتی تھی ۔ شروع شروع میں عصمت آپا بہت گھبرائیں کہ تقریر کرنا تو مجھ کو نہیں آتا ۔ ہم نے دلاسا دیا کہ گھبرائیے مت جو آپ کے من میں آئے بس کہ دیجیے عام لوگ تو آپ کی زبان اور بات سمجھیں گے نہیںInterpretor دکھر لے گا کہ لوگوں سے کیا کہا جائے ۔ اب تو وہ اچھی تقریر کرتی ہیں اور ان کو اعتراف ہے کہ میں نے اخترحسن صاحب کے ساتھ تلنگانہ میں تقریر کرنا سیکھی ۔ سچ تو یہ ہے کہ تقریر کرنا میں نے بھی اس دوران میں سیکھا ورنہ مجھے تقریر وقریر کرنا نہیں آتی تھی ۔

جلسے کا آغاز برا کتھا سے ہوتا تھا جیسے مرہٹی میں "پواڑے" ہوتے ہیں یہاں تلنگانہ میں برا کتھا عام تھی ۔ یہ کچھ ایک طرح کلی طور پر مکالمہ ہوتا تھا دو آدمیوں کے بیچ ، ڈرامائی انداز میں اور مکالموں کے ذریعے سماجی ، سیاسی حالات پر طنز و مزاح کیا جاتا تھا اور

شفیعہ ۔ جہاں کہیں جلسہ کرنا ہوتا کچھ دیر پہلے اعلان کردیا جاتا کہ پارٹی لیڈر آئے ہیں ۔ پہلے بدا کتھا ہوتی پھر ان کی تقریریں ۔ تو ہوتے ہی تقریباً پورا گاؤں جلسہ گاہ میں جمع ہو جاتا ۔ اس طرح ہر روز شام سے آدھی رات تک کئی جگہوں پر جلسے ہوتے تھے ۔

آخری رات جو عصمت آپا کے ساتھ تلنگانہ میں گذری اب تک یاد ہے ۔ رات کے بارہ بج چکے تھے پروگرام کا آخری ختم ہوا تو اروٹلا رام چندرا ریڈی نے کہا یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ایک بہت اہم گاؤں ہے وہاں ہمارا بہت بڑا دلم ہے وہاں کا پورا نظم و نسق ہمارے ہاتھ میں ہے ۔گورنمنٹ کو وہاں سے بالکل بے دخل کردیا گیا ہے ۔ ۔ ۔ یہ واقعہ ہے کہ کوئی دیہات تلنگانہ تحریک کے زیر اثر بالکل خود مختار ہوگئے تھے ۔کسانوں نے زمین بھی حاصل کرلی تھی اور اس کی تقسیم بھی ہوگئی تھی رام چندرا ریڈی نے اس خاص گاؤں میں چلنے کو کہا ، تو عصمت آپا آمادہ ہوگئیں ۔ وہاں پہنچے ڈھنڈورا پیٹا گیا آناً فاناً گاؤں کے سب ایک میدان میں جمع ہوگئے ۔ دسمبر کا مہینہ تھا سردی خوب پڑرہی تھی اور عصمت آپا کو بھوک بھی بہت لگی تھی ۔ اروٹلا رام چندر نے وہاں کے خوش حال کسان کو بلا کر کہا دس گیارہ آدمیوں کا کھانا بنواؤ ۔ ۔ ۔ اس نے موٹا چاول جیسا بھی اس کے پاس تھا کے لیے چڑھا دیا ۔ جلسہ ختم ہوا تو وہیں قریب میں ایک جھونپڑی تھی جہاں ہمارے رات گزار نے کا انتظام تھا ۔ جلسہ ختم کر جھونپڑی میں آکر بیٹھے تو میزبان کسان نے اس کے کاندھے پر جو کپڑا پڑا تھا اسے وہ زمین پر بچھا دیا اور پورا چاول گرم گرم لا پر الٹ دیا اور کنارے پر کچھ اچار وچار ۔ عصمت نے آہستہ سے مجھ سے کہا بھئی یہ تو بڑا گندہ ہے ۔کیسے کھائیں ؟ اپنی دھوتی اس نے ۔ میں نے کہا اب جو بھی ہے بیچ بیچ میں سے لے کر تھوڑا سا کھا لیجیے ۔ بہر حال دوچار لقمے کھا کر پانی پیا ۔ اب سو مسئلہ تھا گیارہ بارہ آدمی ایک جھونپڑی میں ۔ ۔ ۔ میں نے عصمت آپا کے لیے ایک کونے میں جگہ بنائی اور کہا میں یہیں آپ قریب بیٹھا ہوں مجھے نیند نہیں آرہی ہے آپ تھوڑا سو لیجیے ۔ ۔ ۔ تو خدا خدا کر کے وہ رات گزری ۔ صبح اٹھتے ہی عصمت کہا ، چلو بھئی واپس ، بہت دیکھ لیا تلنگانہ !

تلنگانہ تحریک اپنی نوعیت کی ایک بڑی تحریک تھی اور اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ صرف اس مو مقالے لکھنے کے لیے امریکہ ، روس اور یورپ سے کئی اسکالر یہاں آئے اور کئی ایک نے مجھ سے انٹرویو بھی لیے ۔ اس م نہیں یہاں کے جاگیرداروں ، زمین داروں کے خلاف وہ ایک انقلابی تحریک تھی لیکن میرا اب تک یہ خیال ہے کہ تلنگانہ ابھی ا لیے پوری طرح تیار نہیں تھا ۔ چناں چہ میں "پیام" میں اس کے خلاف لکھتا بھی رہا تھا اور عالم کے بھی اس ضمن میں کئی چھپے ۔ میں نے ایک اداریہ بھی لکھا تھا اس بارے میں ۔ جس میں واضح طور پر یہ کہا تھا کہ اب جب کہ نہرو وزیر اعظم بن گ ہندستان آزاد ہوچکا ہے اور نظام کی حکومت کا بہر حال ہند سے الحاق ہونے والا ہے ، تو اس وقت اس تحریک کو واپس چاہیے ۔ اس کے کچھ ہی روز بعد وہ واقعہ پیش آیا جسے تاریخ بھلا نہیں سکتی ۔ روی نارائن ریڈی صاحب چاہے اسے بھلا د وقت میرا اڈیٹوریل آفس لے پلی میں باجی کے مکان کے بازو والے مکان میں تھا ۔ رات کے کوئی بارہ بجے کا وقت ہوگا کام ختم ہوچکا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی ۔جاکر دیکھا تو روی نارائن ریڈی کھڑے ہیں ۔ اس زمانے میں وہ انڈر گراؤ خیر میں نے جلدی سے انھیں اندر بلا کر بٹھا یا ۔ وہ خاص مقصد سے آئے تھے ۔ انھوں نے کہا "آپ کی اس رائے سے

اسی وقت Armed Struggle واپس لے لینی چاہیے پارٹی کا پورا گروپ جس کی میں قیادت کررہا ہوں متفق ہے اور اسی کی
ف سے میں تم سے بات کرنے آیا ہوں ۔ تم ایک پریس کانفرنس کا انتظام کردو میں عوام پر اس بات کا اظہار کردینا چاہتا ہوں ۔
تاں چہ سلطان بازار کے ایک بڑے احاطے میں پریس کانفرنس بلائی گئی معلوم ہوا کہ روی نارائن ریڈی مخاطب کرنے والے ہیں تو
ب ہی پریس والے جمع ہوگئے ۔ نارائن ریڈی پیچھے کے راستے سے خاموشی سے آئے اور آتے ہی انھوں نے اپنی بات کہہ دی
۔ غلط وقت پر غلط اقدام کیا گیا ہم کو Armed Struggle نہیں کرنی چاہیے تھی اور یہ بات میں اپنی پارٹی کی طرف سے بھی کہہ
رہا ہوں ۔ جلسہ گاہ سے نکلتے ہی وہ گرفتار کرلیے گئے ۔ یہ ۴۸ء کی بات ہے مگر اس کے بعد صورت حال میں کچھ تبدیلی آئی ۔

آپ کو یاد ہوگا پیام میں تو میں نے پہلے ہی کئی بار اس طرف اشارہ کیا تھا ۔ مسلح جدوجہد کو قبل از وقت بتایا تھا ۔ عالم نے اور
دوسرے اور لوگوں نے بھی اس کے خلاف مضامین لکھے تھے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ جب جواہر لال نہرو کی
یادت میں قومی حکومت قائم ہوچکی ہے تو سوال یہ تھا کہ مسلح جدوجہد کس کے خلاف ؟ بہ ہر حال ۔ میں نے اس وقت بھی اپنی تقریر
یں کہا تھا اور آج بھی یہی کہوں گا کہ تلنگانہ تحریک کا ایک نمایاں فائدہ یہ ہوا کہ اس علاقے میں ہندو مسلم فساد نہیں ہوا ۔ کیوں کہ
س تحریک نے تلنگانہ علاقہ میں ایک ایسا ماحول پیدا کردیا تھا اور آپسی اتحاد کو اتنا مضبوط بنادیا تھا کہ وہاں ایسے فسادات نہیں ہوئے
یسے مرہٹواڑہ میں ہوئے ۔

000 00 000

سری نگر سے

سہ ماہی جریدہ " جہات " کا اجراء

ترتیب : حامدی کاشمیری

رابطہ : اطہر ضیاء (مدیرہ)

سہ ماہی " جہات " سری نگر

کمپیوٹر سٹی ۔ نیو زیرو برج

سری نگر ۔ کشمیر ۔

اقبال متین

باتیں ہماریاں

کبھی کیا کیا یاد آجاتا ہے اور پیچھا نہیں چھوڑتا ۔ چادر تان لو تو تصور میں وہی منظر ۔ اٹھ بیٹھو تب بھی وہی ۔ بیٹھے کی آبیاری کے لیے نکل پڑو ۔ سامنے پھول خیالوں میں دھول ۔

حال کا ایک لمحہ ماضی اور مستقبل کی تفریق مٹا دیتا ہے ۔ بس یہی دھن کہ اس لمحے کو پالو ۔ کھو نہ جائے کہیں ۔

کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا ۔ جانے کیا خیال کریں ۔ اوہ بڑے لچھے بنتے ہو ۔ اس میں اچھائی اور برائی کی بات نہیں ہے ۔ اپنی اپنی سوچ ہے اور بس ۔ کوئی شخص جذبے کے پیچھے جان کی بازی لگا دیتا ہے اور کوئی جان دے کر بھی جذبے سے عاری رہتا ہے ۔ جذبہ لغت کا لفظ نہیں ہے ۔ بعض لفظ لغت میں رہ کر بھی لغت کے لفظ نہیں رہتے اور سدا دل میں نہ رہ کر بھی دل کے لفظ رہتے ہیں ۔

وسیم عباس اور سکینہ بھابی محبت کے لوگ ہیں ۔ میرے چاہنے والے میرے قدرداں ۔ بعض وقت یہ قدر دانی مجھ جیسے آدمی کو بھول بنا دیتی ہے لیکن محبتیں توانائی دیتی ہیں ۔ قمر جمالی اور محمود حامد سامنے آکر کھڑے ہوگئے ۔ سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا ۔ قمر تو شکر گزار تھیں ۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا ۔ تنے ملنے والوں میں تم دونوں سب سے آگے ہو ۔ میں نے سچ کہا ۔

وسیم عباس کا اصرار تھا اور میں نے سکینہ بھابی کے پہلے افسانوی مجموعے " صلیب کا بوجھ " پر دیباچہ لکھ دیا تھا جو انھیں پہنچانا تھا ۔ کتاب پریس میں رکی پڑی تھی ۔ وسیم نے " اعجاز پریس " چھتہ بازار میں ملنے کا وعدہ لے رکھا تھا ۔

پرسوں بھی سینے میں درد ہوا تھا ۔ ۲۵ ڈسمبر ۱۹۹۳ء کو ۔ اتفاق سے آج بھی دو بجے دن خفیف سی تکلیف ہوئی ۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی جیسے پھلانگ کر دل سینے سے باہر نکل آئے گا ۔ صوفے پر آرام سے نیم دراز ہوا ۔ صوفے کی پشت سے جب میری پیٹھ لگی تو اس دلِ ناہنجار کا جواب نہیں صوفے میں دھڑکے جا رہا ہے ۔ علانیہ محسوس ہوتا ہے کہ تھک نہ جائے کہیں ۔ سعدی میرا چھوٹا بھائی ہے اس کے دیوان خانے کی دیوار سے لگے تخت پر لیٹ رہا ۔ سار بی ٹریٹ (SORBITRATE) زبان کے نیچے رکھ لی ۔ کچھ دیر تکیے پر دل کی دھڑکن سنتا ہوا لیٹا رہا ۔ یہ دھڑکن خوف کے باعث ناگوار ہوئی تو کروٹ بدل لی ۔ پھر چتا لیٹ رہا ۔ یہ حیدرآباد کا ٹھیٹھ لفظ ہے ۔ جو ایسے وقت ضرور زبان پر آجاتا ہے جب لفظ کی تمیز نہیں رہتی ۔ یوں سمجھیے کہ چت لیٹ گیا ۔ پوری طرح طبیعت نہیں سنبھلی تھی ۔ درد نہیں تھا ۔ دھڑکن کچھ نارمل ہو رہی تھی ۔ اب دل کی دھڑکن کا نہیں گھڑی کی ٹک ٹک کا خیال ستانے لگا کہ وسیم عباس اور نور محمد پریس میں منتظر ہوں گے ۔ وسیم کی بے چینی ، اس کا اضطراب آنکھوں کے آگے مجسم ہو رہا تھا ۔ بہن اور شبو نے روکا بھی لیکن میں سوچ رہا تھا اگر مجھے کچھ ہو ۔ ہوا جاتے تو وسیم اور سکینہ دیباچے کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھ بھی نہ سکیں گے اور اکیڈمی میں کتاب کے داخلے کی تاریخ قریب آرہی تھی ۔

نکل پڑا ۔ رکشا لے کر اعجاز پریس کے لیے روانہ ہوگیا ۔ راستے میں نئے پل کے موڑ پر پھر سینے کی تکلیف اور اختلاج

قلب نے ستانا شروع کیا۔ اعجاز پریس پہنچ کر وسیم کے انتظار میں آمدورفت کے لیے جو رکشا لے رکھا تھا چھوڑ دینا پڑا۔ سابقہ ثمرہ نے اثر دکھایا۔ اللہ کا کرم ہے اتفاق ہوا۔ کتنے ہی لوگ ملے۔ مالک کا کرم ہے لوگ کچھ اس طرح ملتے ہیں کہ میں اپنی حیثیت سامنے رکھوں تو اندر کا چھپا آدمی ذرا سے میں اوجھل جاتے۔ میں ہر ایک سے اٹھ کر ایستادہ ہوکر انکسار اور اپنائیت سے ملتا ہوں۔ ان کی ہر بات کا جواب دیتا ہوں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرے اس طرز عمل سے ملنے والے کس درجہ مطمئن ہوتے ہیں۔ میں نے کئی بار یہ بھی دیکھا ہے کہ میں جب ان سے اس طرح ملتا ہوں تو لوگ کس طرح اپنی چاروں طرف دیکھتے ہیں۔ جیسے اپنی منزلہ دوسروں کی نظروں میں دیکھ رہے ہوں۔ اللہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے بھاگ نکلوں میرے آقا ان لمحوں سے سلامتی سے گزار دے بس۔

نور محمد نے حسبِ وعدہ میری کتاب "سوندھی مٹی کے بت" چھاپ دی ہے۔ مجھے خوش کردیا ہے۔ اللہ رکھے کیا پایا دمنع جوانِ صالح ہے۔ میں مطمئن ہوں۔ سکینہ بھابی کی کتاب کا دیباچہ نور محمد کے حوالے کرکے باہر نکلتا اور سڑک کی طرف بڑھ ہوں کہ فوری رکشا لے لوں اور گھر جاکر پڑ رہوں۔ پیچھے سے بھائی انگر پکارتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور پیچھے ہی سے ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ ان کی طرف پلٹ جاتا ہوں۔ ہاتھ تھام رکھا ہے۔ شکوہ سنج ہیں کہ میں نظام آباد سے آتا ہوں اور نہیں ملتا۔ کہا کہ نور الدین خاں کہہ رہے تھے کہ آپ شاید ہم سے خفا ہیں۔ میں تفصیل سے انگر بھائی کو ساری باتیں سمجھاتا ہوں۔ ادھر چار مہینے سے اپنی مرجھائی ہوئی صحت کی گذشتہ شگفتگی کا تذکرہ کرتا ہوں۔ کہلاتا ہوں کہ نواب نور کو میرا سلام اور پیار پہنچا دیجیے۔ اس سے کہیے کہ مجھے ڈاکٹروں نے میری دو منزلہ کوٹھی نما موٹریں چھین لی ہیں۔ میری ٹانگیں جن کے بوتے پر میں نئے شہر اور پرانے شہر کی تفریق دیتا تھا انھیں زنجیر کر رکھا ہے۔ میں اب کی بار ضرور آؤں گا۔ فون کر کے آؤں گا کہ وہیں آپ سے بھی مل لوں۔

حیدرآباد میں مجھ جیسے آدمی کا صاحبِ سواری ہونا بے حد ضروری ہے اس لیے کہ آٹو کا میٹر سوار ہونے کے بعد آٹو (AUTO) کے ڈھانچے میں نہیں چلتا۔ اچک کر ہمارے سینے میں فٹ ہوجاتا ہے اور اپنی رفتار کے ساتھ دل کی رفتار بڑھاتا رہتا ہے۔ چور نظروں سے اس کو اس طرح ضرور دیکھتے ہیں جیسے نہیں دیکھ رہے ہیں اور آٹو ڈرائیور ہمیں دیکھتا ہوا نہ دیکھے۔ سانس میں فرق پڑتا ہے۔

انگر بھائی اور میرا بہت پرانا یار نواب نورالدین خاں مخلص لوگ ہیں۔ لیکن انگر بھائی نے مجھ سے کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ اور نور مل کر چلے آئیں گے۔ آپ اپنا وقت اور پتہ ہمیں دے دیں۔ پٹرول کی مہنگائی شاید محبتوں کا حساب کتاب رکھتی ہے۔ رکھوں کہ نہ رکھوں۔ یہ بات شاید انھیں یاد نہیں آئی ہوگی۔ یہ بھی ان کی نیک طبعی ہے۔ وہ اگر ایسا پوچھ بیٹھتے تو میں انھیں کیا پتہ دیتا جب مجھے خود اپنا پتہ نہیں۔

جتنے کام ذہن میں لیے حیدرآباد آتا ہوں ان کی مناسبت سے اکثر بیٹے کے پاس، کبھی بیٹی کے پاس، کبھی بھائی کے گھر ٹھہر جاتا ہوں اور پھر اس پر مستزاد ہر ایک کا طرزِ زندگی جدا، ہر ایک کا رہن سہن الگ، کوئی مجھے اپنے گھر میں دس قدم اجازت دے، کوئی بیس قدم کی۔ سو قدم میرا حق نہیں ہے اور ان پر لازم نہیں۔ مجھ پر واجب کہ میں ان کے آرام میں خلل نہ ڈالا لیے میں کسی کو اپنا کیا پتہ دوں۔

میرے احباب میں دوچار ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے اس طرح سوچا بھی۔ بھائی مظہر کاتب کے چھوٹے بیٹے کی شادی

جیلانی بانو نے جس لہجے میں یہ بات کی وہ دل کو چھو گئی۔ کہا۔۔۔ متین بھائی۔ آپ حیدرآباد آتے ہیں اور برسوں نہیں ملتے بعض وقت آپ سے ملنے بہت ہی چاہتا ہے۔ میں اور انور آپ کی باتیں کرتے ہیں۔ ہم کو اپنا پتہ دے دیا کیجیے کہ ہم آجایا کریں مجھے منیرہ یاد آئیں۔ بانو کا ان کا پیار یاد آیا۔

اور بھی کرم فرما ہیں۔ راشد آذر ہے۔ قمر جمالی اور محمود حامد ہیں۔ رفعت صدیقی اور اعظم راہی ہیں وسیم عباس ہیں سب سب نوید اقبال کے گھر فون پر وقت لے کر آجاتے ہیں۔

ایک اور شخص ہے۔ زبان سے محبت کا اظہار کیے بغیر چپ کے سے دل میں اتر جانے والا۔ میں کہہ نہیں سکتا اس بھوئی جیسی مٹی شخصیت نے کیسے پیر سکیڑ رکھے تھے۔ مٹی میں اپنا ہنر ڈھونڈنے والا۔ مٹی کی سگندھ۔ برسات کی پھوار سے لپٹے میں بلبلے بلبلے پھرنے والا۔ مٹی لپٹے ساتھ اٹھائے میرے سینے تک آ پہنچا۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ وہ سینے میں کر گیا۔ اب جو اسے ڈھونڈتا ہوں تو محسوس ہوا کہ وہ سینے میں پہنچ کر بہت آہستہ رینگتا ہوا میرے دل میں پہنچ گیا ہے۔ اور ایک گو میں اطمینان سے پیر پھیلائے بیٹھ گیا۔ اب جو میں اسے الگ کرنا چاہوں تو میرے لیے مشکل یہ آپڑی ہے کہ یہ سرخ اور گر بھوئی میرے دل کے لہو میں اپنا رنگ ملا کر اس طرح چھپ گئی ہے کہ میں نے اس کی علاحدہ پہچان ہی کھودی۔ اس کے دا نرالے ہیں۔ مجھ سے وعدہ لیتا ہے کہ آپ آٹو میں آئیں گے آٹو میں جائیں گے۔ کبھی آٹو تک آ کر آٹو میں بٹھا دیتا ہے۔ پھر میں ا میں اسے اس کے گھر تک چھوڑتا ہوں۔ پھر اس کی بینائی نے آنکھ میں پھول آجانے کے سبب اسے محتاط بنا دیا کہ وہ شام ڈوب تھوڑا فاصلہ بھی نہ طے کرے۔ اللہ رکھے یہ میرا ایسا دوست ہے جس کے پاس علم کی فضیلت کے ساتھ اپنے سے عمر میں بڑے ا کا احترام لازم و ملزوم ہے۔

شخصیات اور خاکوں پر میری کتاب "سوندھی مٹی کے بت" عزیزم نور محمد نے بہت توجہ سے اعجاز پریس میں چھاپ کتاب کا اور گردپوش کا کاغذ انھوں نے منگوالیا۔ جلد بندی انھوں نے کروائی۔ ٹائیٹل ان کی نگرانی میں چھپا جس کا ڈزائین عزیز آر نے بنایا تھا اور سلولائیڈ پر عکس مغنی تبسم نے نکلوایا تھا۔ جلد بنوا کر جب Lamination بھی نور محمد نے کروالیا اور کتاب مکمل تو میرے چھوٹے بھائی کو فون کر کے کہا۔

"اقبال متین صاحب کی کتاب تیار ہے۔ آٹو میں بھر کر آپ کے پاس بھجوا رہا ہوں۔"

یہ نہیں کہا کہ تین ہزار تین سو روپے ابھی ان کی طرف باقی ہیں۔ میں نور سے ملتا اور ادا شدنی رقم کا ذکر کرتا تو شرماتا جیسے اس کے بس میں ہوتا تو میرے پر ہاتھ رکھ دیتا۔ اس کی اس شرافت نے مجھے جی بھر کر شرمندہ کیا۔

اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی تخلیقات پر امداد کی رقم بہت انتظار دکھا کر ملی۔ صرف چار ہزار روپے۔ ۳۵۲ صفحات کی کتا اشاعت کے لیے چار ہزار روپے۔ چلو اردو کی خدمت کے لیے یہ بھی کیا کم ہے کیوں کہ ہماری اردو اکیڈمیاں اندھا دھند خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ ان کی اس کرم فرمائی سے انکار ممکن نہیں کہ اردو ادب و شعر کے معیار کو پست سے پست کرنے کی نوازشوں کا بڑا ہاتھ ہے اور یہ بڑا ہاتھ دراز دستی کی اس انتہا کو پہنچ گیا ہے کہ اردو شعر و ادب کا گریبان چاک کر رہا ہے۔ یہ کتابیں ہر اردو اکیڈیمی کی اعانت سے زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہی ہیں کہ اردو ادب کی کھوٹ لے زیور سے لدی دلہن گھونگھٹ سے

ٔرم سار ہے اور اکیڈمیاں مصلحتوں کے پیچھے کسوٹیاں گروی رکھ کر سود ادا کر رہی ہیں

نور محمد کے اخلاص کا امتحان کہاں تک لیتا ۔ بنک میں چک داخل کیا اور خوش ہوگیا لیکن کوئی اور بھی تھا جو میرے ساتھ را ہا تھا ۔ میرا چاہنے والا پیارا سا نوجوان الیاس ۔ حرمین میڈیکل اسٹور کا مالک ۔ میری دوائیں ایک دن بھی ناغہ نہیں ہوئیں ۔ پورے ۔ روپے ہوگئے تو میں نے اس سے دوائیں لینی بند کردیں ۔ دو دو تین تین دن ناغے بھی ہونے لگے ۔ حیدرآباد جاتا تو اس سے بد ملتا ۔ جتنی بن پڑتیں نقد دوائیں لے لیتا ۔ وہ لاڈ کرتا شکوہ کرتا ۔ ایسی لاڈ پیار کی برہمی دکھاتا کہ کیا آج کل بیٹے دکھاتے ہوں ۔ غصہ ۔ د ۔ جس میں احترام بھی ہے ۔ محبت بھی ہے ۔ آپ دوائیں لے جائیے ۔ پیسے میں جانتا ہوں کہیں نہیں جائیں گے ۔ میری بگری ہوتی ہے ۔ آپ میرے بزرگ ہیں ۔ اتنا پیار دیتے ہیں اور میرا نقصان کرتے ہیں اپنے ساتھی سے مخاطب ہوتا ۔ اس کی دوکان میں کام نے والوں کے ساتھ اس کا برتاؤ ساتھیوں کا سا تھا ۔ پکار کر کہتا فوری پیک (PACK) کرو ۔ ۹۰ ڈل زم ۔ ۹۰ ساربی ٹریٹ ۔ ۹۰ رسٹل وغیرہ یرہ کیپسول ملا کر دوا کی گولیوں کی سات آٹھ قسمیں ہو جاتیں ۔

میں ہاں ہاں کرتا ٹوکتا رہتا ۔ روکتا رہتا ۔ میں دوکان کی سیڑھیاں اتر جاتا کاؤنٹر چھوڑ کر میری طرف لپکتا ۔ پیچھے سے ہاتھ تھام لیتا ۔ سامنے آکر راستہ روک لیتا ۔ میں اس کو پیار سے دلار سے سمجھاتا ۔ پچکارتا کہ دیکھو میں رقم ہاتھ میں ہو تب تک تم سے ملوں گا بھی ں اور نہ ملنے کا دکھ اندر اندر جھیلتا رہوں گا ۔ کیا میں تمہارے خلاف اپنے ضمیر سے سودا کرلوں اور اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں ؟ تم اس گراوٹ تک مجھے لے جانا چاہتے ہو ؟

آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ۔ اداس ہوجاتا ۔ کہتا میں تو کتنی بار آپ سے کہتا رہا ایک کارڈ لکھ دیجیے اور دیکھیے آپ کا الیاس ں سلیقے سے دواؤں کا پارسل بھجواتا ہے ۔ آپ نے کبھی یہ عزت نہیں دی مجھے ۔ الٹے دوکان پر آکر دوائیں بھی نہیں لیں گے ب ؟ پھر آپ مجھے اپنا کیوں بولتے ہیں ۔ آپ کو تو جب تکلیف ہوگی ۔ ہوگی مگر مجھے تو اب ہورہی ہے ۔ ان سوا سو روپیوں میں تو ں دن کی دوائیں بھی نہیں آتیں ۔ آپ رقم کے بغیر اب میرے پاس مت آئیے ۔ وہ رقم کے مطابق دوائیں کچھ اس طرح ساتھ کردیتا ہے خود بھی ساتھ ہوگیا ہو ۔

میرا ایسا بانکا مخلص الیاس مجھے بہت یاد آرہا تھا ۔ اکاڈمی نے چار ہزار روپے دیے ہیں ۔ تین ہزار تین سو اپنے چہیتے نور دے دوں گا ۔ بچ جائیں گے سات سو ۔ الیاس کو کیا دوں گا ۔ وہ تو اب ساتھ رہنے لگا ہے ۔ خفا خفا سا ۔ دوائیں میری زنبیل میں رکر ۔ اسکوٹر کے پیچھے بٹھا کر گھر چھوڑنے والا الیاس ۔

پرسوں چک کیش ہوجائے گا ۔ میں مگن بھی ہوں ۔ نہیں بھی ۔ خوش بھی ہوں غم زدہ بھی ۔ مطمئن بھی ہوں تردد بھی ساتھ ہے ۔ دو خانوں میں بٹا ہوا آدمی اچھا لگتا ہے شاید اس لیے کہ وہ پہچانا نہیں جاتا ۔

شام اس دنیا دار ولی سے ملاقات ہوگئی جو مٹی ڈھوتا پھرتا ہے ۔ آٹو آٹو کی تکرار سن کر جس سے میں نے پنڈ چھڑایا تھا ۔ نکھوں میں پھول اتر آنے سے جس نے اپنی موٹر کار بیچ دی تھی اور آٹو میں پھرتا تھا ۔ چاہتا تھا میں بھی اس کی طرح آٹو میں پھروں ۔ محبت ں آج کل آدمی پاگل نہیں ہوتا ۔ لیکن ایسا آدمی جو زندگی بھر کار میں بیٹھ کر بھی مٹی ڈھوتا رہتا ہے اور بینائی کھو کر دوسروں کو راستہ دکھانے نے مرحلہ میں یہاں تک مبتلا رہتا ہے کہ یہی زندگی کا آزار مزہ دے جائے ۔ وہ اخلاص میں بھی نیم پاگل تو ہو ہی جاتا ہے ۔

ایوان اردو گیا ۔ تمکنت سے اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا خوب صورت سا بردبار آدمی اٹھ کھڑا ہوا ۔ باچھیں کھل گئیں ۔
بہت دن بعد آئے آپ اور ایک بار تو بغیر ملے بھی چلے گئے ۔ میں سب خبر رکھتا ہوں ۔ صرف لب نہیں آنکھیں مسکرا رہی ہیں ۔ صحت اب کیسی ہے ۔ میں بس اب نکلنے ہی کو تھا ۔ اب آپ آگئے ہیں تو ایک چائے پی جائیے ۔ شکر کی گوا ساتھ ہیں کہ نہیں اور ہاں وہ دعوہرون نے کچھ اثر دکھایا کہ نہیں ۔ ناپ تول کر رک رک کر جملے ادا کرنے والا یہ شخص ۔ ایک سانس میں اتنی باتیں کر گیا ۔ لگتا ہے وہ اپنی محبتوں پر پہرے بٹھاتا رہتا ہے اور کالے شیشوں کی عینک سے باہر نہیں آنے دینے کا جتن کرتا ہے ۔ لیکن بے بس ہے ۔

چائے پی گئی ۔ کہا چلیے میں آپ کو چھوڑتا ہوا سیاست کے دفتر چلا جاؤں گا ۔

وٹھل واڑی پر مجھے اتار کر اس نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا ۔

کہا ۔ آپ کے نام آیا ہے میں دینا ہی بھول گیا ۔

گھر میں داخل ہوکر میں نے لفافہ کھولا ۔ سو سو کے دس نوٹ تھے اور ایک چھوٹے سے کاغذ پر لکھا تھا ۔ یہ آپ کے آٹو کرائے کے لیے ہیں، جب بھی آئیے ایک بار تو مل ہی لیجیے ۔ آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے ۔ ملاقات نہ ہو تو اچھا نہیں لگتا ۔

میرے ذہن نے کچھ نہ سوچا ۔ اس شخص نے کیسے وقت یہ سب کچھ کردیا میرے لیے ۔ اب میں یکایک سرافراز ہوگیا سربلند ، سرخ رو ۔ پلک جھپکاتے ۔ میں میاں الیاس کے مرین میڈیکل ہال میں کھڑا سولہ نوٹ گن رہا تھا ۔ نور محمد کے پریس میں پانچ ۳۲ نوٹ گن رہا تھا ۔ ابھی گھر سے نکلا بھی نہ تھا اور یہ سب کردیا تھا میں نے ۔ ذرا سوچ لینے پر جھاڑے تو خیال آیا کہ سو روپے آٹو کے لیے بھی جیب میں بچ رہیں گے ۔ آخر مجھے دینے والے کی خوشی بھی تو پوری کرنی ہے ۔

دوسرے دن میں نے آٹو لیا ۔ بینک سے پیسا نکالا اور اسی آٹو میں پہلے ملن صاحب عینک الیاس کی دوکان پہنچا ۔ یونین بنک کوٹھی سے اعجاز پریس قریب تھا اور مرین میڈیکل ہال دور ۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ پہلے الیاس کی رقم چکا دوں اور دوسری ضرورتیں جو اٹھا رہی ہیں ان کا سر کچل دوں اور شانت ہوجاؤں ۔ اس جذبہ ، این و آں پر فتح پالی تو وہاں سے چھتہ بازار روانہ ہوا کہ یہ میرے لیے پتھر کی لکیر تھی یا یوں کہیے کہ میرا آٹو ریل کی فولادی پٹڑی پر چل رہا تھا کہ کوئی بڑی سے بڑی ضرورت بھی پٹڑی بدل نہیں سکتی تھی ۔ نور سے مل کر گھر لوٹا ۔ آٹو والا بھی سوچ رہا ہوگا کہ آج کس معتبر آدمی سے سابقہ پڑا ہے ۔ یوں آٹو سے اترتا ہے اور یوں سوار ہوجاتا ہے ۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ غیر مرئی ولی بھی برابر میں بیٹھا ہوا خوش ہو رہا ہے اور میں اسے دیکھ دیکھ کر اترا رہا ہوں میں نے بھی اسی پر دھونس جمانے کے لیے ایک ہوٹل میں آٹو والے کی تواضع کی اور گھر پہنچ کر آٹو سے اترا تو وہ شخص سیٹ نہیں تھا ۔ بعضے زندگی میں ایسا سہانا وقت بھی ہم اردو والوں پر آجاتا ہے ۔ ۔ ۔ بیشک اللہ بڑا ہے ۔

اعجاز پریس میں مجھ جیسے بہت سے آتے ہیں ۔ کتاب چھپوانے والے ۔ اشتہار چھپوانے والے ، شادی کے رقعے چھپوانے والے ، ، چہلم کی دعوت " سیاہ حاشیے میں چھپوانے والے ۔ پوسٹر چھپوانے والے ۔ بابری مسجد نے نور محمد کو تہس نہس کے رکھ دیا ۔ نہ ہندو کے نہ مسلمان کے انسان بھی نہیں آدمی زاد کے دل میں سچائی ہو تو خدا در آتا ہے ۔ ضمیر کیسے کیسے ونشت لاتا ہے جب درعدہ صفت جھوٹ اس کو ساتھ لے کر پیچھا کرنے والے خدا سے ، بھگوان سے ، اوم سے ، بے تحاشا بھاگتا پھرتا ہے

یہ قول کیفی اعظمی کے رام کو دوسرا بن باس فرقہ پرست ذہنیت نے اس آسانی سے دے دیا کہ نہ لکشمن ساتھ۔ نہ سیتا۔ انھیں کبھی جنگلی درندوں سے لڑنا پڑا آج آدمی نما ذہنی درندوں سے۔ رام تو حق کا، صبر و تحمل کا، فرض شناسی کا، انسانی محبت کا استعارہ بن گئے تھے۔ بابری مسجد شہید ہوکر زمین پر بچھی تو سوالیہ علامت بن کر گھر گھر پہنچی۔ رام ہاتھ میں محبت کا کشکول لیے ساتھ ساتھ پھرے۔ کشکول خالی کا خالی رہا۔ فرقہ پرست سیاست نے جانے کتنے نور محمد اس کشکول میں ڈال دیے جو بلک بلک اٹھے۔ اپنا ذہنی توازن کھو کر سنبھلے، نہ سنبھل سکے تو اللہ کو پیارے ہوئے۔

نور محمد اپنے پریس میں بیٹھے اپنی ہی زندگی کی اونچ نیچ کو مسطح کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ گھر پر رہے تو ہمیشہ بے گھری ساتھ رہی۔ ان کے بعض کرم فرماؤں نے بزرگی کی آڑ میں اپنے کندھوں کا بوجھ ان کے سر پر اس طرح رکھ دیا کہ وہ "درگویم سنت پیغمبر است" چلاتے رہ گئے۔ شیراز کے سعدیؒ تو تھے نہیں کہ ستو لے کر سفر پر نکل جاتے لنٹے ان کے انھیں ہی نواہوں نے ان کا ستو باندھ کر بیچا کیا۔ اچھا خاصا جما جمایا کاروبار۔ چھتہ بازار میں اعجاز پریس نورؔ علی نور۔ پھول جیسے ہونہار بچے۔ ماں کی شفقت سے محروم، ممتا سے محروم۔ باپ کی زندگی اجیرن بن کر رہ گئی تھی تو ننھوں کی معصومیت نے وقت سے پہلے شعور کی صورت گری ذہن و دل میں کرلی۔ اسکول سے سیدھے اعجاز پریس آجاتے۔ باپ کے ساتھ گھر سے نکلتے باپ کے ساتھ گھر لوٹتے۔ اوبڑ کھابڑ راستوں پر زندگی بگ ٹٹ نہیں بھاگتی، گرتی سنبھلتی چلتی ہے۔ لیکن پھونک پھونک کر قدم دھرنے میں بھی تسکین کا سامان تو اللہ میاں فراہم کر دیتے ہیں سو تھا۔۔۔ گھر کا اضطراب پریس کی گھڑڑ گھڑڑ میں آنکھیں موند لیتا تھا۔ جاگتے میں خواب کی کیفیت ہو تو آوازیں جگاتی نہیں لوری بن جاتی ہیں۔ زندگی جب کسی ردم (RHYTHM) کو اپنا لیتی ہے تو کیا بجتے گھنگرو کیا زنجیر کی جھنکار۔ نانیت کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ نور محمد کو کھوتے جانے اور پاتے رہنے کا جیسے مزہ لگ گیا تھا۔

ایسا بے ضرر آدمی اپنے پریس میں بیٹھا دل کا حساب کتاب ذہن کو چکا رہا تھا۔ وہی تماشا چل رہا تھا جو زندگی بھر اس کی لمحوں کے سامنے گھر کی دیواروں کی اسکرین پر ہوتا تھا۔ اور اب وہ پریس میں بیٹھا اپنے تصور میں در آنے والے گھر کی دیواروں کے پردے چاک کرنے میں منہمک تھا۔ اس کے انہماک کی کسی کو خبر نہ تھی کہ پولیس کی جیپ پریس کے سامنے آکر رکی۔ سے چھتہ بازار میں کھلبلی مچ گئی۔ نور محمد جس کی شرافت کی سارا چھتہ بازار قسم کھاتا ہے اس سے پولیس کو کیا بیر۔ لیکن لوگ اکثر ؛ ہیں کہ ضرور بیر رہتا ہے اور غنڈوں سے دوستیاں۔ میں نہیں جانتا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ آج سے ۵۰ سال پہلے جب پیدا بھی نہیں ہوا تھا میرے ابا کا تقرر پولس ڈپارٹمنٹ میں انسپکٹر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ سربرآوردہ نوابوں کے انگلیوں پر گنے جانے والے خاندان کا یہ فرد۔ بڑے بخشی میر مجلس پائیگاہ آسمان جاہی کا صاحبزادہ جس کی نوابی کی مجھ نابکار نے لٹیا ڈبو دی، انسپکٹر وردی میں، گھوڑے پر سوار، امی کہتی تھیں بہت سجتا تھا۔ بہ مشکل سات دن ہوئے ہوں گے ابا گھر آئے۔ جمعدار سے اپنا نی بھجوا دیا۔ گھوڑے کی باگ اس کے ہاتھ میں تھمادی۔ کہا، سب انسپکٹر صاحب کو بھجوا دو۔ وردی ان کے حوالے کردوں گا پہنچا دیں گے۔ جمعدار سکار یعنی سرکار سرکار کہتا رہ گیا۔ امی سے مخاطب ہوکر کہا۔ اس ماحول میں تو میں سانس بھی نہیں لے نوکری کیا خاک ہوگی مجھ سے۔ یہ بات تو ۵۰ سال پہلے کی ہے۔ آج دنیا نے اتنی ترقی کرلی ہے تو محکمۂ پولیس نے کتنی ترقی ہوگی جب کہ ہمارے قومی رہنماؤں نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ ان کے نہ جرم پہچانے جاتے ہیں نہ ظلم۔ چناں چہ یہاں کا کہ

جیپ سے اتر نے والے سعد داروں نے نور محمد کو جیپ میں بٹھا لیا ۔ وہ پوچھتا رہ گیا کہ بھئی میرا جرم صاحبو ۔ کہا پولیس بے سبب کسی پر ہاتھ نہیں ڈالتی ۔

نور محمد کو جرم بتایا گیا ۔ اس کا جرم آنکھوں کے سامنے رکھ دیا گیا ۔ نور محمد کی پھٹی پھٹی آنکھیں بھیگ گئیں ۔

جانے [illegible]واز میں بات کرنے کی قوت اس میں کہاں سے آگئی ۔ اس نے زندگی میں پہلی بار للکار کر کہا ۔

" شرم کی بات ہے اس کو آپ جرم کہتے ہیں ۔ "

جرم یہ تھا کہ بابری مسجد کی شہادت پر ہندو اور مسلم لیڈروں نے قومی یک جہتی کو مزید تقویت دینے کے لیے ایک جلسے کا انعقاد کیا تھا ۔ اس جلسے سے دو کام نکلتے تھے ۔ عوام کے لیڈر اکثر " حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی " کے مصداق ایک حرکت میں دس برکتیں حاصل کر لیتے ہیں ۔ یہاں تو کام بہت معمولی تھا ۔ قوم میں فرقہ واریت کے خلاف جذبہ پیدا کرنا ، ساتھ ہی عوام میں اپنا نام اونچا کرنا ۔ اس اہم ترین جلسے کے لیے لیے پوسٹر کی ضرورت تھی جو چیخ چیخ کر پبلک کو اپنی طرف بلا رہا ہو ۔ لہذا " لیڈران کرام (جتنی سیاست گہری ہے اتنی ہی اضافت کے ساتھ یہ ترکیب نحوی بھی درست ہے) نے پوسٹر کا ڈزائین اس طرح بنوایا کہ بابری مسجد شہید کی جا رہی ہے اور شہید کرنے والے ہاتھوں سے خون رس رہا ہے ، بہہ رہا ہے اور مہکتا ہوا صاف نظر آرہا ہے ۔

جلسے میں تقاریر ، جھاڑنے والے " لیڈر ، ہندو بھی تھے مسلمان بھی ۔ بڑے اہتمام سے پوسٹر پر اپنے نام اور کام چھپوائے تھے ۔ نعروں میں ہندو مسلم اتحاد کی دہائی دی تھی ۔ نور محمد کے سان و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی اس پر فرقہ پرستی کو ہوا دینے کا الزام آئے گا ۔ پوسٹر ضبط کیے گئے تو قائدینِ صلح جن کو سانپ سونگھ گیا ۔ نور محمد شام ڈھلے پولیس کی حراست سے پریس آئے ۔ پریس بند کیا اور گھر پہنچے کہ اس گھر کا نام تو گھر ہی تھا ۔ یکا و تنہا ، بے یار و مددگار ، نہ کوئی سوگوار نہ کوئی غم خوار ۔ آنکھوں میں نہ آنسو نہ نیند کی پریاں ۔ خباثتوں کا آتشیں ننگا ناچ ناچتا ہوا اہرمن رات دیر تک جگاتا رہا ۔ آنکھ لگی تو نور محمد چیختا ہوا اٹھا ۔

" مجھے بچاؤ بچاؤ مجھے بہت بلندی ہے ۔ میں بہت بلندی سے نیچے گر رہا ہوں ۔ پرخچے اڑ جائیں گے میرے ۔ میں یہاں ہوں ، مجھے تھام لو ، بلندی اور بلندی ہو رہی ہے ۔ آؤ کوئی تو آؤ ۔ "

پروفیسر سید محمد کا بیٹا ۔ سٹی کالج کے طالب علم اور اساتذہ جس کی کم گوئی ، انکسار اور شرافت نفس کی گواہی دیتے تھے ۔ جس نے اپنا محبوب کی منڈی کا کوٹھی نما اونچی کرسی کا مکان ٹھیکریوں کے مول اس لیے بیچ دیا تھا کہ حکومت وقت نے کسبیوں کو اس بستی میں رہائش کا پروانہ دے دیا تھا ۔ کوئی " آشدی " محبوب کی منڈی میں بار پاسکتی تھی ۔ اس لیے اس نے آشدی ، چھوڑ دی تھی اور نور محمد اتنی بڑی جائداد سے محروم ہو کر چھتہ بازار کے اعجاز پریس میں آ بیٹھا تھا اور آج سارے چھتہ بازار کے پریس والوں کو نور محمد نے سبق پڑھا دیا تھا کہ بابری مسجد ڈھائی جا سکتی ہے لیکن اس کا پوسٹر نہیں چھاپا جا سکتا ۔

راتوں رات نور محمد کو اہرمن بہت بلندیوں پر لے جا چکا تھا ۔ تین چار رات وہ اسی طرح چیختا چلاتا رہا ۔ کچھ ہی دن میں ڈاکٹروں نے تشخیص کر دی کہ اسے برین ٹیومر (BRAIN TUMOR) ہو گیا ہے ۔ آپریشن ضروری ہے ۔ کم سے کم پچیس ہزار روپے لگ جائیں گے ۔ رضوان کو اپنے ماموں کے لیے چھپ چھپ کر رونے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا ۔ سوم شنکر جن کو ماسٹر صاحب ماسٹر صاحب پکارتے نور محمد کی زبان سوکھتی تھی ، وہ تو نور محمد کی ہر پریشانی میں اس کی قوت بن جاتے تھے ۔ لیکن اب یہ قوت جواب

گئی تھی ۔ ماسٹر صاحب نے نور محمد کی آنکھوں سے سلسلے آنسو چھین کر اپنی آنکھوں میں بھر لیے تھے اور نور محمد کو دلاسا دینے اپنی دل گرفتگی کو بھول بیٹھے تھے ۔ ان کے جی میں بس یہ سما گئی تھی ۔ کہ نور محمد کا علاج دواؤں سے ہوسکتا ہے ۔ آپریشن میں کا زیاں ہے ۔ چناں چہ نور محمد کا علاج جڑی بوٹیوں سے شروع کروا دیا گیا تھا ۔ میں نے ماسٹر صاحب کو مسکرا مسکرا کر نور محمد کی بندھاتے دیکھا اور یہ جان کر دیکھا ہے کہ ان کی ہنسی میں زخم بھر رہے ہیں ۔

اپنے چھوٹے بھائی سعدی تسکین کو نور محمد پر بیتی سنا رہا تھا ۔ میرے بھتیجے جاوید سعدی نے کہا کہ آپ اتنے فکر مند ہیں تو منان انکل کو ایک نظر بتا لیجیے صحیح مشورہ مل جائے گا کہ آپریشن ضروری ہے یا نہیں ۔ میں نے جاوید کی ستائش کی کہ اس نے دل کا بوجھ ہلکا کردیا ۔ ہم کسی نتیجے پر تو پہنچ سکتے ہیں کہ جیب پر نظر رکھ کر دماغ کے آپریشن کی بات کرنے والے سرجن ہزار اور بیس ہزار کی سودے بازی میں انسانی زندگی کی قدر و قیمت کو بھولے ہوئے ہیں ۔

میں دوسرے دن نور محمد کو کچھ بتلائے بغیر ڈاکٹر سید عبدالمنان سے ملا ۔ سارا ماجرا بیان کیا ۔ دل چسپی سے سنتے رہے ۔ میں محسوس کیا ، متاثر ہیں ۔ کہا پرسوں صبح دس اور گیارہ بجے دن کے درمیان انھیں لائیے متین بھائی ، کہنا کہ میڈیکل رپورٹس اور ایکس رپورٹس سب کی سب ساتھ رکھیں ۔

میں نور سے ملا نور نے کہا ۔ آپ کہیں تو ضرور چلتا ہوں لیکن منان صاحب ہارٹ اسپیشلسٹ ہیں ۔

میں نے کہا ہاں میں جانتا ہوں ۔ یہ بھی جانتا تھا کہ تم یہ ضرور کہوگے ۔ ہمیں منان صاحب سے علاج کروانا نہیں ہے ۔ نتیجے پر پہنچنے کے لیے ان سے مشورہ کرنا ہے ۔ یہ بات یاد رکھو نور میاں ، کوئی مرض ہو ۔ ایک سے ایک ڈاکٹر اور ایک سے سرجن مل جائے گا لیکن ڈاکٹر سید عبدالمنان نہیں ملیں گے ۔ بڑے ڈاکٹر بہت سے ہیں ۔ منان بڑے ڈاکٹر بھی ہیں بڑے انسان ان سے مشورہ کرنے پر ہم اس لیت و لعل سے تو نکل جائیں گے ۔ اگر منان کہہ دیں کہ آپریشن ضروری ہے تو سمجھ لو کہ ضروری ہے ۔ نور نے پوچھا ۔ میں کب اور کہاں آپ سے ملوں ۔ میرے بیٹے نوید اقبال کا مکان منان بھائی کے پاس جاتے نور محمد کے راستے میں پڑتا تھا ۔ چناں چہ میں نے نور کو اے ۔ سی ۔ گارڈس بلا لیا اور پھر ایک بار ہدایت کی کہ ساری کی ساری ساتھ رکھنا نہ بھولیں ۔ رضوان نے کہا ۔ جی ہاں میں ساتھ رہوں گا سب رکھ لوں گا ۔ ماسٹر صاحب نے مجھے احسان مند نظروں دیکھا ۔

نور وقت پر رضوان کے ساتھ آگئے ۔ میں گارڈن کے گیٹ پر ان کا منتظر تھا ۔ جاوید سعدی بھی اپنے مشورے کا رد عمل کے لیے پہنچ گیا تھا ۔ منان بھائی ہمارے منتظر تھے کہا اطمینان سے جو میں پوچھتا جاؤں بتلاتے جاؤ ۔ وہ پوچھتے رہے اور نور دماغ کے علاج کے لیے دل کھول کر رکھ دیا ۔

دیر تک ایکس رے رپورٹس دیکھتے رہے ۔ پھر میڈیکل رپورٹس دیکھیں ۔ کچھ دیر آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے ۔ سوچنے والی نکلے ہوئے ہونٹوں کے باہر مجھے نظر آرہی تھیں جو اداس نہیں تھیں ۔

نور سے مخاطب ہوئے ۔ میں سمجھتا ہوں آپریشن کی ضرورت نہیں ہوگی ۔ دواؤں سے اللہ ہو جائے گا ۔ پھر بھی پرسوں ۔ بجے فلاں کلینک پر آجائیے ۔ میں آپ کو بتلا کر دماغ کے ایک ڈاکٹر سے مشورہ کرلوں ۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ۔ نسخہ

(آگے ص ۳۳ پہ)

پروفیسر منیجر پانڈے
ہندی سے ترجمہ : دیویش

ادب کی سماجیات اور مارکسیت

ادبی فکر کے ادب برائے ادب اور انفرادیت پسندی کے مختلف نظریوں سے ادب کی سماجیات کا تصادم تو سب پر عیاں ہے ۔ نفسیاتی ، ساختیاتی اور اسلوبیاتی طریقوں سے بھی اس کی مبارزت ناقابل تردید ہے ۔ لیکن مارکسی تنقید سے ادب کی سماجیات کا رشتہ پیچیدہ اور متنازعہ فیہ ہے ۔ دونوں کے مابین ایک طرح سے انکار و اقرار یا ردّ و قبول کا رشتہ ہے ۔ دونوں میں اتحاد ہے اور آویزش و پیکار بھی ۔ عرصہ ، دراز سے دونوں میں مکالمے اور مناظرے کا عمل جاری ہے ۔ انتقادی دھارا مارکسیت سے مکالمہ قائم کرنے کی سعی کرتا ہے اور تجربیت پسندانہ دھارے سے اس کا مسلسل مناظرہ بھی نظر آتا ہے ۔

مارکسی تنقید سے ادب کی سماجیات کے رشتے کی پیچیدگی کا ایک سبب یہ ہے کہ بعض حضرات مارکسی تنقید کو سماجیاتی تنقید یا ادبی سماجیات تصور کر لیتے ہیں ۔ نظریہ ، ادب برائے ادب کے حامیوں اور ہیت پسندوں کا ایسا ہی ماننا ہے تجربیت پسند عمرانیاتی مفکر بھی مارکسی تنقید کو عمرانیات قرار دیتے ہیں ۔ یہ سب تو قابل فہم ہے ۔ البتہ پیچیدگی تب بڑھ جاتی ہے جب بعض مارکسی نقاد بھی عمرانیاتی تنقید اور مارکسی تنقید کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھ بیٹھتے ہیں ۔ ان میں سے کچھ مارکسی مفکر تو عمرانیات کو اثباتیت اور تجربیت پسندانہ عمرانیات سے علاحدہ کرنے کے لیے اس کو سائنسی یا جدلیاتی بھی کہتے ہیں ۔ دوسری جانب مارکسی نقادوں کی ایک جماعت ادب کی سماجیات سے مارکسی تنقید کے اتحاد کی مخالفت کرتی ہے ۔ بقول ٹیری ایگلٹن " مارکسی تنقید صرف ادب کی سماجیات نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ادبی فن پارے کی مزید جامعیت کے ساتھ تعبیر و تصریح کرنا ہے ۔ جس میں اس کی ہیت اسلوب اور معنی کے تئیں زیادہ ۔ حساس احتیاط کا مظاہرہ ہوتا ہے ۔ مارکسی تنقید فن پارے کی زمانیت ہی نہیں اس کی لازمانیت کی بھی وضاحت کرتی ہے ۔ مارکسی تنقید کی ایجادیت ، ادب کی تاریخی فہم میں نہیں بلکہ انقلابی فہم میں ہوتی ہے ۔ "

ٹیری ایگلٹن سے بھی ایک قدم آگے نکلتے ہوئے کلف شلاوٹر نے لکھا ہے کہ مسئلہ ادب کی مارکسی سماجیات کے فروغ کا نہیں بلکہ اصل سوال سماجیات سے ادب کے تحفظ کا ہے ۔ "کلف شلاوٹر امریکہ میں عمرانیات اور ادبی سماجیات دونوں کے حال زار سے واقف ہیں ۔ لہذا ان کی خفگی قابلِ فہم ہے لیکن تشویش تب ہوتی ہے جب وہ فرماتے ہیں کہ فکرِ ادب میں مارکس کی انقلابی میراث کو جارج لوکاچ اور گولڈ مان جیسے نقادوں نے غرق کردیا ہے اور صرف لسکی نے اس کو بچایا ہے ۔ ان کی اس کے پیشِ نظر یہ تشویش فطری ہے کہ وہ ادب کو عمرانیات سے بچاکر کہاں لے جانا چاہتے ہیں ۔ ان کا مرکزی اعتراض یہ ہے کہ سماجیات اس نظام کی غمازی کرتی ہے جو آرٹ اور ادب کی نشو و نما کے امکانات کو تلف کرتا ہے ۔ ایسی سماجیات پر ایستادہ ادب کی

ت اپنے اصل ضابطہ ، علم کے مقاصد سے علاحدہ نہیں ہوسکتی ۔

ایسے ادیبوں کی تعداد خاصی ہے جو مارکسی تنقید اور ادب کی سماجیات میں اتحاد قائم کرنا چاہتے ہیں ۔ ان میں سے چند ت کی حدود سے کماحقہ واقفیت رکھتے ہیں اور ان کو توڑ کر عمرانیات کو تاریخی مادیت بنانے کے بعد ہی آرٹ کی حقیقی سماجیات مکان پر غور کرتے ہیں ۔ ازروئے نکولس ہاجینکو لاذ عمرانیات محنت کش طبقے کی تحریکوں اور مارکسی خیالات کے روز افزوں اثر و کے خلاف رد عمل اور جواب کے طور پر فعال رہی ہے ۔ اس کا یہ کردار پہلے سے کہیں زیادہ نمایاں ہوکر سامنے آرہا ہے ۔ ں کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی کوئی بہتر شکل نہیں ہوسکتی ۔ یا کہ اس کا بہتر استعمال نہیں ہوسکتا ۔ کسی نئی سمت میں اس کی ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا تنقیدی محاسبہ کیا جائے ۔ تب ہی وہ تاریخی مادیت کی معاون ہوسکتی ہے ۔ اس اعتقاد تے ہوئے جینے ولف رقم طراز ہیں ۔ " میں نہیں مانتی کہ ہمیں سماجیات سے استفادہ کرتے ہوئے کسی طرح کا تکلفانہ یا خوابانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے ۔ اس سے بہرہ یاب ہونے سے ہم ان کے ہم نوا نہیں ہوجاتے جو سطحی ، محدود کن عمرانیات کے علم بردار ہیں ۔ تاریخی مادیت معاشرے کے مطالعے کا نظریہ ہے اور میں اس معنی میں سماجیات کو قبول کرتی " جینے الف نے تاریخی مادیت اور مارکسی تنقید کے تصورات سے استفادہ کرتے ہوئے آرٹ کی سماجیات کے امکان پر غور کیا پنی دوسری کتاب " جمالیات اور آرٹ کی سماجیات " (۱۹۸۳ ء) میں انھوں نے سماجیاتی جمالیات کا بنیادی خاکہ پیش کیا ہے ۔ ے انھوں نے ایک طرف قدیم جمالیات کو اظہاریت پسندانہ حدود سے آزاد کرنے اور دوسری جانب عمرانیاتی تسہیل سے جمالیات نا کے مسئلے سے بحث کی ہے ۔ انھوں نے ثبوتیت پسند عمرانیات کی عدیم القدری اور جمالیاتی غیر جانب داری کو رد کیا ہے ف نے اس کتاب میں متعدد بار مارکسی جمالیات کو آرٹ کی سماجیات سے تعبیر کیا ہے اور مارکس انگلس سے لے کر جارج ، کی فکرِ آرٹ کو عمرانیاتی نظریے کے ذیل میں رکھا ہے ۔ مارکسیت اور عمرانیات کے اتحاد کی بنیاد پر آرٹ کی سماجیات کو ینے کی ایک جراءت مندانہ کوشش آرنلڈ ہاوجیر نے کی ہے ۔ ادب کی سماجیات کے فروغ میں مارکسیت کا با معنی استعمال لیو ں ، لوسین گولڈ امان اور ریمنڈ ولیمس نے کیا ہے ۔

مارکسیت سے ادب کی سماجیات کے رشتے کے کماحقہ ، تفہیم کے لیے ادب کی عمرانیاتی فکر کی روایت پر ایک نظر ی ہے ۔ آج کل بعض لوگ ادبی سماجیات کو اثباتی تجربیت پسندانہ ادب کی سماجیات کا متبادل تصور کرلیتے ہیں ۔ یہ نیم ہے ۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ آج تجربیت پسندانہ ادب کی عمرانیات کی جو شکل اور غایت سامنے آئی ہے وہی غایت ابتدائی دور میں اثباتیت کی نہیں تھی ۔ ادب کی عمرانیاتی فکر کی روایت انیسویں صدی کی آغاز کے ساتھ شروع ہوئی تھی کا نصب العین ادب کے متعلق تاریخی نقطہ ، نظر کی نشو و نما تھا ۔ انیسویں صدی کو تاریخیت کے فروغ کی صدی قرار دیا جاتا ہے ہر شعبے میں تاریخی نقطہ ، نظر اور طریقہ ، کار کی ترقی اسی زمانے میں ہوئی ۔ فلسفہ ، سائنس ، سیاست ، اقتصادیات ، تاریخ نویسی نیز فکرِ ادب میں تاریخی نقطہ ، نظر کی ترویج کے ساتھ ترقی اور ارتقاء کے تصورات سامنے آئے ۔ اسی ذہنی فضا میں ادب کی ، بھی رونما ہوئی ۔

اس فکری دھارے کو باقاعدہ طور پر شروع کرنے کا سہرا فرانس کی مادام اسٹیل کے سر ہے ۔ ۱۸۰۰ء میں شائع ہوئی ان کی کتاب " معاشرتی اداروں سے ادب کے رشتے پر غور و فکر " سے اس فکری روایت کی داغ بیل پڑی ۔ مادام اسٹیل فرانس کی ایسی انقلابی خاتون تھیں جو نپولین کی آمریت کے خلاف بغاوت اور سرکشی کے باعث فرانس کو خیر باد کہہ کر طویل مدت تک جرمنی میں جلاوطنی کی زندگی گزارتی رہیں ۔ وہ اس وقت کے یورپ کے ادبی حلقوں کی متعدد نجندھری کہانیوں کی ہیروئن تھیں ، اور جرمنی کے عظیم ادیبوں اور مفکرین کے علاوہ ، احباب میں شامل تھیں ۔ جیسے گوئٹے ۔ ہیل ۔ بالدہ رقم طراز ہیں کہ مادام اسٹیل نے کانٹ ، گیٹے ، شیلر اور ہیگل کی تصانیف نیز خیالات سے ان فرانسیسی قارئین کو پہلی بار متعارف کرایا جو فرانسیسی نوکلاسکیت سے مایوس ہوکر فکرِ ادب کی نئی راہ کے متلاشی تھے ۔ مادام اسٹیل نے اپنی کتاب میں معاشرتی اداروں اور ادب کے رشتے پر غور کیا ہے اور سیاست اور ادب کے رشتے سے سیر حاصل بحث کی ہے ۔ ان کے تنقیدی جائزے میں ان گھڑپن ہے البتہ انقلابی جذبہ پوری کتاب میں موجود ہے ۔ ان کے خیالات سے بحث ہم آگے کریں گے ۔ بعض حضرات آج کل مادام اسٹیل کے ان گھڑپن پر خندہ زن ہیں ۔ ایسے لوگوں کی ذہنیت گنگا کی صفائی میں لگے ان لوگوں سی ہے جو خود کو بھگیرتھ سے بھی زیادہ اہم تصور کرتے ہیں ۔ مادام اسٹیل نے جب ادب کی معاشرتی نوعیت ، اس کی تاریخی حیثیت اور سیاسی اداروں سے اس کے رشتے پر غور و خوض کیا تھا تب نہ مارکسیت وجود پذیر ہوئی تھی ، نہ عمرانیات اور نہ ثبتیت ۔ اس وقت " جدید " اور " قومی " جیسے الفاظ کے نئے معنی فروغ پا رہے تھے ۔ اور عصری آگہی نیز نسلی شعور کے تصورات وضع ہو رہے تھے ۔ مادام اسٹیل کے تنقیدی جائزے میں یہ تصورات موجود ہیں ۔

انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے ادب کی عمرانیاتی فکر آج کی تجربیت پسندانہ سماجیت کی طرح نہیں تھی ۔ فریڈرک جیمسن نے ادب کی سماجیات کی ابتدائی صورت حال کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا جنم اس رومانی عہد میں ہوا جس میں تاریخ کی کھوج ہوئی ۔ اس کی بنیاد میں ثقافتی مُطلے کے اتحاد کا تصور تھا ۔ تاریخی اعتبار سے فنی تجربے کی اس توضیح کے فروغ میں بائیں بازو اور دائیں بازو کے حامی دونوں طرح کے مفکرین کا حصہ تھا ۔ وہ فکر اس وقت کے انقلابی تاریخی عمل کا ورثہ تھی ۔ ثبتیت اور عمرانیات دونوں کے بنیاد گزار اے کامتے ۱۸۱۸ء سے ۱۸۲۴ء تک سوشلسٹ سینٹ سائمن کے شریک کار اور سکریٹری تھے ۔ کامتے کی فکر میں جو جامعیت تھی وہ آج کے اثباتی تجربیت پسند ماہرین عمرانیات میں مفقود ہے ۔ یہی نہیں ادب کی سماجیات کے بنیاد گزار تین (Tain) ثبوتیت پسند تھے لیکن ان کی تاریخ ادبِ انگریزی میں تاریخی تناظر ، معاشرے کی کلیت کا ادراک ، اخلاقی اقدار کا شعور اور معاشرے میں انسان کی فضیلت مبرم کی فکر کار فرما تھی ۔ ان کے ادبی تنقیدی جائزے کے مقابلے میں آج کے تجربیت پسند معاشرتی مفکرین کا ادبی جائزہ پیروڈی معلوم ہوتا ۔ انیسویں صدی کے سماجی مفکرین اپنے معاصر علوم طبیعی کے ماہرین کی مسابقت میں معاشرہ ، ثقافت ، آرٹ اور ارتقائے ادب نیز طریق کار کے قواعد و ضوابط کی جستجو میں سرگرداں تھے ۔ اس مسابقت میں ان میں سے بعض مبالغے کا شکار بھی ہوئے ۔ آج کے تجربیت پسند معاصر سائنس کے سامنے مسکین بنے ہوئے ہیں ۔

انیسویں صدی کے وسط سے مارکسیت کے متوازی عمرانیات کی نشوونما شروع ہوئی ۔ کامتے ، اسپنسر وغیرہ نے تاریخی فکر کی جو روایت شروع کی تھی وہ میکس ویبر ، سمیل ، دورخیم ، مین ہائم وغیرہ کی مساعی سے تجربیت اور ہیئت پسندی کی جانب جیسے جیسے

آگے بڑھتی گئی ویسے ویسے وہ تاریخی تناظر سے دور ہوتی گئی ۔ امریکہ میں عمرانیات کی وہی تجربیت اور ہیئت پسندانہ روایت آج ہیئت تک شکل اختیار کرچکی ہے ۔

انیسویں صدی کے اختتام تک عمرانیات داں اختلاف کے باوجود مارکسیت سے مکالمہ قائم کرسکتے تھے ۔ اس کا ثبوت ہے میکس ویبر کی فکر ۔ بیسویں صدی کے تجربیت اور ہیئت پسندانہ عمرانیات سے مارکسیت کے مکالمے کا امکان بہت زیادہ نہیں ہے ۔ انیسویں صدی میں آرٹ یا ادب کی آزاد عمرانیات وضع نہیں ہوئی تھی ۔ اس وقت آرٹ اور ادب کی تاریخ کے ذیل میں ہی ان کی معاشرتی حیثیت اور اہمیت کا جائزہ لیا جاتا تھا ۔ مادام استیل اور تین (Teen) کی تحریروں سے یہی ثابت ہوتا ہے ۔ آرٹ اور ادب کی آزاد سماجیات کو فروغ بیسویں صدی میں حاصل ہوا ہے ۔ جس فکری روایت کا آغاز ایک انقلابی عمل کے جزو کے طور پر ہوا تھا وہ بیسوی صدی میں آکر خیر مبدیت کے ضابطہ ۔ علم میں محدود ہوگئی ۔ خیالات کی تاریخ میں انقلابی نظریوں کی ایسی پامالی ہوتی رہی ہے ۔

اگر چہ بیسوی صدی میں مارکسیت کے متوازی ایک مخالف نظریے کے طور پر عمرانیات کو فروغ حاصل ہوا ہے لیکن اسی صدی میں دونوں میں ربط پیدا کرنے کی کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں ۔ مارکسی تنقید سے ادب کا اتحاد قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مارکسیت اور عمرانیات کے مابین اتحاد قائم ہو ۔ مارکسیت سے عمرانیات کے اتحاد کے متعلق تین نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں ۔ ایک نقطہ ۔ نظر مارکسیت کو ہی اصل عمرانیات قرار دیتا ہے ۔ دوسرے کی رو سے عمرانیات مارکسی علوم انسانیہ کا ایک شعبہ ہے ۔ تیسرے نقطہ ۔ نظر کے عمرانیاتی مفکر تجربیت اور ہیئت پسندی کی حدود سے عمرانیات کو آزاد کرکے اس میں تاریخی مادیت کی خصوصیات کی نشوونما کی کوشش کرتے ہیں ۔ پہلے نقطہ ۔ نظر کے حامی مارکسیت کو عمرانیات بناتے ہیں اور دوسرے نیز تیسرے نقطہ ۔ نظر کے پیرو عمرانیات کو مارکسیت بناتے ہیں ۔ مارکسیت کو سماجیات بنانے والے پہلے تو جدلیاتی مادیت سے تاریخی مادیت کو علاحدہ کرتے ہیں یعنی اول الذکر کو وہ تصوری اور موخرالذکر کو عمل کا فلسفہ تصور کرتے ہیں ۔ پھر تاریخی مادیت کے عام ضوابط کو تاریخی عمل کے ٹھوس تنقیدی جائزے سے لگاتے ہیں ۔ اس کے بعد وہ تاریخی عمل کی کلیت کے ادراک سے مخصوص اور مقامی مسائل کے جائزے کو علاحدہ کرتے ہیں ۔ اور یہاں معاشرتی اداروں ، ساختوں اور گروہوں وغیرہ کے مسائل کے تنقید و تجزیے میں عمرانیات کے لیے جگہ بناتے ہیں ۔

مارکسیت کو سماجیات کے طور پر پیش کرنے کی مساعی مغرب میں ہی نہیں روس میں بھی ہوئی تھی ۔ روس میں ایسی ایک سعی نکولائی بخارن نے کی تھی ۔ ۱۹۲۱ء میں ان کی شہرہ آفاق تصنیف شائع ہوئی تھی " تاریخی مادیت ، مقبول عام سماجیات کی ایک نصابی کتاب " اس کتاب کے تیسرے روسی ایڈیشن کا انگریزی ترجمہ ۱۹۲۶ء میں منظر عام پر آیا تو کتاب کا نام قدرے بدل گیا تھا ۔ نیا نام تھا " تاریخی مادیت ، سماجیات کا ایک نظریہ ۔ " بخارن نے مارکسی فکر سے میکس ویبر ، سمیل اور سوم بارٹ کے خیالات کو ہم آہنگ کرتے ہوئے تاریخی مادیت کو ایک عمرانیاتی ۔ نظریہ بنادیا ۔ بخارن کی اس کتاب کی خوب تنقید بھی ہوئی ۔ پہلی اہم تنقید ۱۹۲۵ء میں جارج لوکاچ نے کی ۔ لوکاچ نے بخارن کے آسان کاری کے رجحان ، جعلی معروضیت اور تاریخ کی تعبیر و تشریح کی کمزوریوں کی سخت تنقید کی لوکاچ بخارن کی رو سے مادیت بورژوا مادیت ہے ۔ بخارن نے معاشرتی سائنس کو علوم طبیعی کا خدمت گزار بنادیا ۔ انھوں

نے لکھا تھا ۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہے کہ علوم طبیعی کے مانند ہی معاشرتی علوم میں بھی پیش گوئی ممکن ۔ بخارن کے اس ارتقا پسندانہ نظریہ ۔ جبر کی تنقید کرتے ہوئے جارج لوکاچ نے کہا کہ اس جبریت سے انقلابی عمل کا امکان تلف ہے ۔ لوکاچ نے تنقید کے آخر میں لکھا ہے کہ بخارن نے ہم عصر علوم طبیعی کا مادہ پرستانہ انتقاد کرتے ہوئے سرمایہ دا سے ان کا رشتہ دکھانے کے بدلے ان کے طریقہ ۔ کار کو پوری طرح اختیار کر کے معاشرے کا جو مطالعہ پیش کیا ہے اس میں شعور ۔ تاریخی تناظر اور جدلیات کی آگاہی کا فقدان ہے ۔

بخارن نے اپنی کتاب میں مارکسیت کو سماجیات بنانے کی جو کوشش کی تھی اس کی سب سے زیادہ اہم ۔ طو سخت تنقید انتونی گرامشی نے کی ۔ گرامشی نے وہ تنقید تب لکھی تھی جب وہ فاشسٹوں کی قید میں موت سے جوجھ رہے تھے ۔ نے آغاز میں ہی یہ سوال اٹھایا ہے کہ مارکسیت کو عمرانیات بنانے کے کیا معنی ہیں ۔ انھوں نے عمرانیات کی تاریخ اس کی اور غایت پر غور کرتے ہوئے مارکسیت کو لسماجیات بنانے کی مخالفت کی ہے ۔ بخارن نے جدلیاتی مادیت سے تاریخی مادیت کو کرتے ہوئے اول الذکر کو فلسفہ اور ثانی الذکر کو سماجیات کہا ۔ گرامشی نے مارکسیت کو اس طرح منقسم کرنے کی تنقید کی اور لا جدلیت اور مارکسیت کے انقلابی تاریخی تناظر کی سمجھ کے فقدان کی دلیل ہے ۔ گرامشی نے بخارن کے نقطہ نظر اور طریق کار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب کے فلسفیانہ رجحان کو اثباتی ارسطوئیت کہا جاسکتا ہے جس میں طبیعی علوم کی جگہ اصول معلول نے لے لی ہے نیز کریہہ ترقی پسندیت کا مابعد الطبیعیات سے گٹھ جوڑ ہوگیا ہے ۔ بقول گرامشی ۔ کتاب انحطاط ۔ میکانکی اور راسخ الاعتقادی کا عجیب و غریب امتزاج ہے ۔

بخارن نے نہ صرف مارکسیت کو سماجیات ہی نہیں بنایا تھا بلکہ انھوں نے کتاب میں آرٹ کی عمرانیات بھی تھی ۔ گرامشی نے ہیئت اور مواد کے رشتے نیز زبان کے متعلق بخارن کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی آرٹ کی ۔ پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے ۔ بخارن نے گیٹے کی جو تشریح پیش کی ہے اس کو گرامشی نے سطحی قرار دیا ہے ۔ گرامشی کے اس کتاب سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بخارن ۔ گیٹے کی تخلیق کی تاریخ ۔ عالمی ادب میں پرومیتھیو کے اسطور کے استعمال کی تاریخ او ادب میں اس کے تخلیقی استعمال سے ناواقف ہے ۔ کیا ان امور سے واقفیت کے بغیر گیٹے کی تخلیق کی تعین قدر ممکن ہے قدر اسی وقت با معنی ہوتی ہے جب وہ مستند اور یقینی ہو ۔ محض عمومی نوعیت کے اقوال کی کوئی اہمیت نہیں ۔ گرامشی نے کو سماجیات بنانے اور اس کی بنیاد پر آرٹ کی سماجیات خلق کرنے کی بخارن کی کوشش کی جو تنقید کی ہے ۔ اس کے گرامشی کی فکر ادب کو سماجیاتی ڈھانچے میں ڈھال کر گرامشی کے ادب کی عمرانیات وضع کرنے کی بعض لوگوں کی کوشش کو ہی کہا جائے گا ۔ ولیم کیو بوئلبور نے ایسی ہی کوشش ایک مضمون میں کی ہے جس کا تقریباً ترجمہ ہندی کے شہیر نقاد بچن ۔ کتاب " ادب کی عمرانیات اور ہیئت پسندی " میں موجود ہے ۔

ایسا نہیں ہے کہ روس میں عمرانیات سے مارکسیت کے اتحاد کی بات اب پرانی پڑگئی ہے ۔ ساٹھ کے دہے دونوں میں ارتباط پیدا کرنے کا جو پروگرام شروع ہوا تھا اس میں اب تیزی آئی ہے ۔ آج کل وہاں مارکسی ۔ لینینسٹ سماجیات؟

ہو رہی ہے اور اس کی بنیاد پر فنون کی سماجیات کا بھی فروغ ہورہا ہے ۔ وہاں کی سائنس اکیڈیمی میں عمرانیاتی تحقیق کا ایک ادارہ بھی ہے ۔ اس کے ڈائرکٹر پروفیسر وی این ایوانو نے اپنے ایک مضمون میں مارکسی لینینٹ عمرانیات کے طریقے سے متعلق مسائل سے بحث کی ہے ۔ ان کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ لینن نے بھی دو بار لفظ عمرانیات کا استعمال معاشرتی علم کے مفہوم کیا ہے ۔ چناں چہ روس میں جو عمرانیات وجود پذیر ہے اس کو مارکسی لیننسٹ سماجیات سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ خیر نام میں کیا رکھا ہے البتہ غور طلب بات یہ ہے کہ روس میں جو عمرانیات تشکیل پارہی ہے اس کی ہیئت اور غایت کیا ہے ۔ پروفیسر ایوانو کے مطابق مارکسی لیننسٹ سماجیات معاشرتی رشتوں ، سماجی عمل اور مختلف معاشرتی گروہوں کی نشوونما نیز سرگرمیوں کے قواعد و ضوابط کا علم ہے ۔ انھوں نے " روسی غیر مستعمل عمرانیاتی فرہنگ " کے مصنفین کی آراء جو درج کی ہیں جن کی رو سے عمرانیات معاشرتی گروہوں ، اداروں ، جماعتوں اور طریقوں کی نشوو نما نیز کارگزاریوں کے قوانین کا علم ہے ۔ مغرب کے مختلف ممالک میں معاشرتی نظام میں موجود تضادات اور تنافر کو دور کر کے اس کو مزید چست درست اور کامیاب بنانے کے لیے عمرانیات میں انھیں امور کا مطالعہ کیا جاتا ہے

ادھر روس میں فن اور ادب کی سماجیات کی جانب مراجعت کا رجحان بڑھ رہا ہے ۔ ماریا کرجنیان نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ فن پاروں کے مطالعے کے عمرانیاتی اصولوں کو بار بار فرسودہ وازکار رفتہ قرار دیا جاتا ہے ۔ لیکن سائنس کی ترقی سے بار بار ان کی معنویت ثابت ہوتی ہے ۔ اب یہ واضح ہوتاجارہا ہے کہ عمرانیات کے اصولوں میں ارتقاء ، تفصیل اور ہم ربط باہمی کی جتنی قوت ہے اتنی اور کسی میں نہیں ۔ اس مضمون میں ادبی فن پاروں کے عمرانیاتی مطالعے کے روسی اور مغربی طریقہ کار میں فرق بتایا گیا ہے لیکن مارکس ، مہرن ، پلیخانوف ، لینن ، لونا چرسکی کو ادب کے عمرانیاتی نقطہ نظر کا معمار بھی ، کہا گیا ہے ۔ پس واضح ہے کہ مضمون میں مارکسی تنقید کو عمرانیاتی اصول مانا گیا ہے ۔ مصنفہ کی رائے میں مغرب کی سماجیاتی فکر دل چسپ اور سبق آموز ہے کیوں کہ اس میں ادبی تجزیے کے ذریعے آج کے معاشرے میں انسان کی شناخت کی کوشش ہے البتہ اس میں تاریخی تناظر کا فقدان ہے جو اس کی سب سے بڑی کم زوری ہے ۔ مغرب کے متعدد ادبی عمرانیات دانوں نے اس کم زوری کو رفع کرنے کی کامیاب سعی کی ہے ۔ عمرانیات اور مارکسی تنقید کو ملانے کی مساعی کے پیش نظر ایک سوال بار بار ابھر کر آتا ہے کہ کیا تجربیت پسندانہ عمرانیات میں تاریخی تناظر اور اقداری شعور کے انضمام سے وہ مارکسیت بن جائے گی ۔

مارکسیت کو کٹر پن سے نجات دلانے نیز اسے مزید وقیع تخلیقی ، تنقیدی اور عصری بنانے کی کوششیں مارکس کے وقت سے آج تک مسلسل ہوتی آرہی ہیں ۔ ایسی مساعی کی پشت میں کہیں نیک نیتی ہوتی ہے تو کہیں مکاری ۔ اسی عمل میں مطابقت پسندی سامنے آتی ہے ۔ قابل غور امر یہ ہے کہ مطابقت کے عمل میں مارکسیت کیاکھوتی ہے اور کیا پاتی ہے ۔ ادب کی عمرانیات اور مارکسیت کی ربط باہم کی تاریخ پر توجہ کریں تو ایک بات واضح ہوگی کہ مارکسیت کا انقلابی شعور اس عمل کا سب سے پہلے شکار ہوتا ہے ۔ بیش تر ادبی سماجیات داں طبقاتی کش مکش اور اس کے سیاسی مفہوم کو رد کرتے ہیں ۔ آرٹ کی تاریخ نویسی اور اس کی سماجیات کی تعمیر میں آرنلڈ ہاؤجیر کی خدمات بہت اہم ہیں ۔ وہ مارکسیت کے نظریے اور عمل میں فرق کرتے ہیں نیز وہ نظریے سے اس کی سیاست کو

بھی علاحدہ کرتے ہیں ۔ باؤجیر مارکسیت کو معاشرے اور تاریخ کے فلسفے کے طور پر قبول کرتے ہیں ۔ جدلیت کو اختیار کرتے ہیں ا آرٹ کی تاریخ نویسی نیز عمرانیاتی جائزے میں تاریخی نقطۂ نظر اور جدلیاتی طریقِ کار کا استعمال کرتے ہیں ۔ لیکن مارکسیت کے سیاسی مظہر سے اپنی تحریروں کو دور رکھتے ہیں ۔ انھوں نے آرٹ کی سماجیات کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مارکس نے تصوری اور عمل کے اتحاد کا جو نظریہ پیش کیا تھا اس کے علی الرغم اس کتاب میں سیاسی مارکسیت سے مبرا صرف نظری مارکسیت کو قبول کیا گیا ہے ۔ کتاب میں ایک اعتقادیہ بھی ہے کہ ہم مارکسیت کی سیاست کو رد کرتے ہوئے محدود معنوں میں سوشلسٹ بنے بغیر بھی مارکسیت کی تاریخ از فلسفے کو اختیار کر سکتے ہیں ۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ ہم مارکسیت کے غیر طبقاتی معاشرے کی پیش گوئی کی مابعد الطبیعیات سے بچ سکتے ہیں ۔ تاریخی مادیت کے متعدد اعتقادات کو باؤجیر نے ادعائی کہہ کر خارج کردیا ہے ۔

آرٹ کی عمرانیات کی تشکیل میں جو حیثیت آرنلڈ باؤجیر کی ہے وہی حیثیت ادبی سماجیات کی ۔ نشوونما میں لوسین گو امان کی ہے ۔ گولڈ امان کے مطابق مارکس کا سرمایہ دارانہ معاشرے کا تجزیہ فرسودہ ہوگیا ہے البتہ سرمایہ دارانہ سماج میں انسان کی قضا مبرم کا تجزیہ ۔ بالخصوص بے ربطی اور اجنبیت کی اساس میں مضمر تجسیم (Reification) کا تجزیہ پہلے سے کہیں زیادہ مفید مطلب ہو ہے ۔ بقول ان کے مارکس کی فکر کی دو جہات ہیں ۔ ایک میں سرمایہ دارانہ معاشرے میں اکثریتی محنت کش طبقے کی روز افزوں غربت او اس میں انقلابی شعور کی نشوونما کے امکان پر اصرار ہے ۔ دوسری میں تجسیم کا تنقیدی جائزہ ہے ۔ پہلی جہت انیسویں صدی کے نصف آخر میں بامعنی تھی لیکن دوسری جہت آج نسبتاً زیادہ معنی خیز ہوگئی ہے ۔ دراصل تاریخ کا اصل ارتقا مارکس کی توقع اور پیش گوئی کے مخالف سمت میں ہوا ۔ آج محنت کش طبقے کے انقلابی شعور کی بات کرنا اسطور میں زندگی کرنے کے مانند ہے ۔ آرنلڈ باؤجیر اور گو امان کی باتوں پر غور کرنے والا کوئی بھی شخص یہ سمجھ لے گا کہ ان کی فکر سے مارکسیت کا کون سا پہلو غائب ہوگیا ہے ۔ ادب کے بیش تر ماہرین عمرانیات خیالات کی کش مکش کے سیاق میں مارکسی بنے رہتے ہیں لیکن طبقاتی کش مکش کا حوالہ آتے ہی عمرانیات داں ہوجاتے ہیں ۔

ویسے ادب کی سماجیات میں جس انقلابی شعور کے فقدان کی بات کی جاتی ہے وہ مارکسی تنقید میں ہمیشہ نہیں ملتی ۔ اگر ہم اردو ۔ ہندی کی مارکسی تنقید پر توجہ کریں تو یہ حقیقت سادہ طور پر سامنے آجائے گی ۔ تاریخ کی انقلابی فہم مارکسی تنقید کا معیار ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ ہر جگہ حقیقت بھی ہو ۔ اردو ۔ ہندی میں ایسے مارکسی نقادوں کی تعداد زیادہ ہے جو انقلاب اور ادب دونوں کے ضمن میں اپنی مخصوص ، فہم کے باعث دونوں کا نقصان کرتے ہیں ۔ " ہندی میں ایسے مارکسی تنقید نگار ہیں جو خود کو سماجیت کے ایک سرے پر کھڑا رکھتے ہیں اور باقی سب کو دوسرے سرے پر یعنی ہیئت پسندی کے ساتھ کھڑا دیکھتے ہیں تو چند نقاد ایسے بھی ہیں جو ہیئت پسندی سے ہم آغوش رہتے ہوئے دوسروں کو عمرانیت کا صید زبوں تصور کرتے رہتے ہیں ۔

دور حاضر کا سب سے چالو محاورہ ہے " پر امن بقائے باہمی "۔ باہم دگر مخالف طبقات ، نظریات اور معاشرتی نظاموں میں پر امن ہم موجودیت کی جستجو ہورہی ہے ۔ جب سوشلزم اور سرمایہ داری کے مابین پر امن ہم موجودیت ممکن ہے تب مارکسیت سے عمرانیات کی مطابقت کیوں نہیں ممکن ہوگی ۔ آج کل میدان غور و فکر میں مطابقت کی جو دیو قامت سعی جاری ہے اس میں علم تاریخ

(آگے ص ۵۳ پر)

ڈاکٹر ضیاء الدین

کرشن چندر کی افسانہ نگاری

کرشن چندر جو ادبی دنیا میں ایک افسانہ نگار، ناول نگار، اور ڈراما نگار کی حیثیت سے مقبول و معروف ہوئے لیکن جس میدان میں انھوں نے اپنی فن کاری کا سب سے زیادہ لوہا منوایا وہ افسانہ نگاری ہے۔ کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء افسانہ نگاری سے کی۔ ان کی پہلی تخلیقی کاوش ایک مختصر افسانہ تھا۔ جو "یرقان" کے نام سے ۱۹۳۵ء میں "ادبی دنیا" میں شائع ہوا (۱)۔ دوسرا افسانہ "مصور کی محبت" اور تیسرا افسانہ "جہلم میں ناؤ پر" رسالہ ہمایوں لاہور سے شائع ہوئے۔ یہ تینوں افسانے انھوں نے قیام کشمیر کے دوران لکھے۔ ان کے ابتدائی افسانوی مجموعے طلسم خیال میں ایک طرف رومانی فضا ملتی ہے تو دوسری طرف کشمیر کی سرزمین کے دل فریب نظارے۔

ابتداء میں کرشن چندر اپنے پیش رووں میں سے پریم چند کی حقیقت نگاری کے بجائے رومانی افسانہ نگاروں، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، اور مجنوں گورکھپوری سے زیادہ متاثر رہے۔ لیکن اس رومانیت کو پیش کرتے ہوئے وہ رومانی افسانہ نگاروں کی طرح زندگی سے مکمل فرار حاصل نہیں کرتے۔ بلکہ زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرتے ہیں اور انھیں بدلنے کا خواب بھی دیکھتے ہیں۔ اس مجموعے کا جائزہ لیتے ہوئے خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں۔

> "ان کا پہلا مجموعہ طلسم خیال ان کے رومانوی مزاج کا نقش اولین ہے لیکن کرشن چندر کی رومانیت زندگی سے فرار، موت کی آرزو، خیالی دنیا میں پناہ گزینی کی تلقین نہیں کرتی۔ بلکہ زندگی کو بدل دینے کی ایک والہانہ بے تابی کا نام ہے۔ سماج کی تلخ حقیقتوں کو کرشن چندر نے خوب صورت لہلہاتے مرغ زار اور گیت گاتے ہوئے آبشاروں کے گرد بھی محسوس کیا ہے۔" (۲)

کرشن چندر کا رومانوی انداز نہ صرف ان کے ابتدائی افسانوی مجموعے میں چھایا نظر آتا ہے بلکہ حقیقت پسندی اور اشتراکی نظریے سے وابستہ ہونے کے بعد بھی جو افسانے انھوں نے لکھے ان میں بھی رومانی عنصر موجود تھا۔ اس کا سبب کچھ تو بچپن میں کشمیر کی حسین وادی اور دل فریب نظاروں میں گزارے ہوئے لمحات تھے۔ کشمیر کی حسین وادی کا حسن، ان کے دل و دماغ پر ایسا چھایا رہا کہ وہ پہلو بدل بدل کر ان کے افسانوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ جیسے انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر پر تقسیم وطن کا المیہ۔ کشمیر کے فطری حسن سے بجا طور پر متاثر ہونے کے علاوہ کچھ ان کے مزاج اور فطرت میں بھی رومانیت رچی بسی تھی۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

> "میں حقیقت پسندی کو اختیار کرتے ہوئے ہمیشہ تھوڑا سا رومان پسند بھی رہا۔ خوب صورتی اور شاعری کا

دامن مکمل طور پر کبھی نہ چھوڑ سکا۔" (۳)

کرشن چندر کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "نظارے" ہے۔ یہاں وہ رومانوی ماحول سے نکل کر حقیقت پسندی کی بڑھاتے نظر آتے ہیں۔ رومانوی ماحول سے نکل کر تلخ حقائق کا سامنا کرتے ہوئے وہ خود کو ایک عجب کشمکش میں مبتلا پاتے "نظارے" کے افسانے نمایاں طور پر اس کش مکش کا پتہ دیتے ہیں۔ اس مجموعے کے تقریباً سارے افسانوں میں کرشن چندر تک پہنچنے کے لیے بے قرار نظر آتے ہیں۔ اور اسی بے قراری کے باعث ان کے ہاں دو مختلف راہیں نظر آتی ہیں اس مجموعے میں رومانی افسانوں کے ساتھ ساتھ بے رنگ و بو، جنت اور جہنم، خونی ناچ، دل کا چراغ، دو فرلانگ لمبی سڑک حقیقت پسندانہ اور انسانی مسائل سے متعلق یادگار افسانے بھی ہیں۔ ان افسانوں میں ان کا فن ایک خوش گوار تبدیلی سے ر۔ ان کی طبیعت رومان نگاری کے ساتھ ساتھ سماجی حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوئی۔ "نظارے" کے تقریباً تمام افسانے حقیقت کی کش مکش سے دوچار نظر آتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ جب ان کے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کا رنگ گہرا ہوتا گ نے فطرت کے حسین مناظر کے دل فریب اظہار سے رومان کو قائم کھا، اور اپنے افسانوں میں رنگینی کا عنصر باقی رکھنے۔ فطرت کی بہترین عکاسی کی۔ ان کی رومانیت فطرت سے وابستہ ہے۔ فطرت کے ساتھ انسان کے دائمی رشتے کا احساس ا زیادہ ہے۔ فطرت ان کے نزدیک کوئی خارجی شئے نہیں۔ ان کے افسانوں میں آدمی کے ساتھ ساتھ فطرت بھی سانس لی جاگتی محسوس ہوتی ہے۔ جس کی مثال "دسواں پل" "زندگی کے موڑ پر" اور "گرجن کی ایک شام" میں ملتا ہے۔ فطرت ہاں ایک زبردست اور پر اسرار قوت کے روپ میں بھی ابھرتی ہے۔ جو قنوطیت اور مایوسی کو ختم کر دیتی ہے۔ وہ فطرت کا سب سے بڑا دوست سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کی پے چیدہ اور گھناؤنی حقیقتوں سے بھاگ کر دیہات کی کھلی میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ اور وہ اپنے زیادہ تر موضوعات بھی وہیں سے تلاش کرتے ہیں جہاں معاشی و سیاسی نظام کی خرا حسن، عشق اور فطرت کی معصومیت کو چھین لیا ہے یا چھین رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی پلاٹ اور کرداروں سے زیادہ فضاء اور منظر نگاری ان کے یہاں زیادہ اہم ہوجاتی ہے۔ زیادہ تر افسانوں میں کردار اپنے وجود کا بھر پور احساس نہیں دلا پاتے ہیں۔ اسی وجہ سے کردار نگاری کے معاملے میں انھیں وتند تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

"ان کے کرداروں کے پاس چہرے نہیں ہیں۔ وہ صرف دماغ ہیں۔ وہ قدیم افسانے کے ہیرو کی طرح تقریر کرتے ہیں، اور یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ کس طبقے کے فرد ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں میں سچے کرداروں کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ وہ اس کی بات کہنے اور اس کے اپنے تاثر کو من و عن بیان کرنے والی کٹھ پتلیاں ہیں، جن کی اپنی کوئی شخصیت نہیں" (۴)

خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں،

"تقسیم ہند کے بعد ان کی افسانہ نگاری میں ٹھہراؤ کم اور خطابت کا عنصر بڑھتا گیا۔ ان کے کردار آہستہ آہستہ اپنی جسمانی حیثیت اور عمل سے علاحدہ ہو کر صرف خیالات کے ہیولے بنتے گئے۔ ان خیالات پر کرشن چندر

کا اپنا زاویہ ، نظر حاوی ہے ۔ ہر جگہ کرشن چندر خود بولتے ، تقریر کرتے یا انقلاب و مساوات پر درس دیتے نظر آتے ہیں " ۔ (۵)

وارث علوی لکھتے ہیں ؛

" اپنے اسلوب کے ذریعے کرشن چندر افسانے پر اس قدر چھائے رہتے ہیں کہ افسانہ اپنے قوت نمو سے پھل پھول کی استعداد ہی پیدا نہیں کرپاتا ۔ ان کے افسانوں میں کہانی ، کردار ، واقعات اور میلیو کی کوئی اہمیت نہیں حالاں کہ یہی وہ عناصر ہیں ، جن کے ظہور ترتیب سے افسانہ وجود میں آتا ہے ۔ کرشن چندر کی کہانی کمزور ہوتی ہے ، اور اسے دل چسپ بنانے کے لیے وہ پلاٹ کو ایسے موڑ دیتے ہیں ، کہ کہانی پر کردار قربان ہوجاتے اور تھیم غارت ہوجاتی ہے ۔ (۶)

کرشن چندر کے افسانوں پر کردار نگاری کی سطح پر یہ الزامات پوری طرح درست نہیں ہیں ۔ بے شک کرشن چندر کے تمام افسانوں میں کامیاب کردار نگاری نہیں ملتی ۔ ان کے افسانوں میں کرداروں کو ان کے تمام تر داخلی و خارجی تصادم کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش بھر پور انداز میں نہیں ہوئی ہے ۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے کئی افسانوں میں کامیاب کردار ملتے ہیں ۔ جن میں تائی ایسری ، کالو بھنگی ، موبی ، بھگت رام اور کچرا بابا کے مرکزی کرداروں کو نمونے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے ۔

تائی ایسری لازوال محبت کا سمبل ہے ۔ جو انسانوں سے بھی اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنی عقیدت اس کو بھگوان سے ہے جس کا عملی ثبوت وہ اپنی جاں نثاری ایثار و وفاشعاری سے دیتی ہے ۔ اس میں کرشن چندر نے انسانیت کے پہلو کو بھر پور انداز میں ابھارنے کی کوشش کی ہے ۔

کالو بھنگی کا کردار ایک فطری کردار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتا ہے ۔ اس کردار کا عام لوگوں سے برتاؤ اور اس کا بے پناہ جذبہ خدمت و ایثار ، اس کی شخصیت کے ایسے پہلو ہیں جسے انسانیت کے لیے پیمانہ ، قدر بنایا جاسکتا ہے ۔ سماجی جبر کے رد عمل میں وہ کسی قسم کے سفلی پن کا مظاہرہ نہیں کرتا ۔ اس کردار کا فطری پن اپنے خالق کو مداخلت کا موقعہ نہیں دیتا ۔ تائی ایسری اور کالو بھنگی کے کردار تاریکی میں روشنی کی علامت بن کر ابھرتے ہیں اور ناساعد حالات کی آندھی اور طوفان بھی اس روشنی کی حفاظت کرتے ہیں ۔

کرشن چندر کا اہم کارنامہ افسانہ نگاری میں بے پناہ تنوع پیدا کرنا ہے ۔ موضوعات کے تنوع کے ساتھ ان کے کرداروں میں بھی تنوع ملتا ہے ۔ انھوں نے ہر طبقے ، ہر فرقے ، ہر مذہب ، ہر خطے کے ادنی و اعلی کرداروں کو ان کی مخصوص و منفرد صفات کے ساتھ پیش کیا ہے خاص طور پر سماج کے دبے کچلے طبقے کے کرداروں کو جو تمام عمر محرومیوں ، ناکامیوں ، بیماریوں اور ذلتوں کا سامنا کرتے ہیں ۔ ان کرداروں کو پیش کرتے ہوئے وہ ایسے موضوعات بھی تلاش کرتے ہیں جہاں ان کرداروں کے عشق اور فطری معصومیت پر معاشی و سیاسی نظام کی خرابیوں نے چھاپہ مارا ہے ۔ ان کو پیش کرتے ہوئے وہ زبان و بیان ، فضاء بندی اور منظر نگاری کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں ۔

ان اوصاف سے ان کی کمزور کہانیاں بھی خالی نہیں ہیں ۔ اکثر کہانیوں میں کرشن چندر کی خود اپنی شخصیت بھی جھ
بقول ڈاکٹر صادق ،

" کرشن چندر کے اکثر افسانوں میں ایک تعلیم یافتہ ، حساس اور باغی نوجوان کا کردار ملتا ہے ناسازگار سماجی اور سیاسی ماحول میں سانس لیتا ہوا خود کو بے بس پانے والا یہ جوشیلا کردار ایک سوچتا ہوا ذہن ہے ۔ یہ کردار خود کرشن چندر ہے جو مختلف افسانوں میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہونے کے باوجود بنیادی طور پر ایک ہی نظر آتا ہے ۔ " (۸)

تقسیم وطن کے بعد کرشن چندر نے کثرت سے مختلف موضوعات پر افسانے لکھے جن میں مجموعی طور پر ان د بالکونی ، گرجن کی ایک شام ، مہا لکشمی کا پل قابل ذکر ہیں ۔ فرقہ وارانہ فسادات پر لکھے گئے افسانے " ہم وحشی ہیں " کے کتابی شکل میں شائع ہوئے ۔ ان میں پشاور اکسپریس ایک منفرد افسانہ ہے ۔ یہ افسانہ کرشن چندر نے ایک ٹرین کی زبانی بیان کرو جب انسان مذہب کے نام پر وحشی درندہ بن کر انسانیت کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا ۔ کرشن چندر نے ایک بے جان اور ٹرین کو زبان دے کر انسان کی وحشیانہ زندگی اور بے حسی پر زبردست طنز کیا ہے ۔

کرشن چندر کے طرز تحریر کی ایک نمایاں خصوصیت طنزیہ و مزاحیہ انداز بیان ہے ۔ طنز ان کا ایک خاص حربہ ہے ضرورت کے وقت کام میں لاتے ہیں ۔ طنز و مزاح کا جوہر ان کی فطرت میں ابتداء ہی سے موجود تھا ۔ انھوں نے اپنے طا کے زمانے کے " پروفیسر بلیکی " میں بھی طنزیہ انداز اختیار کیا ہے ۔ یہ افسانہ انھوں نے اپنے فارسی کے استاد ماسٹر بلاقی ، چسپ شخصیت سے متاثر ہو کر لکھا ہے ۔ " ہوائی قلعے " ان کے طنزیہ و مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ لیکن طنز کا عنصر ان بھی کئی افسانوں میں ملتا ہے ۔ جن میں " دو فرلانگ لمبی سڑک ، زندگی کے موڑ پر ، ان داتا ، اردو کا نیا قاعدہ ، مہا لکشمی کا سے آگے ، موبی ، ہم وحشی ہیں ، ایک گرجا اور ایک خندق ، الٹا درخت قابل ذکر ہیں ۔ طنز کے لیے جو سفاکی اور سرد مہری وہ کرشن کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے ۔ زندگی ، سماج اور معاشرے کی ناہمواریوں کو دیکھ کر ان پر شدید غم و غصہ غیظ و یاسیت طاری ہوجاتی ہے اور پھر وہ معاشرے کی ناہمواریوں اور غلط کاریوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں ۔

کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیں تو بہت سی خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں ۔ جن میں موضوعاتی ، ہیئتی ، تک اہمیت کی حامل ہیں ۔ انھوں نے اردو افسانے کے میدان میں فن اور تکنیک کی سطح پر کئی اضافے کیے ۔ انھوں نے ر روؤں کی تقلید کرنے کے بجائے اپنی ایک علاحدہ راہ اختیار کی ۔ پلاٹ کی سطح پر ان کے تجربات خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ ا کئی کہانیاں روایتی پلاٹ کے بغیر تخلیق کی ہیں ۔ پلاٹ سے متعلق اپنے افسانوی مجموعے " سرخ حاشیے " میں لکھتے ہیں :

" بہ ظاہر نہ اس پلاٹ کی کوئی ابتداء ہوتی ہے ۔ نہ انتہاء ۔ خیال کی ایک رو ہے جو شروع سے آخر تک چلی آتی ہے ۔ کبھی پلاٹ کا جو نقطہ آخر ہوتا ہے وہ خود ایک نئے پلاٹ کی تمہید ہوسکتا ہے ۔ " (۸)

جن افسانوں کو انھوں نے پلاٹ کی قید سے آزاد رکھا وہ افسانے بھی ان کے کامیاب افسانے ہیں ۔ جیسے دو فر سڑک ، ایک گرجا ایک خندق ۔ یہ افسانے موضوع ، ساخت ، مواد اور تکنیک کی جدت کے لحاظ سے منفرد اور تاثر سے بھر

ثن چندر نے اپنے انداز بیان کی جدت اور تازہ کاری سے اپنے افسانوں میں نیا پن پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے ۔ ان سانوں میں پتھر کا گیت ، شہتوت کا درخت اور بھیروں کا مندر لیجئے ہے ۔ یہ انداز روایت میں ایک طرح کی توسیع ہے ۔ تکنیک کی سطح ۔ بھی ان کے ہاں تنوع ملتا ہے ۔ بقول سید احتشام حسین ۔ تکنیک ان کے ہاتھوں میں گیلی مٹی کی طرح ہے ۔ جسے وہ غیر معمولی فن ر ادراک کی مدد سے حسین سانچوں میں ڈھال سکتے ہیں ۔ "

اخر میں کرشن چندر کے اسلوب بیان کا مختصر جائزہ بھی لیتے چلیں کیوں کہ اسلوب بیان کا افسانے کی کامیابی سے گہرا ق ہوتا ہے ۔ خوب صورت اور دل فریب اسلوبِ بیان کے بغیر ایک افسانہ کامیاب قرار نہیں دیا جاسکتا ۔ اسلوبِ بیان سے ہی سانہ نگار کی انفرادی شناخت نمایاں ہوتی ہے ۔ کرشن چندر کا اسلوبِ بیان اتنا جان دار ہے کہ ان کے اکثر افسانوں کی دیگر خامیوں پر ہ ڈال دیتا ہے ۔ زبان و بیان کی قدرت ان کی تحریروں میں تازگی ، شگفتگی ، رعنائی ، دل کشی اور ندرت پیدا کردیتی ہے ۔ ان کا ب غنائی ہے ۔ یہ عنصر انھیں اپنے ہم عصروں سے علاحدہ کرکے اردو افسانے کا سب سے بڑا شاعر بناتا ہے ۔ سردار جعفری اس ب کو غزل کے مترادف قرار دیتے ہیں ۔ اور وارث علوی کے خیال میں :

" جس قسم کا غنائی تخلیقی مزاج لے کر کرشن چندر پیدا ہوئے تھے اسے وہی زبان نکھار سکتی تھی جو خود نکھری ہوئی ہو ۔ اس زبان کے رنگ و آہنگ کی لطیف ترین لرزشوں کو کرشن چندر نے محسوس کیا اور اپنے احساسات کی نازک ترین کپکپاہٹوں کو انھوں نے اس زبان کے الفاظ میں سمودیا ... کرشن چندر کے مضراب کا ہلکا سا لمس ایک لفظ سے ہزار سر پیدا کرتا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ اظہار و بیان کی خراد پر چڑھا ہوا اردو کا لفظ آوازوں کی ایک دنیا کو اپنے بطن میں لیے ہوئے ہے ۔ ہر لفظ ایک سر بہار ہے اور کرشن چندر زبان کا سب سے بڑا نغزہ زن ۔ " (۹)

خلیل الرحمن اعظمی کے خیال میں :

" کرشن چندر کے اسلوبِ نگارش میں غیر معمولی دل کشی ہے ۔ وہ افسانہ نگار ہی نہیں انشا پرداز بھی ہیں ۔ ان کی اس خصوصیت نے انھیں مقبول بنایا اور ان کے افسانوں کو بڑی منزلت نصیب ہوئی ۔ لیکن انداز بیان کی یہی قدرت غالباً ان کے لیے آگے چل کر عیب بھی بن گئی ۔ کچھ تو اپنے رومانی اور شاعرانہ مزاج اور ضبط کی کمی کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ ہر موضوع پر کم سے کم وقت میں بڑے خوب صورت افسانے تیار کرسکتے ہیں ۔ ان کے افسانوں پر مضمون نگاری کا غلبہ ہونے لگا ۔ یوں تو وہ پہلے بھی مضمون نما افسانے لکھتے تھے جس کی یادگار ان کا مجموعہ " ہوائی قلعے " ہے لیکن آگے چل کر ان کا یہ مخصوص طرز بن گیا ۔ وہ سیاسی و معاشی مسائل اور ان کی پیچیدگیوں کی تہہ میں جانے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ حقیقتوں پر نظر جماکر ان کے اندر اترنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ان سے پیدا شدہ فوری ردِ عمل ہی کو بنیاد بناکر افسانہ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں ۔ ان کے اس نوع کے افسانے اپنی شاعرانہ کیفیتوں ، خوب صورت انداز بیان ، طنزیہ فقروں اور نادر تشبیہات کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے پڑھنے والوں کو مسحور کرلیتے ہیں اور ذہنی طور پر وہ اپنے ساتھ بہالے جاتے ہیں ۔ لیکن ان افسانوں میں زندگی کی وہ گہری حقیقتیں جو تجربات کی تنقیح و تحلیل ، کرداروں کے اندرونی مشاہدے اور مانوس چیزوں

کی تہوں میں جانے کے بعد پیدا ہوتی ہیں تقریباً مفقود ہوتی ہیں ۔" (۱۰)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی تشبیہات و استعارات اور اشاریت و علامتیت جس کا استعمال وہ فنی چابک دستی سے کرتے ہیں کہ افسانوں میں ابہام کی کیفیت پیدا ہونے کے بجائے اس کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں ۔ لیکن حد سے تجاوز کرتی ہوئی [illegible] نگاری ان کے اسلوب کا عیب بن جاتی ہے ۔ مناظر کی تصویر کشی اور فطرت کی مرقع نگاری کو جب وہ زیادہ تفصیلات سے بیان کرتے ہیں تو وہ مختصر افسانوی فن کے متحمل نہیں ہوپاتے ۔ یہ خامی ان کے بیش تر افسانوں میں پائی جاتی ہے جو ان کی کہانیوں کے مجموعی اثر کو مجروح کرتی ہے ۔

تاہم پلاٹ ، کردار نگاری اور اسلوب بیان کی کمزوریوں کے باوجود کرشن چندر اردو کے بہت بڑے افسانہ نگار ہیں ۔ ان کا نام صف اول کے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا ہے اور انھوں نے اردو افسانہ نگاری میں نہ صرف تنوع پیدا کیا ہے بلکہ تکنیک اور فنی سطح پر بھی اردو افسانہ نگاری کو ایک نئی معراج تک پہنچایا ۔ ہر چند کہ وہ اپنی ذات کو ایک سمٹا ہوا صحرا پیش کرنے کی جد و جہد میں مصروف نظر آتے ہیں ۔ مگر ان افسانوں کے مجموعی تاثر کو ایک طرف تو زک اس وقت پہنچتی ہے جب وہ جزئیات نگاری میں اپنے قلم سے ابلتی ہوئی خوب صورت نثر کے بہاؤ کے ساتھ بہتے نظر آتے ہیں ۔ اور اس بہاؤ میں وہ پتھر کی شناخت یا نشان بھول جاتے ہیں جس کی وہ تلاش میں نکلے تھے ۔ دوسری بات جو ان کے افسانوں کو مجروح کرتی ہے وہ ان کی اشتراکیت ہے ۔ وہ یہ فرض کرکے چلتے ہیں کہ ہر مشکل کا علاج اشتراکیت کے نسخہ میں ہے ۔ وہ یہ آسانی سے فراموش کرتے نظر آتے ہیں کہ انسان کی داخلی کش مکش سے پیدا ہونے والے مسائل کا تعلق دل سے ہوتا ہے ۔ زخمی احساسات کو کسی ISM کی صلیب پر لٹکایا نہیں جاسکتا اور اسی لیے ان کے بہت سے خوب صورت افسانے جو ایک زبردست اٹھان لیے اٹھتے ہیں ۔ اپنے انجام کو پہنچتے پہنچتے اکثر ایک اشتہار بن جاتے ہیں ۔ جیسے کوئی مجمع باز ہر دکھ کی دوا اس پڑیا کو قرار دیتا ہے جو اسے بیچنا مطلوب ہے ۔

قصہ مختصر جب تک وہ ایک افسانہ نگار رہتے ہیں وہ بہت دل فریب رہتے ہیں اور جب وہ مبلغ بننے کی کوشش کرتے ہیں تو ناگوار گزرنے لگتے ہیں کبھی کبھی وہ اپنی خوب صورت زبان کے بہاؤ میں اس درجہ بہتے ہیں کہ کشمیر کے حوالے سے جغرافیائی غلطیاں ان سے سرزد ہوتی ہیں اور ان کا قاری اگر کشمیر گیا ہے تو ان خوب صورت الفاظ کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے ۔ یہ تو ممکن ہے کہ افسانہ نگار اپنے پڑھنے والوں کو اپنی خیالی جنت میں اپنے قلم کے سہارے لے جائے ۔ مگر جب وہ ایک جغرافیائی اکائی کے اظہار کا بیڑا اٹھائے تو اسے جغرافیائی اکائیوں کا پابند رہنا پڑتا ہے ۔ افسانوں میں دریا کتنا ہی الٹا کیوں نہ بہے مگر شکارہ بانہال نہیں پہنچ سکتا ۔

مجموعی طور پر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ کرشن چندر ایک عظیم افسانہ نگار ہیں ۔ ان کا اردو افسانے پر بڑا گہرا اثر ہے ۔ انھوں نے غیر محسوس طور پر اردو افسانے کو ایک مخصوص رنگینی عطا کی ہے ۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہر ذہین پڑھنے والا یہ کہنے سے نہیں چوکتا کہ اے کاش وہ اپنی تخئیل نگاری کے بادل پر اتنا اونچا نہ اڑتے کہ ہماری زندگی کی سنگلاخ زمین ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی اور جب کہانی کی ضرورت کے پیش نظر وہ واپس زمین کی تلاش میں نکلتے تو کسی اور زمین کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں ۔

کرشن چندر ایک بہت اچھے افسانہ نگار ہیں مگر وہ اور بہت اچھے ہوتے اگر وہ اتنے زودنگار نہ ہوتے اور ان کے پاس خوب صورت الفاظ کا اتنا بڑا خزانہ نہ ہوتا ۔

00 000 00

۱۔ ڈاکٹر احمد حسن ۔ کرشن چندر اور مختصر افسانہ نگاری ۔ ص ۔ ۴۹ ۔

۲۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ۔ ترقی پسند ادبی تحریک ۔ ص ۔ ۱۸۵ ۔

۳۔ کرشن چندر ۔ بند گلی کی منزل ۔ "عصری ادب" محمد حسن اپریل ۱۹۷۰ء ۔ ص ۔ ۶

۴۔ ڈاکٹر محمد حسن ۔ "اردو افسانہ" ادبی تنقید ۔ ص ۔ ۱۲۲ ۔

۵۔ خلیل الرحمٰن اعظمی "ترقی پسند ادبی تحریک" ۔ ص ۔ ۱۸۶ ۔

۶۔ وارث علوی (مضمون) کرشن چندر کی افسانہ نگاری ، روایت اور مسائل (مرتبہ) گوپی چند نارنگ ۔ ص ۔ ۳۰۲ ۔

۷۔ ڈاکٹر صادق ۔ ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ ۔ ۱۹۸۱ء ۔ ص ۔ ۱۹۵ ۔

۸۔ شاداب رضی ۔ کرشن چندر کا ایک افسانوی مجموعہ ۔ "پاسبان" ۔

۹۔ وارث علوی ۔ "کرشن چندر کی افسانہ نگاری" ۔ ماہ نامہ "جواز" مالیگاؤں ۔ جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۵ ۱۹۶۸ء ۔ ص ۔ ۱۴۳ ۔ ۱۵۴

۱۰۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ۔ ۱۹۸۳ء ۔ ص ۔ ۱۸۶ ۔

00 000 00

(سلسلہ ص ۱۹ سے)

ر کر کہا ان گولیوں میں اس گولی کو ایک کی بجائے دن میں دو کر دیجیے ۔ ایک صبح ایک شام ۔ اور ہاں کن کن سرجنوں کو بتلایا ۔ نور ، نام بتلائے ۔ اپنے خاص انداز میں چہرے کو اظہار میں شامل کر لیا اور تاسف سے کہا ۔ نہیں بھئی ۔ اب مجھ سے کہے بغیر کسی ن کے پاس نہ جائیے ۔ وہ جو پہلا نام آپ نے بتایا ہے اس کے پاس تو ہرگز نہیں ۔

اس کلینک پر جہاں منان بھائی نے نور کو بلایا تھا دو تین معائنوں کے بعد پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔۔۔ ی آپریشن ضروری نہیں ہے ۔ ٹیومر ابھی پلپلا ہے ۔ سخت ہو جاتا تو آپریشن سے نکال لیا جاسکتا تھا ۔ انشاء اللہ یہ تو دواؤں سے ل کر دیا جاسکتا ہے ۔ ویسے خدا نہ کرے بعد میں ضرورت پڑے تو کروالیں گے ۔ اچھی غذا وقت پر کھایا کیجیے ، فکر بالکل مت کیجیے ۔ کیجیے مگر آرام کے ساتھ میری مراد ہے آرام کے وقت آرام کوئی کام نہیں ۔

ماسٹر صاحب نے اپنی بیٹی کی شادی ٹھہرادی جو انھوں نے اس پریشانی میں ملتوی کردی تھی ۔ میں حیدرآباد آکر شرکت نہ کا ۔ ماسٹر صاحب کو تار سے اور خط سے مبارک باد دی ۔ میرے خط کے جواب میں انھوں نے اردو زبان میں مجھے خط لکھا جس سکرپٹ لاطینی تھا ۔ میں خط پڑھ کر ان کے اخلاص کا اور بھی معترف ہوا کہ ماسٹر صاحب نے نور کے ساتھ کتنی بے چینی سے ی میں میرا انتظار کیا تھا ۔ سوچتا رہا ۶ ڈسمبر ۱۹۹۲ء کو جب رام نے دوسری بار بن باس لیا ہوگا تو کہتے ہیں سوم شنکر ان کے ساتھ ئے ہوں گے ۔ کاش میرے ملک کے عظیم رہنما اپنی بلندیوں سے نیچے اتر کر کسی نور محمد اور کسی سوم شنکر کے دل تک پہنچ سکتے ۔

00 000 00

پروفیسر تقی علی مرزا

ہائیکو

ہائیکو (HAIKU) جاپانی شاعری کی ایک صنف ہے جو تین مصرعوں اور سترا ارکان پر مشتمل ایک نظم ہوتی ہے ۔ پہلے تیسرے مصرعے میں پانچ ارکان اور دوسرے مصرعے میں سات ارکان ہوتے ہیں ۔ ہائیکو دراصل جاپانی شاعری کی ایک کسی قدر طویل ، تنکا (TANKA) کی ایک شکل ہے ۔ تنکا پانچ مصرعوں اور اکتیس ارکان پر مشتمل ہوتی ہے ۔ اس کے پہلے تین مصرعے (HOKKU) یا ہائیکو کہلاتے ہیں ۔ اب ہائیکو بجائے خود ایک صنف بن گئی ہے ۔ ٹوکیو یونیورسٹی کے اردو کے پروفیسر اسادا یوتا کا ، میں حیدرآباد آئے تھے ۔ پروفیسر منفی تنبسم کے دولت کدے پر ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ، علاوہ اور رموز کے انھوں نے ہائیکو بارے میں بھی بعض دل چسپ باتیں بتلائیں اور ایک ہائیکو جاپانی میں اور اس کا اردو ترجمہ سنایا ۔ جاپانی نظم کچھ اس طرح تھی ۔ .

ہو ری ری کے یا
کا وا زی تو بی کو مو
ی زو نو او تو

اس کا اردو ترجمہ یوں تھا ،

تالابِ کہنہ
ایک چھوٹا سا مینڈک چھلانگ لگاتا ہے
پانی کی آواز

انگریزی میں ہائیکو نظمیں لکھی گئی ہیں ۔ نام ور شاعر ایزرا پاؤنڈ (EZRA POUND) نے کئی ہائیکو لکھی ہیں ۔ انہی کی ایک نظم پیش

O fan of white silk
Clear as frost on the grass blade
You also are laid aside

ایک اور گم نام شاعر کی نظم ہے ،

Russet leaves lie still
On grass and autumn ' s final
Flower looks sunward

ہائیکو کی نمایاں خصوصیت نہ صرف اس کی بندھی بندھائی ہیئت ہے بلکہ اس کا ارتکاز ہے ۔ اردو کے شاعر اگر اس ' اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ اس کی صوری اور معنوی دونوں خصوصیات کو ملحوظ رکھیں ۔ ایک مختصر نظم

ہائیکو نہیں کہلائی جاسکتی کہ وہ مختصر ہے ۔ چند ہائیکو نظمیں پیش خدمت ہیں :

مدر ٹریسا

○

مدر ٹریسا گزر گئیں

اب ان کو سینٹ بنانے کی تیاری ہے

دنیا کا دستور

ایل نینو

○

(ماہرین موسمیات کا کہنا ہے کہ مانسون کے کامیاب یا ناکام ہونے کا انحصار ایل نینو ۔ ۔ ۔ پر ہوتا ہے جو بر اعظم جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل کی ایک کیفیت ہے ۔ ایل نینو کے لغوی معنی ہیں " ننھا بچہ " اور اس سے مراد یسوع مسیح کا عالم طفلی بھی ہے)

ایل نینو نے اپنی

چشم کرم پھیری اور دنیا

پیاسی رہ گئی

سعیِ لاحاصل

○

تفتیش ، تحقیق ، جرح

مقدمات کا ایک لا متناہی سلسلہ

نتیجہ کچھ بھی نہیں

ہائیکو

○

دریا کوزے میں

بند ہے اور کوزے کا سارا پانی

ایک قطرے میں بند

OO OOO OO

میر ہاشم

تمہارا نام محبت، خلوص، درد، وفا

(سلیمان اریب کی یاد میں)

سب پر ایک سکوت کا عالم تھا ۔ جیسے سحرزدہ ہوں ۔ اپنے اپنے خیالوں میں گم ۔ وہ غزل اپنے مخصوص انداز اور سحرانگیز ترنم میں اریب سنا چکے تھے ۔ اس بات کو کوئی تیس سال ہوچکے ہیں مگر اریب کی وہ آواز میرے کانوں میں ہے ۔ اور ان کا سراپا میری نظروں کے سامنے ۔ تاثر میں ڈوبی ہوئی ۔ استعاراتی پیرایہ ۔ بیان کی وہ غزل اب بھی مجھے یاد ہے ۔ آپ بھی سنیے ۔

آج بھی ہاتھ پہ ہے تیرے پسینے کی تری
یعنی ہے آج بھی شاخِ شجرِ درد ہری
پاسِ داماں نہ سہی ۔ پاسِ گریباں ہی سہی
تجھ پہ لازم نہیں اے دستِ جنوں جامہ دری
دل کی بستی سے کبھی یوں نہ گزرتی تھی صبا
اب نہ پیغام بری ہے نہ کوئی نامہ بری
رات کا کرب سمیٹے ہوئے اپنے دل میں
جھلملاتا ہے کہیں دور چراغِ سحری
میں نے کس دل سے شبِ غم کی سحر کی ہے اریبؔ
یاد آئے گی زمانے کو مری بے جگری

مگر زمانہ ہمیشہ زود فراموش رہا ہے ۔ اریب کا یہ یقین کہ زمانے کو ان کی بے جگری یاد رہے گی محض گمان تھا ۔ آج کتنے لوگ ہیں جنھیں یہ یاد ہے کہ ادبی محاذ پر اریب نے کن حالات میں کیا کارنامے انجام دیے ؟ کس طرح جدوجہد میں زندگی بسر کی کس طرح موت سے نبرد آزما رہے اور کس طرح شبِ غم کی سحر کی ۔

مخدوم کے بعد اریب کی وفات سے حیدرآباد کی ادبی فضا میں ایک خلاء پیدا ہوگیا جو کبھی پر نہیں ہوسکا ۔ مخدوم اور اریب دونوں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے ۔ مخدوم سیاسی محاذ پر برسرِ پیکار تھے اور آخر تک رہے ۔ اریب کلچرل فرنٹ پر سرگرم تھے ۔ " ترقی پسند مصنفین " کے جو بعد میں " عوامی مصنفین " کے نام سے موسوم کی گئی تھی ۔ ایک زمانے تک سکریٹری رہے ۔ بڑی بڑی کانفرنسوں کا انعقاد کیا ۔ ترقی پسند مصنفین کے دائرہ عمل کو وسعت دی ۔ اس میں لچک پیدا کی ۔ اریب کی شرکت اور اشتراک کے بغیر

کسی ادبی تقریب کا خیال ممکن نہ تھا ۔ اگر مخدوم کے ساتھ سارا زمانہ تھا تو اریب اپنی ذات سے نہ صرف ایک انجمن تھے بلکہ وجئے نگر کالونی میں ان کا مکان ایک ایسا سرکٹ ہوز تھا جہاں اطراف ہند اور بیرون ہند سے آنے والے شاعر ، ادیب اور فن کار ٹھہرتے ۔ یہ اریب کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ اپنے دستِ تہی کے باوصف ان سب کی میزبانی کس طرح کرپاتے ۔

اس وقت میں سٹی کالج (حیدرآباد) میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا جب کسی رسالے میں ایک نظم شائع ہوئی ۔ شاعر کا نام "سلیمان اریبؔ" لکھا تھا ۔ مجھے لگا کہ "اریبؔ" کتابت کی غلطی ہے ، نام "سلیمان ادیب" ہوگا ۔ بعد جب اریبؔ سے شناسائی ہوئی اور شناسائی فوراً ہی دوستی میں بدل گئی تو علم ہوا کہ اریب ترکی زبان سے اردو میں آیا ہوا لفظ ہے اور معنی بھی معلوم ہوئے ۔ اس وقت اریب کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے ۔ اور کمیونسٹ تحریک سے میری ذہنی وابستگی رومانی سطح تک ہی تھی اور یہی چیز اریب سے دوستی اور قربت کا باعث بنی ۔ مگر اریب سے دوستی کے لئے کسی نظریاتی ہم آہنگی کی ضرورت نہ تھی ۔ ان کا بے پایاں اور بے ریا دل کسی کو بھی اپنی گرفت میں رکھنے کے لئے کافی تھا ۔ پھر اریب کا وصف یہ تھا کہ وہ نوواردانِ بساطِ ادب کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرتے ۔ وہ ماہ نامہ "سب رس" کے ایڈیٹر تھے ۔ پھر اپنا ایک رسالہ "صبا" جاری کیا جو نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کا ایک معیاری رسالہ تھا ۔ جو ان کی حیات تک جاری رہا ۔ اپنے اس ماہ نامہ کے ذریعہ انھوں نے کتنے ہی نئے لکھنے والوں کو متعارف کروایا ۔ جن میں سے چند ایک آج ہندوستان کے چوٹی کے شاعر ، ادیب اور نقاد ہیں ۔ شمس الرحمن فاروقی ، قاضی سلیم ، جوگندر پال ، میر سلیم ، گوپی چند نارنگ ، بشیر نواز ، زبیر رضوی ، جیلانی بانو ، واجدہ تبسم ، آمنہ ابوالحسن ، اقبال متین ، عزیز قیسی ، وحید اختر ، شاذ تمکنت ، مغنی تبسم ، انور معظم ، راشد آزر ، اکبر حیدرآبادی ، غیاث احمد گدی ، الیاس احمد گدی اور بہت سے ادیب و شاعر اپنے ابتدائی دور میں "صبا" کے صفحات پر متعارف ہوئے ۔ حیدرآباد کے اعلیٰ ترین سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں اریب کی رسائی تھی اور بہت سے لوگ ان کے توسط سے وہاں تک پہنچے مگر خود اریب نے اپنی ذات کے لئے اس رسائی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ۔ اگر کوئی فکر دامن گیر رہتی تو وہ "صبا" کی تھی ۔ انھوں نے "صبا" کو ہر صورت میں جاری رکھا اور کسی حال اس کے معیار میں فرق آنے نہیں دیا ۔

سعادت حسن منٹو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ لوگ مرحوم کی خامیوں اور کوتاہیوں کو دھوکر اسے رحمت اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹانک دیتے ہیں ۔ میرا ارادہ اریب کو ایسی کسی کھونٹی پر ٹانکنے کا نہیں ہے ۔ اریب فرشتوں کی طرح بے رنگ کردار نہیں رکھتے تھے ۔ ان کے کردار میں سات رنگوں کی آمیزش تھی ۔ اور ان رنگوں میں سیاہ و سفید بھی شامل ہیں ۔ اریب کی وہ نوجوانی کا زمانہ تھا ۔ یہ ناآسودہ نوجوان بھٹکتا رہا ۔ کوئے ملامت کے طواف کئے ۔ اور برملا کہتا رہا ۔

تم نے کتنے عشق کیے ہیں ، عشق کی یہ توہین نہیں ہے
کوہ کنی سے مئے خواری تک عشق ہمیشہ رسوا ، رسوا

شاعروں میں اریب کا انداز جگر مرادآبادی کی طرح ہوتا مگر صورت ، شکل ان کے برعکس ۔ دراز قد ، گورا چٹا نوجوان ، چہرے پر چیچک کے پھول کھلائے ، فروغ مئے سے فروزاں لانبے لانبے ملائم سنہرے بال بکھرائے ، دلآویز ترنم میں ڈوب کر شعر پڑھتا تو سماں بندھ جاتا ۔ انٹر میں پڑھنے والی چینی کی گڑیا جیسی ایک لڑکی نے کسی مشاعرے میں اریب کو غزل پڑھتا ہوا دیکھ کر ، اریب میں کھوگئی ۔ صفیہ نے اریب کے لیے بغاوت کی ، خاندان سے اور خاندان کی روایتوں سے اور پھر وہ باہمت لڑکی اریب کی شریک حیات ہو کر

بن رہی اور ادیب کا موضوعِ سخن بھی بن گئی۔ ادیب کے ساتھ زندگی کرنا کسی عام لڑکی کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تمام آزمائشوں سے گذری سے کردں کے تمام راستوں سے سنبھال کر بہ ہرحال ادیب کو گھر پہنچایا۔ صفیہ کی حیثیت ادیب کے عاشق کی تھی اور ادیب کی ڈائری میں صفیہ کا نام سرِ فہرست ہی رہا۔

ایک دن صفیہ نے ادیب پر چوٹ کی کہ اگر میں تمہاری بیوی نہ بنتی تو آج بھی تم میری حسرت میں تڑپتے رہتے۔ اس طنز پر ادیب چراغ پا نہیں ہوئے بلکہ اس وسیع ظرف انسان نے اپنا اقبالِ بیان اس طرح قلم بند کیا۔

ہنسی ہنسی میں صفیہ نے ایک دن یہ کہا
"ادیب مجھ سے فقط اس لیے نہ اکڑو تم
کہ میں تمہارے لیے اب نہیں ہوں محبوبہ
تمہاری بیوی ہوں
مارا ہوا شکار ہوں میں
وگرنہ تم مری حسرت میں آج بھی مرتے
تمام عمر ستاتا تمھیں غم نایافت
تمام عمر مرا درد معتبر رہتا
تمام عمر مری یاد ہم سفر رہتی
نہ یوں کہ پاکے مجھے اس طرح بھلا دیتے"
میں تلخ نوش ہوں لیکن یہ گھونٹ پی نہ سکا۔

ادیب اپنی طالبِ علمی کے زمانے میں درجہ اول کے اسٹوڈنٹ تھے۔ اسکول میگزین کی ادارت بھی کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سوویٹ یونین کے کمیونسٹ انقلاب نے دانش وروں میں انقلاب کی روح پھونک دی تھی۔ ادیب جو اپنے ماحول، سماجی حالات اور سیاسی نظام سے غیر مطمئن تھے۔ دانش وروں کے اس کارواں میں شامل ہوگئے جو کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھا۔ کمیونسٹ تحریک اپنے زمانے کی اہم اور بامعنی تحریک تھی اور اس تحریک سے وہی لوگ وابستہ ہوتے جنھیں عام انسانوں کے دکھ، درد کے مقابلے میں جان و دل عزیز نہ تھے۔

ادیب نے مارکسزم کا مطالعہ کیا تھا یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جو یہ بتاتا ہے کہ انسانی سماج مذاہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ طبقہ وارانہ بنیاد پر بٹا ہوا ہے۔ محنت کش عوام، افلاس، غربت، بے روزگاری، غلاظت اور بیماریوں میں اس لیے زندگی بسر نہیں کرتے کہ وہ خدا کی مرضی ہے بلکہ اس کا سبب استحصال کرنے والا طبقہ ہے۔ ان حالات کو ایک انقلاب کے ذریعے بدلا جاسکتا ہے۔ انسان اور کائنات کو بہتر اور تمام انسانوں کے لیے یکساں طور پر سازگار بنایا جاسکتا ہے۔ سماجی انصاف اور مساوات کے ذریعے سب کو خوش گوار زندگی مہیا کی جاسکتی ہے۔ اس طرح مادیت کا یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جو قنوطیت کے بجائے رجائیت اور ناامیدی کے بجائے امید، جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔ اس سماجی فلسفے پر مذہب کا ایقان تھا البتہ کمیونزم کے مابعد الطبیعاتی فلسفے کو ادیب نے

کبھی قبول نہیں کیا ۔ وہ پکے مسلمان ہی رہے ۔ پورے جوش اور ولولے کے ساتھ ادیب انقلاب کی راہ پر گام زن ہوگئے ۔ یہ جوش اور ولولہ انھیں وراثت میں اپنے باپ سے ملا جو مرب تھے ۔ عزم ، استقامت اور ناک نقشہ اپنی ماں سے پایا جو پٹھان تھیں ۔ انقلابی تحریکات سے وابستگی اور باغیانہ نظمیں برسرِ عام سنانے کی پاداش میں دو سال کے لئے وہ جیل بھیج دیے گئے ۔ قید و بند کی زندگی نے ان کے اندر کی انقلاب کی آگ کو اور بھڑکایا ۔ رہا ہونے تو طلبہ کے ایک جلسے میں پہنچ گئے ۔ اسٹوڈنٹ پر فائرنگ کے خلاف حکومتِ وقت کو چیلنج کرنے والی نظم سنائی جس کی پاداش میں پھر چھ ماہ کے لیے جیل پہنچا دئے گئے ۔ اس طرح سلیمان ادیب نے یونیورسٹی کی ان اعلی ڈگریوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی جو ذاتی طور پر خوش حال اور اعلی پیمانے کی زندگی گزارنے کی ضمانت بن سکتی تھیں ۔ مارکسزم کے دیے ہوئے آدرشوں کے سہارے ادیب زندگی کے تلخ تجربات سے گزرتے رہے اور یہ کہہ کر اپنے ایمان کو تازہ کرتے رہے ۔

اس سے پہلے بھی کئی بار یہ موڑ آئے ہیں
دستِ مئے خوار سے چھینے گئے مینا و ایاغ
ہر خوشی چھین گئی
زندگی درد سے معمور ہوئی
چشمِ تاریخ نے ہر بار مگر دیکھا ہے
میرے جمہور کبھی دب نہ سکے
اور سرافراز رہے (انسان نہیں مرسکتا)

زندگی پر ایمان ، انسان کی شرافت پر یقین اور حسن سے رومانی وابستگی نے انھیں توانائی عطا کی ۔ انھوں نے سچ ہی کہا تھا ؛

جنوں ہے ختم ہمیں پر ، ہمارے بعد ادیبؔ
دکن کی خاک سے اٹھا نہ کوئی دیوانہ

دکن کی خاک سے مخدومؔ اور ادیبؔ کے بعد کوئی دیوانہ اپنے کاندھوں پر اپنی صلیب اٹھائے نظر نہیں آیا ویسے دکن کی زرخیز خاک نے بہت اچھے ادیب ، شاعر اور نقاد پیدا کیے اور آج بھی ہیں ۔

ادیب کے لیے زندگی کبھی آسان نہیں رہی ۔ اقتصادی حیثیت سے وہ ناکام تھی اور تجربات تلخ تھے ان کی معاشی جدوجہد کبھی نتیجہ خیز نہیں رہی ۔ ان کی زندگی غالب کے اس مصرع کے مصداق تھی ؛

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اور ادیب نے دیانت داری کے ساتھ سچی اور حقیقی شاعری کی جس میں ان کی زندگی کے شب و روز کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے ۔ انھوں نے حالات کو بطورِ واقعہ نہیں بلکہ شعری حقیقت بنا کر اظہار کا پیکر عطاء کیا ۔

گزر رہا ہوں مسلسل اک ایسے عالم سے
حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا

بے گھری مجھ سے پتہ پوچھ رہی ہے میرا
در بہ در پوچھتا پھرتا ہوں کہاں جاؤں میں

○

زندگی کون سے ناکردہ گنہ کی ہے سزا
خود نہیں جانتا کیا اوروں کو بتلاؤں میں

○

تیری محفل میں کہ مقتل میں کہیں دیکھا تھا
زندگی سے مری بس اتنی شناسائی ہے

○

پوچھ مت ، دیکھ ، کہ کیا حالِ ادیب آج بھی ہے
اپنے ہی شہر میں بے چارہ غریب آج بھی ہے

مگر ادیب کبھی قنوطیت کا شکار نہیں ہوئے ۔ وہ رجحانات اور تصورات جو انھوں نے مارکسی فلسفے کی بہ دولت حاصل کیے تھے آخر تک ان کا دامن تھامے رہے ۔ انھیں صبحِ نو کا یقین تھا اور اسی یقین نے ایک عمر تک سرشار رکھا ۔

صلے میں گر مجھے دار و رسن ملتے ہیں ملنے دو
نہ گاؤں میں جو حق کے گیت توہینِ گلو ہوتی

○

تم نے کیا نہیں دیکھا جب بھی پھول کھلتے ہیں
بوئے زندگانی کی خار و خس سے آتی ہے
ہم بھٹکنے والوں کے ساتھ گو نہیں ہے تو
چاپ تیرے قدموں کی پیش و پس سے آتی ہے
سوچتا ہوں دنیا کو چھوڑ کر کہاں جاؤں
تیری بوئے پیراہن ، ہر نفس سے آتی ہے

○

ظلمت ظلمت چیخنے والو ، جھلمل جھلمل تارے دیکھو
صبحِ فردا روشن روشن ، پنہاں پنہاں پیدا پیدا

حسن اور ظاہری حسن سے ادیب کی روحانی وابستگی عمر بھر قائم رہی اور انھوں نے عمر پائی بھی کتنی ، ۳۰ ، ۴۰ سال کی عمر میں دنیا کو خیرباد کہہ دیا اور اتنی عمر بھی وہ محض عشق کی گرمی کے باعث جی سکے ۔

نہ جانے کب یہ دلِ زار سرد پڑجاتا
جو تیرے قرب کی گرمی نہ مل گئی ہوتی

اریب پاس گریباں کے شاعر تھے۔ چاکِ گریباں کے باوجود انھیں آدابِ عشق کا پاس تھا۔

مٹ گئے جس کے لیے نام تک اس کا نہ لیا
کاش اس بات کی اس کو بھی خبر ہوجاتی

○

وہ ایک بار تو آیا تھا زندگی بن کر
اس ایک خواب کو بس ہم نے عمر بھر دیکھا۔

○

جیسے اک لمحے کو رک جاتی ہے نبضِ عالم
جب مرے پاس سے وہ ہوکے گزر جاتے ہیں

○

چھڑ نہ جائے کہیں پھر قصہ، کفر و ایماں
سو ترا نام بھی لیتے ہوئے گھبراتے ہیں

کمیونسٹ پارٹی نے اریب کو مایوس اور دل برداشتہ کردیا۔ پھر آہستہ آہستہ اریب کو اس بات کا احساس ہوا کہ جس سماجی ے کو وہ اپنائے ہوئے تھے وہ عقیدہ پرستی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جس انقلاب و انصاف کا وہ خواب دیکھ رہے تھے اس کی تعبیر کا ب و دور کوئی امکان نہ تھا اور زندگی ایک تلخ حقیقت بن کر سامنے آکھڑی ہوئی۔ اریب کا یہ سفر جو سیاسی نظریہ پرستی اور یقین سے ع ہوا تھا، تشکیک، ہزیمت کے احساس اور شکستِ خواب پر ختم ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ سفر دشوار گزار اور کرب ناک تھا مگر ب کی فطری شرافت، نیکی، خلوص، روشن خیالی اور وسیع المشربی نے انھیں ٹوٹ کر بکھرنے نہیں دیا۔ ان تلخ تجربات کا عکس ان شاعری میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اک فقط وصل کی لذت کو اٹھا رکھا ہے
ورنہ اس دشتِ تمنا میں بھی کیا رکھا ہے
جو گزرتا ہے وہ رک جاتا ہے اک پل کے لیے
دل کو وہ آئینہ، بازار بنا رکھا ہے
عالم آشوب میں اب اتنی کہاں ہے فرصت
سانس لینے کو بھی اب کل پہ اٹھا رکھا ہے

جیسے روتے ہوئے بچے کو کوئی چپکا لے
یوں غمِ دہر کو سینے سے لگا رکھا ہے
ساری اقدار کو رو پیٹ کے اب ہم نے ادیب
رزد ۔ زیست میں اک خود کو بچا رکھا ہے

اور واقعی ادیب کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے خود کو سنبھالے رکھا اور جب سارے اقدار کی بے حرمتی دیکھی تو بڑے کرب کے ساتھ کہا ،

ایک حمام میں تبدیل ہوئی ہے ۔ دنیا
سب ہی ننگے ہیں کسے دیکھ کے شرماؤں میں

ایک مرتبہ ادیب کے گھر پر سردار جعفری نے ادیب سے تازہ غزل سنانے کی فرمائش کی ۔ ادیب نے جو غزل سنائی اس کے چند شعر یہ ہیں :

پیار کا درد کا مذہب نہیں ہوتا کوئی
کعبہ و دیر سے مطلب نہیں ہوتا کوئی
جان و ایمان سہی ۔ سب کچھ سہی ۔ تو میرے لیے
ہائے کس منھ سے کہوں سب نہیں ہوتا کوئی
چاندنی ۔ پھول ۔ ہوا ۔ جام ۔ ستارے خوش بو
زہر کے نام ہیں جس شب نہیں ہوتا کوئی
مجھ کو خود مجھ سے بھی ملنے نہیں دیتی دنیا
چھپ کے ملتا ہوں کبھی جب نہیں ہوتا کوئی
سچ تو یہ ہے کہ میں ہر بزم میں تنہا ہی رہا
یوں تو گھر پاس مرے کب نہیں ہوتا کوئی

سردار جعفری نے یہ کہہ کر داد دی کہ یہ صفیہ کا فیض ہے اور جعفری صاحب کی وہ بات بھی غلط نہ تھی ۔ ادیب کی شاعری میں صفیہ کے نکھرے ہوئے ادبی ذوق کا یقیناً حصہ رہا ہوگا ۔

مرہٹواڑے میں پربھنی سے ادیب کا گہرا تعلق رہا ۔ وہاں ہر سال ایک مشاعرہ منعقد کیا جاتا تھا ۔ ان مشاعروں میں مخدوم محی الدین ۔ شاہد صدیقی ۔ جاں نثار اختر ۔ کیفی اعظمی ۔ مغنی تبسم ۔ عزیز قیسی اور شاذ تمکنت وغیرہ جیسے ادبی قد و قامت کے شعرا شرکت کیا کرتے تھے مگر سلیمان ادیب ۔ جیسے ان مشاعروں سے وابستہ ہوگئے تھے ۔ وہ تقریباً آٹھ دس سال تک ہر مشاعرے میں شرکت کرتے رہے ۔ پہلی بار عزیز قیسی کو لے کر آئے اور اپنی یہ غزل سنائی ،

ہمیں دامن سے کیا مطلب کہ چشمِ نم نہیں ہیں ہم
وہ دہاں ہوں تو ہوں لیکن دلِ پُرغم نہیں ہیں ہم
ابھی تو سلسلہ جاری ہے اپنی آزمائش کا
کلاہِ کج تو ہیں لیکن جبینِ خم نہیں ہیں ہم

یکے بعد دیگر ان مشاعروں میں ادیب نغمہ سرا رہے۔

زندگی تیری محبت ہی اگر ہو جاتی
زندگی پھر کسی عنواں سے بسر ہو جاتی
تیرے آنے سے کہاں وقت رکا، شب ٹھہری
تو نہ آتا بھی تو اس شب کی سحر ہو جاتی

o

پوچھ مت، دیکھ، کہ کیا حال ادیب آج بھی ہے
اپنے ہی شہر میں بے چارہ غریب آج بھی ہے
لاکھ یورش ہو خزاں کی مجھے اس کا ہے پتہ
ہر گلِ تازہ بہاروں کا نقیب آج بھی ہے

وہ اپنی تازہ غزلیں اپنے مخصوص والہانہ انداز میں سناتے۔ ڈائس پر بیٹھتے ہوئے لوگوں میں ادیب کو دیکھ کر ہر شخص یہ اندازہ لگا سکتا کہ وہ ایک شاعر بیٹھا ہے۔ ادیب کو ان کی غزلوں پر زبردست داد ملتی اور ساری محفل پر ایک کیفیت طاری ہوجاتی
ں میں آج بھی پابندی سے ہر سال مشاعرے ہوتے ہیں۔ سامعین کی تعداد بھی پہلے سے زیادہ ہوگئی ہے مگر ان مشاعروں کی
، بدل چکی ہے۔ سامعین کا مذاق بدل چکا ہے۔ اب ان مشاعروں میں ادیب، مخدوم، مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر وغیرہ
شاعروں کے لیے سامعین نہیں رہے۔ ویسے بھی آج کل ہندوستان بھر میں مشاعروں کا رنگ آہنگ بدل چکا ہے۔

ادیب کا ادبی سفر بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ آگے کی طرف جاری رہا اور ان کی بعد کی شاعری میں جدیدیت کے
ت کا سراغ بہ آسانی مل جاتا ہے۔ ان کے آخری زمانے کی نظمیں "شب خون" میں شائع ہوتی رہیں۔ "شب خون" شمس
، فاروقی کی قیادت میں جدیدیت کا علم بردار تھا اور اب بھی ہے۔ مگر جدیدیت کے نام پر ادیب نے تجریدی لایعنیت، دیز
اور غیر مربوط اور بے ربط ادبی اجتہاد سے ہمیشہ گریز کیا۔ انھوں نے ہیئت اور تکنیک کا کوئی تجربہ بھی نہیں کیا۔ لیکن اپنی شاعری
رخ و ترسیل کا کوئی مسئلہ پیدا کیے بغیر ایک نیا موڑ دیا۔ غزل کی کلاسکی روایات سے شدید واقفیت کے باوجود ادیب کے بیش
عار غیر روایتی ہیں اور بعد کی نظموں میں تو ادیب نے روایت سے اپنا رشتہ ہی توڑ لیا۔ زبان، بیان، موضوعات اور لفظیات
، مختلف ہیں۔ کہیں کہیں زبان سپاٹ، کھردری اور بیان نثر سے قریب ہے۔ مگر ان نظموں میں اپنے ذاتی تجربات، ماحول اور
، کی سچی ترجمانی ملتی ہے۔ مختلف نظموں سے چند اقتباسات پیش ہیں؛

زندگی سے کٹا کر
موت کی طرف بھاگے
موت بھی نہیں ملتی
زندگی کہاں ہے تو   (برزخ)

o

یہ شراب و مستی کیا
چادرِ دریدہ ہیں
روح جن سے جھلکتی ہے
اور شاعری قائم
اک شکستہ آئینہ   (شرابِ شعر)

o

جب کوئی فرضِ صداقت کا چکانے کے لیے
زہر کا دردِ تہِ جام بھی پی لیتا ہے
اپنا سر ہنس کے کٹا دیتا ہے
زندگی جبر سہی جبرِ مسلسل ہی سہی
سہتا ہے
اور اس جبر کو سو رنگ عطا کرتا ہے
حرف کا، صوت کا، صورت کا، فسوں کاری کا
میں اسے دیکھ کے چپکے سے گزر جاتا ہوں
یہ تو میں خود ہوں وہ احمق جس کی
اپنی رسوائی میں تسکینِ انا ہوتی ہے

o

لفظوں سے معنی کا رشتہ
پہلے شاید کچھ ہوتا تھا
لیکن اب لفظوں سے معانی اپنا رشتہ پوچھ رہے ہیں۔   (ایک خزینہ)

o

تم کس سے ملنے آئے ہو
کس چہرے سے کام ہے تم کو
تم جو چہرہ دیکھ رہے ہو
اس میں ہیں کتنے ہی چہرے
میں خود اپنے آپ سے مل کر
پہروں سوچ میں پڑجاتا ہوں
کس چہرے سے بات کروں میں (تم کس سے ملنے آئے ہو)

○

قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے رات
چاندی چاندی پگھل رہا ہے چاند
وقت کے ریگ زار دریا میں
ذرہ ذرہ بکھر رہے ہیں تمام
اس زمیں پر نہیں کسی کو دوام (پانچ سطریں)

○

مری نظر نے کیا تھا یہ منکشف مجھ پر
تمام عالم معدوم صحرا بے ذرہ
مرے سفر نے کیا ہے یہ منشرح مجھ پر
تمام عالم امکاں ہے ذرہ بے صحرا

○

اریب حلق کے کینسر میں کوئی آٹھ دس ماہ مبتلا رہے ۔ انھوں نے موت کا سامنا بڑی جی داری سے کیا۔ ہر تکلیف کو ده پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔ ان آٹھ دس ماہ میں وہ ہر لحہ یہ جانتے تھے کہ موت ان کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے ۔ وہ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے اور نظمیں بھی کہتے رہے ۔ اس دوران اگر انھیں کوئی فکرِ لاحق تھی تو وہ صد : حس زمانے ں وہ کینسر ہاسپٹل (حیدرآباد) میں شریک تھے صفیہ پر دل کا شدید حملہ ہوا۔ انھیں گاندھی میڈیکل ہاسپٹل سکندرآباد پہنچا دیا گیا۔ نے انتقال سے ایک دن قبل اریب نے صفیہ کو دیکھنے کی ضد کی۔ صفیہ سے مل کر وہ کئی منٹ تک ایک لفظ بھی کہہ نہ سکے ۔ اور ۰، ستمبر ۱۹۷۰ء کی درمیانی شب وہ ستارہ ٹوٹ گیا جو ۵ / اپریل ۱۹۲۲ء کو نمودار ہوا تھا۔

اریب نے بسترِ مرگ پر بھی ایک نہایت اثرانگیز نظم "کڑوی خوش بو" کہی جس میں نہ صرف بے درد زندگی کا مرثیہ ہے ہ جینے کی تمنا بھی ہے۔

رات چپکے سے مرے کمرے میں
چاند کی ایک کرن در آئی
اس نے سرگوشی میں مجھ سے یہ کہا
آؤ ہم چاند تک ہو آئیں ذرا
چاند کی سیر سے جب میں لوٹا
گھر کی دہلیز پہ سورج تھا کھڑا

o

ہائے وہ پیکرِ ناشود، صد عشوہ طراز
جب بھی آیا ہے تصور میں مرے
میں نے جینے کی تمنا کی ہے

o

اف یہ برسات یہ ہنگام گل و مل یا رب
عام کر دے کہ یہاں کوئی بھی
تشنہ لب ہونے کا شکوہ نہ کرے
ساقیِ کوثر سے وہاں

o

ایک ہنگامہ بپا ہے ہر سو
صبح سے شام مگر کیسے ہو
رات کی صبح نہیں ہوتی ہے
زہر کی لہر ہے یا موت کی کڑوی خوش بو
لو لو مرے جی جاں سے گزر جاتی ہے
ڈتھیئن لینے سے کچھ دیر کو نیند آتی ہے

o

اور بالآخر ادیب کو ابدی نیند آہی گئی

تمہارا نام محبت، خلوص، درد، وفا
تمہارے نام سے منسوب گلستاں، صحرا

oo ooo oo

سید خالد قادری

شاذ تمکنت یادوں کے آئینے میں

آج جب کہ ماضی کی ان گنت یادیں خواب و خیال کی دھند میں کھو چکی ہیں شاذ کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کے اجالے ذہن کے
ں کو پھر بھی منور کر رہے ہیں۔ وہ دن میرے حافظے میں پوری طرح روشن ہے جب شاذ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔
ایوننگ کالج کے اسٹاف روم میں سلیقے سے آراستہ آرام دہ کرسیوں میں ایک درجن کے قریب مرد و خواتین اساتذہ بیٹھے ہوئے خوش
یں مصروف تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جن صاحب کی حیثیت وہاں صدرِ محفل کی سی تھی وہ شاذ تمکنت تھے۔ ان کا سراپا اس بات کی
مدیق کر رہا تھا کہ وہ شاعر یا ادیب ہونے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتے۔ سفید پائجامے پر سیاہ شیروانی، پاؤں میں سنہرے کام والی سینڈل
ں لٹیں پیشانی پر بکھری ہوئی۔ پان کا ایک بیڑا منہ میں اور باقی پہلو میں رکھی ہوئی پان کی چھوٹی سی ڈبیا میں۔ اس وقت وہ حاضرین کو
، غزل کے اشعار سنا رہے تھے جس کا مطلع یہ تھا:

پیاسا ہوں ، ریگ زار میں دریا دکھائی دے
جو حال پوچھ لے وہ مسیحا دکھائی دے

پھر:

پڑتی ہے سات رنگوں کی تیرے بدن پہ چھوٹ
جو رنگ تو پہن لے وہ گہرا دکھائی دے

ب شاہینہ اختر (پیام اور بلٹز کے ایڈیٹر اختر حسن صاحب کی صاحب زادی) سے مخاطب ہوئے تھے جو نہ صرف ایک دل کش شخصیت کی
ں بلکہ حسنِ اتفاق سے اس دن گہرے گلابی رنگ کی ساری بھی زیبِ تن کیے ہوئے تھیں۔
میں اجنبیوں کے بیچ ایک نو وارد کی طرح جھجکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تو انھوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

ہر تازہ واردِ خمِ گیسو کو دیکھ کر
مجھ کو تو اپنا عہدِ تمنا دکھائی دے

لا ایک اور شعر:

دریا پہ آنسوؤں کے تجھے ڈھونڈتا ہوں میں
پانی پہ تیرا نقشِ کفِ پا دکھائی دے

ری کے مزاج کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے اور شاید اسی لیے مجھے، اب بھی یاد ہے۔
ایوننگ کالج میں بہ حیثیت انگلش لکچرر کے میرے تقرر کا یہ پہلا دن تھا شاذ صاحب کو شاید میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ انھوں نے
ال خاصی گرم جوشی سے کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس میں ایک طرح کی بزرگانہ شفقت بھی شامل تھی جو بعد میں جلد ہی بے
لبت میں بدل گئی تھی۔

اپنی غزل پر حاضرین سے داد وصول کر چکنے کے بعد وہ میری طرف مخاطب ہوئے: "ہاں تو جناب آپ اہلِ زبان تو ہیں ہی اب اہل
کے بارے میں بھی کچھ کہیے۔ کیٹس اور شیلے کو ہی پڑھتے رہے یا میر و غالب سے بھی کچھ شغف رکھتے ہیں؟

میں نے عجز و انکسار کے لہجے میں جواباً عرض کیا کہ میں ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناطے ہر زبان کا ادب پڑھنے کا ش
رکھتا ہوں اور میر و غالب کے ساتھ ساتھ خود ان کی بھی ایک دو نظمیں اور ایک آدھ غزل پڑھ رکھی ہے۔ ہاں جہاں تک شعری ذوق اور ا
عربیت کا سوال ہے تو اس میں شاید وہ مجھے ابھی کچا پائیں گے۔

ایسا لگا کہ میرے اس جواب سے میری انگریزیت کے بارے میں شاذ صاحب کے خدشات رفع ہوگئے۔ انھوں نے بشاشت خوش
سے برجستہ کہا "اس کی فکر مت کرو میاں۔ ہماری صحبت میں رہوگے تو دھیرے دھیرے وہ بھی پختہ ہو جائے گا۔"

اس کے بعد سے شاذ صاحب میرے لیے اجنبی نہ رہے۔ ان سے ملنا تقریباً روز کا معمول ہو گیا اور پھر یہ سلسلہ برسوں قائم رہا۔
باوجود اس کے کہ ان کا تعلق مجھ سے پہلے کی نسل سے تھا اور ہم دونوں کی عمروں میں کافی فرق تھا میں ان کا شمار ان گنے چنے ا
میں کرتا ہوں جن کی صحبت میں میں نے حیدرآباد میں خاصا وقت گزارا اور جن کے نہ ہونے سے میرے شب و روز میں کچھ عرصے کے ل
بھی ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔

شاذ کے تعلق سے جتنی باتیں میرے ذہن کے پردوں میں محفوظ ہیں۔ انھیں ضبطِ تحریر میں لاؤں تو ایک ایسی حکایت رقم ہوگی جو
حد درجہ چونکا دینے والی ہوگی کبھی بے حد رومانی اور پھر اپنے اختتام میں قطعی طور پر المیہ۔ مگر میرے لیے ایسا کرنا نہ قرینِ مصلحت ۔
تقاضائے دوستی۔ اب ایسے میں شاذ پر کچھ لکھتے ہوئے صرف ان ہی باتوں کا سہارا لینا پڑ رہا ہے جن سے نہ تو شاذ کی ذات پر کوئی حرف آ۔
کسی اور کی دل آزاری ہو۔

ایک رفیقِ کار کی حیثیت سے کالج کے رسمی ماحول سے نکل کر جب میں انھیں باہر بھی ایک دوست کی حیثیت سے جاننے اور سمجھ
لگا تو مجھے پتہ چلا کہ شاذ کی دوستی دو ہی قسم کے لوگوں سے ہو سکتی ہے۔ یا تو وہ جو شاذ سے محبت کرتے ہوں یا پھر وہ جن سے انھیں خود ؟
ہو۔ باقی لوگوں سے ان کے تعلقات کی بنیاد شائستگی اور خوش اخلاقی کے ایسے نازک بندھنوں پر استوار ہوتی تھی جو ذرا سی بھی ناخوش گو
پر ٹوٹ سکتے تھے۔ ان کے احساس کا آبگینہ حد درجہ نازک تھا۔ اس کے ساتھ ہی مزاج میں ایسی نرگسیت تھی کہ انھوں نے اپنی ہی ذات
گرد ایک حصار باندھ رکھا تھا جس سے نکل کر باہر آنا خود ان کے اپنے بس میں نہ رہ گیا تھا۔

مختصراً یہ کہ شاذ صاحب ایک انتہائی منفرد شخصیت کے مالک اور اپنی مثال آپ تھے۔ نفاست پسند، سلیقہ مند، نازک مزاج اور
ہی ساتھ بے حد حسین۔ خود پسندی اور انانیت بھی اس قدر کہ ہر کس و ناکس کو خاطر میں نہ لاتے اس کے برخلاف جو انھیں پسند آجائے ا
ہمراز، بذلیقہ اور پھر اس سے کوئی پردہ نہ رکھتے۔

ان دنوں ان کا صرف ایک ہی مجموعہ "تراشیدہ" شائع ہوا تھا جس کی بہت سی نظمیں اور غزلیں ان کی اس دور کی جذباتی زندگ
حقیقی واردات سے منسلک تھیں۔ ہجر و وصال کی ان گنت حکایتیں۔ چائے کی کئی کئی پیالیاں اور پھر اسی ایک بات کا اعادہ کہ:

تو اگر میری ہوتی ، رنگ ہی دگر ہوتا
غم کا ، شادمانی کا ، میری زندگانی کا

ویسے تو شاذ کا معاملہ ہمیشہ ہی "زخم بھر جانے سے قبل ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا" والا ہی رہا مگر کبھی کبھی یہ کیفیت شدید ہو جاتی تھی۔ وہ ہجر

کسی حال بھرنے نہ دیتے۔ وقت کا مرہم ان کے لیے نہ تھا۔ شکستِ آرزو کی گونج کبھی مدھم پڑنے بھی لگے تو کیا ہوا زندگی میں پائی جانے اس مستقل خلش کا مداوا کیسے ہو جس کا کوئی نام نہیں۔ اپنے آپ کو مٹا دینے کی اس خواہش کا کیا کیا جائے جو ادراک کا ایک ناقابلِ تقسیم تھی۔ اپنے معمولات میں شاذ کی انتہا پسندی جس کے لیے وہ کافی بدنام ہوئے ان کے ان ہی نفسیاتی مسائل کا فطری نتیجہ تھی۔ ان سے ایک ں قربت ہونے کے باعث میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ شاذ ان لوگوں میں سے نہ تھے جنھیں قطرۂ شبنم سے فنا کی تعلیم ملتی ہے۔ اسیماب صفت وجود روزِ اول سے ہی مائل بہ فنا تھا۔ خود اپنے آپ کو مٹا کر اپنی تکمیل ان کی سرشت کا تقاضہ تھی:

لوگ کیا سمجھیں میری خوئے اذیت طلبی
تجھ پہ تہمت ہے کہ تونے مجھے برباد کیا

تو ہر انسان کی ذات میں تضادات ہوتے ہیں مگر شاذ کے بارے میں یہ بات کچھ زیادہ ہی سچ تھی۔ وہ بہ یک وقت زندہ دل بھی تھے اور زود بھی۔ کھلنڈرے بھی اور پھر اچانک اداسی کا پیکر بھی، عیش پسند بھی اور اذیت کوش بھی، خاکسار بھی اور پر تمکنت بھی، قلندر حیثیت ور دنیادار بھی۔

ان دنوں جدیدیت کا غلغلہ زوروں پر تھا۔ شمیم بھائی (شمیم حنفی) بھی اس کے علم برداروں میں تھے۔ چھٹیوں میں ان سے ملاقات تو خود دہلی اور علی گڑھ کے دوستوں کا تذکرہ کرتے اور مجھ سے حیدرآباد کے ادیبوں کا حال دریافت کرتے۔ شاذ سے میری نئی نئی دوستی . میں نے ان سے شاذ کی تعریف کی اور کچھ اشعار سنانے چاہے تو انھوں نے یہ کہہ کر مجھے خاموش کر دیا کہ تراشیدہ، ان کی نظر سے گذری ہے لی صرف دو تین لائنیں ہی انھیں قابلِ توجہ لگیں:

ریل کی سیٹی / خدا جانے کہاں جاتے ہیں لوگ
کیا یہ سچ ہے پھر پلٹ کر اپنے گھر آتے ہیں لوگ
(طیورِ آوارہ)

سی طرح ایک دو غزلوں کے کچھ متفرق اشعار۔ اس وقت ان کے نزدیک جدید دور کے نمائندہ شاعر بانی، بلراج کومل، عمیق حنفی اور محمد ، وغیرہ تھے۔

اردو شاعری کے ضمن میں شمیم بھائی کی نظر پر خود سے کہیں زیادہ اعتماد ہونے کی وجہ سے میرا شاذ کی شاعری کے بارے میں جوش طور پر سرد ہو گیا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ شاذ کے بارے میں شمیم بھائی کے تعصب کا باعث ان کی شاعری نہیں بلکہ ان کی روایتی وں کی طرح پان نوشی اور اس سے بھی زیادہ مئی جون کے موسم میں علی گڑھ گرم سوٹ زیبِ تن کر جانا تھا۔ ویسے شاذ بہ ذات خود نقادوں کو یادہ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کے نزدیک تخلیقی فن کار کا رتبہ کہیں زیادہ برتر اور اعلیٰ تھا۔ ہاں اگر کبھی کبھار اتفاق سے یہ دونوں ، کسی انسان میں یک جا ہو جائیں تو اس کی ذات ان کے لیے قابلِ ستائش تھی۔ اس سلسلے میں وہ حالی اور فراق کی مثالیں دیا کرتے تھے۔

حیدرآباد کے ذی علم اور ادب شناس لوگوں سے وہ ہمیشہ شاکی رہے کہ یوں تو مروت اور دل جوئی کے طور پر یہ حضرات ان کی ی کے تعلق سے کلماتِ خیر کہتے نہیں تھکتے مگر جہاں تک باقاعدہ سنجیدگی سے کچھ لکھنے کا تعلق ہے ان میں سے کسی کو اب تک اس کی توفیق ، ہوئی۔ لسانی اور اسلوبیاتی تنقید کو اپنا دائرہ عمل بنا لینے کی وجہ سے مغنی صاحب (مغنی تبسم) سے تو انھیں کچھ زیادہ توقع نہ تھی مگر عالم ب (عالم خوندمیری) سے انھیں اس سلسلے میں ہمیشہ شکایت رہی۔

کبھی کبھار نقادوں کے تعلق سے دل کی بھڑاس نکالنا مقصود ہوتا تو شاذ ان کی مثال ان میراثیوں سے دیا کرتے تھے جو کسی کے گ
کی ولادت پر ڈھول تاشہ لے کر آدھمکتے ہیں اور انعام کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود آلِ احمد سرور فراق اور اخترالای
آرا انھوں نے اپنے کتابوں کے فلیپ پر شائع کیں۔ خاص طور پر فراق نے جو چند لائینیں ان کی شاعری کے بارے میں تحریر کی تھیں ا
ترا شیدہ میں شامل ہیں، ان کی شاذ صاحب کے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔

انیس، جوش اور فراق ایک طرح سے بہ حیثیت شاعر شاذ کے آئیڈیل تھے۔ ان پر کسی قسم کی نکتہ چینی وہ برداشت نہ کرپا۔
اور ان کے فن کی توصیف و ستائش کرتے نہ تھکتے تھے۔ ان کی اپنی شاعری پر فراق کی گہری چھاپ ہے یہ محسوس کرنے کے لیے کسی غیر
تنقیدی بصیرت کی ضرورت نہیں۔ البتہ جوش ان کے لیے ایک ایسی ہستی رہے جسے شعری اظہار پر جو بے پناہ قدرت حاصل تھی وہ ان
تر شاعروں کے لیے قابلِ عقیدت تو تھی مگر قابلِ تقلید نہیں۔ کبھی کبھی طبیعت موزوں ہونے پر وہ جگر، فیض، منیب الرحمن، جاں نثا
اور اخترالایمان کے اشعار بھی سنایا کرتے تھے۔

ان کے قریبی دوستوں میں عوض سعید کا نام سرفہرست ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دونوں کی طویل رفاقت بعد کے دنوں میں ایک
دبی سی رقابت میں بدل گئی تھی۔ عوض کو شکایت تھی کہ شاذ صاحب ان سے ان کی محبت کا خراج وصول کرتے ہیں جب کہ شاذ اس با
بے جا اور بے بنیاد سمجھتے تھے۔ بہ حیثیت مجموعی ان دونوں کا حال ایسے یاران دیرینہ کا سا تھا جن کی ایک دوسرے کی گئی توقعات پو
ہو سکی ہوں۔ عوض صاحب جہاں ایک طرف بالکل سادہ، شرمیلے اور خاموش طبع انسان تھے، شاذ کے مزاج میں نزاکت اور رکھ رکھاؤ کے
تھوڑی سی تیزی اور کسی حد تک دنیاداری بھی پائی جاتی تھی۔ مگر ان کی شخصیت کا بانکپن شائستگی اور خلوص کی شیرینی میں ڈوبا ہوا لہجہ دو
کو ہی کیا ان کے ناقدین کو بھی ان کی خامیاں نظر انداز کر دینے پر مجبور کر دیتے تھے۔
شاید عوض صاحب ہی نے مجھے بتایا تھا کہ "شاذ تمکنت" سید مصلح الدین کا تیسرا قلمی نام تھا جو آخرکار انھیں شہرت کی بلندیوں پر لے گیا
دو نام "منظر نسیم" اور "مصلح الدین شفیع" تھے۔ دوسرے نام سے تو انھوں نے ایک افسانہ "پیوند" بھی لکھا تھا جو لاہور سے نکلنے
رسالے "نظام" میں شائع ہوا تھا۔

کم عمری میں ہی والدین کی شفقت سے محروم ہو جانے کے باعث شاذ شروع ہی سے جذباتی ناآسودگی کا شکار رہے۔ نوجوانی میں
ماموں اور سوتیلے بڑے بھائی نے زندگی سے پوری طرح مایوس نہ ہونے دیا مگر مجموعی طور پر حالات غیر یقینی ہی رہے۔ تعلیم کا سلسلہ
کرکے چھوٹی موٹی ملازمتوں کا سہارا لینا پڑا۔ تقریباً عمر کا آدھا حصہ گزار چکنے کے بعد ہی وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکے مگ
بھی ایک بڑے خاندان کی کفالت کی ذمہ داری کاندھوں پر تھی۔

اس زمانے میں کالج کے لکچرر کی ماہانہ یافت بس اتنی ہی ہوتی تھی کہ دو وقت کی روٹی چلنے کے ساتھ ساتھ کسی طرح خوش پوشی ک
رکھا جا سکے۔ اس سے زیادہ کے لیے شاذ صاحب نے ریڈیو، ٹی وی اور مشاعروں کا سہارا لیا۔ پونا میں ملازمت کے دوران تو بمبئی کے بہ
لگائے مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ جاں نثار اختر، اخترالایمان، سردار جعفری اور کیفی اعظمی مل کر بس اتنا کر سکے کہ پونا میں شاذ کا ایک
ہو جائے ـــــ چلیے کچھ تو ہوا۔ اپنے ہم وطنوں سے تو یہ بھی نہ ہو سکا ـــــ مگر تقدیر کی کلید ـــــ وہ ان کے ہاتھ میں بھی نہ تھی۔ شاذ ہ
جہاں سے چلے تھے پھر وہیں آ گئے۔ ہجرت کی برکتیں بھی ان کے حصے میں نہ آئیں ـــــ

ماضی کے ان ایام کو بہت پیچھے چھوڑ جب وہ نو عمری کے دوستوں عوض سعید اور زبیر رضوی کے ہم راہ ساگر ماکیز سے لگے فر

ھنوران اور نامپلی کے رائل ہوٹل میں چائے کی کئی کئی پیالیاں خالی کر دیا کرتے تھے پس عمر کب شاذ کی شامیں اور ینٹ ہوٹل کی مخلوط رسے گذرتی ہوئی اسٹار بار جان، کوالٹی اور رستم فرام تک وسعت اختیار کرتی چلی گئیں پتہ ہی نہ چل سکا۔ مگر اس کے بعد پھر ان شاموں کی مائی اور راتوں کا عذاب جھیلنا ان کے لیے دشوار ہو چلا:

روز وحشت کا تقاضا ہے کہ صحرا کو چلیں
روز اپنے آپ کو زنجیر پہناتے ہیں ہم
وشت بے آب و گیاہ زندگی میں چارسو
ایک زنجیر ہوا سے سر کو ٹکراتے ہیں ہم

پ ایسے میں الفت کا دم بھرنے والی کسی مغنیہ کی چارہ گری ہو یا پھر عزیز احمد خاں وارثی کی دھنیں، اقبال متین جیسے بزرگ دوستوں کی ست ہو یا راشد آذر اور خیرات ندیم جیسے دوستوں کی رفاقت وہ وقت خود فراموشی دفعتہ آن پہنچا جب موت کے سوا کسی اور کی مسیحائی کی رورت نہ رہی ----- ویسے یہاں یہ اعتراف کرنا نامناسب نہ ہو گا کہ شاذ کی شدید، علالت کے دنوں میں جب کہ انھیں دوستوں کی مدد کی رورت تھی) ان کے سب سے زیادہ کام آنے والی ایک ایسے شخص کی ذات تھی جو کبھی ان کے قریبی احباب میں شامل نہ رہا تھا۔ یہ مغنی تبسم ۔ گو کہ خود مغنی صاحب کا شاذ کے ساتھ سلوک ایسا کسی بات کا متقاضی نہ تھا مگر پھر بھی شاذ نے نہ جانے کیوں ان کے ساتھ اپنے رشتے میں یشہ ایک فاصلہ قائم رکھا تھا جو زندگی اور موت کی آخری کشمکش کے ساتھ ایک انداز میں اپنے آپ ختم ہو گیا۔

شاذ کی شاعری کے ابتدائی دنوں میں جن لوگوں نے ان میں پوشیدہ تخلیقی جوہر کو پہچان کر ان کی ہمت افزائی کی تھی ان میں سردار فری، فراق، خلیل الرحمان اعظمی، اور اریب کے نام نمایاں ہیں۔ ان میں ایک اریب ہی تھے جن سے بعد کے دنوں میں شاذ کے تعلقات میں ناہمواری پیدا ہو گئی تھی۔ اریب پر ان کا مضمون "بتہ خانہ کی روشنی" پڑھنے سے اس کا اندازہ ہو جاتا ہے گو کہ شاذ نے مجھے کبھی اس کی صیلات نہیں بتائیں۔ اس کا علم مجھے پہلی بار اس دن ہوا جب شاذ مجھے ساتھ لے کر اریب سے ملنے کینسر ہاسپٹل گئے ---- اریب کی اہلیہ یہ بھی اس وقت وہاں موجود تھیں۔ شاذ کئی دنوں تک شش و پنج میں رہنے کے بعد بہ مشکل وہاں جانے کا حوصلہ پیدا کر سکے تھے۔ اس شام پٹل کے اس کمرے میں اریب صاحب اور شاذ کے بیچ معافی درگذر اور پھر اس آخری مرحلہ حیات میں تجدید ملاقات کا جو جذباتی اور پر اثر ظر میں نے دیکھا اس نے میرے ذہن میں نہ صرف شاذ کا درجہ انسانی حیثیت سے بڑی حد تک بلند کر دیا بلکہ مجھے اریب کے غیر معمولی حوصلے وہ دلی اور انسان دوستی کا بھی قائل ہونا پڑا۔

شاذ صاحب اپنی شاعری کی وجہ سے طلبہ اور خصوصاً خواتین میں بے حد مقبول تھے ----- میں نے نہ صرف ہندی کی نسبتاً بہتر ذوق کی نے والیوں کو ان کا کلام بہ صد ادب و احترام ان کے روبہ رو گاتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے بلکہ ایسی چند مخصوص محفلوں میں بھی ان کے ہم رہا ہوں جو معزز گھرانوں کی خواتین نے ان کا کلام سننے کے لیے آراستہ کی تھیں۔ ایسی جس محفل میں مجھے پہلی بار شاذ صاحب کے ساتھ نے کا اتفاق ہوا وہ دار الشفا میں کسی کے گھر پر منعقد کی گئی تھی۔

ان کی شہرت کی وجہ سے ایک طرف کالج کے طلبہ ان کا شاگرد ہونے پر فخر محسوس کرتے تھے تو وہیں دوسری طرف کالج کے ارباب رار انھیں کسی شوپیس (Show Piece) کی طرح استعمال کرتے تھے اور کالج میں مختلف مواقع پر آنے والی ہر اہم شخصیت سے ان کا یہ تعارف کرواتے تھے۔ اس سب کے باوجود میں نے شاذ صاحب کو اپنے فرائض منصبی کی ادائگی میں اپنی اس حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے

ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ اسی طرح گھر گرہستی اور اہل وعیال سے متعلق ذمے داریوں کو پورا کرنے میں انھوں نے عام طور پر کوتاہی نہ کی۔ یہاں تک کہ اپنی شاموں اور راتوں کی جس تنظیم کے لیے وہ آخری زمانے میں رسوا ہوئے وہ بھی ان کے ان فرائض کی ادائگی میں کچھ زیادہ ٓڑے نہ آئی۔۔۔۔

شاذ کی شاعری کے مطالعے سے ان شعروں کے خالق کا ایک انتہائی قنوطی (Morbid) خاکہ ابھرتا ہے۔ مگر حقیقت اس کے عکس تھی۔ ان مخصوص لمحوں کو چھوڑ کر جب ایک قنوطی تخیل (Mobid Inogination) شاذ کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ان کی حسِ مزاح ہمیشہ غیر معمولی طور پر بیدار رہتی تھی۔ وہ اپنی فطری ظرافت اور برجستہ فقروں سے سنجیدہ محفل کو بھی لالہ زار بناسکتے۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو سے ان کے بیش تر قریبی دوست واقف ہوں گے۔

اخترالایمان اور جاں نثار اختر سے شاذ کے بہت قریبی مراسم تھے۔ یہ حضرات جب بھی حیدرآباد آتے شاذ اپنا زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتے۔ گلڈ کے مشاعرے کے سلسلے میں اخترالایمان آئے تو شاذ نے ان کے اعزاز میں کالج میں بھی ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ مہمان کے استقبال اور تعارف کے بعد ان سے کلام سنانے کی درخواست کی گئی۔ کالی جاکٹ اور سفید کرتے پائجامے میں ملبوس اخترالایمان مائک پر آئے ابھی وہ کچھ سنانے کا ارادہ کرہی رہے تھے کہ طلبہ کے ہجوم میں سے ایک نعرہ بلند ہوا "بھائی کوئی پھڑکتی سی غزل ہوجائے ذرا ترنم کے ساتھ" اخترالایمان کا پارہ چڑھ گیا۔ غصے سے بے قابو ہوتے ہوتے بولے "نہ میں غزل کہتا ہوں نہ مشاعروں کا شاعر ہوں۔ میں اسے باذوق لوگوں کی محفل سمجھ کر آیا تھا مگر اب مجھے احساس ہوا کہ میں غلط جگہ آگیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مائک سے ہٹ کر واپس اپنی کرسی پر جابیٹھے۔ شاذ کے لیے یہ مرحلہ بڑا صبر آزما تھا مگر انھوں نے اسے بڑی بردباری اور ذہانت سے سر کیا۔ خود مائک پر آکر طلبہ کو مہمان سے اپنی عقیدت اور ادب میں ان کے مقام کا احساس دلایا اور اپنے پر اثر انداز میں کلام سنانے کی اس طور التجا کی کہ اخترالایمان کو اپنا غصہ تھوک کر دوبارہ مائک پر آنا ہی پڑا۔

دنیائے شعر و ادب میں اور کوئی ایسی شخصیت تھی جو شاذ کے لیے استادِ سخن کا درجہ رکھتی تھی تو وہ فراق صاحب تھے۔ شاذ ان کا ہر ناز اٹھانے کو تیار رہتے تھے۔ گلڈ کے اسی مشاعرے میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے فراق صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ یہ شاید ۷۲۔۔ ۷۳ء کی بات ہوگی اور فراق کی حیدرآباد کے کسی مشاعرے میں آخری۔ شرکت بھی۔ انھیں لکڑی کے پل پر دوار کا ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ جہاں ان کی دیکھ بھال شاذ کے ذمے تھی۔ شاذ ان کے پاس سے واپس آئے تو کچھ پریشان تھے۔ میں نے وجہ دریافت کی تو کہنے لگے "یار فراق صاحب اتنے بڑے شاعر ہیں اور میں ان کی بے انتہا عزت کرتا ہوں مگر عجیب سنکی آدمی ہیں اور بڑی بے تکی قسم کی فرمائشیں کرتے ہیں اور پھر پیچھے پڑجاتے ہیں کہ انھیں فوراً پورا کیا جائے۔ اب مجھے چوک جانا پڑے گا۔" میرے مزید استفسار پر انھوں نے بتایا کہ وہ ان سے لقا کبوتر کے دو جوڑے لاکر دینے کی فرمائش کررہے تھے جس کے لیے وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ "بیٹا دیکھو وہ جو آدھا کبوتر ہوتا ہے یعنی کہ دم کی طرف سے دیکھو تو آدھا دکھائی دیتا ہے اس کے دو جوڑے لادو" پھر اوپر سے موصوف نے ایک ٹوکرا سیتاپھل کی فرمائش بھی ٹھونک دی تھی۔ سیتاپھل کی تو خیر کوئی بات نہ تھی مگر آدھے کبوتروں کے جوڑے مہیا کرنے جیسا غیر شاعرانہ کام شاذ نے شاید فراق صاحب کے لیے ہی زندگی میں پہلی اور آخری بار کیا ہوگا۔

فراق کے ساتھ دوسرے دن کی جو روداد شاذ نے سنائی وہ بھی کم دلچسپ نہ تھی۔ دوسرے دن جب وہ ان کے ہوٹل کے کمرے میں پہونچے تو فراق صاحب فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے اور پائجامے کا کمر بند باہر لٹک رہا تھا۔ ان کے سامنے سیتاپھل کا ٹوکرا رکھا تھا جو تین چوتھائی خالی ہوچکا تھا اور سیتاپھل کے بیج اور چھلکے کمرے میں ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔۔۔۔

شاذ کے یہاں شاعر اور شاعری دونوں کا تصور پوری طرح کلاسیکی تھا۔ شاعر کی نوا، قیس کی صحرا نوردی یا فرہاد کی کوہ کنی، یہ تینوں ایک ہی تثلیث کے الگ الگ حصے تھے۔ عاشق اور بت گر، شاعر اور مصور ان تمام کا خمیر اسکے لیے ایک ہی مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ خود وہ شاعر اور مصور تو تھا ہی قیس و فرہاد کی روایت سے بھی اس نے اپنا رشتہ تمام عمر جوڑے رکھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ شاذ کی شاعری نہ صرف سیاسی اور سماجی مسائل سے ہمیشہ گریز کرتی رہی بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کے مختلف رنگوں سے خود کی جو تصویر ابھاری وہ بھی ایک فن کار کے اسی Archetype کی عکاس تھی۔ "طیور آوارہ" اور "ٹائم کیپسول" جیسی چند نظمیں ہی اس اعتبار سے مختلف کہی جاسکتی ہیں جب کہ آخر الذکر کے بارے میں تو سبھی قریبی دوست جانتے ہیں کہ کس طرح وہ شعوری کوشش کا نتیجہ تھی۔

شاعر اور شاعری کے بارے میں شاذ کا چاہے جو بھی تصور رہا ہوں شعری اظہار اور زبان و بیان پر انھیں جو قدرت حاصل تھی وہ دکن کے کم ہی شاعروں کے حصے میں آئی۔ فنی اور جمالیاتی نقطہ نظر سے پرکھنے پر بھی شاذ کی شاعری اپنی مثال آپ ہے۔ ایک سنگ تراش کی صورت گری، مصور کی صناعی اور شاعر کا احساس سبھی کچھ اس میں یک جا دکھائی دیتے ہیں۔ اسے بنیادی طور پر ایک ایسا نغمہ کہا جاسکتا ہے جس نے داس کے بطن سے جنم لیا ہو۔ اپنی شاعری کی ان ہی خوبیوں کے باعث ۱۹۶۵ء کے بعد کی اردو شاعری میں شاذ کا نام بڑی تیزی سے ابھرا تھا۔

یوں تو اس جہانِ گذراں میں کسی شے کو بقا نہیں مگر یادوں کے آئینے میں جھانکو تو سب کچھ کل ہی کی بات لگتی ہے۔ لانی میدان کے ایک سرے پر شاذ کا مکان۔ دیوان خانے کے باہر آم کا وہ چھتنار درخت۔ اسی دیوان خانے میں میں اور شاذ پہروں بیٹھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی عوض سعید اور مصحف اقبال بھی آجاتے۔ ادبی بحثیں، شعر و شاعری یا ادھر ادھر کی نہ ختم ہونے والی باتیں۔ آج جب کہ تغیر وقت نے لانی میدان کی ہیئت بدل ڈالی ہے اور آم کا درخت بھی شاید وہاں نہیں رہا۔ اس راستے سے گذرتے ہوئے شاذ کی تصویر نقش برآب کی طرح آنکھوں میں ابھر کر ڈوب جاتی ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ گردش ایام پیچھے کی طرف لوٹ جائے اور ہم وہی بزم رفتگاں پھر سے سجا سکیں۔

○ ○ ○

(سلسلہ ص ۲۶ سے)

(مارکسیت) سے علم شعور (نفسیات) اور معاشری علم کو ہم آہنگ کیا جارہا ہے۔ ادبی تنقید میں ہیئت پسندی کی مختلف شکلوں۔ روسی ہیئت پسندی، ساختیات، نئی تنقید، اسلوبیات وغیرہ سے آراستہ مارکسی "تنقید" کو خوش شکل بنایا جارہا ہے۔ یہی نہیں ہندی میں تو رام داس شرما جدلیات سے تکثیریت کے ربط کی کوشش کر رہے ہیں جو کہ مارکسیت سے عمرانیات کے ارتباط کی اساس ہے۔

(پروفیسر منیجر پانڈے سنٹر آف انڈین لینگویجس، جواہر لال نہرو یونیورسٹی۔ دہلی کے صدر ہیں۔) ۵،٥٥٥

ڈاکٹر معین الدین عقیل

محمد مہدی واصف مدراسی کے "کلمات آب دار"

[راقم نے محمد مہدی واصف مدراسی کے رقعات کا ایک نایاب مجموعہ "کلمات آب دار" ترتیب دیا ہے، جو ان دنوں اسلام آباد پاکستان کے مرکز تحقیقات فارسی کے زیر اہتمام اشاعت کے مرحلے میں ہے۔ اس مجموعے کا تعارف فارسی زبان میں شائع ہو رہا ہے چناں چہ اردو داں حلقے اور جنوبی ہند کے علم و ادب کے شائقین کے ملاحظہ کے لیے یہاں اس تعارف کو اردو میں پیش کیا جاتا ہے۔]

محمد مہدی واصف (۱۸۰۲ء - ۱۸۷۴ء) مدراس کے ایک علمی خاندان کے نمائندہ فرد اور خود علم و فضل اور شعر و ادب تصنیفات و تخلیقات کے باعث ایک ممتاز مقام کے حامل رہے۔ ان کے والد محمد عارف الدین خاں رونق (۱۷۷۸ء - ۱۸۵۳ء معروف برہان پوری کے فرزند تھے، جنھوں نے نواب محمد علی خاں والاجاہ اول (۱۷۴۸ء - ۱۷۹۵ء) کی جانب سے اپنے علم و فضل کے باعث برہان پور سے منتقل ہو کر مدراس میں سکونت اختیار کر لی تھی (۱)۔ عارف الدین خاں رونق مدراس میں پیدا ہوئے (تربیت مولوی محمد اسماعیل حاجی محمد مقیم، غلام محی الدین معجز (۱۷۵۹ء - ۱۸۱۴ء)، محمد باقر آگاہ (۱۷۴۵ء - ۱۸۰۵ء) جیسے اساتذہ سے اپنے ذوقِ علمی اور ادب و شعر سے اپنی دل چسپی کے باعث غلام حسین خاں، عمدۃ الامراء نواب والاجاہ دوم (۱۷۹۵ء - ۱۸۰۱ء) کی مصاحبت کے مقام تک پہنچے۔ یہ تاج الامراء علی حسین خاں ماجد (۱۷۸۳ء - ۱۸۰۱ء) کے اتالیق رہ چکے تھے۔ عمدۃ الامراء کے انتقال کے بعد یہ کڑپہ چتور میں بہ حیثیت منشی خدمات انجام دیتے رہے اور کچھ عرصہ سر تھامس منرو (Sir Thomas Manro) گورنر مدراس ۱۸۲۷ء) کے دفتر سے بھی منسلک رہے (۳)۔ قادر الکلام شاعر تھے، چناں چہ مدراس کے افضل الشعراء محمد حسین خاں راقم (۱۸۱۷ء کے توسط سے نواب والاجاہ غلام غوث خاں بہادر (۱۸۲۳ء - ۱۸۵۹ء) (۴) کی مجلس شعرا کے رکن بنے۔ ان کا دیوان مطبوعہ ہے (نے دو فرزند یادگار چھوڑے: ایک محمد مہدی واصف اور دوسرے زین العابدین۔

واصف ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء میں پیدا ہوئے (۶)۔ تعلیم اپنے والد کے زیر سایہ حاصل کی۔ مفتی سید عبدالرحمن (۷)۔ (متوفی ۱۸۸۰ء)، مولوی یوسف علی خاں (۸)، شیخ محمد مکی (۹)، محمد عبدالوہاب محدث مدار الامراء (۱۰) اور سید عبدالقادر حسینی (۱۱) (متوفی ۱۸۶۴ء) ان کے اساتذہ تھے۔ ۱۷ برس کی عمر میں انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ مذکورہ اساتذہ سے حصولِ علم کے علاوہ انھوں نے صوفی بزرگ مولوی سید عام عالم واعظ نقش بندی سے بیعت کی اور طریقہ قادریہ کی اجازت و خلافت حاصل کی (۱۲)، پھر بعد میں قیام حیدرآباد، ۱۸۵۳ء تا ۱۸۷۳ء میں مولانا محمد مسکین شاہ (متوفی ۱۸۹۶ء) سے بیعت کی (۱۳)۔ وہ اردو کے علاوہ عربی و فارسی تھے اور ترکی، سنسکرت، تلنگی، کنڑی اور ملیالم سے بھی واقف تھے۔ انگریزی بھی سیکھ لی تھی۔ چناں چہ فراغتِ تعلیم کے بعد مولوی نامی (۱۷۷۷ء - ۱۸۲۷ء) کی وساطت سے، جو فورٹ سینٹ جارج کالج میں مدرس تھے (۱۴)، نووارد انگریزوں کے عربی و فارسی کے ہوئے اور ۱۷ سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے اور وظیفے پر سبک دوش ہوئے (۱۵)۔ اس کے زمانہ تدریس میں انھوں نے پسند"، "لطائف عجیبہ" اور "حکایات نادرہ" ترتیب دیں، جو کالج کے نصاب میں شامل ہوئیں (۱۶)۔ یہاں سے سبک دوشی کے بعد محکمہ عالیہ والاجاہی میں مترجم کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے اور نواب غلام غوث خاں والاجاہ کی مصاحبت اور ان کی

رکن بنے ۔ ۱۸۵۳ء میں نواب کے انتقال کے بعد حیدر آباد منتقل ہوگئے اور وہاں کی معروف درس گاہ "مدرسہ دارالعلوم" میں عربی کے مدرس ہوئے ۔ وہیں حیدر آباد میں ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء میں انتقال کیا (۱۷) ۔

ان کے اخلاف میں پانچ فرزند تھے ۔ عبدالباسط عشق (۱۸۲۰ء ۔ ۱۸۸۴ء) عبدالعزیز کاشف (۱۸۹۹ ۔ ؟) عبدالرحمن یاد ، عبدالکریم فطرت اور عبدالعلی والہ (۱۸۳۱ء ۔ ۱۸۹۳ء) ۔ ان فرزندوں نے اپنے اسلاف و اکابر کی علمی روایت کو آگے بڑھایا ۔ ان میں سے تین فرزندوں کی تصانیف مطبوعہ ہیں (۱۸) ۔ عبدالکریم کا تخلص فطرت ان کے شغلِ سخن کو ظاہر کرتا ہے (۱۹) ۔ عبدالباسط اور عبدالرحمن کی ذہانت اور علمی دل چسپی کا اعتراف خود واصف نے "حدیقۃ المرام" میں کیا ہے (۲۰) ۔ ان میں سے عبدالباسط عشق کے چار فرزندوں میں سے ایک ملا عبدالقیوم (۱۸۵۳ء ۔ ۱۹۰۶ء) نے مملکت آصفیہ حیدر آباد میں اپنے علم و فضل اور اپنی قومی و تعلیمی خدمات کے باعث بڑی ناموری حاصل کی اور مشاہیرِ اسلام اور اکابرِ ہند سے ان کے قریبی روابط رہے (۲۱) اور دوسرے فرزند عبدالحئی شاعر تھے اور وصف تخلص تھا (۲۲) ۔ ملا عبدالقیوم کے فرزندوں ملا عبدالباسط ، حسن عبدالقدوس (متوفی ۱۹۴۷ء) عبدالرحمن اور حسین عبدالمنعم میں سے ملا عبدالباسط مملکت آصفیہ میں منصف کے عہدہ پر فائز تھے ۔ حد درجہ علمی شغف کے مالک تھے ۔ چناں چہ اپنے اجداد میں سے عارف الدین خاں رونق ، عبدالباسط عشق اور عبدالحئی وصف کے دواوین مع حالات مرتب کرکے شائع کیے (۲۳) ۔

واصف نے ساری زندگی اپنے بزرگوں کی علمی روایات کے تسلسل کو آگے بڑھانے میں گزاردی اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ مستعدی سے جاری رکھا ۔ وہ عربی ، فارسی اور اردو میں کثیر کتابوں کے مصنف تھے ۔ فارسی و اردو میں فکرِ سخن کرتے تھے ۔ فارسی میں واصف اور اردو میں مسکین تخلص تھا ۔ ان دونوں زبانوں میں ان کے دیوان مطبوعہ ہیں ۔ عربی ، فارسی و اردو کے علاوہ ترکی زبان میں ایک تصنیف "تاریخِ واصف" (۲۴) اور انگریزی زبان کے تعلق سے ایک انگریزی لغت (۲۵) ان سے یادگار ہیں ۔ ایک بیان کے مطابق ان کی تصنیفات کی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی (۲۶) ۔ سخاوت مرزا نے ان کی ۵۳ کتابوں کی فہرست درج کی ہے (۲۷) ۔ ان کے علاوہ کچھ اور کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں ۔ ان کی کل تصانیف میں ان مطبوعات کا ذکر ملتا ہے:

"حدیقۃ المرام" (عربی) ، علماءِ مدراس کا تذکرہ (۲۸) ، "تہذیب الاخلاق" ، ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف "اخلاقِ محسنی" کے چند ابواب کا عربی ترجمہ (۲۹) ، "فراست الانسان فی نصائح اللقمان" ، مدراس کے محمد اعظم علی خاں کی تصنیف "النصائح اللقمانیہ" کا عربی ترجمہ (۳۰) ، "لولوئے منشور فی آدابِ زیارۃ القبور" (عربی) (۳۱) ، "مطالب الفرقان" ، اشاریہ قرآن حکیم (۳۲) ، "دلیلِ ساطع" (فارسی) ، فرہنگِ مترادفات اردو ، ہندی ، سنسکرت (۳۳) ، "حسنِ خطاب (ورد جواب" (مدراس کے افضل الشعرا محمد حسین خاں راقم کے ساتھ ایک علمی محاکمہ (۳۴) ، "ذخیرۃ العقبیٰ فی شرح اسماء الحسنیٰ" (فارسی) (۳۵) ، "وسیلۃ النجات" (فارسی) ، شرح اسمائے نبی کریمؐ (۳۶) ، شرائط تعلق داری (فارسی) (۳۷) ، "دیوانِ واصف" (فارسی) (۳۸) ، "روضہ رضوان" (اردو دیوان (۳۹) ، "منہاج العابدین" ، امام غزالی کی تصنیف "کیمیائے سعادت" کا اردو ترجمہ (۴۰) ، "شعار المتقین" (اردو) (۴۱) ، "دیوانِ مسکین" (اردو) (۴۲) "املانامہ واصفی" (اردو) (۴۳) "رئیس الذاکرین" ، حالات اولیاء کرام (۴۴) ۔

چند اور مطبوعات کا ذکر سخاوت مرزا کی مرتبہ فہرست میں موجود ہے ، لیکن تفصیلات درج نہیں ہیں: "نمایدِ نوشت" (فارسی) ، "معدنِ دانش" (اردو) ، "فضائلِ جمعہ" ، "القول المتین فی اخفا التامین" ، "زبدۃ الاخلاق" (اردو) ، "رسالہ خوفِ خدا" (اردو) "فصل الخطاب و استفتاء نکاح سنی و شیعہ" (۴۵) ، "جواہر المصادر" ، "ڈکشنری انگریزی" ، "شمع و پروانہ" (نظم) (۴۶) ۔

اسی فہرست میں ان مزید کتابوں کا ذکر ہے، جو غیر مطبوعہ ہیں: "تذکرۂ شاعراں" "برزخِ بالغہ"، "ترجمہ" "در المختار"، "مطلوب الاطبا" "تاریخِ واصف" (حربی)، "مجمع الامثال" (اردو نثر)، جب کہ "معدن الجواہر (تذکرۂ شعرائے فارسی)" (۴۷)، "توصیف النبی" (۴۸)، "رو العابدین"، "رقعاتِ واصف"، "حقیقتِ ایمان" (تصوف)، ترجمہ "اسوۂ عشرہ" (نثر اردو ۴۹)، "ترجمہ تفسیر جلالین تحت اللفظی الموسو بہ موضح القرآن" (۵۰) "جواہر الفوائد" (فارسی) احادیث نسبت اخلاق و تصوف، "کنز الرموز" (نثر اردو)، "انوار المشرقین" (۵۱)، "الرسا البہیتہ الدافعہ نسبتہ الرجعیہ الی الحنفیہ" ؟ "الاسقاط الظہریہ بہ سبب الجمعتہ فی ملک مکہ"، "ظفر المقلدین" ؟ "باقی ہوس"، "الله بس" "مناظر اللغات" (فارسی اردو) (۵۲) ؟ "دلیل الشعرا"، لغت محاورات فارسی و ضرب الامثال ---- کے ساتھ کوئی صراحت نہیں کی گئی۔ تصانیف کے علاوہ: "آداب الصالحین"، "خلاصتہ التکمیل" ---- اور "تحسین الاخلاق" کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ ان تصانیف کا پتہ نہ چل سکا۔ جب کہ ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے ان میں سے "آداب الصالحین" (۵۳) اور "خلاصتہ التکمیل الایمان ہندی" (۵۴) اور "مناظر اللغات"، "ترجمہ کیمیائے سعادت"، "رسالہ اخلاق النبی"، "رسالہ تعبیر خواب" (۵۵)، "منہاج العابدین"، "شادی نامہ" (۵۶) "نیا ید نوشت"، "ترجمہ جلالین"، "طریق الہدیٰ فی سنن المصطفیٰ"، "نفائس کلام"، انسان کامل" (۵۸)، "فصل الخطاب"، "انیس الذاکر"، "سخن بشنو"، "توصیف النبی"، "ترجمہ اسوۂ عشرہ"، "نماز المتقین"، "روضہ رضوان" پر مفصل تعارفی شذرات تحریر کیے ہیں (۵۹)۔ ان میں سے "سخن بشنو" (۶۰)، "نماز المتقین" (۶۱)، "طریق الہدیٰ فی سنن المصطفیٰ" (۶۲) اور "رسالہ اخلاق النبی" (۶۳) کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔

واصف کی چند اور تصانیف کا کچھ اور مآخذ سے بھی پتہ چلتا ہے:

عبدالجبار خاں ملکاپوری نے ان کی تصانیف کے ذیل میں ایک تصنیف "گلزارِ اعظم" کا ذکر کیا ہے، لیکن تفصیلات درج نہیں کیں (۶۴)۔ "رسالہ چار موسم" (۶۵) اور "مظہر الاعجاز" (۶۶) بھی ان کی تصانیف بتائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے ان کی اور تصنیف "حکایاتِ لطیفہ" کا سراغ لگایا ہے جو عربی سے اردو ترجمہ ہے (۶۷)۔

واصف کی ایک اور تصنیف "رقعاتِ واصف" کا ذکر سخاوت مرزا نے کیا ہے (۶۸)، لیکن کوئی تفصیل نہیں بتائی۔ اس تصنیف کا ذکر کہیں اور بھی نہیں ملتا۔ ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے ان کے متعدد خطوط کا حوالہ دیا ہے لیکن یہ مرتب اور مطبوعہ نہیں (۶۹) جب کہ "رقعاتِ واصف مطبوعہ ہے اور "رقعاتِ واصفی" کے نام سے بلختم ماہ ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ کو کارخانہ جامع الاخبار، مدراس سے بہ اہتمام رحمت اللہ شائع ہوئی تھی، مگر قریب قریب نایاب ہے۔ اس کا صرف ایک مطبوعہ نسخہ "جامعتہ العلوم الثنامیہ" کڑپہ کے کتب خانے میں موجود ہے لیکن اس کے کم از کم دو اوراق ضائع ہوگئے ہیں (۷۰)۔ راقم کے ذخیرۂ مخطوطات میں اس کا ایک مکمل قلمی نسخہ موجود ہے جو واصف کے انتقال ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء سے چار برس قبل، جب کہ وہ حیدرآباد (دکن) میں رہائش پذیر تھے۔ ۱۲۸۶ھ میں حیدرآباد ہی میں کتابت ہوا۔ ترقیمہ کی عبارت یہ ہے:

بہ تاریخ ششم ربیع الاول ۱۲۸۶ھ مقدسہ روز جمعہ در بلدۂ
فرخندہ بنیاد حیدرآباد منقول گردید

نسخہ مکمل اور عمدہ حالت میں ہے اور پختہ و صاف نستعلیق میں کتابت ہوا ہے اور یہ تقریباً ۱۲.۵ x ۹ س م سائز کے ۲۳ اوراق / صفحات پر مشتمل ہے۔

اس میں کل ۱۰۴ رقعات شامل ہیں، جنھیں مصنف نے اپنے مرشد سید ہمام عالم، اپنے برادر، اپنے فرزند اور اپنے کسی دوست کے نام
ے کیا ہے۔ صرف رقعہ ۲ میں انھوں نے اپنے مکتوب الیہ (سید ہمام عالم) کو نام سے مخاطب کیا ہے، ورنہ بالعموم اپنے مرشد کے لیے صرف
ب استعمال کیے ہیں۔ یا اپنے فرزند کو فرزندِ ارجمند اور بھائی کو برادرِ عزیز القدر سے خطاب کیا ہے۔ یہ القاب بدلتے بھی رہے ہیں اور
ند رقعات القاب کے بغیر بھی راست شروع ہو جاتے ہیں اور سابقہ رقعے یا رقعات کا تسلسل معلوم ہوتے ہیں۔ چند رقعات اپنے کسی
ست کے نام بھی تحریر کیے ہیں، جن کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح اپنے جس فرزند کو وہ مخاطب کرتے ہیں، ان کے بارے میں پتہ نہیں
کہ وہ ان کے کون سے فرزند ہیں؟

ان رقعات کو خود مصنف نے "کلماتِ آب دار" کا عنوان دیا ہے، اور متن اسی عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ ان رقعات کے
وعات کا تعلق ذاتی زندگی اور شخصی و نجی معاملات سے قطعی نہیں۔ تقریباً یہ سب ہی فکر و دانش، علم و حکمت اور اخلاق و موعظت پر
تل اور بے حد جامع و مختصر ہیں اور ان سب میں رقعہ نگار کے علم و تجربہ اور دانش و حکمت کا نچوڑ سمایا ہوا ہے۔

قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں کوئی خاص اختلاف موجود نہیں، لیکن مطبوعہ میں مصنف کا تحریر کردہ ابتدائیہ موجود ہے، مگر مذکورہ
ـعہ نسخہ میں تمہید کا صرف پہلا صفحہ موجود ہے جب کہ اس کے بعد کم از کم ایک ورق ضائع ہو گیا ہے (۱۷)۔ متن آغاز سے موجود ہے، لیکن
ا کا بھی آخری ورق ضائع ہوا ہے۔ رقعہ نمبر ۱۰۲ نا تمام رہ گیا ہے اور عبارت ---- "حصہ بہ قدر حیثہ اش ارزانی دارند ----" پر متن کا
نہ ہوتا ہے۔

حوالے

حالات کے لیے: علی رضا رائق "گل دستہ کرناٹک" ص ص ۵۸-۵۹ مخزونہ: کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، قدرت اللہ گوپاموی "نتائج الافکار" (بمبئی، ۱۳۳۶ھ) ص ۲۹۷-۲۹۸، علی حسن خاں "صبح گلشن" (بھوپال، ۱۲۹۵ھ) ص ۱۸۴-۱۸۵، محمد منور بہادر گوہر "سخن وران بلند فکر" (مدراس، ۱۹۳۶ء) ص ۱۷۳-۱۷۴

حافظ محمد معروف کے ایک اور فرزند معین الدین زور آور علی خاں بھی تھے، جو علم دین اور طریقت میں امتیاز رکھتے تھے۔ میر محمد علی واعظ اور حضرت بادشاہ سے بیعت تھے اور امرا میں ان کی قدر و منزلت تھی۔ محمد مہدی واصف، "حدیقۃ المرام" اردو ترجمہ سخاوت مرزا (کراچی، ۱۹۸۲ء) ص ۷۶

محمد یوسف کوکن "ARABIC AND PERSIAN IN MADRAS (1710-1960)" (مدراس، ۱۹۷۴ء) ص ص ۴۰۱-۴۰۲

و نیز، مصنف: "تذکرۂ گلزارِ اعظم" اور "تذکرۂ صبح وطن"، مطبوعہ: مدراس، علی الترتیب، ۱۸۵۹ء، ۱۸۴۲ء

مرتبہ محمد عبد الباسط، مطبوعہ حیدر آباد، ان کی ایک اور تصنیف "الطائف معروف"، جو عاصم خاں مبارز جنگ عمدۃ الامراء اور دیگر کے نام مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ مدراس کے مدرسہ محمدی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ محمد یوسف کوکن، ص ۴۰۱

نواب غلام غوث خاں کے مذکورہ تذکرے اہم عصر ماخذ ہیں، و نیز عبد الجبار خاں ملکاپوری "تذکرۂ شعرائے دکن" (حیدر آباد، ۱۳۲۹ھ) ص ص ۱۱۲۵-۱۱۲۶، گوہر جلد دوم ص ۱۱۲-۱۱۳)، سخاوت مرزا، مقدمہ، تصنیف مذکور، علیم صبا نویدی "تامل ناڈو کے صاحب تصنیف علما" (مدراس ۱۹۹۶ء) ص ۹۰-۹۳

"حدیقۃ المرام" ص ۵۷

(۸) "حدیقۃ المرام" ص ۴۷

(۹) "حدیقۃ المرام" ص ۵۰-۵۱

(۱۰) "حدیقۃ المرام" ص ۵۷

(۱۱) سخاوت مرزا، ص ۷

(۱۲) "حدیقۃ المرام" ص ۳۱، "تذکرۂ شعرائے دکن" ص ۱۱۲۹

(۱۳) "حدیقۃ المرام" ص ۷۷، مولانا محمد مسکین شاہ کے حالات کے لیے: محمد سلیمان علوی "مظفر نامہ"، حصہ سوم (آگرہ، ۱۹۰۰ء) ص ۱۹-۲۱

(۱۴) گوہر، جلد اول، ص ۱۱۲-۱۱۳، علیم صبانویدی، ص ۹۵-۹۶

(۱۵) نواب غلام غوث خاں "تذکرۂ گلزار اعظم" ص ۳۹۸، گوہر، جلد دوم ص ۱۸۳، ڈاکٹر افضل الدین اقبال، "فورٹ سینٹ جارج کالج: دکنی زبان و ادب کا ایک اہم مرکز" (حیدرآباد دکن، ۱۹۷۹ء) ص ص ۹۵-۱۲۹

(۱۶) ڈاکٹر افضل الدین اقبال "مدراس میں اردو کی نشوونما" (حیدرآباد دکن، ۱۹۷۹ء) ص ص ۲۸۵؛ محمد عمر الیافعی کے مطابق واصف نے "اقبال لقمان" کا راست انگریزی سے نثر فارسی میں "حکایات دل پسند" کے نام سے ترجمہ کیا تھا، جو ہندستان و دکن کے نصاب میں شامل رہنے کے باعث بارہا چھپتا رہا، بہ حوالہ: "فخر قوم ملا عبدالقیوم - "اشاعت خصوصی "مجلہ نظامیہ" (حیدرآباد دکن، ۱۹۳۹ء) ص ۸۹؛ اولاً یہ مدراس سے ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی، پھر یہ دوبارہ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء میں نول کشور سے شائع ہوئی - افضل الدین اقبال "حکایات لطیفیہ" (حیدرآباد دکن، ۱۹۹۳ء) ص ۱۷

(۱۷) تفصیلات کے لیے "تذکرہ گلزار اعظم" ص ۳۹۷-۳۹۹؛ محمد یوسف کوکن، ص ۲۰۴ و بعدہ سخاوت مرزا، مقدمہ؛ مظفر حسین سلیمانی "حیات مسیح" (لکھنو ۱۹۱۱ء) ص ۱۱۹ میں سنہ وفات ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء درج ہے، جب کہ واصف کے فرزند عبدالعلی والہ نے واصف کے انتقال پر یہ قطعہ تاریخ کہا تھا:

مہدی واصف رجب کی تیسویں   فضل حق سے مورد رحمت ہوئے
سال رحلت ان کا والہ نے کہا   آج واصف داخل جنت ہوئے

مشمولہ: منور خاں گوہر، جلد دوم، ص ۱۸۴

(۱۸) مظفر حسین سلیمانی، ۲۰۱۱؛ نیز محمد یوسف کوکن، ص ۲۳۱۰، محمد عبدالباسط "ترانہ عشق" مرتبہ: ملا عبدالباسط (حیدرآباد دکن، ۱۳۵۹ھ)، مقدمہ، عبدالعلی والہ سے "انشاء والہ"، "کلام والہ" اور "دیوان والہ" بہ عنوان "چمنستان بہشت" (تینوں، مطبوعہ حیدرآباد دکن، ۱۳۱۲ھ اور شرح دیوان غالب "وثوق صراحت" (حیدرآباد دکن، ۱۳۱۳ھ) یادیار ہیں - سعدی، حافظ اور فیضی کی شرحیں بھی لکھی تھیں، جو شائع نہ ہوئیں - غلام صمدانی گوہر "تزک محبوبیہ" جلد دوم (حیدرآباد دکن، ۱۳۲۱ھ) دفتر ہفتم ص ۱۹۹

(۱۹) "حدیقۃ المرام" کے خاتمے، ص ۸۰ میں اردو میں ور واصف کی ایک دوسری تصنیف "حسن خطاب و رد جواب" کے آخر میں ان کا فارسی قطعہ تاریخ شامل ہے، مشمولہ محمد یوسف کوکن، ص ۲۰۷، ڈاکٹر افضل الدین اقبال "حکایات لطیفیہ" مرتبہ (حیدرآباد دکن، ۱۹۹۳ء) ص ۲۹ کا تخلص والا بتایا ہے اور ان کے متعدد قطعات تاریخ کی نشان دہی کی ہے - پھر ان کی تصانیف "تاریخ عزیز دکن" "تحفہ" اور "اخلاق عزیزی" پر تفصیلی شذرات بھی تحریر کیے ہیں - ایضاً ص ص ۲۹-۳۴

(۲۰) ص ص ۹۰ - ۹۱

(۲۱) ان کے حالات کے متعدد ماخذ کے علاوہ، ان کے فرزند عبدالباسط کا مرتبہ "مجلہ نظامیہ" اشاعت خصوصی بہ عنوان: "فخر قوم ملا عبدالقیوم" (حیدرآباد دکن، ۱۹۳۹ء)

:) ان کے "دیوانِ وصف" کو بھی محمد عبدالباسط نے مرتب کیا تھا، مطبوعہ حیدرآباد دکن، ۱۳۶۰ھ، حالات کے لیے، مقدمہ، و نیز غلام صمدانی گوہر دفتر بہ ہشتم، ص ۹

۲) اور ایک دوسرے فرزند حسن عبدالقدوس کے داماد محمد عمر مہاجر (۱۹۱۷-۱۹۷۷ء) نے مملکتِ آصفیہ کے دورِ آخر میں اپنے حسنِ خطابت کے باعث ماموری حاصل کی- غالب کے فارسی مجموعہ مکاتیب "پنج آہنگ" کا اردو ترجمہ (مطبوعہ کراچی، ۱۹۷۰ء) اور مقالات کا ایک مجموعہ "ادب اور ادیب" جسے ان کی دختر فریسہ عقیل نے مرتب کیا (مطبوعہ کراچی، ۱۹۸۳ء) ان سے یادگار ہیں-

۲) سخاوت مرزا، ص ۱۱

۲) ایضاً- نواب عزیز جنگ ولا کا بیان ہے کہ انگریزی میں ان کی قابلیت اعلیٰ درجہ کی تھی اور یہ کہ وہ فرانسیسی بھی جانتے تھے- "تاریخ النوا... (حیدرآباد دکن، ۱۹۰۵ء) ص ۳۴۱

۲) حیدرآباد دکن کے ایک فاضل ابو محمد عمر الیافعی کا یہ بیان سخاوت مرزا نے درج کیا ہے، ص ۸

۲) ص ۹-۱۱، اس فہرست میں ۳۳ اور ۴۴ نمبر کے تحت غالباً ایک ہی تصنیف ہے اور "منہاج العابدین" جسے محمد یوسف کوکن نے ترجمہ "کیمیاءِ سعادت" (ص ۴۰۹) اور علیم صبا نویدی نے "احیاء العلوم" کے سات ابواب کا ترجمہ بتایا ہے اور جو مدراس میں ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی، ص ۹۲، ایضاً کے مطابق ترجمہ "کیمیاءِ سعادت" قبل ازیں ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء میں چھپ چکا تھا- پھر یہ ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء میں مطبع حیدری، بمبئی سے بھی شائع ہوا- افضل الدین نے اقبال "فورٹ سینٹ جارج کالج----" ص ۱۱۲ مذکورہ فہرست میں "مطلوب الاطبا" اور "ترجمہ موجز" کا کل علاحدہ علاحدہ اندراج ہوا ہے، جب کہ "فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو" مرتبہ: افسر صدیقی (کراچی، ۱۹۶۵ء) جلد اول، ص ۳۶۱- جلد سوم، ص ص ۲۶-۲۷ کے مطابق یہ دونوں دراصل ایک ہی ہیں-

۲.) مطبوعہ: مظہر العجائب پریس- مدراس، ۱۲۷۹ھ، بہ حوالہ محمد یوسف کوکن، ص ۴۰۴

۲) مطبوعہ: مظہر العجائب پریس، مدراس ۱۲۷۸ھ، بہ حوالہ ایضاً، اس کا ایک قلمی نسخہ ذخیرۂ مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی میں موجود ہے، بہ حوالہ افسر صدیقی، جلد دوم، ص ۴۶

۳) مطبوعہ: مظہر العجائب پریس، مدراس، ۱۲۷۱ھ، بہ حوالہ محمد یوسف کوکن، ص ص ۴۰۴-۴۰۵

۲) مطبوعہ: مظہر العجائب پریس- مدراس ۱۲۷۸ھ، بہ حوالہ ایضاً، ص ۴۰۵

(۳۲) مطبوعہ: مظہر العجائب پریس، مدراس، ۱۲۸۱ھ بہ حوالہ ایضاً-

۳۱) مطبوعہ: مظہر العجائب پریس، مدراس ۱۲۶۶ھ، اشاعت ثانی، ۱۲۷۷ھ، بہ حوالہ ایضاً ص ۴۰۵، اس کا ایک قلمی نسخہ ذخیرۂ مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی میں موجود ہے- افسر صدیقی، جلد اول، ص ۲۵۶، ایک اور قلمی نسخہ کتب خانہ سعیدیہ، حیدرآباد دکن میں اور ایک مطبوعہ نسخہ (۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء) کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے، بہ حوالہ افضل الدین اقبال "فورٹ سینٹ جارج کالج----" ص ۱۰۸

۳۱) مطبوعہ: ۱۲۸۷ھ بہ حوالہ محمد یوسف کوکن، ص ص ۴۰۶-۴۰۷

۳) مطبوعہ: مطبع مظہر العجائب، مدراس، ۱۲۷۵ھ، بہ حوالہ ایضاً، ص ۴۰۶

۳) مطبوعہ: ۱۲۷۵ھ، بہ حوالہ ایضاً

۳) ۱۲۷۷ھ، بہ حوالہ ایضاً، ص ۴۰۷

۳.) مطبوعہ: ۱۲۹۴ھ، بہ حوالہ ایضاً، علیم صبا نویدی نے اس کا سنہ اشاعت ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) بتایا ہے، ص ۹۳

۳) ایضاً میں اسے نعتیہ مجموعہ بتایا گیا ہے- مطبوعہ: مدراس، ۱۲۷۵ھ، بہ حوالہ محمد یوسف کوکن، ص ۴۰۸، جب کہ نصیر الدین ہاشمی "مدراس میں اردو" (حیدرآباد دکن، ۱۹۳۸ء) ص ۸۴ میں اس کا سنہ اشاعت ۱۲۷۳ھ درج ہے، و نیز یہ مطبع عظیم الاخبار، مدراس سے منشی غلام استاد

فورٹ سینٹ جارج کالج کے قیام سے اسی سال شائع ہوا۔ افضل الدین اقبال "فورٹ سینٹ جارج کالج ---" ص ۱۲۲

(۴۰) مطبوعہ: مدراس ۱۸۶۱ء، بہ حوالہ جے ایف بلوم ہارٹ
" Catalogue of the library of the India Office:
HINDUSTANI BOOKS" (لندن، ۱۹۰۰ء) ص ۲۳۰، و نیز، محمد یوسف کوکن، ص ۴۰۹، بہ ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء میں بھی مظہر العجائب مدراس سے شائع ہوئی تھی۔ افضل الدین، فورٹ سینٹ جارج ---" ص ۱۱۳

تصنیف مدراس سے دو مرتبہ شائع ہوئی۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۶۷ء میں، بہ حوالہ۔ بلوم ہارٹ، ص ۲۳۳، اسکا ایک قلمی نسخہ "کتب خانہ عبیداللہ مدرس" میں محفوظ ہے۔ بہ حوالہ "امانتی کتب خانہ، خاندان شرف الملک مدراس کے اردو مخطوطات" مرتبہ: ڈاکٹر محمد غوث، محمد افضل الدین اقبال (حیدر آباد دکن، ۱۹۸۹ء) ص ۸۸

(۴۲) مطبوعہ: مظہر العجائب پریس، مدراس، ۱۲۷۰ھ، بہ حوالہ، محمد یوسف کوکن، ص ۴۱۰، علیم صبانویدی، ص ۹۳ کے مطابق یہ مطبع مدراس سے ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ ممکن ہے یہ اولین اشاعت ہو۔

(۴۳) مطبوعہ: عزیزیہ پریس، مدراس ۱۲۷۶ھ، بہ حوالہ محمد یوسف کوکن، ص ۴۱۰

(۴۴) مطبوعہ: مطبع مظہر العجائب، مدراس ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء، بہ حوالہ علیم صبانویدی، ص ۹۲، شاید یہ دوبارہ بھی شائع ہوئی: مطبوعہ: بمبئی، بہ حوالہ: سجاد مرزا بیگ دہلوی، "ال فہرست" (حیدر آباد دکن، ۱۹۲۳ء) ص ۳۰۵، اس کا اول الذکر مطبوعہ نسخہ کتب خانہ سالار جنگ موجود ہے۔ افضل الدین اقبال "فورٹ سینٹ جارج کالج ---" ص ۱۱۶

(۴۵) یہ مدراس میں ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں مطبع مظہر العجائب سے شائع ہوئی۔ بہ حوالہ ایضاً ص ص ۱۱۵-۱۱۶

(۴۶) سخاوت مرزا، ص ص ۹-۱۱، ان میں سے "نیا یادنوشت" ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں مطبع مظہر العجائب مدراس سے شائع ہو چکی ہے اور اس نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔ افضل الدین اقبال "فورٹ سینٹ جارج کالج ---" ص ۱۱۴، اور "ڈکشنری انگریزی" و "انگریزی ہندوستانی اور فارسی لغت" ہے، جو مدراس میں ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء میں شائع ہوئی، ایضاً ص ص ۱۰۴-۱۰۷

(۴۷) مطبوعہ: ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء، بہ حوالہ علیم صبانویدی، ص ۹۱

(۴۸) یہ ایک مختصر رسالہ ہے، جس کا قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔ بہ حوالہ، افضل الدین اقبال "فورٹ سینٹ کالج ---" ص ص ۱۰۸-۱۰۹

(۴۹) "غالباً" یہ شائع نہیں ہوا، اس کا صرف ایک قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔ محی الدین قادری زور، مخطوطات، "جلد پنجم (حیدر آباد، ۱۹۶۰ء) ص ۱۵۸، و نیز افضل الدین اقبال "فورٹ سینٹ جارج کالج ---" ص ص ۱۱۹-۱۲۰

(۵۰) "الفہرست" (ص ۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو جلدوں میں ہے لیکن مزید تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔ علیم صبانویدی کے مطابق یہ علاء الدین محمد شافعی اور شیخ جلال الدین سیوطی کی تفسیر کا ترجمہ ہے، جو ۱۲۳۸ھ / ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا۔ ص ۹۲، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ نندی، مدراس میں موجود ہے اور اس کے آخر میں میر شمس الدین فیض، عبدالکریم فطرت (فرزند) عبدالغفور ناظر، سید عبداللہ عبدالعزیز کاشف کے قطعات تاریخ شامل ہیں۔ افضل الدین اقبال "فورٹ سینٹ جارج کالج ---" ص ۱۱۴

(۵۱) اس کا ایک قلمی نسخہ ذخیرۂ مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی میں موجود ہے۔ بہ حوالہ سرفراز علی رضوی "مخطوطات انجمن ترقی اردو" عربی (کراچی، ۱۹۶۷ء) ص ۵۰، یہ ۴۰ صفحات پر مشتمل اور ۱۲۷۲ھ کا مکتوبہ ہے۔ فہرست نگار نے اسے خود نوشتہ بتاتا ہے۔

(۵۲) مطبوعہ: ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء، بہ حوالہ علیم صبانویدی، ص ۹۱، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سعیدیہ، حیدر آباد دکن میں موجود ہے۔ افضل اقبال "فورٹ سینٹ جارج کالج ---" ص ۱۰۹

(۵۳) یہ کتاب ۱۲۹۳ھ ، ۱۲۹۹ھ اور ۱۲۹۰ھ میں شائع ہوئی۔اس کا آخری مطبوعہ نسخہ کتب خانہ مدرسہ محمدی ۔ مدراس میں موجود ہے ۔ بہ حوالہ افضل الدین اقبال "فورٹ سینٹ جارج کالج ----" ص ۱۰۴

(۵۴) مطبوعہ: نظام المطابع ، ویلور ، ۱۲۶۹ھ / ۱۸۴۳ء بہ حوالہ قاموس الکتب اردو "جلد اول ، انجمن ترقی اردو کراچی ، (کراچی ، ۱۹۶۱ء) ص ۲۰۷)

(۵۵) مطبوعہ: ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء ، بہ حوالہ علیم صبا نویدی ، ص ۹۲ ، و نیز افضل الدین اقبال "فورٹ سینٹ جارج کالج ----" ص ۱۳

(۵۶) مطبوعہ: مطبع مظہر العجائب ، مدراس ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء بہ حوالہ ایضاً و نیز بلوم ہارٹ ، ص ۳۷

(۵۷) مطبوعہ: مطبع مظہر العجائب ، مدراس ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء بہ حوالہ ایضاً ، ص ۱۱۵ ، و نیز "فہرست نمائش ادارۂ تحقیقات اردو" (جلد اول ، حصہ مخطوطات) مرتبہ: قاضی محمد سعید (پٹنہ ، ۱۹۵۹ء) نمبر شمار ۸۷۲ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا ایک قلمی نسخہ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ میں موجود ہے۔

(۵۸) مطبوعہ مطبع مظہر العجائب ، مدراس ، ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء بہ حوالہ افضل الدین اقبال "فورٹ سینٹ جارج کالج ----" ص ۱۷۷

(۵۹) "فورٹ سینٹ جارج کالج ----" ص ص ۹۹-۱۲۸

(۶۰) مطبوعہ: مطبع مظہر العجائب ، مدراس ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء ایضاً ، ص ۱۱۸

(۶۱) مطبوعہ: مطبع عظیم الاخبار ، مدراس ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء ایضاً ، ص ۱۲۰

(۶۲) مطبوعہ: مطبع عظیم الاخبار ، مدراس ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء ایضاً ، ص ۱۱۵

(۶۳) مطبوعہ: مطبع عظیم الاخبار ، مدراس ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء ایضاً ، ص ۱۱۲

(۶۴) "تذکرۂ شعراء دکن" ص ۱۱۲۶

(۶۵) "فہرست نمائش ادارۂ تحقیقات اردو" نمبر شمار ۸۴۱

(۶۶) ایوانو ولادیمیر

" Consise Discriptive Catalogue of the Persian MSS. in the Curzon Collection of the Asiatic Society of Bengal (کلکتہ ، ۱۹۲۴ء) ص ۸۰۷

(۶۷) مطبوعہ: مطبع جامع الاخبار ، مدراس ، ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء ۔ بعد میں یہ ۱۸۶۳ء میں بھی اور پھر ۱۹۱۰ء میں مطبع مجتبائی لکھنو سے بھی چھپی ۔ "حکایات لطیفہ" ص ص ۱۸-۲۲

(۶۸) ص ۹

(۶۹) "فورٹ سینٹ جارج کالج ----" ص ص ۱۲۰-۱۲۲

(۷۰) ڈاکٹر راہی فدائی ، مقیم کڑپہ کی عنایت سے اس نسخہ کا عکس راقم کے استفادہ میں آسکا

(۷۱) تمہید کی محض یہ عبارت مذکورہ نسخہ مطبوعہ میں موجود ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد حمد آفرید گاری کہ ارحم الراحمین است و نعت رسول مختار صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کہ رحمۃ للعالمین است و پس از تحیت و رضوان بر روان پاک خلفای راشدین و ائمہ طاہرین می گوید۔ بندہ ہیچمدان واصف کج مج بیان کہ این رسالہ است مشتمل بر رقعات مطالب جداگانہ کہ لو مشتاقان فن انشاء را یادگر نقش ۔ اگر خدا خواہد خیلی مفید باشد و حفظ عبارتش کشایش صندوق را کلید باشد بدیہہ ۔ است از واصف بطلبہ ، روزگار و تحفہ ،

خانوادۂ محمد مہدی واصف

حافظ محمد معروف برہانپوری

محمد عارف الدین خاں رونق

۱۷۷۸ء - ۱۸۵۳ء

محمد مہدی واصف
۱۸۰۴ء - ۱۸۷۳ء

زین العابدین

عبدالباسط عشق
۱۸۲۰ء - ۱۸۸۴ء

عبدالرحمن یاد

عبدالکریم فطرت

عبدالعلی والہ
۱۸۳۱ء - ۱۸۹۳ء

عبدالعزیز
۱۸۵۹ء

ملا عبدالقیوم
۱۸۵۳ء - ۱۹۰۶ء

عبدالحیٔ وصف

ملا عبدالباسط

حسن عبدالقدوس
متوفی ۱۹۴۷ء

عبدالرحمن

حسین عبدالمنعم

ڈاکٹر راہی فدائی

سلطنت خداداد کا غدار میر صادق اور اس کا قاتل

علامہ اقبال نے اپنی معرکہ آرا تخلیق "جاوید نامہ" میں غدارِ سلطنتِ خداداد میر صادق اور مکارِ مملکت بنگال میر جعفر کے خبث باطنی
برت انگیز نقشہ کھینچتے ہوئے رقم کیا ہے:

منزلِ ارواحِ بے یوم النشور — دوزخ از احراقِ شاں آمد نفور
اندرون او دو طاغوتِ کہن — روحِ قومے کشتہ از بہرِ دو تن
جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

زیرِ نظر مضمون میں میر صادق کے تعلق سے چند تاریخی اہمیت کے سوالات اور ان کے جوابات دلائل کی روشنی میں پیش کیے جا رہے
:

حضرت ٹیپو سلطان شہید کی تاریخ جو در اصل آزادیٔ ہند کی تاریخ ہے، کا مطالعہ کریں تو زوالِ سلطنتِ خداداد کے اسباب تلاش کرتے
نے ذہن کے زاویہ، نقد و نظر سے درج ذیل سوالات ضرور ابھر آئیں گے کہ میر صادق ہے کون؟ اس نے کس لیے اپنے محسن و آقا کے ساتھ
ب حرامی کی؟ اس نے کس لیے طوق لعنت و ملامت کو زیب گلو بنانا پسند کیا تھا؟ اس کا انجام کیا ہوا؟ اور کس نے اس کو اپنے کیفرِ کردار تک
پایا؟

میر صادق کا تذکرہ کرتے ہوئے مؤلف "صحیفہ ٹیپو سلطان" محمود خاں محمود بنگلوری نے بہ حوالہ کرنل بیٹسن (Beatson)
نف "ٹیپو سلطان سے جنگ" رقم کیا ہے کہ میر صادق آرکاٹ (Arcot) موجودہ تملناڈو کا باشندہ تھا، (ص ۳۰۷ مطبوعہ ۱۹۴۲ء
ٹبہ، ادب لاہور) مگر مولوی محمد خاں جیوری نے سفر نامہ بچانن (Buchanan) طبع دوم، جلد اول، مطبوعہ ۱۹۷۰ء، ص ۴۴ کے
الے سے تحریر کیا ہے کہ میر محمد صادق وڈبالاپور (Dodbalapur) ضلع بنگلور کرناٹک میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام میر نقی اور
ں کے نانا کا نام میر احمد خاں (جاگیر دار صوبہ، سرا) تھا۔ (ص ۵۰ ریاست میسور میں اردو مطبوعہ ۱۹۶۰ء) محقق شہیر میر حسین علی کرمانی حاکم
لف "نشانِ حیدری" کا بیان ہے کہ میر محمد صادق میر احمد خاں جاگیر دار تعلقہ، بلگوار اور منصب دار صوبہ، سرا کا نواسا تھا۔ ایک مدت تک
ر صادق فوج کے رکاب بازار کا کوتوال تھا، وہ اپنی زندگی بڑی کفایت شعاری اور جزرسی سی بسر کرتا تھا، نواب حیدر علی خاں بہادر (متوفی
۱۱۹۷ھ مطابق ۱۷۸۲ء) نے اس کو ۱۱۹۴ھ مطابق ۱۷۸۰ء میں شہر آرکاٹ کی صوبہ داری عطا کی تھی، میر صادق اپنے اسی وصف خاص یعنی جزرسی
کفایت شعاری کے سبب سے جو اس سے کوتوالی اور صوبہ داری کے زمانے میں ظاہر ہوئی تھی، سلطان ٹیپو کا منظورِ نظر بن گیا تھا، پھر بہت
د ۱۱۹۸ھ میں سلطان نے اس کو منصبِ دیوان یعنی وزارت عظمیٰ پر مامور کر دیا۔

میر صادق کے سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے محمود خاں بنگلوری نے لکھا ہے کہ میسور میں عام طور پر مشہور ہے کہ (میر صادق
یدرآباد کے میر عالم کا بھائی تھا، مذہباً شیعہ تھا اور نجفی النسل سید تھا (ص ۳۸۰ تاریخ سلطنتِ خداداد۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۸۹ء) محمود خاں بنگلوری کا
کورہ بیان کہ وہ میر عالم کا برادرِ حقیقی تھا، امرِ واقعی کے خلاف ہے، یہ اس لیے کہ ابو القاسم موسوی شوستری ملقب بہ میر عالم وزیر اعظم نظام
ملک آصف جاہ کے والد کا نام سید رضی شوستری تھا (تذکرہ۔ گلزار اعظم از نواب محمد غوث خاں بہادر اعظم مدراس ۱۲۷۲ھ صفحہ ۲۲۷) اور

میر محمد صادق کے باپ کا نام میر علی تقی تھا جیسا کہ قبل ازیں مذکور ہوا ہے۔ البتہ میر عالم کا ایک حقیقی بھائی سلطان ٹیپو کے مصاحبوں میں ضرور شامل تھا مگر اس کا نام میر صادق نہیں بلکہ زین العابدین شوستری مؤلف "فتح المجاہدین" ہے۔

(سوانح ٹیپو سلطان از مولوی سید امجد علی اشہری۔ دہلی۔ صفحہ ۱۵) منصب دیوان (وزارت عظمیٰ) پر مقرر کیے جانے کے بعد میر صادق کی نیت میں فتور آگیا۔ وہ کفایت شعاری کے بجائے حرص و ہوس کا شکار ہو گیا۔ ۱۲۰۲ھ مطابق ۱۷۸۷ء میں جب سلطان ٹیپو دشمنوں سے فرصت پاکر ملک و لشکر کے انتظام کی طرف متوجہ ہوئے تو میر صادق کے ظلم و ستم اور خرد و برد کے حیرت انگیز واقعات ان کے علم میں لائے گئے۔ سلطان نے اس پر تحقیقات کا حکم جاری فرمایا۔ جب جرم ثابت ہو گیا تو سلطان نے میر صادق کو نہ صرف اس کے عہدے سے برطرف کر دیا بلکہ اس کی تمام ناجائز کمائی اور جملہ اثاثہ قرق کر دینے کا حکم صادر فرمایا۔ چنانچہ میر صادق کی کوٹھی سے نقد دو لاکھ روپئے سکہ۔ رائج الوقت، ایک لاکھ "ہون محمدی" اور زر و جواہر اور طلائی و نقرئی ظروف کثیر تعداد میں برآمد ہوئے۔ بعد ازاں سلطان نے میر صادق سے ربط قائم رکھا اور اس کے مشوروں پر عامل رہا (حملات حیدری از شیخ احمد علی گوپاموی۔ کلکتہ ۱۸۴۹ء ص ۵۵) سلطان کو اسی مہدی خاں کی وجہ سے جنرل میڈس سے دب کر صلح کرنی پڑی تھی، اسی نے عین لڑائی میں توپوں کا دہانہ بارود کے بجائے مٹی اور ریت سے بھر دیا تھا۔ وہ پورے پانچ سال یعنی ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۲ء تک عہدہ۔ دیوان پر فائز رہا۔ جب اتحادی افواج اپنے اپنے مستقر کو لوٹ گئے تو سلطان ٹیپو نے چاہا کہ اپنے اعیان و ارکان کی وفاداریوں کا امتحان لے، چناں چہ مختلف نوعیت سے جانچ اور آزمائش کی گئی تو پتہ چلا کہ خود دیوان سلطنت مہدی خاں نائطی سازش میں شریک ہے اس نے اتحادیوں سے ساز باز کر۔ کھی ہے۔

اس افشاء راز کے بعد سلطان نے فی الفور اس کو معزول کر دیا اور دوبارہ میر صادق ہی کو منصب دیوانی پر بحال کر دیا۔ ۱۲۱۱ھ مطابق ۱۷۹۶ء میں جب کہ سلطان کے دونوں شہزادوں کی انگریزوں کے چنگل سے واپسی پر جشن منعقد ہوا تھا تو اس موقع پر میر صادق نے ایک تفصیلی عہد نامے کے ذریعہ، خدا اور رسول اور کلام اللہ کی قسم کھاتے ہوئے اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ (تاریخ سلطنت خداداد ص ۲۲۷) اس طرح میر صادق سلطان کو بظاہر دھوکہ دینے اور ان کے دل میں پھر سے جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ میر صادق کے ذہن و دل حقیقت میں اپنی ذلت پر انتقام کی آگ میں تپ رہے تھے اسی اثنا میں انگریزوں نے اس کے احساسات، جذبات سے مکمل فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ پیغام بھجوایا کہ اگر وہ بغیر کسی پس و پیش کے انگریزوں کا ساتھ دے گا تو اس کو سرکار خداداد کا حاکم بنا دیا جائے گا۔ انگریزوں کی اس پیش کش کا ذکر سب سے پہلے غوثی چنگل پیٹی نے اپنی مثنوی "شہادت جنگ سلطانی" مرقومہ ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں کیا تھا غوثی رقم طراز ہیں:

غرض نئیں جو ہمنا ملک مال سوں — اول شاہ کو دے ہو سلطان توں
تجھے دیویں گے تخت شاہی تمام — کریں گے سلاماں تجھے صبح و شام
روانہ کیے جب او نامہ تمام — ہوا شاد نامے سوں بد بخت خام

(مثنوی شہادت جنگ سلطانی مرتب مولوی محمد خاں میسوری، مطبوعہ ۱۹۶۰ء، ص ۴۳)

میر صادق نے انگریزوں کی مذکورہ لالچ سے خوش ہو کر اپنے محسن و آقا کے خلاف غداری و نمک حرامی کرتے ہوئے سلطان کے اطراف سازشوں کا جال پھیلا دیا۔ (بقول مؤلف سلطنت خداداد) بہ حیثیت وزیر اعظم ہونے کے سلطنت خداداد کی تباہی کی پوری پوری ذمہ داری اسی غدار پر عائد ہوتی ہے۔ اول تو وہ سلطان تک صحیح خبریں پہنچنے نہیں دیتا تھا اور اخیر میں ۴ / مئی ۱۷۹۹ء کے دن (یعنی سلطان کی شہادت کے دن) جب سلطان ڈڈی دروازے (یعنی عقبی دیوار میں واقع وہ دروازہ جو عام دریچے سے بڑا ہوتا ہے) سے باہر نکلا تو اس (میر صادق) نے دروازہ بند کرا دیا کہ سلطان واپس نہ آسکے اور فصیل قلعہ پر سلطان کی موجودگی کی اطلاع انگریزی فوج کو اسی غدار نے دی تھی۔" (ص ۵۸۹)۔ صاحب "نشان حیدری" لکھتے ہیں "جس وقت سلطان کی سواری مورچے کی طرف روانہ ہوئی تھی، کور باطن میر صادق ان

کے پیچھے دوڑتا ہوا گیا اور مذکورہ دریچے (ڈڈی دروازے) کو بند کر کے راستے کو مسدود کر دیا اور خود کمک لانے کے بہانے سے گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل گیا" (حصہ دوم - لاہور ۱۹۶۰ء ص ۱۹) میر صادق کی غداری کا احوال انگریز مورخوں نے بھی لکھا ہے - "مؤلف تاریخ ٹیپو سلطان" نے ولزلی (Wellesley) کے حوالے سے تحریر کیا کہ "کارنوالس نے جب میسور پر حملہ کیا تو راجہ کو نکال لے جانے میں، روپے کے توسل سے میر صادق کو آلہ کار بنایا گیا تھا" (تاریخ ٹیپو سلطان مولفہ محب اللہ - نئی دہلی ۱۹۸۲ء ص ۴۵۰) مؤلف سلطنت خداداد نے ولکس اور بورنگ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "میسور کی تیسری جنگ کے بعد اس (میر صادق) نے رعایا پر تشدد کرنا شروع کر دیا تھا مطلب یہ تھا کہ رعایا کو سلطان سے بددل بنا دیا جائے -" (ص ۳۸۱)

کرنل ڈبلیو میلس (W. Miles) اپنی کتاب "ٹیپو سلطان" دیباچے میں لکھتا ہے کہ "یہ کہانی کہ میر صادق نے اس (سلطنت ٹیپو) سے غداری کی اور اس کو انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کے حوالے کر دیا - کوئی ناقابل فہم بات نہیں ہے (صحیفہ ٹیپو سلطان حصہ دوم از محمود خاں بنگلوری ص ۳۱۱) اس واقعے کے پس منظر کا خلاصہ مؤلف "ٹیپو سلطان" نے اس طرح قلم بند کیا ہے:

"۷ / مئی ۱۷۹۹ء (۲۹ / ذیقعدہ ۱۲۱۳ھ) کو ٹیپو سلطان نے اپنی زندگی میں آخری مرتبہ سورج نکلتے دیکھا صبح سویرے (طاؤس حالی) گھوڑے پر سوار ہو کر وہ فوجیوں کے معائنے کے لیے نکلے، انگریزوں کی مسلسل گولہ باری سے قلعہ کی ایک دیوار گر گئی تھی، انہوں نے اس کی مرمت کا حکم دیا پھر فصیل پر اپنے بیٹھنے کے لیے سائبان لگانے کا حکم دیا، اور پھر واپس محل میں آکر انہوں نے غسل کیا - قلعے کے محاصرے کے بعد سے یہ محل میں رہائش ترک کر کے سپاہیوں کی طرح ایک خیمے میں رہنے لگے تھے غسل سے فارغ ہونے کے بعد دوپہر تک فصیل کی مرمت دیکھتے رہے، دن کے کوئی ایک بجے فصیل سے نیچے اترے ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے اور وہیں دوپہر کا کھانا طلب کیا، مگر ابھی ایک نوالہ ہی لیا تھا کہ شہر کی طرف سے رونے اور چلانے کی آوازیں سنائی دیں ٹیپو سلطان نے پوچھا کہ یہ شور کیسا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ شاہی توپ خانہ کا سردار سید غفار ہلاک ہو گیا ہے اور انگریزی فوج بلا روک ٹوک قلعے کی طرف بڑھی چلی آرہی ہے وہ دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوئے چند جاں نثاروں کو ساتھ لیا - اور قلعے کے دریچے (ڈڈی دروازہ) سے نکل کر دشمن پر حملہ کرنے کے لے بڑھے، ان کے باہر نکلتے ہی دیوان میر صادق نے اندر سے دریچے کو بند کر دیا تاکہ انھیں واپس قلعے میں آنا پڑے تو وہ نہ آسکیں"

(ٹیپو سلطان از صفدر حسین - حیدر آباد - ۱۹۹۰ء ص ۶۴) اس غداری کی سزا میر صادق کو کس صورت میں بھگتنی پڑی، اس کی تفصیل صاحب "حملات حیدری" نے یہ ایں طور بیان کی ہے -" (میر صادق) نے گنجام کے تیسرے دروازے پر آکر دربانوں کو کہا کہ خبردار میرے جانے کے بعد تم چپ چاپ جلد دروازہ بند کر لینا، وہ یہ کہہ کر آگے بڑھا تھا کہ سامنے سے ایک سپاہی ملازم سلطانی آکر اس کو لعن طعن کرنے لگا کہ اے روسیاہ راندہ درگاہ یہ کیسی بے حمیتی ہے کہ تو ایسے سلطان دین پرور اور محسن عالی گوہر کو دشمنوں کی جال میں پھنسایا، اپنی جان لیے جاتا ہے، کمزارہ روسیاہی کے کاجل سے اپنا منہ تو کالا کر لے، یہ کہتا ہوا کمال طیش سے ایک ہی وار میں اس کو آب تیغ سے شربت اجل پلا زین سے زمین پر مار گرایا، لاش اس کی چار دن بعد قلعے کے دروازے پر بے کفن، دفن کی گئی - شہر کے لوگ اب تک بھی آتے جاتے قصداً اس کی قبر پر تھوکتے، پیشاب کرتے اور ڈھیر کی ڈھیر پرانی جوتیاں ڈالتے ہیں" - (حملات حیدری کلکتہ ۱۸۴۰ء ص ۲۱۰، ۶۰۹) نشان حیدری کے مصنف لکھتے ہیں کہ "اسی وقت (جب کہ میر صادق سلطان کی راہ واپسیں مسدود کر کے خود راہ فرار اختیار کے ہوئے تھا -) ایک شخص نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا اور لعنت ملامت کرتے ہوئے اس سے کہا "اے ملعون! تو شاہ دین پناہ کو دشمنوں کے حوالے کر کے اپنی جان سلامت لے جانا چاہتا ہے؟ لے اب میں تیرے کیے کا پھل تجھے چکھائے دیتا ہوں - یہ کہہ کر اس نے تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ وہ غدار گھوڑے پر سے چکرا کر گر پڑا اسی وقت لوگوں نے ہجوم کر کے اس کو مار مار کر قیمہ کر دیا اور اس ناپاک لاش کو بول و براز میں پھینک دیا" - (باب ۱۹)

میر صادق کے قتل ہونے کی تصدیق مثنوی "شہادت جنگ سلطانی" سے بھی ملتی ہے، چناں چہ غوثی جنگل پیٹی رقم طراز ہیں:

نہ لا تاب بھاگیا وہ کاذب نکل　　اسی وقت اس کو کیا کوئی قتل!
کہ یکرن بار دیکھو کیا کیا نول　　پوشیدہ رکھیا تھا او مطلب اول
وے مقصد کو اپنے بھی پایا نہیں　　فلک کوں بھی کام اس کا بھایا نہیں۔

(میر صادق کے نام کو شاعر اپنی مثنوی میں میر کاذب کے اسم صفت سے یاد کرتا ہے ص ۴۲)

مذکورہ مثنوی "شہادت سلطانی" ۱۲۱۳ھ کے تین سال بعد اور "نشانِ حیدری" ۱۲۱۷ھ میں یعنی شہادت کے چار سال بعد معرضِ وجود میں آئی۔ ان معتبر اور قریب العہد تاریخوں کی موجودگی میں بعض لوگوں کا یہ زعم باطل کہ "وہ (میر صادق) میر عالم کے ساتھ حیدر آباد چلا گیا اس کے قتل کی خبر صرف اس کو بچانے کے لیے گھڑی (گئی) تھی" (صحیفہ ٹیپو سلطان۔ ص ۳۰۹) ناقابلِ اعتنا متصور ہو گا علاوہ ازیں حیرت ہے کہ مشہور مورخ محمود خاں محمود بنگلوری کو میر صادق کی غداری ایک سربستہ راز معلوم ہوتی ہے چناں چہ وہ لکھتے ہیں "میر صادق کے سامنے کونسا لالچ تھا؟ کس چیز نے اس کو ہوس دلائی؟ بہت ممکن ہے کہ اس غدار سے کوئی ایسا معاہدہ کیا گیا ہو جیسا کہ بنگال میں میر جعفر سے کیا گیا تھا۔ میر جعفر سے غداری کے صلے میں وعدہ کیا گیا تھا کہ بنگال کی مسند نوابی اس کو دی جائے اور یہ بعید از عقل نہیں کہ میر صادق کو بھی ہوس دلائی گئی ہو۔ لیکن سلطان کی شہادت کے ساتھ ہی اس کا بھی اچانک قتل کر دیا جانا اس راز کو ہمیشہ کے لیے مقفل کر گیا" (صحیفہ ٹیپو سلطان حصہ دوم ص ۳۱۲) حالاں کہ خوشی چنگل چیٹی نے لالچ کی تفصیل دیتے ہوئے انگریزوں کا قول نقل کیا ہے:

تجھے دیویں گے تخت شاہی تمام　　کریں گے سلاماں تجھے صبح و شام

مولوی محمد خاں میسوری نے محمود خاں بنگلوری کے شبہہ کا ازالہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "۸۷-۱۷۸۷ء میں سلطان کی میر صادق سے عدم اعتمادی، اس کے اثاثے کی ضبطی، اس کی برطرفی، اور محبوسی، میر صادق کی تذلیل و تحقیر کی انتہا تھی، اس کو بالکل سطحی سمجھ کر میر صادق کی سلطان سے نمک حرامی کی کوئی اور موہوم وجہ تلاش کرنا عبث ہے" (ریاست میسور میں اردو۔ ص ۵۲) میر صادق کی غداری کے اسباب اور اس کا عبرتناک انجام طشت از بام ہو جانے کے بعد آخر میں یہ اہم سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس غدار کو کیفرِ کردار تک پہنچانے والا کون تھا۔ اس کا کوئی نام و نشان تاریخ کی صفحات پر مرقوم ہے کہ نہیں؟ تعجب کا مقام ہے کہ ہر ایک مورخ نے اس مردِ جری کا نام نظر انداز کر دیا جس نے میر صادق کو نہ صرف راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے پہچان لیا بلکہ اس کا راستہ روک کر بڑی دلیری و احساس ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے سلطان کے ساتھ نمک حرامی کا مزہ بھی چکھا دیا مگر تاریخ کی خوش بختی ہے بہ مصداق ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین (اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے ہیں) اس محسنِ قوم کا نام تاریخ کے حافظے میں بہر حال آ ہی گیا۔ چناں چہ محمود خاں بنگلوری رقم طراز ہیں "لیکن بعض لوگ اس (میر صادق) کے قاتل تک کا نام لیتے ہیں جو کڈپہ کا ایک پٹھان قادر خاں نامی تھا کسی نے اسی زمانے میں ایک مسدس بھی میر صادق پر لکھی تھی جس میں قادر خان کا نام لیا گیا ہے" (صحیفہ ٹیپو سلطان حصہ دوم ص ۳۰۹)

مذکورہ بالا اقتباس سے ایک اشکال ابھرتا ہے کہ میر صادق کا قاتل قادر خان کڈپہ کا متوطن تھا تو وہ کس طرح سری رنگ پٹن پہنچا ہوا جب کہ سلطنت خداداد کی مختلف تاریخوں میں قاتل کے نام کے بجائے صرف ایک جاں نثار سپاہی مرقوم ہے۔ اس اشکال کو دفع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سلطان ٹیپو کے والد نواب حیدر علی کے معرکوں کا وہ باب الٹا جائے جس میں نواب حیدر علی نے کڈپہ کی موروثی حکومت جس کا حکمراں میانہ خاندان کا افغانی سردار نواب عبدالحلیم خاں تھا، ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں کاری ضرب لگائی تھی۔ نواب حلیم خاں ۱۱۹۱ھ مطابق ۱۷۷۸ء تک برابر نواب حیدر علی خاں کی خدمت میں خراج ادا کرتا رہا بعد ازاں اس نے سرکشی کرتے ہوئے باج گزاری بند کر دی۔ اس پر نواب حیدر علی نے دوبارہ کڈپہ پر فوج کشی کر دی جس کے نتیجے میں حاکم کڈپہ نے قلعہ سدھوٹ کی طرف پسپائی اختیار کر لی اور قلعہ بند ہو کر صلح کی کوشش کرنے لگا۔ اس معرکے میں نواب بہادر حیدر علی کے بہت سے فوجی افغانوں کے مقابلے میں مارے گئے تھے۔ اس لیے نواب

نے مزید مقابلہ آرائی سے بچتے ہوئے پیغام صلح و آشتی کو قبول کر لیا مگر انہوں نے یہ شرط رکھی کہ نواب حلیم خاں اپنی بہن کو جو نہ صرف
و جمال میں یکتائے روزگار تھی بلکہ بلند کردار و خوش خصال بھی تھی، نواب بہادر کی زوجیت میں دے۔ حلیم خاں نے پہلے تو مال مٹول
ن پھر مصاحبین کے اصرار پر اپنی بہن بخشی بیگم کا نکاح نواب بہادر سے کرا دیا۔ یہ وہی بخشی بیگم تھیں جنھوں نے زوالِ سلطنت خداداد
مد قلعہ ویلور میں دیگر لواحقین کے ساتھ محبوس رہ کر ۱۲۱۹ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا تھا۔ موصوفہ کی تدفین شہر ویلور ہی میں انھیں کی
ہوئی مسجد کے روبرو عمل میں آئی تھی۔ ایک سال ۱۲۲۰ھ میں قبر پر گنبد تعمیر کرنے کے لیے کھدائی کی گئی تو اتفاقاً تربت کھل گئی،
نے دیکھا کہ اس نیک خاتون کا نہ صرف جسم صحیح سالم ہے بلکہ کفن تک مصفیٰ و مجلیٰ حالت میں ہے "بہارِ اعظم جاہی" مولفہ مولوی غلام
در ناظر (المتوفی ۱۲۴۳ھ ۱۹۶۱ء مدراس ص ۱۸۹) گنبد کی پیشانی پر سنگین کتبہ موجود ہے جس پر درج ذیل قطعہ تاریخ کندہ ہے:

"چوں ز دنیا بخشی بیگم جہت جنت شدو داغ　　بہر تاریخین او ہاتف بگفت ازدرد و آہ
سالِ گنبد از غرائب، سالِ رحلت ایں بگو　　زیبِ جنت زوجہ حیدر، ام سلطاں بادشاہ

الغرض حلیم خاں نواب سے رشتہ داری استوار ہونے کے بعد نواب حیدر علی خاں نے حلیم خاں کے تمام اہل خانہ اور خویش و اقارب
ت و احترام سری رنگ پٹن منتقل کر دیا، جہاں اس کی باقی ماندہ زندگی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ گزری (حملات حیدری ص ۳۲۷
تِ خداداد بحوالہ تاریخ نور رنگ ص ۱۳۵ صحیفہ ٹیپو سلطان حصہ دوم ص ۴ - ۲۰۳) انھیں حلیم خاں کے رشتہ داروں میں سے نواب
علی خاں ابن نواب قطب الدین خاں تھے جنہوں نے سلطان ٹیپو کی طرف سے انگریزوں سے مقابلہ کرتے ہوئے قلعے کے جنوب مغرب
تاریخ ۴ / مئی ۱۷۹۹ء شہید ہوگئے۔ (حملاتِ حیدری ص ۶۰۵ میسور میں اردو از مولوی محمد خاں میسوری ص ۴۴) مذکورہ شواہد و واقعات
ئی میں یہ امر بعید از قیاس نہیں ہے کہ میر صادق کا قاتل قادر خاں کڈپوی بھی حلیم خاں نواب کے ساتھ کڈپہ سے سری رنگ پٹن آیا ہو
کو اس نے سلطان شہید کی ملازمت اختیار کر لی ہو، اس طرح اس نے نہ صرف اپنی نمک حلالی اور وفاداری کا ثبوت فراہم کر دیا ہے بلکہ
بھی تاریخ کے روشن صفحات پر نقش کر دیا ہے۔

○ ○ ○

مطالعہ

یوسف ناظم

ندا فاضلی "کھویا ہوا سا کچھ" کے پردے میں

سادگی کی خوبیاں، جنھیں اساتذہ کی زبان میں محاسنِ شعر کہا جاتا ہے۔ ندا فاضلی کے یہاں نیا لباس پہن کر بہ افراط موجود ہیں۔ ان محاسن کی جڑیں تو انھی ۔۔۔ سے جاکر ملتی ہیں جو صنائع بدائع اور لف ونشر وغیرہ کے ادق ناموں سے شاعری میں رائج تھیں لیکن ندا فاضلی کہ جو اپنی شناخت کے بارے میں بہت چوکنا رہتے ہیں۔ انھیں اپنے انداز سے برتا ہے۔ سادگی بجائے خود حسن ہے۔ مرا حسن جس میں دیہات کی سوندھی مٹی کی بو باس ہو، ندا کے اشعار کی سجاوٹ ہے۔ یہی ان چھوٹی بج دہج شاعر کے حسنِ بیان کا نمایاں پہلو ہے۔ یہ بتانے کے لیے کہ وہ اچھے شاعر ہیں ندا کو اپنا چوتھا مجموعہ چھاپنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن ان کے اسلوبی انداز کی داستان ان کے اسی مجموعے "کھویا ہوا سا کچھ میں" ملتا ہے۔ اور دل کو چھو لینے کی بات یہ ہے کہ اس داستان میں "زیبِ داستاں" قسم کی کوئی چیز نہیں ہے اور ندا نے جو کچھ بھی کھویا اسی میں پایا ہے۔ شاعر کی متلاشی آنکھیں جستجو خیز تگ و دو اور بولتی ہوئی فطری چیزیں ڈھونڈتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اگر سب کی سب نہیں تو ۸۰ فی صد اب ان کی دست رس میں ہیں دیکھیے:

کہیں چھت تھی، در و دیوار تھے کہیں، ملا مجھ کو گھر کا پتہ دیر سے
دیا تو بہت زندگی نے مجھے مگر جو دیا وہ دیا دیر سے

یہ نہ تھکاوٹ ہے نہ قناعت لیکن طمانیت کی ایک ایسی پر سکون اور خاموش کیفیت ہے جس کی خواہش ہر آدمی کو اور خاص طور پر ایسے آدمی کو جو فطرتاً اور مزاجاً شاعر ہو، ضرور ہوتی ہے۔ ندا فاضلی صوت و سکوت کو ہم آہنگ کرنا جانتے ہیں۔ وہ حصار میں گھرے ہوئے غیر متحرک اسباب کو پھیلانا اور متحرک بنانے کا گر ہی نہیں، پھیلے ہوئے سامان کو سمیٹنے کا ہنر بھی جانتے ہیں خواہ وہ سامان، آسمان ہی کیوں نہ ہو۔

زمین دی ہے تو تھوڑا سا آسماں بھی دے   مرے خدا! مرے ہونے کا کچھ گماں بھی دے
یہ کائنات کا پھیلاؤ تو بہت کم ہے   جہاں سما سکے تنہائی وہ مکان بھی دے

دوسرا شعر پڑھ کر قاری ایک لمحے کے لیے چونک جائے کہ شاعر نے مانگا کیا ہے اور اسی مکان میں شاعر ایک ایسا گوشہ بھی چاہتا ہے جس میں ایک چھوٹی سی دیوارِ گریہ بھی ہو۔

گھر کی تعمیر چاہے جیسی ہو   اس میں رونے کی بھی جگہ رکھنا

اس دھرتی پر کون ہے جو روتا اور کچھ کھوتا نہیں ہے لیکن ندا جانتے ہیں کہ اچھی غزل کچھ کھونے اور کچھ رونے ہی کی دین ہوتی ہے۔

اس دھرتی پہ آکر سب کا اپنا کچھ کھو جاتا ہے   کچھ روتے ہیں کچھ اس غم سے اپنی غزل سجاتے ہیں

لے کی یہ بات جو ندا کے یہاں چاہت کی صدوں کو چھوتی ہے ہر بار ان سے کچھ نہ کچھ کہلواتی ہے مثلاً

صدیوں صدیوں وہی تماشا • رستہ رستہ لمبی کھوج — لیکن جب ہم مل جاتے ہیں کھو جاتا ہے کون
وہ میری پرچھائیں ہے یا میں اس کا آئینہ ہوں — میرے ہی گھر میں رہتا ہے مجھ جیسا ہی جانے کون

ندا اگر یہ سمجھتے ہیں کہ شعر کو شاعر کی شناخت بننے میں دیر ہوتی ہے تو یہ صرف ان کا شبہ ہے۔ شاعری کے سفر میں تو وڑ آتے ہیں کہیں کچھ دیر اور کچھ دور چل کر لوٹنا یا راستہ بدلنا پڑتا ہے۔ ندا نے صرف خوش رنگ پھلوں اور مہکتے پھولوں سے نہیں رکھا یہ بھی جانا ہے کہ یہ شاداب پھل اور آنکھوں کو تراوت بخشنے والے پھول یوں ہی نہیں پیدا ہوگئے ہیں۔ ان کی تخم کب اور کیسے ہوئی اور ان کی آب یاری کے لئے کتنے جتن کرنے پڑے ہوں گے۔ یہ سب جاننے اور دیکھنے کے لئے ان انی صرف بصری نہیں دل کی دھڑکن بھی بن گئی۔

صرف آنکھوں ہی سے دنیا نہیں دیکھی جاتی — دل کی دھڑکن کو بھی بینائی بنا کر دیکھو

ابوں کی بے حرمتی تو نہیں کرتے لیکن کہتے ہیں ؛

زندگی کیا ہے کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

ابی علم کے بوجھ تلے کتنے لوگ ملبہ بن جاتے ہیں)

ندا نے شاعری کو بھی اسی طرح دیکھا اور برتا۔ روایت سے رشتہ جوڑے رکھا۔ اقدار کی بدلتی رتوں میں نہاتے دھوتے۔ ، اور بغاوت کے درمیان لفظوں کا پل تیار کیا۔ طاؤسی رنگوں میں لپٹے ہوئے لفظ چنے • (اسے شاید لفظیات کہتے ہیں)۔ جاگتی ، سے خواب دیکھے۔ کچھ کھویا لیکن اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ کبھی کوفت کا بھی ذائقہ چکھا اور کہا • جو بیت گیا ہے وہ گزر میں جاتا۔ اونچی اڑان بھی اڑے لیکن زمین کی مضبوط ڈور ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی ورنہ وہ یہ نہیں کہتے کہ

چمکتے چاند ستاروں کا کیا بھروسا ہے — زمیں کی دھول بھی اپنی اڑان میں رکھنا

حساس کے باوجود کہ

آنکھوں دیکھی کہنے والے بھی کم کم ہی تھے — اب تو سب ہی لکھی لکھائی باتوں کو دہراتے ہیں

بالکل نیا کہنے کی مستقل اور مسلسل روش بھی ان کے یہاں کلاسکی رچاؤ لیے ہوئے ہے۔ ترقی پسندی سے الگ اور ہٹ کر بھی وہ اس اندازِ شاعری کے قریب سے ہو کر گزرے ہیں جس سے فیض پہچانے جاتے ہیں۔ اس انداز شاعری کے رنگ تو ان کے یہاں نہیں ہیں لیکن اس کی چھوٹ تو کہیں کہیں پڑتی ہی ہے۔ فیض نے بالراست کہا تھا۔

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیٔ گلفام — وہ عکسِ رخِ یار سے مہکے ہوئے ایام

، ندا ہٹ کے کہا ہے ؛

اب بھی یوں ملتے ہیں ہم سے پھول چنبیلی کے — جیسے ان سے اپنا کوئی رشتہ لگتا ہے

ندا کسی بھی تجربے سے گھبراتے نہیں ہیں۔ انھیں چوں کہ شعری زبان کا بڑا سہارا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دیہی البیلے پن کا بھا سلیقہ ہے اسی لیے وہ گاؤں کا کچا راستہ ہو یا شہر کی شاہ راہ ہر رہ گزر سے کسی اجنبی کی طرح ٹھٹک ٹھٹک کر نہیں بلکہ یوں

بے تکلف اور بلا تامل گزر جاتے ہیں جیسے یہ سارے رستے ان کے آزمائے ہوئے ہیں ۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ندا نے اپنے دوہوں میں بھی اس نہج اور سج دھج کو برقرار رکھا ہے جو ان کی غزلوں اور نظموں میں رچ بس گئی ہے ۔ ندا اصل میں اپنے سامع یا قاری کو للکارتے یا جھنجھوڑتے نہیں پچکارتے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دوبدو بات کر رہے ہوں ۔ ان کی یہی اپنائیت شاعرانہ ملن ساری اور ذہنی قربت ان کی کامیابی بھی ہے اور وجہ مسرت بھی ۔ چند دوہے دیکھیے ۔

سودا لینے ہاٹ میں کیسے جائے نار چاقو لے کے ہاتھ میں بیٹھا ہے بازار

اور اب تو یہ گھر گرہستی والی لڑکی اپنے گھر میکے والوں کو خیریت کی چٹھی بھی نہیں بھیج سکتی ۔ ڈاک کے خرچ میں شاعرانہ اضافہ کے بعد تو اس کا شوہر، خط لکھنے کی شاید ہی اجازت دے ۔ (شاعرانہ اس لیے کہ اس اضافے میں مبالغہ، غلو کی حد تک ہے ۔)

سنا ہے اپنے گاؤں میں رہا نہ اب وہ نیم جس کے آگے ماند تھے سارے وید حکیم

ہم سمجھتے تھے ندا فاضلی صرف چنبیلی کے پھولوں کو یاد کرتے ہیں ایسا نہیں ہے نیم کے درخت کی پتیاں اور نمولیاں ان کے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ ہیں ۔ فلورائڈ میں بسے ٹوتھ پیسٹ کی عادت تو شہروں کی بدعت ہے ورنہ مسواک کے کہاں خوش بودار عرق کے غرارے کرتے ہیں ۔ ایک اور دوہا دیکھیے ۔

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار دکھ نے دکھ سے بات کی بن چٹھی بن تار

یہاں فیض کا ایک شعر یاد آگیا ۔

ہم اہل قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیم صبح وطن یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

ندا کے دوہے اور فیض کے شعر میں کیفیت ایک ہی ہے ماحول الگ ہے ۔ ایک یاد میں گاؤں بول رہا ہے اور ایک یا صحبتِ یاراں ۔ اور انجمنِ گل ۔ ندا نے گاؤں کو استعارہ بنا لیا ہے ۔ وہ شہر ممبئی کے باشندے نہ بنتے تو یہ دوہا کیسے کہہ سکتے تھے

گھر کو کھوجیں رات دن گھر سے نکلے پاؤں وہ رستہ ہی کھو گیا جس رستے تھا گاؤں

اور ندا کو گاؤں کا بوڑھا پیپل بھی یاد آتا ہے تو اس کی چھاؤں سمیٹ لیتے ہیں ۔

بوڑھا پیپل گھاٹ کا بتیائے دن رات جو بھی گزرے پاس سے سر پر رکھ دے ہاتھ

یہی نہیں پھر ندا کو گاؤں کی الھڑ لڑکی کی موتیا اور بیلے کے پھولوں سے مہکی یاد، یہ کہنے پر اکساتی ہے کہ

چڑیوں کو چہکار دے، گیتوں کو دے بول سورج بن آکاش ہے، گوری گھونگھٹ کھول

گھونگھٹ کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی چمکیلی غزلیں، کچھ لچکیلے گیت، سوچ میں ڈوبی ہوئی نظمیں اور کانوں میں رس گھولنے والے دوہے اگر یہ سب کچھ اس مجموعے میں موجود ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعر نے کھویا ہوا سا کچھ، کیسے کہا ہے ۔ اس سوال کا جواب ندا شاید اپنے پانچویں مجموعے میں دیں گے ۔ ان کے پاس کہنے کے لیے اب بھی بہت کچھ ہے ۔

کتاب بہت خوب صورت چھپی ہے ۔ سرورق پر رنگ بکھرے نہیں، برسے ہیں ۔ معیار پبلی کیشنز دلی نے یہ مجموعہ دل لگا کر چھاپا ہے ۔ قیمت ۱۰۰ روپے ہے اور میں تو سمجھتا ہوں، صرف سرورق کی قیمت ہوئی ۔ شعر کی قدر و قیمت سے اس کا تعلق نہیں ۔ ندا تو نقصان ہی میں رہے ۔

OO OOO OO

مطالعہ

مغنی تبسم

حیدرآباد کی سیر

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا مرحوم اپنی بیگماتی زبان اور دل کش اسلوب کے لیے ساری ادبی دنیا میں شہرت رکھتے تھے اور آج بھی ان کی تحریریں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں ۔ آغا صاحب نے بہت سے مضامین لکھے جن میں سے چند ریڈیو سے نشر کیے بعض مضامین رسائل میں شائع ہوے ۔ ۱۹۲۶ء میں ان کے مضامین کا ایک مختصر سا مجموعہ "پسِ پردہ" کے نام سے شائع ہوا تھا ۔ اس کے بعد کبھی انھوں نے اپنے مضامین کو یک جا کر کے کتاب کی صورت میں شائع کرنے کی طرف توجہ نہیں کی ۔ آغا صاحب کی صاحب زادی محترمہ مہرالنسا صاحبہ معظم حسین نے اپنے والد کی تمام تحریروں کو یک جا کر کے مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا اور مضامین کے دو ضخیم مجموعے "ندرتِ زبان" اور "حیدرآباد کی سیر" شائع کیے ۔ "حیدرآباد کی سیر" کے پیش لفظ میں انھوں نے اطلاع دی ہے کہ ابھی بہت سے مضامین ہیں جنھیں یک جا کر کے آئندہ شائع کیا جائے گا ۔ یہ نہایت مسرت کی بات ہے کہ میر معظم حسین صاحب اور مہرالنسا صاحبہ نے آغا حیدر حسن ریسرچ سنٹر قائم کیا جس میں آغا صاحب کے بیش قیمت کتب خانے اور نوادر کو محفوظ کر دیا گیا ہے جن سے ریسرچ اسکالر استفادہ کرسکتے ہیں ۔ اسی ریسرچ سنٹر کی طرف سے ان کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی ہے ۔ یہ کتابیں اگر شائع نہ ہوتیں تو اردو زبان ایک ان مول خزانے سے محروم رہ جاتی ۔

"ندرتِ زبان" پر ہم اظہارِ خیال آئندہ کسی اشاعت میں کریں گے ۔ اس وقت آغا صاحب کے مضامین کا مجموعہ "حیدرآباد کی سیر" ہمارے پیشِ نظر ہے ۔ کتاب کا ایک تہائی حصہ شہر حیدرآباد اور ریاستِ حیدرآباد سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے ۔ اسی اعتبار سے کتاب کا نام حیدرآباد کی سیر رکھا گیا ہے ۔ کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں شامل زیادہ تر مضامین وہ ہیں جو ریڈیو سے نشر کیے گئے ۔ حیدرآباد شہر کے بارے میں جو مضامین ہیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور دل چسپ پیرائے میں حیدرآباد شہر کی سیر کرائی گئی ہے اور یہاں کی تہذیب کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں ۔ سیر کی ابتدا نام پلی اسٹیشن سے ہوتی ہے ۔ شمالی ہند سے ایک مسافر پہلی بار حیدرآباد آتا ہے ۔ ٹرین سے نام پلی اسٹیشن پر اترتا ہے ۔ اس کے ورود کی تفصیل آغا صاحب کی زبانی سنیے :

"حمال ! حمال ! بھئی یہ حمال کیا ہے ؟ قلی کو یہاں حمال کہتے ہیں ۔ ۔ حمال نے سارا سامان ہوشیاری سے اتارا ۔ ٹھیلے پر احتیاط سے لاد نے چلا ۔ جملہ عدد آٹھ تھے ۔ ۔ ۔ اکنّی قلی کو دی ۔ اس نے جھک کر اور شگفتہ رو ہوکر تمیز سے آداب عرض کی اور کہا کہ خاوند سامان دیکھ لیجیے ۔ ہوا گاڑی میں بیٹھے تو چلانے والے نے عرض کیا سرکار کہاں لے چلوں ۔"

کروڑگیری پر سامان کی تنقیح ہوجانے کے بعد مسافر ضلع سرائے کا رخ کرتا ہے ۔ وہاں سے شہر کی سیر کو نکل کھڑا ہوتا ہے ۔ ایک ایک محلے سے گزرتا ہے ۔ آنکھوں دیکھا حال اس طرح بیان کرتا ہے کہ حیدرآباد کی تہذیب کا جیتا جاگتا مرقع نظروں کے سامنے آجاتا ہے ۔ ادھر

ادھر سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

" اسے میاں یہ ہراج خانہ کیا ہے ۔ اسے کا لفظ یہاں نہیں بولتے ۔ یہ کلمہ ، تخاطب اس شہر میں تحقیری ہے ۔ اور کسی ادنیٰ سے آدمی کو بھی تم نے " اسے " کہا اور وہ چڑ جائے گا ۔ " صاحب یہ اسے ترے کیا بات " یہاں مخاطبت کے لیے بجائے " اسے " کی " اجی " بولا جاتا ہے ۔ اجی ہاں استاد سکھا چکے ۔ اب بتاؤ تو سہی کہ یہ ہراج خانہ کیا ہے ۔ کیا سوراج کا ردِ عمل ہے ۔ نہیں بھئی یہ نیلام گھر ہے ۔ "

" یہ شان دار عمارت جس کے چاروں کونوں پر چار عظیم مینار ہیں حیدرآباد کی مشہور چار مینار ہے ۔ اس کی وضع تعزیے کی سی ہے ۔ محمد قلی قطب شاہ نے جب یہ شہر آباد کیا تو یہ عمارت بنوائی ۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ موضع چچلم میں وبا پھیلی اور ایک شخص نے تعزیہ بنایا اور اس جگہ رکھا ۔ تعزیے کی برکت سے وبا دور ہوئی ۔ اس لیے اعتقاداً اس جگہ پر بادشاہ نے سنگِ خارا اور چونے کی بندش سے ایک شان دار عمارت اسی تعزیے کے مثل بنوا دی ۔ "

" ذرا یہاں بھانت بھانت کے آدمیوں کو چلتے پھرتے دیکھو ۔ حبشی بھی ہیں ، ایرانی بھی ہیں ، عرب بھی ہیں اور فرنگی بھی ادھر ضرور آتے ہیں کیوں کہ چار مینار کے پاس اور محبوب چوک میں قدیم نوادرات کی چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں ۔ پرانے لوگ چوبغلہ پہنے دھوتی باندھے یا پاجامہ پہنے سر پر پگڑی بندھی چلے جاتے ہیں ۔ کسی کے سر پر چیرا ہے ۔ کسی کے ٹھیٹ دکنی بانکوں کی کل دار رنگین پگڑی ہے ۔ یہاں کا پاجامہ دوہرا ہوتا ہے ۔ شیروانی پہنے ، ثقہ ہوے تو بٹن لگے ۔ ۔ ۔ ہاتھ میں چوب دستی لیے بڑے وقار سے چلے جا رہے ہیں ۔ یہاں کے لوگوں کی رفتار میں قدرتی وقار ہوتا ہے ۔ "

وہ جس بازار سے گزرتے ہیں سامانِ فروخت کی ایک ایک تفصیل بیان کرتے ہیں ۔ ترکاری کے بازار سے گزرے تو بیسیوں ترکاریوں کے نام اور خواص گنا دیے :

" چلو منڈی میں چلیں ۔ او ہو ہو کیسی بھری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ابوتھے کی بھاجی ہے ۔ یہ چکے کی بھاجی ہے ۔ بھاجی یہاں ساگ کو کہتے ہیں ۔ یہ چگر ہے ۔ خوب رہی آغا صاحب ۔ اچھا بنایا ۔ ایسے بھی ہم کیا اندھے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تو املی کی کونپلیں ہیں ۔ ۔ ۔ چگر ایک لفظ اچھا ہے ۔ یا املی کی کونپلیں ۔ ۔ ۔ یہ امباڑے کی بھاجی ہے ۔ سن کے پتے ہیں ۔ وہاں کوئی ان کو نہیں کھاتا ، یہاں پکائے جاتے ہیں ۔ چنے کی دال میں خوب پکتے ہیں اس کی بھجیا کھاؤ تو انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ ۔ ۔ ۔ "

حیدرآباد کے بازاروں کے علاوہ قدیم و جدید عمارتوں ، محلات اور ساتھ ہی ساتھ یہاں کے امرا اور شرفا کے بارے میں بھی تفصیلات دی ہیں ۔

حیدرآباد شہر کے علاوہ آغا صاحب نے ریاست کے بعض اور علاقوں کی بھی سیر کرائی ہے ۔ جیسے نرمل ، ماہور ، کیسلا پور ۔ پھر ریاست سے باہر نکل کر کشمیر لے چلے اور غالب کی دلی بھی دکھائی ۔ سیر و سیاحت کے علاوہ اس کتاب میں دیگر موضوعات پر بھی مضامین شامل ہیں ۔ ایک خاکہ ہے ۔ خاکہ نگاری میں آغا صاحب کو کمال حاصل تھا ۔ افسوس ہے نقادوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی ۔ توجہ کیسے دیتے جب کہ ان کے سامنے خاکہ نگاری کے وہ بلند پایہ نمونے موجود ہی نہ تھے جو ان کے قلم سے نکلے ۔ " بی بی صاحبہ " (لیڈی حیدری) ایک معرکتہ الآرا شخصی خاکہ ہے ۔ سراپا سے لے کر سیرت نگاری تک خاکے کے سارے لوازم اس میں موجود ہیں ۔ آغا صاحب نے ایک جیتی جاگتی ہستی سے ہمیں ملایا ہے جو ایک منفرد اور مثالی شخصیت تھی ۔

" ۱۹ ء میں پہلی دفعہ نواب سر راس مسعود جنگ مرحوم کی معرفت ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ لڑکپن کا زمانہ تھا ۔ ئی کے تمدن کا دل دادہ اور مغلیہ شان دیکھے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ان کو دیکھ کر حیران رہ گیا ۔ وہ مصر یا یمن کی شہ زادی معلوم ہوتی تھیں ۔ گورا نگ ، سیاہ بال ، آنکھیں منور اور رسیلی پتلیاں جیسے کالی ناگ یا سیاہ ہینے کے گرد ہیرے کا حلقہ ۔ آنکھوں کی مناسبت سے ناک ، لب غنچے ور بستہ متناسب اعضا ، ہاتھ بڑے پیارے اور نرم نرم انگلیاں پتلی پتلی لمبوتری ، بڑی خوب صورت کہ دست بوس ہونے میں روح کیف وجاتی اور ایک خاص قسم کا روحانی سرور ہوتا جو کسی پیر کی دست بوسی میں شاذ میسر ہوتا ہو ۔

ہلکا ہلکا مختصر سا زیور ، اطلس ، دریائی یا دھوپ چھاؤں کا رنگین سنگا ۔ کاج پٹی کے گریباں اور ناخونی گلے کا سفید مہین کرتا ۔ میلی استین اور استینوں پر بمبئی کی بانکڑی لگی ۔ کرتے پر صدری اور تین گز کا دوپٹہ ململ ، تن زیب یا آبِ رواں کا کرتے کی جوڑ کا ، گلا رکر اوڑھتیں اور اس کے آنچل کے کونے کو بھل سوئی سے اٹکاتیں جو بڑا بانکا معلوم ہوتا ۔ کف پائی زیبِ پا ہوتی ۔ "

میں نے بہت سے گھر ایسے دیکھے ہیں جنھوں نے بی بی صاحبہ کے گھر کی سجاوٹ دیکھ کر اپنا گھر سجایا ۔ وہ کسی چیز کو ایک جگہ ہیشہ نہ رہنے دیتیں ۔ اپنے ہاں کا سامان ۔ ۔ ۔ ادھر کا اٹھا کر ادھر سجا دیتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ سارے گھر کی صورت بدل گئی ۔ "

" کھانا وہ بڑی نزاکت اور نفاست سے کھاتیں ۔ ان کو مصروفِ طعام دیکھ کر کھانے کا سلیقہ آتا ۔ "

" وہ ہر ایک کے ساتھ سلوک ہوا کرتی تھیں ۔ کوئی ان کے دروازے سے ان سے ملے بغیر نہ جاتا اور جو ان سے ملتا اپنی مراد پالیتا ۔ "

" وہ معاشرتی تعلیم ، اصلاحی ، سیاسی کاموں میں بڑی دل چسپی لیتیں اور حیدرآباد کی خواتین کی روحِ رواں تھیں ۔ اکثر ادارے ان کے قائم کردہ یا ان کے مجوزہ ہیں ۔ اکثر کتابیں ان کے کہنے سے لکھی گئیں ۔ اقبال مرحوم نے گولکنڈہ پر بی بی صاحبہ ہی کے کہنے سے نظم ہی تھی ۔ وہ خصم کی دکھیاؤں کی بڑی طرف دار تھیں اور مردوں کی ستائی ہوئی بیویاں ان سے تسکین پاتی تھیں ۔ مشورہ اور رائے وہ بہت وچ کر دیتیں اور جو ان پر عمل کرتا اس کو کبھی پشیمانی نہ ہوتی ۔ "

اس کتاب میں چند مضامین شخصیات پر ہیں ۔ اقبال پر ایک تقریر ہے جو ریڈیو سے نشر کی گئی ۔ جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا پر یک عمدہ مضمون ہے جس میں ملکی صنعتوں کو فروغ دینے میں ان کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ چند مضامین ہیں جو ادبی تنقید اور تحقیق کے دائرے میں آتے ہیں ۔ حیدرآباد کے دکنی زبان کے شاعر دہقانی پر مضمون میں دہقانی کی شاعری کا شمالی ہند کے عوامی زبان کے شاعر لیر کی شاعری سے تقابل کیا ہے ۔ دکنی مرثیہ گو نیم تحقیقی تعارفی مضمون ہے ۔ " اپنی باتیں جنگ کے بعد " ایک ریڈیو تقریر ہے جس میں نگِ عظیم کے بعد ریاست کے معاشی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے آئندہ ترقی کے سلسلے میں بڑے پتے کی باتیں بتائی ہیں خاص طور پر تلنگانہ لانگ اور ماحولیات سے اپنے گہرے تعلقِ خاطر کا اظہار کیا ہے تقریر کا یہ حصہ ملاحظہ ہو :

" آپ کے پاس دس ہزار گز زمین ہے ۔ آپ نے ایک مکان اپنے لیے بنایا باقی زمین چو طرف کھلی پڑی ہے ۔ ایک صاحب آئے ۔ نھوں نے آپ کا گھر بنا دیکھا ۔ ہر طرح آپ کو ترغیب دی ، تحریص دی ۔ کچھ دام زیادہ دیے اور ایک ٹکڑا لے لیا ۔ اس پر اپنی پسند کا مکان نایا ۔ دو مکان بن گئے کہ تیسرے صاحب اور آدھمکے ۔ دس ہزار گز زمین پر دس مکان بنے ۔ اب تو گھر کاوس گھرو ہو گیا اور قیمت پر قیمت اور ولی پر بولی بڑھنے لگی یہاں تک کہ لوگ اشرفیاں بچھانے کو تیار ہوگئے اور گنج بیچ کا چھوٹا سا محلہ ہوگیا ۔ گندگی الگ ، صفائی مفقود ، ہوا الگ غلیظ وی ۔ چھوٹی جگہ میں جتنے آدمی زیادہ ہوں گے انتہائی صحت پر خراب اثر ہوگا ۔ جن صاحب کی زمین تھی انھوں نے نفع پر بیچ کر پیسہ تو کمایا لیکن

اپنے شہر والوں کی صحت کا خیال نہ کیا۔ ادھر من مانے مکان بنانے سے اس قلعے کی خوب صورتی خاک میں مل گئی۔ مختصر پڑ گئے۔ "

چند مضامین یا تقریریں بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ ان کا اسلوب اور ان کی زبان دوسرے مضامین سے الگ ہے۔ بچوں نفسیات اور ان کی دل چسپی کا خاص خیال رکھا ہے۔

" بچوں سے باتیں " ریڈیو تقریر کا اقتباس دیکھیے :

" میری آنکھوں کے نور، دل کے سرور چھوٹے بڑے بچو، بچیو! تمھاری فرمائش پر تمھارے ماموں جانی تمھاری اس ہوائی میں مجھے پکڑ لائے ہیں۔۔۔ تم اپنے ماموں جان کو تو چاہتے ہی ہو کہ ان کی ایک دن کی جھٹی کے بھی روا دار نہیں۔ سچ ہے " نا ما سے کانا ماموں بھلا " مگر تمھارے ماموں جان اللہ نہ کرے کانڑے نہیں۔ ان کے دیدے تو کنول کے سے ہیں۔ رشتہ بھی تم نے ان اچھا جوڑا ہے۔ ماموں سے زیادہ کونسا رشتہ محبت کا اور پیارا ہے۔ اللہ بخشے میری ددا جو کہانیاں مجھے بچپن میں سناتی تھیں اس میں اکثر زادے شکار کرتے ہوے جنگل میں رستہ بھٹک جاتے۔ جنگل میں دیو کو انسان کی بو آتی اور وہ چلاتا مانس گند، مانس گند اور جب شہ زاد پر نظر پڑتی تو کہتا کہ بارہ بارہ چوبیس برس میں لگا نظر آیا اور دہانہ پھاڑے شہ زادے کو نگلنے دوڑتا۔ جب قریب پہنچتا کہ بس اب نگل جب نگل تو شہ زادہ ادب سے سلام کرتا کہ ماموں جان آداب عرض۔ دیو جوں ہی ماموں جان کا لفظ سنتا تو کہتا خاک کھاؤں، دھول کھاؤ بھانجے ہی کو کھاؤں۔ تو میری جانو! بھانجے کہنے کی ایسی لاج ہوتی کہ دیو بھی آدمی کو کھانا چھوڑ دیتے تھے۔ "

اپنی ددا سے بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی اپنے خاص انداز میں ریڈیو پر بچوں کو سنائی۔ " کتے کی کہانی "۔ یہ بھی اس کہ میں شامل ہے۔ کہانی جتنی دل چسپ اور حیران کن ہے اس سے بڑھ کر کہانی کی زبان اور اس کا طرز بیان ہے۔ بچے تو بچے بڑے ایک بار شروع کریں تو ختم کر کے ہی رہیں۔ کہانی تو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ کہانی میں محل کے اجڑنے کا ایک منظر ہے۔ اس ایک جھلک دیکھ لیجیے :

"۔۔۔۔ ہونی شدنی شمع کا پھول شہزادے کے چہرے پر گرا اور وہ چیخیں مارتا " ہائے جلا " " ہائے مرا " چلاتا آسمان پر اڑ اس کا اڑنا تھا کہ جھاڑ، فانوس، ہانڈیاں، کنول، دیوار گیریاں چھنا چھن گرنے لگے اور ہر رنگ، قمقمے، حباب چٹخنے لگے۔ دیواروں میں لگ گئی۔ حوض پھٹ گئے۔ نہریں اٹ گئیں۔ باغ جل گیا۔ محل اجڑ گیا۔ جہاں بلبلِ ہزار داستاں بولتے تھے وہاں الو بولنے لگے۔ جہاں گوں میوؤں کے درخت لدے پڑے جھومتے تھے وہاں تھوہڑ، جھاڑ جھنکار، ببول، ناگ پھنی، بھٹ کٹیاں، سانبر، ستیاناسی کی جھاڑ پیدا ہو گئیں۔ بچھو، کن کھجورے، بڑا گوہی، چھپکلیاں اس میں رینگنے لگیں۔ چھتوں سے جالے لٹکتے۔ بگولے اور جھکڑ چلتے۔ آندھیاں آتیں سارا محل گرداباد۔ چو طرف ریت کے تودے کے تودے۔ ڈراؤنی آوازیں سنائی دیتیں۔ ایک وحشت کا عالم۔ شہ زادی اور ددا بھی ح پریشان کہ تھا کیا اور کیا ہو گیا۔ "

ایک ڈراما بھی اس مجموعے کی زینت ہے۔ " حضرت بہادر شاہ غازی، جس میں بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی سے لے کر دلی اجڑنے تک کی جھلکیاں موثر طریقے سے پیش کی ہیں۔

اردو والے یہ تو جانتے تھے کہ آغا حیدر حسن مرزا ایک صاحبِ طرز ادیب ہیں، جو زبان وہ لکھتے ہیں ویسی کوئی نہیں لکھ سکتا اردو ادب میں ان کا کیا مرتبہ و مقام ہے اس کا تعین ہنوز نہیں ہوا ہے۔ آغا صاحب کے مضامین اب جو مجموعوں کی صورت میں

کیے جارہے ہیں اور آئندہ شائع ہوں گے ان کے مطالعے کے بعد ہی ان کی صحیح قدر شناسی ہو سکے گی ۔

آغا صاحب نے اپنے مضامین میں گذشتہ عہد کی تہذیب و معاشرت کو حیاتِ دوام بخش دیا ہے ۔ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں پر تنقیدی نگاہ ، ڈالی ۔ صرف ان کی خامیوں پر انگشت نمائی نہیں کی ، خوبیوں کو بھی سراہا ہے ۔ ان مضامین کی ادبی خوبیاں اس سے الگ نہیں ، ان کی زبان خاص تہذیب میں رچی بسی ہے ۔ ان کا ذخیرہ ، الفاظ ہیرے جواہرات سے بھرا خزانہ ہے کہ دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہوجائیں ۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہماری زبان لفظوں ، محاوروں ، کہاوتوں ، ضرب الامثال سے کس قدر مالا مال ہے پھر اس میں اظہار کے کیسے کیسے پیرایے ہیں ۔ اور اس بات پر افسوس ہوتا ہے کہ آج ہم جو زبان بولتے لکھتے ہیں وہ کتنی نادار ہوگئی ہے ۔ آج کے پڑھے لکھے لوگ آغا صاحب کے مضامین کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں پائیں گے ۔ بہت سے الفاظ اور محاورے لغات میں بھی نہیں ملیں گے ۔ ضرورت ہے کہ ایک " فرہنگِ آغا حیدر حسن مرزا " مدون کی جائے ۔ لیکن اس کام کو سرانجام دینے والے خال خال ہی ملیں گے ۔ آغا حیدر حسن ریسرچ سنٹر کو ان کا بیڑہ اٹھانا چاہیے ۔ آغا صاحب نے بہت سے نئے لفظ اور اصطلاحیں بھی وضع کی ہیں ۔ زبان سازی کا انھیں خاص ملکہ تھا ۔ وہ انگریزی لفظوں کے استعمال سے گریز کرتے ۔ کسی لفظ یا اصطلاح کا متبادل اردو میں نہیں ملتا تو وہ خود لفظ گھڑ دیتے ۔ اصطلاح بنالیتے ۔ ان کے وضع کردہ چند لفظ اور اصطلاحیں دیکھیے :

نمونہ نگر	ماڈل ٹاؤن	(MODEL TOWN)
کنوار گھر	بیچلرز کوارٹر	(BACHELORS QUARTER)
ہوا گاڑی	موٹر کار	(MOTOR CAR)
زانو پوش	نیپکن	(NAPKIN)
پرسش خانہ	انکوائری آفس	(INQUIRY OFFICE)
لب قلم	لپ اسٹک	(LIP STICK)
نیبو بوندیاں	لیمن ڈراپ	(LEMON DROP)
خطہ	اسٹیشن	(STATION)
کھڑا کھانا	بفے	(BUFFET)
محکمہ ، سیاحاں	ٹورسٹ ڈپارٹمنٹ	(TOURIST DEPARTMENT)
مبارک نامے	گریٹنگ کارڈ	(GREETING CARD)
کوہستان جوبلی	جوبلی ہلز	(JUBILEE HILLS)

ان ترجموں کو دیکھ کر میں سوچتا ہوں کہ اگر آغا صاحب دارالترجمہ جامعہ ، عثمانیہ میں ہوتے تو ان کی وضع کردہ اصطلاحیں کیسی ہوتیں ۔ شاید ان سے بہتر ، آسان اور زیادہ قابلِ قبول ہوتیں جو مترجمین نے وضع کیں ۔

OO OOO OO

فہمیدہ ریاض

خزانہ

اچانک راہ چلتے اک خزانہ ہاتھ آتا ہے
بہت حیران ہوجاتے ہیں ہم اور بے قرار . . .
زمیں ششدر
سمیٹیں گے اسے کیوں کر
اسے سب سے چھپاکر گھر ہی لانا ہے
کسی تاریک تہہ خانے میں اس کو دفن کردیں گے
ہمیشہ نصف شب کے بعد تہہ خانے میں جانا ہے
ہم اپنا آنسوؤں سے تر بہ تر چہرہ چھپاتے ہیں
اسے چھوتے ہیں اپنی انگلیوں سے بار بار
مگر آتا نہیں ہے اعتبار
خزانے پاس جب جائیں
خزانے کے نہ ہونے کا زمانہ ساتھ جاتا ہے
یوں ہی آنکھوں میں رہ رہ کر چمک اٹھتے نہیں آنسو
بہت افسردہ ہوجاتے ہیں وہ اور اشکبار
وہ جن کو خوش نصیبی سے
کسی ویران گھاٹی میں
اچانک راہ چلتے اک خزانہ ہاتھ آتا ہے

OOO

ضیا جالندھری

زوال

غازہ ، حرف و بیاں ، روشنیِ حیلہ گری
روغن و رنگ کی ج دھج میں چھپائے ہوئے داغ
دیدہ و دل کا عذاب آئینہ خانوں کے چراغ
عز و ناموس یہاں صورت سائل گریاں
سر بہ زانو ہیں کہ ان کا کوئی پرساں نہ رہا
وحشتیں نعرہ زناں شہر میں انساں نہ رہا
کیسے خوابوں کی ہے تعبیر یہ ویرانیِ شہر
آگ رہ رہ کے لپکتی ہے خیالوں کی طرح
آنکھیں ہر سمت اب اٹھتی ہیں سوالوں کی طرح

OOO

نثار احمد نثار

روز و شب کی ارزانی

میری ذات کے اندر
چل رہا ہے مدت سے
ایک سلسلہ یوں ہی
بے حصول
بے معنی
بس جنوں کی فراوانی
ہر حسین لمحے کی
ہو رہی ہے ارزانی

صبح جب نکلتی ہے
منظروں کی آرائش
اک عجیب سا رشتہ
مجھ سے جوڑ لیتی ہے
جیسے جیسے لمحوں کے
پاؤں تیز ہوتے ہیں
اک اٹوٹ سا ناتا
ٹوٹتا ہے پل بھر میں

دل پناہ کی خاطر
بے امان عالم کی
سمت جا نکلتا ہے
جیسے جیسے لمحوں کے
پاؤں جھکنے لگتے ہیں
دل خلا سے آتا ہے
کلا و فن کی دنیا میں

آسماں کے باشندے
فرش پر اترتے ہیں
شوق سیر کرے !
اور بھی نکھرتا ہے
خوب لطف آتا ہے
ساتھ سیر کرنے میں
آسماں کے باشندے
خوب کھیل کرتے ہیں
اپنے شوق پہ نادم
مجھ کو چھوڑ جاتے ہیں

اپنی عام راتوں سی
روز رات کٹتی ہے
نیند ٹوٹ جاتی ہے
شب طویل لگتی ہے
خواب دور آنکھوں سے
در بہ در بھٹکتے ہیں
اس طرح سے ہوتی ہے
روز و شب کی ارزانی

(XXX)

قاسم ندیم

بے قراری

جب تمہاری شخصیت کی
ایک ایک پرت کھلنے لگی
مری آنکھوں میں بھی
نمی تیرنے لگی
شاید تم نے نہیں دیکھا
یا تمہارے دیکھنے سے قبل ہی
مسکراہٹ اپنے چہرے پر
میں نے سجائی
اتنا پہلو دار
اتنا گہرا وجود
مرے روبرو ہوگا
مجھ سے محوِ گفتگو ہوگا
یہ میں نے کبھی سوچا نہ تھا
آنسوؤں کے سوتے
میری آنکھوں کے
کب کے خشک ہو چکے تھے
آج نہ جانے ان میں نمی کیسے آگئی ؟
روح میں بے چینی کیسے سما گئی ! !

○○○

بت

وہ شاید پتھر تھا
درد و الم کے سارے خزینے
پنہاں رکھ کر ، اپنے اندر
آہ و فغاں سے عاری
نباہتا رہا ساری دنیا داری
کبھی زمانے سے
نہ کوئی شکوہ
نہ اظہارِ لاچاری
لب یوں ہی ساکت و جامد
جیسے پتھرا گئے ہوں
زمانے کا زہر
اپنے لبوں سے
کشید کرتا رہا وہ
زندہ رہتے ہوئے بھی
ہر پل ، ہر گھڑی مرتا رہا وہ ! !

○○○

حامدی کاشمیری

☆

دل کہ خو کردہ ، غم ہے کب سے
تیری یادوں کا کرم ہے کب سے

سر اٹھانے ۔ کا کسے یارا ہے
سر پہ اک تیغ دو دم ہے کب سے

میری ہمت کہ جیے جلتا ہوں
یورشِ جور و ستم ہے کب سے

تو مرے پاؤں کی زنجیر بنی
منتظر راہِ عدم ہے کب سے

ایک پتی بھی نہیں اگتی ہے
یہ زمیں خون سے نم ہے کب سے

ختم کب ہوگی مسافت، شب کی
دوریِ صبح کا غم ہے کب سے

○○○

احسن عزیز

☆

قیام و رفت کی تمثیل روز و شب مسلسل دیکھتے ہیں
شکست و ریخت کی تشکیل روز و شب مسلسل دیکھتے ہیں

ہوائے مرگ ان روشن دیوں کو کیوں بجھا دیتی ہے آخر
یہ کس کے حکم کی تعمیل روز و شب مسلسل دیکھتے ہیں

ہمیں تسلیم رسی کھینچ ہی لے گا وہ اک دن ، پر ابھی تک
دیے ہی جا رہا ہے ڈھیل روز و شب مسلسل دیکھتے ہیں

امیدوں سے بھرے دل، منتظر آنکھوں کی خوشیوں کے لیے ہی
ہم اپنے خوابوں کی تذلیل روز و شب مسلسل دیکھتے ہیں

جوار و قرب میں بکھرے ہوئے منظر برے لگتے ہیں لیکن
نہیں کر سکتے ہیں تبدیل روز و شب مسلسل دیکھتے ہیں

وجود اور وقت کے تیزاب ایسے مسئلوں میں ہم تو احسن
سکون و صبر کی تحلیل روز و شب مسلسل دیکھتے ہیں

○○○

شاذ تمکنت

☆

جانے والے تجھے کب دیکھ سکوں بارِ دگر
روشنی آنکھوں کی بہہ جائے گی آنسو بن کر

تو حصارِ در و دیوار لیے جائے کدھر
میرا کیا ہے کہ میں ہوں دشت بہ دل خانہ بہ سر

کون جانے مری تنہائی پسندی کیا ہے
بس ترے ذکر کا اندیشہ ۔ ترے نام کا ڈر

یوں بھی اشکوں کا دھندلکا تھا سجھائی نہ دیا
کس نے لوٹا دمِ رخصت سر و سامانِ سفر

کس نے دیکھا ہے مرا شہرِ خموشانِ حیات
دل کی وادی سے گزرنا ہے تو آہستہ گزر

رو رہا ہوں کہ ترے ساتھ ہنسا تھا برسوں
ہنس رہا ہوں کہ کوئی دیکھ نہ لے دیدہ ، تر

یہ مری زخم نصیبی یہ تری
میں نے تیرے ہی اشارہ پہ تو ڈالی تھی

ٹوٹ جائے گا نشہ دیکھ کوئی نام نہ
آنکھ بھر آئے گی اس طرح مرا جام نہ

کوئی گم گشتہ ہر آغازِ سفر ہے
چوم لیتا ہے ۔ تری یاد کا بھاری

میں نے ہر رات یہی سوچ کے آنسو پ
منھ دکھانا بھی ہے دنیا کو بہ ہنگامِ

شاذ کو صبر عطا کر کے بڑا کام
اس نے کیا مانگا تھا ۔ کیا پایا ہے اے ربِ

ooo

کاوشؔ عباسی

☆

آ پہنچا انتظار بھی گھٹ کر دنوں تلک
جاں بھی نکل کے سینے سے آئی لبوں تلک

اے جانِ جاں ! گواہ یہ حالِ تباہ ہے
چاہیں گے یوں ہی ہم تمھیں مرتے دموں تلک

اے دوست ! تمتماہٹیں تیرے یقین کی
اے کاش جھلملائیں مرے وسوسوں تلک

مجھ کو تو جیسے درد کی مشعل بنا دیا
یہ غم کی آنچ یوں تو ہے پہنچی سبھوں تلک

بہروپ یہ بھی تھا کہ مرے حالِ زار پر
حیرانیاں بہت تھیں مرے ہم دموں تلک

کاوشؔ تپاں ہیں میرے ہی سوزِ وجود سے
خوابوں میں رہتی صبحوں سے غم کی شبوں تلک

ooo

☆

رہ میں یہ خفّتِ سخن پوچھے نہ کوئی حال بھی
دل میں وہ حسنِ اعتماد ۔ جھینپے رخِ کمال بھی

آج بھی صحنِ دل سے میں دور سا ہی گزر گیا
جھانک رہا تھا طاق سے مہ سا ترا خیال بھی

لوگ بھی یاں عجیب ہیں دوست مگر عجیب تر
ملیے انھیں تو مل کے ہو خار سا اک ملال بھی

یہ بے دلی، یہ کم تری، آنکھوں میں اڑتی ریت سی
کوئی خیالِ معتبر ۔ معدنِ جاں میں ڈھال بھی

ooo

ڈاکٹر ظفر مرادآبادی

☆

ہر چند جستجو نے ندی تک سفر کیا
پھر بھی مآلِ تشنہ لبی تک سفر کیا

اک کائنات ہم کو نظر آئی جلوہ گر
جب بھی بہ راہِ ذات خودی تک سفر کیا

محرومِ التفات ہے چپنے روز و شب
جب تک دعا نے داد رسی تک سفر کیا

اس پر جمی ہوئی ہے نگاہِ ہوس پسند
جس نخلِ نو نے سرو قدی تک سفر کیا

ہر حادثے نے گرد بنایا ہمیں ظفرؔ
لمحوں میں بٹ کے ہم نے صدی تک سفر کیا!!

ooo

ساحلؔ احمد

☆

گھر میں رہنے کیوں نہیں دیتی
کیا تماشہ پھر دکھائے گی

ہوگئی شاید دعا تیری قبو
ہر طرف چلنے لگی ٹھنڈی

دوستی اس کی خزاں سے کیا ہ
سب کو کیسا کر گئی تنگی

مٹھیوں میں ریت بھر کر لے گ
ہوگئی بدنام جنگل کی

آنکھ ساحلؔ کھولتا میں کس
سنگ ریزے چمن کے لائی تھی

ooo

اوشا بھدوریا

☆

روشنی کے خواب پلکوں پر کھلاتا کون ہے
پاکے تنہائی مجھے مجھ سے چراتا کون ہے
جب تری یادوں کے سائے چھونے لگتے ہیں مجھے
نیند ان ویران راتوں کی اڑاتا کون ہے
لوٹتی ہوں جب کبھی تھک ہار کے گھر کی طرف
پھول میری راہ میں آکر بچھاتا کون ہے
دل شکستہ ہے غزل ۔ الفاظ سب گونگے ہوئے
میری اپنی داستاں مجھ کو سناتا کون ہے
پیار کی سچائیوں سے میں نے آنکھیں پھیر لیں
ہاتھ پھیلا کر مگر مجھ کو بلاتا کون ہے
تو نہیں تیری تمنا تیری چاہت بھی نہیں
مجھ کو ان ویران راتوں میں جگاتا کون ہے
پیار کو اقرار کو اظہار کو اصرار کو
آتے جاتے راستوں میں چھوڑ جاتا کون ہے
صرف کچھ ویران سانسیں اک اپاہج آرزو
روٹھ جاتی ہوں تو پھر مجھ کو مناتا کون ہے

ooo

ڈاکٹر اختر نظمی

☆

تنگ ہر رہ گزر ۔ نہ کر دینا
سخت مجھ پر سفر ۔ نہ کردینا

آج برسوں کے بعد گھر دیکھا
پھر مجھے در بہ در ۔ نہ کر دینا

اتفاقاً خوشی ملی ہے مجھے
دوستوں کو خبر نہ کر دینا

اور بھی زندگی کے مصرف ہیں
راستے میں ۔ بسر نہ کردینا

شعر کو صرف دو زباں نظمی
صرف خونِ جگر ۔ نہ کر دینا

ooo

حسن داد خاں

☆

افشائے راز کس نے کیا ، آئینہ کہ میں
محرمِ جمالِ یار کا آئینہ تھا کہ میں

وہ کون تھا جو درد کی تاریخ لکھ گیا
بے دست و پا سی شکل نے بڑھ کر کہا کہ میں

افسردہ خاطری کا نہ الزام دو مجھے
محفل کا ہر چراغ بجھا سا رہا کہ میں

دشوار و سخت منزلِ غم کیسے طے ہوئی
اب سوچنا پڑا وہ کوئی اور تھا کہ میں

سب مجھ سے پوچھتے ہیں یہ خوش بو کہاں کی ہے
زلفوں کو چھو کے آئی ہے بادِ صبا کہ میں

وہ چھپ کے پوچھتے ہیں ، حسنؔ کون ہے یہاں
اٹھ کر بڑے خلوص سے کہنا پڑا کہ میں

ooo

محسن جلگانوی

☆

یقیں کے ہاتھ عطا کر گمان تھوڑا سا
کہ آسمان سے دے آسمان تھوڑا
مری زمین پہ اس نے محل بنایا تھا
مگر دیا نہ مجھے سائبان تھوڑا سا
وہیں سے اس کی ندامت کے سلسلے نکلے
مرے خلاف تھا اس کا بیان تھوڑا سا
بہت ہیں بارشیں ، دیوار و در کا کیا ہوگا
بچا تھا بجلیے برس ہی مکان تھوڑا سا
بس ایک ضد تھی کہ اٹھے نہ بیچ میں دیوار
کہ میں نے مانگا ہی کب تھا مکان تھوڑا سا
یہ کن حصاروں میں فردِ سزا کو بانٹ دیا
زمین تھوڑی سی پھر آسمان تھوڑا سا
بہا کے لے گئی نیلی ہوا سمندر میں
لگا نہ ہاتھ مرے سائبان تھوڑا سا
مرے پروں کے لیے یہ اڑان - مٹھی بھر ۔ ۔ ۔ "
میں کیا کروں گا ترا آسمان تھوڑا سا
مدارِ ناصر و باقی تو خوب ہے محسنؔ
مگر وہ میرؔ کا طرزِ بیان تھوڑا سا

ooo

محمد علی اثرؔ

☆

جانے کب اک موڑ پہ آئے
ان کی مرضی ، میری رائے

کاش کبھی وہ دن بھی آئے
بن مانگے سب کچھ مل جائے

لوٹ رہے ہیں گھر کو طائر
پھیل رہے ہیں شام کے سائے

تیری یاد کا ساون بھادوں
آنگن آنگن پھول کھلائے

شعر وہی جو دل میں اترے
بات وہی جو سب کو بھائے

آنکھوں کے گلشن میں کوئی
تتلی بن کر اڑتی جائے

بھیگا بھیگا اس کا آنچل
دل میں اثرؔ کے آگ لگائے

ooo

☆

مرا ۔ میں ۔ ہم سفر ہے اور میں ہوں
تمنّا راہ بر ہے اور میں ہوں

مقدر میری راہیں دیکھتا ہے
ستارا اوج پر ہے اور میں ہوں

بہت شاداب نظاروں سے گزرا
ابھی پیاسی نظر ہے اور میں ہوں

نہ جانے جستجو کس کی ہے مجھ کو
سفر اندر سفر ہے اور میں ہوں

اندھیرا ہی اندھیرا چار سو ہے
بڑا لمبا سفر ہے اور میں ہوں

مری تحقیق کے سب معترف ہیں
غزل زیرِ اثرؔ ہے اور میں ہوں

ooo

نعمت انور غوری

۔ شہر آشوب ۔

☆

اک شورِ محشر تھا بپا تم چپ رہے ہم چپ رہے
ہر اک نے پوچھا کیا ہوا تم چپ رہے ہم چپ رہے
سہمے ہوئے دیوار و در سنسان تھی ہر رہ گزر
اک خوف تھا صبح و مسا تم چپ رہے ہم چپ رہے
مذہب کی چادر اوڑھ کر پھر شیطنت برپا ہوئی
انسانیت کا خوں ہوا تم چپ رہے ہم چپ رہے
جو بے خطا پکڑے گئے وہ نذرِ زنداں ہوگئے
مجرم مگر آزاد تھا ، تم چپ رہے ہم چپ رہے
سیندور مانگوں کا اڑا کاٹا گیا دستِ حنا
گودیں ہوئی ہیں بے صدا تم چپ رہے ہم چپ رہے
یہ دور ، دورِ ابتلا ، باقی کہاں صدق و صفا
مسند نشیں لالِ ریا ، تم چپ رہے ہم چپ رہے
پیرِ مغاں کی مصلحت دیکھی ہے لوگوں نے بہت
بگڑا نظامِ مے کدہ تم چپ رہے ہم چپ رہے
جب سامنے اک گھر لٹا کوئی نہ افسردہ ہوا
انور تڑپ کر رہ گیا تم چپ رہے ہم چپ رہے

ooo

نثار احمد نثار

☆

ہوا کے جھونکے غبار اب کے کم اٹھاتے ہیں
کچھ احتیاط سے ہم بھی قدم اٹھاتے ہیں

یوں اپنے آپ پہ بھی مہرباں نہیں اتنے
یہی بہت ہے ترے ناز ہم اٹھاتے ہیں

پلٹ کے آئیں گے آسودگی کے لمحے بھی
ہم اطمینان سے بارِ الم اٹھا تے ہیں

دماغ دل کے اصولوں سے اب گریزاں ہے
فضول آنکھوں کو سمتِ صنم اٹھا تے ہیں

ooo

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

غلام

شیر خاں اور گل پری کی جوڑی دیکھنے میں ان مل بے جوڑ سی لگتی تھی، شیر خاں ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ قد بھی چھوٹا سا، جسم فربہ، گھنی ڈھی نے چیچک کے کچھ داغ چھپا بھی رکھے ہوں گے، کچھ کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کیوں کہ بے ڈھنگی تھی، خود رو جھاڑیوں کی یلی ہوئی۔

اور گل پری اپنے نام کی طرح خوب صورت تھی اس میں پھولوں کی سی نزاکت کا سا حسن جھلکتا تھا۔ خاں سرحد کا رہنے والا تھا اور گل ات کی رہنے والی تھی، یہ ان مل بے جوڑ جوڑی کیسے جڑی، یہ محض اتفاق تھا یا قدرت کی ستم ظریفی، شیر خاں جوانی کی سرحد سے گزر چکا ا اپنی غربت اور بد حالی سے تنگ آکر اس نے اپنے گاؤں سے دور شہر میں ٹھیکے دار رحم دل کی ملازمت اختیار کر لی تھی، رحم دل بھی اسی ا رہنے والا تھا، رحم دل اسے کار و بار کے سلسلے میں ادھر ادھر بھیجتا رہتا تھا۔

رحم دل کا کاروبار کیا تھا، اس کے ٹھیکے کس نوعیت کے تھے یہ شیر خاں کو کافی دیر کے بعد معلوم ہوا، مگر اس وقت تک وہ خان کا اتنا مند ہو چکا تھا کہ چھوڑنے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ چھوڑتا تو جاتا بھی کہاں، گاؤں میں اس کے ماں باپ عزیز و اقارب سبھی جانوروں کی سی نزار رہے تھے۔

شیر خاں نے جب خان کا اعتماد حاصل کر لیا تو خان اسے کام کی نگرانی سپرد کر کے خود دور دراز سیر سپاٹے یا شاید نئے ٹھیکے لینے کے لیے ---- اور پھر آہستہ آہستہ وہ اسے کام کے سلسلے میں ادھر ادھر بھیجنے لگا۔

ایسے ہی کسی کام کے سلسلے میں سوات گیا ہوا تھا کہ اس کی ملاقات گل پری کے خاندان سے ہو گئی، وہ جتنی خوب صورت تھی، اس کے پ اتنے ہی غریب تھے۔ خان نے ان پر اپنی خوش حالی کا سکہ جمایا اور گل پری کے رشتے کے لیے انھیں بہت سے تحفے تحائف اور مال دیا۔ ب کے باوجود گل پری پھر بھی انعام خداوندی سے کم نہ تھی، وہ اس کے آگے بچھ بچھ جاتا تھا، اس کے عزیز اس کی بے وقوفی سمجھتے تھے، وہ یوں پر بڑی سختی کرتے تھے، انھیں اپنا زر خرید سمجھتے تھے، مگر شیر خاں تو گل پری کے سامنے خود زر خرید غلام بن کر رہتا تھا۔ اس کی مانتا تھا۔

شیر خاں اکثر باہر رہتا اور گل پری گاؤں میں اداس رہتی، گاؤں والوں کے رسم و رواج، ان کا رہن سہن، ان کی زبان تک اس کی سے مختلف تھی، آخر ایک دن اس نے شیر خاں سے کہا "خان کیا تمھارے پاس وہاں کام پہ مجھے رکھنے کے لیے جگہ نہیں جو مجھے یہاں اکیلا اتے ہو، تمھارا جی نہیں چاہتا کہ میں تمھارے ساتھ رہوں۔"

شیر خاں نے اس کے لہجے کی شیرینی اپنے رگ و پے میں اترتی ہوئی محسوس کی۔ اس کا جیسے سانس رک گیا، دل تھم گیا وہ دم بہ خود یکھتا رہ گیا، گل پری ہی کو اپنی بات جاری رکھنی پڑی ---- "ہاں خان میں یہاں اکیلی اداس رہتی ہوں، نہ کام نہ کاج، بال نہ بچہ!"

اس نے ان جانے میں خان کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ان کی شادی کو کئی سال ہوئے تھے مگر وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ نے اس سے وعدہ کیا اور اگلی دفعہ اسے ساتھ لے گیا۔

"وہاں سے شہر نزدیک ہے، ہم تھہرجاتا لیڈی ڈاکٹر کو بھی دکھاسکتے ہیں۔

اس کا خیال تھا خان شہر میں پکے مکان میں رہتا ہوگا، اس نے شہر اور شہر کی رونقوں کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا مگر تم دیکھا نہ تھا۔ خان کے ساتھ جاکر وہ اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ سکے گی جو وہ سنتی رہتی تھی مگر جہاں اسے شہر لایا گیا تھا وہ تو خان کے اس کے گاؤں سے بھی ویران جگہ تھی ----دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔"

"یہ کیا جگہ ہے؟" اس نے خان سے کہا۔ "میں سمجھتی تھی تم شہر میں رہتے ہو جہاں کھلی کھلی سڑکیں ہیں، اونچی اونچی عمارتیں، گاڑیاں اور ----

"شہر میں تو ٹھیکے دار رہتا ہے، ہم تو یہاں کام دیکھنے پر مقرر ہیں۔"

"کیا کام ہے یہاں تمہارا اس ویرانے میں؟"

او ھر دریا نے جو کام خراب کیا تھا ہم اس کی مرمت کرارہے ہیں۔ روڑے مٹی کا ٹھیکہ ہے ہمارا۔"

کچھ دن تو خان اس کے لیے پکا پکایا کھانا ڈیرے سے لاتا رہا، لیکن اس نے دیکھا کہ اسے کام سے آتے آتے اکثر دیر ہو جاتی اور بیٹھی رہتی، یوں بھی اس کا اصرار تھا کہ وہ خود اس سے بہتر کھانا بنایا کرے گی۔ اس پر اس نے دال، گھی، مرچ مصالحہ گھر میں لاکر سبزی، گوشت کبھی وہ خود لے آتا، کبھی کوئی ملازم، کبھی کبھی کوئی اور، کبھی کوئی جوان آدمی، کبھی کوئی بچہ ----اس نے دیکھا سہمے سے، مظلوم، مجبور سے لگتے تھے۔ پہلے پہل اس نے سوچا غریب آدمی سبھی ایسے بجھے بجھے، سہمے سے ڈرے ڈرے ہوتے ہیں لیکن ایک خوب صورت سا، کم عمر لڑکا آیا تو اس نے پوچھ ہی لیا----"تم یہاں کیا کام کرتے ہو؟"

"جو باقی کرتے ہیں جی، مزدوری!"

"رہتے کہاں ہو؟"

اس نے دیکھا کہ وہ جواب دیتے ہوئے ڈر رہا تھا، اس کا زرد رنگ اور بھی زرد لگ رہا تھا، بھورے بال مٹی سے اٹے ہوئے نیلی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں۔

"یہیں رہتے ہیں جی، یہیں!"

"یہاں تو دور تک نہ کوئی آبادی ہے، نہ گاؤں۔"

"میری مطلب ہے جی ڈیرے پہ، کام کی جگہ پہ۔"

"گھر نہیں جاتے۔"

اس نے دیکھا گھر کے نام پر وہ اور بھی ڈر گیا---- نہیں جی، یہی ہمارا گھر ہے، جب تک یہ کام ختم نہیں ہو جاتا" اور پھر یہ کہنے لگا جیسے تسلی دے رہا ہو۔

"ہماری مزدوری جی ہمارے گھر پہنچ جاتی ہے، کھانا ہمیں کام ہی پہ مل جاتا ہے!"

وہ جلدی جلدی یہ کہہ کر بھاگ گیا، اس نے محسوس کیا، وہ جھوٹ بول رہا تھا، وہ کچھ چھپا رہا تھا۔ اسے اس بچے سے ہمدردی تھی، وہ اسے اپنا اپنا سا لگا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس کے اپنے گاؤں کا تھا۔ اسی طرح کے بچے تھے اس کے گاؤں کے، گورے رنگ، بال، نیلی آنکھیں، جیسے اس کا اپنا بھائی تھا۔

مگر وہ یہاں کیسے آگیا، اسے تو گاؤں میں بکریاں چراتے ہوئے ہونا چاہیے، اسے یہ بچہ اچھا لگا۔ اس نے خان سے کہا سودا سلف، کھانا لے جانے کے لیے اسے ہی بھیجا کرے، بڑے بڑے مسٹنڈوں کو نہ بھیجا کرے!"

"تجھے کیا ڈر لگتا ہے، ارے جب تک یہ تیرا غلام زندہ ہے کوئی آنکھ اٹھا کر تو دیکھے۔"

"نہیں یہ مطلب نہیں تھا میرا، میں نے تو یوں ہی۔"

"خیرا خیرا جو تم کہو اور ایسے ہی ہوگا۔"

ایک دن جب وہ آیا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

"آپ نہ جائیں جی" بچے نے منت کی۔

"کیوں؟"

"یہ اچھی جگہ نہیں جی، خان ناراض ہوگا۔"

"ناراض ہوگا تو کیا کرے گا؟"

"جی مجھے مار پڑے گی، میرا کھانا بند ہو جائے گا جی۔"

"میں ساتھ ہوں، میرے ہوتے تجھے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔"

وہ اسے روک نہ سکا مگر جلد ہی دونوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ لڑکے کے خدشات سچ نکلے۔ خان نے لڑکے کو دیکھتے ہی دو چار تھپڑ رسید کیے۔

"اتنی دیر کیوں لگائی؟"

پیشتر اس کے کہ وہ کچھ بولتا ایک اور آدمی سامنے آگیا، اس کے ہاتھ میں بید تھا، اس نے بغیر پوچھے دو تین بید رسید کر دیے۔ لڑکے کے منہ سے ایک آواز بھی نہ نکلی، اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔

خان نے اسے دیکھا تو غرایا۔۔۔۔ "تم کیا کرنے آئی ہو یہاں، کیوں آئی ہو؟ میں پوچھتا ہوں کیوں آئی ہو؟"

وہ اتنے غصے میں تھا کہ اسے لگا وہ اسے بھی دو چار رسید کر دے گا۔

"یہ تو مجھے منع کرتا رہا، میں خود ہی زبردستی اس کے ساتھ آگئی۔ میں تمہارا اڈیرا دیکھنا چاہتی تھی۔"

عورت کی آواز سن کر بید والا ادھر متوجہ ہوا، ادھر ادھر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"کتوں نے پھاڑ کھایا ہوتا اگر اکیلی آتی، یہ کم بخت ساتھ تھا اس لیے بچ گئی ہو!"

وہ بے چاری شرمندہ بھی تھی اور خوف زدہ بھی۔

خان نے اس سے کہا "چلو واپس چلو۔"

"جاتی ہوں مگر اکیلے مجھے ڈر لگتا ہے، اس چھوٹے کو کہو مجھے چھوڑ آئے، اور وعدہ کرو اسے اور نہیں مارو گے، قصور اس کا نہیں۔"

"جاؤ جاؤ اپنے کام سے کام رکھو، ہمارے کام میں دخل نہ دو!"

واپسی پر لڑکا خاموش رہا، اس نے کئی سوال کیے مگر وہ کچھ نہ بولا اور اسے گھر پہنچاتے ہی واپس بھاگ نکلا۔ دن بھر اس کے دھیان میں سہما ہوا چہرہ بار بار آتا رہا، بکری کے بچے کی طرح معصوم مگر خوف زدہ۔

رات کو جب خان آیا تو اس نے پہلا سوال ہی اس لڑکے کے متعلق کیا۔۔۔ "اس کو اور تو نہیں مارا؟"

"میں پوچھتا ہوں تم کیا لگتی ہو اس کی؟"

"بے چارہ، اتنا چھوٹا سا تو ہے، راستے بھر کانپتا رہا۔ میں نے اس سے بار بار پوچھا مگر اس نے کسی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ وہ تو جیسے گونگا ہو گیا تھا، اس کی تو جیسے زبان کٹ گئی تھی"

"زبان کھولتا تو سچ مچ کٹ جاتی"

"تم اتنے ظالم ہو، میں سوچ بھی نہ سکتی تھی!"

"اچھا چپ رہو، تم نہیں سمجھ سکتیں ان باتوں کو!"

وہ رات بھر اس بچے کے متعلق سوچتی رہی، کیا مجبوری ہوگی اس کے والدین کو کہ اسے ایسی سخت مزدوری پر بھیج دیا، اس کی ماں کے دل پہ کیا گزرتی ہوگی۔

صبح اس نے خان کے جانے سے پہلے پھر یہی بات چھیڑ دی۔

"بے چارہ کتنا معصوم سا بچہ ہے، آج سودا اسی کے ہاتھ بھیجنا۔"

"تم اس سے پوچھو گی اسے اور مار تو نہیں پڑی، کھانا ملا یا نہیں مگر یاد رکھو وہ ایک لفظ بھی نہیں بولے گا، اسے معلوم ہے اگر بولا تو اس کا کیا حشر ہوگا؟"

"نہیں پوچھوں گی بابا، نہیں پوچھوں گی، مگر تمھیں بھی قسم ہے اپنی ماں کی اگر اس کو کچھ کہا"

"اچھا میری اماں، اب بس کر اپنی بک بک!" خان کو غصے میں اپنی زبان پر قابو نہ رہا تھا۔ گل پری سہم گئی۔

"یہ تم نے کیا کہہ دیا خان!"

"ہاں ہاں کہا ہے اماں جان اب چپ ہو جاؤ!"

گل پری بہت دن سہمی رہی، خان سے بات تک نہ کی مگر عجیب بات تھی خان بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہ دیتا تھا۔ رات کو بھی غائب رہتا۔ آخر ایک دن گل پری نے خان سے معافی مانگی، روئی دھوئی، توبہ کی۔ اپنا قصور پوچھا تو خان بولا۔

"ہم اپنی خوشی سے تم سے دور تھوڑا ہی ہے، او بے وقوف تم کو پتہ نہیں، تم نے ہم کو بابا بولا اور ہم نے تم کو اماں جان کہا، اب بیوی کیسے بنائے۔ ہم تو بڑی مشکل میں پھنس گیا!"

"یہ تو غصے کی بات تھی، عقل کی بات تو نہیں تھی"

"او، نہیں، یہ غصے اور عقل کا معاملہ نہیں، یہ مسئلے کی بات ہے، تم نہیں سمجھتیں!"

"تو چلو شہر چلتے ہیں۔ مولوی صاحب سے پوچھیں گے اس کا تو کوئی حل ہوئے گا!"

خان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔۔۔ "اوئے، ہم نے تو خواہ مخواہ تم کو بے وقوف بولا۔ تم تو بڑا سمجھ دار ہے!"

شہر جانے لگے تو خان نے خود ہی کہا۔۔۔ "اس بڈھے کو ساتھ لے چلتے ہیں، ادھر ہم شہر میں ادھر ادھر نکلے گا تو یہ تمھارے پاس ہوگا، تم کو بھی ہم شہر کا سیر کرائے گا"

اس دوران اس نے دیکھا تھا کہ اس لڑکے کو خان اکثر ساتھ ہی رکھتا تھا، رات کو بھی وہ ڈیرے کی بجائے ان کے گھر پر ہوتا۔۔

وہ شہر لئے تو دن بھر شہر کی سیر کرتے رہے، شام کو جب لوٹے تو اس نے خان سے کہا ----"اس کام کے لیے ہم اسے لے اس کا تو
ں نہیں!"

"کل ہمارا ایک دوست آئے گا، اس کے ساتھ ہم بڑے مفتی صاحب کے پاس جائیں گے، ادھر تو یہ لوگ بولتے ہیں غلام آزاد کرو، پر
ں فکر کرتی ہو، ابھی تم سیر میر کرو، ابھی ڈاکٹر کو بھی دکھانا ہے تم کو!"

صبح ہوئی تو خان شام تک واپسی کا کہہ کر نکل گیا ----- وہ جس جگہ ٹھہرے ہوئے تھے وہ جگہ بسوں کے اڈے کے پاس ہی تھی قریب
سجد بھی تھی، وہ لڑکے کو ساتھ لے کر وہاں گئی، مولوی صاحب سے اپنا مسئلہ بیان کیا، مولوی صاحب نے اس کا حل بتایا اور وہ واپس
ڈے پہ آگئی - بیٹھے بیٹھے جانے اسے کیا سوجھی اس نے لڑکے سے پوچھا۔

"تمھیں اپنا گھر، اپنے ماں باپ تو یاد آتے ہوں گے!"

لڑکا خاموش رہا۔

"تمھیں اپنے گاؤں کا نام تو یاد ہوگا!"

لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا۔

"گاؤں کے رستے یاد ہیں -"

لڑکے نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔

"اچھا اگر تمھیں کوئی گاؤں پہنچا دے، تمھیں تمھارے ماں باپ سے ملا دے ----!"

لڑکا رونے لگا۔ زار و قطار رونے لگا۔ جانے اسے کیا کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔

"اٹھو ----!" اس نے لڑکے سے کہا ---- "چلو، میرے ساتھ!"

"کہاں ----؟" لڑکے نے کہا۔

"بس تم چلو میرے ساتھ ----!"

وہ بس کے اڈے پر گئی، ٹکٹ لے کر اسے بس میں بٹھا دیا، ڈرائیور سے کہا اس کا خیال رکھے - پاس بیٹھی زنانی سواری سے کہا۔ "میرا
ہے، اسے سوات جانا ہے - پیسہ اس کے پاس ہے اس کا خیال رکھنا!"

لڑکا ڈرا سہما بیٹھا رہا، وہ اس وقت تک بس کے قریب کھڑی رہی جب تک بس چل نہ پڑی، لڑکے کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس کی
میں بھی آنسو تھے - واپسی کے راستے میں اور اپنے کمرے میں پہنچ کر بھی وہ دیر تک روتی رہی۔

خان رات بہت دیر سے واپس آیا۔ وہ سو رہی تھی - خان اس سے کھانے کا پوچھ رہا تھا.. اس نے سوئے سوئے بتایا۔ اسے بھوک
و د کھا کے سو رہو۔

صبح وہ اٹھی تو اس نے سنا خان زور زور سے بول رہا تھا

"کیا شور مچا رکھا ہے صبح صبح، نہ یہ گاؤں ہے نہ تمھارا اڈا، لوگ کیا کہیں گے -"

"بھاگ گیا ہے ---- وہ نڈھا بھاگ گیا ہے - تم نے اس کا خیال نہیں رکھا ناں!"

"وہ کہیں نہیں بھاگا!"

(سلسلہ ۳ ص ۱۰۵ پر)

غلام جیلانی

چھوٹی سی بات

تم کو کچھ بھی یاد نہیں ۔ سب بھول بھال گئیں ، ان دنوں تمہاری عمر بس کوئی چھ سات برس کی ہوگی اور شام کو دروازے کے آ. رنگولی کے ڈیزائنوں پر اکیلی کوئی کھیل کھیلتی رہتی تھیں۔ عجیب سا تھا وہ کھیل ، ٹھیکری کا ایک ٹکڑا زمین پر پھینکتیں ، پھر ایک ٹانگ . اچکتی ہوئی جاکر اسے پاؤں سے ٹھوکر مارتیں اور ہاتھ سے اٹھالیتیں ۔ مہین بنفشی گھاگرے میں پتلی پتلی ٹانگوں کا سونا جھلکتا رہتا ۔ اسی سو. میں ڈھلا تمہارا سبک چہرا ، کسی عظیم بت تراش کا فن پارہ ، نازک ہونٹ ، ستواں ناک ---- سیاہ گھنی پلکوں کے نیچے ہرنی جیسی آنکھیں ----ہاں ، مجھے ایک ایک تفصیل یاد ہے ۔

گیند اچھل کر تمہاری رنگولی میں جا پڑتی تو واپس لے جانے دوسرے بچوں سے پہلے میں آجاتا تھا ۔ کبھی تم بھی اٹھاکر میری طرف پھینک دیتیں ۔ مگر تم اتنی سنجیدہ کیوں رہتی تھیں ؟ صرف ایک دفعہ تمھیں مسکراتے دیکھا تھا جب میں تمھیں دیکھنے میں کھو گیا تھا اور گیند بجائے تمھاری ٹھیکری اٹھالی تھی ۔ اس دن پتہ چلا تمھاری مسکراہٹ کتنی دل آویز تھی! ذرا سی لرزش کے بعد اوپر کا ہونٹ نچلے ہونٹ سے سرگوشی کرتا ، اور پھر دونوں پر مسکراہٹ کا کنول کھلتا جاتا ---- الھڑ---- معصوم ۔

میں نے اپنی کم عمری میں بھی اپنے دل اور ذہن کی ہم آہنگی کو ایک مقدس خزانے کی طرح اپنے میں محفوظ رکھا ۔ کبھی کسی بچے . اس کا ذکر نہیں کیا ---- اور کیوں کرتا ، یہ تو میری اور تمھاری امانت تھی!

اس دن یکایک بارش شروع ہو گئی تھی ۔ ہم لوگ میدان میں فٹ بال کھیل رہے تھے اور بارش کا زور اور بڑھ گیا تو سارے . اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے ۔ میرا گھر میدان کے پچھواڑے پڑتا تھا اور تمھارا گھر بالکل سامنے ، مورم کی سڑک کے کنارے تھا ۔ میں تمھارے گھر کی سیڑھیوں پر جا کھڑا ہوا ---- اب میں سوچتا ہوں ۔ تمھارے ہی گھر کی سیڑھیوں پر کیوں گیا اور بھی تو گھر تھے اسی سیدھ میں ؟ یہ بات کہ تم نے بھی کبھی سوچی تھی ؟ ---- میرا مطلب ہے ، بعد میں کبھی ، ---- جب ایسی باتوں پر سوچنے کی عمر ہو جاتی ہے ، تب ؟

اور پھر کھٹ سے تمھارا دروازہ کھلا اور تمھاری ماں نے اپنی زبان میں مجھے اندر آجانے کو کہا اور میں بھیگے ہوئے کپڑوں سے پانی ٹپکا تمھارے ڈرائینگ روم میں آکھڑا ہوا ۔

اور اس وقت تم نے مجھے دیکھا ۔ تم الماری کے سامنے فرش پر بیٹھی گڑیوں سے کھیل رہی تھیں ۔ تم نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا تو چونک گئی تھیں ۔ تمھاری آنکھوں کی جھیلوں میں لمحہ بھر کے لیے ہل چل مچ گئی تھی ۔ وہ جھیلیں اور ان پر جھکے ہوئے پلکوں کے صنوبر آج بھی میرے ساتھ ہیں ۔ زندگی کے سفر میں وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے اور صرف وہی نہیں ، تمھارے گلابی ہونٹ بھی ، جو اس دن اچانک مجھے وہاں ، اس بھیگی ہوئی حالت میں دیکھ کر حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے تھے اور پھر تم یک لخت کھل کھلاکر ہنس پڑی تھیں ۔ تمھاری ماں نے پھر اس اجنبی زبان میں تم سے کچھ کہا تھا اور تم اسی طرح ہنستی ہوئی اندر کہیں بھاگ گئی تھیں ۔

کتنے دن بعد تم نے بتایا تھا کہ وہ تامل زبان تھی اور ماں نے تمھیں اندر جانے کو کہا تھا ۔ "جانتے ہو کیوں ؟" اور تم نے خود ہی کہا تھا ۔ اس لیے کہ تم میری طرف مسلسل عجیب انداز میں دیکھے جا رہے تھے ۔ یہ بات ماں نے بعد میں کبھی بتائی تھی ۔

اور پھر وہ دور بھی آیا جب اپنے اپنے کالجوں کی بسوں کے انتظار میں بس اسٹینڈ پر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تھے ---- تم بنی بڑی بڑی شربتی آنکھوں کے گوشوں سے، اور میں ہزار بہانوں سے۔ وہاں مجھے ان لڑکوں پر بے حد غصہ آتا تھا جو تمھیں چھیڑنے کی کوشش تے تھے۔

ان ہی دنوں میں ہم وہ محلہ چھوڑ کر دوسری جگہ چلے گئے تھے مگر میں اسی بس اسٹینڈ پر کالج کی بس کے لیے آتا رہا۔

یہ بھی عجیب محبت تھی ---- جس میں کبھی ایک بار بھی تم سے بات تک نہیں ہو سکی۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا، تم مجھے کیسا آدمی بھتی ہو ا کیا کبھی تمہارا جی نہیں ہوا، مجھ سے بات کرنے کو؟

---- اور پھر ایک دن پہلی بار تم نے مجھ سے بات کی اور اس دن تم نے بتایا کہ میں نے ہی کبھی کوشش نہیں تھی۔ تم سے بات نے کی ہمیشہ انتظار رہا! کیسی عجیب بات تھی!

اس روز بالکل اچانک ہی، ایک نئی جگہ تم سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ چھٹی کا دن تھا اور مطلع ابر آلود۔ رم جھم ہو ہو کر رک جاتی تھی۔ ٹ پاتھ پر ایک ڈھابہ نما مکان پر بیسن والی مصالحے کی گرم گرم مرچیں تلی جارہی تھیں۔ تم اپنے چھوٹے سے بھائی کے ساتھ ایک طشتری میں مرچیں کھارہی تھیں۔ اس دن پہلی بار پتہ چلا کہ تمہارا اتنا چھوٹا بھائی بھی ہے ----!

خیر تو تمھیں دیکھ کر میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اور پھر تم نے ایک غیر متوقع حرکت کر ڈالی۔ ایک طشتری مرچیں خرید کر میرے لیے بھوا دیں۔ یہ گویا پہلا معاملہ تھا، تمھارے میرے درمیان!

---- اور مجھے یاد نہیں، اس موقع پر، میں نے تم سے کیا کہا، کیا حرکتیں کیں ---- جو تم نے نزدیک آکر کہا ---- لے لیجیے نا بڑے رے کی ہیں۔

تیز مرچوں کے اثر سے تمھاری آنکھوں سے پانی جارہا تھا۔ ناک اور گال بھی سرخ ہو رہے تھے ---- اور ایسے میں تمھاری آواز بھی یب، مضحکہ خیز سی لگ رہی تھی ---- جیسے تم خود لگ رہی تھیں۔

دیکھا تم نے؟ مجھے ایک ایک تفصیل یاد ہے اور پھر ہم مرچیں کھا کر سڑک کا چھوٹا سا جنگلہ الانگ کر پیچھے ہری گھاس پر چلے آئے۔ ہاں ہینڈ پمپ سے پانی پیا۔ ہاتھ منہ دھویا، اور گھاس پر بیٹھ گئے۔ تمھارا بھائی اٹھ کر دوسرے بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے لگا۔

اس دن تم نے بتایا تھا کہ بی اس۔ سی کے امتحان میں تمہارے پرچے بہت خراب ہو گئے تھے۔ پاس ہونا ناممکن تھا اور چھٹیوں میں کمپیوٹر ٹریننگ شروع کرنے والی ہو۔ بھارت ناٹیم سیکھنا تو شروع کر دیا ہے ---- وہی تو سیکھنے یہاں آتی ہوں روز، ہاں۔ اس سامنے والی لڈنگ میں۔ وہیں رہتی ہیں، ہماری ڈانس ٹیچر، مگر میں گم سم سا بیٹھا تمھیں دیکھنے میں محو تھا۔ تم نے اور بھی کچھ کہا ---- مگر میں اس وقت ن نہیں رہا تھا۔

تم نے ہلکے کاسنی رنگ کے لہنگے پر دھانی اوڑھنی لپیٹ رکھی تھی۔ جمپر جامنی رنگ کا تھا۔ کانوں کی لوؤں سے دو بہت چھوٹے چھوٹے، پیازی رنگ کے آویزے لٹک رہے تھے ---- تاش میں اینٹ کی شکل کے۔ بات کرنے میں ہل اٹھتے تو گلابی نقشے جھل مل کرنے لگتے

---- اب بھی ویسی ہی دبلی پتلی، نازک سی تھیں تم! یہ اور بات ہے، گداز جوانی ہر جگہ سے جھانکنے لگی تھی۔ قدرت نے تمھارا جسم ڈانس کے لیے ہی بنایا تھا۔ تم کہے جارہی تھیں ---- نہیں، ہماری ڈانس کلاس میں صرف گرلس ہوتی ہیں۔ آپ وہاں آکر نہیں دیکھ سکتے۔
---- مگر میں نے ایک دن دیکھ ہی لیا تھا ---- چوری چھپے، باہر لان میں کھڑے ہو کر، ڈانس فلور کی کھلی کھڑکی میں سے۔ اندر وہ

اکیلی ناچ رہی تھی ---- پام بیٹ کے رامپا مندر کی اپسرا میں جان پڑ گئی تھی؟ اور اس کے ہاتھوں اور کمر کی متحرک قوسوں سے کمرے کی ہر رقصاں و پیچاں ہو رہی تھی۔ اس کا ذکر میں نے تم سے کبھی نہیں کیا۔ کر ہی نہ کو سکا۔ تم اس کے بعد کئی دن تک نظر ہی نہیں آئیں، نہ ڈانس کی کلاس میں، اور نہ بس اسٹینڈ پر۔

تم نے بعد میں بتایا تھا کہ مدراس چلی گئی تھیں۔ کسی شادی میں، وہاں تم روز سمندر کے کنارے جا بیٹھتی تھیں، گھنٹوں گزار دیتی تھیں۔

"تمہیں سمندر بہت پسند ہے" "میں نے پوچھا تھا۔

"بہت۔ بس جی چاہتا ہے، بھیگی ریت میں گھروندے بناتی جاؤں، بناتی جاؤں"۔

"اور پھر ----؟

"ساگر سے ایک لہر اٹھے، اور سارے گھروندوں کو توڑ کر آگے بڑھ جائے۔"

"تمہیں دکھ نہیں ہوگا ----؟" میں نے پوچھا تھا۔

"ہوگا" "تمہارا چہرہ معصومیت میں ڈوب گیا تھا" ---- "ایک مرتبہ میں رونے لگی تھی"۔

"پھر کیا کیا"

"پھر اور گھروندے بنائے ---- پھر ایک لہر آئی ---- پھر گھروندے بنائے ----"

---- اس کے بعد تم دیر تک چپ ہو گئی تھیں۔ رامپا کی اپسرا والی بات میں تم سے نہیں کہہ سکا۔ اب سوچتا ہوں، کہہ دیتا تو کیا ہوتا؟ ---- کیوں کہ تم اس مورتی کی طرح پتھر کی بنی نہیں تھیں۔ تم تو لہروں کی گود میں گھروندے بنا کر کھیلتی تھیں۔ جی نے چاہا تھا میں تمہیں وہ بات سناؤں، ---- مگر اس بات کو بھی ایک خوب صورت سرائے کی طرح سینے میں چھپا کر ٹالتا رہا۔ کتنا سرور تھا۔ اس میں بھی!

اور اس کے بعد بس دو ایک بار ہی مل سکے تھے۔ کتنی باتیں تھیں جو کبھی زبان تک نہ آسکیں۔ ہمارے پاس باتوں کے بہانے ہی کتنے تھے؟ ایک ان دیکھا سا خوف، ہمیشہ درمیان میں للکارتا رہتا! ---- کہیں سراب کی حقیقت کھل نہ جائے؟ کہیں خواب دیکھتے دیکھتے آنکھ نہ کھل جائے۔ الجھے سانسوں میں دھڑکنیں کہتی ---- آج کہہ نہ ڈالا، تو کون جانے پھر موقع بھی ملے!

ایسا ہی ہوا تم یکایک غائب ہو گئیں۔ ایسی کہ کہیں کسی طرح پتہ نہ چل سکا۔ بس بیٹھے بیٹھے ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ گھر پر پوچھنے گیا تھا مگر تم لوگ گھر چھوڑ چکے تھے۔ کیوں ---- ایسا کیوں کیا تم نے؟ جانے سے پہلے کہہ بھی تو سکتی تھیں؟ میں کیا روک سکتا تھا؟ ---- مگر شاید تم اسی طرح چلی جانا چاہتی تھیں۔ میں نے تمہیں ڈھونڈا ضرور، انتظار بھی کیا ---- مگر مجنوں یا فرہاد نہیں بنا۔ میں مجنوں یا فرہاد تھا بھی نہیں۔ میری جستجو یا انتظار کا تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلا! مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا وہ ان جانا سا خوف یک لخت ان جانا نہیں رہا؟

---- جانتی ہو دل کو واپس آنے میں کتنے دن لگے؟ تم چلتی بھی تھیں تو پھولوں پر، زمین پر قدم رکھتیں تو نقش قدم بھی ملتے! ---- مگر شاید یہی بات میرے حق میں مفید رہی۔

تم اپنے راستے پر چلی گئیں۔ میں اپنے راستے پر نکل گیا۔ ہرجاتا کوئی نہیں۔

---- تمہیں یاد ہے، ان باتوں کو شاید تیس برس گزر گئے ہیں۔ اور اتنے دن بعد آج یہاں اس اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں تم نظر آئیں ---- محض اتفاق سے۔ اس جنکشن پر لوگ صرف گاڑیاں بدلنے رکا کرتے ہیں تم بھی میری طرح کہیں سے آرہی ہوں گی اور کہیں

جا رہی ہوں گی۔

----- تم پلیٹ فارم پر بک اسٹال سے کوئی میگزین خرید رہی تھیں اور میں تمھیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ قدم جہاں کے تہاں رک گئے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا ان تیس برسوں کی مسافت سے بے اثر اور بے خبر تم اسی طرح شباب کی تصویر بنی کھڑی تھیں، جیسی کہ ہوا کرتی تھیں! ---- ہاں۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ تم نے ساڑی پہن رکھی تھی۔ ---- سبز رنگ کے سلک کی۔

اور پھر کہیں سے تمھارے قریب ایک نوجوان آکھڑا ہوا، ---- خوش پوش، خوش شکل، اور تم دونوں باتیں کرتے ہوئے ویٹنگ روم میں چلے گئے، میں بت بنا ان سارے واقعات کو ذہن میں جذب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

----- اور پھر جب ویٹنگ روم میں پہنچا تو سارا منظر جو آوٹ فوکس تھا، فوکس میں آگیا۔ تم وہ نہیں تھیں جسے میں نے ابھی دیکھا تھا۔ م تو آرام کرسی پر شال اوڑھے پڑی تھیں، چپ چاپ کھوئی کھوئی نظروں سے چھت کو تک رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے چھت میں سے گزر کر تمھاری ریں اور دور کہیں آسمانوں میں دیکھ رہی ہیں۔

ان تیس برسوں سے نہ تم بے اثر رہیں تھیں، اور نہ بے خبر۔

----- پھر میں آہستہ آہستہ چلتا تمھاری آرام چیر کے دوسری جانب آگیا اور تم نے بھی بہت آہستہ آہستہ گردن پھیر کر میری طرف دیکھا ---- مگر صرف دیکھا۔ اسی طرح جیسے چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ تمھارے چہرے پر پہچان کا کوئی رنگ نہیں جھلکا۔

اور پھر تمھارے شباب نے جھک کر تمھارے کانوں میں دھیرے دھیرے کچھ کہا۔ مگر ---- کچھ بھی تو نہیں ہوا، تم پر کوئی اثر نہیں !!

اور تب میں نے جانا۔ تم پہچان اور بیجان، یادوں اور زخموں کی اس دنیا سے بے نیاز ہو چکی ہو۔ تمھارے ذہن کی کسی جہت میں، کسی ت سے اب کوئی ہل چل نہیں ہوتی۔ تمھارے چہرے کی کسی جھری میں ذرا سا بھی ارتعاش نہیں ہوتا اور نہ فضا میں کہیں کسی یاد کا تار ٹوٹتا ۔ پھر بھی تم جی رہی تھیں۔ ایک چھوٹی سی شیشی میں سے کئی چھوٹی چھوٹی گولیاں تمھارے منہ میں ڈال دی گئیں۔

----- یہ کیسی ملاقات تھی؟

----- میں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ چلا آیا۔ ان دونوں نے بھی مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ چپ چاپ جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

عجیب بات ہے۔ میں تم سے ایک بات بھی نہ کر سکا! ہمیشہ کی طرح ہمارے درمیان دبیز خاموشی کھڑی رہی۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ ں کبھی اس کی خبر نہ ہوگی تم سے یہ سب کہے بغیر میں رہ بھی نہیں سکتا۔

○ ○ ○

جسوندر شرما

ترجمہ : سعید احمد سندیلوی

اپنا اپنا سچ

آج کسنا دوسرے دن بھی مہتا جی کے لوہے کے اونچے سے گیٹ سے باہر سر جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ گیٹ بند تھا، پھر بھی چھوٹی سی دراز میں سے وہ کئی بار اندر جھانک لیتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے اندر سے مہتا جی گیٹ کی طرف ہی آتے دکھائی دیے تھے، تب وہ دم سادھے ہوئے منھ لٹکا کر کھڑا ہوگیا تھا۔ مگر مہتاجی باہر نہیں آئے تھے۔ گیٹ کے ساتھ لگی بیٹھک میں جا کر دیوان پر بیٹھ گئے تھے۔

کسنا نے سوچا سیدھے بیٹھک میں ہی جاکر ان سے بات کرلوں، لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی۔ کل دیکھا نہیں تھا وہ کتنے غصے میں تھے۔ اسی طرح کسنا صبح صبح گیٹ کے پاس آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ کھڑے کھڑے ٹانگیں بھی جواب دے گئی تھیں۔ پاؤں گویا پتھر ہوگئے تھے۔ سردیاں بھی اس بار غضب کی پڑ رہی تھیں۔ سامنے نیم والے چوک میں بچوں نے گھاس پھوس اکٹھا کرکے آگ جلائی ہوئی تھی۔ بار بار کسنا کا من کر رہا تھا کہ وہ بھی کچھ دیر آگ تاپ لے، لیکن وہ وہیں گیٹ پر ہی ڈٹا رہا۔ پتہ نہیں مہتا جی کب بلالیں۔

مہتا جی بے حد گرم مزاج کے تھے۔ مگر ان کا اصلی مزاج کسنا جانتا تھا۔ اندر سے بہت ہی نرم دل تھا ان کا اور پھر کام کے آدمی کی قدر جانتے تھے۔ تبھی تو پچھلے سال جب کسنا سردار دلیپ کی چکنی چپڑی باتوں میں آگیا تھا اور ایک اتوار اس کے گھر لکڑیاں چیرنے چلا گیا تھا۔ مہتاجی کو پتا نہیں کہاں سے بھنک پڑی۔ وہ چیخے "میرا نوکر ہوکر ـــــ سسرا میرے جانی دشمن کے گھر کام کرنے جائے، اس کی یہ مجال"۔۔۔ انھوں نے رات کسنا سے پوچھ ہی لیا تھا۔ ڈانٹتے ہوئے بولے "وہ لمپٹ اگر تجھے چار پیسے دے دیتا ہو تو میں ناراض نہیں ہوتا۔ سالا مفت میں تمھاری ہڈی تڑواتا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے۔"

کسنا ۱۵ سال کا ہوگا تب سے مہتاجی کا نوکر ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے اس کا باپو بھی مہتا خاندان کا چوبیس گھنٹے کا نوکر تھا۔ باپو تو مہتا خاندان میں اتنا گھل مل گیا تھا کہ اسی گاؤں میں رہ کر بھی خود اپنے خاندان میں مہینے میں ایک آدھ بار شادی یا غمی میں ہی آتا۔ ماں بے چاری راہ دیکھتی رہتی، طعنے، گالیاں دیتی مگر کسنا کا باپو تو مالک کی نوکری چاکری میں ہی مست اور مصروف رہتا تھا۔ گھر میں گزارے لائق سب کچھ مہتاجی کے گھر سے ہی آتا۔ اگر کسنا کو باپو سے کوئی صلاح لینی ہوتی تو اس کے پاس کھیتوں میں ہی جانا پڑتا۔

کسنا اپنے باپو جتنا وفادار تو نہیں تھا۔ تاہم باپو کے مرنے کے بعد اس کا کافی کام کسنا نے سنبھال لیا تھا۔ بیچ بیچ میں دو تین دن غائب بھی ہوجاتا۔ اپنی رشتے داری میں جاکر پڑا رہتا تھا یا تیوہار وغیرہ کو کچی شراب یا بھانگ چڑھا لیتا، پھر بھی مہتا جی برداشت کرلیتے کبھی کچھ نہ کہتے۔ ان کے کئی کاموں کو سرانجام صرف کسنا ہی دے سکتا تھا۔ درجن بھر سے زیادہ جانوروں کا گوبر اٹھاتا، انھیں کھونٹے پر بڑی پانی پلاتا، دودھ دوہنا، لکڑیاں چیرنا وغیرہ، ایسے کئی کاموں میں وہ پورا دن کھپا رہتا۔

[illegible]

[illegible] ہے [illegible]

[illegible] کیا کرے [illegible] ہے [illegible]

[illegible] ہے۔

یہ سب سسپنس [illegible] کا کیا دھرا ہے۔ [illegible] کے [illegible] [illegible] کام [illegible] ۔ اب [illegible] تو [illegible] [illegible] منا جی کو بھی ڈرا دیا تھا۔

کہتا تو منا جی کے سامنے قسم کھانے کو تیار ہے کہ اس نے [illegible] کے [illegible] کو ہاتھ نہیں لگایا۔ [illegible] نے اس کی جگہ [illegible] کا [illegible] ہے۔ لیکن اصل [illegible] تو [illegible] میں ہی [illegible] ہے۔ [illegible] زبان کا بہت [illegible] ہے۔ اتنا کام سسپنس سے [illegible] گا۔ پھر [illegible]

اب کہنا کیا کرے۔ کیا کیپٹن [illegible] کر اور [illegible] سے [illegible] یا واپس [illegible] جائے۔ [illegible] ی نہیں کی۔ سب ہر شخص کے خلاف ہو گئے ہیں۔ [illegible] نے [illegible] [illegible] سب کی منا جی اور [illegible] کے کہنے میں آکر کام روک دیا ہے۔ [illegible] کے [illegible] صاف [illegible] کر دیے ہیں۔

[illegible] کے [illegible] کو [illegible] ۔ [illegible] کی بات نہیں۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے بعد اس سے [illegible] بات [illegible]

[illegible]

کسان نے [illegible] کی [illegible]

[illegible]

[illegible] کے سامنے [illegible] کر [illegible]

[illegible] کچھ دیر کچھ بھی نہیں ہوا۔ سپاہی دھواں چھوڑتے رہے۔ [illegible]

[illegible] ان کے معنی [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] کی بات کی۔ [illegible] کی قسم کھا کر [illegible]

[illegible] تھا۔ کسان نے ایک بار زمین کو ہاتھ لگائے۔ پھر کانوں سے لگا کر قسم کھائی۔

[illegible] ہم کب جیت جاتے۔ وہ تو تمھاری [illegible]

[illegible] تم جیسے [illegible] وہ تو چلا گئے۔ اگلے دن جب ہم [illegible]

[illegible] کی ضرورت نہیں [illegible] تمھاری [illegible]

[illegible] ۔ تاریخ کو بیلنے والا ہے اس کی دیکھ بھال ٹھیک طرح سے کرنا۔

کسان کے [illegible] کی طرف بھاگا۔ [illegible]

[illegible]

●●● ● ●●●

[illegible]

عکسی کہانی

ترجمہ / حمید جعفری [illegible]

کاکا توا (سندھی کہانی)

[illegible] وشاکا نے نہیں کہا پاپی تھی کہ اپنے نصیب پر فخر کرے یا [illegible] اس گھر میں اسے وہ سب کچھ ملا تھا جس کا [illegible] [illegible] کی تصور کرتی ہے ۔ عجب وہ شوہر ... اس نے سمجھا وہ ایک [illegible] فلیٹ ، نوکر چاکر ، گھر میں صرف [illegible] افراد ... ساس سسر اور وہ بھی زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہنے والے ۔ انھوں نے وشاکا کو یہاں کالج میں ملازمت کرنے کی اجازت بھی دی تھی ۔ باہر آنے جانے ، گھومنے پھرنے پر بھی کوئی روک ٹوک نہیں تھی ۔ پھر بھی اسے اس گھر میں گھٹن کیوں محسوس ... وہ باہر نکلنے کے لیے بے چین تھی ۔ شادی ہوئے ابھی تو کل چھ مہینے گزرے ہیں پوری عمر کیسے کٹے گی ...

ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس کی ممی کا بمبئی سے ٹرنک کال آیا تھا ۔ وہ پیر اتوار کو اس کی خیر و عافیت معلوم کرتی ہیں ۔ "بیٹی ... تو ہو نا ؟ تمھارے ساس سسر کیسے ہیں ؟ جینت کہاں ہے ؟ گھر کے لوگوں کا طرز عمل تمھارے ساتھ ٹھیک تو ہے نا ؟ تمھیں ... تکلیف ... ؟"

وشاکا ماں کے دریافت کردہ ہر سوال کا جواب اسی مشینی انداز میں دیتی جاتی ہے ۔ "جی ممی میں بالکل ٹھیک ہوں ۔ یہاں مجھے ... تکلیف نہیں ہے ۔ آپ اب میری فکر نہ کیجیے ۔ اپنی صحت کا خیال رکھیے ۔ آپ کھانا تو ٹھیک سے کھاتی ہیں نا ؟ دوا ... لیتی ہیں یا ... ؟"

ماں سے بات کرنے کے بعد وشاکا اپنی خواب گاہ میں آکر لیٹ جاتی ہے ۔ ایرکنڈیشنر کی ہوا اسے زیادہ ٹھنڈی لگتی ہے ... پیروں کے پاس پڑا ہوا کمبل کھینچ کر اپنے جسم کو چاروں طرف سے کس کر لپیٹ لیتی ہے ۔ اتوار کے دن دوپہر کے ... اسے ... لینے کا موقع ملتا ہے ۔ جینت اتوار کو پورے دن غائب رہتا ہے ۔ وشاکا آنکھیں بند کر کے ... نیند کی دیوی اس سے روٹھی ہوئی ہے ۔ وہ صرف کروٹیں بدلتی رہتی ہے ۔ اپنی حالت پر ... چاہتی ہے لیکن ... آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو گئے ہیں ۔ ... جو ... کی خوشی ہے کہ ... ان کا ... سکون سے آنکھیں موند سکے گی ... کہ اس کے مرنے کے بعد وشاکا کا کیا ہوگا ...

وشاکا کے والد کا تو اس کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا ۔ ... نے ہی ... ٹھیک ... پال پوس کر بڑا کیا ۔ پڑھایا لکھایا ۔ انگریزی ادب میں ایم ۔ اے کرنے کے بعد کالج میں ملازمت بھی مل گئی ... تھی ... سوچا تھا کہ اب ... [illegible] ... [illegible]

چکی تھی۔ "مدراس کے باشندے ، فارین سروس سے ریٹائرڈ ، مگر جگت کے پروفیسر کے آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ
لیے ایک حسین ، تعلیم یافتہ لڑکی ۔۔۔

یہ اشتہار اس کو متاثر کر گیا ۔ ارسال کردہ فوٹو اور بائیو ڈاٹا منظور کیے گئے ۔ جوہو بیچ کے ایک ریستوراں میں شہزادے نے ایک دوسرے کو دیکھ کر رضا مندی کی "ورمالا" پہنائی تھی ۔ تاج محل ہوٹل کے ریسپشن ہال میں آئی ہوئی سب ہی وشاکھا کی قسمت سے حسد محسوس ہورہا تھا ۔

۔ تم خوش قسمت ہو ۔ بھگوان کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ۔ اس نے تمہارے سب دکھ دور کردیے ہیں ۔ تمہاری دعاؤں کی تکمیل ہوگئی " رشتے داروں کے اس وقت کے گئے یہ جملے اس وقت وشاکھا کے کانوں پر ہتھوڑے مار رہے ہیں ۔

دیوار پر لگی گھڑی نے چار بجائے ۔ ٹھیک پانچ بجے اس کے ساس سسر اپنے کمرے سے باہر نکل کر چائے کی گھنٹی بجاتے ہیں ۔ انھیں مقررہ وقت پر چائے چاہیے ۔ چائے پی کر ساڑھے پانچ بجے وہ پارک میں چہل قدمی کرنے جاتے ٹھیک سات بجے لوٹ آتے ہیں ۔ پوری عمر فارین سروس میں گزارنے کی وجہ سے انھوں نے اپنے روز مرہ کے معمولات سوئیوں کے حساب سے متعین کرلیے ہیں ۔ گھڑی کی یہ سوئیاں اپنے گھنٹوں کی آواز کے ساتھ ، گھر کے دوسرے افراد اور بھی اپنے ساتھ ہم قدم کرنے کے لیے گھسیٹتی رہتی ہیں ۔

وشاکھا بستر سے اٹھنے کے بعد سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہوکر اپنے بال سنوارتی ہے ۔ اتوار کے دن دوپہر کے ملازمین چھٹی پر ہوتے ہیں ۔ شام کی چائے اور رات کا ہلکا کھانا بنانے کی ذمہ داری وشاکھا پر عائد ہوتی ہے ۔

پورے پانچ بجے گھنٹی بجنے پر وشاکھا کچن سے سوکھا میوہ ، چائے اور بسکٹ ٹرے میں لاکر ڈرائنگ روم کی سینٹر ٹیبل سلیقے سے ، کوئی آواز کیے بغیر رکھ دیتی ہے ۔ اب اسے اس بات کی مشق ہوگئی ہے ورنہ پہلے تو اس کے ہاتھ کانپتے ۔ ڈر لگتا تھا کہ کہیں یہ جاپانی کپ پلیٹیں ہاتھ سے چھوٹ کر چکنا چور نہ ہوجائیں اور بیش قیمت ایرانی قالین کو خراب نہ کر دیں ۔ گرنے کی آواز سے بھی اس کے سسر کی سرد مہر آنکھیں اخبار سے اٹھ کر اسے اندر تک چیر دیتی ہیں ۔

وہ چائے کے کپ تیار کرکے سسر کے آگے رکھتی ہے ۔ سسر کی نظر شام والے اخبار پر اور ساس کی دو انگلیوں میں پکڑی ہوئی سلائیوں پر مرکوز ہیں ۔ وہ تیزی سے کچھ بن رہی ہیں ۔ ان کی آنکھوں کی پتلیاں صرف ایک بار اوپر اٹھ کر ، بہو اس کی آنکھوں میں گھور کر ، پھر اپنے کام میں مصروف ہوجاتی ہیں ۔ وشاکھا کو اس ڈرائنگ روم میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے اسے لگتا رہتا ہے کہ دیوار پر لگے شیر چیتے کے سر اپنے خوں خوار دانت بھینچے جیسے ابھی اس پر چھلانگ لگادیں گے ۔ ضرور اس کے سسر نے اپنی افریقی پوسٹنگ کے دوران کیا ہوگا ۔ اس ڈرائنگ روم میں انھوں نے دنیا بھر کے نوادرات سجائے ہیں ۔ اپنی جمع کی ہوئی ان اشیاء سے اس کے ساس سسر کو بہت دل چسپی ہے ۔ وہ خود ان کی جھاڑ پونچھ کرتے ہیں ۔ ملازمین پر اعتماد ہے نہ وشاکھا پر ۔

وہ اپنی پیالی لے کر باہر بالکنی کے شیشے سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ میں بیٹھ جاتی ہے ۔ یہ دھوپ اسے ابھی بھی تو جھلس جیسے ایسی ٹھنڈی اور بے جان ہے ۔ اپنی قبروں سے اٹھ کر سرد لاشوں کے چلنے پھرنے کا تصور اس کے

جھرجھری پیدا کردیتا ہے۔

"گڈ آفٹرنون ! ہاؤ ڈو یو ڈو ؟" بالکنی کی سمت سے ٹنگے آہنی جھولے پر بیٹھا ہوا کاکا توا پرندوں کا جوڑا خوشی سے چلا کر اس کا استقبال کرتا ہے۔ وہ اپنے لبوں پر انگلی رکھ کر انھیں چپ رہنے کی ہدایت دیتی ہے۔ انسانوں کی طرح باتیں کرنے والے یہ طوطے اس کے ساس سسر مالیزیا سے لے آئے تھے۔ جب بھی کوئی مہمان ان کے گھر آتا ہے۔ یہ دونوں کاکا توا اڑ کر اس کے کندھوں پر جا بیٹھتے ہیں اور گڈ مارننگ، گڈ ایوننگ، ہاؤ ڈو یو ڈو کہہ کر اس کا استقبال کرتے ہیں اور پیار سے اس کے گالوں کو چوم لیتے ہیں۔ آنے والا مہمان بالکل ششدر رہ جاتا۔

"ڈریے نہیں ! ہمارے پالے ہوئے طوطے بالکل بادم لیس ہیں" ساس سسر مہمان کو تسلی دیتے اور انھیں ڈرائنگ روم میں سجے ہوئے نوادرات دکھانے میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ یہ ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اگر کوئی ان کے جمع کیے ہوئے کھلونوں کی تعریف کرتا ہے تو وہ خوش ہوکر اس کی زیادہ خاطر مدارات کرتے ہیں۔

دونوں کاکا توا اڑ کر وشاکھا کے کندھوں پر آبیٹھتے ہیں۔ وشاکھا ان کے لال پروں پر سہلاتی ہے۔ یہ دونوں اس سے کافی گھل مل گئے ہیں۔ اس کا نام کہنا بھی سیکھ لیا ہے۔ اسے دیکھتے ہی وشاکھا، وشاکھا، چلانا شروع کردیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر وشاکھا کے ساس سسر کی آنکھیں ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہیں" تم نے انھیں اپنے لاڈ پیار سے بگاڑ دیا ہے۔"

اس گھر کے افراد بہت کم بات چیت کرتے ہیں۔ زیادہ وقت انگلینڈ میں گزارنے کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کی طرح انھیں بھی اپنے ہونٹوں کو جنبش دینے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ بولنے کا کام بھی اکثر آنکھوں سے ہی لیتے ہیں۔

کاکا توا کو بھی کچھ ایسا اندازہ ہوگیا ہے کہ آج وشاکھا کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ نہ تو وہ انھیں بسکٹ کھلا رہی ہے اور نہ انھیں پیار کررہی ہے۔ یقیناً اسے اپنے میکے کی یاد ستارہی ہے جب یہاں ٹھنڈ بڑھ جاتی ہے، تو انھیں بھی اپنے وطن کے گرم نم جنگلوں کی یاد ستاتی ہے۔ وہ بے چین ہوکر اپنے پنکھ پھڑ پھڑاتے ہوئے فلیٹ میں یہاں سے وہاں کے چکر لگاتے ہیں۔ اس گھر سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ بند کھڑکیوں کے شیشوں پر اپنی چونچ سے حملہ کرتے ہیں اور تھک ہار کر اپنے آہنی جھولے پر لوٹ آتے ہیں۔

کھٹ سے دروازہ بند ہونے کی آواز پر وشاکھا چونک جاتی ہے۔ اس کے ساس سسر چہل قدمی کے لیے گھر سے باہر گئے ہیں۔ اب رات کو آٹھ بجے کھانے کی گھنٹی سے پہلے کوئی کام نہیں ہے۔ اس کا اب اکیلے گھر سے باہر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ گھنٹے دو گھنٹے کسی کتاب کا مطالعہ کرے۔

وہ اٹھ کر جینت کی اسٹڈی میں آتی ہے اور حال ہی میں اس کی خریدی ہوئی کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگتی ہے۔ جینت لندن میں فری لانس جرنلسٹ تھا، یہاں بھی ہے۔ حاصل ہونے والی آمدنی سے اس کا شراب و سگریٹ وغیرہ کا خرچ نکل جاتا ہے۔ اسے اپنے اخراجات کے لیے اپنے والدین کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑتا۔ ساس سسر کی تو خواہش تھی کہ وہ بھی ان کی طرح مشہور جاپانی کمپیوٹر انجینئر بن کر کوئی بڑی انڈسٹری لگاتا لیکن وہ تعلیم میں ڈراپ آؤٹ ثابت ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں چلا کر کوئی کام کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

جینت پر رنگین میں اس نے لال گھوں سے بھری ہوئی ہے۔ چانے کا خال کب تک ... [illegible]

یہ بھی عقل کی باتیں کرتا ہے۔ جینت انگریزی ٹیوشن کو دیر سے گھر لوٹتا ہے۔ وشاکھا کو مضطرب کرنے کے لیے جان بوجھ
ہوتا ہے۔ کمرے کے اندر فوٹو بک یا اپنی البم دیکھتی ہی چلی جاتی ہے۔ جینت کی بات یہ ہی تھی کہ ماں کیا ہے بچہ بیوقوف کرانے
والی ہے۔ [illegible] کی زندگی میں شک ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔
وشاکھا سوچ رہی تھی کہ کاش اللہ جینت کو یہ احساس دلا سکتی کہ زندگی صرف سیر سپاٹے کا نام نہیں [illegible]
بلکہ ایک ذمہ داری کا نام بھی ہے۔ اپنے بچپن میں ماں جی اپنے ابا جی کے بارے میں بھی [illegible] لیکن وہ جانتی تھی
جس میں اتنی صلاحیت ہے، قوت ہے۔ جینت کی باتیں تو ہمیشہ آسمان کو چھوتی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی اڑان کے پاؤں
نہیں ہوتے۔ والدین شب بھی اس پر اپنی چاہتیں رکھے ہوئے ہیں۔

[illegible] کے گلاس کے ساتھ کتاب پڑھتی ہوئی وشاکھا کو نہ جانے کس وقت نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ آدھی رات
میں کالا کوا کی چیخ و پکار نے اسے جگا دیا ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اپنے پہلو میں جینت کی موجودگی کا احساس کرنا چاہتی ہے
[illegible] بھی خالی ہے۔

[illegible] کمرہ [illegible] بستر میں جاکر سو گئی ہے۔ جینت لباس تبدیل کیے بغیر بستر میں اوندھا پڑا ہے۔ ایش ٹرے میں
سگریٹ جل کر راکھ ہو گئی ہے۔ تپائی پر وسکی کا خالی گلاس پڑا ہے۔

بالکنی میں پھولوں کا [illegible] ختم گیا ہے۔ وشاکھا کا من سلگنے لگا ہے کیوں نہ وہ سامنے رکھا کرکٹ بیٹ اٹھا کر اس گھر
کی سب ہی کھڑکیوں کو توڑ ڈالے؟ ان کالا کوا کو کھڑکی سے باہر اڑا دے۔ [illegible] اس سرد ماحول میں اب زیادہ دیر رہے
تو یہ بھی [illegible] ہو جائیں گے۔

oo ooo oo

سلطانہ شرف الدین

[illegible]

بچوں کا بوجھ

[illegible]

[illegible] کے [illegible] جاتے [illegible]

[illegible] کسی [illegible] اور [illegible]

[illegible] بہر حال۔ اس مجبوری سے [illegible] کر دیکھنے کے باوجود یقین کرنے کو دل [illegible]

[illegible] محروم ہو گیا [illegible] روشنیاں [illegible] لگے [illegible] کی مسلسل [illegible]

[illegible] بھی [illegible] کی وسعتوں میں [illegible] محسوس ہوتا [illegible] بچے [illegible]

[illegible] ہو گیا۔ [illegible] سب [illegible] تھے

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہو گیا [illegible] ایک [illegible] روشنی [illegible] گئی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ایک [illegible] بتانے [illegible]
کے [illegible] پودے [illegible] پر رخصت [illegible] ۔ بہت لگے کی یہ [illegible] آنکھوں کو [illegible]
[illegible] معلوم ہوتا ہے پاکستان ہی [illegible] کی ہو۔ [illegible]
[illegible] بھی [illegible] ۔

[illegible] پہنچتیاں بجا اٹھتیں۔ رات بھیگنے تک دیکتی رہتیں۔ اعلا۔ ایک دو کہانی اور گیت کی موڑ سکتی۔ [illegible] کی گری اور خاموش راتوں میں گلاسوں اور پیالیوں کی کھنک بھی سنائی دے جاتی۔ پاس سے [illegible] تک [illegible] رات تک جاگتی رہتی۔

چوکیدار [illegible] خراٹوں [illegible] چکا تھا۔ لباس کے گنداپن میں بھی فرق آچکا تھا۔ چوکیداری سے مسافروں کی خیر خبری پر اتر [illegible] جاتے۔ اس کی جھلک دکھائی دے جاتی۔ نہ جانے وہ کس کام میں لگا رہتا۔

اس محلے کی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی کسی سے میل ملاپ کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ سب اپنے ہی جھگڑوں میں لگے [illegible] کی قربت ستا اور نہ خوشی کا احساس کرتا۔ گزرتی کاروں سے خیر مقدم کے طور پر ہاتھ ضرور ہلتے دکھائی دیتے۔ ان کے لوگ صرف ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کے برتاؤ میں مغربی ملکوں جیسا انداز جھلکتا تھا۔

[illegible] کی روشنیاں وہاں نظر نواز ہو چلی تھیں۔ اس طرف سے گزرتے لوگ توجہ سے دیکھنے لگے تھے۔ [illegible] تھی [illegible] کا دن تھا۔ میں اپنی فرصت سے پڑوسیوں کے ساتھ بانٹنے پر تلی ہوئی تھی۔ تجسس سنک اٹھا تھا [illegible] دیکھنے اور ملنے کے لیے مچل رہی تھی۔ سوچا چلو کال کر لیں۔ مل آئیں۔ دیکھیں کون لوگ ہیں۔ آخر اس کوٹھی کو [illegible] کر رکھا ہے۔ بچپن جیسی سیمابی مخلوق کیوں نہیں دکھائی دیتی آخر میرے قدم پر اسرار رونقوں کی کھوج میں نکل پڑے۔ [illegible] سے [illegible] پودے۔ قوس قزح جیسی قالین۔ گل دان سے بھی سبز۔ پڑوسیوں کی خوش ذوقی کی داد دینی پڑی۔ [illegible] نظر آتی۔ میں ہم سایوں کی نفاست پسندی سے بھی متعارف ہوئی۔ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ [illegible] پھاٹک تک پہنچنے کا ارادہ شاید پڑوسن کو نہ بھایا۔ میں نے بھانپ لیا۔ مگر شوق دید کی تسلی کے لیے [illegible] نظر آئیں [illegible] صاحب [illegible] تھیں۔ بدن کے نقوش کافی نمایاں کر رکھے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے [illegible] کر دے۔ ان کی جوانی ڈھلتی نظر آتی۔ ہاں وہ دبلی پتلی گوری چٹی [illegible] شاید انھیں علم نہ تھا۔ وہ ٹھٹکیں۔ جھجکیں۔ مگر اندر داخل ہو گئیں۔ [illegible] تھے۔ وہ [illegible] پر براجمان ہو گئیں۔

[illegible] تھے۔ [illegible] دھنس [illegible]
[illegible]

جاہے ۔ خود مجھ میں ایک عجیب قسم کا نیا احساس سرایت کرتا جارہا تھا ۔

جس میں اجنبیت ، زبردستی مہمان بن جانے کا خیال ، ایک روحانی چبھن اور ہلکی سی اذیت کا تجربہ شامل تھا ۔ ایسے تکلیف دہ محسوسات کے ساتھ میں سنترے کا شربت پی رہی تھی ۔ ہونٹوں کی خشکی کم ہی نہ ہوئی ۔ شربت کی لذت سے بھی نا آشنا رہی ۔ میرے اندر کوفت اور بیزارگی نا معلوم ذرائع سے داخل ہورہی تھی ۔ مدتوں کی پروردہ شائستگی نہ جانے کہاں چلی گئی ۔ میں نے گلاس کسی قدر زور سے رکھا ۔ بے مروتی سے ایک دم کھڑی ہوگئی ۔ جیسے اہل غرض کا اہم کام نکل چکا ہو ۔ خدا حافظ کہا ۔ زحمت کے لیے معافی مانگی ۔ تکلیف دہ گھٹن کے ساتھ نکل پڑی ۔ چپکے چپکے لڑکھڑاتی ، تھکے قدموں سے چلنے لگی ۔ گھر کی سیڑھیاں پھرتی سے طے کیں ۔ ہانپتی ہوئی دالان میں پہنچی ۔ تازہ اور خوش گوار ہوا میں سانس لی اُفوہ ۔ کتنے سکون کا احساس ہوا ۔ نئے پڑوسیوں کے بارے میں سوچنے کو بھی دل نہ چاہا ۔ شاید ملاقات کی آرزو پوری ہوچکی تھی ۔

ہفتہ عشرہ بھی نہ گزر پایا ، طلوع آفتاب کے فوراً بعد ، پولیس کی جیپ ، قیدیوں کی لاری ، چھاپہ مار جوان آ دھمکے ۔ شریف محلے والوں نے غالباً رپورٹ کردی تھی ۔ وہ سب بغیر اطلاع کے کھنڈر محل پر دھاوا کر بیٹھے ۔ گھر کے اندر بے تحاشا گھس پڑے ۔ ڈراتی ، دھمکاتی ، ڈانٹتی کرخت آوازیں دیر تک سنائی دیتی رہیں اور پھر جیسے بھونچال گزر جانے کا منظر دکھائی دیا ۔

معنی خیز خموشی ، وسیع و عریض کمپاؤنڈ کی بے رونقی ، اجڑے مکان کا ویران انداز ، ٹیڑھی مونچھوں والے چوکیدار کا حیران پریشان ہونق چہرہ ، مدتوں تک بھلایا نہ گیا ۔ برسوں بعد بھی وہ بوجھل لمحے ہم سفر ہوجاتے ہیں ۔ ان موذی لمحوں کا بوجھ آج بھی میری یاد داشت میں جاگزیں ہے ۔ ●● ●●● ●● ●●

(سلسلہ ص ۱۹۱ سے آگے)

"پھر کہاں ہے، تم نے اسے کہیں بھیجا ہے؟"

"ہاں!"

"کہاں؟"

"میں نے اسے آزاد کر دیا ہے!"

"کیا بکتی ہو؟"

"سچ کہہ رہی ہوں۔" گل پری نے کہا ---- "میں نے اس غلام کو آزاد کر دیا ہے، صبح میں ساتھ والی مسجد کے مولوی صاحب کے پاس گئی تھی انھوں نے کہا تمہارا خان کا گناہ اسی صورت میں معاف ہو سکتا ہے اگر وہ ایک غلام آزاد کر دے!"

"بات تیرے کی!" خان نے اپنا ماتھا پیٹ لیا ---- پھر وہ ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے اس کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"چلو اڈے والوں کو میں سمجھا لوں گا" ---- اس نے کہا ---- "تم نے آج ایک نہیں دو غلام آزاد کر دیے ہیں۔"

"وہ حیران تھی، بولی ---- "دوسرا کون؟"

"ایک وہ بڈھا اور ایک یہ ---- تمہارا غلام، چلو اچھا ہوا، جھگڑا ختم ہوا۔ آج ڈاکٹر سے مل کر واپس چلتے ہیں ---- مگر اب تمھیں بھی تو نہیں گاؤں میں رہنا ہوگا۔"

"جیسے تمہاری مرضی خان" ---- اس نے کہا ---- "ایک نہ ایک کو تو غلام رہنا ہی ہے، میں ہی سہی!" ○○○

اداروے کی خبریں

○ جدوجہدِ آزادی میں اردو ادب اور صحافت کا حصہ۔

پچاس سالہ جشنِ آزادیٔ ہند کے سلسلے میں ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد کے زیرِ اہتمام "جدوجہدِ آزادی میں اردو ادب اور صحافت کا حصہ" کے زیرِ عنوان ایک سمینار ۳۱ ر اگسٹ ۱۹۹۷ء کو ساڑھے دس بجے صبح ایوانِ اردو (پنجہ گٹہ) میں منعقد ہوا۔ پروفیسر جعفر نظام (صدرِ ادارہ) نے اجلاس کی صدارت کی۔ پروفیسر افضل محمد (وائس چانسلر ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر یونیورسٹی) نے سمینار کا افتتاح کیا۔

سمینار کے آغاز سے قبل پروفیسر مغنی تبسم (معتمدِ عمومی) نے محترمہ نجمہ نکہت صاحبہ کے سانحہ ارتحال پر قرار دادِ تعزیت پیش کی۔ دو منٹ کی خاموشی کے بعد سمینار کی کارروائی شروع کی گئی۔

پروفیسر جعفر نظام نے مہمانِ خصوصی پروفیسر افضل محمد، مقالہ نگاروں اور سامعین کا خیر مقدم کیا۔

پروفیسر افضل محمد نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ سارے ملک میں ہندوستان کی آزادی کا پچاس سالہ جشن منایا جارہا ہے۔ یہ سمینار بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ جدوجہدِ آزادی میں اردو شاعروں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے ادیبوں اور صحافیوں نے بھی اس جدوجہد میں اپنا حصہ ادا کیا۔ آزادی کے بعد ان پچاس برسوں میں ہمارے ملک نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ سائنسی میدان میں ہندستان کی ترقی کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ جن ممالک نے اہم خلائی تجربے کیے ہیں ان میں ہندستان کا چھٹا نمبر ہے۔ ٹکنالوجی میں ہم نے غیر معمولی ترقی کی۔ زرعی پیداوار میں ہم خود مکتفی ہوگئے ہیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان ترقیات کی جھلک ہمارے ادب میں بہت کم نظر آتی ہے۔ ہمارے ادیبوں کو چاہیے کہ اس طرح توجہ دیں اور مضامین قلمبند کریں۔ صحافت کا بھی ادب سے گہرا رشتہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ آزادی اور ادب کے مسائل پر بڑے پیمانے پر سہ روزہ سمینار منعقد کیا جانا چاہیے۔

محترمہ صائمہ بیگ نے صدر اور مہمانِ خصوصی کو گل دستے پیش کیے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے "جدوجہدِ آزادی میں اردو شاعروں اور ادیبوں کا عملی حصہ" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے ہی نہیں بلکہ عملاً بھی آزادی کی جدوجہد میں سرگرم حصہ لیا۔ انگریز حکومت کے عتاب کا شکار ہوئے اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ مقالہ نگار نے نہایت تفصیل کے ساتھ بہادر شاہ ظفر، مرزا محمد باقر، محمد حسین آزاد، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، پریم چند، اقبال، مولانا آزاد، مولانا محمد علی، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، علی جواد زیدی، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، اختر حسن اور کئی دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی۔

پروفیسر یوسف سرمست کے مقالے کا موضوع تھا "اردو ناول اور جدوجہدِ آزادی"۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد نے اگرچہ انگریزی حکومت کے خلاف کوئی بات نہیں کی لیکن انھوں نے انگریزی تہذیب اور مغربی طرزِ زندگی کو اپنانے کی سخت مخالفت کی۔۔۔ منشی سجاد حسین پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے انگریزی حکومت اور انگریزوں کو طنز کا ہدف بنایا۔ عبدالحلیم شرر، محمد علی طبیب، راشد الخیری اور دوسرے تاریخی ناول نگاروں نے ماضی کی بازیافت کرتے ہوئے قوم کو احساسِ کم تری سے نکالا۔ بیسوی صدی

کے ربع اول میں پریم چند نے اپنے ناولوں میں جدوجہدِ آزادی کو بھرپور طریقے سے پیش کیا ۔ اس اعتبار سے ان کے ناول گوشۂ عافیت ، چوگانِ ہستی اور میدانِ عمل اہمیت رکھتے ہیں ۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر جو ناول لکھے گئے ان میں اس دور کے سیاسی حالات کی عکاسی ملتی ہے ۔ پروفیسر سرمت نے ابراہیم جلیس کے ناول " چور بازار " ، عزیز احمد کے ناول " آگ " ، حیات اللہ انصاری کے ناول " لہو کے پھول " ، خدیجہ مستور کے ناول " آنگن " اور خواجہ احمد عباس کے ناولوں کے حوالے سے بتایا کہ اردو ناول نہ صرف جدوجہدِ آزادی کی تصویر پیش کرتے ہیں بلکہ اس کو آگے بڑھانے میں بھی اس نے اہم حصہ لیا ہے ۔

ڈاکٹر بیگ احساس نے " جذبہ ، حب الوطنی اور اردو افسانہ " کے عنوان سے مقالہ پیش کیا ۔ اس ضمن میں انھوں نے پریم چند کے افسانوں کا تفصیل سے جائزہ لیا اور بتایا کہ ان کی کہانیوں کے پہلے مجموعے " سوزِ وطن " کی اشاعت پر وہ حکومت کے عتاب کا شکار ہوئے ۔ اس مجموعے کی ساری کاپیاں نذرِ آتش کردی گئیں ۔ اس مجموعے کے علاوہ پریم چند کے بیش تر افسانوں میں کسی نہ کسی صورت میں جذبہ ، حب الوطنی ملتا ہے ۔ ڈاکٹر بیگ احساس نے بتایا کہ انگارے اور کفن کی اشاعت کے بعد اردو افسانے میں ایک انقلاب آیا ۔ اس دور کے افسانے انگریزوں کے خلاف نفرت جگانے میں کامیاب رول ادا کرتے ہیں ۔ انھوں نے قحطِ بنگال اور تقسیمِ ہند کے فسادات پر لکھے گئے افسانوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اردو افسانے نے حب الوطنی کے جذبے کو جگانے اور جدوجہدِ آزادی کی لے تیز کرنے میں موثر رول ادا کیا ۔

پروفیسر اشرف رفیع نے اردو شاعری اور جدوجہدِ آزادی پر مقالہ پیش کیا ۔ انھوں نے کہا کہ ہر دور میں اردو شاعروں نے اپنے عہد کی نہ صرف عکاسی اور ترجمانی کی ہے بلکہ استحصالی قوتوں کو تنقید کا ہدف بھی بنایا ہے ۔ انگریزوں نے جب سے ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھا اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ان کی مخالفت کی ۔ پہلی جنگِ آزادی پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے ۔ ہندستانیوں میں حب الوطنی کے جذبات کو ابھارنے میں ابتداءً حالی ، آزاد اور شبلی جیسے شعرا کا حصہ رہا ہے ۔ آگے چل کر ہمارے شاعروں نے سیاسی شعور کو بیدار کر کے آزادیِ وطن کے تصور کو عام کیا ۔ ان میں سرور جہاں آبادی ، اکبر الہ آبادی ، چکبست ، ظفر علی خاں ، حسرت موہانی ، اقبال اور جوش قابلِ ذکر ہیں ۔ پروفیسر اشرف رفیع نے جدوجہدِ آزادی میں ترقی پسند شعرا کی خدمات کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا جنھوں نے قوم کے نوجوانوں کو انقلاب برپا کرنے پر مائل کیا ۔ اس سلسلے میں انھوں نے مخدوم محی الدین ، جاں نثار اختر اور مجاز کے کلام سے اقتباسات پیش کیے ۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ ایک بہترین مستقبل کی تعمیر کی کوشش کا تسلسل ہمارے شعری سرمائے میں نظر آتا ہے جس سے ۱۹۴۷ء کے بعد کا ادب بھی خالی نہیں ہے ۔

ڈاکٹر محمد انور الدین نے اپنے مقالے میں بتایا کہ ہندستان کی جدوجہدِ آزادی میں اردو صحافت کا اہم رول رہا ہے ۔ مولوی محمد باقر پہلے صحافی تھے جنھوں نے پہلی جنگِ آزادی کے دوران اپنے اخبار (دہلی اردو اخبار) میں انگریزوں کے خلاف مضامین لکھے ۔ وہ شاہ ظفر کے مشیروں میں شامل تھے ۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد انھیں گرفتار کر کے شہید کر دیا گیا ۔ انھیں کے معاصر سید جمیل الدین خاں صادق الاخبار کے مدیر تھے انھوں نے بھی جراءت کے ساتھ انقلابیوں کی تائید کی جس کی پاداش میں انھیں تین سال قید کی سزا دی گئی اور ان کی جائداد قرق کرلی گئی ۔ اور بھی کئی اردو اخبارات نے پہلی جنگِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا ۔ ۱۸۵۷ء بعد اردو صحافت کا نیا دور شروع ہوا ۔ آزادیِ وطن کی جدوجہد کے ہر موڑ پر صحیفہ نگاروں نے سیاسی شعور کو بیدار کرتے ہوئے انقلاب کی راہ ہموار کی ۔

ڈاکٹر محمد انور الدین نے اپنے مقالے میں تہذیب الاخلاق ، اودھ پنچ ، اردوئے معلیٰ ، زمین دار ، ہم درد ، کامریڈ ، الہلال ، البلاغ دیگر اخباروں اور رسالوں کی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا ۔

آخر میں سمینار کے صدر پروفیسر جعفر نظام نے تمام مقالوں پر اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہر مقالہ نگار نے اپنے موضوع ساتھ انصاف کیا ہے ۔ ان مقالوں کو ماہ نامہ سب رس کی خصوصی اشاعت میں شامل کیا جانا چاہیے ۔

پروفیسر مغنی تبسم کے شکریے پر یہ سمینار اختتام کو پہنچا ۔

OOO

ادارہ ، ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام ڈپارٹمنٹ آف کلچر حکومت آندھرا پردیش کے تعاون سے پچاس سالہ جشنِ آزادیِ ہند . سلسلے میں بہ تاریخ ۳۱ / اگست ۱۹۹۰ء ساڑھے آٹھ بجے شب رویندرا بھارتی میں " شامِ غزل " کا پروگرام پیش کیا گیا جس میں فائن آرٹ اکیڈیمی کے فن کاروں خان اطہر ، رکن الدین ، ریاض احمد اور گائتری راؤ کے علاوہ نیرجا گیری اور عظیم شیخ نے شعراء دکن محمد قلی قطب ش ولی اورنگ آبادی ، صفی اورنگ آبادی ، مخدوم محی الدین ، سکندر علی وجد ، صاحب زادہ محمد علی خاں میکش ، شاہد صدیقی ، سعید شہیدی علی احمد جلیلی کے علاوہ حیدرآباد کے بیرونی شعرا داغ دہلوی ، فصاحت جنگ جلیل اور فانی بدایونی کا کلام ساز پر پیش کیا ۔

عزت مآب جناب بشیر الدین بابو خاں (وزیرِ بھاری مصنوعات) حکومت آندھرا پردیش) جن کی خصوصی دل چسپی کی وجہ سے محفل آراستہ کی گئی تھی ، بہ طور مہمانِ خصوصی شرکت کی ۔ آغاز میں پروفیسر جعفر نظام نے مہمانِ خصوصی کا خیر مقدم کیا ۔ ڈاکٹر آنند ر ورما نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور اپنی کامنٹری سے پروگرام کی دل کشی میں اضافہ کیا ۔

OOO

○ عورت ، مذہب اور سیاست :

" شعبہ ، خواتین " ادارہ ، ادبیاتِ اردو کا خصوصی ادبی اجلاس ۱۴ / ستمبر ۱۹۹۰ء ساڑھے دس بجے دن ، ایوانِ اردو ، پنجہ گٹہ ، ہندوپاک کی نامور ادیبہ محترمہ جیلانی بانو کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں عصرِ حاضر میں عورت کی مذہبی اور سیاسی ذمہ داریو پر مباحثہ ہوا ۔ محترمہ نسیمہ تراب الحسن نے " اسلام میں عورت کے حقوق اور ذمہ داریاں " محترمہ جمیلہ نشاط نے " مسلم پرسنل لا عورت کے حقوق " اور محترمہ جیلانی بانو صاحبہ " عورت ، مذہب اور سیاست " پر مقالے پیش کیے جس پر تنظیم نسواں کے اراکین محترمہ کلپنا کنابیرن (صدر اسمیتا ، حیدرآباد) محترمہ ریتو مینن (صدر کالی ۔ دہلی) محترمہ میرا دیلا یودھن (پانڈیچری) محترمہ اوما چکرورتی (پروفیسر تا جواہر لال نہرو یونیورسٹی ۔ دہلی) اور محترمہ آنندی (مدراس) نے بات کی ۔ اجلاس کی کاروائی محترمہ قمر جمالی نے چلائی ۔

ابتدا میں ڈاکٹر اشرف رفیع جنرل سکریٹری شعبہ ، خواتین نے محترمہ نجمہ نکہت سابق صدر انجمن ترقی پسند مصنفین اور مدیر تحریساً رحلت پر قرار داد پیش کی اور دعاءِ مغفرت کے لیے دو منٹ کی خاموشی منائی گئی ۔ بعد ازاں اجلاس کی کاروائی کا آغاز ہوا ۔

محترمہ قمر جمالی نے اس خصوصی اجلاس کے انعقاد کا مقصد بیان کیا اور کہا کہ " شعبہ ، خواتین " ۴ نومبر ۱۹۴۳ء کو قائم کیا گیا جس کے اغراض و مقاصد میں صرف ادب برائے ادب کو پروان چڑھانا ہی نہیں تھا بلکہ ادب کو حقیقی زندگی سے مربوط کرنا تھا ۔ لہذا محتر طیبہ بیگم ، محترمہ سکینہ بیگم اور محترمہ صغرا ہمایوں مرزا جیسی جید عالم اور سماجی مصلحین اس شعبے سے وابستہ رہے ۔ ابتدائی بیس پچیس سال

تک یہ شعبہ پورے انہماک کے ساتھ چلتا رہا مگر چند سال بعد تعطل کا شکار ہوگیا ۔ بعد ازاں نومبر ۱۹۹۲ء میں اس شعبے کا احیا کیا گیا ۔ تنظیمِ جدید کے بعد سے یہ شعبہ پھر سے فعال ہے اور اس کوشش میں لگا ہے کہ خواتین کو ادبی اور ذہنی طور پر باشعور بنائے ۔ آج جب عورت اخبار کی سرخیوں میں آنے لگی ہے اور مختلف سیاسی سماجی حلقوں میں موضوعِ بحث ہے دیکھنا یہ ہے کہ خود وہ کیا محسوس کرتی ہے ۔

سب سے پہلے محترمہ نسیمہ تراب الحسن نے مذہبِ اسلام اور قرآنِ حکیم کی روشنی میں عورت کے حقوق اور اس کی ذمہ داریوں پر ایک مبسوط مقالہ پیش کیا ۔ انھوں نے مختلف احادیث کی روشنی میں اپنے نظریے کو مدلل کیا اور یہ ثابت کیا کہ اسلام نے عورت کو وہ سارے حقوق پہلے ہی سے دے رکھے ہیں جن کی وہ آج مانگ کر رہی ہے ۔ عوت ہمیشہ سے معتبر اور محبت کی جانے والی شخصیت رہی ہے ۔ انھوں نے کہا کہ جو حقوق پہلے ہی سے اس کے پاس ہیں ان کا مانگنا کیسا ۔ ضرورت صرف محسوس کرنے کی ہے ۔

محترمہ جمیلہ نشاط نے مسلم پرسنل لا کی روشنی میں اپنی بات کا آغاز کیا اور مختلف اکادین اور دانشوروں کے انٹرویوز اور ان کے نظریات کی روشنی میں استدلال پیش کیے ۔ ان کا مقالہ (۵) عنوانات کے تحت درجہ بند کیا گیا تھا جن میں شادی ، طلاق ، نان نفقہ ، وراثت اور کثرتِ ازدواج شامل تھے ۔ محترمہ جمیلہ نشاط کا یہ مقالہ نہ صرف ان کی محنت کا ثبوت دیتا تھا بلکہ اپنے مقصد کے تحت ان کی دیانت داری کا بھی آئینہ دار تھا ۔ انھوں نے ان مسائل پر قلم اٹھایا جن پر الگ سے بحث کی گنجائش تھی اور ایک نشست کی ضرورت محسوس ہوتی تھی ۔

محترمہ کلپانا کنابیرن نے ہندستان کے مختلف علاقوں سے آئی ہوئی مندوبین کا تعارف کروایا اور کہا کہ ہندستان میں ایسے کئی غیر سرکاری ادارے سرگرمِ عمل ہیں جو مسلسل کوشش میں لگے ہیں کہ عورت کو اس کی طاقت کا احساس دلائیں اور اسے ذہنی اور اخلاقی طور پر اس قابل بنائیں کہ وہ اپنی لڑائی آپ لڑسکیں ۔ محترمہ میرا ویلا یودھن نے کیرل کی دلت عورتوں کے مسائل پر بات کی ۔ محترمہ اوما چکر ورتی نے کہا کہ وہ تیس سال سے تاریخ پڑھا رہی ہیں ۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اگر چہ ایسے کئی واقعات ملتے ہی جہاں عورتوں نے مردوں سے زیادہ دلیری کے کارنامے انجام دیے ہیں پھر بھی مورخ انھیں نظر انداز کرتے رہے ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ان بہادر عورتوں کی تاریخ رتب کرنے کی ضرورت ہے ۔ محترمہ آنندی نے مدراس میں عورتوں کے موقف پر اظہارِ خیال کیا ۔ پروفیسر مغنی تبسم سابق صدر شعبہ ، اردو عثمانیہ یونیورسٹی اور جنرل سکریٹری ادارہ ، ادبیاتِ اردو نے شعبہ ، خواتین کی تاریخ اور اس کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس شعبے کا اصل مقصد ہی عورت کو ذہنی طور پر باشعور کرنا ہے ۔ انھوں نے تیقن دیا کہ ادارہ ہمیشہ اس قسم کے مباحث میں تعاون کرے گا ۔

محترمہ جیلانی بانو صاحبہ نے بڑودہ میں منعقدہ سہ روزہ سمینار میں پیش کیا گیا اپنا مقالہ پڑھا اور کئی سوالات اٹھائے کہ اسلام کی بعض پابندیوں کو صرف خواتین پر لاگو کرنا دراصل اسلام کو صحیح معنوں میں نہ سمجھنا ہے ۔ انھوں نے اجلاس میں پیش کیے گئے تمام مقالوں کو درست اور بہترین کوشش قرار دیا ۔

آخر میں جنرل سکریٹری شعبہ ، خواتین پروفیسر اشرف رفیع (صدر شعبہ ، اردو عثمانیہ یونیورسٹی) کے شکریے پر یہ کامیاب اجلاس اختتام کو پہنچا ۔

ooo

○ ادارے کا معائنہ :

○ ۲۵ / فروری ۱۹۹۶ء کو THE INDIAN DOWN UNDER NEWSPAPER کی ایڈیٹر اور پبلشر نے جو آسٹریلیا حیدرآباد آئی ہوئی تھیں ادارہ ۔ ادبیاتِ اردو کا معائنہ کیا اور اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلم بند کیے :

IT IS AN HONOUR TO GO THROUGH SUCH A TREASURE HOUSE OF URDU. IDARA - E - ADABIYAT IS KEEPING A VERY FINE LANGUAGE ALIVE. THE MANUSCRIPTS, NEWSPAPERS OF YESTERYEARS, BOOKS, MAGAZINES — IT IS A MUST FOR A URDU LOVERS, VERY VERY INSPIRATIONAL !

○ اردو کے ممتاز جدید شاعر جناب عین رشید ڈائرکٹر جنرل آف پولس کلکتہ ۔ محکمہ ۔ پولس کے سمینار میں شرکت کی غرض حیدرآباد آئے تھے ۔ اپنے مختصر سے قیام میں انھوں نے ادارہ ۔ ادبیاتِ اردو کے لیے وقت نکالا اور ۱۳ جولائی ۱۹۹۶ء کو ایوانِ اردو آئے انھوں نے ادارے کے مختلف شعبوں کا تفصیل سے معائنہ کیا اور اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا :

" مختصر سا یہ سفر صدیوں کا سفر لگا ۔ تاریخ کے کتنے جانے ان جانے نکات کی طرف ذہن جاتا ہے ۔ ایک زبردست ذخیرہ جس کے کسی ایک شعبے میں جانے میں سال ہا سال لگ جائیں ۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان نوادرات کو COMPUTRISED شکل میں محفوظ کیا جائے ۔ PERIOD کے طالبِ علموں کے لیے یہ ادارہ بہت سارے دروازے کھول سکتا ہے ۔ دوسرے اداروں کی طرح اب اس ادارے کو بھی MEDI FOCUS میں لانے کی ضرورت ہے ۔ اس سلسلے میں تھوڑی سی کوشش میں بھی کروں گا ۔ مغنی تبسم صاحب اور ان کے ساتھیوں کی لگن ہر گوشے میں واضح ہے ۔ مجھے اس ادارے کے در تک لانے کے لیے میں تہہِ دل سے ان کا شکر گزار ہوں ۔ اور یہ دن میری زندگی کا تاریخی دن ہے ۔ MUSUEM ہونے کے باوجود آج کی زندگی جڑے سلسلے بار بار یہاں آنے پر مجبور کریں گے ۔ "

○ پروفیسر نثار احمد فاروقی یوں تو اکثر حیدرآباد آیا کرتے ہیں ۔ ۱۰ جولائی ۱۹۹۶ء کو اچانک انھیں ادارے کی یاد آئی ۔ ادارے میں پھر کر مختلف شعبوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا ۔ اپنے تاثرات ان الفاظ میں تحریر کیے :

" ادارہ ۔ ادبیاتِ اردو میرے لیے کوئی نئی اور غیر مانوس جگہ نہیں ہے ۔ ڈاکٹر زور مرحوم کی حیات میں یہاں ہر بار آنا ہوتا تھا ۔ ان کے انتقال کے بعد صرف ایک بار یہاں آیا تھا اور ادارے کی حالتِ زار دیکھ کر بہت رنجیدہ و دل شکستہ ہوا تھا ۔ اب تقریباً ۱۵ یا ۲۰ سال بعد یہاں آیا تو اس ادارے میں حیاتِ تازہ کے آثار آنکھوں سے دیکھے ۔ یہ سب پروفیسر مغنی تبسم صاحب کی مسلسل نگرانی ۔ دل چسپی اور ان کی صلاحیت اور ذوق کی بہ دولت ممکن ہوسکا ۔ مجھے امید نہیں یقین ہے کہ اب یہ ادارہ شاہ راہِ ترقی پر چلتا رہے گا اور اس کے قیام کا جو مقصد تھا وہ پورا ہوگا ۔

میری نیک خواہشات ۔ دعائیں اور ادارے کے سربراہوں کو دلی مبارک باد ۔ "

○ ماہِ اگست میں اردو کے ممتاز شاعر ، حمایت علی شاعر آزادیِ ہند کی پچاس سالہ تقاریب میں شرکت کے لیے اپنی دختر ڈاکٹر زرافشاں سید کے ساتھ چند روز کے لیے پاکستان سے حیدرآباد آئے تھے ۔ حمایت علی شاعر صاحب کا تعلق اورنگ آباد سے ہے جو قدیم ریاست حیدرآباد کا ایک صوبہ تھا ۔ وہ حیدرآباد ریڈیو سے وابستہ تھے ۔ پاکستان جانے سے قبل ان کا قیام شہر حیدرآباد میں رہا ۔ وہ اور ان کی صاحب زادی ادارہ آئیں اور چند گھنٹے یہاں گزارے ۔ ادارے کو تفصیل سے دیکھا اور اپنے گراں قدر تاثرات کا اظہار کیا :

" ادارہ ، ادبیاتِ اردو میں آنے کی سعادت مجھے پہلے بھی حاصل ہوتی تھی مگر اس بار آکر یوں خوشی ہوئی کہ اس بار تفصیل سے دیکھا کتب خانہ اور اس کے تمام گوشے ، مخطوطات ، تصاویر ، خطاطی کے فن کارانہ نقوش اور بالخصوص طالبات کی خوش نویسی اور ان کی تعلیم کے انتظامات اور امتحانات کے طریقے مزید برآں اردو تعلیم کے مختلف مدارج ۔ ۔ ۔ سبحان اللہ ، جی خوش ہوگیا اور یہ اندیشہ میرے دل سے نکل گیا کہ " اردو " بھی رفتہ رفتہ " شجرِ ممنوعہ " ہوجائے گی اور فارسی کی طرح اردو بھی کتب خانوں کی الماریوں میں بند ہوجائے گی ۔ ۔ ۔ (اب نہ سہی کم از کم اگلی صدی کے اختتام تک) ۔ ۔ ۔ اردو کی بقا کی حیثیتیں سے معرضِ بحث میں ہے ۔ یہاں بھی ، وہاں بھی ۔ مگر وہاں قومی زبان ہونے کے ناطے پھر بھی کچھ امکانات روشن ہیں ۔ یہاں بھی بعض اسٹیٹ میں " دوسری " سرکاری زبان بن جانے کے سبب مستقبل امید افزا نظر آتا ہے ۔

ادارہ ، ادبیاتِ اردو اس سلسلے میں جو خدمات انجام دے رہا ہے اور اردو کے ورثے کی جس قرینے سے حفاظت کی جارہی ہے وہ قابلِ تعریف ہی نہیں قابلِ رشک ہے اور اس سلسلے میں صدر ادارہ ، ادبیاتِ اردو جناب جعفر نظام صاحب اور ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب کا ہم سب کو شکر گزار اور احسان مند ہونا چاہیے ۔

" سب رس " بھی مجھے پابندی سے ملتا ہے ۔ اس کی معرفت بھی ادارہ ، ادبیات کی کارکردگی کی اطلاع ملتی رہتی ہے ۔ ۔ ۔ اللہ کرے مرحلہ ، شوق نہ ہو طے ۔

میری دعائیں اور نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں ۔ میں ادارہ ، ادبیاتِ اردو کے کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں ۔ "

(حمایت علی شاعر)

" ادارہ ، ادبیاتِ اردو میں آنے کے بعد میری معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوا اور مجھے کئی ایسے پرانے سکے ، کتب ، لباس اور مخطوطات دیکھنا نصیب ہوا جن کے بارے میں میں نے صرف کتابوں میں پڑھا تھا ۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب محسوس کر رہی ہوں کہ مجھے اپنے ماضی کے بارے میں اتنی معلومات حاصل ہوئیں ۔ مزید یہ کہ اس ادارے کو دیکھ کر احساس ہوا کہ ہماری قومی زبان اردو کس قدر مال دار ہے اور اس کی کس خوبی سے حفاظت ہو رہی ہے ۔ میں مغنی تبسم انکل کا بہت شکریہ ادا کرتی ہوں جن کے توسط سے یہ ادارہ دیکھنا نصیب ہوا ۔ "

(ڈاکٹر زرافشاں سید)

○ ٹوکیو یونیورسٹی کے اساتذہ ، اردو نے ایک بڑا پروجیکٹ بنایا جس کے تحت دنیا بھر کے کتب خانوں میں مخزونہ اردو مخطوطات کی فہرستیں یک جا کرنے کا کام سرگرمی سے کیا جارہا ہے ۔ اس کام کے لیے چھٹیوں میں اساتذہ ، اردو مختلف ملکوں کے دورے پر نکل کھڑے ہوتے ۔ پروفیسر اسادا یوتکا حیدرآباد آئے ۔ یہاں کے مختلف کتب خانوں کی چھان بین کی اور مخطوطات کی فہرستیں جمع کیں ۔ اسی سلسلے میں ، ستمبر ۱۹۹۷ء کو ادارہ ، ادبیاتِ اردو بھی تشریف لائے ۔ ادارے کا معائنہ کرنے کے بعد اپنے مختصر تاثرات یوں قلم بند کیے :

" میں ایک پروجیکٹ (اردو مخطوطات کی فہرستوں کی کتابیات) کے تحت حیدرآباد آیا ۔ اس سے پہلے مجھے حیدرآباد آنے کا موقع ملا تھا لیکن یہاں کے لوگوں سے ملاقات کرنے کا اتفاق نہیں ہوا ۔ اس بار حیدرآباد کے مہرباں لوگوں کی رہ نمائی سے ادارہ ، ادبیاتِ اردو حاضر ہوسکا ۔ ڈاکٹر زور صاحب کے قائم کردہ اس مشہور ادارے کو دیکھ کر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی ۔ ٹوکیو میں اپنے بی ۔ اے اور ام ۔ اے کے زمانے میں دکھنیات کے مطالعے کے سلسلے میں زور صاحب کی کتابیں پڑھیں ۔ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں ۔ "

oo ooo oo

نقد و نظر

{ تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں روانہ کی جائیں ۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے }

کتاب کا نام : مرزا غالب مصنفہ : ڈاکٹر نتالیا پری گارِنا / ترجمہ : اسامہ فاروقی تبصرہ نگار : پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

غالب پر اردو میں تو خیر ہندستان کی دیگر اور دنیا کی بیش تر زبانوں میں بھی خاطر خواہ لکھا گیا ہے ۔ روس میں اردو شعر و ادب سے دل چسپی آج سے نہیں زمانہ دراز سے ہے ۔ ترقی پسند تحریک کے باعث یہ دل چسپی اور گہری اور شدید ہوئی ۔ ظ ۔ انصاری اور قمر رئیس جیسے اصحاب نے اس خصوص میں اپنا حصہ ادا کیا ہے ۔ ڈاکٹر نتالیا پری گارِ نا کو اردو شاعری سے غیر معمولی لگاؤ رہا ہے ۔ فارسی پر بھی ان کو قدرت حاصل ہے ۔ اقبال پر ان کی کتابیں " محمد اقبال کی شاعری " اور " کلام اقبال کی شعریات " کہا جاتا ہے کہ اونچے درجے کی حامل ہیں ۔ غالبیات سے بھی ان کی دل چسپی ظاہر ہے کہ ۱۹۸۶ء میں ان کی تصنیف " مرزا غالب " ماسکو سے شائع ہوئی اب جس کا اردو ترجمہ اسامہ فاروقی نے کیا ہے ۔

پروفیسر مغنی تبسم نے گارِ نا کی اس تصنیف کو " غالبیات میں اہم اضافہ قرار دیا ہے (ص ۴) ۔ اسامہ فاروقی نے ایک " معتبر غالب شناس " کی رائے درج کی ہے کہ " اردو والے غالب پر آج تک ایسی کوئی کتاب بہم نہ پہنچا سکے ۔ (ص ۸) ۔ لیکن وہ خود سنبھل کر لکھتے ہیں ۔ " ہوسکتا ہے کہ یہاں مبالغہ کا عنصر بھی شامل ہو ۔ " ہاں ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ : " غیر ملکی اسکالر نے اتنی خوبی سے ہمارے عظیم شاعر کو اپنے ہم وطنوں سے متعارف کرایا ہے ۔ " (ص ۹) اردو میں غالب پر کیا کیفیت اور کیا کمیت ، ہر دو اعتبارات سے بہت زیادہ لکھا گیا ہے کہ دنیا کی اور کسی زبان میں نہ لکھا گیا ہو گا ۔ ایسا ہونا بھی چاہیے ۔ ۔ ۔

ڈاکٹر پری گارِ نا نے بلا شبہ نہایت گہرائی اور گیرائی سے غالب کا مطالعہ کیا ہے ۔ ویسے ان کے ہاں شاعری کے مقابلے میں غالب کی شخصیت کا مطالعہ افزوں ہے اور اس میں سماجی حقیقت نگاری کا عنصر زیادہ ہے جو روسی ادیبوں اور ناقدوں کے ہاں ایک غالب رجحان کی حیثیت رکھتا ہے ۔ گارِ نا نے غالب کی حیات کے کسی دور یا پہلو پر قلم اٹھایا ہو تاریخی اور معاشرتی پس منظر کو تفصیل سے پیش کیا ہے ۔ وہ جہاں تہاں اپنے زاویے سے تجزیہ بھی کرتی جاتی ہیں ۔ انھوں نے اپنی آرا کا وضاحت کے ساتھ اظہار بھی کیا ہے ۔ مثلاً ہم سب جانتے ہیں کہ غالب اپنے آباء و اجداد کے بارے میں کچھ زیادہ ہی کہتے رہے ۔ اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے گارِ نا کا یہ کہنا مناسب ہے کہ " اس کا اعتراف ضروری ہے کہ جب بھی غالب کے اجداد کی عظمت کا ذکر آجاتا ہے اسی طرح کی مبالغہ آرائی سے اکثر سابقہ پڑتا ہے (ص ۲۸) ۔ ایک اور جگہ انھوں نے لکھا ہے : " سچ پوچھیے تو مرزا اسد اللہ خاں اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے صوفی نہیں تھے (ص ۸۰) ۔ ایک اور موقع پر وہ لکھتی ہیں : غالب کا عہد جاگیر دارانہ سماج سے نئے سماج کی طرف سفر کا ایک کرب ناک عبوری دور تھا (۱۴۹) ۔ عبد الصمد ، کوئی شبہ نہیں ایک فرضی کردار ہے ۔ ڈاکٹر گارِ نا نے ہر چند کہ ایسا نہیں لکھا لیکن وہ اس قدر بھرپور شک ظاہر کرتی ہیں کہ اس کردار کو رد کرنے کے برابر ہے ۔ یہی کیا کچھ کم ہے کہ وہ عبد الصمد کو " پراسرار " قرار دیتی ہیں ۔ تاریخی اور معاشرتی پس منظر کے بارے میں ایک

بات عرض کروں گا کہ گلزِ نا نے کہیں کہیں بہت زیادہ تفصیل سے کام لیا ہے جو غالب کے سلسلے میں اور خصوصاً اردو والوں کے لیے تو غیر ضروری ہی معلوم ہوتا ہے ہاں اس سے ہندستان کے بارے میں اہلِ روس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہو یہ علاحدہ بات ہے ۔ مثلاً آگرہ کے سلسلے میں ہولی وغیرہ کا تذکرہ (قطع نظر اس کے یہ بات اپنی جگہ ہے کہ آگرہ ، غالب کی شخصیت اور شاعری پر ایسا اثر انداز نہیں ہوا) اسی طرح غالب کی شاعری کے تعلق سے سبکِ ہندی ، کی بحث ، منصور کے نعرہ ، اناالحق پر گفتگو ، قلمی نسخوں کی ترتیب و تزئین اور فریزر کے قتل کے باب میں تفصیل و نیز تصوف کے بعض موضوعات پر کچھ طویل ہی اظہارِ خیال ۔ ۔ ۔ ان سے دامن بچانے کی گنجائش تھی ۔

غالب کی شاعری پر تحریر کرتے ہوئے گلزِ نا نے توضیح و تشریح سے زیادہ کام لیا ہے ۔ جیسا کہ " پنج آہنگ " کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے اور پھر جہاں وہ ناصر علی ، غنی کاشمیری اور بیدل وغیرہ سے غالب کا تقابلی مطالعہ کرتی ہیں فارسی شعروادب پر بھی ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اسی طرح فسانہ ، عجائب " اور میر ، داغ اور ناسخ کے حوالے انھوں نے خوبی سے دیے ہیں ۔ ڈاکٹر گلزِ نا نے نہ صرف خطوطِ غالب کا تفصیل اور اہتمام سے مطالعہ کیا ہے بلکہ اردو ، فارسی انگریزی حتیٰ کہ اطالوی میں غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بڑی حد تک ان کے زیرِ مطالعہ رہا ہے چناں چہ تا ۔ انصاری ، خورشید الاسلام ، مالک رام ، وارث کرمانی ، یوسف حسین خاں ، فیاض محمود ، انا ماریا شمل ، شیخ محمد اکرم ، پروفیسر مجمدار ، رالف رسل اور باؤسانی وغیرہ کے حوالوں اور اقتباسات سے انھوں نے روشنی حاصل کی ہے ، اپنی کتاب کو وقیع اور جامع بنادیا ہے ۔

ڈاکٹر گلزِ نا سے چھوٹی موٹی باتوں میں کہیں چوک بھی ہوگئی ہے مثلاً انھوں نے غالب انسٹی ٹیوٹ " کو " سرکاری انسٹی ٹیوٹ " قرار دیا ہے جب کہ یہ سرکاری ادارہ نہیں ۔

مجموعی طور پر " مرزا غالب " ایک لائق مطالعہ کتاب ہے ۔ اس زاویہ سے بھی کہ یوں ہم اہلِ روس کے تنقیدی زاویہ کو سمجھ سکتے ہیں ۔ ڈاکٹر گلزِ نا کو اس کتاب کی تحریر کے لیے جو محنت اور توجہ دینی پڑی ہوگی اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں ۔ انھوں نے ہمارے اس عظیم شاعر کو روسی عوام سے روشناس کرایا ہے اردو والے ان کے سدا شکر گزار رہیں گے ۔

مترجم کے بارے میں کیا کہا جائے بہت کم موقع پر احساس ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے ۔ سلیس اور رواں دواں انداز ، اسامہ فاروقی کی اردو اور روسی دونوں زبانوں پر قدرت کا اظہار ہوتا ہے اس کے لیے اردو والے ہی نہیں اہلِ روس بھی ان کے شکر گزار ہوں گے ہاں چند ایک جگہوں پر بات کھٹکتی ہے ۔ میں ایک چیز کی طرف تو توجہ ضرور دلاؤں گا ۔ روسی زبان کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن (ص ۱۲۸) پر اسامہ فاروقی نے جو " ادبی سازباز " لکھا ہے وہ محلِ نظر ہے ۔ یہاں ادبی میدان یا ادبی شعبہ کا مفہوم ہے ۔ بہرکیف ڈاکٹر گلزِ نا اور اسامہ فاروقی اس کتاب کی بالترتیب تصنیف و ترجمہ کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں ۔ " ادارہ ، ادبیاتِ اردو ، حیدرآباد " نے غیر معمولی دل کش انداز میں شائع کیا ہے ۔

○ ۱/۸ ڈیمائی سائز ○ مجلد ○ خوب صورت گردپوش ○ صفحات ، ۳۵۱ ○ ناشر ، ادارہ ، ادبیاتِ اردو ، حیدرآباد ۔

کتاب کا نام ، شیخ العالم ، حیات اور شاعری مصنف ، پروفیسر حامدی کاشمیری تبصرہ نگار ، پروفیسر مغنی تبسم

مشہور کشمیری بزرگ حضرت شیخ العالم کشمیری زبان کے اولین بلند پایہ شعرا میں تھے ۔ پروفیسر حامدی کاشمیری نے ان بزرگ کے

سوانح مستند مآخذ سے یک جا کر کے ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں اردو کے استاد رہے • وہ صدر شعبہ • اردو • ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور وائس چانسلر کے گراں قدر عہدے پر فائز رہے ۔ حامدی کاشمیری اردو کے ایک ممتاز شاعر • افسانہ نگار اور نقاد ہیں ۔

حضرت شیخ العالم • شیخ نورالدین نورانی کیموہ موضع کول گام میں ۱۳۷۷ • میں پیدا ہوئے ۔ ان کا اصل نام نندہ • تھا ۔ ان کے والد سلر سنز نے اسلام قبول کرنے کے بعد شیخ سالار الدین نام اختیار کیا تھا ۔ حضرت شیخ نورالدین کو بچپن میں للہ عارفہ نے اپنا دودھ پلایا تھا ۔ وہ بچپن ہی سے عزلت گزیں تھے اور کسی دنیوی کام میں دل چسپی نہیں لیتے تھے ۔ سنِ بلوغ کو پہنچے تو والدین نے ایک دیہاتی لڑکی سے ان کی شادی کردی جس کے بطن سے دو بچے بھی پیدا ہوئے لیکن ان کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔ ایک دن گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے اور ایک غار میں اقامت گزیں ہوکر شب و روز عبادت میں مشغول ہوگئے ۔ اسی عالم میں ۱۲ سال گزر گئے ۔ امیر کبیر سید میر علی ہمدانی کے فرزند میر محمد ہمدانی اپنے والد کے ایما پر کیموہ گئے اور شیخ نور الدین سے ملاقات کی ۔ شیخ نور الدین نے ان کی بزرگی سے متاثر ہوکر ان کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ اس ملاقات کے بعد رہبانیت ترک کردی ۔ گاؤں گاؤں جاکر لوگوں کو دینِ اسلام اور اپنے صوفیانہ مسلک (ریشی مسلک) کی تعلیم دینے لگے ۔ ہزاروں لوگ ان کے حلقہ • ارادت میں داخل ہوئے ۔ اپنی وفات سے سات برس قبل رویہ دن میں مقیم ہوگئے تھے ۔ ۶۳ برس کی عمر میں انتقال کیا ۔ چرار شریف میں تدفین ہوئی ۔

حضرت شیخ العالم ایک صاحبِ حال صوفی ہونے کے ساتھ بڑے شاعر بھی تھے ۔ ان کا شمار کشمیری زبان کے اولین شعرا میں ہوتا ہے ۔ کشمیری میں للہ عارفہ اور حضرت شیخ العالم سے قبل کسی شاعر کا کلام دستیاب نہیں ہوتا ۔ حضرت شیخ العالم ایک وہبی شاعر تھے ۔ شاعری کو انھوں نے رشد و ہدایت کے علاوہ صوفیانہ واردات اور احوال کے اظہار کا ذریعہ بنایا ۔ خارجی زندگی کے حقائق پر بھی ان کی گہری نظر تھی ۔ ان کا عارفانہ کلام اعلیٰ درجے کی فن کاری اور شعریت کا حامل ہے ۔ انھوں نے جس جس فارم میں شعر کہے اسے شروک کا نام دیا جو عارفہ للہ کے واکھوں کی طرز میں ہیں ۔

پروفیسر حامدی کاشمیری نے گہرائی کے ساتھ ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ۔ یہ جائزہ تجزیاتی اور معروضی ہے ۔ اس مطالعے میں انھوں نے اپنے جذباتِ عقیدت کو کہیں بھی حائل ہونے نہیں دیا ۔ حامدی کاشمیری ایسے ناقد ہیں جو قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں اور غیر محسوس طریقے سے اس کے ذوق کی تربیت کا کام بھی انجام دیتے ہیں اس طرح کہ قاری کو تخلیق سے ذاتی لگاؤ پیدا ہوجاتا ہے اور وہ اس سے جمالیاتی حظ حاصل کرتا ہے ۔ حضرت شیخ العالم کی شاعری پر حامدی کاشمیری کی تنقید اسی نوعیت کی ہے ۔ انھوں نے حضرت شیخ العالم کے کلام کے نمونے پیش کرتے ہوئے اردو نثر میں ان کے ترجمے بھی دیے ہیں ۔ ترجمے میں ظاہر ہے اصل شعر کی خوبی نہیں آسکتی پھر بھی حامدی کاشمیری نے اپنے تجزیوں اور افہام و تفہیم کے ذریعے اس کمی کو دور کرنے کی بڑی حد تک کامیاب کوشش کی ہے ۔

مناسب ہوگا کہ ہم حضرت شیخ العالم کے کلام کے چند ترجموں پر بھی نظر ڈال لیں تاکہ ان کی شاعری کے مبہم سے خط و خال ہی ہمارے سامنے آجائیں ۔

بال بھون کی اس گونگی لڑکی نے
پرندوں کی سیوا کی

وہ پرندوں کے ساتھ اڑ گئی
ہاں گھون کی اس گونگی لڑکی نے
پرندوں کی سیوا کی
وہ پرندوں کے ساتھ اڑ گئی
مجھے شکتی دے مولا
ایک پل میں پانڈوؤں کی ماں تھی
ایک پل میں خالہ کمہارن
شہباز ہو کے گونگا بن گیا
کوئی تجھ سے کچھ چھین کے لے گیا
موت شربت ہے اسے پیے بغیر شفاء نہ پائے
پہلے ہی بات کو کیوں نہ تاڑ گیا
کیسے کیسے جوان ملیا میٹ ہو گئے

○

اگر توحید کو سمجھو گے ، کہیں باقی نہیں رہو گے
وحدانیت نے کتنے جلوے دکھائے
عقل اور فکر کو وہاں کیا سمجھو گے
میرے عزیز ! کون اس دریا کو پی سکا
میں نے لا الہ الا اللہ (اپنے اندر) حلول کیا
اپنے وجود کو وحی بنایا
وجود کو چھوڑ کر موجود کو محسوس کیا
ہر طرف اپنے ہی آپ کو دیکھا
میں نے اسے کھونٹوں اور چھ دیشوں میں ڈھونڈا
کہیں بھی اس کا نام و نشان نہیں ملا
میں نے ملاؤں اور تیہ دیشوں سے پوچھا
وہ سن سن کر روئے

○

آنے والے وقتوں میں ویسے ہی اطوار ہوں گے
ناشپاتی اور سیب خوبانی کے ساتھ پک جائیں گے
ماں بیٹی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نکلیں گی
دن سارا غیروں کے ساتھ گزاریں گی
آسمان تک مکانات تعمیر کریں گے
سور باغ میں ہوں گے ، آہو صحرا میں
باز بند ہوگا ، چیل آزاد
پتھر پانی پر ابھریں گے ، کدو کے خول پانی میں غرق ہوں گے
سور کے سر پر سور کا تاج ہوگا
دریا سوکھ جائیں گے گندے نالے گرجیں گے
اس زمانے میں بندروں کا راج ہوگا ۔

○

○ ۸/۱ ڈیمائی سائز ○ صفحات : ۱۴۰ قیمت : ڈھائی سو روپے ○ ملنے کا پتہ : کمپیوٹر سٹی ، راج باغ ، سری نگر ۔

کتاب کا نام : شہر آشوب ایک تجزیہ	مصنف : ڈاکٹر امیر عارفی	تبصرہ نگار : مغنی تبسم

شہر آشوب ایک تجزیہ ، ڈاکٹر امیر عارفی کا مقالہ ہے جو انھوں نے ۱۹۶۶ء میں ایم ۔ اے (اردو) کے لیے تحریر کیا تھا جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے ۔ اس سے قبل شہرِ آشوب پر ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے مقالے شائع ہوچکے تھے ۔ اس وقت ڈاکٹر نعیم احمد بھی اس پر پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے لیے اسی موضوع پر کام کررہے تھے ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کے مقالے وقیع لیکن مختصر تھے اس لیے اس موضوع پر مزید تحقیق و تنقید کی گنجائش باقی تھی ۔ ڈاکٹر امیر عارفی نے ایم ۔ اے کی ضرورت کی حد تک مقالہ لکھ کر پیش کردیا لیکن بعد میں انھوں نے اپنا تحقیقی کام جاری رکھا اور بہت کچھ اضافوں اور ترمیم کے ساتھ مقالے کو کتاب کی صورت دی ۔ موجودہ صورت میں شہر آشوب پر یہ ایک جامع تصنیف ہے ۔

ابتداء میں ڈاکٹر امیر عارفی نے شہر آشوب کی صنفی خصوصیات کی تفصیل سے وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ شہر آشوب کے تصور میں عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوتی رہیں اور " انیسویں صدی کے آتے آتے شہر آشوب کی تعریف متعین ہوگئی ۔ یعنی شہر آشوب " ایک ایسی صنف نظم قرار دی گئی جس میں کسی شہر کی تباہی و بربادی کے ساتھ ساتھ عوام کی زبوں حالی ، ملک کی معاشی ابتری ، انتشار ، عمارتوں اور شہروں کے مٹنے کے غم کا اظہار کیا گیا ہو ۔ "

ڈاکٹر امیر عارفی نے تین ادوار قائم کر کے ۱۷۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک شہر آشوب کے ارتقاء کا مطالعہ کیا ہے اور ہر عہد میں تبدیلیاں ہوئیں ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔ تاریخی پس منظر کو پیش کرتے ہوئے ہر دور کے سیاسی اور معاشی حالات کا جائزہ بھی

ہے انھوں نے مختلف ادوار کے منتخب شہر آشوبوں پر فکر انگیز تبصرے بھی تحریر کیے ہیں ۔
قبل ازیں ۱۹۶۸ء میں پروفیسر نعیم احمد مرحوم شہر آشوب کا ایک انتخاب مدون کرکے اپنے مختصر مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا ۔ اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں ہر دور کے اہم شہر آشوب یک جا کردیے گئے ہیں اور دل چسپی رکھنے والوں کو شعرا کے دواوین اور کلیات میں اس صنف کے نمونے تلاش کرنے کی زحمت اٹھانی نہیں پڑتی ۔ ڈاکٹر امیر عارفی کا کام مختلف نوعیت کا ہے ۔ یہ اردو شہر آشوب کی مکمل تنقیدی تاریخ ہے ۔ اس کے مطالعے سے شہر آشوب کے ادبی تاریخی اور تہذیبی قدر و قیمت کو جاننے میں مدد ملتی ہے
ڈاکٹر امیر عارفی اردو کے استاد ، سنجیدہ محقق اور نقاد ہیں ۔ شعر گوئی سے لگاؤ بھی رکھتے ہیں ۔ حال ہی میں ان کی چند تصانیف شائع ہوی ہیں ۔ آئندہ ان سے بڑی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں ۔

○ سائز : ۸/۱ ڈیمائی ○ صفحات : ۲۸۸ ○ قیمت : ایک سو پچیس روپے ○ ملنے کا پتہ : مکتبہ ، جامعہ ، اردو بازار ، دہلی ۔

نام کتاب : بے منظری کا منظر نامہ (افسانے)	مصنف : حمید سہروردی	تبصرہ نگار : ڈاکٹر بیگ احساس

" بے منظری کا منظر نامہ " حمید سہروردی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے ۔ اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے " ریت ریت لفظ " اور " عقب کا دروازہ " شائع ہوچکے ہیں ۔ حمید سہروردی ان خوش قسمت فن کاروں میں سے ہیں جنھیں جلد ہی محسوس کرلیا گیا اور نقادوں نے ۱۹۷۰ء کے بعد لکھنے والے فسانہ نگاروں کی جو فہرستیں بنائیں ان میں حمید سہروردی کا نام بھی شامل رہا ۔ افسانے کے تین بڑے سمیناروں " اردو افسانہ روایت و تجزیہ " " ۱۹۷۰ء کے بعد اردو افسانہ " اور " اردو ادب کا بدلتا منظر نامہ ۔ ۔ ۔ مابعد جدیدیت " میں انھیں مدعو کیا گیا ۔ انھیں جدید افسانہ نگار بھی تسلیم کیا گیا اور اب وہ مابعد جدیدیت کے افسانہ نگاروں کے بھی ساتھ ہیں ۔ حالاں کہ حمید سہروردی نے نہ تو ترقی پسند افسانے کے خلاف لکھا اور نہ جدید افسانے کے ۔ وہ اپنے انداز میں لکھتے رہے ۔ جن نقادوں نے ان کے فن پر لکھا ان میں شمس الرحمن فاروقی ، گوپی چند نارنگ ، انور سدید ، مہدی جعفر اور سلیم شہزاد سے لے کر بلراج کومل ولینڈا وینگ تک اور اوکاز افضل و نظام صدیقی سے لے کر سید اختر و حامد اکمل تک ایک لمبی فہرست ہے ۔ سہ ماہی جریدے " توازن " مالیگاؤں نے ان کا گوشہ شائع کیا ۔ حمید سہروردی کا سب سے بڑا وصف ان کے اسلوب کی انفرادیت ہے ۔ وہ بیانیہ ، خود کلامی تخاطب اور خود کلامی کی تکنیک کا بڑے سلیقے سے استعمال کرتے ہیں ۔ یہی اسلوب حمید سہروردی کی پہچان بھی ہے ۔

" بے منظری کا منظر نامہ " میں ۲۲ افسانے ہیں ان میں دو سیریز ہیں ایک تو " بے " سیریز اور دوسرا " رات " سیریز ہے ۔ بے سیریز میں ۹ کہانیاں ہیں اور رات سیریز میں ۴ کہانیاں ہیں ۔ ان کے علاوہ نو ۹ کہانیاں اپنا آزادانہ وجود رکھتی ہیں ۔ حمید سہروردی کی کہانیوں میں عورت ہمیشہ موجود رہی جب کہ جدید افسانے سے عورت غائب ہوگئی تھی ۔ بے سیریز کے افسانوں میں عورت اور مرد کے ازلی رشتے کے گرد کہانیاں گھومتی ہیں ۔ اسی میں وصل کے مختلف رنگ ملتے ہیں ۔ جنسی اور نفسیاتی پیچیدگیاں ہیں ۔ برہنہ عورتیں برہنہ مجسمے ہیں ۔ جنس کی غوب صورت علامتیں کبھی بلی کبھی رنگین کلینڈر کے روپ میں ابھرتی ہیں ۔ کبوتر ، کوے ، خضر ، گوتم ، چھپکلی ، پتنگے ، دھوئیں اور دھول سے اٹا ہوا کمرہ ۔ کہانیوں میں معنویت پیدا کرتے ہیں ۔

" رات سیریز " کی کہانیوں میں رات کبھی استعارہ بن کر ابھرتی ہے ۔ کہیں وہ رات شام اور اندھیرے کی تجسیم کرتے ہیں ۔ ان کہانیوں

. بھی برہنگی اور ہوس کا بیان ہے ۔ کہیں کہیں یہ افسانے خود لذتی کی کہانیاں بھی سناتے ہیں ۔ اس طرح کے جملے بھی جگہ جگہ ملتے ہیں ۔

" رات کا ہاتھ شام کے گلے پر پڑا اور شام رات میں تحلیل ہوگئی ۔ "

یا

" اندھیرے کے جوبن سخت ہوچکے تھے ۔ "

" رات برہنہ ہونے لگی ۔ اس کی رانوں میں خارش کی سازش شروع ہوگئی . . . "

" بے اعتنائی " " بے منظری کا منظر نامہ " " لامکانی کا نوحہ " " میں دھرتی نہ بادل " " اندھیری رات تک " " کربلا دور ہے " اب در خواب " اور " بکھرے ہوئے دن " اچھے افسانے ہیں ۔ " آوازیں " نسبتاً پرانا افسانہ لگتا ہے ۔ اس کی تکنیک اور قلم " شہر اور ا " کا ذکر داخلی شہادت بن جاتا ہے ۔

" سفر دریا ہے بہتا ہی رہتا ہے " بیانیہ افسانہ ہے اس بیانیہ میں اکہرا پن نہیں بلکہ پوری قوت اور گہرائی موجود ہے ۔

حمید سہروردی کے ان افسانوں میں کردار ہیں ، کرداروں کے نام ہیں وہ جسم و جاں کے مالک ہیں ، منظر و مقام ہیں لیکن کہانیاں ں کی گرفت میں پوری طرح نہیں آنے پاتیں ۔ جب قاری بڑی محنت سے ٹکڑے ٹکڑے جوڑ کر کہانی کو شکل دینے کے قریب ہوتا ہے تو ں بے جوڑ ٹکڑا اس شکل کو مسخ کردیتا ہے کبھی کہانی کا آخری جملہ پورا تاثر بدل کر رکھ دیتا ہے ۔ قاری یہ سوچ کر کوفت میں مبتلا ہوجاتا ہ کہ اسے خوا مخواہ الجھایا گیا ہے ۔ اب جب کہ جدید افسانہ اپنا سفر پورا کرچکا اور وقت کے آئینے میں اس کی کمزوریاں اور خوبیاں دیکھ لی ہیں تو پھر حمید سہروردی کو بھی غور کرنا ہوگا کہ ان کا اگلا قدم کیا ہوگا ۔

○ سائز ، ۱/۸ ڈمائی ○ طباعت ، لیتھو ، پیپر بیک ○ قیمت ، ساٹھ روپے ○ ملنے کا پتہ ، نصرت پبلشرز لکھنو ۔

نام کتاب ، ایک نیزہ اونچا آسمان (افسانے) مصنف ، اکبر زاہد تبصرہ نگار ، ڈاکٹر بیگ احساس

اردو میں غزل کے بعد سب سے زیادہ مقبولیت افسانے کو حاصل رہی ۔ رسائل میں قاری افسانے ہی شوق سے پڑھتے ہیں ۔ لیکن ر چند برسوں سے اچھے نئے لکھنے والوں کا خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا ۔ جونام چھٹویں دہائی سے لیے جارہے ہیں انھیں آج تک دہرایا جارہا ہ ۔ کچھ لوگ اس کی ذمہ داری جدید افسانے پر ڈالتے ہیں ۔ جدید افسانے پر لاکھ الزام سہی اس کے زیرِ اثر افسانے نے اکہرے پن سے ۔زا پایا ۔ بے شمار تجربے ہوئے ۔ اور یہ تجربے ہماری روایت کا حصہ بھی بنے ۔ اس لیے جدیدیت کے مثبت رول سے انکار نہیں کیا سکتا ۔ سب سے بڑی تبدیلی تو یہ آئی کہ ترقی پسند تحریک سے جو مذہب بیزاری پھیلی تھی جدیدیت نے مذہبی حسیت کو خوب فروغ دیا ۔ ر زاہد کا مجموعہ ایک ایسے وقت شائع ہوا ہے جب کہ جدیدیت لے دھیمی پڑگئی ہے اور مابعد جدیدیت پر مباحث جاری ہیں ۔ مابعد دیدیت کی یہی تعریف کی گئی ہے کہ ادیب کسی رہنمایانہ خطوط اور دباؤ کے بغیر اپنی مرضی سے لکھے ۔ اکبر زاہد کے اس افسانوی مجموعے میں قسم کے افسانے ہیں ۔ ان میں " ایک نیزہ اونچا آسماں " " برف گزیدہ لوگ " " پانی کے کھنڈرات " " بر عرق انرزک کا ذہنی سفر " ہ عنوانات جدیدیت کا اثر قبول کرنے کی گواہی دیتے ہیں ۔ کچھ عنوانات میں رومانیت ہے " اداس پھولوں کا درد " تنہا سیسہ " " یادوں عذاب " اور کچھ عنوانات پر ترقی پسندی کی چھاپ ہے جیسے " متوسواں " " خوب صورت بدصورتی " " سراب " " لاجونتی " " اسے جل

رہے . . . " " بکھرا ہوا آدمی " وغیرہ ۔ اکبر زاہد کے ساتھ بھی وہی مسئلہ ہے جو نئے لکھنے والے کے ساتھ ہوتا ہے ۔ جو ہر راہرو کے ، تھوڑی دور چلتا ہے ۔ اسے اپنی راہ معلوم نہیں ہوتی ۔ انھوں نے کہیں سیدھی سادی بیانیہ کہانیاں لکھی ہیں اور بیانیہ میں وہ گہرائی نہیں کرپائے ۔ کہیں انھوں نے اختتام پر چونکانے کی کوشش کی ہے اور کہیں علامتی انداز برتا ہے ۔ اکثر واقعات کہانی بننے سے محروم گئے اور صحافت سے قریب ہوگئے ۔ ان افسانوں میں " چھت ، باغی ، متو سوامی ، پانی کے کھنڈرات ، ارے چل رہے . . . " تنہا ہیسے اداس بادلوں کا درد ، آگ ، بکھرا ہوا آدمی اور چنبیلی میں سماجی حقیقت نگاری ہے ۔ " لاجونتی " اور " خوب صورت بدصورتی " نفسی افسانے ہیں ۔ لیکن خوب صورت بد صورتی میں اس بات پر یقین کرنا مشکل ہے کہ کوئی عورت محض اپنی بات ثابت کرنے کے لیے چہرہ مستقلاً بگاڑ لے ۔ ان افسانوں میں میلو ڈرامائی کیفیت ہے ۔ پانی کے کھنڈرات کا کردار ہر فرق ارزک ہے ۔ غالباً سریندر پرکاش ۔ متاثر ہو کر کردار کا یہ نام رکھا گیا ہے ۔ سریندر پرکاش کے ہاں ہمیں جمنوزہ القریم جیسے نام مل جاتے ہیں ۔ اس افسانے میں صرف نام عجب سا ہے جب کہ افسانہ عام نوعیت کا ہے ۔ اس میں کسی تجربے کو نہیں برتا گیا ۔ " اکائی کا المیہ " اور " ہر فرق ارزک کا ذہنی سفر " اسلامی عقائد کی عکاسی ہوتی ہے ۔ " ہر فرق ارزک " پتہ نہیں کس زبان اور کس مذہب سے تعلق رکھنے والے کردار کا نام ہے لیکن افسانہ اسلامی عقائد کے مطابق جنت اور دوزخ کے تصور پر مبنی ہے ۔ " سراب " اور " سڑے ہوئے گوشت کا لوتھڑا " میں انسان کی حقیقت بیان کی گئی ہے ۔ " تنہا ہیسے " میں اس باپ کا المیہ ہے جس کے بچے دیارِ غیر میں خوش حالی کی خاطر جاچکے ہیں جو تنہائی سے گھبرا کر دواخانے میں شریک ہوجاتا ہے ۔ " ایک نیزہ اونچا آسمان " معلوم نہیں مصنف کی اختراع ہے یا کوئی تلمیح ؟ کیوں کہ سوا نیزے سورج تلمیح ہے ۔ ایک نیزہ اونچا آسمان غالباً اسلامی تلمیح نہیں ہے ۔ " برف گزیدہ لوگ " میں انسان کی بے حسی ہے ۔ باغی ، متو سوامی ، ارے چل رہے . . . ، کرداروں پر مبنی افسانے ہیں ۔ ان افسانوں کے اکثر کردار یا تو ذہنی توازن کھودیتے ہیں یا " ھو حق " نعرہ بلند کرکے کسی پاگل کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں ۔

اکبر زاہد افسانوں کی زبان سے واقف ہیں ۔ کہانی بننا بھی جانتے ہیں ۔ لیکن ایسا لگتا ہے جیسے انھیں کہانی کہنے اور اسے اختتام تک پہنچانے کی بڑی عجلت سی ہے ۔ مستقبل میں یقیناً ان میں ٹھہراؤ آئے گا اور وہ اپنی راہ متعین کرنے میں ضرور کامیاب ہوں گے ۔ انھوں نے اپنے پہلے مجموعے میں سات افراد کے تاثرات شامل کیے ہیں ۔ میرا خیال ہے اس کی چنداں ضرورت نہ تھی ۔ کتاب پیپر بیاک کے سا لیتھو پر چھپی ہے ۔ غلطیاں کم ہیں ۔

○ سائز ۱/۸ ڈیمائی ، پیپر بیک ○ صفحات : ۱۹۸ ○ قیمت : ۱۰۰ روپے

○ ملنے کا پتہ : وانم باڑی ، اردو اکیڈیمی ۴۹۰ ، جناح روڈ قادر پیٹ ، وانم باڑی ۔

OO OOO OO

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

جلد : ۵۹ — اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۹۶ء — شمارہ : [illegible]

سعودی عرب میں ہمارے نمائندے

○ حدیث ارسلان : P.O.Box. No. 71 Riyadh -11411

○ سلیم فاروقی : اردو اکیڈمی جدہ فون : 6855698

○ شریف اسلم : بزم اردو جدہ

فی پرچہ : ۱۰ روپے

زرسالانہ : ۱۰۰ روپے

کتب خانوں سے : ۱۲۵ روپے

مشرق وسطیٰ اور امریکہ : ۲۵ ڈالر

پاکستان، نیپال، سری لنکا و بنگلہ دیش : ۱۰ ڈالر

انگلستان : ۱۵ ڈالر

[illegible] Rs. 30.00

ناشر : ادارہ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد [illegible]

○● ○●○ ○●

ضروری اعلان

کاغذ ، کتابت اور طباعت کے اخراجات میں اضافے کے باعث ہندستان میں
" سب رس " کے زرِ سالانہ میں جنوری ۱۹۹۸ ء سے اضافہ کیا گیا ہے ۔

عام خریداروں سے : ایک سو پچیس روپے سالانہ

کتب خانوں سے : ایک سو پچاس روپے سالانہ

قیمت فی شمارہ : بارہ روپے

اختر حسن

یادوں کی سیر گاہ

(پانچویں قسط)

اورینٹل مسلم کانفرنس

آئیے آج میں آپ کو لکھنو میں مولانا آزاد کی بلائی ہوئی اورینٹل مسلم کانفرنس کے بارے میں کچھ بتاؤں۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۶ء تک کے بیسویں صدی کے دو دہے ہند کیا پوری عالمی تاریخ کے بہت اہم دہے ہیں۔ ان دو دہوں میں کئی صدیاں سانس لیتی نظر آئیں گی۔ ان ہی دو دہوں میں دوسری جنگِ عظیم ہوتی ہے، ایشیا اور آفریقہ میں بیداری کی لہر پیدا ہوتی ہے، بڑی بڑی شخصیتیں ابھرتی ہیں، چین میں نئی حکومت قائم ہوتی ہے، نو آبادیاتی نظام ختم ہونے لگتا ہے۔ جنگ کے خاتمے پر ۱۹۴۵ء سے ہی ہند میں بھی نئی زندگی کے آثار دکھائی دیتے ہیں، مختلف تحریکیں زور پکڑتی ہیں، مونٹ بیٹن وائسرائے بن کر آتے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا رزو لیوشن پاس ہوا تھا وہ اپنا رنگ دکھاتا ہے اور بالآخر اسی بنیاد پر ہندستان کا بٹوارہ ہوتا ہے۔ ہندستان اور پاکستان دو آزاد ملک بنتے ہیں۔ حیدرآباد میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں۔ "پیام" اخبار نکلتا ہے۔ نرسنگ راؤ کا "رعیت" نکلتا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں یہاں بھی کانگریس اسوسی ایشن قائم ہوتی ہے، اسٹیٹ کانگریس بنتی ہے، مجلس اتحادالمسلمین تشکیل پاتی ہے، فاشزم کے خلاف آواز اٹھتی ہے۔ ریاستِ حیدرآباد کی سیاست میں ایک عجیب موڑ آتا ہے، رضاکار تحریک پھر پولیس ایکشن اور مسلمانوں کا قتلِ عام، تباہی، بربادی اور پھر بالآخر حیدرآباد ریاست کا الحاق، نظام شاہی کا خاتمہ ۔۔۔ غرض ہر طرف ایک کایا پلٹ۔

ہمارے لیے یہ زمانہ بڑی آزمائش اور ابتلا کا زمانہ تھا۔ میری ایک دیرینہ خواہش تو پوری ہوگئی تھی۔ قاضی صاحب سے اخبار "پیام" لے لیا تھا۔ ورنگل کی دم گھٹا دینے والی ملازمت سے نجات مل گئی تھی۔ شہری زندگی کے مسائل سے، زندگی سے، سیاست سے قریب تر ہونے کے موقع ملے جو میری عین تمنا تھی، خواہش تھی، پوری ہوئی لیکن ساتھ ہی نئے مسائل اور مشکلات میں بھی اضافہ ہوا۔ سب سے اہم مسئلہ اخبار چلانے کا تھا۔ میرے اخبار لینے کے ایک سال کے اندر ہی اندر مرزا اسماعیل یہاں سے چلے گئے قاضی عبدالغفار صاحب معلوماتِ عامہ کے ڈائرکٹر تھے۔ ان سے بڑا سہارا تھا۔ ان کے ذریعے اخبار کو اشتہارات کافی ملتے تھے مگر جب انھوں نے حیدرآباد کی بدلتی ہوئی سیاست کا رنگ دیکھا، رضاکاروں کی تحریک کا اثر دیکھا اور محسوس کیا کہ اب تک مسلمانوں کو قومی دھارے میں لانے کی جتنی کوششیں انھوں نے کی تھیں وہ سب ناکام ہوگئیں اور نظام حکومت سے ان کی بن نہیں سکتی تھی تو وہ بھی استعفیٰ دے کر چلے گئے۔ عبدالحق صاحب نے بھی پاکستان کا رخ کیا۔ فسادات کے زمانے میں ان کا پورا کتب خانہ جلا دیا گیا تھا۔ اسی

پرآشوب زمانہ میں جب مولانا آزاد نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں لکھنو میں انڈین مسلم کانفرنس بلائی اور قاضی صاحب نے جو اس کے کنوینر تھے مجھے لکھا کہ تم حیدرآباد سے ایک بڑا وفد لے کر اس کانفرنس میں ضرور شرکت کرو۔ پھر اسی کے چند ہی روز بعد سردار جعفری نے لکھا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس بھی اسی زمانہ میں لکھنو میں ہو رہی ہے تو ہم نے لکھنو جانے کا ارادہ کیا کہ دونوں کانفرنسوں میں شرکت ہوسکے اور ایک بڑا اچھا وفد بنانے کی کوشش کی۔ ہم کو معلوم تھا کہ دسمبر میں ڈاکٹر حسین ظہیر ضرور لکھنو جاتے ہیں تو میں اور عالم سب سے پہلے ان کے پاس گئے کہ آپ وفد کی قیادت کیجیے۔ وہ تیار ہوگئے۔ بڑا پرآشوب زمانہ تھا وہ۔ آزادی ملے چند ہی مہینے ہوئے تھے۔ فسادات چل رہے تھے۔ قتل و خون کا بازار گرم تھا۔ ریلوں کو روک روک کر انسانوں کو مارا، جلایا جارہا تھا جس کی جھلک اس دور کے حساس لکھنے والوں کے پاس ملتی ہے جیسے کرشن چندر کی "پشاور ایکسپریس" منٹو کا "ٹھنڈا گوشت" اور "کھول دو" وغیرہ میں ۔۔۔ تو بہت جان جوکھم کا معاملہ تھا۔ ہم ذرا شش و پنج میں پڑ گئے کہ جائیں یا نہ جائیں مگر جب ڈاکٹر حسین ظہیر نے کہا ہم تو بہ ہر حال جائیں گے تو ہماری بھی ہمت بندھ گئی۔ ہمارے وفد میں سلیمان اریب، شاہد صدیقی، تحسین سروری، میری بیوی عصمت خانم، میری دو بہنیں رضیہ، رابعہ اور رابعہ کے شوہر برنی صاحب تھے اور عالم کو بھی بالآخر شرکت کے لیے آمادہ کرلیا تو سکنڈ کلاس کی پوری ایک بوگی ہماری رزرو ہوگئی جس سے ملا ہوا فرسٹ کلاس کا ڈبہ تھا جس میں حسین ظہیر تھے۔ قافلہ روانہ ہوا۔ راستے میں آدھی رات کو یکایک بیچ جنگل میں ٹرین رک گئی۔ آپ اندازہ لگائیے کیا کیفیت ہوئی ہوگی ہماری۔ ہر شخص دل میں ذرا سہما مگر بظاہر بہادر بننے کی کوشش میں جب ایک گھنٹہ گزر گیا پھر بھی ٹرین حرکت میں نہ آئی تو ڈاکٹر حسین ظہیر ہمارے کمپارٹمنٹ میں آگئے ہم لوگوں نے ہنسی مذاق اور باتوں میں لگ کر وقت گزارا۔ پورے تین گھنٹے بعد ٹرین پھر حرکت میں آئی تو جان میں جان آئی۔ ہ بود بلائے ولے بہ خیر گذشت۔ لکھنو جاتے ہوئے ایک دن الٰہ آباد میں بھی ٹھہرے وہاں ڈاکٹر حسین ظہیر کے بڑے بھائی علی ظہیر تھے انھوں نے ہماری بہت آؤ بھگت کی۔ ایک ہی دن میں وہاں خوب سیر کی امرود کے باغوں میں گئے۔ الٰہ آباد کا امرود مشہور اور وہ امرود کا موسم تھا درخت کے تازہ پکے امرود کھائے۔ شہر گھومے اور پھر کشتی میں بیٹھ کر "سنگم" پر بھی گئے۔ واقعی بڑا عجیب لگتا گنگا جمنا کا یہ ملاپ۔ ایک طرف گدلا پانی دوسری طرف جمنا کا صاف شفاف پانی ملنے پر بھی دونوں کا فرق دکھائی دیتا ہے۔

کانفرنس کا اجلاس صبح ہونے والا تھا۔ مولانا آزاد مخاطب کرنے والے تھے جو اس وقت وزیر تعلیم تھے۔ بہت بڑا پنڈال بنایا تھا ہزاروں لوگ جمع تھے ہم بھی مولانا کو دیکھنے اور سننے کے مشتاق بیٹھے تھے۔ قاضی صاحب متفکر تھے کہ کیا بات ہوئی مولانا ابھی نہیں آئے۔ آخر وہ خود دلی گئے اور شام کے اجلاس میں ان کو لے کر آئے۔ ہزاروں لوگ جو ایک عالم، مفکر اور مجاہد آزادی کو دیکھنے اور سننے کے لیے صبح سے جمع تھے۔ سب اس وقت تک بھی منتظر بیٹھے تھے۔ مولانا آئے اور بڑی پراثر تقریر کی۔ ہم نے مولانا کو سنا تھا ان کی کتابیں پڑھی تھیں۔ ان کی "غبارِ خاطر" مجھے بہت پسند تھی اور ان کی ایک کتاب "ترجمان القرآن" کی پہلی جلد کا میں نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ یہ تفسیر الحمد دراصل اردو ہی میں لکھی گئی تھی جس کا ڈاکٹر عبداللطیف نے انگریزی

میں ترجمہ کیا تھا اور اس ترجمے کو انھوں نے پھر مولانا کے ہی طرزِ نگارش میں منتقل کرنے کو مجھ سے کہا تھا تو اس ضمن میں مولانا کے طرزِ نگارش کو گرفت میں لانے کے لیے میں نے ان کی کئی کتابیں پڑھی تھیں ۔ ان کی نثر کا خاص طرز تھا مولانا حسرت موہانی ان کی نثر کے بہت مداح تھے چنانچہ کہتے ہیں :

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر　　　　نظمِ حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

اب پہلی بار ہم نے ان کو دیکھا ۔ ان کی تقریر سنی ۔ بڑی پرکشش بارعب شخصیت تھی اور تقریر تو جیسے آبِ رواں اور بے حد پر مغز ۔ پوری تقریر تو یاد نہیں بنیادی بات جو انھوں نے کہی وہ یہ تھی کہ ہندستان کی موجودہ صورتِ حال میں مسلم اقلیت کا کیا موقف ہے گا اور مسلمانوں کو کس طرح اپنے ذہن فعال بنانا ہوگا اور کس طرح قومی دھارے میں شامل ہو کر اپنا مقام حاصل کرنا چاہیے ۔ قومی دھارے سے ان کی مراد ظاہر ہے کانگریس کا قومی دھارا تھی ۔ مولانا آزاد کے بعد ڈاکٹر اشرف نے تقریر کی ان کو صرف ۵ منٹ دیے گئے تھے مگر انھوں نے ۱۵ منٹ تقریر کی ۔ بڑے آتش بیاں مقرر تھے ۔ ان پندرہ منٹوں میں انھوں نے اپنے جن نظریوں کی ترجمانی کی اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ " قومی دھارا کا مطلب صرف کانگریس نہیں ۔ بائیں بازو کی جماعتیں بھی قومی دھارے " میں آتی ہیں اور ان کی اس وقت مسلمانوں کو زیادہ ضرورت ہے ۔

ڈاکٹر اشرف سے بھی ہم پہلی بار لکھنؤ میں ہی ملے اس طرح کہ ہم سردار جعفری سے ملنے گئے تو دیکھا ایک چھوٹے سے کمرے میں کئی لوگ ہیں ۔ سامان بکھرا پڑا ہے اور ایک صندوق پر کوئی صاحب بیٹھے ہیں ۔ سادہ لباس ۔ مسکراتا ہوا چہرا اور مسلسل گفتار ۔ جعفری نے تعارف کرایا کہ یہ ڈاکٹر اشرف ہیں علی گڑھ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ۔ ڈاکٹر اشرف نے تاریخی نقطہ ، نظر سے ہندستانی مسلمانوں سے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جو بہت مقبول ہوئی ۔ اس وقت نام یاد نہیں آرہا ہے اس پر میں نے تبصرہ بھی کیا تھا جو عالم میں چھپا تھا ۔

دوسرے دن انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی اور رات میں مشاعرہ جس میں فراق صاحب کی وجہ سے ذرا بدمزگی پیدا ہوگئی ۔ جب ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی گئی تو مائک پر آکر انھوں نے ہندی اردو کا تقابل شروع کردیا ۔ اردو کی تعریف کہ وہ ایک بڑی لطیف و نازک ، شائستہ مہذب زبان ہے اور اس میں جو نزاکت اور لطافت ہے وہ فارسی زبان سے آئی ہے اور مثال کے طور پہ شعر پڑھا ،

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے　　　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　　　اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

اور کہنے لگے اس بات کو اگر ہندی میں کوئی شاعر کہے گا تو ایسا کہے گا جیسے ، " بھل بھل موتے ہاتھی " اس پر ایک حلقے سے احتجاج ہوا مگر زیادہ گڑبڑ ہونے سے پہلے وہ اپنی مختصر تقریر کے بعد چند شعر سنا کر چلے گئے ۔

مختصر یہ کہ ہمارا لکھنؤ کا سفر بہت اچھا اور پر لطف رہا ۔ خوب دعوتیں کھائیں قاضی عبدالغفار صاحب نے تمام نمائندوں کو

[illegible]

اخبار پیام کی مالی مشکلات

اس پرلطف اور فکر انگیز سفر کے بعد حیدرآباد واپس ہوئے تو پھر وہی ایک روٹین اور کچھ نئے مسائل اور مشکلات کا سامنا [illegible] کی حکومت کے آخری زمانہ میں انڈین گورنمنٹ نے بہت سی چیزوں پر پابندی لگادی تھی اور کاغذ بہت گراں ہوگیا تھا۔ بہت اشتہارات بھی بند ہوگئے تھے اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جب میں نے پیام لیا تھا تو کتنی مالی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور گو ہی اس کی ساکھ پھر قائم ہوگئی تھی۔ سرکولیشن بھی بڑھا تھا مگر مالی حالت کچھ بہت بہتر نہیں ہوئی تھی تاہم میں نے ہمت نہیں ہاری اور ہی خواہوں نے میرا حوصلہ بڑھائے رکھا۔ اخبار نکلتا رہا اور اس کی مقبولیت اور سرکولیشن میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اس زمانے میں مجھے [illegible] بہت بڑا چیلنج پیش کیا گیا۔ ۔ ۔ آپ کو یاد ہوگا جب ورنگل میں تھا تو ایک شیوکمار لعل صاحب کا ذکر کیا تھا میں نے۔ وہ پولیس افسر تھے جو پولیس ایکشن کے بعد ہوم منسٹر ہوگئے۔ ابھی چند سال پہلے ان کا انتقال ہوا۔ ایک دن پیام کے دفتر پر ان کا فون آیا [illegible] صاحب آج شام چائے آپ میرے ساتھ پیجیے۔ تو میں گیا ان کے پاس۔ اس وقت تک ملٹری گورنمنٹ قائم ہوچکی تھی۔ چائے ایک تقریب بہر ملاقات تھی اصل بات یہ تھی کہ انھوں نے مجھے ایک خاص مقصد سے بلایا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ گورنمنٹ نے شعیب [illegible] کی یاد میں وظیفہ [illegible] کی رقم کسی ایسے ادارے کو دینے کا تصفیہ کیا ہے جو ان کے مقاصد کی تکمیل کرسکے اور یہ میرے اخبار میں [illegible] ی کو یہ رقم دوں۔ میں چاہتا ہوں آپ اس کو اپنے اخبار کے لیے قبول کرلیں۔ شرطیں بہت معمولی صرف دو ہیں۔ ایک تو یہ شعیب اللہ کی بیوی کو ماہانہ پچاس روپے دیے جائیں جب تک وہ زندہ رہیں یا اخبار زندہ رہے دوسری شرط یہ ہے کہ اخبار کی پالیسی [illegible] لیے Nationalist رہے۔ میں نے سوچنے کے لیے دو دن مہلت مانگی۔ اپنے خاص کمیونسٹ دوستوں سے جیسے مخدوم محی الدین اور [illegible] اور گوڑ سے مشورہ کیا تو انھوں نے سختی سے اس کی مخالفت کی۔ انتہا پسندی اس وقت زوروں پر تھی۔ میں اس کا قائل نہ تھا اور [illegible]ین پر اخبار چلانا بھی نہیں چاہتا تھا: میری پالیسی شروع سے ہی Nationalist رہی تھی شاید رضاکار تحریک کے زمانے میں [illegible] [illegible]زم کی طرف کچھ زیادہ ہوگیا تھا پھر ابھی نہ میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا نہ میرے اخبار کی پالیسی کمیونسٹ پالیسی تھی۔ لیکن کمیونسٹ انہیں کے مشورے پر جس میں میرے اسٹاف ممبرز بھی شامل ہوگئے تھے میں نے اس وظیفہ [illegible] کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ میرے [illegible] [illegible]نے بھی اس کی اجازت نہیں دی۔ اس وقت اخبار کی تعدادِ اشاعت میں پھر تیز رفتاری سے اضافہ ہورہا تھا اس کا سرکولیشن [illegible] [illegible] تک پہنچ گیا تھا اور اس کی مقبولیت بھی بڑھ رہی تھی اور سان گمان میں بھی نہ تھا کہ اس پر اتنی جلد [illegible] ہوگا۔ [illegible] میں نے [illegible] [illegible]نسٹ کا [illegible] کر [illegible]۔ یہ بھی ایک وجہ تھی میرے انکار کی۔ میں نے اس پیش کش کو رد کردیا تو وہ وظیفہ [illegible] کی [illegible] [illegible] ۔ وہ کانگریس کی سفارش لے کر یہاں [illegible] اور اب [illegible] [illegible] انھوں نے ایک [illegible] پریس [illegible] صحیفہ [illegible] نام سے اخبار نکالا۔ [illegible]

میں [illegible] برس بعد کی بات ہے [illegible] ہو گئی اور کچھ احتیاط [illegible] قلب میں [illegible] کہ شیو کر
[illegible] صاحب [illegible] گئے۔ وہ اس بات کو بھولے نہیں تھے۔۔۔ اور کسی سے مخاطب ہو کر کہا، [illegible] اس [illegible] اختر حسن۔
[illegible] اس نے اور آپ کیا [illegible] لیا ہے۔ میں نے اس کو دو [illegible] اس نے قبول نہیں کیا۔ [illegible] یہ ہے کہ اب سوچتا ہوں
[illegible] غلطی کی میں نے [illegible] سے کام نہیں لیا۔ وہ [illegible] اس وقت قبول کر لیتا تو "پیام" کے سلسلے مسائل حل ہو جاتے
[illegible] کا وہ حل نہ ہوتا جو ہوا اور آج تک بھی میں اس کا مدیر رہتا۔ مگر ہم اس وقت کمیونسٹ پارٹی کے [illegible] ہوئے تھے
[illegible] سے نتائج و عواقب پر غور نہیں کیا۔

میں نے جب پیام کا چارج لیا تو قاضی صاحب کے زمانے کے جو لوگ تھے وہ سب چلے گئے صرف ایک جمیل صاحب پرانے [illegible] تھے لیکن بعد میں وہ بھی ECONOMIC TIMES میں چلے گئے تو سب نئے لوگ تھے اور جمیل صاحب کے چلے جانے [illegible] ایک اچھے مترجم کی ضرورت تھی۔ عالم سے ذکر آیا تو انھوں نے احسن علی مرزا کی نشان دہی کی میں نے ان کو [illegible]۔ ان کا [illegible] ایک خاص کیریکٹر تھا۔ مترجم اچھے تھے، زود نویس بھی تھے اور ایک وہاب حیدر پہلے سے تھے وہ بھی اچھے مترجم تھے، کلا[illegible] "[illegible]" میں کام کر چکے تھے مگر وہ دونوں "کامریڈز" تھے اور تیسرے ایک "کامریڈ" تھے احمد معظم، صبح دکن کے ایڈیٹر [illegible] کے فرزند۔ وہ بہت زیادہ انتہا پسند تھے ان کی انتہا پسندی نے پیام کو اور مجھے بہت نقصان پہنچایا۔ کئی سال کام کیا انھوں نے [illegible] بھی۔ کمیونسٹ پارٹی کی اندرونی خبریں سب ان ہی کے توسط سے آتی تھیں اور سرخیاں وہی لگاتے تھے۔ ہر سرخی ایڈیٹر تو نہیں [illegible]۔ مجھے ان پر کامل اعتماد تھا اور میں نے انھیں تاکید بھی کر دی تھی کہ سرخیاں لگانے میں بہت احتیاط برتیں۔ پھر بھی پیام کی [illegible] پر [illegible] جھنڈا لہرائیں گے" انھوں نے لگائی اور غالباً وہی پیام کی تباہی کا شاخسانہ بن گئی۔ اس کے کچھ ہی عرصے [illegible] گورنمنٹ نے پیام پر دو مہینے کی پابندی لگا دی اور میں نے اسی وقت محسوس کیا کہ بات یہیں تک نہیں رہے گی چنانچہ [illegible] کی ایک صبح پولیس ہمارے [illegible] کے مکان کی تلاشی کے لیے آدھمکی مگر کچھ ملا نہیں سوائے رضی کے ایک خط کے [illegible] نے [illegible] سے لکھا تھا۔ وہ ہمارا دوست بڑا پرجوش کامریڈ تھا۔ عالم کا گہرا دوست تھا۔ ہمارے "ویڈنس ڈے گروپ" میں بھی [illegible] رہتا تھا۔ جلدی مر گیا بیچارا۔ اس کا وہ خط کچھ اتنا مبہم ذو معنی سا تھا کہ اس سے کئی معنی نکالے جا سکتے تھے پولیس نے وہ خط [illegible] ہم کو پوچھ گچھ کے لیے پولیس اسٹیشن لے گئے۔

گرفتاری اور رہائی

جب ہم پولیس کنٹرول روم پہنچے تو عجیب منظر دیکھا۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ صرف ہمارے ساتھ ہی یہ [illegible] ہے وہاں [illegible] ایک طرف [illegible] میں [illegible] اور [illegible] ایک

طرف سے زینت ساجدہ اور کئی دوسرے شناسا چہرے ۔ ایک ہی سلے میں سب کو گرفتار کیا گیا تھا سب کو الگ الگ کمروں میں بٹھایا گیا اور کوئی ۹ گھنٹے تک باری باری سے ہر ایک سے Introgation ہوا ۔ زینت کا نمبر چوتھا تھا ان سے کچھ پوچھ گچھ ہوئی وہ بری طرح رونے لگیں تو شام میں انھیں حوالات سے ہی چھوڑ دیا گیا مگر رضیہ کو جیل بھیجا ، مظہر اور قمر کو بھی پھر مجھے اور عالم کو اور پھر سری دھر گونیکل کو ۔ وہ چھوٹا سا دبلا پتلا آدمی تھا کیرالا کا رہنے والا اور وہ پارٹی ممبر بھی تھا ۔ اس کا قصہ سنیے ۔ ۔ ۔ ہمارے دوست ڈاکٹر جے سوریا ایک انگریزی ویکلی نکالنا چاہتے تھے ، بائیں بازو کی پالیسی کا ۔ اس کے لیے ان کو کسی آدمی کی تلاش تھی ۔ پتہ نہیں وہ کب اور کیسے اور کہاں سری دھر گونیکل سے ملے تھے ۔ انھوں نے اس کو لکھا کہ حیدرآباد آجاؤ تو ویکلی کا پورا کام تمھارے سپرد کردوں گا ۔ وہ بے چارہ کیرالا سے یہاں آگیا ۔ اب سوال تھا اس کو ٹھیرایا کہاں جائے ۔ جے سوریا سے اس زمانے میں ہمارے بہت گہرے تعلقات تھے ۔ ہمارے لال ٹیکری کے مکان میں اوپر اڈیٹوریل آفس کے پیچھے کی طرف ایک لمبا سا کمرہ تھا ، خالی پڑا تھا ، جے سوریا کی خواہش پر ہم نے وہ اسے رہنے کے لیے دے دیا ۔ جب پولیس دفتر کی تلاشی لینے آئی تو دیکھا وہاں کمرے میں کوئی سو رہا ہے اس کو بھی اٹھا کر پکڑ لائے اور ہمارے ہی وارڈ میں رکھا ۔ اس غریب کی حالت عجیب تھی ، بری طرح بوکھلایا ہوا ۔ چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا ۔ صبح اٹھ کر اپنا بستر تہہ کر کے اس پر بیٹھ جاتا اور چپ چاپ رہتا ۔ کسی سے بات نہیں کرتا تھا ۔ عالم اس کا بڑا مذاق اڑاتے تھے بعد میں اسے دوسرے وارڈ میں بھیج دیا گیا ۔ مظہر اور قمر بھی دوسرے وارڈ میں تھے رضیہ کو عورتوں کے وارڈ میں رکھا گیا تھا ۔ سلیمان اریب اور نرسنگ راؤ بھی اسی سلے میں گرفتار ہوئے تھے ۔ ان کو سکندرآباد جیل میں بھیجا گیا ۔

شروع شروع میں بہت سختی رہی ۔ پنسل ، کاغذ ، کتاب سب منع تھا ۔ کھانا بھی گھر سے نہیں منگوا سکتے تھے مگر بعد میں کچھ سہولتیں مل گئیں ۔ کھانا بھی گھر سے آنے لگا ۔ کچھ کتابیں بھی منگوا سکے ۔ جیل کا جو ڈاکٹر تھا وہ میرے دوست ہریش چندر استھانہ کا دوست نکلا ۔ اس نے ہم کو کم زور قرار دے کر جب شروع میں جیل سے کھانا ملتا تھا روز دو انڈوں کا انتظام کروا دیا تھا اور کھانا بھی نسبتاً اچھا ملنے لگا تھا ۔ جیل کا کمپونڈ خاصا بڑا تھا اس میں ہم والی بال کھیل سکتے تھے ۔ میں روز کھیلتا تھا کبھی کبھار مجبوراً وقت گزاری کے لیے عالم بھی شریک ہوجاتے ۔ جیل میں تقریباً دو مہینے عالم کا مستقل ساتھ رہا اور ہم نے دنیا جہان کی باتیں کیں اور جب وہ مجھ سے پہلے چھوٹ گئے تو میں بہت اکیلا رہ گیا ۔ مختلف مسائل پر باتوں کے ضمن میں اکثر و بیش تر ہم یہ بھی سوچتے کہ آخر ہماری گرفتاری کس بنا پر ہوئی ۔ نہ میں پارٹی ممبر تھا نہ عالم نہ رضیہ ۔ ہم سوشلسٹ نظریات کو پسند کرتے تھے اور عام لوگوں کی بھلائی اور قومی بہتری ہمارا مقصود تھا ۔ پارٹی ممبر بننے کا مجھے کبھی شوق نہیں ہوا ۔ مخدوم ، راج بہادر گوڑ وغیرہ نے بہت کوشش کی کہ میں کارڈ ہولڈر بن جاؤں ، میں نے قبول نہیں کیا ۔ اس لیے ہم کو تعجب یہی تھا کہ ہم کو کس علت میں گرفتار کیا گیا ۔ اس کے اصل سبب کا بہت بعد میں جب ، اردو اکیڈمی میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا ، بالکل اتفاقیہ پتہ چلا وہ اس طرح کہ ایک صاحب راما مورتی یا راما راؤ نامی جو کمیونسٹ پارٹی بہت اہم ممبر تھے ۔ وہ جب بالکل مفلوک الحال ہوگئے تو کام کی تلاش میں اردو اکیڈمی آئے اور مجھ سے ملے ۔ وہ اردو بہت اچھ

تے تھے ۔ اس زمانے میں ہمارے ہاں اردو کلاسس چل رہی تھیں میں نے ان کو اردو پڑھانے کا کچھ کام دے دیا وہ " ہندستان کی
ی میں مسلمانوں کا حصہ " پر اردو میں ایک کتاب لکھ رہے تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے بڑی دھا پوش کر کے سکریٹریٹ کی کچھ
کی فائلیں دیکھنے کی اجازت لے لی تھی ۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہاں جو Documents ہیں کچھ ان کی نظر سے گزرے ۔ ان میں آپ
ں کی جو گرفتاری ہوئی اس تعلق سے بہت کچھ ہے اور ایک میمورینڈم کا انھوں نے ذکر کیا جو ملٹری گورنر کو دیا گیا تھا ۔ اس بیان
یہ کہا گیا ہے کہ اختر حسن ان کے بھائی بہن سب کمیونسٹ پارٹی کے لوگ ہیں اور Arm Supply کرتے ہیں ۔ تو یوں پتہ چلا
اس بنیاد پر ہم سب کو گرفتار کیا گیا اور انھوں نے ایک راز کے مراسلے کا بھی ذکر کیا جو تلنگانہ تحریک سے تعلق رکھتا تھا کہ تلنگانہ کے
ت بڑے علاقے پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہوگیا تھا اور اب یہاں حیدرآباد میں ایک " دلم " بننے والا تھا اس میں پارٹی کی حکومت بننے پر کس
یا عہدہ دیا جائے گا اس کا ذکر تھا جس کی رو سے روی نارائن ریڈی چیف منسٹر ۰ مخدوم محی الدین لیبر منسٹر اور مسٹر اختر حسن وزیر
مات ۔ ۔ تو یہ کچھ راز کی باتیں ان سے ہم کو معلوم ہوئیں ۔ خیر تو ہم جیل میں تھے اور باہر ہماری رہائی کے لیے ہنگامے ہو رہے
۔ ۔ اجتماعی جلوس ۰ جلسے نہ صرف حیدر آباد شہر میں بلکہ اضلاع میں بھی ۰ نظام آباد کریم نگر عادل آباد وغیرہ میں پیام کے چاہنے والے
ت تھے اس لیے کہ ان کے دلوں کی دھڑکن کا ساتھی تھا ۔ میری رہائی غالباً ساڑھے تین چار ماہ بعد ہوئی ۰ رضیہ غالباً ڈھائی مہینے جیل
ں رہیں اور عالم تو اس سے پہلے ہی رہا ہوچکے تھے ۔ یونیورسٹی میں علی یاورجنگ کی وجہ سے جو اس وقت وائس چانسلر تھے ۔ ان دونوں
ملازمت پر کوئی اثر نہیں پڑا ۔ وقار احمد صاحب کا ادعا ہے کہ میں ان کی وجہ سے چھوٹا وہ اس وقت انجمن صحافت کے سکریٹری تھے ۔
انجمن قاضی عبدالغفار صاحب نے بنائی تھی ان کے بعد میں اس کا سکریٹری ہوا پھر وقار احمد ہوئے ۔ انھوں نے میری رہائی کے ضمن
ں کچھ پیروی ضرور کی اس کا مجھے اعتراف ہے ۔ نظام گزٹ میں انھوں نے کئی بیانات شائع کیے ۰ مراسلے لکھے ۔ بہ ہر حال جب ہم
ں سے چھوٹ کر باہر کی دنیا میں آئے تو بہت کچھ بدلا ہوا پایا ۔ ہمارے جیل سے چھوٹنے کے دوسرے ہی دن اطلاعاتِ عامہ اور صحیفہ
روں کی طرف سے ملٹری گورنر کو وداعی ڈنر دیا گیا تھا ۔ میں بھی اس میں شریک تھا ۔ ۱۴ مہینے یہاں ملٹری گورنمنٹ رہی ۔ پھر ویلوڈی
، قیادت میں سیول حکومت قائم ہوگئی ۔ ملٹری راج ختم ہوگیا تو ملٹری گورنر کو وداعی ڈنر دیا گیا تھا ۔ اطلاعاتِ عامہ میں اس وقت
ر ہندو جی ڈائرکٹر تھے ۔ وہ پکے قوم پرست اور بہت ہی پرمذاق آدمی تھے ۔ انھوں نے بہت خوب صورت تقریر کی تھی اور ۔۔ ۔
ڑے طنزیہ مزاحیہ انداز میں کہا تھا کہ حیدرآباد میں ۱۹۰ صحافی ہیں ان میں سے ہماری گورنمنٹ نے صرف ایک صحافی و ۔۔
، آج ہمارے درمیان موجود ہے اور پھر ہماری تعریف و عریف بھی کی اور خود ملٹری گورنر سے ملایا ۔

گورنر جنرل چودھری بہت وجیہ اونچا پورا حسین ۰ بیوی بھی بہت حسین ۔ وہ مجھ سے ملے تو کہنے لگے ۰ یہ تو بڑے شریف
س سمجھتا تھا کوئی بڑے بھیانک قسم کے آدمی ہوں گے لال لال آنکھیں ہوں گی ۔ بڑی بڑی مونچھیں ۔ تو اس طرح بے تکلفانہ
ں وہ ۔ اتفاق سے ان دنوں جوش حیدرآباد آئے ہوئے تھے ان کا بھی پروگرام رہا وہ ایک دو گھنٹے کے لیے آتے اور بہت

کچھ سنایا ۔ فرض سیول حکومت بن گئی ۔ نئے مسائل ۔ نئی تبدیلیاں ۔ مگر میرے سامنے تو سب سے اہم سوال میرے اخبار کا تھا ۔ پانچ چھ مہینے کے التوا میں اس کی حالت بہت بگڑ گئی تھی مجھے سب سے پہلے اسے سنبھالنا تھا ۔

پیام کا دوبارہ اجرا :

بہ ہر صورت یکم نومبر ۱۹۴۹ء سے میں نے پھر اخبار پیام نکالنا شروع کیا ۔ سیکڑوں مبارک باد کے خطوط آئے جن میں سے میں یہاں صرف دو خطوں کا ذکر کروں گا ایک قاضی عبدالغفار صاحب کا دوسرا ٹی ۔ انجیا کا ۔

قاضی صاحب کا خط ہے :

انجمن ترقیِ اردو ہند

سلطان حسین منزل

دریا گنج دہلی ۔ مورخہ یکم نومبر ۱۹۴۹ء

برادرم اختر

پیام کے دوسرے جنم کا پہلا پرچہ آج وصول ہوا اس امتحان کی آگ میں تپ کر تمہارا سونا یقیناً اور کھرا ہو گیا ہو گا ۔

جو کچھ ہوا یہ تو سب کچھ ہونا ہی چاہیے تھا ۔ نہ تو کچھ افسوس کا محل ہے ۔ نہ تعجب کا ۔ اپنے فرض کو فرض سمجھ کر انجام دینے کا احساس ایک ایسی بڑی طاقت ہے جو زندگی کی ساری زحمتوں پر چھا جاتی ہے ۔

امید کہ تم بہ خیر و عافیت ہوں گے ۔

میں کئی مہینے سے بیمار ہوں اور بہت کم زور ہوگیا ہوں پھر بھی ممکن ہے کہ وسط نومبر میں چند روز کے لیے حیدرآباد آسکوں ۔

جناب اختر حسن صاحب

اڈیٹر پیام ۔ حیدرآباد ۔

محمد عبدالغفار

جنرل سکریٹری

ٹی انجیا کا خط ۔

انڈین نیشنل کانگریس

گول بنگلہ ۔ افضل گنج

۳۱ / اکتوبر ۱۹۴۹ء

مکرمی اڈیٹر صاحب روز نامہ پیام

مجھے یہ سن کر انتہائی مسرت ہوئی کہ روزنامہ پیام یکم نومبر ۱۹۴۹ء سے دوبارہ شائع ہو رہا ہے مجھے امید ہے کہ پیام مزدوروں کی پکار کو بلند کرنے میں مزدوروں کی ہر ممکنہ مدد کرے گا ۔ جیسا کہ وہ اب تک کرتا آیا ہے ۔ پیام کو بند کر کے حکومت نے مزدوروں کی آواز کو بھی دبا دیا تھا اگر ہماری حکومت مزدور اور کسان راج چاہتی ہے تو پیام کے قلم کو روانی کی آزادی دے تاکہ وہ مزدوروں کی صحیح خدمت کرسکے ۔ پیام سے ہمارے مزدوروں کی ہم دردیاں وابستہ ہیں ۔ امید ہے کہ آپ کا اخبار ضرور مزدوروں کا ساتھ دے گا ۔ تاکہ انھیں سرمایہ داروں کے شکنجے سے نجات دلا سکے ۔

ٹی ۔ انجیا

قاضی صاحب کے خط نے پھر میرے حوصلوں کو بلند کیا ۔ میں نے اخبار نکالا اور ایسے میں میرے کرم فرما ونود راؤ صاحب ناظم اطلاعات عامہ کا یہ مشورہ میرے حق میں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بن گیا کہ پیام کا ایک اچھا سا منصوبہ نمبر نکالا جائے اور جب میں نے ان کے اس مشورہ پر عمل کرنے کا تصفیہ کر لیا تو اس کے لیے کافی رقم درکار تھی جس کا انتظام بھی محکمہ ۔ اطلاعات کے توسط سے اس طرح ہوگیا کہ کچھ پرانے بل تھے ونود راؤ کی توجہ اور کوشش سے وہ وصول ہوگئے اور ایک ماہ کے اندر پیام کا ایک ضخیم منصوبہ نمبر جو غالباً ۴۸ صفحات پر مشتمل تھا منظر عام پر آسکا جس میں کم از کم ۱۵ ہزار کے اشتہارات تھے اور ان کا بیش تر حصہ ونود راؤ صاحب کی مہربانی اور توجہ کا رہینِ منت تھا ۔ اس دوران بیرونی کمپنیوں سے سابق میں جو اشتہارات ملتے تھے ان کی تجدید کے لیے بھی مراسلت شروع ہوئی اور اس میں کچھ کامیابی بھی ہوئی لیکن اس زمانے میں عابد علی خاں صاحب کی ادارت میں " سیاست " کے نام سے ایک اور روز نامہ نکلنے لگا تھا جس کے جوائنٹ اڈیٹر محبوب حسین جگر تھے ۔ اس کا اخبارِ پیام کے سرکولیشن پر اور اشتہارات پر کچھ

۔ اور پھر اسی زمانے میں میرے عزیز محمود علی خاں اختر نے جو پیام کے منیجر کی حیثیت سے میرا دست راست تھے • "پیام" سے اعلانی برتنا شروع کی ۔ نیز پیام کے اسٹاف کے دو مترجمین احمد معظم اور غلام حیدر صاحب کی خدمات کو سیاست نے حاصل ۔ یہ خلا بھی میرے لیے ایک اعتبار سے حوصلہ شکن تھا مگر خیر ان کی جگہ مجھے جلد ہی ایک نیا Hand وہاب حیدر کی شکل میں جو نہ صرف اچھے مترجم تھے بلکہ بہ حیثیت انسان بھی بہت خوش کردار اور اعتدال پسند نوجوان تھے ۔ وہ آرٹسٹ بھی تھے اور بعض بہت ہی پراثر • کارٹون بھی بناتے تھے سیاسی سماجی واقعات پر ۔ ایک طرح سے ان کی رفاقت بہت کارگر ثابت ہوئی مگر کچھ ہی د وہ بمبئی کے "انقلاب" میں چلے گئے ۔ پھر بھی میں کسی نہ کسی طرح اخبار نکالتا رہا • اس کی مقبولیت برقرار تھی اور آہستہ آہستہ بھی بڑھ رہے تھے • لیکن ساری کوششوں کے باوجود یہ ماننا پڑیگا کہ "پیام" کی مالی حالت دن بہ دن خراب ہوتی چلی جارہی تھی کے کچھ خاص کرم فرما اور ہمارے کچھ احباب اخبار کے اور ہمارے واقعی بہی خواہ تھے وہ اس کی مالی مشکلات سے غافل نہیں تھے ۔ ایک روز ڈاکٹر جے سوریا کے ہاں سب جمع ہوئے یہ سوچنے کے لیے کہ پیام کی مالی حالت کو کیسے بہتر بنایا جاسکتا ہے ؟

اس میٹنگ میں کافی سوچ بچار کے بعد یہ طے پایا کہ پیام کو ایک لمیٹڈ کمپنی میں تبدیل کردیا جائے ۔ ڈاکٹر حسین ظہیر، ایچ سبیا اور ایل ۔ این ۔ گپتا نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا اور میں نے بھی رضا مندی کا اظہار کیا تو دوسری میٹنگ میں اس ۔ عملی صورت دینے کی بات چلی ۔ اس موقع پر پھر ہمارے کامریڈز نے اصرار کیا کہ مسٹر ڈھگے کو منیجنگ ڈائرکٹر بنا یا جائے ۔ یہ مسٹر ادس تھے ان کی بیوی سوشل ورک کرتی تھیں پتہ نہیں کیسے وہ دونوں پارٹی سے قریب ہوگئے تھے اور پارٹی کو ان پر بہت اعتماد مجھے وہ کچھ اچھے آدمی نہیں لگتے تھے • مجھے ان پر بھروسا نہیں تھا ۔ چناں چہ میں • مخدوم کو پہلے ہی متنبہ کرچکا تھا کہ مجھے وہ قابل آدمی نہیں لگتے پھر بھی وہ لوگ مصر رہے کہ ان کو مینیجنگ ڈائرکٹر بنایا جائے اور جب ڈاکٹر جے سوریا نے بھی ان کی حمایت کی تو سوش ہوگیا • ان کو کمپنی کا مینیجنگ ڈائرکٹر بنا دیا گیا اور میرے ایک اچھے دوست کوکب دری کو سکریٹری بنایا گیا اور ہر شیر کی اقل بمت پانچ سو روپے رکھی گئی اس طرح لمیٹڈ کمپنی کا ایک کچا خاکہ تیار ہوگیا اور اسے منفعت بخش بنانے کے اقدامات شروع ہوگئے ۔

ڈاکٹر حسین ظہیر • جے ۔ ایچ ۔ سبیا اور کمپنی کے صدر نشین این ۔ ایم ۔ جے سوریا کے علاوہ ہری لال داگھرے ایڈوکیٹ اور ر کے چند احباب نے جو پیام کے پرستاروں میں تھے پہلی فرصت میں پانچ پانچ سو کے شیرز خرید لیے کریم نگر کے بی ۔ ڈی ۔ راؤ اور راج ریڈی ایڈوکیٹ نے تو اپنے اثرات سے کام لیتے ہوئے کچھ اور شیرز ہولڈر بھی بنائے ۔

۔ مینیجنگ ڈائرکٹر ڈی ۔ کے ۔ ڈھگے نے میمورنڈم آف ایسوسی ایشن اور کمپنی کے قواعد و ضوابط کا ایک ابتدائی ڈرافٹ تیار کیا اگلی میٹنگ میں تھوڑے سے ردوبدل کے بعد منظور ہوگیا مگر جس معاہدہ کے تحت مجھے اس کمپنی کا کارگزار بنایا جانا تھا اس کی تکمیل میں مینیجنگ ڈائرکٹر نے لیت و لعل سے کام لینا شروع کیا اور جتنی رقم اب تک وصول ہوئی تھی اس پر پوری طرح اپنا رکھا اور صرف یہی نہیں اخبار کے کام میں مختلف طریقوں سے رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی ۔ اس ضمن میں کچھ ایسی باتیں ہوئیں

۔ محمود علی خاں اختر منیجر پیام نے استعفیٰ دے دیا اور کوکب دری بھی جو سکریٹری تھے ، منیجنگ ڈائرکٹر کے طرزِ عمل سے ناراض ہو بے تعلق سے ہوگئے نتیجہ یہ کہ جو کام لستے زور و شور سے شروع ہوا تھا اور فائدہ بخش بن سکتا تھا ، اس میں ایک مستقل تعطل پیدا گیا اور اسی دوران میں مسٹر ڈھگے نے ایڈیٹر سے معاہدہ وغیرہ کا جو مسودہ تیار کیا وہ نہایت ناقص اور میرے لیے بالکلیہ ناقابلِ قبول تھا ۔ یٹر کو کوئی اختیار نہیں دیا گیا تھا اور میری حیثیت اڈیٹر کیا دفتر کے ایک چپراسی سے بھی کم تر بنادی گئی تھی اور اس کو نہ جانے کیسے ڈاکٹر جے سوریا صدر نشین سے بھی درست منوالیا تھا ۔ میں اسے کیسے قبول کرسکتا تھا ۔

ادھر ڈھگے نے ایک اور چال چلی جب میں نے ان کے ڈرافٹ کیے ہوتے مہمل معاہدے پر دستخط کرنے سے صاف انکار دیا تو اس نے لمیٹڈ کمپنی کے ہی ایک اہم رکن عباس اپنے مشیرِ خاص کے نام سے کمشنر کو درخواست دی ۔ " پیام " ہی کے نام سے ایک بار نکالنے کی اور جوڑ توڑ کر کے ایک ہی دن میں ڈکلریشن لے لیا اور اخبار نکالا جس کا اداریہ ڈاکٹر جے سوریا سے لکھوایا ۔

یہ اپنی نوعیت کا ایک عجیب و غریب انوکھا واقعہ تھا کہ کسی حکومت نے ایک ہی شہر سے ایک ہی نام کے دو اخبار ، وہ بھی ز ناموں نکالنے کی اجازت دی ہو ۔ اور جانتے ہیں آپ یہ ڈکلریشن کس نے دیا ؟ علم بردار صاحب نے ۔ بہ ہرحال یہ شرمناک واقعہ ہوا ور ایک " پیام " ڈاکٹر جے سوریا کی ادارت میں نکلا دوسرا ایک " پیام " میری ادارت میں ۔ اس طرح تین تک دو " پیام " نکلتے رہے ۔ فتر پر قبضہ ان لوگوں کا تھا مگر اسٹاف کی اکثریت میرے ساتھ تھی ۔ اس وقت میں لال ٹیکری کے ایک دو منزلہ مکان میں تھا اور میرا یڈوریل آفس اس کی اوپری منزل پر تھا ۔ اسٹاف نے راتوں رات پیام کے اصل دفتر سے کچھ بہت ضروری فرنیچر وغیرہ اس دفتر میں منتقل ر لیا ۔

بڑا تکلیف دہ واقعہ تھا لیکن میں نے بہ ہرحال دشمنوں کے آگے سپر نہیں ڈالی ۔ میں نے احتجاج کیا کہ ایک نام سے دو ڈکلریشن یسے دیے جاسکتے ہیں ۔ کورٹ میں اپیل کی کورٹ نے اسے غیر قانونی قرار دیا ۔ مگر تین دن میں وہ ہمارے دفتر کا سارا اچھا فرنیچر اٹھا لے گئے اخبار کے سارے فائل بھی غائب کردیے گئے تھے ۔ اردو کا بہترین ٹائپ رائیٹر تھا قاضی صاحب کے زمانے کا وہ بھی اٹھا لے گئے اور دو نگریزی کے ٹائپ رائیٹر تھے وہ بھی اور پیسہ جتنا کچھ جمع ہوا تھا وہ سب ڈھگے کے قبضے میں تھا ۔ ۔ ۔ میں نے زندگی میں کسی سے نفرت ہیں کی ، کسی پر غصہ نہیں کیا مگر ان دو شخصوں ، مسٹر ڈھگے اور ان کے معتمدِ خاص داسوئی کو میں کبھی معاف نہیں کرسکتا جنھوں نے یرے کیریر کو نہیں ایک کاز کو نقصان پہنچایا اور مجھے مجبوراً پیام کو بند کرنا پڑا جس کے لیے میں نے اتنی قربانیاں دی تھیں ۔ پھر بھی میں نے ایک آخری کوشش اور کی ایک ہی نام کے دو ڈکلریشن کے جھگڑے سے نمٹنے کے لیے نئے نام " عوام " کا ان ہی علم بردار حسین صاحب سے ڈکلریشن حاصل کرلیا اور ہفتہ وار " عوام " نکالا ۔ مگر مالی موقف ہمارا اتنا کم زور تھا کہ میں اسے زیادہ عرصہ نہ چلا سکا اور ایک سال کے اندر ہی اسے بھی بند کرنا پڑا ۔ ۔ ۔ ۲۱ جنوری ۱۹۵۲ء کو " عوام " کا پہلا شمارہ نکلا تھا اور ۲ ستمبر ۱۹۵۲ء کو میری دوبارہ گرفتاری عمل میں آئی اور یکم نومبر ۱۹۵۲ء کو رہا ہوا ۔

نگار سجاد

تہذیب کیا ہے

تہذیب ، تمدن اور ثقافت عربی زبان کے ایسے الفاظ ہیں جو بعینہ اردو زبان میں بھی مستعمل ہیں ۔ لفظ تہذیب کا مادہ ہ ذ ب ہے ۔ ہذب کے معنی صاف کرنا ، درست کرنا ، پودوں اور درختوں کی شاخ تراشی کرنا ، ھذب الشعر یعنی شعر کی اصلاح ، ھذب الرجل یعنی پاکیزہ اخلاق والا بنانا (۱) مہذب یعنی پاکیزہ اخلاق والا ۔ اس عربی لفظ کو اردو زبان نے اس کے معنوں ، اختیار کیا ہے ۔ لہذا اردو زبان میں بھی تہذیب کے معنی پاک کرنا ، اصلاح کرنا ، درستگی ، آراستگی ، شائستگی اور خوش اخلاقی کے لیے جاتے ہیں ۔

اصطلاحاً تہذیب سے مراد انسان کا نظامِ فکر ہے یعنی انسان کے وہ عقائد ، نظریات و افکار ہیں جن سے اس کی شخصیت بنتی اور ا ہے ۔ اس کے خیالات جتنے زیادہ پاکیزہ روشن اور سلجھے ہوئے ہوں گے وہ معاشرے کا اتنا ہی مہذب شخص متصور ہوگا ۔ تہذیب کا سانی فکر و خیال اور ذہن سے ہوتا ہے اس اعتبار سے تہذیب کی کیفیت نظریاتی ، فکری ، روحانی اور غیر مادی ہوتی ہے ۔

تہذیب کے مترادف ایک اور لفظ " ثقافت " استعمال ہوتا ہے ۔ تاہم اس کے لغوی معنوں میں تھوڑا فرق ہے ۔ ثقف کے مین ہونا ، ہوشیار و دانا ۔ ثقف الولد کے معنی لڑکے کو مہذب بنانا ، تربیت دینا ، تعلیم دینا ، اسی طرح امراۃ (ثقاف) معنی بہت ورت کے ہیں (۲) اس لفظ کو بھی اردو زبان سے تقریباً ان ہی معنوں میں اپنا لیا ہے ۔ لہذا اردو میں اس کے معنی عقل نے کے ہیں ۔ یوں ثقافت کا تعلق بھی براہِ راست ذہن سے بنتا ہے اور اصطلاحاً یہ لفظ تہذیب کے مترادف کے طور پر کیا جاسکتا ہے ۔ بعض علما ان دونوں لفظوں کو ایک دوسرے کے متقابل سمجھتے ہیں جیسے کہ جمیل جالبی تہذیب کا تعلق انسان رسے بتاتے ہیں اور ثقافت کو روحانی اور باطنی حیثیت دیتے ہیں گویا ان کے نزدیک تہذیب ، ثقافت کے برعکس ہے ۔ (۳) ۔ اگر دونوں کے لغوی معنوں پر غور کیا جائے تو یہ تضاد غلط نظر آتا ہے ۔ لسان العرب میں بھی ثقافت کے معنی علوم و ادبیات پر قدرت و مہارت ، کسی چیز کو تیزی سے سمجھ لینے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے بتلائے گئے ہیں ۔ اس لفظ بھی " تہذیب " کی طرح انسانی ذہن کے کارناموں سے ہے ۔

تہذیب و ثقافت کے مقابل تمدن اور حضارت کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں ۔ تمدن کا مادہ م د ن ۔ مدن کے معنی اور مدن کے معنی شہر بنانا یا شہر آباد کرنا اور تمدن کے معنی شائستہ و مہذب ہونا ۔ (۴) تمدن کا لفظ اردو میں بھی ان ہی

معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی مل کر رہنے کا طریقہ ۔ طرزِ معاشرت ۔ یا انسان کا بڑے بڑے گروہوں میں مل کر ایک نظام
تحت زندگی بسر کرنا تمدن کہلاتا ہے ۔

اصطلاحاً تمدن کی تعریف کی جاسکتی ہے کہ تمدن وہ نظامِ عمل ہے جو انسان کے نظامِ فکر (تہذیب) کے تابع ہوتا ہے ۔ تمدن کا تا
چوں کہ انسانی افکار و خیال کے تحت سرزد ہونے والے ظاہری اعمال سے ہے لہذا اس کی حیثیت عملی ۔ ظاہری اور مادی ہوتی ہے ۔

تمدن کے مترادف دوسرا لفظ " حضارت " ہے ۔ اس کا مادہ ح ض ر ہے ۔ حضر کے معنی موجود ہونا ۔ حاضر ؛
اور حضارہ کے معنی شہر میں رہنے کے ہیں اور حضارہ یعنی شہر کی بودوباش ۔ (۵) اردو زبان نے اس لفظ کو بھی ان ہی معنٰ
سمیت اپنے اندر سمیٹ لیا ہے لہذا اردو میں " حضارت " کا لفظ شہری زندگی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ شہر بسانے اور بسا
کا تعلق بہ راہِ راست عمل سے ہے لہذا تمدن و حضارت کی کیفیت یہ ہے کہ یہ نظر آنے والی وہ عملی اور مادی چیز ہے جس
انسان مشاہدہ کرسکتا ہے جب کہ تہذیب کو یا تو محسوس کیا جاسکتا ہے یا سمجھا جاسکتا ہے مشاہدے کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا ۔

اب تک کی بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تہذیب (ثقافت) اور تمدن (حضارہ) میں ایک اعتبار سے فرق ۔
تہذیب کا تعلق انسانی فکروخیال اور عقائد و نظریات سے ہے جب کہ تمدن کا تعلق ظاہری اعمال سے ہے ۔ تاہم تہذیب و تمدن ا
دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور تلازمے کی یہ کیفیت ان کو ایک کر دیتی ہے ۔ تمدن دراصل تہذیب کا نتیجہ ہے ۔ یہ الفاظ د
" تمدن " تہذیب کا عملی مظاہرہ ہے ۔ جب تک تہذیب (نظامِ فکر) نہیں ہوگی تب تک تمدن (نظامِ عمل) کا سوال ہی پیدا نہ
ہوسکتا ۔ یہ روح اور جسم کے مانند ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور تلازمے کی یہی صفت ان کو ایک کردیتی ہے ۔ ا
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تہذیب و تمدن کے لیے ہم ایک ہی لفظ اختیار کرسکتے ہیں ؟ میرے خیال میں اس کا جواب اثبات
ہونا چاہیے ۔ اور وہ " تہذیب " ہے جس میں مادی اور غیر مادی دونوں پہلو شامل ہوں گے ۔

انگریزی زبان میں تہذیب کے مترادف کلچر (Culture) اور تمدن کے مترادف ۔
(Civilization) کے ــــــــ الفاظ مستعمل ہیں ۔ لفظ کلچر ابتدا میں صرف کاشت کاری کے لیے استعمال ہوتا تھا ۔ سترھو
صدی عیسوی تک یہ لفظ درختوں کی نشوونما اور کاشت کاری کے لیے استعمال ہوتا رہا (۶) اس کے بعد یہ جانوروں اور قدرتی پیدا
جیسے ریشم کی نشوو ارتقا کے لیے استعمال ہونے لگا ۔ (۷) اس کے بعد اس لفظ کے معنوں میں مزید تبدیلی آئی اور یہ انسانی جسم
تربیت کے معنوں میں استعمال کیا جانے لگا ۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی میں اس لفظ کے وہ معنی اختیار کیے گئے جو آج بھی ؛
یعنی کلچر کا لفظ تہذیب کے معنوں میں استعمال ہونے لگا ۔ (۸) اصطلاحاً کلچر کی جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ بھی تہذیب کی اصطلا
تعریف کے قریب قریب ہے ۔

ماہرینِ عمرانیات نے کلچر کی کئی تعریفیں بیان کی ہیں تاہم E. B. Tylor کی بیان کردہ تعریف سے بیش تر ماہرینِ عمرانیا

ئن نظر آتے ہیں جو انیسویں صدی کے آخری ربع میں وضع کی گئی تھی ۔ جس کی رو سے " کلچر " ایسا مرکب ہے جس میں علم ، بیدہ ، فن ، اخلاق ، قانون ، رسم و رواج اور دوسری ہر قسم کی صلاحیتیں اور عادتیں جن کا اکتساب انسان ، معاشرے کا ایک فرد نے کی حیثیت سے کرتا ہے ، موجود ہیں " ۔ (۹)

تاہم میرے خیال میں اس سے زیادہ سادہ مگر وسیع المعنی تعریف خود Robert Bierstedt کرتا ہے

" کلچر وہ مرکب ہے جو ہمارے نظام فکر ، نظام عمل اور ہر اس چیز پر مشتمل ہے جو معاشرے کا ایک رکن ہونے کی حیثیت ہم میں موجود ہے ۔ (۱۰)

کلچر کی طرح ہی لفظ Civilization میں بھی معنوں کے اعتبار سے واضح ارتقائی منازل نظر آتی ہیں ۔ یہ لفظ اٹھارویں صدی " قانون یا انصاف " کے لیے بولا جاتا تھا اس کے بعد یہ لفظ " انسانی معاشرے کی ترقی یافتہ شکل (A developed or advanced state of human society کے طور بولا جانے لگا ۔ (۱۱) ان معنوں میں Civlization کا لفظ تمدن کے مترادف نا ہے ۔

جس طرح ہم نے تہذیب اور تمدن کے لیے ایک ہی لفظ " تہذیب " ... یا ہے اسی طرح اب ماہرین عمرانیات کلچر اور یشن کے لیے ایک ہی لفظ " کلچر " استعمال کرنے لگے ہیں کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق کلچر ، سویلائزیشن کی ترقی یافتہ شکل ر تمدن رفتہ رفتہ تہذیب میں ڈھل جاتا ہے ۔

" تہذیب " ترقی یافتہ تمدن کے اس خاص پہلو کو بتاتی ہے جس کا تعلق حسن ، ہم آہنگی ، ستھرا پن اور پاکیزگی سے (۱۲)

اس بیان کے مطابق جب تمدن بہت زیادہ ترقی یافتہ ہوجائے اور اس میں حسن و خوبی نظر آنے لگے تو اس پر تہذیب کا ہوگا ۔ لیکن یہ بہت مبہم سا وصفِ اشتراک ہے کیوں کہ حسن ، خوبی اور پاکیزگی کی تعریف اور اس کے مفہوم جداجدا ہیں چناں ، کا حکم لگانا کہ کہاں پر پہنچ کر تمدن ، تہذیب کے سانچے میں ڈھل گیا نہایت مشکل ہے ۔

جدید ماہرین عمرانیات ، کلچر اور سویلائزیشن کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم گردانتے ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کی ت اور اہمیت نہیں ہے ۔ ہر ٹن ہنٹ کلچر کو غیر مادی سمجھتا ہے اور سویلائزیشن کو مادی سمجھتا ہے جو کہ ایک دوسرے کا لازمی ۔ اپنی اس بات کو وہ بیس بال کے کھیل کی مثال سے واضح کرتا ہے ۔ یعنی بیس بال کے کھیل میں دستانے ، بیٹ اور کھلاڑی وغیرہ مادی کلچر کے کچھ عناصر ہیں جب کہ کھیل کا طرز ، کھلاڑی کی توانائیاں ، ان کی حکمتِ عملی اور خاص روایتی انداز غیر مادی عناصر ہیں ۔ اب اگر بیس بال کے " کھیل " کو بھلا دیا جائے تو بلا (Bat) محض لکڑی کا ایک ٹکڑا رہ جائے گا ۔ (۱۳)

اس اعتبار سے سویلائزیشن (مادی کلچر) منطقی نتیجہ ہے کلچر (غیر مادی کلچر) کا اور دونوں ایک دوسرے کے بغیر بے معنی ہیں ۔

تہذیب کے عناصرِ ترکیبی تہذیب کی ایک جامع تعریف کے تعین کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ تہذیبیں کیسے وجود میں آتی ہیں ؟ وہ کون سے تکوینی عناصر ہیں جن کے ملنے سے انسانی معاشرے بنتے ہیں اور ان معاشروں میں تہذیب و تمدن پروان چڑھتے ہیں ۔ دنیا کی کم و بیش تمام معلوم تہذیبوں کے تشکیلی عناصر تین ہیں :

۱۔ جغرافیائی عنصر ۲۔ حیاتیاتی عنصر ۳۔ نظریاتی عنصر

جغرافیائی عنصر :- کسی جگہ یا مقام کی آب و ہوا ، جائے وقوع ، زمین کی ساخت اور معدنی وسائل وغیرہ اس میں شامل ہیں ۔ اسے ماحول یا گردو پیش بھی کہا جاسکتا ہے ۔ جغرافیائی ماحول یا گردو پیش انسان کی جسمانی ساخت ، اس کے خیالات ، اعمال اور معیشت سب پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ اس موضوع پر غالباً سب سے پہلے بقراط نے یہ کہہ کر روشنی ڈالی :

" اکثر حالتوں میں آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانوں کا جسم اور ان کی سیرت ملک کی نوعیت کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں ۔ (۱۴)

یونانیوں نے نظریہ ، ماحول کی تائید میں چند محبوب مثالیں دیں مثلاً زیریں وادیِ نیل کی زندگی نے مصریوں کی جسمانی ساخت ، سیرت اور اداروں پر ایک قسم کا اثر ڈالا اور یوریشیا کے صحرائی علاقے کی زندگی نے سیتھیوں کی جسمانی ساخت ، سیرت اور اداروں پر بالکل مختلف اثر ڈالا ۔ (۱۵)

بطلیموس نے دنیا کے آباد حصہ ، زمین کو سات قسموں پر تقسیم کیا تھا جن کو ہفت اقالیم ، کا نام دیا جاتا ہے ۔ ابنِ خلدون ان اقالیم پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد یہ ثابت کرتا ہے کہ ان اقالیم کے باشندوں پر مقامی حالات و آب ہوا کا گہرا اثر پڑتا ہے ۔ اس کے نزدیک گرم اقالیم (یعنی پہلی اور دوسری اقالیم) کے باشندے سیاہ فام گھنے بالوں اور وحشی فطرت کے حامل اس لیے ہوتے ہیں کہ وہاں سورج ان کے سر پر ہوتا ہے اور شدتِ گرمی کی وجہ سے ان کی کھال سیاہ پڑ جاتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی ان کے مزاج میں بھی وحشت اور گرمی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس سرد اقالیم (یعنی چھٹی اور ساتویں اقالیم) کے باشندے رنگ میں سرخ و سفید ہوتے ہیں ان کے بدن پر بال کم ، آنکھیں نیلی اور بال بھورے ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہوا شدتِ برودت کی وجہ سے سرد اور ٹھنڈی رہتی ہے اور زیادہ تر موسموں میں سردی شدید پڑتی ہے ۔ ان دونوں کے درمیان تیسری ، چوتھی اور پانچویں اقالیم کو ابنِ خلدون مجموعی طور سے " اقالیم معتدلہ " کا نام دیتا ہے ۔ اقلیم معتدلہ کے انسان تو انسان حیوان تک معتدل مزاج کے ہیں ۔ ان اقالیم کی آب و ہوا معتدل اور مثالی ہے حد یہ کہ نبوت بھی ان ہی اقالیم کے ساتھ مخصوص ہے ۔ ان اقالیم کے باشندے اسی اعتدال مزاجی کے باعث درجہ ، کمال پر ہوتے ہیں ۔ (۱۶)

کسی ملک کی طبعی حالت کا اثر وہاں کی معیشت پر بھی پڑتا ہے مثال کے طور پر ہندوستان کے جغرافیائی حالات میں سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ شمالی سرحد کے کوہستانی علاقے اور جنوبی جزیرہ نما کے مغربی اور مشرقی گھاٹوں کو چھوڑ کر تقریباً سارا ملک مسطح یا کسی قدر مرتفع میدانوں پر مشتمل ہے ۔ جنھیں بڑے بڑے دریا سیراب کرتے ہیں ۔ چند سرد خطوں سے قطعِ نظر موسم ساز

لے ایک حصے میں معتدل اور دوسرے حصے میں گرم رہتا ہے ۔ بارشوں کی کمی نہیں ۔ ملک کے بڑے حصے کی آب و ہوا یکساں کہی سکتی ہے لیکن پورے ملک میں سرد ترین سے لے کر گرم ترین اور مرطوب ترین سے لے کر خشک ترین تک ہر قسم کی آب و ا موجود ہے اور زمین کی حالت میں بھی اتنا تنوع ہے کہ قریب قریب ہر قسم کی نباتاتی اور معدنی پیداوار ملک کے اندر ہوتی ہے ۔ ر ہے جس ملک میں میدانوں کی کثرت ہو ، پانی افراط سے ہو اور سورج سال کے بڑے حصے میں زمین کو حرارت اور زندگی بخشتا ۔ وہ زراعت کے لیے خاص طور موزوں ہوگا ۔ چناں چہ ابتدا سے ہندستان کا پیشہ زراعت ہے ۔ (۱۷) بلکہ علم الاقوام کی تحقیقات ، بعد بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے زراعت ہندستان میں ہی شروع ہوئی ۔ (۱۸) گویا کہ ہندستان کی طبعی ت کا اثر وہاں کے ذریعہ ، معاش پر پڑا اور اس معیشت کا بہ راہِ راست اثر ہندستانیوں کی تہذیب و تمدن پر پڑا ۔ ظاہر ہے ں کی تہذیب ، شکاریوں کی تہذیب سے بہت مختلف ہوتی ہے اور ترقی کی ہر منزل پر وہ امن کو جنگ پر اور تعمیر کو تخریب پر ، دیتی ہے ۔ پھر بھی نہیں جغرافیائی عنصر کو تہذیبِ انسانی کی تشکیل میں اس وقت فیصلہ کن اہمیت حاصل ہوجاتی ہے جب " ا تہذیب " کا مسئلہ درپیش ہو ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کا کہنا ہے :

" تہذیب کا ترکیبی عنصر جو طبعی ماحول اور سماجی حالات پر مشتمل ہے خواہ نظریاتی عنصر کے مقابلے میں زیادہ اہم ہو یا نہ یکن تہذیب میں مقامی رنگ یہی پیدا کرتا ہے ۔ " (۱۹)

جغرافیائی عنصر وہ طاقت ور عنصر ہے جو انسانی فکر کو بھی متاثر کرتا ہے ۔ اس کی بہت عام اور مقبول مثال " وطنیت کی ۔ ایشیا کے مقابلے میں یورپ میں وطنیت زیادہ قوی اور عام کیوں ہے ۔ ۔ ۔ ؟ اس کی وجوہات میں سے ایک وجہ یورپ کے ائی حالات بھی ہیں ۔ ایشیا میں طبعی علاقے زیادہ وسیع ، مختلف اقسام کی آب و ہوا اور پہاڑوں کی مختلف اقسام پر مشتمل ہیں ۔ یہ ، زیادہ زرخیز ہیں اور ان میں وسائلِ حیات کی فراوانی ہے ۔ اس بنا پر برِ اعظم ایشیا میں مملکت کا میلان فطری طور پر وسعت وسعت کی طرف ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ اس خطہ ، زمین پر دنیا کی وسیع ترین سلطنتیں قائم ہوئیں ۔ اس کے برخلاف یورپ ندگی کی کشمکش ، تنازع للبقا شدید ہے ۔ اس کی آبادی گنجان ، علاقے تنگ اور وسائلِ معیشت محدود ہیں ۔ پہاڑوں اور دریاؤں کی سرحدوں نے مغربی اقوام کو مستقلاً تنگ فطری دائروں میں محصور کردیا ہے ۔ خصوصاً یورپ کا وسطی ، مغربی اور جنوبی حصہ وسیع ں کی نشوونما کے لیے موزوں نہیں ۔ اس لیے قدیم یورپ میں بھی سیاسی تصور ، شہری ریاستوں سے آگے نہیں بڑھ سکا جن کا ند میل سے زیادہ وسیع نہیں ہوتا تھا ۔ لیکن وہ بالکل خود مختار ہوتی تھیں اس کی اہم مثال یونان ہے ۔ یہاں قدیم ترین عہد سے چھوٹے چھوٹے خودمختار شہروں کا تذکرہ ملتا ہے ۔ " (۲۰)

اس ضمن میں ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ ماحول کوئی ساکن عامل نہیں جیسا کہ بعض یونانی دانش ور سمجھتے تھے ۔ (۲۱) ب و ہوا ، علاقے کے جغرافیائی حالات اور زمین کی ساخت وغیرہ میں تبدیلی آتی رہتی ہے گو کہ تبدیلی کا یہ عمل بہت سست

اور صدیوں پر محیط ہوتا ہے ۔ افریقہ کا جو صحرا آج ہمیں جھلسا ہوا نظر آتا ہے وہ برفانی دور میں باقاعدہ سیراب ہوتا تھا ۔ (۲۲) پہاڑ شکست و ریخت کے عمل سے گزرتے رہتے ہیں ، دریا اپنی گزرگاہیں تبدیل کرتا رہتا ہے ، سمندر اپنی حدود بدلتا رہتا ہے لیکن یہ سب دنوں مہینوں میں نہیں بلکہ صدیوں میں ہوتا ہے ۔ ان جغرافیائی تبدیلیوں کا اثر مقامی تہذیبوں میں بھی تبدیلی لاتا ہے ۔

بعض ماہرین نے تہذیب کے تکوینی عناصر میں معاشی عنصر (ECONOMICAL FACTORS) کو بھی شامل کیا ہے ۔ لیکن فی الحقیقت اس عنصر کی کوئی جدا گانہ حیثیت نہیں ہے بلکہ اس کو جغرافیائی عامل کے تحت لیا جانا چاہیے کیوں کہ کسی ملک کی معیشت کیا ہوسکتی ہے اس کا فیصلہ انسان نہیں قدرت کرتی ہے ۔ انسان قدرت کے اس فیصلے کو تبدیل تو کرسکتا ہے لیکن قدرت کے فیصلوں میں اتنی منفعت ہوتی ہے کہ انسان خود ہی اس کو تبدیل نہیں کرتا اور قبول کرلیتا ہے ۔ ہندوستان قبلِ مسیح میں بھی ایک زرعی ملک تھا ، آج ایٹمی طاقت بن جانے کے باوجود اس کی زرعی حیثیت مسلمہ ہے ، صرف اس وجہ سے کہ ملک کی طبعی حالت ہی ایسی ہے کہ اس کو ایک زرعی ملک ہونا چاہیے ۔

حیاتیاتی عنصر :- اسے نسلی عامل بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اس میں رنگ ، نسل ، زبان اور تمام تر وراثتی اور نسلی صلاحیتیں ، عادتیں اور قابلیتیں شامل ہوتی ہیں جو کہ رسوم و رواج کی صورت میں نسل در نسل چلتی ہیں ۔ ٹائن بی ان کی تعریف یوں کرتا ہے : " نسل کی اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کے خاص گروہوں میں چند امتیازی وصف ہیں جو ان کے جانشینوں میں بہ طورِ میراث منتقل ہوجاتے ہیں ۔ (۲۳) ان وصف سے مراد محض نفسی خصائص ہی نہیں بلکہ بدیہی جسمانی خصائص بھی ہیں ۔

ابنِ خلدون کا خیال ہے کہ " کسی خاندان کے اوصاف چار پشتوں تک چلتے ہیں ، کوئی خاندان مسلسل شرف و نسب کا مالک نہیں رہتا ۔ لیکن ابنِ خلدون اس امر کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ شرف و حسب کی زندگی و بقا کے لیے چار پشتوں کی حد کوئی قاعدہ ، کلیہ نہیں ، کوئی خاندان اپنا شرف چار پشتوں تک بھی برقرار نہیں رکھ سکتا اور کوئی خاندان یہ سلسلہ پانچویں اور چھٹی پشت تک کھینچ لے جاتا ہے لیکن چار پشتوں کے بعد زوال ضرور شروع ہوجاتا ہے ۔" (۲۴)

بہ ہر حال مختلف خاندان یا قبیلے یا نسلیں اپنی جبلی عادتوں ، خصلتوں اور قابلیتوں سے تکوینِ تہذیب کا باعث ہوتی ہیں ۔ جس طرح جغرافیائی عامل کسی تہذیب کو مقامی رنگ عطا کرتا ہے ۔ اسی طرح حیاتیاتی عنصر کسی تہذیب کو دوسری تہذیب سے نمایاں اور ممتاز کرتا ہے ۔

جس جسمانی خصوصیت پر نسلی نظریات کے مغربی داعی بہ طورِ خاص زور دیتے ہیں وہ رنگ ہے ۔ سفید رنگ کو برتری کا نشان سمجھا جاتا رہا ۔ شاید اسی لیے ہندستان میں آنے والے آریاؤں نے ہندستان کے مقامی لوگوں کو نیچ اور کمتر سمجھا ، کیوں کہ وہ نہ گورے چٹے تھے اور نہ آریاؤں کی طرح لمبے چوڑے اور بعد میں منوشاستر میں ان کو مستقلاً شودر کا درجہ دے دیا گیا ۔ تہذیب کے جدید نسلی نظریات میں سب سے ہر دل عزیز نظریہ وہ ہے جس میں سفید فام نسل کے سنہرے بالوں ، بھوری آنکھوں اور لمبوترے سر والے

لوگوں کو تختِ برتری پر بٹھایا گیا ۔ (۲۵) پہلی جنگِ عظیم کے بعد بھی اسی قسم کے رجحانات کی لہر نے جرمنوں سے دعویٰ کروایا کہ وہ دنیا کی سب سے برتر اور عظیم قوم ہیں اور اس دعوے نے ان کی اندر من حیث القوم ایک طرح کا (NATIONAL SENTIMENT) پیدا کیا ۔ (۲۶)

جس طرح سے یورپ کا دعویٰ سفید رنگ کی وجہ سے برتری کا تھا ۔ اسی طرح جاپانیوں نے اس غرض کے لیے بالکل مختلف جسمانی معیار مقرر کیا ۔ اتفاق یہ ہے کہ جاپانیوں کے جسم غیر معمولی طور پر بالوں سے پاک ہوتے ہیں اوران کے پڑوس میں شمالی جزیرے میں بالکل مختلف قسم کی قدیم قوم آباد ہے جس کا جسمانی نمونہ عام اہلِ یورپ سے ایک حد تک ملتا جلتا ہے انھیں " بالوں والے آئینو " کہا جاتا ہے ۔ اس بنا پر جاپانیوں نے طبعاً بالوں کے نہ ہونے کو روحانی برتری کا نشان قرار دے لیا ۔ اگر چہ ان کا یہ دعویٰ ویسا ہی بے بنیاد ہے جیسا سفید رنگ کی برتری کا مغربی دعویٰ لیکن سطحی طور پر ان کا یہ دعویٰ ثانی الذکر کی نسبت زیادہ معقول نظر آتا ہے اس لیے کہ جس انسان کے جسم پر بال نہ ہوں وہ اپنے اس بھائی کے مقابلے میں بندر سے زیادہ دور ہے جس کے بدن پر تھوڑے بہت بال ہوں ۔ (۲۷)

اس قسم کے نسلی نظریات کو کوئی مانے یا نہ مانے لیکن اس امر سے انکار دشوار ہے کہ یہ عامل تکوینِ تہذیب کا باعث ہوتا ہے ۔ کسی خاندان یا قبیلے یا نسل میں احساسِ کم تری یا احساسِ برتری کے مہلک جراثیم اس عامل کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جس کا اثر ان کے پورے نظامِ حیات پر پڑتا ہے ۔ گویا ایک طرف تو یہ عامل کچھ خیالات و افکار اور کچھ عادات و اطوار اپنی آنے والی نسل کو دیتا ہے جس سے خیالات کی ایک خاص فضا پیدا ہوجاتی ہے ۔ دوسری طرف یہ عنصر کسی بھی اجنبی کی شناخت کا ذریعہ بن سکتا ہے اگر پاکستانی معاشرے میں ایک بوٹے قد ، پیلی رنگت ، چھوٹی مگر کھلی آنکھیں اور چپٹی ناک والا اجنبی آجائے تو دیکھنے والا جان سکتا ہے کہ یہ چینی تہذیب کا ایک فرد ہے ۔

نیز یہ عنصر انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان رسوم و رواج ، اعراف و اقدار کا جو اس کو وراثتی طور پر ملے ہیں ، احترام کرے ۔ معاشرہ قوتِ نافذہ کے طور پر کام کرتا ہے اور قوانین کی عدم موجودگی کے باوجود افراد ان رسوم و رواج کی پابندی کرتے ہیں اور ان کا ضمیر اس پر مطمئن ہوتا ہے ۔

حیاتیاتی عنصر میں ہم زبان کو بھی شامل کرسکتے ہیں جسے تہذیب کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھا گیا ہے ۔ (۲۸) زبان جو کہ انسان کو موروثی طور پر اپنے والدین سے ملتی ہے نہ صرف اس کی شناخت کا ذریعہ ہے بلکہ یہ تہذیب کو بھی زندہ رکھتی ہے کیوں کہ تہذیبوں کے حالات ، ان کی ادبیات اور دیگر ایجادات زبان ہی کی وجہ سے محفوظ رہتی ہیں ۔ جو زبانیں آج فنا ہوچکی ہیں ان کی تہذیبوں کا بھی نام و نشان مٹ چکا ہے ۔

نسلی یا حیاتیاتی عنصر ساکن عامل نہیں ہے لہذا نسلوں اور قوموں رنگ ، زبان اور عادات و خصائل کے اعتبار سے

تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور اب دنیا میں کوئی قوم یا نسل خالص ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی ۔ بین الاقوامی جنگیں ، شادیاں ، مہاجرت اور خلائی وغیرہ ایسے بے رحم عوامل ہیں جنھوں نے رنگ و خون اور زبانوں میں زبردست آمیزش پیدا کردی ۔ (۲۹) نسلوں کے خالص ہونے کا تصور بہت ہی ابتدائی زمانوں میں تو تسلیم کیا جاسکتا ہے یا پھر بہت ہی الگ تھلگ معاشروں ISOLATED SOCIETIES) میں اس کے وجود کو منطقی سمجھا جاسکتا ہے وگرنہ ہر قوم اور ہر نسل ، زبان ، رنگ ، خون اور عادات و خصائل کے اعتبار سے تبدیلیوں سے دوچار ہوتی رہتی ہے ۔

حیاتیاتی عنصر نسبتاً کم زور عنصر ہے اور بعض ماہرین کے نزدیک اس کی کوئی جداگانہ حیثیت بھی نہیں کیوں کہ اگر ہم " نسل کے سلسلے میں ٹائن بی کی تعریف (۳۰) کو معیار قرار دیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ " امتیازی وصف " سے کیا مراد ہے ؟ اگر اس سے مراد ان کے رسوم و رواج اور عادات و خصائل ہیں جو ان میں من حیث القوم پائے جاتے ہیں تب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عادات و خصائل کس کے عطا کردہ ہیں ؟ کیا ان کو ان کے طبعی ماحول نے یہ عادات اختیار کرنے پر مجبور کیا ۔ یا پھر ان کے عقائد و نظریات نے یہ امتیازی وصف عطا کیا ۔ ان دونوں صورتوں میں حیاتیاتی عنصر کی جداگانہ حیثیت پر ضرب لگتی ہے ۔

اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ حیاتیاتی عنصر کی اس وقت جداگانہ حیثیت ہوجاتی ہے جب یہ جغرافیائی اور نظریاتی عناصر کے مجموعی اثرات کو قبول کرتے ہوئے وجود میں آتا ہے ۔ جس طرح ایک نوزائیدہ بچہ ، جوان و توانا ہونے پر اپنے الگ خاندان کی بنیاد ڈالتا ہے ۔

نظریاتی عنصر ۔ تکوینِ تہذیب کا یہ انتہائی بنیادی اور اہم ترین عنصر ہے اس میں انسان کا پورا نظامِ فکر ، یعنی حیات کائنات کے بارے میں اس کے نظریات ، اعتقادات اور خیالات شامل ہوتے ہیں ۔ یہ اعتقادات و نظریات انسانی بھی ہوسکتے ہیں اور الہامی بھی دونوں صورتوں میں اس کو مذہب بھی کہا جاسکتا ہے ۔ مذہب کا معاملہ تہذیب کے سلسلے میں بڑا پیچیدہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔ مذہب ایک معنی میں تو کل تہذیب پر حاوی ہے اور اس کی تکوین کرتا ہے ۔ اور ایک دوسرے معنی میں مذہب محض تہذیب کا ایک جزو ہے اگر مذہب شخصی سطح پر چند رسوم و عادات کا مجموعہ ہو تو تہذیب کا محض ایک جزو ہوگا ۔ یہ جزو اہم بھی ہوسکتا ہے اور غیر اہم بھی ۔ لیکن اگر مذہب کو اس کے حقیقی معنوں میں لیا جائے جو کہ انسان کو انفرادی طور پر ہی نہیں بلکہ اجتماعی طور پر پوری زندگی کے تمام شعبہ ہائے حیات میں راہ نمائی کرتا ہے تب یہ تہذیب کا ایک اہم ترین تکوینی عنصر ہوگا ۔

آغازِ تہذیب کی بابت دو نظریات ملتے ہیں ایک " عینی نظریہ " دوسرا " مادی نظریہ " عینی نظریہ ، یہ ہے کہ دنیا کے ارتقا کی کسی منزل میں ایک شخص یا کئی اشخاص کو ایک برتر قوت کی طرف سے وحی یا الہام کے ذریعے سے اقدارِ اعلیٰ یا اعیان (۳۱) کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے ۔ یا وہ اپنے وجدانِ صحیح سے خود دیکھنے لگتے ہیں ۔ پھر اسی سماجی ماحول میں جو ان کے ارد گرد موجود ہے یہ مشاہدہ ایک " معروضی ذہنی " (۳۲) شکل اختیار کرلیتا ہے اور جماعت کا نصب العین بن جاتا ہے اور یہ نصب العین اس طرح

ماحول میں ، جس میں یہ جماعت رہتی ہے ایک خاص نفسی یا مادی شکل اختیار کرلیتا ہے ۔ مثلاً اس نظریے کے مطابق ویدک زمانے میں چند رشیوں کو الہام یا وجدان سے " اعیان " کی ایک جھلک نظر آئی جس نے آریا قوم کی اجتماعی حالت اور صلاحیت کے مطابق ایک نصب العین کی شکل اختیار کرلی ۔ اس نصب العین کو وادیِ سندھ اور وادیِ گنگا کے طبعی ماحول میں حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور وہ تصورات و ادارات وجود میں آئے جو مجموعی طور پر ویدک تہذیب کہلاتے ہیں ۔ (۳۳)

دوسری طرف مادی نظریہ یہ ہے کہ اصل چیز طبعی ماحول ہے۔پہلے انسان کی اجتماعی زندگی آب و ہوا ، مادی وسائل اور ان آلات کے اثر سے جو پیدائشِ دولت کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں ایک خاص شکل اختیار کرلیتی ہے ۔ اس کی بنا پر اصول و ضوابط منضبط ہوتے ہیں اور پھر ان سے عملِ تجرید کے ذریعے اقدار کے مجرد تصورات بنتے ہیں جن کا مستقل وجود فرض کر کے ہم انھیں " اعیان " کہنے لگتے ہیں ۔ مثلاً اسی ویدک تہذیب کے بارے میں مادیئین یہ کہیں گے کہ اس کی بنیاد وہ جغرافیائی ماحول خصوصاً وہ زراعتی طرزِ زندگی تھا جس سے قلبۂ بدوش آریاؤں کو ہندستان پہنچ کر سابقہ پڑا اور اسی پر رفتہ رفتہ ان کے مذہب اور سماجی نظام کی عمارت تعمیر ہوئی ۔ (۳۴)

آغازِ تہذیب سے متعلق مندرجہ بالا دونوں نظریات میں نظریاتی ، حیاتیاتی اور جغرافیائی عناصر کو تہذیبِ انسانی کے تشکیلی عوامل کے طور پر قبول کیا گیا ہے ۔ فرق صرف تقدم کا ہے ۔ عینی نظریے میں نظریاتی عنصر کو اولیت اور تقدم حاصل ہے تو مادی نظریے میں جغرافیائی عامل کو نظریاتی عامل سے زیادہ تقدم اور اہمیت ملی ہے ۔

اس ضمن میں ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ جس طرح جغرافیائی عنصر کسی تہذیب میں مقامیت پیدا کرتا ہے وہیں نظریاتی عامل ، تہذیبوں میں آفاقیت پیدا کرتا ہے کیوں کہ یہ تصوراتی یا فکری عنصر جو ان خیالات ، نظریات اور اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اقدارِ اعلیٰ کے شعور سے پیدا ہوتے ہیں ، مقام کا پابند نہیں ہوتا بلکہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک قوم سے دوسری قوم میں پہنچ سکتا ہے ۔ قدیم اور جدید تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ایک تہذیب یا فلسفہ ، زندگی یا سیاسی اصول یا معاشی نظریہ پہلے دنیا کے کسی خطے میں جنم لیتا ہے اور پھر دوسرے حصوں میں پھیلتا چلاجاتا ہے ۔ مختلف آب و ہوا میں رہنے والی ، مختلف نسلی امتیازات رکھنے والی قومیں اسے کلی یا جزوی طور پر اختیار کرلیتی ہیں ، تمام جن مذاہب ، یا فلسفہ یا اصول و نظریات کا درجہ زیادہ بلند نہیں ہوتا یا وہ زیادہ ہمہ گیر نوعیت کی نہیں ہوتیں وہ طبعاً مقامی ہی رہ جاتے ہیں ۔ یہ نظریات قبیلوں یا چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو مطمئن کرسکتے ہیں ۔

نظریاتی عنصر تہذیب کی تشکیل اس طرح کرتا ہے کہ وہ بہ راہِ راست انسانی فکر پر اثر انداز ہوتا ہے کیوں کہ کوئی فلسفہ یا مذہب انسان اور کائنات کے تمام عقدہ ہائے لاینحل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے مخاطب کو بتاتا ہے کہ فی الواقع وہ کیا ہے ؟ زندگی کیا ہے ؟ اس کائنات کی حقیقت اور اس میں انسان کی حیثیت کیا ہے ؟ اور اس اعتبار سے اس کی زندگی کا نصب العین

کیا ہونا چاہیے ؟ فکرِ انسانی ان نظریات سے متاثر ہوتی ہے جس کا بہ راہِ راست اثر اس کے اعمال پر پڑتا ہے جس کا مشاہدہ اس کی روز مرہ کی زندگی میں کیا جاسکتا ہے ۔

اگر کوئی مذہبی نظام ہمہ گیر نوعیت کا ہوتو اس کا اثر تمام شعبہ ہائے زندگی پر پڑتا ہے اور اگر یہ اثرات نتائج کے اعتبار سے بہتر ین ہوں تو دوسری قومیں بہ تدریج اس کو اپنا لیتی ہیں ۔ اسی طرح اگر کوئی فلسفہ محض کسی خاص شعبے سے متعلق ہو تو اس کا اثر اس شعبے پر خصوصیت سے پڑے گا جس طرح سے سوشلزم ۔ مارکس اور اینجلز کے ان معاشی خیالات پر مبنی ہے جس کی اشاعت انھوں نے حالتِ جلاوطنی میں لندن میں بیٹھ کر کی ۔

یورپ کی جس عظیم صنعتی زندگی کو ٹائن بی مسیحیت کی رہبانیت کی ایک ضمنی پیداوار سمجھتا ہے اس کے خیال میں اس عظیم الشان مادی عمارت کی نفسیاتی بنیاد و اساس یہ عقیدہ ہے کہ جسمانی ریاضت و محنت ایک فریضہ ہے اور اس ریاضت کا احترام لازمی ہے ۔ اس کے برخلاف محنت کے متعلق یونانی تصور یہ تھا کہ یہ پایہ ۔ ثقافت سے گرا ہوا مشغلہ ہے اور اس میں انسان کی تذلیل ہوتی ہے ۔ (۳۵)

اسی طرح ہندوستان میں زراعت کی طرف زبردست رغبت اور بحری تجارت سے احتراز کی ایک وجہ تو وہاں کا مخصوص طبعی ماحول تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مقامی ہندوؤں کے نزدیک بحری سفر خلافِ عقیدہ تھا ۔ اس لیے بھی بحری تجارت کو ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاتھوں فروغ حاصل نہ ہوسکا ۔ یہاں بحری تجارت شروع کرنے والے زیادہ تر عرب یا دوسرے غیر ملکی تھے ۔

اسی طرح مذہب کا اثر فنونِ لطیفہ اور تعمیرات تک پر بھی پڑتا ہے ۔ اسلام ایک سیدھا سادہ روشن مذہب ہے ۔ یہ سادگی مسلمانوں کے فنِ تعمیر میں بھی نظر آتی ہے ۔ دوسرے مذاہب کے معابد میں پراسرار ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ کہیں بالکل اندھیرا ہوتا ہے تو کہیں سورج کو رنگے ہوئے شیشوں سے گزارا جاتا ہے تاکہ دماغ پر ایک مخصوص قسم کی اجنبیت اور ہیبت پیدا ہوسکے ۔ مسجد کی سب سے عام چیز صحن ہے جہاں زیادہ سے زیادہ روشنی اور ہوا آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کا سارا فلسفہ ۔ زندگی ابہام اور رمزیت سے دور ہے لہٰذا اسلامی عمارت کے نقشے سیدھے سادے ہوتے ہیں اور یہ عمارتیں گوتھک عمارتوں کی طرح بھول بھلیاں بھی نہیں ہوتیں ۔ (۳۶)

ٹائن بی کا نظریہ ۔ تکوینِ تہذیب :- آرنلڈ ۔ جے ۔ ٹائن بی اپنی شہرہ ۔ آفاق کتاب (مطالعہ ۔ تاریخ) میں ان تکوینی عناصر کا جائزہ پیش کرتا ہے جو انسانی تہذیبوں کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور اس ضمن میں وہ پہلے ماحول اور پھر نسل پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد انھیں تکوینی عناصر کے طور پر قبول نہیں کرتا ۔ البتہ مذہب کی تکوینی حیثیت کا قائل ہے ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس ضمن میں اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ غلط یا متنازعہ ہے ۔

ٹائن بی دراصل جب لفظ " تہذیب " استعمال کرتا ہے تو اس سے اس کا مطلب " عظیم تہذیب " ہوتا ہے لہٰذا وہ اپنے

نظریے میں دراصل تہذیب کی تکوین کی بات نہیں کرتا بلکہ تہذیب کے اعلیٰ ترقی یافتہ شکل کی تکوین کی بات کرتا ہے اور یہ اس کا موضوع اس موضوع سے بالکل مختلف قرار پاتا ہے۔ جن معاشروں نے ترقی نہیں کی اور تہذیب کی اوج پر نہیں پہنچے وہ انھیں عظیم تہذیب نہیں مانتا اور نہ ہی انھیں موضوع بحث بناتا ہے۔ جب کہ ہمارا موضوع کسی بھی تہذیب کے تکوینی عوامل ہے، خواہ وہ عظیم تہذیبیں بن سکی ہوں یا نہیں۔ اسی طرح سے وہ نسل اور ماحول کو بالکل رد نہیں کرتا بلکہ انھیں نئی روشنی میں دیکھتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ مختصراً ٹائن بی کے نظریہ تکوین تہذیب پر روشنی ڈال دی جائے۔ اس ضمن میں ٹائن بی دعوتِ مقابلہ اور Challenges and response کا نظریہ پیش کرتا ہے اور اسی کو (عظیم) تہذیب کا تکوینی عنصر قرار دیتا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک نسل (حیاتیاتی عنصر) اور ماحول (جغرافیائی عنصر) الگ الگ تہذیب کی تکوین نہیں کرسکتے بلکہ تہذیب کی تکوین ان عناصر کے باہمی تعامل میں پوشیدہ ہے۔ وہ اس طرح کہ جب ماحول دعوتِ مقابلہ دے (یعنی ماحول ناموافق حالات پیدا کردے) اور انسان اپنی قوت اور عقل و دانائی سے اس کا مؤثر جواب دے تب تہذیبی معاشرے وجود میں آتے ہیں۔ ماحول دعوتِ مقابلہ، دلدل، جنگلات، شدید حرارت، طوفان، قحط، خوفناک سمندر، ناموافق آب و ہوا یا بنجر مٹی کی صورت میں دے سکتا ہے۔ اگر انسان اپنی قوتوں سے ان ناموافق حالتوں سے نمٹ لے تو عظیم تہذیب وجود میں آتی ہے۔

اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے ٹائن بی تقریباً تمام بڑی تہذیبوں کی مثال دیتا ہے طوالت کے خوف سے ہم صرف مصری تہذیب کا حوالہ دے کر باب ختم کرتے ہیں۔

مصری تہذیب کی تکوین کی صورت یہ ہوئی کہ برفانی دور کے اختتام پر افریشیا کے خطے میں گہرا طبعی تغیر شروع ہوا، اس میں خشکی پیدا ہونے لگی۔ جب اس علاقے کے لوگوں کو شدید خشک سالی سے سابقہ پڑا تو متاثرہ علاقے کی شکار پر گزر بسر کرنے والی آبادی کے سامنے تین راستے تھے۔ اول یہ کہ وہ اپنے شکار کے پیچھے پیچھے شمال یا جنوب کی طرف نکل جائیں اور ان خطوں میں پہنچ جائیں جہاں کی آب و ہوا ویسی ہی بن گئی تھی جس کہ وہ عادی تھے۔ دوئم یہ کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں جو تھوڑے بہت جانور خشک سالی سے بچ رہے تھے ان کے شکار پر جیسے تیسے کر کے بسر اوقات کریں۔ سوئم یہ کہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں لیکن جانور پال کر کھیتی باڑی کر کے حالات پر قابو پائیں۔

یہ حالت پیش آنے پر جن لوگوں نے نہ وطن چھوڑا نہ طرزِ بود و باش بدلا یعنی دوسرا طریقہ اختیار کیا وہ تو صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ خشک سالی نے انھیں دعوتِ مقابلہ دی لیکن وہ اس کا مناسب جواب دینے میں ناکام رہے۔

جن لوگوں نے وطن نہ چھوڑا اپنا طرزِ معاشرت بدل لیا (یعنی تیسرا طریقہ اختیار کیا) وہ شکار کو چھوڑ کر کھیتی باڑی میں لگ گئے اور مویشی پالنے کے ساتھ ساتھ دہقان بن گئے۔

جن لوگوں نے اپنی جائے سکونت بدلی اور طرزِ بود و باش نہ چھوڑا وہ خشک سالی سے بچنے کے لیے شمال کی

بارانی ہواؤں والے خطے میں چلے گئے ۔ اس طرح انھیں بلا ارادہ ایک نئی دعوتِ مقابلہ سے دوچار ہونا پڑا جو لوگ اس شدید سرد موسم سے بچ گئے ان میں ایک نئی تخلیقی قوت حرکت میں آگئی ۔

جو لوگ خشک سالی سے بچنے کے لیے جنوب کی سمت چلے گئے جہاں بارشیں ہوتی تھیں ، وہ منطقہ ، حارہ کی یکساں و بے رنگ آب و ہوا سے پیدا ہونے والے روح فرسا اثرات کے ماتحت آگئے ۔ لوگوں کا پانچواں اور آخری گروہ وہ تھا جس نے خشک سالی کی دعوتِ مقابلہ میں اپنی جائے سکونت بھی بدل لی اور طریق معاشرت بھی بدل لیا اس نادر دو گونہ ردِ عمل کے باعث افریشیا کے بہ تدریج معدوم ہونے والے مرغ زاروں کے بعض قدیم معاشروں سے مصر اور سمیریا کی تہذیبیں معرضِ وجود میں آگئیں ۔

○○ ●●● ○○

حوالے

(۱) المنجد ، دارالاشاعت ، کراچی ، جولائی ۱۹۷۵ ، ص ۱۱۲۲

(۲) ایضاً ص ۱۲۵

(۳) جمیل جالبی ، پاکستانی کلچر ص ۴۳

(۴) المنجد ص ۹۵۲

(۵) المنجد ص ۲۱۷

(۶) دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری ، جلد دوم ، آکسفورڈ ۱۹۷۸ ، ص ۱۲۳۷

(۷) ایضاً

(۸) (The Training development and refinement of mind taste and manners The intellectual side of civilization)

(۹) ROBERT BIERSTEDT " THE SOCIAL ORDER " P. 127

(۱۰) دی سوشیل آرڈر ص ۱۲۷

(۱۱) دی آکسفورڈ انگلش ڈکشنری ، جلد دوم ص ۳۳۸

(۱۲) " انسائیکلو پیڈیا آف سوشیل سائنسز " جلد سوم ، نیویارک ۱۹۵۱ ، ص ۹۲۱

(۱۳) " ہرٹن ہنٹ " سوشیالوجی ، نیویارک ۱۹۶۲

(۱۴) ٹائن بی ، آرنلڈ جے ، مطالعہ ، تاریخ (جلد اول) ص ۱۱

(۱۵) تلخیص ڈی ۔ سی ۔ سومرویل ، (ترجمہ) غلام رسول مہر ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ۱۹۶۴ ۔

(۱۶) ابن خلدون " مقدمہ "

(۱۷) ڈاکٹر سید عابد حسین ، قومی تہذیب کا مسئلہ

(۱۸) ایضاً

(۱۹) ایضاً

(۲۰) ندوی ، سید ابوالحسن علی ، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ، کراچی ۱۹۷۶ ، ص ۲۴۱

(۲۱) ٹائن بی ص ۱۰۳

(۲۲) مجلہ ص ۱۳۱

(۲۳) ایضاً ص ۱۰۴

(۲۴) ابن خلدون ص ۱۹۲

(۲۵) ٹائن بی ص ۱۰۵

(۲۶) ایڈولف ہٹلر Mein kampf ، بوسٹن ص ۳۲۶

(۲۷) ٹائن بی ص ۱۰۵

(۲۸) انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز (جلد ۳) ص ۶۲۲

(۲۹) ROBERT BIERSTEDT ص ۳۷

(۳۰) «نسل» کی اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کے خاص گروہوں میں چند امتیازی وصف ہیں جو ان کے جانشینوں میں بہ طریق خاص میراث منتقل ہوجاتے ہیں (ٹائن بی ص ۱۰۳)

(۳۱) (اعیان) ، در اصل ایک تشریح طلب اصطلاح ہے جو افلاطون کی وضع کردہ ہے افلاطون اور بعض فلسفیوں کے خیال میں وجود کی کئی قسموں میں سے ایک قسم «عینی» ہوتی ہے ۔ اس میں وہ مثالی نمونے یا معیار داخل ہیں جن پر ہم پوری زندگی کے ہر ہر اصول و فعل کو پرکھتے ہیں اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں ۔ ان اعیان کو «اقدارِ اعلیٰ» بھی کہا جا سکتا ہے ۔ جن میں حق ، حسن اور انصاف وغیرہ شامل ہیں ۔ (قومی تہذیب کا مسئلہ ص ۶)

(۳۲) «معروضی ذہنی» یہ بھی وجود کی ایک قسم ہے اس کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ وہ خیالات ، معتقدات اور اصول جو صرف ایک فرد کے نفس تک محدود نہ ہوں بلکہ بہت سے افراد میں میں مشترک ہوں اور ایک پود سے دوسری پود میں منتقل ہوتے رہیں مثلاً مذہب ، قانون ، ریاست (مجرد معنوں میں) وغیرہ ۔ ۔ ۔ فلسفیوں نے اس قسم کے وجود کا نام «ذہنی معروضی» وجود رکھا ہے ۔ (قومی تہذیب کا مسئلہ ص ۵ ۔ ۶)

(۳۳) قومی تہذیب کا مسئلہ ص ۲۷

(۳۴) ایضاً

(۳۵) ٹائن بی مطالعہ ، تاریخ ص ۱۳۸

(۳۶) صدیقی ، عبدالحمید ، عقیدہ ، ختم النبوت کے چند عمرانی پہلو ، مرکز مطبوعات اسلامیہ لاہور (طبع اول) ۱۹۶۳ ، ص ۳۲

○○○ ● ○○○

غلام نبی خیال

کشمیری زبان کی چند بزمیہ مثنویاں

مثنوی کشمیری ادب میں اٹھارویں عیسوی کے اخیر پر داخل ہوئی ۔ اس وقت ریاست کے گوشے گوشے میں فارسی کا دور دورہ تھا اور دربار سے لے کر عوام الناس تک سبھی اس زبان کے اثرات میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ درمیانی طبقے کے لوگ خاص طور پر فارسی علم و ادب سے کما حقہ واقفیت حاصل کرلیتے تھے ۔ درس گاہوں میں بھی فارسی زبان کے کلاسیکی شہ پارے شاملِ نصاب تھے ۔ چوں کہ اس قسم کی ساری تصانیف رزم و بزم کے کارناموں اور رومانی قصوں اور کہانیوں سے بھری ہوئی تھیں نتیجے کے طور پر مقامی شاعروں نے بھی ان داستانوں کو مزے لے لے کر پڑھنا شروع کیا ۔ اس سے متاثر ہوکر انھوں نے مواد کو اپنی زبان میں استعمال کیا اور کشمیری ادب میں عشقیہ ، رزمیہ ، مذہبی اور صوفیانہ مثنویاں شامل ہوتی گئیں ۔ ان سب میں سے عشقیہ مثنویوں کا ہی پلہ بھاری رہا اور اس نوع کی مثنویات کو کشمیری میں منتقل کرنے کا سلسلہ کوئی ڈیڑھ سو سال تک جاری رہا ۔

فارسی کی طرح کشمیری میں ترجمہ شدہ ان مثنویوں کی ترتیب بھی مضامین کے اعتبار سے وہی ہے جو فارسی میں بالعموم رائج تھی یعنی پہلے حمدِ باری پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں نعت ۔ اس کے بعد خلفائے راشدینؓ اور اولیا وغیرہ کی تعریف و توصیف اور پھر کتاب کے سببِ تالیف کا بیان اور اصل داستان کا آغاز و اختتام ۔ فارسی مثنویوں میں اگر چہ مندرجہ صدر عنوانات میں ایک اور عنوان بھی لازمی طور پر شامل ہوا کرتا تھا جس میں بادشاہِ وقت یا کسی وزیر یا امیر کی مدح سرائی کی جاتی تھی لیکن کشمیری شاعر نہ تو کسی دربار ہی سے وابستہ رہے اور نہ ہی انھیں کبھی اربابِ حل و عقد کی سرپرستی حاصل ہوئی ۔ چناں چہ یہ حصہ کشمیری مثنویوں میں محذوف ہے ۔

یہاں پر ہم چند ایسی بزمیہ مثنویوں کا ذکر کریں گے جو کشمیری ادب میں منفرد حیثیت کی حامل ہیں اور جن کا چرچا وادی کے ہزاروں دیہاتوں کے ہر گھر میں آج ہوتا رہتا ہے ۔

یوسف زلیخا ، محمود گامی :

محمود گامی (۱۷۶۵ء تا ۱۸۵۵ء) کا نام اس لحاظ سے کشمیر کی ادبی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا مالک ہے ۔

اس نے سب سے پہلے مثنوی کی صنفِ سخن کو کشمیر میں متعارف کیا اور فارسی کی چیدہ چیدہ مثنویات مثلاً شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا۔ قصہ، ہارون رشید اور شیخ منصور وغیرہ کو کشمیری نظم میں منتقل کیا۔ محمود نے زیادہ تر نظامی گنجوی اور مولانا جامی سے ہی استفادہ کیا ہے۔

یوسف زلیخا بھی محمود نے جامی سے لے لی ہے۔ اس مثنوی میں وہی شہرہ آفاق قصہ بیان کیا گیا ہے جس میں حضرت یعقوبؑ کے فرزند حضرت یوسفؑ کے مصائب اور آخر پر مصر میں ملکہ زلیخا کے ساتھ اس کی داستانِ عشق مندرج ہے۔ جیسا کہ کشمیری مثنویوں کے مطالعے سے معلوم ہوگا سوائے چند ایک کے کشمیری شعرا نے ان فن پاروں کو اپنی زبان کے قالب میں ڈھالتے وقت اصل کی مکمل متابعت نہیں کی ہے بلکہ ضرورت کے مطابق ترجمہ میں وقائع یا حکایات میں تراش خراش سے بھی کام لیا ہے۔ محمود نے یہ مثنوی چار بحروں میں لکھی ہے۔ اس کے علاوہ قصے کو اور زیادہ دل چسپ اور رنگین بنانے کی غرض سے اس نے جابجا طبع زاد غزلوں اور رنگینیوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔

محمود کی ساری مثنویات میں سے یوسف زلیخا سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس میں شاعر نے کشمیری زبان کے لیے اچھوتے اشعار پیش کیے ہیں جن میں روانی اور سادگی کے ساتھ ساتھ اثر آفرینی بھی بہ درجہ اتم موجود ہے۔ محمود نے یہ ساری داستان روز مرہ زبان میں فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ بیان کی ہے۔

مثنوی کے اخیر پر جو مرثیہ حضرت یوسف کی وفات پر زلیخا پڑھتی ہے کشمیری مرثیہ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ مرثیہ لکھ کر محمود نے کشمیری شاعری کا دامن ایک بیش بہا فن پارے سے بھر دیا ہے اس کا ایک ایک شعر سرزمینِ کشمیر کے گھر گھر میں آج بھی زبان زد ہے۔ اس شعری شاہ کار کے چند اشعار کا آزاد ترجمہ یوں کیا جاسکتا ہے:

" تمھارے مرنے سے فلک کی کمر دوہری ہوگئی۔ تمھاری موت نے میری آنکھوں کی بینائی چھین لی۔ ابھی نہ مرکہ میرے ہاتھ مہندی سے رنگے ہیں۔ میرے یوسف آؤ کہ میں تمھیں پکار رہی ہوں۔ "

" اس دنیا میں کتنے ہی سیم تن آئے لیکن اے موت! تو نے ان سب کو کفن پہنادیا۔ یہ تو بتا کہ میرے یوسف کو تو نے کس جگہ دفن کردیا۔ میرے یوسف آؤ کہ میں تمھیں پکار رہی ہوں۔ "

" اے یوسف تمھاری موت سے سنبل کی گردن ڈھلک گئی۔ تمھارے مرنے پر بلبلوں نے آہ و زاری کی اور گلوں نے اپنے دامن چاک کیے۔ میرے یوسف آؤ کہ میں تمھیں پکار رہی ہوں۔ "

ہی مال (ولی اللہ متو)

ولی اللہ متو (۱۷۹۵ تا ۱۸۶۰ء) محمود گامی کا ہم عصر تھا۔ جب متو نے مثنوی پر قلم اٹھایا تو اس وقت تک شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں اور یوسف زلیخا کو کشمیری میں پیش کرچکا تھا۔ لہٰذا متو نے فارسی مثنویوں کے خرمن سے خوشہ چینی

کرنے کی بجائے ایک مقامی قصہ ہی کو نظم کرنا چاہا جیسا کہ مثنوی "بی مل" کی ابتدا میں اس نے خود کہا ہے :

"کیا کوئی ایسی عاشقانہ کہانی نہیں ہے جسے میں کشمیری میں بیان کروں ۔ میں نے دیکھا کہ یوسف اور مجنوں اور قصوں کو نظم کرنے میں شاعروں نے داد سخن دی ہے ۔ ایک کشمیری کہانی بی مل بچ رہی ہے ۔ لہذا میں اسی کو اپنا موضوع بناؤں ۔"

اس طرح فارسی کی تقلید سے کشمیری زبان میں تجدید کے چشمے پھوٹنے اور ریاست کی ایک قدیم لوک کہانی "بی مل نانگی رائے" کو متو نے اپنی مثنوی "بی مل" کے لیے منتخب کرلیا ۔

یہ بی مل اور نانگی رائے کے عشق کی داستان کا بیان ہے ۔ بی مل در اصل راجہ بلدیو (دورِ حکومت ۱۰۰۳ قبل) کی بیٹی تھی جو ایک شہزادہ نانگی ارجن پر عاشق ہوئی تھی (۱) اس کہانی کو کشمیر کے ایک فارسی شاعر مفتی صدرالدین وفائی ۔ "المشتاق" کے نام سے فارسی میں نظم کیا تھا ۔ صدرالدین نے ۱۲۲۲ ھ میں وفات پائی لیکن اس کی مثنوی تا حال زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکی ہے ۔ سنا تھا کہ اس کا صرف ایک قلمی نسخہ موجود ہے جو غالباً کشمیر کے مرحوم مفتیِ اعظم مفتی قوام الدین کے آباؤ اجداد کے پاس میں ہے ۔ اگر چہ بی مل کا قصہ کشمیری شعرا میں سب سے پہلے ملا اشرف بلبل (۱۹۸۲ تا ۱۸۵۶ء) نے فارسی میں نظم کیا تھا مگر اس کے مسودے کا بھی کوئی پتہ نہیں چل سکا ہے ۔

متو نے اپنی کشمیری مثنوی وفائی کی فارسی مثنوی سے اخذ کی ہے ۔ وفائی صاحب اور ان کی مثنوی سے استفادہ کا اعتراف خود شاعر نے بھی کیا ہے اور محمد حسن وفائی بھی جنھوں نے مثنوی پر تقریظ لکھی ہے کہتے ہیں کہ :

وفائی : ایں رسالہ عشق آموز — بود مر عاشقاں را بہجت اندوز

نخستیں مولوی مفتی صدردیں — نمو دہ فارسی در عشق آئین

لباسِ کاشمیری بارِ دیگر — ولی اللہ متو داد از سر

متو نے یہ مثنوی اپنے دو اساتذہ عزیز خاں اور ظریف خاں کے تعاون سے مکمل کرلی تھی جن کے چند گیت بھی شامل ہیں ۔ کشمیر کے ممتاز نقاد اور شاعر عبدالاحد آزاد مرحوم کی رائے کے مطابق یہ گیت مثنوی میں شامل کرنے کی غرض سے لکھوائے گئے تھے ۔ (۲)

---

(۱) محمد دین فوق "تاریخ کشمیر" جلد اول ، ص ۸۳ ۔

(۲) "کشمیری زبان اور شاعری" ۱۹۶۲ء ، ص ۲۷۱ ۔

ولی اللہ متو کو اس لحاظ سے ایک منفرد درجہ دیا جانا چاہیے کہ اس نے ایک مقامی قصے کا انتخاب کیا۔ ہر چند متو اور محمود دونوں ایک ہی ماحول کے پروردہ تھے مگر محمود کے برعکس متو نے کم از کم ایک مقامی داستان کا انتخاب کر کے اپنی کشمیر نوازی کا ثبوت دیا۔ وہ فردوسی، خواجو یا نظامی کا دست نگر نہیں بنا بلکہ اس نے اپنے ہی نیم تاریخی سرمائے سے استفادہ کیا۔

بی مل ۱۳۰۷ھ میں طبع ہوئی۔ محمد حسن وفائی نے تاریخ اشاعت یوں لکھی ہے:

برائے سال این مرقومہ خوب　　　　　بگفتا ہاتفی - محمود و مرغوب "

گل ریز (مقبول کرالہ واری)

کشمیری زبان کی جملہ اقسام و اصناف کی مثنویات میں سے گل ریز نے جو نام اور مقام پایا ہے اور جو قبول عام مقبول کرالہ واری (۱۸۲۰ء تا ۱۸۷۶ء) کو اس تصنیف کی بدولت حاصل ہوا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ گل ریز اصل میں ضیائی نخشبی نے فارسی میں لکھی تھی لیکن اصل زبان میں اسے وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جو بعد میں مقبول کے حصے میں آئی۔ سرزمین کشمیر میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا گھرانا ہوگا جہاں گل ریز کے رنگارنگ اشعار وقتاً فوقتاً نہ گائے جاتے ہوں۔ ضیائی نے یہ داستان مشکل اسلوب اور طرز بیان میں نظم کی تھی لیکن مقبول نے اسے قلم بند کرتے وقت کشمیری زبان کی حسین تلمیحوں اور استعاروں کو استعمال میں لایا اور یہ ترجمہ ایک حسین و جمیل جامہ اوڑھ کر پیش ہوا۔ اس مثنوی میں مقبول کی قوتِ تخیل اور اس کی فن کارانہ صلاحیتیں گویا پورے شباب پر ہیں۔ اس طرح سے مقبول نے گل ریز کو ایک ناقابلِ قدر ادبی کارنامہ بنا کر چھوڑا ہے۔

گل ریز میں شہزادہ عجب ملک اور نوش لب کے عشق کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ مثنوی شاعر نے ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں مکمل کرلی جیسا کہ اس نے مثنوی کے خاتمے پر خود اس کی تاریخ تکمیل درج کرلی ہے۔

گل ریز کے کل ابیات کی تعداد دو ہزار چار سو ستائیس ہے جن میں سے غزلیات کے اشعار کی تعداد دو سو ستائیس ہے۔

زیبا نگار (محی الدین مسکین)

اس نام کی ایک مثنوی کو کشمیر کے امام المتغزلین رسول میر شاہ آبادی کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے جس کا آج تک کوئی نشان نہیں مل سکا ہے۔ محی الدین مسکین (۱۸۶۵ء تا ۱۹۲۱ء) نے بھی زیبا نگار کو شروع کرتے وقت گم شدہ مثنوی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ " خاص کر رسول میر شاہ آبادی یگانہ، روزگار استاد تھے۔ پہلے پہل خوب شہرت ہوئی کہ اس نے مثنوی زیبا نگار لکھی ہے لیکن بعد میں اس کی یہ تصنیف عوام تک پہنچی ہی نہیں بلکہ لوگوں میں صرف اس کا چرچا ہی باقی رہا۔

مسکین نے یہ کتاب اپنی وفات سے چند سال قبل پایہ، تکمیل کو پہنچائی۔

ممتاز بے نظیر (پیر عزیز اللہ حقانی)

پیر عزیز اللہ حقانی (۱۸۵۴ء تا ۱۹۲۸ء) نے نصف درجن کے قریب مذہبی مثنویاں لکھی ہیں جن میں ممتاز

[illegible] چھپی ... چمن، گلِ ہزار جش، مایدہ، گل اندام [illegible] ہیں۔ ان سب میں بے نظیر ایک ضخیم مثنوی ہے جس نے حقانی کے نام کو چار چاند لگائے۔ حقانی نے اس کتاب کی اصل کہانی اردو کے کسی سلسلے سے لی ہے جیسا کہ وہ خود کہتا ہے کہ "یہ قدیم کہانی ہندستان کے شیریں بیان تاریخ دانوں نے [illegible]

مثنوی چھ حصوں پر مشتمل ہے جن کے الگ الگ نام شاعر نے یوں رکھے ہیں :

حصہ اول : قصہ ماہ سندر پری ۔ حصہ دوم : قصہ ملکہ مہر انگیز ۔ حصہ سوم : قصہ ملکہ جہان بانو ۔ چہارم : قصہ مہ جبین ۔ حصہ پنجم : قصہ حر بو قلمون اور حصہ ششم : جشنِ شادی ملکہ بے نظیر ۔

حقانی کے یہاں اگرچہ کہیں فارسیت کا غلبہ نظر آتا ہے لیکن اس قصے کو اس نے ایک دل چسپ پیرائے میں [illegible] کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول کی ہے ۔ یہ داستان نہایت ضخیم ہے مگر شاعر کے زورِ قلم نے واقعات کے تسلسل میں [illegible] کر دیا ۔

گلِ بکاولی (لسہ خان)

لسہ خان (۱۸۹۵ء تا ۱۹۲۲ء) شہر سری نگر سے جنوب مشرق کی جانب پچاس کلو میٹر دور قصبہ [illegible] کا رہنے والا تھا ۔ اس کی گلِ بکاولی اردو کے ایک قصہ موسوم بہ گلستانِ بقا سے ماخوذ ہے ۔ وہ اس بارے میں خود لکھتا ہے کہ ایک دل چسپ اردو کتاب دیکھی جس کا نام بوستان کی طرح گلستانِ بقا تھا ۔ اس کتاب کی کہانی مجھ پر اثر انداز ہوئی اور میں نے کشمیری میں نظم کرنے کا ارادہ کیا ۔

شاعر کے ایک رفیق شعبان ڈار پوشواری نے گلِ بکاولی کی تقریظ لکھی ہے اور اس کی تاریخ کو رقم کرتے ہوئے لکھا ہے یہ باغِ بکاولی دیکھ کر باغ باغ ہوا اور میری نظریں اس فن پارے سے حیران رہ گئیں ۔ یہ پھول سونگھ کر میرے دل کا بلبل [illegible] اور میں نے اس کی تاریخ نظم کرلی ۔

اس تاریخ کے مطابق مثنوی ۱۳۳۵ھ میں مکمل ہوئی ہے ۔

رعنا زیبا (شمس الدین حیرت کامل)

کشمیری ادب کے دورِ جدید میں مثنوی کی طرف وہ توجہ نہیں دی گئی جو ہمارے سخن وروں نے دوسری اصناف کی طرف مبذول کی ۔ شاید یہ ترقی پسند تحریک کے اس [illegible] عمل کا ہی نتیجہ تھا جس کے مطابق

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

[illegible] تحریک نے جہاں کشمیری میں شاعری کو نئے نئے تجربات سے روشناس کرکے اسے ایک جدید [illegible]

کر اکثر شاعر مثنوی کو قریب قریب بھول بیٹھے اور اس کی جگہ نظم معریٰ یا مثنوی نے لے لی جو ہیت کے لحاظ سے اگر چہ مثنوی
، شمار ہوسکتی تھی لیکن مواد اور خیال کے بہ موجب اسے جدید مثنوی ہی کہا جاسکتا ہے ۔

کشمیر کے ہم عصر شعرا میں شمس الدین حیرت کاملی ۔ عبدالاحد زرگر اور بہار شاہ آبادی غنیمت تھے کہ انھوں نے جدید ماحول
، رہ کر بھی مثنوی کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور چند اچھی مثنویات تخلیق کیں ۔

رعنا زیبا (میر شمس الدین حیرت کاملی) (۱۸۹۰ تا ۱۹۶۸ ء) نے آج سے کوئی ساٹھ سال قبل تصنیف کی ہے ۔ یہ مثنوی
رت نے اپنے کسی دوست حسن کے ایما پر لکھی ۔ اس کا قصہ علم الاخلاق کی ایک فارسی کتاب " شمس قہقہہ " پر مبنی ہے ۔ اصل
ب نثر میں تھی اور حیرت نے اس میں سے ایک افسانے کا انتخاب کر کے اسے اختصار کے ساتھ تقریباً اٹھارہ سو ابیات میں
ظوم سانچے میں ڈھالا اور یہ سارا کام صرف دس دن کے اندر اندر مکمل کرلیا ۔

چارلس بودلیر



چارلس بودلیر کو سب سے پہلے اردو میں میراجی نے متعارف کیا ۔ میراجی نے بودلیر کی حیات اور شعری رجحانات پر روشنی ڈالی لیکن انھوں نے بودلیر کی نظموں کے ترجمے نہیں کیے ۔ اردو کے رسائل میں کبھی کبھی کسی نظم کا ترجمہ شائع ہوتا رہا لیکن کسی اسکیم کے تحت یہ کام نہیں ہوا تھا ۔

یورپ کے شعرا میں بودلیر کا ایک الگ مقام ہے ۔ وہ شاعر ، نقاد ، مترجم ، فنِ مصوری اور مجسمہ سازی کا پارکھ تھا ۔ وہ جبت تخلیقی احساس اور وجدان کا ایک ایسا مجموعہ تھا جس کی شاعری کے لیے کوئی نظریہ قائم نہیں کیا جاسکتا ۔ ۱۸۵۰ء کے ایک تھیری نے اسے جدید دلتے قرار دیا تھا اور بعد میں اسے " بہشت کے بغیر " اور " دلتے نظام کے بغیر " دلتے سے یاد کیا گیا ۔ ٹی ایس ۔ ایلیٹ سے لے کر ژاں پال سارتر تک نے اسے جدید شاعری کا امام ، ہر زبان کےادب کے لیے ایک اہم جدید شاعر قرار دیا بودلیر کی نظموں کے موضوعات کو تمام یورپ کے اہم مصوروں اور مجسمہ سازوں نے اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ۔ ۲۸ اگست تا ۱۴ نو ۱۹۹۳ ، اور ۲۱ جنوری تا ۱۳ مارچ ۱۹۹۴ ، میں دو تصویروں اور مجسموں کی نمائش منعقد کی گئی ۔ یہ نمائش آرٹ گیلری ٹلسا اور (HECKS MUSEUM) ہیکس میوزیم میں منعقد ہوئی تھی ۔ اور ۱۹۹۳ ، میں ان تمام پینٹنگس اور مجسموں کی تصاویر ایک مقالہ کے ساتھ امریکہ ، کینڈا اور لندن سے ایک ساتھ شائع ہوئیں اس میں ۹۴ فن کاروں (بہ شمول پکاسو) کے شاہکار شامل کیے ۔ جن میں ۱۸۵۰ء سے آج تک کی بنائی گئی پینٹنگس شامل ہیں ۔ انگریزی میں بودلیر کے فن پر بہت سی کتابیں ۱۸۶۹ ، سے آج تک بھی شائع ہوتی رہتی ہیں اور اس کے شعری مجموعوں کے بھی متعدد ترجمے لندن اور امریکہ سے شائع ہوچکے ہیں ۱۹۱۳ ، میں انگریزی رومانی شاعر (SWIN BURNE) سوین برن کا ترجمہ اردو کے انگریزی جاننے والوں میں مقبول رہا ہے ۔ میراجی نے بھی ترجمے سے استفادہ کیا تھا ۔

چارلس بودلیر ۹ / اپریل ۱۸۲۱ ء میں پیرس (RUE HAUTE FEUILLE) میں پیدا ہوا تھا ۔ اس کے باپ فرانیکس بودلیر کے انتقال کے وقت اس کی عمر صرف چھے برس تھی ۔ اس کی ماں نے اوپیک (جو ایک جنرل تھا اور بعد میں چیف آف آرمی مقرر ہوا) سے دوسری شادی کی ۔ جنرل اوپیک نے بودلیر کو افسرانہ اور شاہانہ زندگی گزارنے کے لیے بہت اچھے اسکول میں شریک کروایا تھا اور اس نے بہت جلد فرانسیسی کے علاوہ لاطینی اور انگریزی زبان پر عبور حاصل کرلیا ۔ بودلیر کی ماں انگریز تھی اس لیے وہ انگریزی بہت اچھی جانتا تھا ۔ وہ بچپن ہی سے ادب سے دل چسپی رکھتا تھا ۔ جنرل کی سخت گیری کی وجہ سے اس کا رشتہ گھر سے ٹوٹنے لگا ۔ پیرس کی گلیوں سے اسے نجات دلوانے جنرل نے اپنے ایک دوست کے بحری جہاز سے اسے جون ۱۸۴۱ ء میں ہندستان کے سفر پر روانہ کیا لیکن وہ مرایش تک سفر کرنے کے بعد فروری ۱۸۴۲ ء کو واپس ہوگیا ۔ دوبارہ پیرس آنے کے بعد اس کی زندگی مصائب و تنگ دستی میں گزری ۔ جنسی بیماری نے ان اذیتوں میں مزید اضافہ کیا ۔ لیکن وہ اپنے شعری وجدان اور ادیب کی حیثیت کو مجروح ہونے نہیں دیا بلکہ ان حالات کو اس نے ہمیشہ زرخیز کھاد کی طرح استعمال کیا ۔

۱۸۵۱ ء تا ۱۸۵۷ ء ان چھے برسوں میں اس نے ہر طریقے سے اپنی صلاحیتوں کا استعمال کیا ۔ امریکی شاعر ایڈ گرایلن پو کی حیات ۔ کارناموں اور تخلیقات کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا ۔ اس کے علاوہ فرانس کی تاریخ ثقافت پر بھی اس کی دو کتابیں شائع ہوئیں ۔ ادبی تنقید اور مصوری کی تنقید پر اس کے بہت سے مضامین شائع ہوئے ۔ ۱۸۵۵ ء میں سب سے پہلے اس کی اٹھارہ (۱۸) نظمیں فرانس کے ایک اہم جریدے میں (Fleurs du mal) " بدی کے پھول " کے عنوان سے شائع ہوئیں ۔ ۱۸۵۷ ء میں اس کا پہلا شعری مجموعہ اسی نام سے چھپا جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ ء میں شائع ہوا ۔ " بدی کے پھول " کی تیرہ (۱۳) نظموں کو فرانسیسی کی ادبی ۔ ثقافتی ۔ سماجی ۔ مذہبی افکارات کے منافی قرار دیتے ہوئے ان کو ضبط کرنے اور بودلیر پر مقدمہ چلانے کی سفارش کی گئی ۔ آخر کار دو نظموں پر اسے بھاری جرمانہ اور ایک نظم کے دو بند کو ناقابلِ اشاعت قرار دیا گیا اور یہ دو بند ۱۹۴۹ ء تک شائع نہ ہوسکے ۔ اس کا دوسرا شعری مجموعہ (Spleen de Paris) " پیرس کا قہر " کے عنوان سے شائع ہوا ۔ جس کی بیش تر نظمیں ، نثری نظمیں ہیں ۔ بودلیر یقیناً دنیا کا پہلا شاعر ہے جس نے نثری نظم کی اہمیت کو منوایا بلکہ شاعری کی ایک نئی صنف کے طور پر تسلیم کروایا ۔ اس کی موت ۳۱ / اگست ۱۸۶۷ ء کو نہایت کس مپرسی کے عالم میں ہوئی ۔

میں نے بودلیر کے دونوں شعری مجموعوں کی مختلف نظموں کا اردو میں تین انگریزی تراجم اور فرانسیسی نظموں کو سامنے رکھتے ہوئے نثری نظم کے فارم میں ترجمہ کیا ہے ۔ چند نظمیں سب رس کے قارئین کے لیے پیش کی جارہی ہیں ۔

(مظہر مہدی)

ооо ● ооо

بارگاہِ حسن میں

کیا تو فردوس کی بلندی سے اترا ہے یا ابھرا ہے تحت الثریٰ سے
اے حسن ! تیری تابناک نظریں جنمی اور الوہی
بلا امتیاز بخشتی ہیں شجاعت اور بزدلی
کبھی عشق اور کبھی جرم ۔ تبھی تشبیہہ دیتے ہیں انھیں شراب سے

تیری آنکھوں ہی کا اعجاز ہیں یہ دن اور رات
تجھ میں خوشبوؤں کی فراوانی جیسے کوئی طوفانی شام
تیرے بوسے ساغر اور دہن صراحی
جو سورما کو خوف اور بچوں کو دلیری عطا کرتے ہیں

کیا تجھ کو ستاروں نے ڈھالا یا دوزخ کی تاریکی نے ؟
اچانک تو بکھیرتا ہے مسرتیں اور پژمردگی
قسمت ، سگِ وفادار کی طرح دامن تمہارے چلتی ہے
تو سب کا مختار جو اب وہ کسی کا نہیں

اے حسن ! تو مردہ جسموں پر اس تیزی سے چلتا ہے
دہشت ناکی بھی ۔ تیرے خزینے کا ایک جوہر
اور قتل ۔ اک ایسا کنگن ۔ جو تیری مغرور ناف پر
شہوت انگیز رقص کرتا ہے ۔

مضطرب پروانہ ۔ پرواز کرتا ہے تیری خیرہ کن شمعوں کی طرف
بھڑکتا اور کہتا ہے " یہ آتشیں انجام پائندہ رہے "
مضطرب عاشق ، اپنے محبوب کے ساتھ شب کو ہم کنار
یوں لگتا ہے ۔ جیسے کوئی بسترِ مرگ پر اپنے مرقد کو چومے

ہمیں اس سے کیا ، تو دوزخ سے نمودار ہوا ہے یا جنت سے
اے دہشت ناک مہیب ، معصوم عفریت
تیری اک نگاہ ، اک مسکراہٹ ایک قدم ، وا کرتے ہیں
اس دروازے کو جو کھلتا ہے ذاتِ لامحدود کی جانب
جس کا میں شیدائی اور لاعلم ؟

تو خدا کا فرستادہ ہے یا ابلیس کا ، دہشت پرور ہے یا سکون آگیں
تو بد روحوں کے ہم جلو رہ یا ملائک کے ، ہمیں اس سے کیا ؟
جو بھی ہو ، اے پری زاد ، تو رنگ ، آہنگ ، خوش بو کی
لہریں بکھیر دے
تا کہ اس دنیا کی جبر ناکی اور وقت کی بے دردی میں کچھ کمی ہو

○●○

بالکنی

یادوں کی ماں ۔ محبوباؤں کی ملکہ
تم میری تمام مسرتیں اور میرا ایمان !
تمھیں یاد رکھنی ہوں گی ہمارے نشاطِ وصال کی باتیں
وہ آتش دان کی پیاری گرمیاں اور شاموں کی دل فریبیاں
یادوں کی ماں ۔ محبوباؤں کی ملکہ

شامیں روشن ہیں سرخ کونپلوں سے
یا بالکنی پر گلابی گھونگھٹ میں ملبوس کر
نا ملایم تیرا سینہ · میرے لیے کتنا مہربان ہے تیرا دل !
م لازوال اشیا کی باتیں کرتے تھے بوسوں کے درمیان
وہ شامیں آج بھی روشن ہیں سرخ کونپلوں سے

نا پرشکوہ غروبِ آفتاب کا منظر ہے · گرما کی شاموں میں
نی گہری فضائے بسیط ہے · کتنا صاحبِ اختیار دل !
نل ہی تمھاری جانب جھکا · روح کو شاداں کرنے والی میری رانی !
یں لگا · تمھارے لہو کی تیز بو میری سانسوں میں گھل گئی ہو
نا پرشکوہ غروبِ آفتاب کا منظر ہے گرما کی شاموں میں

ت کی گہری سیاہی ہم کو محصور کر چکی تھی دیوار کی مانند
ں تاریکی میں تمھاری آنکھوں نے مجھے باندھ دیا سنہری ڈور سے
ں تمھاری سانسیں پی گیا · عجب مٹھاس تھی ! عجیب زہریلا پن ·
ارے نازک پاؤں سو گئے میرے شفیق ہاتھوں میں
ت کی گہری سیاہی ہم کو محصور کر چکی تھی دیوار کی مانند

ں جانتا ہوں خوشی کے لمحات کو زندہ رکھنا ایک فن ہے
ہرِ نو ماضی جی اٹھا · جب بھی تمھارے زانو پر سر رکھ دیا
ں میں کھوج سکتا ہوں تمھاری حیران کن نزاکت کو
ئے · تمھارے محبوب بدن میں یا تمھارے نازک دل میں
، جانتا ہوں خوشی کے لمحات کو زندہ رکھنا ایک فن ہے

یہ وعدے · یہ عہد و پیمان · یہ خوش بوئیں · یہ غیر مختتم بوسے
کیا وہ دوبارہ جی اٹھیں گے قبروں سے
آسمانوں پر آفتابوں کے تجدیدِ شباب کی طرح
سمندر کی گہرائیوں میں نہانے کے بعد
وہ وعدے ! عہد و پیماں · وہ خوش بوئیں · وہ غیر مختتم بوسے !

○●○

الباٹروس

اکثر ہمارے ملاح · ذرا سی دل لگی کے لیے
سمندر پر ٹھنڈی ہواؤں پر الباٹروس پکڑتے ہیں
جہازوں کا تعاقب کرتے ہوئے · سورج سے سورج کی جانب
جو سمندر کے کھارے پانی پر رواں ہیں

کبھی کبھی جنگلے پر بیٹھنے والے یہ پرندے
کیسے بے بس ہو جاتے ہیں · کبھی آسمانوں کے یہ شہزادے
قابلِ رحم · ندامت سے اپنے عظیم سفید پروں کو پھیلا دیتے ہیں
اپنے ہی پہلو میں جیسے بے کار چپوؤں کی جوڑی

یہ پنکھ والے بحری مسافر · چال میں کیسے بے ڈھب
کبھی یہ آسمانوں پر حکمران تھے · اب کتنے مضحکہ خیز ہو گئے ہیں
ایک انھیں پائپ سے جلاتا اور دوسرا لنگڑا بن کر
ان کا مضحکہ اڑاتا ہے · وہ جو کبھی اڑان بھرتے تھے ہواؤں میں

یہ شاعر بھی ہیں آسمانوں اور بادلوں پر حاکم
طوفانوں کے ہم رکاب ۰ کسی کمان سے زیادہ کشیدہ
زمین پر جلاوطن ۰ مسخروں کے ہجوم میں
اپنے ہی شہ پروں میں محبوس اور مفلوج

○●○

قہر

میں ایک ہزار سال جیتا بھی تو کیا اتنی یادیں ہوتیں
ایک وزنی میز جس کی درازیں ۰ کچھا کچھ بھری ہوئیں
گٹھڈ ذخیروں سے
نظمیں ۰ محبت نامے ۰ احکام ۰ نغمے ۰ آمدنی اور خرچ کے گوشوارے
اور زلفوں کی بہت سے لٹیں ۰ جو ملیں تھیں نشانی کے طور پر
اتنے راز نہیں چھپا سکتا ۰ یقیناً ۰ میرا بے چارہ ذہن
ایک اہرام اور گنبد ۰ جس کی راہ داریاں اٹی ہیں
لاشوں سے ۰ لاوارث قبرستان سے بھی زیادہ

ایک قبرستان ۰ چاند کا ٹھکرایا ہوا
جہاں چپچپاتے ۰ رینگتے کیڑے کی طرح پشیمانی
سر اٹھاتی ہے ۰ مسلسل ضرب لگاتی ہے ۰ میرے مرحوم محبوب پر
میں مرجھاتے پھولوں سے پُر ایک پرانا حجرہ
جس ۰ میں محفوظ اک سلوٹیں بھرا پرانا پیراہن
جہاں آرائش کے تمام رنگ افسردہ اور چہرے زرد زرد

صرف سانس لیتا ہوں ۰ ان خوش بوؤں سے جو کھلے
عطردانوں سے نکلتی ہیں
بے کیف اور لنگڑاتے ہوئے دنوں کی طوالت سے زیادہ طویل ہے
برفیلے برسوں کے بھاری تودوں کے نیچے دبے ہوئے سال
اکتاہٹ ۰ لاتعلق ۰ اداسی کا ثمر
قیاس کرتی چاہتِ ابدی کے خوفناک امکانات کو

آج کے بعد تم بس رہو گے ۰ میرے دماغ ۰ میری ذی حیات شے
ایک سرد سرمریں سل جس پر نامعلوم خوفناکی کے چھینٹے پڑتے ہیں
صحرائے اعظم کی اجاڑ وسعتوں میں سراسیمہ گہری غنودگی میں
اک قدیم ابوالہول ۰ ناواقف ۰ ہماری بے حس دنیا سے
جو تمام نقشوں سے خارج ۰ صرف وہی اداسی کے گیت
گا سکتا ہے غروبِ آفتاب کے وقت ۰

○●○

شاعری کے ضمیر فروش

محلات کی دل دادہ ۰ شاعری کی دیوی ۰ میرا دل ۰ میری جان !
جب جنوری گولہ باری کی طرح ژالے برساتی ہو
تاریک ۰ بے کیف ۰ برفیلی راتوں کے میدانوں سے
کیا تم جمع کر چکی ہو ۰ انگارے ۰ گرم رکھنے کے لیے اپنے سرد نیلے
پیروں کو

کیا تم گرباؤ گی اپنے صد رنگ بازوؤں کو رات کی ان
کرنوں سے جو پھوٹتی ہوں دریچوں سے ؟
جب تمھارا جیب اور پیٹ دونوں خالی ہوں
کیا تم کریدوگی سونا ، کاشت کے لیے شفق سے
تم روزی کے لیے جب نغمہ سرا ہوگی ، تو کیا لہراؤ گی
عود دان ، جیسے اجتماع میں لڑکے
بے عقیدہ ورد کرتے ہیں ثنا کے گیت
یا پھر اک فاقہ زدہ بازی گر کی طرح ، دکھاؤگی
اپنے کرشمے ہنستی ہوئی ، چھپاتی ہوئی ، اپنے آنسوؤں کو
ہجوم کو اپنی جانب راغب کرنے کے لیے

○ ● ○

سمندر اور آدمی

آزاد منش ، جب تک آزاد ہو ، سمندر کو سینے سے لگائے رکھنا
سمندر وہ پیکر ، جہاں تم روح کے ساتھ مراقبہ کرسکتے ہو
زماں و مکاں کو چھوتی ، ابھرتی ، ڈوبتی لہروں میں
(جب کہ) تمھاری فکر تلخیوں سے بھری ایک خلیج سے کم نہیں

تم کو گر عشق ہے ، اپنے پیکر کے تہوں میں اترنے کا
اور اسے اپنی نظروں اور بانہوں میں بھرنے کا
کبھی کبھی تمھارا دل چاہے گا نجات اپنی زخم خوردگی سے
اس کے ناقابلِ تسخیر اور وحشی درد ناک شور میں

تم دونوں رات کی طرح تاریک اور پراسرار
انسان ! کبھی کوئی تیرے وجود کی گہرائیوں میں اتر سکا
سمندر ! کون جان سکا تیرے چھپے ہوئے خزینوں کو
دیکھنا کیسے کیسے قابلِ رشک راز تم نے محفوظ کر لیے !

اور نامعلوم زمانو سے آج تک ایک دوسرے سے نبرد آزما
بے دریغ ہاتھوں کے ساتھ ، بے جگر سانسوں کے ساتھ
قتل اور موت کے لیے دونوں کتنے مستعد
کیسے بے رحم بھائی ، کیسے ازلی دشمن !

○ ● ○

نقشِ تصور

ایک ہیبت ناک مردے کی روح مکمل بے لباس
خوف ناک تاج پہنے اپنی ننگی کھوپڑی پر
جشن کا توفن پھیلاتی ، بغیر کسی چابک کے
اور ایڑ لگائے تھکا دیتی ہے اپنے فوجی گھوڑے کو
(اس آسیب زدہ اور ہنہناتے خچر کی ناک سے
کف بہتا ہے ، مرگی زدہ بوڑھی کے مانند)
یہ دونوں کریہہ وجودِ بے رحمی سے جست لگاتے ، خلاسے ،
برق رفتاری سے روندتے ہوئے مکاں
گھڑسوار اور اس کی چمکتی تلوار بے تحاشا چلتی ہے
ستم رسیدہ گر پڑتا ہے جس کو فوجی گھوڑا روند نہ سکا
اور جیسے ایک شہزادہ معائنہ کرے اپنی مملکت کا

وہ قبرستان کی لامحدود سرد سطح کو دیکھتا ہے
جہاں ۔ بجھے بجھے آفتاب کی معدوم روشنی میں
ہر نسل پڑی ہوئی ہے جب سے کہ آدمی تاریکی سے ظہور میں آیا

○●○

اجنبی

" اے پُر اسرار اجنبی ۔ بتا ۔ تجھے سب سے زیادہ
کس سے محبت ہے ؟ "
" باپ سے ۔ ماں سے ۔ بہن ۔ یا پھر بھائی سے ؟ "
" میرا کوئی بھی نہیں ۔ نہ باپ ۔ نہ ماں ۔ نہ بہن ۔ اور نہ بھائی "
" کوئی دوست ؟ "
" یہ لفظ میرے لیے ہمیشہ ناآشنا رہا "
" وطن سے ؟ "
" میں یہ بھی نہیں جانتا وہ نقشے میں کہاں ہے "
" حُسن ؟ "
" میں اسے دل کی گہرائیوں سے چاہوں گا ۔ لازوال دیوی "
" زر ؟ "
" مجھے نفرت ہے جیسے تجھے خدا سے "
" پھر کون ہے جسے تو چاہتا ہے ؟ اے حیرت انگیز انوکھے اجنبی ۔ "
" مجھے محبت ہے بادلوں سے ۔ ۔ ۔ اڑتے ہوئے
بادلوں سے ۔ ۔ ۔ "
" ابھی یہاں ۔ ۔ ۔ ابھی وہاں ۔ ۔ ۔ ان سحر انگیز بادلوں سے ۔ "

○●○

افتخار نسیم

قابیل کی موت

کسی کو جلاوطن کردینا
قتل کردینے سے کہیں زیادہ اذیت ناک ہے
اور میں ـــــ خاک بسر پچھلے پچیس سال سے
برف کے صحرا کی خاک چھانتا رہا
مڑ مڑ کر اپنی جنم بھومی کو دیکھتا رہا
جہاں میرا داخلہ ممنوع تھا
تم کسان تھے
میں چرواہا
یہ نفرت اور حسد کا بیج تمہارے دل میں
س نے بودیا تھا
ا بی کوکھ سے کچھ عرصہ بعد جنم لینے کی سزا
نمی تو نہیں ہونا چاہیے
"سگ باش برادر خورد مباش"
کار بندی کے بعد سردار اہلِ قبیلہ کی
ن دولت کا محافظ بن جاتا ہے
سب سے پہلے تم نے مجھے ہی قتل کیا
ن رسمِ تدفین سے بے بہرہ تھے
سلیے جلاوطن کردیا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔
اسے بھول گئے تھے

دستِ مرگ بہت دراز ہے
آج تمہارے مرنے کی خبر سن کر
میں سوچ رہا ہوں
تمہارے حسد اور نفرت کی عمر
کتنی چھوٹی تھی
صرف پچپن سال
کاش تم بھی عمر محبت اور مہربانی
کرنے میں گزار دیتے

☆ ☆ ☆

ایک مختصر سہرا

سماج میرے اور تمہارے درمیان
ایک بارات ہے
بینڈ باجوں کے ساتھ
سہاگ رات کو اگر حقِ زوجیت ادا نہ کرسکو
تو میرے بارے میں سوچ لینا
میں تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں
اب میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا

● ○ ●

سیدہ حنا

ماہیے

•

موتی سے دمکتے ہیں
مٹی کے گھروندوں میں
کیا چاند چمکتے ہیں

•

ہم جیتے ہیں مرمر کے
دکھ درد کہیں کس سے
سب لوگ ہیں پتھر کے

•

لو پکڑی گئی چوری
روٹی نہ جلا دینا
کس دھیان میں ہو گوری

•

وہ میری سہیلی ہے
کچھ بھید نہیں دیتی
الجھی سی پہیلی ہے

•••

فاطمہ تاج

اشکوں کی دیوار

•

اشکوں کی دیوار کے آگے
دیکھ رہی ہے چشمِ تمنا
بھیگے بھیگے خواب مسلسل

دھوپ نہیں ہے، چھاؤں نہیں ہے
آس کا سورج ڈوب گیا ہے
تیرا غم انگڑائی لے کر
میری رگوں میں گھوم رہا ہے
اشکوں کی دیوار کے آگے

شیشہ اب نہ پتھر کوئی
خواب کی چادر دھندلی دھندلی
ذات کا پیکر، تنہا، تنہا
ہل چل ہے نہ آہٹ کوئی

بھیگی بھیگی چشمِ تمنا
دیکھ رہی ہے لمحہ لمحہ
اشکوں کی دیوار کے آگے
تیرے غم کی چھاؤں کھڑی ہے
میری طرح سے تنہا، تنہا

•••



شاہین

سید ولی عالم نام ۔ ۱۹۳۸ء میں غازی پور (بہار) میں پیدا ہوئے ۔ بہار یونیورسٹی سے اسٹاٹکس میں ام ۔ ایس ۔ سی کیا ۔ کچھ عرصہ مارواڑی کالج بھاگل پور میں لکچرر رہے ۔ پھر ترکِ وطن کرکے مشرقی پاکستان چلے گئے وہاں آدم جی جوٹ ملز لمیٹڈ ڈھاکہ میں محکمہ ۔ شماریات کے سربراہ رہے ۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد مغربی پاکستان چلے آئے اور مناپلی کنٹرول اتھارٹی اسلام آباد میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر (شماریات) کے عہدے پر مامور ہوئے ۔ دو تین برس بعد وہ کینیڈا چلے گئے ۔ کارلٹن یونیورسٹی آٹوا سے ام ۔ ایس ۔ سی کیا اور کینیڈا پوسٹ آٹوا میں مالیاتی تجزیہ کار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا ۔ آج کل وہ ریلوے پالیسی اینڈ کاسٹنگ ایڈوائزر ٹرانسپورٹ کینیڈا ، آٹوا کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے ہیں ۔

شاہین ۱۹۵۴ء سے شعر کہہ رہے ہیں ۔ ۱۹۷۰ء تک ان کا کلام شاہین غازی پوری کے نام سے شائع ہوتا رہا پھر انھوں نے غازی پوری کی نسبت ترک کردی ۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ "رگِ ساز" ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا اس دور میں وہ زیادہ پابند نظمیں اور غزلیں لکھا کرتے تھے ۔ زبان کسی قدر فارسی آمیز تھی ۔ رفتہ رفتہ ان کی شاعری کا نہج بدلتا گیا ۔ وہ آزاد اور معریٰ نظمیں لکھنے لگے ۔ زبان میں سادگی پیدا ہوئی ۔ ہیئت کے ساتھ موضوعات میں بھی تبدیلی آئی ۔ ۱۹۸۴ء میں ان کا دوسرا مجموعہ کلام "بے نشاں" شائع ہوا ۔

شاہین نے کسی ادبی تحریک یا دبستان سے خود کو وابستہ نہیں کیا ۔ ان کی شاعری زندگی کے گہرے تجربات اور وسیع مشاہدے کی آئینہ دار ہے ۔ ابھی وہ چھ برس کے تھے کہ ان کی والدہ اور بھائی فسادات میں شہید ہوگئے ۔ نامساعد حالات میں انھیں ترکِ وطن کرنا پڑا ۔ مشرقی پاکستان میں نسلی فسادات اور جنگ کی خوں ریزیوں کا مشاہدہ کیا اور وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے ۔

مغربی پاکستان کا ماحول بھی انھیں راس نہ آیا اور انھوں نے کینیڈا کی اقامت اختیار کرلی ۔ مہاجرین اور تارکین وطن کے مادی ، روحانی اور نفسیاتی مسائل ، کرب ، بے زمینی ، اجنبیت اور مغائرت کا احساس اور اپنی شناخت کی کھوج ۔ ۔ ۔ ان کی شاعری کا خاص محور ہیں اس کے علاوہ عالمی سطح پر ہونے والی سیاسی معاشی اور سماجی تبدیلیاں سائنس اور ٹکنالوجی کی بے مہار ترقی کے اثرات ان کے شعور اور شاعرانہ بصیرت کا حصہ بن گئے ہیں ۔

شاہین اپنے اسلوب اور طرزِ احساس کے اعتبار سے منفرد شاعر ہیں اور جدید اردو شاعری میں ممتاز مقام رکھتے ہیں ۔ نظم اور غزل دونوں اصناف پر انھیں قدرت حاصل ہے ۔ اپنی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں اور فن کاری کو کام میں لاتے ہوئے انھوں نے مجموعی طور پر اردو شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی ہے ۔

(م ۔ ت)

● ○○ ● ○○ ●

شاہین

میری پلکوں سے لپٹی ہے جو خاکِ افلاکیاں

ر افق کے قریں
ہوئے نظر آنے
لون آیا
ے بچے جواں عورتیں
ب نکل آنے اپنے گھروں سے
رہ گزر لڑکیاں دف بجاتی ہیں گاتی ہیں
اس طرف
ے دروازے کے سامنے
ٹی رک گئی ہے
ہر وقت کے قافلے :تیری منزل یہی ہے)

وروں کے لیے ستونوں پر ٹکی چھت کے نیچے
یں فرش پر بیٹھ کو اک تتے کا سہارا دیے
لہ تو یہ مخاطب ہے کون
ے زمانے ترے روز و شب کی دعاؤں کا حاصل یہی ہے)

کس نے عبادت کے دوران
رخ دوسری سمت پھیرا
سرور آشنائی سر ازل اور آگاہی جذبِ کامل یہی ہے)

کسی آگہی کی تمازت ہے
س میں ریا اور خود غرضیوں کے
بھی بت پگھلنے لگے ہیں

ہر اک شخص کو اس کے اپنے عقیدے ، رسوم
اور ----
اقدار کی پاسداری کا عرفِ تحفظ میسر ہے
(الجھے مسائل ہوں جتنے بھی دنیا و عقبیٰ کے حلِ مسائل یہی ہے)

لٹاتا ہے وہ دونوں ہاتھوں سے
اس طرح
جیسے اسے آپ اپنی کسی بھی ضرورت کی پروا نہیں
(محیط ایسا جود و کرم کا کہ جس کا نہ ہو کوئی ساحل یہی ہے

یہاں
ہر روش میں نے پلکیں بچھائی تھیں
اب میری آنکھوں میں
یہ کہکشاں سی کوئی شے اتر کر
مجھے بے خبر کر گئی ہے
(سن اے میرے دل!
میری پلکوں سے لپٹی ہے جو خاکِ افلاکیاں
اب مرا دل یہی ہے ---!)

ٹھہر وقت کے قافلے :تیری منزل یہی ہے
ترے روز و شب کی دعاؤں کا حاصل یہی ہے
سرور آشنائی سر ازل اور آگاہی جذبِ کامل یہی ہے
مسائل ہوں جتنے بھی دنیا و عقبیٰ کے ، حلِ مسائل یہی ہے
محیط ایسا جود و کرم کا جس کا نہ ہو کوئی ساحل ، یہی ہے
سن اے دل مرے !
میری پلکوں سے لپٹی ہے جو خاکِ افلاکیاں
اب مرا دل یہی ہے !

● ☆ ●

شاہین

موت بھی رحم کے قابل ہے

رات دن
موت ہے مصروفِ مشقت
مرے اجداد کی مانند
کہ جو ایڑیاں گِھس گِھس کے جیے
اور مرے
زندگی رحم کے قابل ہے
یہ تسلیم مگر
موت بھی کتنی شکستہ ہے
ذرا دیکھو تو

●●●

• بابری مسجد

بدن کے منفصل جوڑوں کا بڑھتا درد
اک حیلہ ہے
موسم کی خرابی کا
مگر اب کے برس تو
بادلوں کی کاشت نے
ہر باغ میں آنکھیں اگائی ہیں
اور آنکھیں پھول ہیں
پھولوں کا رشتہ موت سے بے حد پرانا ہے
کوئی موسم ہو
اب آنکھیں ہی اگتی ہیں

یہاں بستی کے مُردوں پر
بڑھاپے کی مسلسل نت نئی یلغار جاری ہے
کوئی دن اور
پھر مٹ جائے گا
نام و نشاں تک سارے مُردوں کا
یہ زندہ لوگ
یہ بستی میں روحوں کی طرح
آوارہ پھرتے لوگ
مُردوں کے بغیر ان کا
نہ جانے حشر کیا ہوگا ــــ ؟

●●●

شاہین

وہ گلی ہر شہر میں موجود ہے

چرچراتی سیڑھیوں پر
اپنے کالے خون میں غلطاں تڑپتی فاختائیں
ہر طرف بے چہرہ چہرے
کرب آنکھوں میں
تھکن سے چور جسم
ہر کسی کو انتظار
اک غلط رستے پہ نامعلوم کا۔
(کون آئے گا ؟)

زندگی اے زندگی
قریہ قریہ تو مجھے آخر لیے پھرتی ہے کیوں
میری پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کیوں ضد ہے تجھے ؟
انگلیاں میری پکڑ کر تو جہاں لے جائے گی
وہ گلی ہر شہر میں موجود تھی
موجود ہے

● ○ ●

نیا سال

گریہ شبنم رہا جن کا مقدر
وہ نگوں سر ڈالیاں
خوش رنگ نکہت بیز پھولوں میں ڈھلیں

اب کے جب آنگن میں بادل
کھل کے برسیں
رہ گزاروں کی کثافت سے اٹے چہرے دُھلیں

آنے والے موسموں کی چاپ سے
گوش بر آوازِ دل کے
بند دروازے کھلیں!

● ○ ●

شاہین

●

کیا کیا رہی نہ گرمی بازار شب بخیر
دن آج بھی گزر ہی گیا یار شب بخیر

چاہت سمیت چھوت کے ہیں روگ اور بھی
پر ہم نہ اب بنیں گے خریدار شب بخیر

جو وسوسے تھے ہم نے سپرد جہاں کیے
یہ جرم ہے تو ہم کو ہے اقرار شب بخیر

ل بیٹھنے سے بوجھ تو کچھ دل کا کم ہوا
اب اسے خزاں کی شام شبِ تار شب بخیر

منہ میں لہو کا ذائقہ جس فصلِ گل کا ہے
کل بھی رہے گا اس سے سروکار شب بخیر

دن پھر کٹیں گے خوابوں کی قیمت چکانے میں
مت کھیل ہم سے چشمِ فسوں کار شب بخیر

الجھا مڑا تڑا سہی اک فیصلہ تو ہے
سوجائیے اب اوڑھ کے اخبار شب بخیر

باتوں میں ہم گھروں سے نکل آئے کتنی دور
اب صبح ہو چلی ہے مرے یار شب بخیر

اچھا ہوا مرض کا پتہ دیر سے چلا
مرجاتا ورنہ پہلے ہی بیمار شب بخار

شاہین ورنہ نیند ہی اڑجائے گی تیری
مت دیکھ' ہیں یہ زخم کہ اشعار شب بخیر

●

کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ چل
زندگی ہے مختصر آہستہ چل

ایک اندھی دوڑ ہے کس کو خبر
کون ہے کس راہ پر آہستہ چل

تیز گامی جس شکم کی آگ ہے
اس سے بچنا ہے ہنر آہستہ چل

دیدۂ حیراں کو اک منظر بہت
یوں ہی نظارہ نہ کر آہستہ چل

جو تگ و دو سے تری حاصل ہوا
رکھ کچھ اس کی بھی خبر آہستہ چل

روز و شب یوں وقت کا دامن نہ کھینچ
دو گھڑی آرام کر آہستہ چل

شاہین

●

بے تعلقی چاہوں پھر بھی بات آجائے
تذکرہ ہو دفتر کا ذاتیات آجائے

…یکھنا پڑا اکثر یہ تضاد ہستی کا
…رزو کا ماتم ہو چاند رات آجائے

…یرا لڑکھڑانا تو خیر سے مقدر ہے
…ل یوں ہی زمانے کو گر ثبات آجائے

…ہ کھلے دریچوں میں پھول کھل گئے ہوں گے
…ب مری خبر دینے کوئی ساتھ آجائے

…ں غریب بے چارہ بستیوں میں آوارہ
…نہ زد میں اب کے بھی کائنات آجائے

…پیرہن بن کر خود کو چھوڑ جاؤں میں
…ں تمنا پر جب حیات آجائے

…تناؤ رہتا ہے اک کشش سی ہوتی ہے
دل میں جب لازم احتیاط آجائے

حسن داد خاں

●

کچھ جانے پہچانے چہرے، کچھ بھولی بسری باتیں
نقش ہیں دل کی دیواروں پر ماضی کی کتنی باتیں
اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے اہلِ قلم کا سرمایہ
کچھ سہمے سہمے الفاظ ہیں، کچھ بہکی بہکی باتیں
وہ اب ہم کو بھول چکا ہے اس کی شکایت، کیا کیجیے
ہم بھی اکثر بھول گئے ہیں کچھ دن پہلے کی باتیں
محفل میں سب بول رہے تھے، ہم بیٹھے تھے مہر بہ لب
سنتے ہوئے اربابِ کرم کی الجھی الجھی سی باتیں
جھوٹی سچی باتیں کہہ کر کیا بہلایا کرتے ہو
"رت بدلے گی"، "پھول کھلیں گے"، ساری باتیں ہی باتیں
اپنی زبان پر قابو رکھو اپنے ہونٹوں کو سی …
فتنہ پیدا کردیتی ہیں چھوٹی چھوٹی بھی باتیں
چپ رہ کر تہمت سر لے لی، کچھ کہہ کر بدنام ہوئے
کس کس کا منہ بند کریں ہم، جتنے منہ اتنی باتیں
ہوش میں رہ کر کہہ نہ سکے تم اپنے دل کا حال حسن
دیوانے بھی … لیتے ہیں اپنے مطلب کی باتیں

١

عشرت ظفر

قطرہ قطرہ ہو چکے ہیں جذب ہر پیکر میں ہم
ضربِ دستِ فن میں ہم، تیشے میں ہم، پتھر میں ہم

رفتہ رفتہ راکھ ہوتی جارہی ہے کائنات
رفتہ رفتہ بجھ رہے ہیں اپنی خاکستر میں ہم

حیرتوں کی گرد اڑتی ہے مگر جمتی نہیں
قید ہیں کس آئینے کے دیدہ، ششدر میں ہم

جاگ اٹھے شعلہ، تخلیق کی آواز سے
سو رہے تھے لفظ کے نخلِ ثمر آور میں ہم

گھل چکے ہیں گمشدہ چہروں کے خال و خد تمام
ڈھونڈتے ہیں کس کو اس بیتے ہوئے منظر میں ہم

کیا شناسا ہوں در و دیوار سے عشرت، کہ ہیں
ایک شخص بے وطن کی طرح اپنے گھر میں ہم

یہ کس نے کہہ دیا تجھ سے کہ ساحل چاہتا ہوں
سمندر ہوں، سمندر کو مقابل چاہتا ہوں

وہ اک لمحہ جو تیرے قرب کی خوش بو سے ہے رو
اب اس لمحے کو پابندِ سلاسل چاہتا ہوں

وہ چنگاری جو ہے مشاق فنِ شعلہ سازی
اسے روشن تہہِ خاکسترِ دل چاہتا ہوں

بہت بیزار ہے عمرِ رواں صحرا نوردی
پئے کارِ جنوں تازہ مشاغل چاہتا ہوں

نہ یہ خواہش کہ وہ مٹی میں میری جذب ہو جا
نہ خود کو داستاں میں اس کی شامل چاہتا ہ

عجب بسمل[1] ہے عشرت اپنے قاتل سے یہ کہتا
سرِ محفل تجھے اے جانِ محفل چاہتا ہوں

---

(۱) غالب سے معذرت کے ساتھ

عزم بہزاد

○

قسمت کو جو لوگ رو رہے ہیں
وہ صبر سے ہاتھ دھو رہے ہیں
جس راہ سے بچ کے چل رہے تھے
اس راہ کی گرد ہو رہے ہیں
یہ جھوٹ کو سچ سمجھنے والے
اپنا بھی یقین کھو رہے ہیں
معلوم نہیں تری طلب میں
ہم کس کا شکار ہو رہے ہیں
آئینہ لیے ہوئے ہیں کب سے
منظر میں نظر پرو رہے ہیں
محرومِ وصال تو نہیں تھے
مایوسِ وصال جو رہے ہیں
ہنسنے کی طرح نہ ہنسنے والے
رونے کے سوا بھی رو رہے ہیں

●●●

○

مرے خدا نے مجھے کتنا سرفراز کیا
میانِ اہلِ ہوس مجھ کو بے نیاز کیا
تری نگاہ سے اسلوبِ خامشی سیکھا
اور اپنے آپ کو اہلِ خبر میں راز کیا
تمام عمر مروت کی نذر کر ڈالی
ہمیشہ خود سے بچا دوسروں پہ ناز کیا
ملا جو ہجرِ مسلسل تو دل نے تنگ آکر
ترے وصال کی خواہش کو بے جواز کیا
جہاں بھی ذکر چھڑا تیری ہم رہی کا وہیں
ہمیں نے سلسلہ ، گفتگو دراز کیا
جو اشک عزمؔ مری آنکھ تر نہ کر پائے
انھیں سے شام و سحر میں نے دل گداز کیا

●●●

خواجہ رضی حیدر

○

ختم کر مجھ پہ شب و روز کی یکسانی کو
کوئی منظر ہو نیا آنکھ کی حیرانی کو

خوفِ آئندہ بھی رکھ خانہ ۔ آسائش میں
یاد کر گزری ہوی بے سرو سامانی کو

کتنے افلاک اتر آئے زمینِ دل پر
کتنے امکان ملے خاک سے پیشانی کو

میں نے دیکھا تھا کبھی چاند کو حیرانی سے
چاند اب دیکھ رہا ہے مری حیرانی کو

ایک انجامِ خوشی پر دل وحشت آثار
روز مہمان بلاتا ہے بیابانی کو

سرخ روئی کی طلب میں عجب احوال ہوا
اس نے محبوب رکھا میری پشیمانی کو

سوچتا ہوں کبھی آزار کے اسباب رضی
دیکھتا ہوں کبھی آزار کی ارزانی کو

●●●

○

کبھی مکاں میں کبھی رہ گزر میں رہتے
یہ رور و شب تو ہمیشہ سفر میں رہتے

ہوا کی راہ میں اڑتی تھی زندگی
ال موج کبھی ہم بھنور میں رہتے

ریز پائی کا شکوہ کریں تو کس سے
غر میں رہ کے بھی ہم لوگ گھر میں رہتے

محبتوں میں بہت دل دھڑکتا رہ
عجیب لوگ طلبِ معتبر میں رہتے

خزاں سے پہلے یہاں عجیب مو
ثمر کی طرح پرندے شجر میں رہتے

ہمیں بھی شوق تھا کچھ تتلیاں پکڑ
تمام رنگ مگر چشمِ تر میں رہتے

ہوا کے ساتھ زمانہ بدل گیا ہے
وگرنہ ہم بھی کبھی اس نظر میں رہتے

●●●

احسن سلیم

○

اتھ رہ کر بھی رفاقت نہیں ہوتی
ں نہ جاگے تو محبت نہیں ہوتی
سی ہستی کی تمنا نہیں مجھ کو
س کے ہونے سے رقابت نہیں ہوتی
ینے شعلے میں اترتے کبھی تم بھی
ر نہ کہتے کہ ملامت نہیں ہوتی
د ایسا کہ ستارہ کہیں چمکے
ت ایسی کہ نہایت نہیں ہوتی
ا ایسا ہے کہ رو کے نہیں رکتا
ر اتنا کہ سماعت نہیں ہوتی
ت ایسا ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا
بھی اتنا کہ شکایت نہیں ہوتی

●●●

○

مٹی میں نہاں زبان بھی ہے
جو دل ہے سو داستان بھی ہے
یہ تو ہے تو اعتبار باطل
جو میں ہوں تو یہ مکان بھی ہے
اک وصل ترے فراق میں گم
اک ہجر مرا گمان بھی ہے
اک دشت مرے چراغ سے کم
اک اشک مرا جہان بھی ہے
دریا کو نہیں خیال اپنا
پانی میں اک آسمان بھی ہے

●●●

غلام مرتضیٰ راہی

●

ماں والا وہی ایک اپنی ذات سے تھا
ا وہ بھی ذرہ مگر ہٹ کے کائنات سے تھا

میں تھا بوند برابر بھی میں سمندر میں
ہار کچھ مرا ترکِ تعلقات سے تھا

سنگ ہوں میں اس کی بے رُخی کے سبب
راپا آئینہ اس کی توجہات سے تھا

م شرحیں تصدق ، وضاحتیں قرباں
لق اس کے اشاروں کا بات بات سے تھا

ب نارسائی کو روتا رہا لبِ دریا
ر مراد کا نزدیک میرے ہات سے تھا

یں جاں پہ کھیل گیا اس کے اک اشارے پر
بات مجھ کو بس اک لمحہ حیات سے تھا

راستوں نے رلایا مجھے بہت راہی
ہ آنسوؤں کا تعلق مری نجات سے تھا

مصطفیٰ شہاب

●

کوئی آنسو بھی کاغذی نہ ہوا
سوچ کر غم کو میں دکھی نہ ہوا

مجھ سے مدت ہوئی ، مرا ہم زاد
ایسا ٹوٹا کہ پھر کڑی نہ ہوا

آسماں کے ہزار رنگ ہوئے
تیرے آنچل سا ابرئی نہ ہوا

جو نہ ہونا تھا وہ تو ہوکے رہا
اور جو ہونا تھا وہ کبھی نہ ہوا

جب گھڑی بھر کو ہم ملے تھے شہاب
وقت اتنا بھی اس گھڑی نہ ہوا

زبیر شفائی

●

لو ۔ چراغ اپنی نگلنا چاہتا ہے
کون ساری رات جلنا چاہتا ہے
یہ زمیں حسرت سے تکتی ہے گھٹا کو
آسماں پانی پہ چلنا چاہتا ہے
چاہتا ہے اب تشخص بھول جانا
اس خرابے سے نکلنا چاہتا ہے
ماہتابی رات کی یہ بے پناہی
بلیوں پانی اچھلنا چاہتا ہے
موج اندر موج ہے جدت پسندی
رہگزر دریا بدلنا چاہتا ہے
دھند سے لب ریز ہے شام زمستاں
جسم گرمی سے پگھلنا چاہتا ہے
ایڑیاں رگڑی ہیں یہ کس تشنہ لب نے
دشت میں چشمہ ابلنا چاہتا ہے
یہ زبیر انسان کم روبوٹ ہے کیا
ضابطے اگلے بدلنا چاہتا ہے

☆ ☆ ☆

●

اب ۔ پئے فکر سخن کون مجھے اکسائے
جل بجھی مشعلِ جاں دودِ نفس بل کھائے
دن میں جالے کی طرح چمٹے ہوئے تھے چھت سے
شام ہوتے ہی اتر آئے گھروں میں سائے
چھاگلیں ہی نہیں ۔ خالی تھے کنویں بھی اب کے
ابر پانی سے بھرے سات سمندر لائے
ریگ زاروں سے پلٹنے کا ہے امکاں معدوم
زیر پا نقطہ آخر ہے ۔ کیا کیا جائے
باولی میں تھے اترنے کے لیے زینے بھی
سخت اندھیرے میں قدم رکھتے ہوئے ہول آئے
وصل آمادہ ہوا سے ہے پریشان دھواں
رشتہ شمع کہ ناگن کی طرح لہرائے
شہر سے ایک طرف دور بیاباں میں ہے
اک پری زاد وہاں شعر مرے دہرائے

☆ ☆ ☆

زبیر شفائی

نہ صرف موجۂ خوں پیچ و تاب دیتا ہے
مجھے، مرے ہی عناصر میں داب دیتا ہے

مرے علاوہ بھی کہسار میں ہے اور کوئی
پکاریے تو پلٹ کر جواب دیتا ہے

مطالعات کو دیتا ہے وہ ورق سادے
علاحدہ سے حروفِ کتاب دیتا ہے

وہ رنگ و بو کا محافظ ہے کم سواد نہیں
خزاں رسیدہ شجر کو گلاب دیتا ہے

طلسم کاری بحرِ امید ! زندہ باد
ہوا چلے نہ چلے نقش آب دیتا ہے

سخن تراش زیادہ ہے، تیز رفت دماغ
گزشتگاں ادب کا حساب دیتا ہے

زمین زرد، ہوا زرد، دھوپ زرد سی
زبیر نعرۂ سبز انقلاب دیتا ہے

●

نفس سرنوک ٹھہرادوں کہ خال و خد بدل دوں میں
تجھے اے زندگی کتنی دعائیں آج کل دوں میں

وہی زنداں وہی ظلمت وہی وحشت وہی قسمت
کہ گردن میں پڑی زنجیر کو دن رات بل دوں میں

یہ غنچہ غنچہ خوش بو، سبزہ سبزہ اوس کی بوندیں
کرن کے پھوٹنے تک جانے کس کے ساتھ چل دوں میں

چٹانوں سے زیادہ یہ بدن حساس ہے میرا
کبھی موجِ ہوا چھولے تو چنگاری اگل دوں میں

مرے چاروں طرف جیسے بچھا ہے جال لہروں کا
ہوا پتوار تھامے ہے کہ اپنا رخ بدل دوں میں

زبیر آنکھوں سے تلووں تک چبھے ہیں خارِ فکروفن
کوئی دامن نہیں خالی کہ سوغاتِ غزل دوں میں

جمال اویسی

ن

چراغِ دیر جلا گم ہوئی مری ہستی
جہانِ تیرہ کو ضو دیتی تھی مری ہستی
میں بے قراری میں اپنی طرف جھکا جاؤں
نہ جانے مجھ میں کہاں گم ہوئی مری ہستی
مری نوائے پریشانِ زندگی ہے عبث
تلاش میں ہے خود اپنی ابھی مری ہستی
جو مجھ تک آتی ہے دنیا پلٹ کے جاتی ہے
مثالِ آئینہ اب ہوگئی مری ہستی
میں خانقاہ سے بیگانہ بن کے لوٹ آیا
اسے قبول نہیں ہوسکی مری ہستی
اویسی ایک چراغ اور جلنا باقی ہے
یہ نیک کام بھی کر جائے گی مری ہستی

●●●

ن

یہ جو سادہ ورق ہے اے جاناں
اپنے اظہار پہ ہے کیوں نازاں
شعر میرا ہوا ہے بوقلموں
سوچ میں شارحین ہیں حیراں
شاعری چاہتی ہے دل کا خوں
کام اتنا نہیں ہے یہ آساں
تن پہ میرے لباس کی دھج ہے
بت کدے میں مرا صنم عریاں
آسماں چھت ، دشائیں دیواریں
یہ جہاں میرے واسطے زنداں

●●●

جمال اویسی

○

ہر لمحہ مری جان کو ہے خطرہ ، عدم
جاں کو ہی کیا جہان کو ہے خطرہ ، عدم

گھر سے نکل کے دیکھو سمندر ، پہاڑ ، بن
فطرت کے ان بتان کو ہے خطرہ ، عدم

کشتی سوار کے لیے کشتی امید ہے
طوفاں سے بادبان کو ہے خطرہ ، عدم

کرنوں کے اک فشار سے بے رنگ ہوگی زیست
آنکھوں کے آسمان کو ہے خطرہ ، عدم

تابندہ اس زمین پہ صدیوں سے ہے بشر
گو ہر گھڑی جہان کو ہے خطرہ ، عدم

●●●

○

ہم رفتگاں جانے کہاں گم ہو گئے
جو ڈھونڈنے نکلے تھے وہ بھی کھو گئے

طاقِ ابد سے روشنی پھوٹی کہاں
منزل قریب آئی تو پھر ہم کھو گئے

صبحِ ازل صحرا تھا آغازِ سفر
ہم تھک گئے جنگل میں آکر سو گئے

بھولی ہوئی اک داستاں یاد آگئی
ہر ایک سے پھر ہم لپٹ کر رو گئے

الجھے کچھ ایسے پیچ و خم میں راہ کے
جو کارواں گزرا اسی کے ہو گئے

●●●

رئیس الدین رئیس

●

مجھ سے کب ترکِ انا ممکن ہوا
میرے قبضے میں کہاں یہ جن ہوا

منکشف دریا کا جب باطن ہوا
ساحلوں پر آسماں ساکن ہوا

شہر میں رقصاں ہوئی بے چارگی
درد کی دولت کا میں خازن ہوا

آسماں نے کردیا تبدیل سب
دشمنِ جاں ہی مرا محسن ہوا

نیند میں جلتا رہا اک مرغ زار
اک دشتِ بیکراں سا دن ہوا

تہمتیں ساری مجھے منظور ہیں
تجھ سے کب پاسِ وفا ممکن ہوا

میری جان و مال کا طالب رئیس
کیوں عدالت میں مرا ضامن ہوا

●

زمیں سے لے کے سرِ آسماں بناؤں میں
جو گوشوارہ سود و زیاں بناؤں میں

ہوا کے ہاتھوں میں دم ہے کہ میرے ہاتھوں میں
یہ دیکھنے کو نئے بادباں بناؤں میں

جنھیں چلاؤں بھی خود اور زخم کھاؤں بھی خود
نئے مزاج کے تیر و کماں بناؤں میں

طلسم اگر فنِ تعمیر کو کوئی مل جائے
تو سطحِ آب پہ اپنا مکاں بناؤں میں

مرے ہی دوست مخالف ہوئے عدالت میں
عدو کو کیسے بھلا ہم زباں بناؤں میں

مسافرت کو ادق راستوں کا ہو ادراک
نئی زمین نئے کارواں بناؤں میں

ملے جو دریا تو لوں امتحانِ تشنہ لبی
یقیں کو اپنے رئیس اک گماں بناؤں میں

ڈاکٹر سلمان عباسی

●

دل کہتا ہے بھولی بسری میری کہانی لکھتے جاؤ
جسم میں خون نہیں تو کیا اشکوں کی زبانی لکھتے جاؤ

وحشت کے عالم میں غزل کا مطلعِ ثانی لکھتے جاؤ
پانی کو ہی خون کہو اور خون کو پانی لکھتے جاؤ

ہوسکتا ہے آنے والی صدیاں پیچھے مڑکے کہیں
آج کی باتیں ترک کرو روداد پرانی لکھتے جاؤ

کل مجھ پر خاموش سمندر نے یوں گہرا طنز کیا
جھیلوں کا ٹھہراؤ لکھو ، دریا کی روانی لکھتے جاؤ

ساحل پر کل رات نہ جانے ہم نے کیا کیا لکھا تھا!
صبح کو بس اتنا پڑھ پائے ریت پہ پانی لکھتے جاؤ

آج کی دنیا ، دنیا والوں سے بس اتنا چاہتی ہے
دانش مندی برتے جاؤ اور نادانی لکھتے جاؤ

ساری عمر گنواکر تم نے لمحہ لمحہ جوڑا ہے
اس دولت کا کون بنے گا وارثِ ثانی لکھتے جاؤ

اب کے بدلتے موسم میں کتنے آئے اور کتنے گئے
میں یہ کہانی کہتا جاؤں تم یہ کہانی لکھتے جاؤ

بارِ غزل سلمان اٹھانا سب کے بس کی بات نہیں
جتنی زباں پر آتی جائے جادو بیانی لکھتے جاؤ

●

اپنوں سے دوستی نہ سہی ڈر کبھی
احساسِ کمتری کا میں خوگر کبھی

ب ختم ہوگئی ہے مری شانِ خود
ورنہ میں التماس کا پیکر کبھی نہ

ہر جسم بے کفن ہے گریباں ہیں
اتنا حسین شہر کا منظر کبھی نہ

موجیں بپھر گئی ہیں زمینوں کی و
کوزے میں بند کوئی سمندر کبھی

سب حالتِ جدل میں تھے سب تھے لہ
لیکن کسی کے ہاتھ میں خنجر کبھی

ان کو خدا کے واسطے اب کچھ بھی مت
وہ صرف بے وفا ہے ستم گر کبھی

یوں مل رہے ہیں لوگ کسی اجنبی
جیسے کہ لکھنو میں مرا گھر کبھی

سلمان آپ اترے ہیں اب آسمان
کیا لکھنو میں کوئی سخن ور کبھی

نعمت انور غوری

●

عمرِ رفتہ کی ہمیں کیا کیا نہ یاد آنے لگی
آج پھر وہ لغزشِ مستانہ یاد آنے لگی
شمعِ حسنِ رخ تصور میں جو روشن ہوگئی
دل کی حالت صورتِ پروانہ یاد آنے لگی
گلشن و صحرا نوردی سے نہ کچھ حاصل ہوا
اور کسی کی سعیِ آب و دانہ یاد انے لگی
ہجر کی شب بے قراری کی عجب تھی کیفیت
دل کی اِک اِک حرکتِ دیوانہ یاد آنے لگی
مشکلوں سے ہم نے چاہا تھا بھلادینگے انھیں
پھر وہی اک صورتِ جانانہ یاد آنے لگی
پتھروں میں شیشہء دل تھا لیے پھرتا رہا
اجنبی کی شکلِ معصومانہ یاد آنے لگی
حوصلوں نے تشنگی کا مرحلہ طے کردیا
میکشوں کی جراء ت رندانہ یاد آنے لگی
اب کہاں وہ رسم ساقی ، نظمِ مے خانہ کہاں
مۓ بقدرِ ساغرِ پیمانہ یاد آنے لگی
دوستی ، ترکِ تعلق میں بدل کر رہ گئی
کیوں ہمیں پھر صحبتِ یارانہ یاد آنے لگی
بجلیوں کی زد میں جلتا آشیانہ دیکھ کر
اپنی پھر بربادیِ کاشانہ یاد آنے لگی
کچھ نہ آیا اس کو انور دل دکھانے کے سوا
پھر ہمیں مجبوریِ دیوانہ یاد آنے لگی

عرفان پربھنوی

●

دلوں میں پیار نگاہوں میں دوستی نہ رہی
ہے زندگی کا فقط نام زندگی نہ رہی

اٹھائی آنکھ تو شبنم کے اشک بکھرے تھے
گلوں کو اب تو مہکنے کی بھی خوشی نہ رہی

مکان جلتے ہیں روشن ہیں آنسوؤں کے چراغ
کہا یہ کس نے کہ دنیا میں روشنی نہ رہی

تمھارے نام پہ بجھتے چراغ جل اٹھے
ہمارے ذکر پہ تاروں میں روشنی نہ رہی

اسے سکون کہیں یا کہ بے حسی عرفان
تڑپ نگاہ میں ، سینے میں بے کلی نہ رہی

بھگوان داس اعجاز

○

ایک تو دکھ پہچان کا ، گھیرے ہے دن رات
دوجا دکھ اس سے بڑا ، سب نے کھینچا ہات
میلے میں ٹھیلا گیا ، ٹھیلے میں سامان
آئے ٹھیلا ڈھونڈنے ، کھو بیٹھے پہچان
جو دیکھا ، سمجھا ، سنا ، غلط رہا میزان
اور نِکٹ آ زندگی ، ہو تیری پہچان
تجھے سمجھنے میں مجھے ، لگے نہ پل بھر دیر
پڑیں میری پہچان میں ، جنم جنم کے پھیر
ایک تو چہرہ بدنما ، اور ہاتھ نہ پاؤں
تم اپنا " پہچان پتر " بھول آئے کس گاؤں
جان پہ اپنی کھیل کے بنتی ہے پہچان
کام کوئی تخلیق کا ، مت سمجھو آسان
کون سنے گا بھیڑ میں ، کیا تیری آواز
سب اپنی پہچان میں ، گم لگتے اعجاز

●●●

فاطمہ تاج

○

حدودِ شام و سحر توڑ کر نکلتے ہیں
مرے شعور کے طائر فضا میں پلتے ہیں
سفر عجیب ہے یہ میری زندگانی کا
کہ میرے ساتھ یہ ارض و سما بھی چلتے ہیں
اندھیری رات کے لمحوں پہ بھی نظر کرنا
چراغ شوق تمنا تو روز جلتے ہیں
تمہارا دل ہی سرِ انجمن نہیں لگتا
کہ ہم تو ٹوٹے کھلونوں سے بھی بہلتے ہیں
نہ جانے کونسا جذبہ چٹان بن جائے
ابھی تو موم کی مانند دل پگھلتے ہیں
فرازِ شوق ہو یا پستیاں مقدر کی
بہ اعتمادِ سفر تاج ہم سنبھلتے ہیں

●●●

شفیع اللہ خاں رازؔ اٹاوی

○

زمانہ جس کو ٹھکراتا رہا ہے
اسی کو اب نوازا جارہا ہے
اندھیرا خوف سے تھرا رہا ہے
اجالا جانے کیا فرما رہا ہے
صنم خانے میں ہنگامے بپا ہیں
خدا کا گھر بھی ڈھایا جارہا ہے
فضا میں زلزلے لہرا رہے ہیں
پہاڑوں کو پسینہ آرہا ہے
رگوں میں آج بھی دریا رواں ہیں
مگر تو عمر بھر پیاسا رہا ہے
خطا کاروں کی نیندیں اڑگئی ہیں
سزاؤں کا زمانہ آرہا ہے
مخالف ہیں زمانہ کی ہوائیں
مگر پرچم مرا لہرا رہا ہے
سمندر کی ادائیں جوش پر ہیں
سفینہ کاغذی اترا رہا ہے
ریا کارانِ دنیا ہر جگہ ہیں
وہ مجھ کو رازؔ یہ سمجھا رہا ہے

●●●

سلیم محی الدین

○

زندگی جب اڑان بھر دینا
حوصلہ آسمان بھر دینا
عکس چہروں کو جب عطا کرنا
آئینوں میں گمان بھر دینا
ان کی تصویر میں اتاروں جب
میرے مولا تو جان بھر دینا
ہم چراغوں کو زندگی دیں گے
تم ہواؤں کے کان بھر دینا
اے گناہوں کے بخشنے والے
ہر سزا امتحان بھر دینا

●●●

شاہدہ احمد



شاہدہ احمد ۲۰ ستمبر ۱۹۳۹ء کو الٰہ آباد (یو۔ پی) میں پیدا ہوئیں۔ جے اینڈ کے اکیڈمک اسکول سیالکوٹ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ ۱۲ نومبر ۱۹۷۶ء کو لاہور میں شادی ہوی۔ ۲ جنوری ۱۹۷۷ء کو لندن آگئیں۔ یہاں بی بی سی ریڈیو کی نشریات میں حصہ لیتی رہیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۵ء تک جاری رہا۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۴ء تک بی بی سی ٹیلی وژن کے ایشیائی پروگرام "گھربار" سے وابستہ رہیں۔ ۱۹۷۸ء میں ادبی انجمن "برگِ گل" کا قیام عمل میں اور ۱۹۸۰ء تک اس کی معتمدی کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۸۱ء میں ادبی انجمن "سمن زار" کی بنا ڈالی اور ۱۹۸۵ء تک اس کی سکریٹری رہیں۔ ۱۹۸۳ء میں "برطانیہ میں اردو کے منتخب افسانے" کے عنوان سے کتاب شائع کی جس میں انگلستان میں آباد کے اُفسانہ نگاروں کی منتخب کہانیاں شامل ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں وہ لندن سے کراچی منتقل ہوگئیں۔ وہاں سے ۱۹۸۶ء میں معذوروں کی و بہبود پر ماہ نامہ آدرش جاری کیا اور ۱۹۸۹ء تک اس جریدے کی سربراہ رہیں اور ادارت کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۸۷ء میں ا ایشن فار فزیکلی ہینڈی کیپڈ فار ایڈلٹ کی نائب صدر منتخب ہوئیں۔ ۱۹۸۸ء میں انھیں نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ڈس ایبلٹیز، حک پاکستان کی مجلس عاملہ کا رکن چنا گیا۔ ۱۹۸۹ء کے وسط میں وہ لندن واپس ہوئیں اور وہیں قیام پذیر ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں "آدرش" سہ ماہی جریدے کے طور پر جاری کیا۔ پھر "آدرش سوسائیٹی" کے تعاون سے اس سلسلے کو "جہانِ خاص" کے عنوان سے رو جنگ میں ۱۹۹۶ء تک جاری رکھا جس کی وہ انچارج تھیں۔ ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۵ء تک سینیر براڈکاسٹر کی حیثیت سے بی بی سی کے مقبول سائنسی پروگرام "دریافت" میں پریزنٹر کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۹۴ء میں لندن کے مقامی ریڈیو اے۔ بی۔ سی

لیے بچوں کا پروگرام " گل دستہ " پیش کرتی رہیں ۔

شاہدہ احمد نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے کیا ۔ ان کا پہلا مضمون ۱۹۶۰ ء میں روز نامہ نوائے وقت لاہور شائع ہوا ۔ پھر وہ افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئیں ۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۸۳ ء میں " ادبی دنیا " حیدرآباد (سندھ) میں شائع ہوا بعدازاں مختلف ادبی جرائد میں ان کی کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں ۔ ۱۹۹۲ ء میں پہلا افسانوی مجموعہ " سمندر میں چراغ " منظرِ عام پر آیا شاہدہ احمد اچھی ڈراما نویس بھی ہیں ۔ ۱۹۹۵ ء میں ان کا تحریر کردہ چار ایکٹ کا ڈراما " صدائے کشمیر " اسٹیج کیا گیا جسے ۱۹۹۰ ء میں گوہل آرٹس لندن کی جانب سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ۔ ان کے مضامین اور خاکوں کا مجموعہ ، ڈراما " دستک " اور افسانوں دوسرا مجموعہ زیرِ اشاعت ہیں ۔

جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے شاہدہ احمد ایک منجھی ہوئی فن کار ہیں ۔ کہانی کے فن پر انھیں غیر معمولی دست رس حاصل ہے ۔ شاہدہ احمد فیمنسٹ (Feminist) ادیبہ ہیں مشرقی عورت کی زندگی کے مسائل کو اور زن و شو کے تعلقات اور ان کی نفسیاتی الجھنوں کو انھوں نے بہ طورِ خاص اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے ۔ ان کی کہانیوں کا دوسرا اہم موضوع تارکینِ وطن کی زندگی ہے جو بے زمینی اور اجنبیت کا شکار تو ہیں ساتھ ہی ساتھ مشرقی اور مغربی اقدار کی کشمکش میں گرفتار ہیں ۔ ان کے علاوہ بھی زندگی کے گوناگوں تجربات و مشاہدات سے ہم ان کی کہانیوں میں دوچار ہوتے ہیں ۔ شاہدہ احمد کا اسلوب منفرد اور دل کش ہے زبان و بیان پر ان کی گرفت مضبوط ہے ۔ وہ کفایت لفظی ، ایمائیت ، پیکر تراشی اور علامت نگاری سے کام لے کر اپنی تحریر کو معنیٰ خیز بنادیتی ہیں ۔

(م ۔ ت)

● ○○ ● ○○ ●

سری نگر سے

سہ ماہی جریدہ " جہات " کا اجراء

ترتیب : حامدی کاشمیری

رابطہ : اطہر ضیاء (مدیرہ)

سہ ماہی " جہات " سری نگر

کمپیوزنگ : زیرو برج

شاہدہ احمد

میں، آئینہ، اور وہ

"کتنے برسے کتنے آخر تو بولتا کیوں نہیں؟ دنیا جہان کی کہانیاں سناتا ہے۔ نہیں دیتا تو صرف ایک سوال کا جواب کہ نصیب کا جو کم تیرا ہے یا میرا۔ ہر روز پوچھنے تیری منجھائی دھلائی کا کشٹ اٹھاتی ہوں۔ تجھے چمکاتی دمکاتی ہوں۔ تجھ پر پڑنے والا گرد و غبار اپنی پلکوں سے جھاڑتی ہوں۔ تجھ پر ابھرنے والے چکنے دھبوں کے نشان اوڑھنی کے پلو سے صاف کرتی ہوں لیکن دو پل نہیں گزرتے کہ تو پھر میلا ہوجاتا ہے۔ تیری لش لش کے کوندے ماند پڑ جاتے ہیں۔ نجانے کون کون سی اجنبی اَن جان جنگل گھاٹیوں کے ہیولے اپنی اپنی کتھا رس گھول بیٹھتے ہیں۔ مجھے بھی رلاتے ہیں اور تجھے بھی۔ میرا دل چاہتا ہے تیرے چمچماتے ہوئے چوکھٹے کے اندر کبھی اپنا آپ بھی دیکھوں۔ دھند کی طرح نہیں روشنی کی طرح ٹوٹا پھوٹا ٹکڑوں میں بٹا نہیں۔ سالم سموچا ..... ادھورا نہیں مکمل۔ مگر ایسا ممکن کس طرح ہو ہر وقت تو تیری سطح پر غیروں کا قبضہ رہتا ہے۔

"تو ہنسا کیوں"؟

شاید اس لیے کہ جو میرے نزدیک غیر ہیں وہی تیرے اپنے ٹھہرے۔

تیری میری دوستی ہے۔ ایسی دوستی جس میں لاگ لپٹ نہیں۔ لین دین نہیں۔ تو مجھے دیکھ کر خوش ہوتا ہے میں تجھے سجاتی سنوارتی مگن رہتی ہوں ..... تیری باتیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں ... تو بولنے کا ہنر خوب جانتا ہے ..... جب تو مجھ سے کہتا ہے تو میری محبوبہ نہیں مترہے تو میں پلکیں جھپکا کر تیری طرف دیکھتی ہوں!

"ہاں تو میری محبوبہ نہیں مترہے تو اور بھی یقین سے کہتا ہے اور لفظ متر کی تفسیر یوں پیش کرتا ہے۔

"متر کی ذات ممتا، شفقت اور محبت کے ساتھ تھوڑی سی محبوبیت کے خمیر سے اٹھتی ہے اور محبوبہ صرف عشوہ و انداز اور لبھانے پرچانے کا نام ہے ..... محبوبہ کے بھیتر ذرا سی کنجی کہیں چھپ کر بیٹھی ہوتی ہے [illegible] وہ اس چھل سے پاک ہوتا ہے۔"

سوچتی ہوں جو کبھی تو کوئی منش ہوتا تو کیا ہوتا؟ میں تجھے دیکھ کر جس طرح شرما جاتی ہوں کسی منش کو دیکھ کر شرماؤں تو وہ میری ٹھوڑی اپنی انگشتِ شہادت سے چھو کر چہرا اوپر اٹھانے کی خواہش سے خود کو نہ بچا پائے ... اور ضدی بچے کی طرح مجھے جگنو بنا کر ڈبیا میں بند کر رکھنے کو مچل اٹھے ..... مگر آرزو پوری ہونے پر کیا ہو؟ شاید کہ بے قدری ..... بے قدری اور بے قدری۔

تو مجھے دیکھ کر مسکراتا ہے اور میں تجھے دیکھ کر لیکن دونوں ہی جانتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے بہروپ بہروپ کھیل رہے ہوتے ہیں۔ تب ہی ایک دوسرے کی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی قانونِ فطرت کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ زمین میں دفینے مدفون ہیں

وہ وہی اگتی ہے وہی پلتاتی ہے جو اس میں پوشیدہ ہے ۔ ہمارے اندر بھی اداسیاں دفن ہیں ہمیں بھی وہی ملتی ہیں ۔۔۔ ہمارے ظاہر کا باس کتنی ہی کھلکھلاہٹوں سے کیوں نہ بھرا ہو اندر کی گھمبیری امرت رس سے خالی رہتی ہے ۔

اف ایک تو یہ بہت مشکل ہے ۔ آئنہ تو میرا ہے لیکن حق اور اختیار تجھ پر مجھ سے زیادہ دوسروں کا ہے ۔ اب یہ کس پربت کی ان پورنی مجھے پرے کرکے تیرے سامنے آن براجی ہے ؟

"کہتے رہے کہتے میں پوری نہیں آدھی ہوں ۔۔۔ نام کی نہیں سچ مچ کی ان پورنی ۔ میرا سچ بھی آدھا ۔ میرا جھوٹ بھی آدھا ۔۔۔ جو پوچھو کبھی پوری تھی تو جھوٹ ۔۔ جو پوچھو کبھی پوری ہوں گی سو وہ بھی سچ نہیں ۔۔۔ لیکھ کی ریکھاؤں میں جو لکھ لائی پہلے بھی بھوگا ہے اب بھی بھوگوں گی ۔۔۔ میرا تو وہ حال ہوا کہ گلاب ڈولے تو گلاب کا نقصان ۔۔۔ کانٹا ڈولے تو بھی گلاب ہی کا نقصان ۔"

میں ہمیشہ کی ان پورن کچھ اور تھی کہ نہ مگر ستی ساوتری ضرور تھی ۔ پتی کی ارتھی پر جل مرن کو تیار ۔ مگر ایک دوسرے بت نے اس سارا جیون سوت کاتنے والی کو آخر میں الجھا دیا ہے ۔۔ میں پیڑا کی ریت پھانکتی اس سے پوچھتی ہوں ۔۔ !

"میں نے تیرا کیا بگاڑا جو تو نے مجھے اپنی توجہ کی رنگ پچکاری سے رنگ دیا ۔ ؟ نہ بیاہی عورت میں پریم جوت جگانا جائز ۔۔۔ نہ بیاہی عورت سے پریم روگ لگانا جائز ۔۔ تو نے میرے اردگرد توجہ کا کیسا سنہرا جال بن دیا ہے جس میں پاپ اور پن کا اکھنڈ بیوہ جیون کی موم بتی کو دونوں سروں سے جلا رہا ہے ۔"

وہ فتح کی مسکان ہونٹوں میں دبا کر ترنت پوچھتا ہے !

"تو بتا میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا کیوں مدھول کر رکھ دیا مجھے اپنی چھبی سے ؟"

میرے جد کہتے ہیں ۔۔۔ وقت گزر جانے پر منش کے سارے کومل جذبے عقل کے صحرا کی ریت بن جاتے ہیں ۔ مگر جدوں کے یہ پیش بھی آدھے سچ کی طرح جھوٹے لگے ۔۔ جو یہ سچ ہو تو اس من کے کومل جذبے عقل کے صحرا کی ریت کیوں نہ بنے ؟

پریم پیڑنا کی امر بیل نے سایہ ڈال کر مجھے کسی جوگیہ نہیں رکھا ۔ پنی نظروں سے جو آپ از جانے کسی کی نظر میں کیا چڑھے ؟ ۔۔ بے قدر ہونے کی پیڑنا بھی بھوگ جاؤں جو یہ جان پاؤں کہ اس کی پریم جوت دینے والی ہے کہ جوت لینے والی ۔۔۔ خود کو بھسم نے والی ہے کہ دوسرے کو زیر کرکے سپھل ہونے والی ؟ ۔۔ اس کے پریم میں تیاگ ہے کہ اہنکار ؟

کوئی تلملاتا سا ہیولہ میرے اندر ڈنڈوت کرتا ہے اور یہ ان پورنی ڈر جاتی ہے !

"جس میں اہنکار ہو وہ پریم نہیں ہوتا پتری ۔۔ کیسے جانن ہونے کہ وہ رام ہے کہ راون ؟"

"کہتے رہے کہتے اس کلنکنی کو کوئی اور راستہ دکھا اس نے تجھے جس طرح اپنے شبدوں سے میلا کیا ہے اسے صاف کرتے میں ہو جاؤں گی" ۔ میں نے اسے پھٹکارا تو وہ معمول لہجے میں بولی ،

"ناری ہو کر ایسی بات کرتی ہے بھگوان نہ کرے کہ کبھی تیری ایسی پرکھشا ہو ۔۔ کبھی تجھے اس چتا میں جلنا پڑے ۔۔۔ جانتی ہے

محبتوں کی میرے جیون میں کوئی کمی نہیں رہی ہے ۔ بہتیروں کو میں چاندنی جیسی شیتل دکھائی دی مگر اپنا بھیتر یگ یگ سے جل مانگتا رہا ـــــ مجھ ان پورنی کے جو کہتے ہیں کبھی نہ پوری ہونے والی اچھائیں ناری کا ذہن ہمیشہ جوان رکھتی ہیں ـــــ آنے والے سندر کل کا انتظار اسے اس کی نظروں میں ہریالا رکھتا ہے ۔ اس کل کا جھوٹا وشواس اس کے من میں دیوالی کیے رکھتا ہے ۔ ـــ مگر میرے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کی طرح اس پورے سچ کا یقین کر ۔ میں ایسی ناری ہوں جو جیون کے پہلے ہی قدم پر بوڑھی ہوگئی ـــ میری جھولی میں کسی کل کے جھوٹے وشواس کا کبھی کوئی آسرا نہیں رہا "۔

"کیوں ہوگئی تو جیون کے پہلے ہی قدم پر بوڑھی "؟ آستے نے ہم دردی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں کیوں ہوگئی "۔

"شاید بچپن یا لڑکپن میں کوئی سپنا بنا ہوگا "؟ آستے کے سوال میں ریشم سی کومل تھی۔

"بنا تو نہیں تھا کوئی سپنا ہاں شاید جنمی تھی کسی سپنے کے ساتھ "۔ اس کے لہجے کی اداسی بڑھ گئی۔

"کیا تھا وہ سپنا "؟ آستے نے اور بھی ہم دردی سے پوچھا۔

"جانے دے کیا کرے گا پوچھ کر ـــــ اپنی مترکو دیکھ اسے تیرا مجھے اس طرح ستاتا دینا اچھا نہیں لگ رہا "۔

"ہاں تو اور کیا ایک بیاہتا کا کسی دوسرے بت سے پریم بندھن باندھنا کل جگ ہے کہ نہیں ؟ " میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"بڑے بول نہ بول میں بھی کل تک ایسی ان پورنی تھی جو پورن نہ ہونے کے باوجود پتنی کی مریادھا کے بات پر رتی ماشا پوری تھی ـــــ رہی تن کی امانت کی بات تو اس بات پر آج بھی پورن ماشی کے چندرما کی طرح پورن ہوں ـــ مگر "

"مگر یہ کہ من بھی تو تیرے اس تن ہی کا حصہ ہے نا "؟ میں نے اس کی بات کاٹ کر ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

"سو تو ہے ـــ پھر اس کی سوگند میں نہیں کھا سکتی بڑی مجبوری ہے لیکن تیری سمجھ میں نہیں آئے گی یہ مجبوری ـــ تیرے آگے تو صرف تن کا جنگھٹ ہے تو نہیں سمجھے گی من کی پیڑا "۔

"پاپ صرف پاپ ہے تن کا ہو کہ من کا " میری بات پران پورنی بڑی داناتی سے ہنسی !

"تجھے ناری کہہ کر بلاؤں کہ بالکا ؟ تو تو پوری کی پوری بچی ہے جسے تن کی پیاس اور من کی پیاس کا فرق ہی نہ پتہ ہو اسے کوئی کیا سمجھائے ـــ جیون یگ پر باہر کے بندھن سے زیادہ بھیتر کے بندھن ان مٹ ہوتے ہیں ـــــ میرا من اس کی طرف اس طرح کھنچتا ہے جیسے بالکا گوردو کی طرف ـــ اس کے لیے میں نے من مندر پر چڑھا ـــ " میں " کا کلس اتار دیا ہے ۔ "

تیرا اپنی " میں " کا کلس اتار دینے سے پاپ اور پن کا کیا تعلق یہ سچ تو اسی استھان پر کھڑا ہے ۔ "

" پاپ اور پن کی بات جانے دے بالکا تو کس یگ میں کس قانون فطرت کی بات کرتی ہے " جنموں سے اتہاس کی پستک میں ایک ہی ست لکھا ہے ۔ کسی بھی پرش کے من ہی میں نہیں گھر میں بھی کئی کئی ناریاں ایک ساتھ بس سکتی ہیں ـــــ پھر ایک ناری کے

جیون میں دو پرش ایک ساتھ کیوں جگہ نہیں پاسکتے ــــ پورے انصاف پورے اعتبار کے ساتھ ؟"

"کیا ــ کیا ؟ کیا کفر کیا ہذیان بک رہی ہے تو ؟"

"جو بھی بک رہی ہوں یہ تو مانے گی نا اس میں میری طرح آدھا سچ ضرور ہے ــــ لوگ صرف اپنے مکان سجاتے ہیں ــــ اس میں دیے جلاتے ہیں ــــ دیوالی کرتے ہیں ــــ مگر من کی دنیا میں روشنی نہیں ــــ مکان اجلے ہیں دل جوت سے خالی ــــ باہر کی دیوالی من کی دنیا کا گھور اندھیارا دور نہیں کر سکتی ــــ یہاں بھیڑ میں تنہائی ہے ــــ قہقہوں کے طوفان میں منش ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں ــــ ہنسی کے شور میں کوئی سسکیاں نہیں سنتا سارے ہنستے چہرے نقلی ہیں ــــ ہر طرف جھوٹ ہی جھوٹ ہے ــــ کس سچ کو پاپ کہے گی ــــ کس جھوٹ کو پن ؟

میرے جیون کا ست یہ ہے کہ میں نہ کبھی پوری تھی نہ کبھی ہوں گی ــــ پہلے ایک آنکھ خود کے بھیتر جھکی رہتی تھی دو جی خود کے باہر ــــ اب ایک آنکھ پتی کے آگے جھکی رہے گی ۔ دوجی پریمی کے ۔ دونوں کو شانت رکھنے کے جوکھم میں خود بھوبھل کی چنگاری کی طرح بھیتر سلگوں گی مجھ میں یہ جوت میری جاگ نے نہیں ادھ سوئے پن نے جگائی ــــ مگر تو بتا تیرے جیون کا ست کیا ہے ؟"

"میری زندگی کا سچ ؟" میں گڑبڑائی ۔

"ہاں تیرے جیون کا ست ــــ یہی نا کہ ہر حاصل محرومی ہے اور ہر محرومی حاصل ــــ ان پورنی نے قہقہہ لگایا !

کیا فرق ہے تجھ میں اور مجھ میں ؟ میری پینڈنا بھی تو یہی ہے ۔ ہر حاصل میں محرومی ہے اور ہر محرومی میں حاصل ۔ یہ کائنات آئنہ ہے بالکل ۔ منش کی اپنی کائنات کا ــــ یہاں ہر ناری کھدوسان ہوتی ہے کپڑے کی وہ گیند جس میں لیریں ہی لیریں ہوتی ہیں دھاگے ہی دھاگے ہوتے ہیں ــــ کھول دو تو کچھ نہیں رہتا ۔"

"تو چپ نہیں ہو سکتی ؟" کہتے رہے کہتے اسے خاموش کرا ۔ یہ اپنے پاپ کی گٹھری ہلکی کرنے کے لیے دوسروں پر بوجھا دھر رہی ہے ۔"

"مجھے کیوں چپ کراتی ہے خود کیوں نہیں مان لیتی بازار سے گزرنے والا ہر منش خریدار نہیں ہوتا مگر یہ دنیا بڑی سرائے ہے گاہک بنا ہی لیتی ہے ۔ تو چاہے کہ نہ چاہے جانے والی چیز جاکر رہے گی وہ تیرا تن ہو کہ من ۔"

"خاموش ۔" ،

میں نے سر اٹھایا اور پوری قوت سے ان پورنی پر دے مارا ــــ مگر یہ کیا ہوا ؟ ــــ اس چھناکے میں تو اس کے ساتھ میرا آئنہ بھی پاش پاش ہو گیا ــــ میرا دوست ــــ میرا متر ــــ میرا غم گسار ــــ میں منزل پر منزل مارنے والی عورت مجھے تو بڑا مان تھا اپنے پورا ہونے کا ۔ میں کیسے پلک جھپکنے میں ان پورن ہو گئی ــــ اور وہ جو ان پورنی تھی ۔ آئنے کی کرچیوں میں مل مل کے پورن ہو گئی ۔

آئنے کے بغیر جیون کیسے بیتے گا ــــ کون ہنسائے گا ــــ کون رلائے گا ــــ کسے اوڑھنی کے پلو سے صاف کروں گی ــــ کس

سب رس حیدرآباد

کے چھٹنے میں اپنا آپ دیکھوں گی --- ۹۹ --- میں تو اکیلی رہ گئی۔

کیا کوئی آسیب ہے آئنہ ہستی میں نہاں
جو مری شکل سے خود مجھ کو ڈرا دیتا ہے

خود شناسی عذاب ہے اب تو
آئنے کو سیاہ کرلیں گے

☆

شاہدہ احمد

کانچ کا کھلونا

جیسے ہی دیوارگیر گھڑی کی سوئیوں نے پانچ بجنے کا اعلان کیا اسد کی کمپیوٹر کے کی بورڈ پر ٹہلتی انگلیاں بے اختیار اپنی جگہ تھم گئیں ۔۔۔ کام کو جہاں کا تہاں چھوڑ کر اس نے پھرتی کے ساتھ بریف کیس سنبھالا اور سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آج اس پر دوسرے دنوں کی طرح بے زاری یا اکتاہٹ سوار نہیں تھی۔ صبح سے حالاتِ حاضرہ کی اعصاب جھنجوڑتی خبروں اور روح کے اندر دھمک اتارتی رپورٹوں نے مضمحل ضرور کر رکھا تھا لیکن داؤد سے ملاقات کا آسرا تمام احساسات پر حاوی رہا۔

داؤد اس کا بیٹا تھا جو گذشتہ کئی سالوں سے ہفتے کے پانچ دن اپنی ماں کے پاس گزار رہا تھا اور جمعہ کی شام سے اتوار کی شام تک دو دن اس کے ساتھ۔ اس دو دن کی ملاقات سے اسد کو ہفتہ بھر کے لیے توانائی کا ایندھن مل جاتا۔ وہ زندگی کی تمام کلفتیں بھول جاتا یہاں تک کہ وہ مصیبت زدہ دن بھی جب اسی شہر کوپن ہیگن میں محنت مزدوری کا نامانوس اور کڑا کام وقت کی مجبوری تھا ۔۔۔ شدید برف باری کے موسم میں تن پر مناسب گرم کپڑے تک نہیں ہوا کرتے تھے اور دور وطن میں جاہ و حشمت والے والد صاحب سمجھتے ان کا بیٹا اپنی قابلیت اور ڈگریوں کے بل پر سکینڈے نیویا میں ان کا شملہ اونچا کر رہا ہے ۔

وہ یوں تو ایک منحنی سا سانولے رنگ کا معمولی سے بھی کم تر ڈیل ڈول کا آدمی تھا لیکن حوصلوں کی پختگی نے اس کی شخصیت کے معمولی پن کو ہمیشہ اپنے تابع رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آج ڈینش میڈیا کا ایک جانا مانا نام ور آدمی تھا۔ ظاہری وجاہت کے قد و قامت کے حصار میں قید رہتا تو آج بھی کسی ریسٹوران میں پلیٹیں دھو رہا ہوتا یا کسی فیکٹری میں پرزے ڈھلنے میں جتا ہوتا۔

ہر جمعہ کی شام جب ہفتے بھر کے کام کی بھاری تھکن گیلی ریت کی طرح اس کے اندر جم کر بیٹھ چکی ہوتی تو بیٹے سے ملاقات کی امنگ ایک نئی توانائی کے ساتھ انگڑائی لیتی اور وہ زندگی کا ہر مسئلہ بھول کر اس میں گم ہو جاتا ۔۔۔ گرمیوں کے موسم میں دونوں لانگے کی ساحلی ریت پر چھوٹی چھوٹی رنگین نیکریں پہنے ، دھوپ سے بچاؤ کی ٹنکوں والی ٹوپیاں اوڑھے ایک دوسرے میں مگن کبھی کنارے والے خوب صورت سمندری جہازوں کو سامنے سے گزرتے دیکھ کر لطف اٹھاتے ۔۔۔ کبھی نرم نرم گنگنی دھوپ میں ٹہلنے کے دوران طرف سال ہا سال سے گول چکنے سیاہ پتھر پہ بیٹھی جل پری کے مجسمے کے پاس پانی میں اٹکھیلیاں کرتے پھرتے ۔۔۔ سردیوں میں چمڑے کے گھٹنوں تک اونچے جوتے چڑھائے ، سر پہ اینارو کس کے ہڈ کے علاوہ اونی مفلر لپیٹے سٹی نو (شاپنگ سنٹر) کی دکانیں چھانتے پھرتے۔

اس ونڈو شاپنگ سے جی بھر جاتا تو باپ بیٹا سڑک کے کنارے کسی بھی پارک یا کھلی جگہ بکھری ہوئی برف سمیٹ کر سنومین بنانے کھڑے ہوجاتے ، یا پھر تھک کر ایک دوسرے پر برف کے گولے مارنے کے کھیل میں جٹ جاتے ۔

ہر طرح کے موسم میں تھک کر گھر لوٹنے پر وہ داؤد کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کرتا اور داؤد لپک لپک کر اس کی مدد کرنے کی کوشش میں کام بڑھاتا رہتا ۔۔۔ رات دیر تک دونوں آمنے سامنے قالین پر آلتی پالتی مارے ایک دوسرے کو قصے کہانیاں سنایا کرتے ۔ ایسے میں داؤد اکثر اپنے اور اپنی ڈینش ماں کے گلابی رنگ سے اس کی سانولی رنگت کا موازنہ کرتے ہوئے پوچھتا :

"فار (ابو) سردی گرمی ہر موسم میں تم نین کیوں رہتے ہو ؟"

"کیوں کہ میری ماں نے مجھے اسی طرح پیدا کیا ہے ۔"

وہ سر کھجاتے ہوئے کھسیاہٹ کے ساتھ کہتا لیکن اس جواب سے داؤد کی تسلی نہ ہوتی اور وہ سلسلہ کلام جاری رکھتا :

"کیا تمہاری مور (ماں) کے پیٹ میں سورج تھا جو تم نین پیدا ہوئے اور مستقل نین ہو ؟" اس کے ان معصوم سوالوں کا اسد کے پاس کبھی کوئی تسلی بخش جواب نہ ہوتا ۔۔۔ وہ اپنے طور پر اسے وقت سے پہلے رنگ و نسل کی تفریق کے الجھاؤں میں الجھانے کا قائل نہیں تھا اور فینی سے علاحدگی کے باوجود اسے یہ یقین تھا کہ وہ بچے کا ذہن مسموم نہیں کرے گی ۔۔۔ زیر لب مسکراتے ہوئے رشک سے سوچتا :

"نادان عمر اس لیے خوب صورت ہوتی ہے کیوں کہ اس عمر میں لوگ بے خبر ہوتے ہیں ۔"

بیٹے کی چھوٹی چھوٹی شوخیاں اور ذہانت بھری باتیں اس میں اس طرح شگوفے کھلاتیں کہ وہ اپنے چاروں طرف پھیلی تنہائیوں کی کڑی دھوپ کو بھول جاتا ۔

آج بھی دفتر سے اٹھ کر لپکتا جھپکتا سیدھا فینی کے گھر پہنچا مگر اطلاعی گھنٹی کے جواب میں اچھلتے کودتے داؤد کے بجائے فینی کا نیا اسکینڈے نیوین دوست برآمد ہوا :

"واڈ ہیدر تو (تمہارا کیا نام ہے) کون ہو تم ؟"

اسد کا نام سن کر وہ اس پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے تیکھے انداز میں مسکرایا ۔ "ہوں" اس کی ہوں خاصی لمبی تھی ۔۔۔ "فینی کثر تمہارا ذکر کرتی ہے ۔" "داؤد کہاں ہے ؟" اسد کے لہجے میں زمانے بھر کی رکھائی سمٹ آئی ۔

"وہ تو فینی کے ساتھ مور مور (نانی) کے پاس گیا ہے ، بہت بیمار ہے نا اس لیے ۔"

"کب واپس آئے گا ؟" اس کے تن من پر وہ ساری تھکن اتر آئی جو داؤد سے ملاقات کی لگن میں بے اثر ہوگئی تھی ۔

"شاید کل صبح ۔"

"اچھا فاویل ۔" (خدا حافظ)

"ناولٹ۔"

فینی کا دوست دروازے کے پیچھے غائب ہوگیا اور وہ لمحے جنھیں دامن میں بھرنے کے لیے وہ اس قدر بے قرار تھا اپنے معنی کھو کر بیزار کن مایوسی میں تبدیل ہوگئے ــــ وقت جامد ہوگیا۔ اب اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ آبابو لیوارڈ پر سکینڈے نیویا ہوٹل کے سامنے والی جھیل کی طرف چل دیا جہاں چھوٹی بڑی بہت سی بطخیں شور مچایا کرتی تھیں۔ باپ، بیٹا دونوں اکثر بڑے شوق سے گھنٹوں سمندری کھاڑی کو کاٹ کر آگے بڑھتی ہوئی سڑک کے بیچ میں کھل جانے والے برج کے کنارے کھڑے ہوکر ناروے، سویڈن اور جرمنی کی طرف سے آنے والے بڑی بڑی کمپنیوں کے مال بردار جہاز نورڈ ہیون اور سوہیون کی چھوٹی چھوٹی بندرگاہوں کی طرف سفر کرتے دیکھا کرتے۔

مگر یہاں پہنچ کر بے سکونی اور بھی بڑھ گئی۔ دل بہلنے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ بوجھل ہوگیا۔ گرم شام کا روشن سورج پائن کے گہرے سبز درختوں کے پیچھے بیٹھتا جارہا تھا لیکن روشنی اب بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی ــــ اس نے سوچا کسی دوست کی طرف چلا جائے یا کسی کو گھر پر بلالے۔ مگر دل اپنے بیٹے کے وقت میں کسی کو حصہ دار بنانے پر آمادہ نہ ہوا اور وہ اکیلا ہی "لانگے لینیے" چلا آیا۔

درختوں اور پھلواری میں گھرے ایک الگ سے گوشے میں ایستادہ شہزادی میری۔ کے مجسمے پر بکھرتی دھوپ کا سنہرا پن چھن چھن کر پڑ رہا تھا ــــ اس کے پہلو میں کھڑا برہنہ بچے کا بت اسد کو اپنے بیٹے کی طرح معصوم اور دل کش لگا ــــ " شاید دنیا کے سارے بچوں میں یہ معصومیت اور بھول پن ہی ایک قدرِ مشترک ہے۔ مگر بعض اوقات بینائی اتنی محدود ہوجاتی ہے ویژن اتنا سکڑ جاتا ہے کہ صرف اپنے بچے کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ کتنا عزیز ہوتا ہے اپنا نطفہ۔ شاید اس لیے کہ ہم خود پرست ہیں اور یہ جرثومہ ہمارے جسم کا حصہ ہوتا ہے۔"

شہزادی میری کی خلا میں گم ہوجانے والی کوئی قیمتی خواہش یا ان مول خواب کھوجتی آنکھیں اور چہرے پہ بولتی پر وقار خاموشی اس کے اندر فلسفہ اتارنے لگی ــــ کانسی میں ڈھلے ڈینش شہزادی کے مجسمے کے نیچے پختہ چبوترے۔ پر حسین ملتجی کے سامنے چیتل کی تعویذ پہ مقامی زبان میں کھدا ہوا تھا،

"وہ ہماری زبان بولتی اور ہمارے دلوں میں رہتی تھی۔"

اس کی سوچ اس کی زود حسی کے ساتھ الجھنے لگی، مجسمے پر نظریں جمائے خدا جانے وہ کس سے مخاطب ہوا:

" جو ہماری زبان بولتا اور ہمارے دلوں میں رہتا ہو اس کے چہرے پہ اتنا دل گیر موسم کیوں کر آٹھہرا؟ ــــ کیسی اداسیاں ہیں جو اس وقت لانگے لینیا میں بسیرا ڈالے پڑی ہیں؟"

پختہ روشوں اور گھاس کے شاداب قطعات سے آگے حد نگاہ تک پھیلی سمندری پانی کی چادر کے کنارے بھی سیاہ چٹان پہ اپنے محبوب کی راہ دیکھتی جل پری مجسم انتظار بنی بیٹھی تھی جو زمانوں پہلے اس کے دل میں اپنی محبت کا کبھی نہ بجھنے والا طلسمی چراغ روشن

کر کے سویڈن کی سمت بہنے والے گہرے پانیوں کے کنارے آباد بستیوں میں کہیں کھوگیا۔ بے چاری جل پری تب سے اب تک پا کے اس راستے پہ نگاہ جمائے اس جملے کی تفسیر بنی کہ رہی تھی۔ "بہت سی محبتیں ہماری عبادتوں کی طرح قضا بھی ہوجاتی ہیں۔"

شام ڈھل کر رات اتر آئی۔ شہزادی میری اور جل پری کے مجسمے اندھیرے میں مدغم ہونے لگے ۔۔۔ چاند کا عکس رات کے سے گری بالی کی طرح پرسکون پانی پر چمکنے لگا۔۔۔ پارک کے کونے والے ریستوران میں آرکسٹرا پر ابھرتی وائلن کی غمگین دھن نے اس کے اندر چٹکیاں بھرتی تنہائی کو وحشت سے قریب تر کر دیا۔ فرنچ ونڈوز کے شفاف شیشوں کی دوسری طرف مدھم مدھم رومانوی روشنی میں نازک پھولوں کے گل دستوں سے سجی میزوں کے اطراف بیٹھے خوش خیال، خوش جمال جوڑے محبت بھری سرگوشیوں میں مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ گھاس کا وہ قطعہ جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا شبنم کے نم سے بھیگ چلا تھا اور اس سے کہیں زیادہ نمی خود اس کے اندر اتر چکی تھی!

"محبت کیا ہے؟ ۔۔۔ کیوں پیدا ہوتی ہے اور کیوں ختم ہوجانے پر بھی تعلقِ خاطر بنی رہ کر آزردہ کیسے رکھتی ہے؟"

اس کے اندر ایک ہوک سے اٹھی اور کتاب زندگی کے صفحات پر فینی کے ساتھ پہلی ملاقات حروف کی طرح جڑتی چلی گئی۔

اس روز وہ اپنے ڈینش دوستوں کی محفل میں اس بحث میں الجھا ہوا تھا، آخر کیا وجہ ہے کہ ۱۹۴۹ء کے بعد ڈینش پبلشروں نے ہندوستانی ادب کی طرف توجہ دینی چھوڑ دی۔۔۔ کیوں ان کی دل چسپی محض ہندوستانی روحانیت اور شناختِ ذات قسم کے موضوعات کی سمت رخ موڑ گئی؟"

"تعجب ہے بالکل سامنے کی بات تمھاری سمجھ میں نہیں آرہی۔۔۔ یہ کوئی زندگی اور موت جیسا عقل سے بالاتر مسئلہ ہے؟"

اس نے چونک کر گردن گھمائی۔ ایک نامانوس دل کش صورت پورے اعتماد سے مخاطب تھی۔

"ظاہر ہے گرہ چاہے کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو جب تک کھل نہ جائے گرہ ہی رہتی ہے ۔۔۔ ضروری نہیں کہ ذہن کی ہر الجھن زندگی اور موت کے حل طلب مسئلے جیسی ہی ہو۔"

اسد کے ٹکڑا توڑ جواب پر وہ کھلے دل سے مسکرائی!

"ہاں یہ تو ہے، میں اس بات پر تم سے پوری طرح متفق ہوں واقعی گرہ چھوٹی ہو یا بڑی، کھلنے تک گرہ ہی رہتی ہے"۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ وہ سامنے کی بات جو مجھے نظر نہیں آرہی اس تک میری رہ نمائی کرسکو؟"

اسد اب تک اپنے سوال کی گرہ میں الجھا ہوا تھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ دیکھو نا سیدھی سی بات ہے کاروباری ذہن، کاروباری ترجیحات کے محور پر گھومتا ہے ۔۔۔ ڈینش عوام کا نوجوان طبقہ ہپی ازم کی تحریک سے اکتا چکا ہے اور روحانی تشخص کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ اس موضوع پر لٹریچر ان کی ضرورت ہے لہٰذا ان کی اس ضرورت سے ہمارے پبلشرز اپنی ضرورت پوری کر رہے ہیں، اس لیے اب ہندستانی ادب کی اشاعت کے کیا معنی؟"

"یکمال خاتون ہو ایک پل میں ساری الجھن دور کردی۔ بہر حال شکریہ " اسد کی آنکھوں میں ستائش کے جگنو ٹمٹمانے لگے۔ "مگر تمہارے جواب سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے اس نوجوان طبقے کے ہپی ازم کی طرف مائل ہونے کی کیا وجوہات تھیں ..... اور اب اس سے اکتا کر روحانی تشخص کی تلاش میں بھٹکنے کے کیا اسباب ہیں ؟"

"کیا تم جیسے دانا آدمی کو بھی سامنے کی چیزیں دیکھنے کے لیے دوسروں کی بینائی کی اس قدر ضرورت ہوتی ہے ؟"

اسد اندر ہی اندر کھسیا کر رہ گیا۔ اسے اچھی طرح علم تھا سامنے بیٹھی مد مقابل اتنی معصوم ہرگز نہیں تھی جتنی معصومیت سے اس نے سوال کیا تھا۔

"یہ انسانی نفسیات کی گتھی ہے مائی ڈیر نامعلوم۔ جس کے بارے میں فرائیڈ کا کہنا ہے کہ آدمی آپ اپنا دشمن ہوتا ہے ..... شاید اپنے ساتھ اپنی اس دشمنی کا احساس تمام تر بے چینی و بے قراری کا کارن ہے ..... تم کیا کہتے ہو ؟"

"مجھے اس بارے میں صرف یہ کہنا ہے کہ میرا نام اسد ہے۔"

"اور میں فینی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی ذرا سا آگے کو جھک آئی۔ گہرے کٹاؤ کے گریبان سے جھانکتی بے پردگی پر اسد نے سٹپٹا کر آنکھ چرائی۔

"لاحول ولاقوۃ۔ ہم ایشیائی بھی بس ..... سوائے ایک میرے کسی اور پر اس بے پردگی کا رتی برابر اثر نہیں۔" اس نے خود کو ڈپٹا

پھر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب خوب صورت اور روشن دماغ فینی۔ جس نے پہلی نگاہ میں ہی اسے بے طرح متاثر کیا تھا چند ملاقاتوں میں اس پر جی جان سے فریفتہ ہوگئی ..... اسد نے کئی بار اپنی شخصیت کے اس وصف کو جاننا چاہا جس کی تپش سے اس جیسی عورت پگھل کر موم ہوگئی۔

"حسن کی توجیہہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے شہزادے کہ یہ دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔"

"بڑا الجھا ہوا معاملہ ہے سمجھ میں نہیں آتا تم پر یقین کروں۔ تمہارے ویژن پر یا اپنی کمیونٹی کی متفقہ رائے پر کہ میں ایک کم رو شخص ہوں۔" اسد کی زبان پر اس کی فطری صاف گوئی تھی۔

"تمہاری وجاہت تمہاری ذہین آنکھوں، بیدار دماغ اور علم کی پیاس میں پوشیدہ ہے۔ سیپ میں چھپا موتی دیکھنے کے لیے نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تمہارے پاس وہ نگاہ ہے ؟" اسد نے اشتیاق سے پوچھا "ہائے انسان کی کمزوریاں اب تم بار بار اپنی تعریف سننا چاہتے ہو۔ مگر یہ مجھ سے نہیں ہوگا کیوں کہ محض حسن کی تعریف کرنا محبت کی توہین ہے۔"

"محبت ؟" اسد کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔

"ہاں محبت، اس میں الجھنے کی کیا بات ہے؟" اس نے اسد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلا جھجک اعتراف کرتے ہوئے چاہت سے کہا:

"دل جس مرد پہ آجائے وہی حسن و مردانگی کے یونانی دیوتا کے قالب میں ڈھل جاتا ہے شہزادے، ہر جسم کی جدا کیمسٹری کی طرح ہر ذہن کی نفسیات میں بھی فرق ہوتا ہے ـــــ میری نفسیات کہتی ہے حسن انسان کے عمل میں ہوتا ہے، اس کے عمل اور تدبر میں ہوتا ہے۔ گورے کالے رنگ، چھوٹے بڑے قد یا تیکھے اور بھدے نقوش میں نہیں۔"

فینی کے پھونکے ہوئے سحرانگیز منتر سے اسے گمان ہی نہیں یقین آگیا کہ وہ واقعی اپالو ہے۔

پھر محبت کی سرشاری میں سائیکو گراماٹیکس کے عوامی صحیفوں، خالق اور مخلوق، خیر و شر اور سائنس اور مذہب کے روابط کو الفاظ کے آہنگ میں گنگناتے ہوئے روئے زمین کی نعمتوں اور عذابوں کو انسانی جبلت کے ترازو میں تولنے کے دوران پاکستان سے والد صاحب نے شادی کا سوال کھڑا کر دیا۔ جواباً اس نے انھیں صاف لکھ بھیجا کہ ایک چھوٹے سے قصباتی شہر کی خانہ دار کوزہ مغز حسینہ اس کا مقدر نہیں بن سکتی۔

شادی کے صرف ایک سال کے اندر فینی اتنی اچھی اردو بولنے اور سمجھنے لگی جتنی وہ سالوں کی ریاضت کے بعد بھی ڈینش نہ سیکھ سکا ـــــ اسد کی صحبت ملنے پر اب وہ ڈینش کے کلاسیکی ادیبوں، لدوی بلبی آدم اوہلین شلوگر اور ہنرک پونٹوپیڈان وغیرہ کے رجحان ادب، غنائیہ شاعری اور تنقید و فلسفے کے علاوہ غالب و اقبال کو بھی کسی حد تک جاننے لگی۔ ن۔ م راشد میراجی اور فیض کے نام اجنبی نہ رہے ـــــ زندگی بہت خوب صورت بہت مکمل ہوگئی، داؤد کی آمد نے اسے نئے معنی پہنا دیے ـــــ مگر جیسے ہی اسد کی زندگی کا خلا پُر ہوا فینی کی ذات میں کہیں اندر ہی اندر بے وزنی کی دیمک نے جگہ بنانی شروع کردی ـــــ اب اس کے پاس گھر کے کام کاج، شوہر کی فرمائشوں اور بچے کی دیکھ بھال کے بعد وقت کو اپنے طور پر برتنے کا سمے نہیں تھا۔

آئے دن غیر متعین اوقات کی لمبی بے بی سٹنگ مہنگا سودا تھا۔ شوق کی بھڑک پوری کرنے کے لیے مالی حالات اس عیاشی کے متحمل نہیں تھے ـــــ زندگی میں در آنے والی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے وہ اکثر گھر پر علمی و ادبی مباحثوں یا شعر و ادب کی محفلیں سجانے لگی۔ مگر یہاں بھی ایک ایشیائی مرد کے گھر میں بیوی کی حیثیت سے ان نامانوس ذمہ داریوں نے اس کے شوق کی راہ روکی جن کی وہ عادی نہیں تھی ـــــ اسد کی خواہش پر مہمانوں کے لیے مزے مزے کے مرچ مصالحوں والے کھانے پکانا، محفل کے بیچ سے اٹھ کر چائے، کافی بنابنا کر لانا، داؤد کے رونے کی آواز پر آدھی بات زبان پر اور آدھی دل میں رکھے اس کی خواب گاہ کی طرف دوڑ لگانا ـــــ ذہنی یکسوئی عنقا ہو تو کہاں کا لطف کیسا لطف؟ ـــــ کسی موقع پر امداد طلب نظروں سے اسد کی طرف دیکھتی تو وہ کاتیاں پن کا مظاہرہ کرتا الکسایا ہوا سا آنکھ چرا جاتا۔ وہ کیا محسوس کرنے لگی تھی، اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا کونسا عمل شروع ہوچکا تھا۔ اسد اس پورے عمل میں ناواقف رہا اور بہت کچھ فینی کے اندر لاوے کی طرح پکنے لگا اس نے اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ـــــ ہرچند کہ وہ فلسفہ

مساوات کاداعی تھا لیکن فطری خود غرضی کا ہمیشہ یہی مطالبہ رہا دفتر سے آئے تو گھر صاف ستھرا، بیوی بنی سنوری تازہ دم وشاداب اور ہر ہنستا مسکراتا ملے۔ مہمان آئے ہوں تو دسترخوان پر مشرق کی وضع داری نمایاں ہو ---- قمینی کی ذہانت اور اسٹیکچول فکری بالیدگی از خود ضمنی درجے کی حامل سمجھی لی گئی ---- وہ منتر جو قمینی نے اس کے کانوں میں پھونکا تھا سرچڑھ کر بول رہا تھا وہ خود کو سچ مچ کا اپالو دیوتا اور قمینی کو آرتی اتارنے، بندگی کرنے والی داسی سمجھ کر برتتے لگا نتیجتاً ایک روز دفتر سے گھر پلٹا تو اس نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے پرسکون انداز میں اطلاع دی:

"میرا تمہارا اور ساتھ ممکن نہیں رہا اس لیے تم سے علاحدگی ضروری ہوگئی ہے شہزادے۔"

"کیا؟" اسد نے بے یقینی سے دیکھا۔

"ہاں کیوں کہ تمہیں ایک ذہین ساتھی کی نہیں سو فی صد روایتی بیوی کی ضرورت ہے۔"

"تم ایسا کیسے سوچ سکتی ہو۔کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی یا میں نے کسی لمحے تم سے بے وفائی کی ہے؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے نہ میں نے تم سے محبت کرنا چھوڑی ہے اور نہ ہی تم نے مجھ سے بے وفائی کی مگر وفا اور محبت کی قیمت کے طور پر مجھے اپنا آپ رہن رکھنا منظور نہیں ---- اچھا ہوتا اگر ہم زندگی بھر ایک دوسرے کے محبوب رہتے ---- تم اپنے گھر والوں کی پسند کی ہوئی اس قصباتی لڑکی سے شادی کرلیتے ۔وہ صبح شام رن خوشی تمہارے لیے مرچ مصالحوں والے کھانوں کے دسترخوان سجایا کرتی۔ گاتی گنگناتی بدبودار جرابیں اور میلی بنیائیں دھوتی ۔گندے قالین صاف کرتی۔ غسل خانے چمکاتی ۔کپڑے استری کرتی اور ناخوش ہونے کے باوجود چپ چاپ تمہاری بشری ضرورت کو تمہاری خواہش کے مطابق پورا کرکے اپنے عورت پن کا ثبوت دیتی ---- اس کے لیے یہ سب ممکن ہوتا کیوں کہ اسے پیدائش کے لمحے سے تراش خراش کر اسی سب کے لیے بنایا گیا تھا ---- اس کی تربیت میں شوہر کی صرف خواب گاہ کا ساتھی بن کر قانع رہنا شامل تھا ---- اس سے آگے کی کسی خواہش کو شاید بے چاری مناسب نام دینے کے ہنر سے بھی ناواقف ہوتی۔"

یوں اسد کے نہ چاہنے کے باوجود دونوں کے راستے الگ ہوگئے ---- نہ وہ آپس میں لڑے جھگڑے، نہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا اور نہ ہی کسی پر فردِ جرم عائد کی گئی۔ مگر اس کے بعد ہوا یہ کہ زندگی کے تمام خوش نما رنگ پھیکے پڑ گئے، ایک بے عنوان کیفیت دیمک کی طرح اسد کے دل کو اندر ہی اندر چاٹنے لگی۔ وہ ہنستا بھی، مسکراتا بھی، لمبی لمبی عالمانہ اور فلسفیانہ بحثیں بھی کرتا لیکن اندر ایک جامد سناٹا کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ سادھو سنت جیسی چپ نے دھونی رمالی۔

داؤد اب بھی پہلے کی طرح اس کی زندگی میں شامل رہا۔ دونوں اس کے بٹوارے کے لیے کورٹ کچہری نہیں گئے اور نہ ہی چلڈرن سنٹر کی عدالت سے رجوع کی نوبت آئی ---- باہمی اتفاق سے بغیر کسی بدمزگی کے بیٹے کی ذمہ داری آپس میں بانٹ لی گئی ---- اب وہ ہفتے کے پانچ دن ماں کے پاس رہتا اور چھٹی کے دو دن باپ کے ساتھ۔

دونوں نے اسے شہر کے بہترین پرائیویٹ اسکول میں داخل کر رکھا تھا ـــ اسد اپنی خوشی سے اس کے تمام تر تعلیمی اخراجات اٹھائے ہوئے تھا۔ اس کی اوپن ایوننگ میں دونوں باقاعدگی سے اکٹھے شرکت کرتے ـــ دونوں دیانت داری کے ساتھ بیٹے کو مستقبل کا ایک سلجھا ہوا مکمل انسان دیکھنے کے آرزو مند اور اپنے کسی بھی طرح کے غیر ذمہ دارانہ یا جذباتی عمل سے اس کی شخصیت کو محفوظ رکھنے کے خواہش مند تھے ـــ دونوں ہی کی کوشش تھی ناکام شوہر اور بیوی کی طرح ناکام ماں باپ ثابت نہ ہوں ـــ بیٹے پر گھر کی ٹوٹ پھوٹ کا کم سے کم اثر ہو۔

فینی سے جدائی کے سانحے پر اسد کو غم ذات کی بے وقعتی کے عجیب و غریب تجربے کا سامنا ہوا۔ زندگی کا وہ کیسا ناقابل بیان لمحہ جب وہ پہلی بار اپنے آپ کو بھول کر اس خیال سے بلکا:

"اب کیوں کر داؤد پہلے جیسے خوش باش بچے کی طرح ہر چھٹی کے دن میرے ساتھ اٹکھیلیاں کر سکے گا؟ ـــ ہم کس طرح پارک کی جھیل میں بطخوں کے غذا جھپٹنے کا کھیل اسی ذوق و شوق سے دیکھ سکیں گے؟ ـــ کیا یہ سب کچھ خواب ہو کر رہ جائے گا ہم باپ بیٹے کی دوستی۔ ہمارا ایک دوسرے پر یقین؟"

خیالات نے نشتر کی طرح اسے کاٹا تھا مگر شکر کہ یہ سب نہیں ہوا۔ بہت کچھ مٹ کر بھی بہت کچھ بچ رہا۔ علاحدگی کے بعد جب پہلے ویک اینڈ پر وہ داؤد کے ساتھ سیر کو نکلا تو اس کے متوقع سوالات کے خوف سے اندر ہی اندر تھر تھرا رہا تھا۔

"اب ہم سب اکٹھے کیوں نہیں رہتے؟"

"دفتر کے بعد ہمارے پاس آنے کے بجائے کہاں چلے جاتے ہو؟"

"تم اور فینی اب بھی میرے فار اور مور ہو تو میرے ساتھ ایک ہو کر کیوں نہیں رہتے؟"

مگر اس قسم کے تکلیف دہ سوالات کے بجائے وہ باپ کے چہرے پر چلتے ہوئے مضطرب سورج کو محسوس کر کے کچھ لمحے چپ چاپ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پلک جھپکے بغیر دیکھتا رہا۔ پھر بے تابی کے ساتھ اپنی چھوٹی چھوٹی باہوں کے حلقے میں جکڑ کر لیتے ہوئے بولا:

"فار! یائی ایلسکر دائی۔" (ابو مجھے تم سے پیار ہے)

تب اسد کا دل چاہا اونچی آواز میں روتے ہوئے اپنی تقدیر سے سوال کرے:

"خود کو خوش نصیب کہوں کہ بد نصیب؟ داؤد کی طرح پیار تو فینی کو بھی مجھ سے اب تک ہے پھر محبت کی یہ کونسی قسم ہے میرے مقدر میں لکھی گئی ہے؟" یہ ٹھیک ہے کہ اس سے وقتی طور پر ایک خود غرض آدمی بن کر فینی کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ـــ فینی سوال بھی بجا کہ اس کی ذہنی پرواز کو اردو سکھا کر، مرچ مصالحوں والے ایشیائی کھانوں کے دسترخوان چنوانے کی سمت موڑ کر محدود کر مقصود تھا تو پھر اس نصابی دوشیزہ کو اپنانے میں کیا قباحت آڑے آئی؟

مگر وہ یہ باتیں گھر توڑے بغیر بھی تو باور کرا سکتی تھی ۔ کیوں اپنا آپ منوانے کی کوشش کیے بغیر خاموشی سے سوچتی رہی ۔ اند ہی اندر کڑھتی رہی اور پھر طے کر کے عمل کرنے پہ آئی تو لاکھ سمجھانے اور اظہارِ ندامت کے باوجود اپنے فیصلے میں ترمیم نہ کر سکی ۔۔۔

" محبت کہیں ایسے بھی کی جاتی ہے ؟ "

کوشش کے باوجود اسد کو اپنے اس سوال کا جواب نہ مل سکا کیوں کہ ایسے الجھے ہوئے ریشم کو سلجھانے والی اس کی زندگی سے جا چکی تھی ۔ اب تو لے دے کر داؤد سے وابستہ خوش امیدی کا اندھا سرمایہ حیات تھا ۔ وہ حیرت سے سوچتا :

" لوگ کہتے ہیں اولاد ماؤں کو زیادہ پیاری ہوتی ہے ۔۔۔ مگر کتنی ؟ ۔۔۔ میری زندگی کی سب سے بڑی دولت میرا بیٹا ہے ۔ کیا اس کی ماں کے دل میں اس کے لیے مجھ سے زیادہ چاہت ہے ؟ "

پھر وہی سوال اور جواب دینے والا کوئی نہیں ۔۔۔ رات پوری طرح بھیگ چکی تھی ۔ اسد کے پاس گننے کے لیے سوچ کے مز موتی نہیں بچے تھے ۔۔۔ ہر سو پھیلے ہوئے ہو کے عالم میں شہزادی میری ، کنگ فریڈی اور جل پری کے مجسمے رات کا حصہ بن چکے تھے ۔ صرف پائن کے درختوں کو چھو کر گزرنے والی سمندری ہوا کی سرسراہٹ اور پانی کی لہروں کا شور زندہ تھا ۔ کونے والے ریستوران کی بتیاں بجھ گئی تھیں ، زندگی دم توڑ چکی تھی ۔ دور دور تک سناٹا ہی سناٹا تھا ۔ اسے لگا اس کا اندر سینہ توڑ کر باہر آگیا ہے ۔

اگلے روز طبیعت کی بے زاری سے اکتا کر وہ ناشتے پانی کے چکر میں پڑے بغیر صبح ہی سے وائن کے شغل میں جٹ گیا ۔۔۔ ٹیلی فون کے جھنجھٹ سے بچنے کے لیے جوابی مشین مصرف میں لگا کر گھر کے چپ چاپ در و دیوار میں اپنی کمپنی سے لطف اندوز ہوتا ا محسوس ہو رہا تھا ۔۔۔ پھر اپنی ہی آواز میں اپنا جھوٹ سننے میں مزہ آنے لگا ۔۔۔ ہر گھنٹے پر ریکارڈ کیا ہوا پیغام طوطے کی طرح سبق کو دوہرانے لگتا :

" آپ کی کال سردست وصول نہ کرنے پر معذرت خواہ ہوں ۔ برائے مہربانی طویل سیٹی کے بعد اپنا نام اور ٹیلی فون نمبر بتادیجیے پہلی فرصت میں رابطے کے لیے حاضرِ خدمت رہوں گا ۔ "

" ہا ہا ہا ۔ " وہ پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ ہنسا ۔۔۔

" سائیں تیری خیر ہو ۔ " اس نے اونچی آواز میں نعرہ لگایا ۔

" واہ جی واہ کمال شے ہے بندے سے خود اپنے منہ پہ جھوٹ بلواتی ہے ۔ سالی " ۔ نہار منہ پی جانے والی وائن کا سرور دھمکی سا اثر دکھا رہا تھا ۔۔۔ کئی غیر مطلوب جاننے والوں کی کالیں ریکارڈ ہونے کے بعد دوپہر کے قریب داؤد کی میٹھی آواز ریسیور میں گونجی :

فار : ہم مور مور کے پاس سے واپس آگئے ہیں ۔ میز پیٹا ! ملتے ہی مجھے لینے آجاؤ ۔۔۔ پاسے ساؤنا دائی ۔ " (تم کیسے ہو مجھے بہت یاد آئے)

" ابھی آیا میری جان "

بیٹے کی پرندے جیسی رسیلی چہک نے اسد کی گزشتہ شام سے اب تک تمام ترکسلمندی پل بھر میں اڑن چھو کر دی ۔۔۔ واٹر بھرا گلاس اور ادھ کھلی بوتل جہاں کی تہاں چھوڑ کر وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح اسے لینے جا پہنچا۔ کہاں کا نشہ۔ کیسی الکسی ؟ "فار! آ مائیو" (ابو تم بہت اچھے ہو) وہ شوخی سے۔ مسکرایا۔ "اس خوشامد کا مقصد؟" اسد نے بیٹے کو باہوں میں بھر کر بھینچتے ہوئے پوچھا۔ "آج مجھے ٹیولی لے چلیں گے اور پیزا کا لنچ کرائیں گے ۔۔۔ ہے نا؟" اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"تو اس لیے ہو رہی تھی باپ کی تعریف؟ ۔۔۔ بے ایمان"۔ اسد نے مصنوعی غصے سے گھورا اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس د۔

اپنے پسندیدہ ریستوران میں پیزا کا لنچ اڑا کر۔ ٹیولی پارک، (کوپن ہیگن کی مشہور تفریح گاہ) میں جھولوں کے ساتھ انصاف کرنے پکڑن پکڑائی جیسے تھکا دینے والے کھیل کے بعد باپ بیٹا ہر روز رات کو ہونے والی روایتی آتش بازی کی جگہ کے قریب پڑے ہوئے پرسستانے بیٹھ گئے ۔ سامنے کئی عمر رسیدہ لوگ سبز گھاس کے فرش پر نیم غنودگی کے عالم میں دھوپ سینکنے کا مزہ لے رہے تھے جاپانی پگوڈے کی طرز پہ تعمیر ریستوران کی سیڑھیوں پر قہقہے لگاتے بچے اچھل کود میں مصروف تھے ۔۔۔ پختہ روش پر ان گنت لوگوں جانا لگا تھا۔ مگر اسد کو داؤد کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے نگاہوں کے حصار میں سمیٹے وہ پوری کائنات اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر اترے محبت کے جگنو گرما کی اس چمکیلی دھوپ سے بھی زیادہ روشن تھے ۔ تبھی داؤد نے اچانک اپنے زانوؤں پر اس کا ہاتھ اٹھا کر ہونٹ سے لگاتے ہوئے سرگوشی کی!

"فار! یائے ایلسکر دائی۔ (ابو مجھے تم سے محبت ہے) اس سے بھی زیادہ جتنی تمھیں مجھ سے ہے ۔۔۔ مور کہتی ہے تم گریٹ آدمی ہو۔ مجھے اس سے بھی بہت پیار ہے۔"

"وہ خود بہت اچھی بہت پیاری ہے اور تم تو ہو ہی ہم دونوں کی جان۔"

"تمھیں پتہ ہے فار تم میرے آئیڈیل ہو؟"

"سچ؟"

"بالکل سچ۔ تم جیسا پیارا فار تو پوری دنیا میں کوئی نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی مور جیسی کوئی دوسری مور۔" داؤد کی جگمگاتی ہوئی آنکھوں میں ماں باپ کی الفت لبالب چھلکتے پیمانے سے سوم رس کی طرح چھلکی پڑ رہی تھی ۔۔۔ اسد نے ٹھنڈی لائن کی ہلکی پھلکی بے فکریوں کی طرح فضا میں ہلکورے بھرتے ہوئے سوچا:

"موت اور حیات کی طرح غم اور خوشی کے درمیان بھی پلک جھپکنے کا وقفہ ہے۔"

مفلس سے مفلس اور رنجیدہ سے رنجیدہ انسان کی ہتھیلی پہ کھنچی لکیروں میں بھی آسودگی کا پھول کہیں نہ کہیں کیموفلاج کیے ہے۔ لمحے کی پکڑ میں آتے ہی جس کے کھلنے میں دیر نہیں لگتی ۔۔۔ شادمانی کا احساس اس پر موسم کی پہلی بارش کی طرح پھوار بن کر

— [illegible]

جس قدر خوش گوار انعام ہے کہ میں نے اور فینی نے تعلیم یافتہ ماں باپ ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا [illegible]
اپنی جدید ہی قوت محبت کو اپنے اندر دفن کر کے ایک نسل کو محفوظ کر لیا --- ہم ناکام ہو کر بھی ناکام نہیں۔ ہماری [illegible]
برداشت تک نہیں سکتا --- میں اپنے بیٹے کی نظر میں آئیڈیل باپ اور فینی آئیڈیل ماں ہے، اس کی مکمل اور [illegible]
چاہت سے سرشار ہے۔"

شکر گزاری کے احساس سے اسد کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اس نے بیٹے کو کھینچ کر سینے سے لگایا --- [illegible]
ہکلاتے ہوئے ولادو نے ستے سہرے سے اپنا اعتماد دینے کی کوشش کی۔

"ہاں ڈیڈ، تم جیسا پیارا ڈیڈ پوری دنیا میں کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا --- میں بھی بڑا ہونے پر خود کی طرح [illegible]
تمہارے جیسا گریٹ کول اور آئیڈیل ویک اینڈ ڈیڈ ہوں گا۔"

اس نے گھبرا کے بیٹے کی طرف دیکھا، وہ اسے اپنی محبت بھری نظروں کے معصوم حصار میں لیے آسمانی صحیفے [illegible]
سچائی بیان کر رہا تھا؟ --- اچانک پلک جھپکنے میں اونچائیاں تحت الثریٰ میں کیسے تبدیل ہو گئیں۔ فضا کی تمام تر تازگی کو [illegible]
کی کثافت نے کس طرح نگل لیا؟ --- اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے دل پر پہنچ کر رک گیا۔ نگاہ کے سامنے ولادو کی شکل میں [illegible]
مکمل انسان کی جگہ ایک چٹخا ہوا کانچ کا کھلونا کھڑا تھا --- خوش امیدی کے سورج کو درد کی دھول نے ڈھانپ لیا۔

○●○

○

(سلسلہ ص [illegible])

(جو مذہب اور سماج کے نام نہاد بہی خواہوں سے منسوب ہے) کی تصویر ابھرتی ہے اور ایک متضاد حقیقت [illegible]
گرفت میں لے لیتی ہے۔ جس سے افسانے کی اکائی پہ پیچیدگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

الغرض، افسانہ واقعات کی ترتیب اور کردار و واقعہ کے تخلیقی اور بیانیہ عمل سے [illegible]
کامیاب ہوتا ہے۔ جو اسے آخرے معنی کے بجائے متعدد معنوی امکانات سے [illegible] کرتا ہے اور [illegible]
سے [illegible] ہے۔

○○●○○○

شاہدہ احمد

ہرجائی

میں ایک بے حد قناعت پسند آدمی ہوں۔ زندگی کی مکمل کمائی اپنی ذات کی آزادی کے سوا کچھ نہیں۔ وقت کی مہربانیوں اور لمبی مسافتوں نے بس یہی ایک قیمتی موتی دامن میں ڈالا۔

اپنے اس اثاثے پر اگر خوش اور مطمئن نہیں تو بہت زیادہ ناخوش اور غیر مطمئن بھی نہ تھا۔ ۔ ٹھیک ٹھاک گزر رہی تھی۔ اپنی مرضی سے سونا جاگنا، پہننا اوڑھنا، آنا جانا اور پسند کے لوگوں سے راہ و رسم رکھنا ـــ کہیں بھی کسی جگہ طبیعت پر زور زبردستی یا جبر کا کوئی دخل نہیں تھا ـــ ایسے میں شامتِ اعمال وہ اچانک بغیر کسی چاہت یا خواہش کے اس طرح میری زندگی میں وارد ہوئی کہ میں پورے کا پورا مخل مختل ہوکر رہ گیا ـــ ایک ہی تو سرمایہ تھا میرے پاس اپنی ذات کی آزادی کا۔ جو اس کے شاملِ حال ہوتے ہی لٹ گیا۔ میں نے ... ہو کر سوچا

"اب میرا اپنا کیا رہا ـــ کس پونجی پر ناز کروں گا؟"

"ایسا کیوں سوچتے ہو میں جو ہوں ـــ میرے وجود سے بڑھ کر بھی کوئی اور شے ہوسکتی ہے ناز کرنے کے لیے؟ ـــ ارے اس رفاقت کے عوض تو لوگ دین دنیا ہر چیز خوشی خوشی دان کرنے کو تیار ہیں"۔ اس نے دل ربائی سے موہنے کی کوشش کی۔ اس ادا نے مجھے لاجواب کردیا۔ اس میں بلاشبہ وہ کشش اور جاذبیت تھی کہ لوگ خواہ مخواہ اس کے تعلق سے میرے گرویدہ ہونا شروع ہوگئے ـــ گو کہ ہم دونوں کے بیچ اس بندھن کی استواری سے میرے لیے خالص اپنی ذات کے واسطے دو پل چرانے مشکل ہوگئے ... سے مزاج پر چڑچڑاہٹ طاری رہنے لگی ـــ مگر پھر بھی اکثر یہ سوچ کر مسکرا اٹھتا بعض اوقات شاعر بھی کیا پتے کی بات کہہ جاتا ہے ... "وہ تو وہ ہے تمہیں ہوجائے گی الفت مجھ سے، اک نظر تم میرا محبوبِ نظر تو دیکھو" والی بات صادر ہوچکی تھی ـــ یہ الگ بات ... ہم میں سے کون عاشق تھا کون معشوق، اس کا فیصلہ ہونا باقی تھا مگر لوگوں کے نزدیک میں اس کا محبوبِ نظر تسلیم کرلیا گیا جس کے طفیل ... مجھ سے بھی محبت ہوگئی ـــ جو خاصی مہنگی پڑ رہی تھی۔ دل چاہتا ساری دنیاداری تہہ کرکے ایک طرف رکھوں اور بے مروتی سے ...

"آپ کی محبتیں اور نوازشیں مجھ حقیر فقیر کی اوقات سے بڑھ کر ہیں ـــ خدارا ان فراخ دلانہ عنایات کی بارشیں کہیں اور برسائیے۔" ... آجاتا۔"

میں اس میدان میں اناڑی تھا بے چارہ بے خبری میں مارا گیا ۔۔۔ پہلے سے علم ہوتا تو ایسی نخریلی مزاج دار کے پاس سے بچ کر نکل لیتا ۔۔۔ اس کے باوجود بندھن بندھ گیا تو مجھ پر اس کا حق تھا۔ اس کے ناز نخرے تو کسی حد تک گوارا تھے مگر اس کی خوش نودی کی خاطر بھانت بھانت کے چنز قماتیوں کے سامنے خوش مزاجی کے مظاہروں کی اضافی مشقت خون کھولا کر رکھ دیتی ۔۔۔ دانت پیس کر گلی سے ڈپٹنا چاہتا تو سراپا معصوم مسکراہٹ بنی خاموشی کی زبان میں جتاتی :

"ہمیں اپنایا ہے تو یہ تو ہو گا ہی جانی۔" جواباً میں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔

ضروری ذمہ داریاں نبھانا دشوار ہو گیا ۔۔۔ جب دیکھو تب لوگوں پر بے وقت محبت کی الرجی کا دورہ پڑنے لگا۔ کوئی گزرتا گزرتا دفتر میں سلام کرنے حاضر ہو جاتا ۔۔۔ کسی کا اچانک ہیلو ہائے کے لیے جی مچل اٹھتا ۔۔۔ کوئی ٹیلی فون پر آدمی ملاقات کو ناکافی سمجھتے ہوئے بالمشافہ ملاقات کے لیے ٹھہرانے یا عشائیے پر اصرار میں وقت برباد کرتا۔

یہاں دفتر کے طوفانی کام تنکے کی طرح اڑائے پھرتے۔ مرنے تک فرصت نہیں تھی اور ادھر یار لوگوں کو اپنی تقریبات میں رنگ بھرنے کے لیے مجھے مہمانِ خصوصی بنانے یا صدارتی چونچلوں کی پڑی رہتی۔

پہلے کی سی بے فکری اور آزادی خواب و خیال ہو کر رہ گئی ۔۔۔ حسرت سے سوچتا۔ تھک ٹوٹ کر کسی گوشۂ عافیت میں ایسی شراب کا پیالہ ملے کہ خود سمیت ہر چیز بھلا بیٹھوں ۔۔۔ لیکن خود کو بھولنا تو درکنار یہاں تو اعصاب سے اس کا اترنا مشکل تھا ۔۔۔ جب بھی ایک پل کی فرصت نصیب ہوتی اپنے آپ پر لعنت ملامت کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔

"تف تمہاری اوقات پر ۔۔۔ بھلا ایسے بھی کسی کے ساتھ ناتا جوڑا جاتا ہے کہ زمانہ تو جب چاہے تمھیں تفریحی پارک کے پھاٹک کی طرح کھول کر تم سے ملنے چلا آئے۔ مگر خود سے ملاقات کے لیے اپائنٹمنٹ کی ضرورت آن پڑے اور مزے داری کی بات یہ کہ وہ بھی نہ ملے۔"

اس صورتِ حال نے یہاں تک عاجز کر دیا کہ نوبت تین لفظا کہہ کر سارے بندھن توڑ لینے کی سوچ تک جا پہنچی ۔۔۔ ہم دونوں کے درمیان مزاجوں کی یہ دوریاں بعض اوقات بڑی سنجیدگی سے کھلنے لگیں ۔۔۔ یہ بندشیں، یہ پابندیاں اور مصنوعی طرزِ زندگی مجھ جیسے آزاد منش کے بس کا روگ نہیں تھا ۔۔۔ اس جنجال سے جان چھڑانے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔

وہ یہ تیور اچھی طرح بھانپ رہی تھی ۔۔۔ اسے خوب معلوم تھا اس کی کشش یا جاذبیت میری کمزوری نہیں۔ لوحِ محفوظ کا لکھا تھا کہ وہ میری زندگی میں آگئی یا میں اس کے بس میں چلا گیا ۔۔۔ اس حقیقت کو جاننے کے باوجود وہ مجھ پر امربیل کی طرح پھیل کر مجھے لگے کے درپے رہتی ۔۔۔ اس کی خواہش تھی مجھ پر اس طرح چھا جائے کہ میں اپنی شناخت کھو کر اس کے سامنے میں بونا بن جاؤں۔

اپنی فطرت کے خلاف خود پہ جبر کی قیمت کے عوض شہرت اور ناموری کے بازار میں بٹنے والی قدر و منزلت پر کبھی کبھار تھوڑا سا مغرور ہونے کو دل چاہا تو بھنگ بھری جھٹ پٹ تیکھی چتون سے اخلاقی میری خوش فہمی ہوا کرنے سامنے آکھڑی ہوتی۔

"یہ جو تو بھگت رہا ہے دنیا کے اس میلے میں اس کا کارن میں ہوں اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں۔"

"بکواس، نری بکواس، آخر کیا خصوصیت ہے مجھ میں جو میں تمہارا انتخاب ٹھہرا ورنہ آدمیوں کی بھیڑ سے اٹے شہر میں مجھے ہی ایسا معتبر کیوں بنایا تم نے؟"

میرے اس سوال پر اسے کوئی جواب نہ سوجھتا، کھسیانی سی ہو کر نظریں چرانے لگتی ۔۔۔ اور اس کی یہ کھسیاہٹ مجھے گرم خطوں میں بہنے والی ہموار کے کیف میں ڈال دیتی۔

"ایسی بے قدری تو میری کسی نے زندگی بھر نہیں کی۔" وہ تاؤ میں آکر غراتی۔

"کہہ دو کہ دو آنکھوں کا اندھا عقل کا پورا برا نہیں مانوں گا۔" میں مزہ لیتے ہوئے کمینگی سے چڑاتا۔

"لاکھ آنکھوں کے اندھے عقل کے پورے سہی مگر اتنے بھی نہیں کہ مجھے چھوڑنے کی حماقت کر بیٹھو۔" وہ بری طرح جھلا گئی۔

جواباً میری ہنسی اس کے لیے ہوا کو شیشہ دینے جیسا چیلنج بن گئی ۔۔۔ وہ اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھی کہ مجھے سچ مچ اس سے دلی رغبت نہیں ۔۔۔ جب کہ حقیقتاً اس کی جاذبیت، کشش اور افتخار تمام چیزیں مل کر بھی میری نظر میں وہ درجہ نہ پاسکیں جن کی قیمت کے طور پر میں اپنی رائے، اصول اور مزاج اس کے آگے گروی رکھنے پر راضی ہونے کا سودا کرتا۔

یہ سلسلہ آخر کہاں تک اور کب تک چلتا ۔۔۔ میں نے اپنی سی کر دیکھی ۔۔۔ ہر طرح سے چاہا وہ مجھ سے میری خواہش کے مطابق سمجھوتا کر لے تاکہ ہمارا ساتھ ممکن رہے مگر اس میں لچک نہ پیدا ہو سکی، اسی طرح اپنے گمان کی بلندیوں پر بیٹھی مجھے مجھی سے لڑنے پر مجبور کرتی رہی۔

انت اس کا یوں ہوا کہ ایک روز میں نے کورے کاغذ پر اس کے نام تین حرف لکھے اور فرصت کی راہ لی ۔۔۔ مگر وہ بھی ایک پہنچی ہوئی شے تھی ۔۔۔ کاغذ کے اس ٹکڑے کو سنبھال کر گریبان میں رکھتے ہوئے یوں ظاہر کرنے لگی جیسے میرے فراق میں کچے گھڑے پر بیٹھ کر خود کو چڑھی لہروں کے حوالے کر دے گی لیکن میری جگہ کسی اور کو نہ دے گی ۔۔۔ میں بھی انسان تھا اس کے اس تاثر نے اپنے عمل پر نظرثانی کی ترغیب دی تو اقرار کیے بغیر نہ رہا گیا۔

"وہ اچھی تھی واقعی بہت اچھی، مگر جتنی اچھی اس سے بڑھ کر مشکل اور ٹیڑھی۔"

اس کے رویے نے میری خوش گمانیوں کو ہوا دی ۔۔۔ اور جب یہ گمان یقین کے گلے ملنے کی حد کو پہنچ گیا کہ وہ میرا لکھا کاغذ پھاڑ کر مجھے اپنی باہوں میں واپس سمیٹ کر انعام و تفہیم کی خوش خبری سنانے کو ہے تو رعونت سے منہ پھیر کے بولی!

"جا میں نے تجھے آزاد کیا۔"

اس کی اس کمینی ادا پر بلبلاتے ہوئے میں اپنے پرائے ہر کسی سے کٹ کر تن تنہا کئی دنوں تک خود کو شراب کے پیالوں میں ڈبوئے بہ یک وقت اپنی انا کا ماتم اور آزادی کا جشن مناتا رہا ۔۔۔ پھر آہستہ آہستہ اس دوہری کیفیت کا عذاب کچھ ٹھنڈا پڑا تو نہ چاہتے ہوئے بھی بہت کچھ یاد آنے لگا۔ اپنی وہ قدر و منزلت وہ پذیرائیاں جن کے لمس سے تمام عمر نا آشنائی رہی۔

"یہ میں تھی جس کے وسیلے سے ایک دنیا تمہارے آگے سرنگوں ہوئی --- کہاں ہیں اب وہ ایوان بالا میں تمہاری عنایتیں --- وہ لوگوں کا پروانہ وار نثار ہونے والا ہجوم --- کیوں خشک ہوگئے لوگوں کی محبتوں کے سوتے، نوازشوں کے دریا۔ ؟" وہ تصور کے پردے پر کڑوی طنز کے نشتر چلاتی ہنس ہنس کر کچوکے لگا رہی تھی۔

"یہ تم نہیں میں ہوں جس نے تمہارے ساتھ سب کو خیرباد کہا ہے سمجھیں" ؟

میرے جواب پر وہ کس نائکہ کی طرح فراخ پن سے مسکرائی --- میں حیران رہ گیا وہ جو اس قدر پرکشش، ایسی جاذب نظر اور موہنی کہلاتی تھی دراصل اتنی بدصورت، ایسی بدخصلت تھی ؟ --- زیادہ حیرانی مجھے اس بات پر ہوئی کہ اس کا یہ بدہیت چہرہ میرے علاوہ کسی اور کو کیوں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے غصہ آنے لگا لوگوں کی منافقتوں، خود غرضیوں اور ابن الوقتیوں پر --- میں نے کسی کی جھوٹی محبت کا اعتبار نہیں کیا تھا --- کسی کی پرفریب نوازشوں کو اخلاص نہیں جانا تھا اس کے باوجود بدلے ہوئے رویے تکلیف دے رہے تھے تو کیوں --- بھلا کیوں ؟

ایسے میں میرا ہم زاد میرے اندر سے نکل کر دہلیز پہ آ بیٹھا --- اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ یہ بدبخت بھی انہی میں سے تھا جو میرے رفیق ہونے کا دم بھرا کرتے تھے --- میں اس سے بھی کبیدہ خاطر تھا مگر منحوس اس کی پرواہ کیے بغیر جم کر سامنے بیٹھ گیا،

"کیا اپنے فیصلے پر پشیمان ہو ؟"

"کس نے کہا یہ تم سے" ؟ میں نے الٹا سوال کیا۔

"اپنے فیصلے پر نہیں اس پرتیا کے ہرجائی رویے کی خلش ہے --- ہے نا ؟"

"خلش --- خلش کس بات کی" ؟ میرے اندر کی خفگی میرے لہجے میں عیاں ہونے لگی۔

"خلش اس بات کی کہ تمہیں خود پر بہت مان تھا --- بڑے پریقین تھے دامن جھٹک کر اٹھ گئے تو وہ بڑھ کر راہ روک لے گی --- تم سا جہاں دیدہ اور زیرک انسان اور سادگی کی یہ انتہا ؟"

"کیا مطلب" ؟ میں جزبز ہو کر رہ گیا۔

"مطلب یہ کہ کیا تم اس کی زندگی میں آنے والی پہلی ہستی ہو ؟"

"نہیں مجھے معلوم ہے مجھ سے پہلے کسی اور کے ساتھ اس کا سمبندھ تھا۔" میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"پھر تم نے اس سے ایسی توقع کیوں باندھی ؟"

"میں نے کسی سے کوئی توقع نہیں باندھی۔ تم اچھی طرح جانتے ہو اسے آباد کرنے کے لیے مجھے کھینچ کر اس کی طرف سے جایا گیا تھا۔

۔"

"کیا فرق پڑتا ہے مرادِ تو مراد ہی ہوتی ہے وہ خود کسی کو اپنی طرف بلالے یا کوئی کسی کو گھسیٹ کر اس تک لے جائے ایک ہی بات ہے۔"

ہم زاد کی اس دلیل پر میں نے ناگواری کا اظہار کرنا چاہا لیکن کیا نہیں ـــــ میری اس خاموشی سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا، بولا،

"تم نے اپنی زندگی کے برے بھلے جو بھی اصول بنا رکھے ہیں ان کا سودا نہیں کیا اور خود کو دنیا پرستی کے گڑھے میں اجازت نہیں دی، کیا یہ کم ہے؟

"اٹھو میرے سامنے سے اور فوراً چلے جاؤ"۔ میں اپنی تلخی پر مزید قابو نہ رکھ سکا۔

"تمھیں کھاتر کیوں کر ضدی بچہ ـــــ؟ ارے احمق میں وہ مراد نہیں، تمھارا ہم زاد، تمھارا غم گسار ہوں، تم مجھے اتنی آسانی ساتھ خود سے دور نہیں کرسکتے۔"

اس کے جواب میں جو زمین کے سینے پر رکھی چٹان جیسی مضبوطی اور استقامت تھی مجھے تھکانے لگی۔ میں نے ہانپ کر

"آخر اس مکالمے بازی سے تم کیا باور کرانا چاہتے ہو؟"

"صرف یہ کہ جس طرح طوائف کسی ایک کی نہیں ہوتی اسی طرح وہ کرسی بھی کسی ایک کی نہیں ہوتی جس کے مختصر سے لے انسانوں کے لئے سارے رنگ تم پر واضح کیے ہیں کہ ایک عرصہ لگے گا حواس جوڑنے میں۔"

"میرا خیال ہے تم کوئی فلسفہ نہیں سیدھی سادی سچائی بیان کر رہے ہو جو کچھ کچھ درست ہے"۔ میں نے قائل ہوتے ہوئے کہا۔

"کچھ کچھ"؟ وہ شرارت سے ہنسا

"نہیں بہت کچھ۔"

میری ہنسی اس کی ہنسی میں شامل ہوگئی اور کھو جانے والی آزادیٔ ذات کی ان مول پونجی ایک بار پھر سے میری ملکیت میں آگئی۔

راجندر سنگھ بیدی

لاجونتی

"ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے۔۔۔"

(یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ری ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جاتے ہیں۔)

۔۔۔ ایک پنجابی گیت ۔

بٹوارہ ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا اور پھر سب مل کر ان کی طرف متوجہ ہوگئے [illegible] کے بدن صحیح و سالم تھے، لیکن دل زخمی۔۔۔

گلی گلی محلے محلے "پھر بساؤ" کمیٹیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تن دہی کے ساتھ "کاروبار میں بساؤ" "زمین پر بساؤ" اور "گھروں میں بساؤ" پروگرام شروع کردیا گیا تھا لیکن ایک پروگرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا جس کا سلوگن تھا "دل میں بساؤ" اور اس پروگرام کی نارائن باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے بڑی مخالفت ہوئی تھی۔

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لیے مندر کے پاس محلے "ملاشکور" میں ایک کمیٹی قائم ہوگئی اور گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے بابو سندر لال کو اس کا سکریٹری چن لیا گیا۔ وکیل صاحب صدر، چوکی کلاں کا بوڑھا محرر اور محلے کے دوسرے معتبر لوگوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جاں فشانی کے ساتھ اس کام کو کوئی اور نہ کرسکے گا۔ شاید اس لیے کہ سندر لال کی اپنی بیوی اغوا ہوچکی تھی اور اس کا نام بھی تھا لاجو۔۔۔ لاجونتی۔

چناں چہ پربھات پھیری نکالتے ہوئے جب سندر لال بابو، اس کا ساتھی رسالو اور نیکی رام وغیرہ مل کر گاتے۔۔۔ "ہتھ لائیاں کملانی لاجونتی دے بوٹے۔۔۔" تو سندر لال کی آواز ایک دم بند ہوجاتی۔ اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بابت سوچتا۔۔۔ جانے وہ کہاں گئی ہوگی، کس حال میں ہوگی، ہماری بابت کیا سوچ رہی ہوگی، وہ کبھی آئے گی بھی یا نہیں؟۔۔۔ اور پتھریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے۔

اور اب تو یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ اس نے لاجونتی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کا غم اب دنیا کا غم

دیکھا تھا۔ اس نے اپنے دکھ سے بچنے کے لیے لوک سیوا میں اپنے آپ کو غرق کر دیا۔ اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز ملانے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا ۔ ۔ ۔ انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر اسے ٹھیس لگ سکتی ہے۔ وہ لاجونتی کے پودے کی طرح ہے۔ جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤ تو کمھلا جاتا ہے لیکن اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ اسے جگہ بے جگہ اٹھنے بیٹھنے، کھانے کی طرف بے توجہی برتنے اور ایسی ہی معمولی معمولی باتوں پر پیٹا کرتا تھا۔

اور لاجو ایک پتلی شہتوت کی ڈالی کی طرح نازک سی دیہاتی لڑکی تھی۔ زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا گیا تھا۔ طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے قراری تھی۔ اس کا اضطراب شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ بن کر اس کے بڑے سے پتے پر کبھی ادھر کبھی ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔ اس کا دبلاپن اس کی صحت کے خراب ہونے کی دلیل نہ تھی، ایک صحت مندی کی نشانی تھی جسے دیکھ کر بھاری بھرکم سندرلال پہلے تو گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجو ہر قسم کا بوجھ، ہر قسم کا صدمہ حتیٰ کہ مار پیٹ تک سہہ گزرتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا گیا اور اس نے ان حدوں کا خیال ہی نہ کیا جہاں پہنچ جانے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ سکتا ہے۔ ان حدوں کو دھندلا دینے میں لاجونتی خود بھی تو ممد ثابت ہوئی تھی۔ چوں کہ وہ دیر تک اداس نہ بیٹھ سکتی تھی اس لیے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی سندرلال کے صرف ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکتی اور لپک کر اس کے پاس چلی آتی اور گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہہ اٹھتی ۔ ۔ ۔ "پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی ۔ ۔ ۔" صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک دم ساری مارپیٹ بھول چکی ہے۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ مرد ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں بلکہ عورتوں میں کوئی بھی سرکشی کرتی تو لڑکیاں خود ہی ناک پر انگلی رکھ کے کہتیں ۔ ۔ ۔ "لے وہ بھی کوئی مرد ہے بھلا۔ عورت جس کے قابو میں نہیں آتی ۔ ۔ ۔" اور یہ مارپیٹ ان کے گیتوں میں چلی گئی تھی۔ خود لاجو گایا کرتی تھی۔ میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی۔ وہ بوٹ پہنتا ہے اور میری کمر بڑی پتلی ہے۔ لیکن پہلی ہی فرصت میں لاجو نے شہر ہی کے ایک لڑکے سے لو لگالی اور اس کا نام تھا سندرلال، جو ایک برات کے ساتھ لاجونتی کے گاؤں چلا آیا تھا اور جس نے دولہا کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا "تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار، بیوی بھی چٹ پٹی ہوگی۔" لاجونتی نے سندرلال کی اس بات کو سن لیا تھا مگر وہ یہ بھول ہی گئی کہ سندرلال کتنے بڑے بڑے اور بھدے بوٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کی اپنی کمر کتنی پتلی ہے!

اور پربھات پھیری کے سمے ایسی ہی باتیں سندرلال کو یاد آئیں اور وہ یہی سوچتا، ایک بار، صرف ایک بار لاجو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسالوں اور لوگوں کو بتادوں ۔ ۔ ۔ ان بے چاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ فسادیوں کی ہوسناکیوں کا شکار ہو جانے میں ان کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا، انھیں اپنا نہیں لیتا ۔ ۔ ۔ ایک گلا سڑا سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے ۔ ۔ ۔ وہ ان عورتوں کو گھروں میں آباد کرنے کی تلقین

رتا اور انھیں ایسا مرتبہ دینے کی پریرنا کرتا جو گھر میں کسی بھی عورت ، کسی بھی ماں ، بیٹی ، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے ۔ پھر وہ ہتا ۔ ۔ ۔ انھیں اشارے اور کنائے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی چاہیے جو ان کے ساتھ ہوئیں ۔ ۔ ۔ کیوں کہ ان کے دل غمی ہیں ۔ وہ نازک ہیں ، چھوئی موئی کی طرح ۔ ۔ ۔ ہاتھ بھی لگاؤ تو کھلا جائیں گے ۔ ۔ ۔

گویا " دل میں بساؤ " پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے محلہ ملاشکور کی اس کمیٹی نے کئی پربھات پھیریاں نکالیں ۔ صبح چار انچ بجے کا وقت ان کے لیے موزوں ترین وقت ہوتا تھا ۔ نہ لوگوں کا شور ، نہ ٹریفک کی الجھنیں ، رات بھر چوکیداری کرنے والے کتے تک بجھے ہوئے تنوروں میں سردے کر پڑے ہوتے تھے ۔ اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے لوگ پربھات پھیری والوں کی آواز سن لر صرف اتنا کہتے ۔ ۔ ۔ او ، وہی منڈلی ہے ، اور پھر کبھی صبر اور کبھی تنک مزاجی سے وہ بابو سندرلال کا پروپگینڈا سنا کرتے ۔ وہ عورتیں جو بڑی محفوظ اس پار پہنچ گئی تھیں گو بھی کے پھلوں کی طرح پھیلی پڑی رہتیں اور ان کے خاوند ان کے پہلو میں ڈنٹھلوں کی طرح اکڑے پڑے پڑے پربھات پھیری کے شور پر احتجاج کرتے ہوئے منہ میں کچھ منمناتے چلے جاتے ۔ یا کہیں کوئی بچہ تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں کھول کر " دل میں بساؤ " کے فریادی اور اندوہ گیں پروپگینڈے کو صرف ایک گانا سمجھ کر پھر سو جاتا ۔

لیکن صبح کے سمے کان میں پڑا ہوا شبد بے کار نہیں جاتا ۔ وہ سارا دن ایک تکرار کے ساتھ دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے معنی کو بھی نہیں سمجھتا پر گنگناتا چلا جاتا ہے ۔ اسی آواز کے گھر کر جانے کی بدولت ہی تھا کہ انھیں دنوں میں جب کہ مس مردولا سارا بھائی ہند اور پاکستان کے درمیان اغوا شدہ عورتیں تبادلے میں لائیں تو محلہ ملاشکور کے کچھ آدمی نھیں پھر سے بسانے کے لیے تیار ہوگئے ۔ ان کے وارث شہر سے باہر چوکی کلاں پر انھیں ملنے کے لیے گئے ۔ مغویہ عورتیں اور ان کے لواحقین کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر سر جھکائے اپنے اپنے برباد گھروں کو پھر سے آباد کرنے کے کام پر چل دیے ۔ سالو اور نیکی رام اور سندرلال بابو کبھی " مہندر سنگھ زندہ باد اور کبھی " سوہن لال زندہ باد " کے نعرے لگاتے ۔ ۔ ۔ وہ نعرے لگاتے ہے حتیٰ کہ ان کے گلے سوکھ گئے ۔ ۔ ۔

لیکن مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں ، جن کے ماں باپ ، بہن اور بھائیوں نے انھیں پہچاننے سے انکار کردیا تھا ۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں ؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لیے انھوں نے زہر کیوں نہ کھالیا ؟ کنویں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی ؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں ۔ سینکڑوں ہزار عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان دے دی لیکن انھیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں ۔ کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں ۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انھیں نہیں پہچانتے ۔ پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی ۔ ۔ ۔ سہاگ وتی ۔ ۔ ۔ سہاگ والی ۔ ۔ ۔ اور اپنے بھائی کو اس جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی ۔ ۔ ۔ تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری ؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تھا رے ۔ ۔ ۔ اور بہاری چلا دینا چاہتا ۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کے نارائن

بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا جو دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے ۔ جو صرف ایک حد ہے جس کے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں ۔

لیکن فوجی ٹرک میں مس سارا بھائی تبادلے میں جو عورتیں لائیں ، ان میں لاجو نہ تھی ۔ سندرلال نے امید و بیم سے آخری لڑکی کو ٹرک سے نیچے اترتے دیکھا اور پھر اس نے بڑی خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کو دو چند کردیا ۔ اب وہ صرف صبح کے سمے ہی پربھات پھیری کے لیے نہ نکلتے تھے بلکہ شام کو بھی جلوس نکالنے لگے اور کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنے لگے جس میں کمیٹی کا بوڑھا صدر وکیل کالکا پرشاد صوفی کھنکاروں سے ملی جلی ایک تقریر کردیا کرتا اور رسالو ایک پیک دان لیے ڈیوٹی پر ہمیشہ موجود رہتا ۔ لاؤڈ اسپیکر سے عجیب طرح کی آوازیں آتیں ۔ پھر کہیں نیکی رام محرر چوکی کچھ کہنے کے لیے اٹھتے لیکن وہ جتنی بھی باتیں کہتے اور جتنے بھی شاستروں اور پرانوں کا حوالہ دیتے اتنا ہی اپنے مقصد کے خلاف باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتا دیکھ کر سندرلال بابو اٹھتا لیکن وہ دو فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا ۔ اس کا گلا رک جاتا ۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور روہانسا ہونے کے کارن وہ تقریر نہ کر پاتا ۔ آخر بیٹھ جاتا ۔ لیکن مجمع پر ایک عجیب طرح کی خاموشی چھاجاتی اور سندرلال بابو کی ان دو باتوں کا اثر جو کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے چلی آتیں ، وکیل کالکا پرشاد صوفی کی ساری ناصحانہ فصاحت پر بھاری ہوتا ۔ لیکن لوگ وہیں رو دیتے ، اپنے جذبات کو آسودہ کرلیتے اور پھر خالی الذہن گھر لوٹ جاتے ۔

ایک روز کمیٹی والے سانجھ کے سمے بھی پرچار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑھ میں پہنچ گئے ۔ مندر کے باہر پیپل کے پیڑ کے ارد گرد سیمنٹ کے تھڑے پر کئی شردھالو بیٹھے تھے اور رامائن کی کتھا ہو رہی تھی ۔ نارائن باوا رامائن کا وہ حصہ سنا رہے تھے جہاں ایک دھوبی نے اپنی دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا ۔ ۔ ۔ میں راجا رام چندر نہیں جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آنے پر بھی سیتا کو بسالے گا اور رام چندر جی نے مہاستونتی سیتا کو گھر سے نکال دیا ۔ ایسی حالت میں جب کہ وہ گربھ وتی تھی ۔ "کیا اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے ؟ " ۔ ۔ ۔ نارئن باوا نے کہا ۔ ۔ ۔ " یہ ہے رام راج ، جس میں ایک دھوبی کی بات کو بھی اتنی ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ "

کمیٹی کا جلوس مندر کے پاس رک چکا تھا اور لوگ رامائن کی کتھا اور شلوک کا ورنن سننے کے لیے ٹھہر چکے تھے ۔ سندرلال آخری فقرے سنتے ہوئے کہہ اٹھا ۔ ۔ ۔

"ہمیں ایسا رام راج نہیں چاہیے بابا ! "

"چپ رہو جی " ۔ ۔ ۔ " تم کون ہوتے ہو ؟ " ۔ ۔ ۔ " خاموش ! " مجمع سے آوازیں آئیں اور سندرلال نے بڑھ کر کہا ۔

۔ ۔ " مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا ۔ "

پھر ملی جلی آوازیں آئیں ۔ ۔ ۔ " خاموش ! " ۔ ۔ ۔ ہم نہیں بولنے دیں گے ۔" اور ایک کونے میں سے یہ بھی آواز آئی

۔ ۔ ۔ " مار دیں گے ۔ "

نارائن بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا ۔ ۔ ۔ " تم شاستروں کی مان مرجادا کو نہیں سمجھتے سندرلال ! "

سندرلال نے کہا ۔ ۔ ۔ " میں ایک بات تو سمجھتا ہوں بابا ۔ ۔ ۔ رام راج میں دھوبی کی آواز تو سنی جاتی ہے لیکن سندرلال کی نہیں ۔ "

انھیں لوگوں نے جو ابھی مارنے پہ تلے تھے ۔ اپنے نیچے سے پیپل کی گولریں ہٹا دیں اور پھر سے بیٹھتے ہوئے بول اٹھے ۔ " سنو ، سنو ، سنو ۔ ۔ ۔ "

رسالو اور نیکی رام نے سندر لال بابو کو ٹھوکا دیا اور سندرلال بولے ۔ ۔ ۔ " شری رام نیتا تھے ہمارے ۔ پر یہ کیا بات ہے بابا جی ۔ انھوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا ۔ مگر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وشواش نہ کر پائے ؟ "

نارائن بابا نے اپنی ڈاڑھی کی کھچڑی پکاتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ " اس لیے کہ سیتا ان کی اپنی پتنی تھی ۔ سندر لال ، تم اس بات کی مہانتا کو نہیں جانتے ۔ "

" ہاں بابا ۔ ۔ ۔ " سندرلال بابو نے کہا ۔ ۔ ۔ " اس سنسار میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں ۔ پر میں سچا رام راج اسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کرسکتا ۔ اپنے آپ سے نا انصافی کرنا اتنا ہی بڑا پاپ ہے جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا ۔ ۔ ۔ آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے ۔ ۔ ۔ اس لیے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی ہے ۔ ۔ ۔ اس میں کیا قصور تھا سیتا کا ؟ کیا ؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں بہنوں کی طرح ایک چھل اور کپٹ کی شکار نہ تھی ؟ اس میں سیتا کے ستیہ اور استیہ کی بات ہے یا راکشش راون کے وحشی پن کی جس کے دس سر انسان کے تھے لیکن ایک اور سب سے بڑا سر گدھے کا ؟ "

۔ ۔ ۔ آج ہماری سیتا نردوش گھر سے نکال دی گئی ہے ۔ ۔ ۔ سیتا ۔ ۔ ۔ لاجونتی ۔ ۔ ۔ اور سندر لال بابو نے رونا شروع کردیا ۔ رسالو اور نیکی رام نے تمام وہ سرخ جھنڈے اٹھالیے جن پر آج ہی اسکول کے چھوکروں نے بڑی صفائی سے نعرے کاٹ کر چپکادیے تھے اور پھر وہ سب " سندرلال بابو زندہ باد " کے نعرے لگاتے ہوئے چل دیے ۔ جلوس میں سے ایک نے کہا ۔ ۔ ۔ " مہا ستی سیتا زندہ باد " ایک طرف سے آواز آئی " شری رام چندر ۔ ۔ ۔ "

اور پھر بہت سی آوازیں آئیں ۔ ۔ ۔ " خاموش ، خاموش ! " اور نارائن باوا کی مہینوں کی کتھا اکارت چلی گئی ۔ بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہوگئے جس کے آگے آگے وکیل کالکا پرشاد ، حکم سنگھ محرر چوکی کلاں جارہے تھے ۔ اپنی بوڑھی چھڑیوں کو زمین پر مارتے اور ایک فاتحانہ سی آواز پیدا کرتے ہوئے ۔ ۔ ۔ اور ان کے درمیان کہیں سندرلال جارہا تھا ۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے ۔ آج اس کے دل کو بری طرح ٹھیس لگی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر

گا رہے تھے ۔

" ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے . . . "

ابھی گیت کی آواز لوگوں کے کانوں میں گونج رہی تھی ۔ ابھی صبح بھی نہیں ہو پائی تھی اور محلہ ملاشکور کے مکان ۴۱۴ بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کرب ناک انگڑائیاں لے رہی تھی کہ سندرلال کا " گرائیں " لال چند جسے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو لے دیا تھا ، دوڑا دوڑا آیا اور اپنے گاڑھے کی چادر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا . . .

" بدھائی ہو سندرلال ۔ "

سندرلال نے میٹھا گڑ چلم میں رکھتے ہوئے کہا . . . " کس بات کی بدھائی لال چند ؟ "

" میں نے لاجو بھابی کو دیکھا ہے ۔ "

سندرلال کے ہاتھ سے چلم گر گئی اور میٹھا تمباکو فرش پر گر گیا . . . " کہاں دیکھا ہے ؟ " اس نے لال چند کے کندھوں کو پکڑتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ پانے پر جھنجھوڑ دیا ۔

" واگہ کی سرحد پر ۔ "

" سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سا بولا ۔ " کوئی اور ہوگی ۔ "

لال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا . . . " نہیں بھیا وہ لاجو ہی تھی لاجو . . . "

" تم اسے پہچانتے بھی ہو ؟ " سندر لال نے پھر سے میٹھے تمباکو کو فرش پر سے اٹھاتے اور ہتھیلی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ا کرتے ہوئے اس نے رسالو کی چلم حقے پر سے اٹھالی اور بولے . . . " بھلا کیا پہچان ہے اس کی ؟ "

" ایک تیندولہ ٹھوڑی پر ہے ، دوسرا گال پر . . . "

" ہاں ہاں ہاں " اور سندر لال نے خود ہی کہہ دیا ۔ " تیسرا ماتھے پر ۔ " وہ نہیں چاہتا تھا اب کوئی خدشہ رہ جائے اور ایک دم اسے لاجونتی کے جانے پہچانے جسم کے سارے تیندولے یاد آگئے جو اس نے بچپنے میں اپنے جسم پر بنوالیے تھے جو ان ہلکے ہلکے دانوں کی مانند تھے جو چھوئی موئی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہی وہ کمھلانے لگتا ہے ۔ بالکل ا طرح ان تیندولوں کی طرف انگلی کرتے ہی لاجونتی شرما جاتی تھی . . . اور گم ہو جاتی تھی ، اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی ۔ گویا اس کے سب راز کسی کو معلوم ہوگئے ہوں اور کسی نا معلوم خزانے کے لٹ جانے سے وہ مفلس ہوگئی ہو . . . سندر لال کا سارا جسم ایک ا جانے خوف ، ایک ان جانی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھنکنے لگا ۔ اس نے پھر سے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا . . .

" لاجو واگہ کیسے پہنچ گئی ؟ "

لال چند نے کہا . . . " ہند اور پاکستان میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھا نا ۔ "

" پھر کیا ہوا ۔ ۔ ۔ ؟ " سندر لال نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا ۔ " کیا ہوا پھر ؟ "

رسالو بھی اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور تمباکو نوشوں کی مخصوص کھانسی کھانستے ہوئے بولا ۔ ۔ ۔ " سچ مچ آگئی ہے لجونتی بھابی ؟ "

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ " واگہ پر سولہ عورتیں پاکستان نے دے دیں اور اس کے عوض سولہ رتیں لے لیں ۔ لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہوگیا ۔ ہمارے والنٹیر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں ان میں ادھیڑ می اور بے کار عورتیں زیادہ ہیں ۔ اس تنازعے پر لوگ جمع ہوگئے اور ادھر کے والنٹیروں نے لاجو بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ " اسے بوڑھی کہتے ہو ؟ دیکھو ۔ ۔ ۔ دیکھو ۔ ۔ ۔ جتنی عورتیں تم نے دی ہیں ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی ؟ " اور ں لاجو بھابی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تیندوے چھپا رہی تھی ۔ "

پھر جھگڑا بڑھ گیا ۔ دونوں نے اپنا اپنا " مال " واپس لے لینے کی ٹھان لی میں نے شور مچایا ۔ ۔ ۔ " لاجو ۔ ۔ ۔ لاجو بھابی ۔ ۔ ۔ " مگر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیا ۔

اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا ، جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی ۔ رسالو اور نیکی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندر لال کہیں دور ھنے لگا ۔ شاید سوچنے لگا ۔ لاجو آئی بھی پر نہ آئی ۔ ۔ ۔ اور سندر لال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا جیسے وہ بیکانیر کا صحرا پھاند کر آیا ہے اور اب کہیں درخت کی چھاؤں میں زبان نکالے ہانپ رہا ہے ۔ منہ سے اتنا بھی نہیں نکلتا ۔ ۔ ۔ " پانی دے دو ۔ " اسے یوں وس ہوا ، بٹوارے سے پہلے اور بٹوارے کے بعد تشدد ابھی تک کار فرما ہے ۔ صرف اس کی شکل بدل گئی ہے ۔ اب لوگوں میں لاسا دریغ بھی نہیں رہا ۔ کسی سے پوچھو ، سانبھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھابی بنتو ۔ ۔ ۔ تو وہ جھٹ سے کہتا " مر گئے " ر اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری آگے چلا جاتا ۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بڑے نڈے دل سے تاجر انسانی مال ، انسانی گوشت اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے ۔ مویشی خرید نے والے کسی بھینس یا ے کا جبڑا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے تھے ۔

اب وہ جوان عورت کے روپ ، اس کے نکھار ، اس کے عزیز ترین رازوں ، اس کے تیندولوں کی شارع عام میں نمائش نے لگے ۔ تشدد اب تاجروں کی نس نس میں بس چکا ہے ۔ پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک مال ڈال لیتے اور یوں " گپتی " کر لیتے گویا رومال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے سودا ہوجاتا تھا ۔ اب " گپتی " کا رومال بھی ہٹ ا تھا اور سامنے سودے ہورہے تھے اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے تھے ۔ یہ سارا لین دین یہ سارا کاروبار پرانے زمانے) داستان معلوم ہورہا تھا جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید و فروخت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے ۔ ازبیک ان گنت عریاں عورتوں کے منے کھڑا ان کے جسموں کو ٹوہ ٹوہ کے دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سا گڑھا جاتا ہے اور اس کے ارد گرد ایک زرد سا حلقہ اور پھر زردیاں اور سرخیاں ایک سرے کی جگہ لینے کے لیے دوڑتی ہیں ۔ ۔ ۔ از بیک

آگے گزرجاتا ہے اور ناقابلِ قبول عورت ایک اعترافِ شکست ۔ ایک انفعالیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازار بند تھ
دوسرے سے اپنے چہرے کو عوام کی نظروں سے چھپاتے سسکیاں لیتی ہے ۔ ۔ ۔

سندر لال امرتسر (سرحد) جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اسے لاجو کے آنے کی خبر ملی ۔ ایک دم ایسی خبر مل جا
سندر لال گھبرا گیا ۔ اس کا ایک قدم فوراً دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے
کے تمام پلے کارڈوں اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روئے لیکن وہاں جذبات کا یوں مظاہرہ ممکن نہ تھا ۔ اس نے ۔
اس اندرونی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو ناپتے ہوئے یوں چوکی کلاں کی طرف چل دیا کیوں کہ وہی جگہ تھی جہا
عورتوں کی ڈلیوری دی جاتی تھی ۔

اب لاجو سامنے کھڑی تھی اور ایک خوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی ۔ وہی سندر لال کو جانتی تھی ۔ اس کے سوا
نہ جانتا تھا ۔ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جب کہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ زندگی کے دن بتا کر آئی
جانے کیا کرے گا ؟ سندر لال نے لاجو کی طرف دیکھا ۔ وہ خالص اسلامی طرز کا لال دوپٹہ اوڑھے تھی اور بائیں بکل مارے ہوئے
۔ ۔ عادتاً محض عادتاً ۔ ۔ ۔ دوسری عورتوں میں گھل مل جانے اور بالآخر اپنے صیاد کے دام سے بھاگ نکلنے کی آسانی تھی اور وہ
کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی کہ اسے کپڑے بدلنے یا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کا بھی خیال نہ رہا ۔ وہ ہندو اور م
تہذیب کے بنیادی فرق ۔ ۔ ۔ دائیں بکل اور بائیں بکل میں امتیاز کرنے سے قاصر رہی تھی ۔ اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی
کانپ رہی تھی ۔ ایک امید اور ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ ۔

سندر لال کو دھچکا سا لگا ۔ اس نے دیکھا لاجونتی کا رنگ کچھ نکھر گیا تھا اور وہ پہلے کی بہ نسبت کچھ تن درست سی نظر آتی
نہیں وہ موٹی ہو گئی تھی ۔ ۔ ۔ سندر لال نے جو کچھ لاجو کے بارے میں سوچ رکھا تھا وہ سب غلط تھا ۔ وہ سمجھتا تھا غم میں گھل
کے بعد لاجونتی بالکل مریل ہو چکی ہوگی اور آواز اس کے منہ سے نکالے نہ نکلتی ہوتی ۔ اس خیال سے کہ وہ پاکستان میں بڑ
رہی ہے ۔ اسے بڑا صدمہ ہوا ۔ لیکن وہ چپ رہا کیوں کہ اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی ۔ اگر چہ وہ نہ جان پایا کہ اتن
تھی تو پھر چلی کیوں آئی ؟ اس نے سوچا شاید ہند سرکار کے دباؤ کی وجہ سے اسے اپنی مرضی کے خلاف یہاں آنا پڑا ۔ ۔ ۔ لیک
چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لاجونتی کا سنولایا ہوا چہرہ زردی لیے ہوئے تھا اور غم ۔ محض غم سے اس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں
دیا تھا ۔ وہ غم کی کثرت سے موٹی ہوگئی تھی اور صحت مند نظر آتی تھی لیکن یہ ایسی صحت مندی تھی جس میں دو قدم چلنے پر
سانس پھول جاتا ہے ۔ ۔ ۔

مغویہ کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا ۔ لیکن اس نے سب خیالات کا ایک اثباتی مردانگی سے مقا
اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے ۔ کسی نے کہا ۔ ۔ ۔ " ہم نہیں لیتے مسلران (مسلمان) کی جھوٹی عورت ۔ ۔ ۔ "

اور یہ آواز رسالو ۔ نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے محرر کے نعروں میں گم ہو کر رہ گئی ۔ ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی پھٹتی اور چلاتی آواز آرہی تھی ۔ وہ کھانس بھی لیتا اور بولتا بھی جاتا ۔ وہ اس نئی حقیقت ۔ نئی شدھی کا شدت سے قائل ہوچکا تھا ۔ یوں معلوم ہوتا تھا آج اس نے کوئی نیا وید ۔ کوئی نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصے دار بنانا چاہتا ہے ۔ ۔ ۔ ان سب لوگوں اور ان کی آوازوں میں گھرے ہوئے لاجو اور سندر لال اپنے ڈیرے کو جارہے تھا اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بن باس کے بعد اجودھیا لوٹ رہے ہیں ۔ ایک طرف تو لوگ خوشی کے اظہار میں دیپ مالا کر رہے ہیں اور دوسری طرف انھیں اتنی لمبی اذیت دیے جانے پر تاسف بھی ۔

لاجونتی کے چلے آنے پر بھی سندر لال بابو نے اسی شدومد سے ۔ دل میں بساؤ پروگرام کو جاری رکھا ۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے نبھا دیا تھا ۔ اور وہ لوگ جنھیں سندر لال کی باتوں میں خالی خولی جذباتیت نظر آتی تھی ۔ قائل ہونا شروع ہوئے ۔ اکثر لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیش تر کے دل میں افسوس ۔ مکان نمبر ۴۱۴ کی بیوہ کے علاوہ محلہ ملاشکور کی بہت سی عورتیں سندر لال بابو ورکر کے گھر آنے سے گھبراتی تھیں ۔

لیکن سندر لال کو کسی کی اعتنا یا بے اعتنائی کی پروا نہ تھی ۔ اس کے دل کی رانی آچکی تھی اور اس کے دل کا خلا پٹ چکا تھا ۔ سندر لال نے لاجو کی سورن مورتی کو اپنے دل میں استھاپت کرلیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت کرنے لگا تھا ۔ لاجو جو پہلے خوف سے سہمی رہتی تھی سندر لال کے غیر متوقع نرم سلوک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ کھلنے لگی ۔

سندر لال لاجونتی کو اب لاجو کے نام سے نہیں پکارتا تھا ۔ وہ اسے کہتا تھا " دیوی ! " اور لاجو ایک ان جانی خوشی سے پاگل ہوجاتی تھی ۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ سندر لال کو اپنی واردات کہہ سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے سب گناہ دھل جائیں ۔ لیکن سندر لال لاجو کی وہ باتیں سننے سے گریز کرتا تھا اور لاجو اپنے کھل جانے میں بھی ایک طرح سے سمٹی رہتی ۔ البتہ جب سندر لال سوجاتا تو اسے دیکھا کرتی اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی ۔ جب سندر لال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ " نہیں " ۔ " یوں ہی " ۔ " اوں ہوں " کے سوا اور کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھکا ہارا سندر لال پھر اونگھ جاتا ۔ ۔ ۔ البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندر لال نے لاجونتی کے " سیاہ دنوں " کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا تھا ۔

" کون تھا وہ ؟ "

لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ " جماں " ۔ ۔ ۔ پھر وہ اپنی نگاہیں سندر لال کے چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندر لال ایک عجیب سی نظروں سے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا ۔ لاجونتی نے پھر آنکھیں نیچی کرلیں اور سندر لال نے پوچھا ۔

" اچھا سلوک کرتا تھا وہ ؟ "

"ہاں "

"مارتا تو نہیں تھا ؟ "

لاجونتی نے اپنا سر سندر لال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔ "نہیں ۔ ۔ ۔ " اور پھر بولی "وہ مارتا نہیں تھا اس سے زیادہ ڈر آتا تھا ۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں تھی ۔ ۔ ۔ اب تو نہ مارو گے ؟ "

سندر لال کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا ۔ ۔ ۔ "نہیں دیوی ! اب ماروں گا ۔ ۔ ۔ "

"دیوی ! " لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی ۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن سندر لال نے کہا ۔ ۔ ۔ "جانے دو بیتی باتیں ! اس میں قصور ہے ۔ اس میں قصور ہے ہمارے سماج کا جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے ہاں عزت کی جگہ نہیں دیتا ۔ وہ تمہاری ہانی نہیں کرتا ہے ۔ "

اور لاجونتی کی من کی بات من ہی میں رہی ۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے بدن کی طرف رہی جو کہ بٹوارے کے بعد اب "دیوی" کا بدن ہوچکا تھا ۔ لاجونتی کا نہ تھا ۔ وہ خوش تھی بہت خوش لیکن ایک ایسی سرشار جس میں ایک شک تھا اور وسوسے ۔ وہ لیٹی لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پاکر ایکا کی طرف متوجہ ہو جائے ۔ ۔ ۔

جب بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی ۔ اس لیے نہیں کہ سندر لال بابو نے پھر بدسلوکی شروع کردی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ لاجو سے بہت ہی اچھا سلوک کرنے لگا تھا ۔ ایسا سلوک جس کی لاجو متوقع نہ تھی سندر لال کی وہی پرانی لاجو ہونا چاہتی تھی جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی ۔ لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا ۔ نے اسے یہ محسوس کرادیا جیسے وہ ۔ ۔ ۔ لاجونتی کوئی کانچ کی چیز ہے جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی اور لاجو آئینے میں اپنے سراپا دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہوسکتی ہے پر لاجو نہیں ہوسکتی ۔ وہ بس گئی ، پر اجڑ گئی ۔ ۔ ۔ سندر پاس اس کے آنسو دیکھنے کے لیے آنکھیں تھیں اور نہ آہیں سننے کے لیے کان ! ۔ ۔ ۔ پربھات پھیریاں نکلتی رہیں اور محلہ سدھارک رسالو نیکی رام کے ساتھ مل کر اسی آواز میں گاتا رہا ۔

"ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے ۔ ۔ ۔ "

پروفیسر حامدی کاشمیری

راجندر سنگھ بیدی کے افسانے "لاجونتی" کا تجزیہ

افسانے کے قصے کا آغاز راوی کی زبانی - پھر بساؤ کمیٹیوں - کی سرگرمیوں کے ذکر سے ہوتا ہے ۔ راوی بیان کرتا ہے کہ قدامت پسند طبقے کی طرف سے مغویہ عورتوں کو پھر بسانے کے سلسلے میں - دل میں بساؤ - کے نعرے کی مخالفت کے باوجود محلہ ملا شکور میں ایک کمیٹی قائم کی جاتی ہے ۔ جس کے سکریٹری سندر لال بابو چنے جاتے ہیں ۔ اس خیال کے ساتھ کہ چونکہ ان کی بیوی لاجونتی بھی اغوا ہو چکی ہے ۔ اس لیے سندر لال جاں فشانی سے کام کریں گے ۔ سندر لال اپنے ساتھیوں نیکی رام اور رسالو کے ساتھ پربھات پھیریاں نکالتے ہوئے یہ گانا گاتے ہیں ۔

ہتھ لائیاں کملاں لاجونتی دے بوٹے

(یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں ۔ ہاتھ بھی لگاؤ تو کملا جاتے ہیں)

سندر لال کو گانا گاتے ہوئے عموماً لاجونتی یاد آتی اور اس کی حالت غیر ہو جاتی ۔ لاجو سیماب صفت دیہاتی لڑکی ہے ۔ سندر لال سے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی اس کے صرف ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی روک نہ سکتی اور لپک کر اس کے پاس چلی آتی ۔ وہ سوچتا کہ اگر وہ اسے ایک بار مل جائے ۔ وہ اسے سچ مچ دل میں بسائے گا ۔ اغواء شدہ عورتوں کے تبادلے میں ایسی عورتیں بھی آتی ہیں جن کے شوہر ۔ ماں باپ اور بہن بھائی انھیں پہچاننے سے انکار کرتے ہیں ۔ قدامت پسندوں کے گڑھ میں نارائن بابا کے یہ کہنے پر کہ دھوبی کی بات پر رام چندر جی نے سیتا کو گھر سے نکال دیا تھا ۔ سندر لال ایسے رام راج کے خلاف احتجاج کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ راون کے سیتا کو لے جانے میں سیتا کا کوئی قصور نہیں ۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج کی سیتا گھر سے نکال دی گئی ہے ۔ اس پر لوگ سندر لال کا جلوس نکالتے ہیں ۔ لتے میں لال چند سندر لال کو یہ خوش خبری سناتا ہے کہ اس نے لاجو بھابی کو واگہ کی سرحد پر دیکھا ہے ۔ وہ اس کی نشانی بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی ٹھوڑی اور گال پر تیند ہیں ۔ لال چند مزید کہتا ہے کہ دوسری طرف عورتوں کے - تبادلے میں عورتوں کی عمر اور خوب صورتی الجھن کا باعث بنی ہے لاجو کے ملنے کے بعد بھی سندر لال "دل میں بساؤ" پروگرام کو شد و مد سے جاری رکھتا ہے ۔ وہ لاجو سے بے حد نرمی اور عزت سے پیش آتا ہے ۔ وہ اسے لاجو کے نام سے نہیں ۔ بلکہ دیوی کہہ کر پکارتا ہے ۔ لاجو چاہتی ہے کہ وہ اسے اپنی ساری واردات کہہ سنائے اور سنانے سنانے [illegible] کہ اس کے سب گناہ دھل جائیں ۔ لیکن سندر لال لاجو کی وہ باتیں سننے سے [illegible] کرتا ہے ۔ بہت دنوں تک جب سندر لال اسے کچھ کہنے کی مہلت نہیں دیتا ۔ تو لاجو کے دل میں اپنے بارے میں شک اور دھندھ پیدا ہوتا ہے ۔ وہ سندر لال کی وہی پرانی لاجو بننا چاہتی ہے جس سے وہ لڑتی بھی تھی اور خود ہی منتی بھی تھی ۔ سندر لال اسے محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ لاجونتی نہیں بلکہ [illegible] کی کوئی چیز ہے

ٹوٹنے ہی ٹوٹ جائے گی۔ وہ شدت سے محسوس کرتی ہے کہ وہ بس ٹوٹ گئی ہے پر اجڑ گئی ہے ۔

افسانے کے متذکرہ بالا حقیقت پسندانہ واقعات بدیہی طور پر افسانہ نگاری کے حقیقت نگارانہ مسلک کی گواہی دیتے بنا، پر نقاد بالعموم اسے ایک متعین تاریخی موضوع یعنی ملکی فسادات سے منسوب کرتے رہے ہیں اور اسے فسادات بہترین افسانوں میں شامل کرتے رہے ہیں ۔ اس نوع کی تنقید فکشن اور تاریخ کے درمیان حدِ فاصل کو منہدم کرکے افسانے مبدل کرنے کا غیر ادبی کام کرتی رہی ہے اور افسانے سے صریحاً زیادتی کا ارتکاب کرتی رہی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ ا تقسیم کے تاریخی واقعہ کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات ے موضوع کے بدل کے طور پر تسلیم کرنے سے اس کی غارت ہوجاتی ہے ۔ جس طرح غالب کے قطعے " اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل " (جو کہ عالمگیر انسانی المیے کی مصور کو غدر کے تاریخی واقعے سے منسلک کرنے سے اس کی تخلیقیت کالعدم ہوتی ہے ۔ یاد رہے کہ افسانہ ہو یا شعر ۔ موضوع سے نہیں ۔ بلکہ اس کی عدمیت سے جنم لیتا ہے ۔ لہٰذا لاجونتی میں کسی تاریخی موضوع کی تعین کے عمل کو اس کی تحسین نہیں بنایا جاسکتا۔

یہ درست ہے کہ افسانے کا پس منظر اور کرداروں کا ظاہری عمل واقعہ ۔ تقسیم کی یاد دلاتا ہے ۔ چناں چہ افسانے جملہ " بٹوارہ ہوا " ملک کے بٹوارے کے تاریخی واقعے کا بیان معلوم ہوتا ہے اور پھر افسانے میں بعض تاریخی کردار و مس مردولا سارا بائی ۔ ہندو پاکستان واگہ سرحد ۔ امرتسر اور تقسیم کے نتیجے میں عورتوں کی اغواء کاری اور ان کی بازآبادکاری طور پر تاریخی حوالہ ۔ گی کو قائم کرتے ہیں لیکن ذرا سی توجہ سے کام لیا جائے تو ان کرداروں اور واقعات کی افسانے کے میں اپنی ضمنی حیثیت کی بنا، پر تاریخی واقعیت دھندلا جاتی ہے ۔ افسانے کے مرکزی کردار یعنی سندر لال اور لاجونتی جو افسانے ہیں ۔ حقیقی نہیں ۔ بلکہ یک سر فرضی کردار ہیں اور افسانے میں فرضی واقعات کے تانے بانے میں منسلک ہو کر لتے اور خود کفیل ہوجاتے ہیں کہ افسانے کو تاریخیت کی تنگ نائے سے نکال کر تخلیقیت کی وسعتوں سے ہم کنار کرتے واقعات و شخصیات ان کے تخلیقی تب و تاب کے آگے پگھلتی پرچھائیوں میں بدل جاتی ہیں ۔ یہ دراصل افسانے کی تخلیق جو کردار و واقعے کے عمل اور ردِ عمل کی پیچیدگی کو لسانی تاروپود میں منتقل کرکے اس کی تخیلی حیثیت کو متعین کرتی ہے افسانے کا شروع کا جملہ ہی یعنی " بٹوارہ ہوا " افسانے کی کلیت کے سیاق میں تاریخیت کے بجائے عدم تاریخیت کا اشاریہ لہٰذا بٹوارہ کسی مخصوص وقت اور مقام کے تعینات کی نفی کر کے عمومی طور پر زمین ۔ ذخائر ۔ جائیداد یا ملک کے بٹوارے جاتا ہے ۔ اسی طرح حقیقی کردار و مقامات بھی افسانے کی تخیلی فضا، میں رچ بس کر اپنی اصلیت جس کی بہرحال ضمنی حیثیت دست کش ہو کر اس کی ساری کل فرضیت کا حصہ بن جاتے ہیں ۔

افسانے کی تخلیقی حیثیت اس کی کثیر المعنی سے مزید مستحکم ہوتی ہے ۔ اس کی ایک حاوی جہت عورت کی نفسیاتی الجھنوں کی پردہ کشائی سے عبارت ہے ۔ لاجو گھر لوٹنے پر خوف زدہ رہتی ہے کہ سندر لال حسبِ سابق اسے پیٹے گا ۔ مگر وہ اس سے نرمی اور پیار سے پیش آتا ہے ۔ نتیجتاً وہ نفسیاتی طور پر ایک نامعلوم وسوسے میں گرفتار ہوتی ہے ۔ وہ اس کے سیاہ دنوں کی واردات سنانا چاہتی ہے ۔ مگر وہ سننے میں دلچسپی نہیں لیتا [illegible] اور مربیانہ سلوک

نا ہے ۔ وہ اس کے لیے وہ پرانی لاجو ہونا چاہتی ہے ۔ مگر یہ ناممکن دیکھ کر وہ اپنی زندگی کے دوبارہ بسنے کو اجڑنے سے تعبیر کرتی ۔ اس کی نفسیاتی گرہ کو صرف اس کی افتادِ طبع یا اس کے ثقافتی ماحول کی دین قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ عورت کی سائیکی پر بھی محمول سکتا ہے ۔ اس کے ذہنی رویے کو سانحہ ، اغوا کے Aftermath کی روشنی میں بھی دیکھا جاسکتا ہے ۔ افسانے کے گیت جس پودوں کے ہاتھ لگانے سے ہی ان کے مرجھا جانے کا ذکر ہے اور جس سے افسانے کا خمیر اٹھا ہے ۔ سے عورت کی نفسیاتی ں کی نزاکت آئینہ ہوجاتی ہے ۔

لاجو دوبارہ بسنے اور شوہر کی جانب سے پیار اور عزت پانے کے باوجود نارمل زندگی بسر کرنے سے قاصر ہے ۔ اسے محسوس ہے کہ وہ سب کچھ تو ہوسکتی ہے ، پر لاجو نہیں ہوسکتی ۔ اغواء کاری کے بہیمانہ عمل کے نتیجے میں انسانی شخصیت کے انہدام کا افسانے کو ایک اور معنوی بعد سے آشنا کرتا ہے اور قاری اجنبیت ، دکھ اور تباہی کے عالم گیر تجربے میں شریک ہوتا ہے ۔

افسانے کے تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ حقیقت اپنے اثر و اقتدار سے محروم ہو کر افسانویت میں ڈھل جاتی ہے اور راوی لے کے اس تقلیبی عمل میں اہم رول ادا کرتا ہے ۔ افسانے کے ابتدائی جملوں یعنی " بٹوارہ ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اٹھ پنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا اور پھر سب مل کر ان کی طرف متوجہ ہوگئے جن کے بدن صحیح و سالم تھے ۔ لیکن دل زخمی " سے س کے (راوی) مخصوص اور منفرد رویے کا اظہار ہوتا ہے ۔ وہ کہیں پر بھی مصنف کی جگہ نہیں لے لیتا ۔ بلکہ ایک فرضی کردار طور پر ہی اپنی حیثیت منوالیتا ہے ۔ یہاں تک کہ واگہہ سرحد پر مغویہ عورتوں کے تبادلے کے حقیقی واقعے کے بیان کرنے بھی وہ افسانے کے تخیلی ماحول سے مغائرت کا احساس پیدا ہونے نہیں دیتا ۔ راوی اپنے عمل کے حدود سے متجاوز نہیں ہوتا ۔ داروں کو اپنے طبعی تقاضوں کے مطابق اپنے توسیعی امکانات کو دریافت کرنے میں مزاحم نہیں ہوتا ۔ چناں چہ یہ سندر لال ، ہے نہ کہ راوی ، جو عورتوں کے تبادلے کو انسانی گوشت کی تجارت کرنے سے مشابہ کرتا ہے ۔ اسی طرح وہ " جوان عورت کے ،، اس کے نکھار ، اس کے عزیز ترین رازوں ، اس کے تیندولوں کی شارع عام میں نمائش " کا ذکر جس تلخیِ کام و دہن سے کرتا ، وہ اس کی (سندر لال) نہ کہ راوی یا مصنف سے منسوب ہوسکتا ہے ۔ ایسے موقع پر راجندر سنگھ بیدی نے ایک مشاق فن کار کی داروں کے ردِ عمل کو جذباتیت کا ہدف بننے سے بچایا ہے اور اپنی غیر پسندیدہ مداخلت کا بھی سدِ باب کیا ہے ۔ یہ ضرور ہے ندر لال کے ردِ عمل کا یہ اظہار قدرے طوالانی ہوگیا ہے اور اس کی طوالت نہ صرف گراں گزرتی ہے بلکہ افسانے کی نسبت میں زائد عنصر کا تاثر بھی پیدا کرتی ہے ۔ خاص کر جب لال چند واگہہ پر عورتوں کے تبادلے کے تاجرانہ عمل کی رپورٹنگ کرچکا تھا ۔ ہ اور اس کے ردِ عمل کے طور پر سندر لال کا نقد و تبصرہ جذباتیت سے بھی آلودہ ہوجاتا ہے اور اس کی طبعی خصوصیات دم مطابقت کا تاثر پیدا کرتا ہے ۔ تاہم افسانے کے قصہ پن کی فطری روانی میں یہ تکنیکی رکاوٹ روک نہیں بننے پاتی ۔

افسانے کے کردار بدلتے واقعات کی مدد سے اپنی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں ۔ چناں چہ لال جو نیک ، رحم دل ، معاملہ فہم زیرک ، استدلالی اور محنتی شخص ہے ، واقعات کے توسط سے ہی اپنی گوناگوں انسانی خوبیوں کو ہے ۔ اسی طرح لاجو کے نازک سے نازک جذباتی اور نفسیاتی کوائف بدلتے واقعات کے زیرِ اثر منکشف ہوتے ہیں ۔ اس طرح سے ل کے حوالے سے افسانہ معنوی تہہ داری پر حاوی ہوجاتا ہے ۔ افسانے میں نیکی اور رحم دلی کے مقابلے میں شر اور کھوٹ پن

سید خالد قادری

پتھر کا آدمی

کچھ عرصے سے ہر اس چیز میں جو تغیر پذیر ہے یعنی جس کی صفت میں گھٹنا بڑھنا یا وقت کے ساتھ تبدیل ہونا ہے مجھے غیر معمو دل چسپی پیدا ہوگئی ہے ۔ شاید اس لیے کہ میں اس حتمی نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ دنیا کی تمام چیزیں صرف دو ہی زمروں میں آتی ہیں ۔۔ ایک تو وہ جو غیر متحرک ہیں اور اپنے آپ تبدیل نہیں ہوتیں جب تک کہ کوئی دوسرا ان کی حالت کو نہ بدلے ۔۔۔۔ اور دوسری وہ جن میں بہ ذات خود ہر قسم کی صلاحیت ہوتی ہے ۔۔۔۔ نہ صرف پیدا ہونے بڑھنے اور بدلنے کی بلکہ اپنی تکمیل کو پہنچ کر دھیرے دھیرے گھٹنے ا ختم ہوجانے کی بھی ۔۔۔۔ پہلے زمرے میں پتھر اور دھات یا ان سے بنی اشیا کو رکھا جاسکتا ہے جو ایک ہی حالت میں رہتی ہیں جب دوسرے زمرے میں پیڑ ، پودے ، جانور اور انسان آتے ہیں جن کا وجود حرکت ، ارتقا اور تغیر سے عبارت ہے ۔

اسی آخرالذکر صفت کو زندگی کا نام دیا گیا ہے مجھے یہ بھی معلوم ہے ۔ مگر ساتھ ہی ساتھ مجھے اس حقیقت کا بھی شدید احساس ہے پتھر اور دھات کی اشیا چوں کہ ایک ہی حالت میں رہتی ہیں اس لیے ان سے انسان کا رشتہ بھی ایک سا رہتا ہے ۔ مگر پیڑ ، پودے ، جا اور انسان ۔۔۔۔ ان کی حالت بدلنے کے ساتھ ان سے ہمارا رشتہ بھی بدل جاتا ہے ۔۔۔۔ یہی وہ بات ہے جو مجھے تشویش ناک معلوم ہ ہے ۔

ایک ننھی سی بیل پھیل کر چاروں طرف ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے ۔ ایک چھوٹا سا پودا خرید کر لائیے اور پھر دیکھتے دیکھتے وہ بڑھ کر ایک تناور درخت بن جاتا ہے جس کی شاخیں آپ کے سارے مکان کو ڈھک لیتی ہیں ۔ یہاں تک کہ احتیاط نہ کرنے کھڑکیوں اور دروازوں سے اندر داخل ہوجاتی ہیں ۔۔۔۔ یا پھر کتے کا بچہ بلی یا خرگوش جن کی نسل بڑھتے بڑھتے پورے گھر پر قابض ہوجا ہے ۔ مرد اور عورت بھی شادی کے بعد اگر چند لمحے سنجیدگی سے سوچنے کے لیے نہ رکیں تو زندگی اپنے ارتقا پذیر ہونے کا مسلس احساس دلاتی جاتی ہے ۔۔۔۔ اور پھر وہی بڑھنے اور تبدیل ہوتے جانے کا احساس ۔۔۔۔

اس حقیقت کا ادراک مجھے اچانک ایک دن ایک عام سے لمحے میں اس وقت ہوا جب میری بیوی اور چاروں بچے میرے سا ناشتہ کی میز پر بیٹھے تھے ۔ میری بیوی معمول کے مطابق میرے لیے چائے بنا رہی تھی ۔۔۔۔ ایک ایسا گھریلو فریضہ جو وہ لگ بھگ پندرہ س سے اسی تن دہی سے انجام دے رہی تھی ۔۔۔۔ میز پر موجود دوسری تمام چیزیں تقریباً وہی اور اسی حالت میں تھیں ۔۔۔۔ پھول دار کپ گلاس ، چینی کی پلیٹیں اور چھوٹے بڑے چمچے ۔۔۔۔ یہاں تک کہ چھت سے لٹکا ہوا براس کا پرانا لیمپ اور ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ کی کر

ہوئی پرانی کرسیاں بھی جنھیں میں برسوں سے دیکھنے کا عادی تھا۔ یہ سب آج لتنے سالوں بعد بھی ویسے ہی دکھائی دے رہے تھے ۔۔۔ مگر ان تمام ایک سی حالت پر قائم چیزوں کے درمیان مجھے اچانک اس تبدیلی کا شدید احساس ہوا جو وہاں دن میں دوبارہ جمع ہونے والے میرے افراد خاندان میں آچکی تھی ۔۔۔ مجھے ایسا لگا وہ سب یکسر بدل چکے ہیں۔ اس وقت میری کیفیت اس اندھے کی تھی جس کی آنکھوں میں ایک دم سے روشنی آجائے ۔

مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا۔ آخر یہ کب اور کیسے ہوا ۔ میرے افراد خاندان ۔۔۔ میری بیوی، میرے بچوں کو کس نے اس طرح یکسر بدل دیا ۔۔۔ وہ دبلی پتلی چھریری خوب صورت سی لڑکی جسے میں بیاہ کر لایا تھا کب اور کیوں کر اس موٹی، بھدی اور بے ہنگم عورت میں تبدیل ہوگئی ۔۔۔ اور یہ ابھری ہوئی ہڈیوں اور لمبے بالوں سے ڈھکے سروں والے اجنبی سے لگنے والے لڑکے ۔۔۔ کیا یہی وہ گھنگھریالے بالوں والے ننھے منے معصوم بچے ہیں ۔۔۔ یہ تو سراسر ظلم ہے ۔۔۔ میں سوچ رہا تھا ۔۔۔ آخر میرے ساتھ ایسا بھدا مذاق کس نے کیا؟

ان ہی خیالوں میں گم میں نے چائے کا کپ اٹھاکر اس کا ایک گھونٹ اپنے مخصوص انداز میں لیا۔ گو کہ اس طرح چائے پینے سے ایک ایسی آواز نکلتی تھی جو دوسروں کے لیے ناگوار ہوسکتی تھی مگر سچ بات تو یہ تھی جب تک میں اس طرح چائے نہ پیوں مجھے اس کا پورا مزہ نہیں ملتا۔۔۔ میری بیوی کے لیے میرا یہ انداز انتہائی ناپسندیدہ تھا۔۔۔

"تمھیں اپنے طور طریقوں کا خیال تو نہ ہوگا۔ کم از کم بچوں کی تو فکر کرو ۔۔۔ اس عمر میں ان پر ایسی باتوں کا کیا اثر ہوگا" ۔۔۔ وہ غصے سے مجھے گھور رہی تھی ۔۔۔

میں نے نظریں گھماکر اپنے بچوں کی طرف دیکھا ۔۔۔ دراصل میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ میری بیوی کے ایسے سخت گیر اور بے رحمانہ رویے کا ان پر کیا اثر ہوتا ہے ۔۔۔ مگر مجھے مایوسی ہوئی ۔۔۔ میری دونوں لڑکیوں کے چہروں پر ایسے تاثرات تھے جیسے اپنے باپ کی غیر مہذب حرکت ان کے لیے شرمندگی کا باعث ہوئی ہو۔ جب کہ میرے دونوں لڑکوں کو جن کی عمریں پندرہ سولہ کے آس پاس تھیں میری وہ حرکت مضحکہ خیز لگی تھی ۔۔۔

"ممی کو کتنی جلد غصہ آجاتا ہے۔" وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے ۔

"ہمیں تو پاپا کی یہ آواز اچھی لگتی ہے ۔۔۔ ممی دیکھو۔ ہم بھی ویسی آواز نکال سکتے ہیں۔" وہ دونوں میری نقل کرکے بھونڈے انداز سے ہنس رہے تھے ۔

اب میرے غصہ میں آنے کی باری تھی۔

"بس۔ بس بہت ہوچکا۔ میں کیا کرتا ہوں اور کیا نہیں اس پر کسی کو رائے زنی کرنے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ اور خاص طور پر تمھیں جس کے اکسانے پر میرے ہی بچے میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔" میرا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔

"تمہارے بچے تمہارا مذاق نہیں اڑائیں گے اگر تم اپنے طور طریقے سدھار لو۔" میری بیوی کے لہجے میں ایسا ٹھہراؤ اور سکون تھا جیسے اس نے کوئی غلطی کی ہی نہ ہو۔

میں نے ایک بار پھر اپنے بچوں کی طرف دیکھا۔

میری دونوں لڑکیاں باری باری سے مجھے اور اپنی ماں کو دیکھ رہی تھیں جیسے وہ کچھ فیصلہ نہ کرپارہی ہوں کہ کس کا ساتھ دیا جائے ــــ لڑکے اب بھی نظریں بچاکر ہنس رہے تھے۔ میرے گھورنے پر ایک دانتوں سے اپنے ناخن کترنے لگا اور دوسرے نے سر کھجانا شروع کردیا ــــ

"اگر سب کو اپنی مرضی کا کام کرنے کی چھوٹ دے دی جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے یہ اب تم خود دیکھ لو۔" میری بیوی نے لڑکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا ــــ اس کے چہرے پر فتح کی چمک تھی۔

میں اپنا چشمہ اتارکر اسے نیپکن سے صاف کرنے لگا ــــ اپنے غصے پر قابو پانے کی یہ ایک غیر شعوری کوشش تھی۔

آج سے دس پندرہ سال پہلے اس میز کے اطراف جو خاندان بیٹھتا تھا اس کے افراد بالکل مختلف تھے ــــ میں سوچ رہا تھا ــــ ایک شوہر اور باپ جو خوش اور مطمئن تھا کہ اس کی بیوی خوب صورت اور خوش مزاج اور بچے معصوم اور محبت کرنے والے تھے ــــ سب کچھ کتنا اطمینان بخش تھا ــــ آج ویسا کچھ نہیں رہا۔ سب کچھ پوری طرح بدل گیا ہے۔ کہیں کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے ــــ اچانک میرے اندر پلنے والا نفرت، بے بسی اور غصے کا لاوا پھٹ پڑا اور میں اپنی بیوی کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے زور سے دھاڑا۔

"یہ چڑچڑی اور بد مزاج عورت کون ہے؟ یہ موٹی بھدی بے ہنگم مخلوق! میں اسے نہیں جانتا ــــ گوشت کا یہ بدصورت لوتھڑا! یہ وہ عورت ہرگز نہیں جسے میں نے اپنی بیوی بنایا تھا ــــ"

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اس طرح یہ سب کہہ کر میرا مقصد اپنی بیوی کی توہین کرنا اسے اذیت پہنچانا نہ تھا۔ میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ میں اس کا سامنا اس سچائی سے کرادوں جس سے شاید وہ پوری طرح غافل تھی ــــ میں صرف اسے اس کی بدلی ہوئی حالت کا احساس دلانا چاہتا تھا ــــ مگر میری بیوی مجھے سمجھ نہ سکی۔

وہ چند لمحے حیرت اور کرب سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپاکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے پلٹ کر اپنے بچوں کی طرف دیکھا ــــ میری لڑکیاں اسے تسلی دینے کی کوشش کررہی تھیں جب کہ میرے لڑکوں کی آنکھیں غصے سے سرخ ہورہی تھیں ــــ

"آپ کو اس طرح ممی کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔" میرا بڑا لڑکا چیخ کر مجھ سے مخاطب تھا۔ "کیا اتنے سالوں میں آپ نہیں بدلے۔ شاید بہت دنوں سے آپ نے خود کو آئینے میں نہیں دیکھا ــــ"

"تمھیں اپنے باپ سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔" میں نے اس پر چھوٹوں کو زیر کرنے کے لیے استعمال کیا جانے والا آخری

[illegible] لیا۔

"مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں۔۔ آپ نے کس دل سے ممی کے بارے میں ایسی تکلیف دہ باتیں کیں۔ آپ خود کو کیوں [illegible] دیکھتے۔۔۔" وہ کھلی بغاوت پر آمادہ تھا۔۔

یکایک مجھے ایک عجیب قسم کی سراسیمگی نے آگھیرا۔۔۔ میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔

"بس۔ بس۔ بہت ہو چکا۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں اور تب تک واپس نہ آؤں گا جب تک تم سب ہوش میں نہ آجاؤ۔۔۔"

میں تیزی سے ڈائننگ روم سے نکل کر ہال میں آیا اور باہر جانے کے لیے اپنا اوورکوٹ پہننے لگا۔۔۔ دفعتاً میری نگاہ سامنے [illegible] لگے آئینے پر پڑی۔۔۔ مجھے اپنے بیٹے کی بات یاد آگئی۔

میں نے آئینے میں نظر آنے والے اپنے عکس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ آئینے کے کونوں پر ابھرے ہوئے آرائشی نقوش [illegible] کا سنہرا فریم بالکل ویسے ہی تھے جیسے آج سے برسوں پہلے۔ مگر اس کے پس منظر میں نظر آنے والا میرا چہرہ قطعی مختلف تھا۔۔۔ زرد، [illegible] اور بے جان۔۔۔ چمکیلی آنکھوں کی جگہ گڑھوں میں تیرتی دو پتلیوں نے لے لی تھی اور سر پر گھنے خوب صورت بالوں کی جگہ [illegible] سفید بالوں کا ایک گچھا تھا۔۔۔ میں نے رنج اور شکست خوردگی کے احساس سے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا اور گھر سے باہر نکل کر [illegible] عبور کرتا ہوا سامنے کے پارک میں جا پہنچا۔۔۔

میں یہاں کسی سنسان گوشے میں بیٹھ کر حالات پر غور کرنا چاہتا تھا۔۔۔ اپنے منتشر اعصاب پر قابو پانے کا شاید یہی ایک [illegible]

میں جس بنچ پر بیٹھا تھا وہاں سے پارک کا آہنی پھاٹک اور اندر آنے والا راستہ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ شاید کچھ [illegible] بارش ہوئی تھی۔ روش پر لگے مہتراب بھی گیلے تھے اور ہوا میں پانی کی مہک تھی۔ پارک میں سب کچھ ہمیشہ کی طرح تھا۔۔۔ یہاں [illegible] اس بات کا احساس ہوا کہ دکھ اور کرب صرف ان ہی چیزوں کا مقدر ہے جو وقت کے ساتھ خود بہ خود گھٹتی بڑھتی اور تبدیل ہوتی [illegible] ۔۔۔ جیسے انسان اور اس کی زندگی۔۔۔

کاش میں گوشت پوست کے انسان کے بجائے راستے پر پڑا ایک پتھر ہوتا جسے تبدیلی اور زوال سے گزرنے کے کرب سے [illegible] نہیں ہونا پڑتا۔۔۔ تبدیلی اور تغیر کے وہ نامعلوم مراحل جن کی آخری منزل فنا ہے۔۔۔ میں سوچ رہا تھا۔

"شاید ہم پہلے بھی کئی بار مل چکے ہیں۔ آتے جاتے راستے میں یا پھر اس جگہ۔"

میرے سامنے ایک بوڑھا گداگر کھڑا تھا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔۔۔ اس کی بات سچ تھی مگر شاید کسی اور معنی میں۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ مگر ہم کہاں ملے [illegible] مجھے یاد نہیں۔۔۔"

"یہ تو صحیح طور پر میں بھی نہیں کہہ سکتا۔ شاید یہیں یا کہیں اور۔" اس کی نگاہوں میں عجیب سی ویرانی تھی۔۔۔

[illegible] ہو گئی ہے—

[illegible] کہ اب تک آپ کا [illegible] کی—

[illegible] ایک [illegible]

[illegible] مسکرا [illegible] ہو گیا تھا—

[illegible] کی طرح [illegible] دونوں آ گئی تھی—

[illegible] حسن اور [illegible] عشق [illegible] ایک دوسرے کے [illegible] — [illegible]

[illegible] کرتے [illegible] زندگی میں [illegible] کے درمیان اس [illegible]

[illegible] کے بعد بھی [illegible] زندگی کی حقیقت سے [illegible] کرنے کے [illegible]

[illegible] کے قریب [illegible] پہنچ گئے کہ اس [illegible] تھے [illegible]

[illegible] کا مطلب ہے [illegible] اپنے آپ سے کیا— [illegible]

[illegible]

[illegible] اپنے [illegible] کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

مادھوی کٹی

ترجمہ : حیدر جعفری سید

بنجر زمین
(ملیالم افسانہ)

پورے آٹھ سال بعد ان دونوں کی ملاقات ہو رہی تھی ۔ اس بار وہ عشاق کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس حیثیت سے مل ․کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے ۔ اس لیے وہ حالاں کہ چاہتے تھے کہ چند منٹ تک کوئی بات نہ کرے ، سرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے رہے ، پھر بھی دونوں ہمت نہیں کر پارہے تھے ۔ دونوں کے درمیان خاموشی کی لھڑی تھی اسے توڑنے کی کوشش ہورہی تھی ۔ اکا دکا جملوں سے ۔

"کیا مجھے دیر ہوگئی ؟"

"نہیں تو ۔ میں بھی ابھی ابھی آئی ہوں" اس نے جواب دیا ۔ وہ اسے بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اس نے نصف گھنٹے سے ار کیا ہے ۔ ۔ ۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر اسے معلوم ہوجائے کہ اتنے برسوں بعد بھی میں اس پر مر رہی ہوں تو ممکن ہے وہ مجھ ت کرے ۔ ں نے اپنے خط میں ہماری باہمی محبت کو محض گڈے گڑیوں کا کھیل کہہ ڈالا تھا ۔ اتنی جسارت ، وہ خط ۔ ۔ ۔

"میں ایسی لہ تلاش کرتا ہوں جہاں نمی نہ ہو ۔"

یہ سن کر وہ ہنس پڑی ۔ ایسی ہنسی ۔ ۔ ۔ جس میں رونے کا عکس بھی شامل تھا ۔ وہ سمجھ گیا لیکن اس نے اپنے چہرے پر ں نہیں آنے دی ۔

ادھر وہ اپنے آپ سے کہنے لگی کہ میری اداکاری اعلیٰ درجے کی ہے ۔ وہ میرے دل کے آئینے پر کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا ۔ مجھ پر یہ الزام بھی عائد نہیں کرسکتا کہ میں نے اسے ایک بار پھر اپنے چنگل میں پھنسانے کے لیے بلایا ہے ۔ ہم دونوں کی ت سے جو ملاقات لگ رہی تھی ۔ وہ آزاد ہوگیا ۔ تب میں بھی فاتح کیوں نہ بنوں ؟ ہاں اس نے خط میں لکھا تھا ۔ ۔ ۔ " زندگی ہی نہیں ۔ ۔ ۔ بلکہ اپنی زندگی بھی تباہ کرنے کے کوشاں ہو ۔ یہ جو تمھاری ضد ہے ، آپس میں ملنے کی ، میں تو اسے لوں گا ۔ ۔ ۔ مرحلے تک ہم جس مستقل مزاجی سے جس عہد کی پابندی کر رہے ہیں کیا اسے توڑنا ضروری ہے ؟ " ۔ ۔ ۔ میں نے جواب میں لکھا تھا " میں تمھیں پھر سے اپنا محبوب بنانے کے لیے نہیں بلا رہی ہوں ۔ بس ، یوں ہی ایک بار لینے کے لیے ۔ ۔ ۔ "

میں آگیا تا ! اب ! "کیا چاہیے ؟" اس نے اپنے رومال سے پرانی محبوبہ کا منھ پونچھتے ہوئے پوچھا ۔ اس وقت میری نظر اس شادی والی انگوٹھی پر گئی جو اس کے رومال والے ہاتھ کی زینت بنی ہوئی تھی ۔ ۔ ۔ موٹی سی انگوٹھی اس نے پلکیں نیچی کرلیں ۔

وہ ہنسنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی " ڈرو مت ، رونے دھونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے ۔ نہ میں گلے شکوے کروں گی ۔ یہ سب میں آٹھ سال پہلے کر چکی ہوں جب تمھارا خط پڑھا تھا ۔ اب تو اس کے خیال سے ہی ۔

یہ سن کر وہ نہیں ہنسا ۔ اس نے اپنے ہاتھ کا رومال ایک قریبی پتھر پر بچھایا اور اس سے بیٹھنے کے لیے کہا ۔ اس پتھر پر کسی کا نام اور ایک دو ۔۔ سی کندہ تھیں ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ قبرستان کا پتھر ہے وہ اس پر بیٹھ گئی ۔ وہ بھی پاس ہی گڑے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا ۔ ان کے سامنے ایک پتھر کی دیوار کے پار سمندری لہریں متحرک تھیں ۔ کالے کالے پتھروں کے درمیان رہ رہ کر جھاگ کے ساتھ اچھلتی چڑھتی شوخ لہروں پر نظر مرکوز کیے وہ کافی دیر تک ساکت و صامت بیٹھے رہے ۔ بالآخر اس نے اپنی آواز کو ذرا روکھا بناتے ہوئے پوچھا ۔

"کیا کچھ بھی نہیں کہنا ہے ؟"

"ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں ۔

" ہوں ۔ "

" مجھ سے نفرت کرنے لگے ؟ "

"کس لیے ؟ "

" اک بار محبت کی تھی ، اس لیے "

اس نے کچھ کرختگی کے ساتھ قہقہہ لگایا ۔ پھر اپنی جیب سے ایک سگریٹ [illegible] سلگاتے ہوئے کہنے لگا ۔

" تم پاگل ہو ۔ تم جو کچھ کہہ رہی ہو اس کا مطلب کوئی سمجھ نہ سکے گا ۔ "

" تمھاری سمجھ میں بھی نہیں ؟ "

اس کے اندر کی عورت کی خود داری ایک بار پھر مرد کے سامنے سرنگوں ہورہی تھی ۔ وہ سوچنے لگی کہ ہاں میں سنکی ہوں ۔ سنکی ہی کیوں ، وہ اپنے پرانے الزامات کو دوہرا سکتا ہے ۔ تمھاری بول چال ، کام کرنے کے انداز سب میں تصنع ہے ۔ لیکن اب وہ مجھے اجنبی سمجھتا ہے ۔ اس لیے ممکن ہے کہ وہ مجھ سے ناراض نہ ہوسکے ۔

۔ ۔ ۔ اگر وہ اس پر پھر سے ناراض ہوتا ، اس کی مذمت کرنے کے لیے نئے نئے بہانے تلاش کرتا تو وہ اس کو خوش نصیب سمجھتی کیوں کہ اس طرح وہ اپنے ان ہی پرانے دنوں کو آج پھر سے جیتا جاگتا کر سکتی ہے ہو بہ ہو اسی روپ میں نہ سہی ۔

اس کی ایک جھلک تو دیکھ سکتی ہے اس کی محبت کچھ ایسی ہی تھی ، ہمیشہ اسے برا بھلا کہنے کے لیے طرح طرح کے بہانے تلاش کرتا ۔ وہ کہتا ، یہ جو تم مجھ سے محبت کرتی ہو ، یہ تو تمھاری غلطی ہے ، تمھارا قصور ہے ۔ آخر میں ساری بات چیت کے بعد وہ رحم انگیز انداز میں روتی اور وہ اس کے پیروں پر گر کر پاؤں کی انگلیوں کو چومنے لگتا ۔ ۔ ۔

"کہہ لو میں سنکی ہوں ، پاگل ہوں ۔ اسی لیے میں بالوں میں کنگھی پیچھے کی طرف کرتی ہوں ۔ انگریزی میں بات کرتی ہوں ، تمھیں ۔ ۔ ۔ "

اس نے سگریٹ پھینک دی اور زور سے ہنسا ۔

"مجھے تم سے ہمدردی ہو رہی ہے ۔ تم میں اتنا بھی شعور نہیں ہے کہ ایک عام عورت کی طرح رہ لیتیں ۔ "

اس ریمارک پر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا ۔ اس نے ابھی جو سگریٹ پھینکی تھی اس کے سرے سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے مرغولوں کو دیکھتی ہوئی وہ سوچنے لگی ۔

ٹھیک ہی تو ہے ۔ کسی کو بھی شکست سے ہم کنار کردینے والی میری اداؤں کے جھلی دار پردے میں سے وہ جھانک لے اور وہاں عریاں پڑی ہوئی میری شخصیت کے کچے پن کو دیکھنے کی صلاحیت اس میں ہے ۔ صرف وہی جانتا ہے کہ میرے ولایتی رنگ ڈھنگ اور لچھے دار انگریزی بولنے کی عادت کے پیچھے یہ مطلب نہیں پوشیدہ ہے کہ میں اپنے وطن سے کم محبت کرتی ہوں ۔ اپنی شناسا دوسری خواتین سے میں اس لیے دوری نہیں برتتی کہ مجھ میں غرور کا جذبہ ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ عورتیں کہیں میری انفرادیت کو سونگھ نہ لیں ، مجھ سے نفرت نہ کرنے لگیں ۔ میرے اس راز کا پتہ اس کے علاوہ کسی اور کو نہیں ہے ۔ میرے جسمانی حسن ، اور فیاضی نے مجھے دوسروں سے مختلف بنایا لیکن دراصل میں انھیں کسی کی بد دعا سمجھتی تھی کیوں کہ ان کی وجہ سے میں دوسروں سے الگ رہنے پر مجبور ہوگئی تھی ۔ انھیں میں خوبیاں کیسے مانوں ؟ میں تو پیار کے دو بولوں کی پیاسی تھی جو محبت کو اور بھی شیریں بنادیں ۔ لیکن جب میں اپنی تنہائی کو محسوس کرتی تھی تو وہ تنہائی مجھے کاٹنے دوڑتی تھی ۔ ۔ ۔ میں نے ان باتوں کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا جیسے آغازِ بلوغت میں جسم کے کچھ اعضا کو دوسروں سے بالارادہ چھپایا جاتا ہے ، میں نے اپنے من کو اسی طرح دوسروں کے لیے بند رکھا ۔ بعد میں کام کی مصروفیت بڑھی اور من کی ہل چل بھی پوشیدہ ہی رہی ۔ حتیٰ کہ والدین بھی ان ہنگاموں کو محسوس نہ کرسکے ۔ ظاہری طور پر میں خوش مزاج دکھائی دیتی تھی ہمیشہ اپنے صاف شفاف حسین دانتوں سے مسکراہٹ بکھیرتی رہتی ۔ والدین میرے بارے میں کیا جانتے تھے ؟ مجھے مہینے میں ایک بار سردرد ہوتا ہے ۔ میں اپنے سر میں ناریل میں پکا تیل لگاتی ہوں ۔ بس میرے بارے میں ان کے پاس اس قسم کی ایک دو معلومات ہوتی تھیں ۔ انھوں نے کبھی بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی میں اپنی تنہا ۔ ن چاند پانی پر لیٹی لیٹی مستقبل کی ازدواجی زندگی کے بارے میں کیا سوچتی تھی ۔ ۔ ۔ اب شادی کے بعد بھی سوالات کا سلسلہ جاری ہے ۔ صرف رات کے ۔ ۔ ۔ جو کرتے ہوئے پاس میں آنے والے شوہر کے بارے میں میری

کیا راستے ہے ؟ کیا میں نے محبت کا تقدس حاصل کرلیا ہے ؟ دوسرے لوگوں کی نظر میں بے شک میری ازدواجی زندگی کامیاب ہے لیکن کسی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں خوش ہوں یا نہیں ۔ میں نے اپنے اندر تنہائی کا بیج بویا تھا ۔ اب وہ درخت بن گیا ہے اور اس میں پھول پھل آگئے ہیں ۔ ایک دوسرے کو سمجھنے میں ناکامیابی کی وجہ سے شکست خوردہ زندگی والے لوگ جب گھروں کے اندر یا باہر گلیوں میں سوتے ہیں وار رات میں پل بھر کی لذت کے لیے ایک دوسرے کے بدن استعمال کر لیتے ہیں ۔ اس وقت میں لیٹے لیٹے اپنا احتساب کرتی رہتی ۔میرا عالم بیزار اور غیر جانبدار من اپنے تن میں سے اٹھ نگوڑے دل کا بغور معائنہ کرتا اور دیکھتا کہ دل میں تری یا نمی کا نام و نشان نہیں ہے۔وہ ہریالی کی خواہش سے محروم بنجر زمین ہے ۔۔۔

وہ سوچتی جارہی تھی ۔

" تم میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے ۔ میں نے سوچا تھا کہ تم اب تک کچھ تو سمجھ دار ہوگئی ہوگی ۔ "

وہ خاموشی کی دیوار کو گراتے ہوئے بولا ۔ میں ۔۔۔ اس سے آنکھ ملانے سے بچنا چاہتی تھی اس لیے میں نے سر نیچا کرلیا

ان دونوں کے سامنے بارش سے مالا مال ہوئے سمندر کی لہریں کسی جنسی آسودگی سے محروم حسینہ کی یاد دلا رہی تھیں گہری سانسیں لیتی ہے ۔ بے بسی کے عالم میں زمین پر لوٹتی ہے اور دھیمے سے سکتی ۔ سسکتی ہے ۔ آسمان چھوٹے چھوٹے سوراخ والے چھاتے کی طرح لگ رہا تھا رم جھم پھوار پڑنے لگی تھی ۔

" تم آج بھی چھتری نہیں لائی ہو ۔ ہے نا ؟ "

اس نے نفی میں سر ہلایا ۔

" تم اب بھی ویسی ہی ہو ۔چھتری لیتی ہو نہ پیسہ ۔ نہ رومال ۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ تمھاری گزربسر کیسے ہوگی ؟ "

سامنے والی دیوار سے بندھی الگنی پر مچھلیاں رسی پر لگی سوکھ رہی تھیں مچھیرنیں جھونپڑیوں کے دروازے کھول کر ہوئی انھیں لے جانے کے لیے آرہی تھیں ۔ کھلے دروازوں سے جلتی انگیٹھیوں کی [illegible] صاف دکھائی دے رہی تھیں ۔ اسے آگ لپٹیں سرخ پھولوں کی طرح خوب صورت لگیں ۔ " دیکھو " وہ کہنے لگی " ادھر انگیٹھی کی لپٹ سرخ پھولوں جیسی لگ رہی ۔

پھر اس نے ایک اور تشبیہ کا اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ " جیسے سرخ سرخ تتلیاں بیٹھی ہوئی پنکھ ہلا رہی ہوں ۔ "

کیا ان دونوں نے اپنا وہی پرانا کھیل شروع کردیا ؟ اسی طرح گھنٹوں بیٹھ کر پہیلیاں کھانا ۔۔۔ کیا چاند آسما کبھی نہ پھوٹنے والی آنکھ ہے ؟ یا چاند کوئی موٹی سی ٹکی ہے جو کل سے روزے رکھنے والی ہے ؟ پرانی یادیں اس کے نکلنے لگیں ۔

"ہم نے آخر شادی کیوں کی ؟ کیا ہم اسی طرح نہیں رہ سکتے تھے ۔ محبت میں غرق ، محبت میں گم ۔ ۔ ۔ ؟ "
وہ چپ رہا ۔ اس کی خاموشی سے شہ پاکر وہ پوچھنے لگی ۔ ۔ ۔ " بولو کس طرح کی ہے ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ تمھاری بیوی ؟ "
وہ اب بھی مہر بہ لب بیٹھا رہا ۔ اپنی انگلی میں پڑی موٹی انگوٹھی کو گھماتا ہوا ۔ اس کی پلکیں نیچے کی جانب تھیں ۔
" تم کافی بدل گئے ہو " وہ بولے جارہی تھی " تم موٹے ہوگئے ہو ۔ اب تم اپنے بالوں میں وہ کریم نہیں لگاتے جو پہلے لگایا کرتے تھے ۔ انگلی میں انگوٹھی پہنے ہوئے ہو ۔ ۔ ۔ تم وہ شخص نہیں رہ گئے ہو جسے میں پہچانتی جانتی تھی ۔ "
" ہُم ۔ ۔ ۔ "

اس کے چہرے کی کیفیت اندھیرے کی وجہ سے غیر واضح تھی ۔ ساحل سمندر پر صرف پتھروں کے کنارے پر چاندنی نے اپنی لکیر کھینچی ۔ وہ محسوس کرنے لگی کہ پانی کسی تھکے ماندے شخص کی طرح ہانپ رہا تھا ، اندر سے کراہ رہا تھا ۔

اس کا من ماضی کے کھانچے میں سمائے ان دنوں کی طرف بھاگنے لگا جب وہ کہتا تھا ، " کیا کہا ؟ میں تم سے محبت نہیں کرتا ؟ کیا تم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکتی ہو ؟ ہے اتنی ہمت ؟ " اس کی وہ باتیں صرف اس کے مخصوص وہ مسکراہٹ اس محبت کرنے والے جوڑے کو ایک ہی ماں کی آغوش میں سلاتے ہوئے جیسے ساری دنیا سے چھپا کر راحت و سکون دینے والی وہ شامیں ۔ ۔ ۔ کیا سب کے سب مرگئے ؟ وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگی ۔ ۔ ۔ آج وہ کسی دوسری عورت کا ہوچکا ہے ۔ اس پر یقین کرنا مشکل معلوم ہورہا ہے ۔ لیکن یہ حقیقت ہے ۔ اری پگلی اس حقیقت کو قبول نہیں کرے گی تو اور دکھی ہوگی ۔

" تم سچ مچ خوش نصیب ہو ۔ "
" ہ ۔ ۔ ۔ م "
" اس لیے کہ تم سب کچھ بھول سکتے ہو ۔ "
وہ اپنا سر گھما کر اسے دیکھتا رہا ۔
" میں ان باتوں کو بھول نہیں پاتی ۔ ایسا کیوں ؟ "

وہ کیا جواب دیتا ۔ دراصل اس کی بے بسی کے مقابلے میں اپنی بے بسی بھیانک لگ رہی تھی ۔ کیا وہ اپنی مجبوری کو چھپا کر اسے تسلی دے سکتا تھا ؟ وہ جیسے کہہ سکتا تھا کہ میں ان دنوں کو نہیں بھولا ہوں ۔ ایسی معصوم محبت کو بھلا دوں تو بھلا میری زندگی میں کیا رہ جاتا ہے جسے میں اپنی کامیابی تسلیم کروں ؟ وہ چاہتا تو اس سے کھل کر سب کچھ کہہ سکتا تھا ؟

کہہ سکتا تھا کہ میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں ۔ اسی محبت کی وجہ سے تمھاری زندگی سے نکل گیا ہوں ۔ جب بھی میں اپنی بیوی کا چہرہ دیکھتا ہوں اور اس کا بوسہ لیتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے تمھارا چہرہ ہوتا ہے جس سے میں محبت کرتا تھا ۔ میرا دھرم میرا ایمان تم ہی ہو ۔ لیکن وہ ان باتوں کو کھل کر کیسے کہہ سکتا تھا ؟

" میرے وہ دن نہیں رہے ۔ اس قسم کے سوال پوچھ کر مجھے پریشان نہ کرو " وہ کہنے لگا " میرے پاس اوسط سے زیادہ ذہانت یا سرمایہ نہیں ہے ۔ میں ایک معمولی انسان ہوں ۔ مجھ میں محبت کرنے کی ہمت بھی نہیں رہ گئی ہے "

یہ سنتے سنتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ۔ پھر بھی اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے بولی " ٹھیک ہے ۔ میں تمہیں پریشان کر رہی تھی ۔ تمہیں ایک بار پھر اپنے طلسم کا شکار کرنا چاہتی تھی ۔ مجھے معاف کردو ۔ "

اس نے سوچا کہ وہ ہمیشہ ہی اپنی محبت کو پنجرے کی مانند مانتا ہے ۔ ان دونوں کی زندگی کے سنہرے دنوں میں اسکی گود میں سر رکھ کر لیٹے ہوئے وہ کہتا تھا " تمہیں مجھ سے محبت نہیں کرنی چاہیے تھی ۔ مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے میں پا بہ زنجیر ہوں ۔ "

ان دنوں وہ ایسی بات سن کر ہنس دیتی تھی ۔ اس نے سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا ، ابھی کچھ دنوں بعد پنجرہ توڑ کر کھلے آسمان میں اڑ جانے والے پرندے کی طرح وہ بھی میری محبت سے آزاد ہو جائے گا ۔ وہ کیا جانتی تھی کہ میرا لاڈ پیار اس کا دم گھونٹ رہا ہے ۔ اس نے اپنے دل جیسے تالاب میں لیے بازوؤں والا ایک ایسا پودا لگا رکھا تھا جو شکار کو چاروں طرف سے باندھ کر رکھتا ہے پھر وہ اپنے محبوب کو کوشش کر کے قیدی بنا کر مطمئن تھی کہ یہ شکار نہیں بھاگے گا ۔ لیکن جسے وہ پالتو سمجھتی تھی ۔ ایک دن وہ اسے چھوڑ کر بھاگ گیا " میں تمہیں فریب دینے کے لیے کوشاں تھی " وہ بولی " پھر سے اپنے چنگل میں پھنسانے کے لیے ؟ "

" کون سے چنگل میں ؟ "

" میری شدید آرزو تھی کہ اپنا ایک بچہ ہو ۔ میرا اور تمہارا بچہ ۔ ۔ ۔ مجھے معاف کردینا " اس نے بائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی پونچھی اور سمندر کی طرف دیکھنے لگا ۔ دیکھا کہ کینچلیاں اتار کر لوٹنے والے سانپوں کی طرح جھاگ دار رو پہلی لہریں چٹانوں سے ٹکرا کر شکست خوردہ ہی لوٹی جارہی تھیں ۔ بارش رک چکی تھی ۔ اس نے چھاتہ بند کر کے اسے زور سے جھٹک دیا ۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بجھی سی آواز میں کہنے لگا " بہت دیر ہوچکی ہے ۔ گھر میں تمہارا شوہر کیا سوچ رہا ہوگا " وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ہنسا ۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ آج کے لیے رخصت کا خواہاں ہے ۔ ایک طرح کا اختتام ۔ وہ شوخ ہنسی ، پراسرار باتیں ، شیریں بوسے ۔ ۔ ۔ سب کی یادیں اسے گھیرے ہوئے تھیں ۔ لیکن اب ان میں سے ہر ایک بے جان سا لگنے لگا ۔ وہ اٹھی اور اپنی گیلی ساڑی کو پنڈلیوں سے ہٹا کر مکمل طور پر نچوڑ دیا ۔ پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر بولی " مجھے دوانی کا ایک سکہ دو ، پرس بھول آئی ہوں ۔ بس ٹکٹ کے لیے چاہیے ۔ "

وہ ہنسا وہ اسے اس کا دیا ہوا سکہ سنبھالے اندھیرے میں اوجھل ہوتے دیکھ رہا تھا ۔ جب وہ چلی گئی تو وہ اپنے کو سنبھال نہیں سکا ۔ رونے لگا لیکن خاموشی سے ۔ درشن دینے کے بعد غائب ہو جانے والی دیوی کی طرح وہ چلی گئی ہے اپنی تنہائی اور اکیلے پن کی سنسان لکیر کی طرف مجسم دکھ کی بو بنے ہوئے اپنے پتھر کے مندر کی طرف ۔ اسے پھر سے بلانے اور اس کے پاؤں کی انگلیاں چومنے کو جی چاہ رہا تھا ۔

(باقی ص ۱۴۴ پر)

شوکت عثمان
ترجمہ: قاسم ندیم

پاسبان

دوپہر کو اچانک موسلادھار بارش ہوگئی۔ مرے کو مارے شاہ مدار، رات کے وقت پہلے ہی باڑھ آگئی تھی۔ سب جل تھل ایک ہو گئے تھے۔ گاؤں والوں نے اس بند پر آکر پناہ لی تھی۔ جہاں حدِ نگاہ تک پانی ہی پانی تھا۔ دور دور تک پھیلے ہوئے پانی کی لہریں بند سے ٹکرا رہی تھیں۔

دو دن بیت گئے۔ باڑھ میں کمی نہیں آئی تھی۔ لوگ پنجرے میں بند پرندوں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے لیکن صبر کے علاوہ چارہ نہ تھا۔ تھوڑی سی جگہ تھی اور لوگ ایک دوسرے سے جکڑے کھڑے تھے۔ بے چین لوگوں کے ہنسنے، کھانے اور رونے کی آوازیں خلط ملط ہو گئی تھیں۔ نئی نویلی دلہن کا آنگن میں قدم رکھنا اور آگ میں کودنا ایک جیسا لگتا ہے۔ وہ بھی یہاں موجود تھی۔ لیکن تھوڑا سا گھونگٹ کاڑھے ہوئے۔ خسر اور جیٹھ کو بھی اپنی عزت کا کوئی خیال نہیں رہا تھا۔ کل ایک بار بہو کی بے پردگی پر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے لیکن آج مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے انہیں حالات سے سمجھوتا کرنا پڑا۔

بارش کے وقت بہت سے لوگوں نے چاول بھگو کر کھانے کا انتظام کیا۔ گائیں اور بکریاں، جنھیں ان کے مالک اپنے ساتھ لائے تھے، ان کے دودھ سے نوزائدہ بچوں کی بھوک پیاس کسی حد تک بجھ سکی لیکن جانور کچھ کھائے پیے بغیر دودھ نہیں دے سکتے۔ فضل مرید منشی کی گائے دوہنے بیٹھا تو اس نے ایک زوردار لات لگادی۔ جانور تھنوں کو چھونے نہ دیتے تھے۔ بکریاں دیر تک ممیانے کے بعد خاموش ہوگئیں۔ پیٹ میں تنکا بھی نہیں گیا تھا۔ خالی منہ کتنی دیر تک جگالی کرتیں۔ گلا خشک ہوگیا۔ جانور تو جانور، انسانوں کے بچے بھی بھوک سے بے تاب ہو کر رو کر سو گئے۔

رات میں پانچ سو گز لمبے بند پر تھکن سے چور بہت سے لوگ سو گئے۔ چند نوجوان پہرہ دینے لگے تاکہ سانپ اور دوسرے زہریلے جانور بند پر نہ چڑھنے پائیں۔ چاروں طرف بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھار پانی کے بہنے کی آواز ابھرتی اور پھر اداس ماحول میں ڈوب جاتی۔ اچانک خاموشی میں اکتارے کی آواز ابھرنے لگی۔ بند کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے گاؤں کے اندھے فقیر نے اکتارے پر اس گیت چھیڑ دیا تھا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور تین چار میل دور تک پانی ہی پانی نظر آرہا تھا۔ اگر کوئی رومانی شاعر اس منظر کو دیکھ لیتا تو جوش کے مارے پاگل ہوجاتا۔

پہرے داروں اور گاؤں کے کچھ نوجوانوں نے بند کے نزدیک بہتے ہوئے چاولوں کی ایک بوری پکڑلی۔ خوشی سے ان کے چہرے

دیکھنے لگے ۔ موجیں بہت تیز تھیں ۔ وہ بڑی مشکل سے بوری کو پکڑ کر باہر لائے ۔ جب بوری کنارے پر رکھی تو سب بری طرح ہانپ رہے تھے ۔ پانی کی سرپٹکتی موجوں کو دیکھ کر بولے "شاید یہ باڑھ برسوں بعد اترے گی"۔

اگلے دن نوجوانوں نے بانس اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے جگہ جگہ احاطے بنالیے تاکہ بچے پانی میں نہ گریں۔ بند کی دیوار زیادہ چوڑی نہ تھی ۔ زیادہ سے زیادہ پچاس فٹ ہوگی۔ گاؤں کا بوڑھا سردار سلیم نوجوانوں کے اس کارنامے پر بے حد خوش ہوا اور بولا "خاموش بیٹھے رہنا جوانوں کو زیب نہیں دیتا ۔۔ تم لوگوں نے اچھا کام کیا ہے۔

اچانک جوانوں کی نظریں گوٹھے کی چھت پر پڑی ۔ جو بہتی ہوئی آرہی تھی۔ لہروں کی مخالف سمت میں تیرنا آسان نہیں لیکن پھر بھی جوان پانی میں کود پڑے اور گوٹھے کی چھت سے سوکھی گھاس کھینچ لائے جو کہ پانی کی وجہ سے گیلی ہوگئی تھی۔ یہ چارہ گائے بکریوں کے لیے تین چار دن کی خوراک کے لیے کافی تھا۔ اسی طرح بچوں کے لیے دودھ کا انتظام بھی گاؤں کے نوجوانوں نے کردیا۔ بکریاں چارہ کھاکر دودھ تودیں گی ہی ۔ پیٹ خالی تھا اس لیے دولتی جھاڑ رہی تھیں۔

اس چھوٹی سی جگہ پر زندگی کا ڈھرا بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ ہر انسان کا دل ہمدردی کے احساس سے لب ریز تھا۔ باڑھ کی لہریں جتنی تیز تھیں ۔ ان سے کہیں زیادہ ہمدردی کی لہریں دلوں میں اٹھ رہی تھیں ۔ ہر آدمی دوسروں کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن اس چھوٹی سی جگہ پر ممکن نہ تھا۔ نوجوانوں سے جو کچھ ہوسکتا تھا ۔ انھوں نے کیا اور جب کچھ کرنے کو باقی نہ رہا تو اکتاہٹ سی محسوس کرنے لگے۔

اسی دن سردار دوپہر کے بعد نوجوانوں کو لے کر بند کے کنارے جا بیٹھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اس لیے دھوپ میں شدت نہ تھی۔ آسمان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔

نوجوانوں نے اپنی نگاہیں بوڑھے سردار پر گاڑ رکھی تھیں لیکن سردار خاموش تھا جیسے اس کے پاس باتوں کا خزانہ ختم ہوگیا ہو ۔ بہت دور سے ایک گول گول چیز ڈوبتی ابھرتی بہتی چلی آرہی تھی۔ سردار نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ۔ بتاؤ وہ کیا ہے ؟"

"فٹ بال!" ایک جوان نے بے ساختہ کہا۔

"مردہ بیل بھی ہوسکتا ہے ۔"

"کمبل ہے کمبل ۔۔۔ "جتنے منہ اتنی باتیں ۔ آخر وہ چیز نزدیک آئی ۔ سب حیرت زدہ تھے ۔ سب کے اندازے غلط ثابت ہوئے ہزاروں لاکھوں لال لال چیونٹیاں ایک گچھا بنی ہوئی بہتی چلی جارہی تھیں۔ بوڑھے سردار نے کہا ۔ دیکھو ایک بھاری بھرکم بیل باڑھ کی خطرناک اور تیز لہروں سے محفوظ نہ رہ سکا ۔ لیکن یہ ننھے منے کیڑے مکوڑے ہیں ۔ چیونٹیاں ہیں جن کا باڑھ کچھ بھی نہ بگاڑ سکی۔ جانتے ہو کیوں ؟ سردار نے جوانوں کی جانب سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔ کسی کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ "بولو نا" سردار نے ایک بار پھر کہا لیکن وہ اب بھی خاموش تھے ۔ آخر خود ہی اس نے خاموشی کو توڑا اور کہا "یہ چیونٹیاں بھی اس خطرناک باڑھ میں ختم ہوجاتیں ۔ ان کے زندہ رہنے کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ ہے ان کا اتحاد و اتفاق۔ ہو ۔۔ دیکھو ۔ ان سب نے ایک دوسرے کو پکڑ رکھا ہے اور سب سے زیادہ حیرت کی بات

یہ ہے کہ یہ ننھے جان دار اس وقت بھی حسب معمول کام میں مگن ہیں " ۔

" کام ! " نوجوان چونک اٹھے ۔

" ہاں ، ہاں ۔ " سردار انھیں سمجھانے لگا۔ غور سے دیکھو ۔ سب کام میں مگن ہیں ۔ کچھ پانی کی سطح سے نیچے ہیں اور کچھ اوپر ۔ جو نیچے ہیں وہ دھیرے دھیرے اوپر آرہی ہیں اور جو اوپر ہیں وہ آہستہ آہستہ نیچے جارہی ہیں۔ اس لیے باڑھ انھیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکی ۔ ہیں تو یہ چھوٹے جان دار لیکن ان کے مسلسل عمل نے انھیں ڈوبنے سے بچالیا " ۔

سب نوجوان ٹکر ٹکر چیونٹیوں کی جانب دیکھ رہے تھے ۔ ان کی نگاہیں اس گچھے سے اس وقت ہٹیں جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا سب نہ جانے کس سوچ میں ڈوب گئے ۔ سردار کو ان کی یہ خاموشی پھر کھلنے لگی ۔ اس نے انھیں دوسری بہتی ہوئی چیز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا " اچھا " اب دیکھتے ہیں ، کون صحیح بتاتا ہے " ۔

یہ ایک چوکون چیز تھی اور اچھے خاصے فاصلے پر تھی ، اس لیے کوئی اندازہ نہ لگ سکا ۔ چوکون چیز پر سفید سا دھبہ نظر آرہا تھا ۔ نوجوان پھر بڑے غور سے دیکھنے لگے ۔ لگ بھگ ساٹھ گز کے فاصلے پر وہ چیز پہنچی تو دیکھا کہ وہ ایک سیاہ تختہ ہے ۔ لمبائی پانچ فٹ اور چوڑائی تقریباً دو فٹ ہوگی ۔ فضل مرید نے بہت دیر سے اس تختے پر اپنی نگاہیں جمار کھی تھیں ۔ اس نے اچانک کچھا لپنے جسم پر لپیٹا اور پانی میں کود گیا ۔ سردار اور دوسرے لوگ چیختے رہ گئے ، " ابے کیا کرتا ہے ، کیا کرتا ہے " ؟

لیکن فضل کافی آگے جاچکا تھا ۔ باڑھ پھر بھی کچھ کم ہوگئی تھی لیکن لہریں کافی تیز تھیں ۔ صرف ایک تختے کی خاطر جان پر کھیل جانا بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے ؟ کسے خبر تھی کہ پانی میں مگر مچھ ، بچھو ، سانپ وغیرہ کیا کچھ نہیں ہوتے ۔ بند پر موجود سبھی لوگوں نے چیخ چیخ کر فضل کو واپس آنے کے لیے کہا ، لیکن اس نے سنی ان سنی کردی ۔ اور مخالف لہروں سے لوہالیتا ہوا آگے بڑھتا رہا ۔ سب حیران تھے ۔ اس کے پاگل پن کو دیکھ رہے تھے ۔

لگ بھگ ایک سو گز تیرنے کے بعد فضل نے تختے کو پکڑلیا لیکن تیز طرار لہروں کو چیر کر اسے کنارے پر لانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ تختہ ہاتھ میں آجانے سے لوگوں کی کچھ امید بندھی کہ اب فضل ڈوب نہیں سکتا۔ وہ اسے پکڑ کر بہتا رہے گا ۔

اب فضل ، بند سے تقریباً تین سو گز دور چلا گیا تھا ۔ وہ کنارے کی طرف آنے کے لیے لہروں سے زور آزمائی کرتا رہا ۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے دو پہلوان ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہورہے ہوں ۔ فضل نے جب دیکھا کہ وہ کافی دور نکل آیا ہے اور تیر کر تختے کو کنارے پر لے جانا مشکل ہے تو اس نے تختے کو پوری قوت سے کنارے کی جانب ڈھکیل دیا ۔ تختہ دس گز دور جا پڑا ۔ فضل تیزی سے ہاتھ پاؤں مارتا ہوا تختے کی جانب بڑھا اور اس سے پہلے کہ وہ بہہ کر آگے نکل جاتا ۔ اسے پکڑ لیا پھر اسے ڈھکیلتا ہوا کنارے پر لے آیا ۔ دو تین نوجوانوں نے تختے کو باہر نکالا ۔ فضل بری طرح ہانپ رہا تھا ۔ جوانوں نے اسے بند پر چڑھنے میں مدد دی ۔ سردار کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نمودار ہوگئے تھے ۔ وہ ملامت سے بولا ۔ یہ تم نے کیا بے وقوفی کی ؟ ایک تختے کے لیے جان دینے پر تل گئے " ۔

" چاچا " یہ تختہ نشین ، ہم لوگوں کی جان ہے ۔ ہماری روح ہے " روح ۔ " فضل نے جواب دیا اور پھر جوانوں کی جانب مڑکر بولا ، " تختہ یہاں لے آؤ ۔ " کئی جوان اسے اٹھالائے ۔

" میں صرف دو سال مدرسے گیا ہوں ، لیکن آپ تو مجھ سے زیادہ پڑھنا لکھنا جانتے ہیں ۔ پڑھیئے " ۔ فضل نے تختے کو سیدھا کرتے ہوئے کہا ۔ جو لوگ پڑھنا جانتے تھے انھوں نے فرفر پڑھا " مدرسہ ۔ نعمت نگر " سبھی لوگوں کی نظریں سائن بورڈ پر مرکوز تھیں ۔ فضل نے سنجیدگی سے کہا ، چاچا میں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا ۔ دل میں سوچا ، مدرسہ تو بازہ کی بھینٹ چڑھ چکا لیکن سائن بورڈ کو نہ بہنے دوں گا ۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آپ نے چیونٹیوں کے بارے میں کہا تھا ۔ کیا ہم ان سے بھی گئے گزرے ہیں ؟ کیا ہم اپنی تہذیب کی نشانیوں کو ، اپنے علم کے گہواروں کے کچھ نقوش کو مٹنے سے بچانے کی ہمت نہیں کرسکتے ؟ کیا ہم وقت کے طوفان سے خوف زدہ ہوجائیں گے ؟ "

سردار نے فرطِ مسرت سے شرابور ہوکر فضل کو اپنے سینے سے لگالیا ۔ سردار کو لگا جیسے مخالف لہروں سے لڑنے والی قوت جاگ اٹھی ہے ۔"

(سلسلہ ص ۱۱۰)

پتھر اور مٹی کے چبوترے ، پھر میدان کو پار کرنے کے بعد پیلی جھلملاتی بتیوں سے روشن بازار کے بس اسٹاپ پر پہنچ کر اس نے پیاسے نینوں سے پیچھے مڑ کر دیکھا ۔ لیکن اسے کھوکھلے اندھیرے کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا ۔

اور پھر اس کے کمرے میں اگا پیپڑ بڑھتا گیا اور چھت تک پہنچ گیا ۔ پیپڑ کی ڈالیں دیواروں سے رگڑ کھاتی گئیں اور دراڑیں بنتی گئیں رات کی مسموم ہوا میں وہ پیپڑ اپنے بے شمار بازو پھیلاتے ہوئے اور بڑھنے کی کوشش میں تھا ۔ وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی پیپڑ کے تنفس پر غور کر رہی تھی ۔ اپنے دل کی تنہائی بھی اسے کاٹ رہی تھی ۔ اس حالت میں وہ موت کو بھی ایک نعمت سمجھنے لگی ۔

(سلسلہ ص ۱۱۷)

" کس کی کہانی کی بات کر رہے ہو بھائی صاحب ؟ جن کی کہانی لکھتے ہو

وہ تو وہیں کے وہیں پڑے ہیں میں اپنے باپ کی جگہ بیٹھا ہوں ،

اور آپ اپنے بھائی صاحب کی بیٹھک چلا رہے ہو ۔ ترقی کون سی کہانی نے کرلی ۔ ۔ ۔ ؟ "

کس کس افسانے کا ذکر کیا جائے ۔ " دھنواں " کا ہر افسانہ اس لائق ہے کہ اس پر بات کی جائے ۔ ان میں موضوعات کی بوقلمونی بھی ہے اور اسلوب کا جادو بھی ۔ زبان کا ندرتِ استعمال بھی ہے اور مکالمے کی دل نشینی بھی ۔ اہم بات یہ ہے کہ اظہار

[illegible]

مطالعہ

غلام جیلانی

دھواں

(گلزار کے افسانوں کا مجموعہ)

" موسم " ، " اچانک " اور " معصوم " جیسی بے مثال فلموں کا قلم کار اور ڈائریکٹر اب ایک باکمال افسانہ نگار کے روپ میں منظرِ عام پر آیا ہے ۔ یہ ایک نہایت خوش آئند واقعہ ہے ۔ جس طرح فلموں کے لیے ان کے لکھے مکالمے اور گیت معیار اور تاثر میں اپنا جواب نہیں رکھتے اسی طرح ان کے افسانے بھی اثر آفرینی سے معمور ہیں ۔ پچھلے کچھ عرصے سے ان کے افسانے " فنون " اور " ذہن جدید " میں شائع ہوتے رہے ہیں ۔ لیکن زیرِ نظر مجموعہ " دھواں " میں شامل ان کے (۲۸) افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے ہم افسانہ نگاری کی ایک نئی جہت سے متعارف ہو رہے ہیں ۔

گلزار کے افسانوں میں نہ تو الجھن میں ڈالنے والا ابہام ہے اور نہ روایتی بیانیہ انداز ۔ اور نہ افسانوں کو جدید ، مابعد جدید یا تجریدی وغیرہ جیسی اصطلاحوں کی تجزیاتی چھلنیوں میں سے گزار کر دیکھنے کی ضرورت ہے ۔ کیوں کہ یہ آج کے افسانے ہیں اور ان میں ایک نیا پن ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج افسانہ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں پر ہی لکھا جارہا ہے ۔ گلزار نے بھی حقیقت نگاری سے ہی کام لیا ہے ۔ زندگی کی مخفی حقیقتوں کو بھی ان کی باریک بیں آنکھ نے دیکھا ہے ۔ وہ اپنے ایک کردار سے کہلواتے ہیں :

> " نئی کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کا بدلتا ہوا تصور ہے ۔ حقیقت صرف وہ نہیں جو دکھائی دیتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے ، جو آنکھ سے اوجھل ہوتی ہے ۔ "

ان کہانیوں کے موضوع بھی ایک وسیع بساط پر پھیلے ہوئے ہیں ۔ مگر سب یا تو زندگی کے مختلف سماجی اور معاشی مسائل سے جڑے ہوتے ہیں یا پھر سیاسی اور معاشرتی تغیرات سے متاثرہ ذہنوں کے نفسیاتی تجزیوں کی عکاسی کرتے ہیں ۔ خوف ، بے یقینی ، شک ، حسد اور محبت کے جذبات ، ولولے اور کم زور اعتقاد ، ازدواجی زندگی کی گتھیاں ، خواہشیں اور حسرتیں ۔ ۔ ۔ گلزار نے سب پر لکھا ہے ۔ یہ انسانی رشتوں کی کہانیاں ہیں ، باہم اعتماد اور اعتبار کی کہانیاں ہیں جو کبھی ایک چھناکے کے ساتھ کانچ کی طرح ٹوٹ بھی

جاتے ہیں ۔ ان کہانیوں میں جوان دلوں کی دھڑکنیں بھی ملتی ہیں اور بوڑھوں اور بچوں کی معصومیت اور بے بسی بھی ۔ گلزار کے کردار بھی کہیں کم زور اور نچلے طبقے کے مزدور اور دھوبی ہیں ، تو کہیں اونچے طبقے کے زمیں دار اور جاگیردار ۔ کہیں فلمی دنیا کی مشہور ہستیاں ہیں تو کہیں ڈاکو اور دہشت گرد ہیں ۔ ان کہانیوں میں کہیں اونچی حویلیاں اور شان دار کوٹھیاں ہیں اور کہیں گاؤں کے کھیت اور چوپال ۔ ہر کہانی کی تشکیل میں گلزار نے زندگی کی کسی نہ کسی سچائی کے پہلو کو اجاگر کیا ہے ۔

لیکن جو چیزیں ان کے افسانوں کو ممیز کرتی ہے وہ گلزار کا طرزِ نگارش ہے ، ٹریٹ منٹ ہے ، مکالموں کی خوبی ہے ، اور سب سے بڑھ کر زبان کا استعمال ہے ۔ جس طرح ان کے افسانے مختصر ہیں اسی طرح ان کا طرزِ بیان بھی مختصر جملوں پر مشتمل ہوتا ہے ۔ لیکن الفاظ کے انتخاب میں بلا کی معنویت ، بے ساختگی اور روز مرہ کی خوب صورت آمیزش ہوتی ہے ۔ ہر لفظ اپنی جگہ نگینے کی طرح جڑا ہوا ۔ سادگی اور پرکاری کوئی آسان نہیں ۔ انھوں نے اپنے افسانے اپنے اسلوب اور اپنی زبان میں بیان کیے ہیں ۔ جس سے وہ قاری کو جلد ہی اپنے افسانے کے سحر میں محصور کرلیتے ہیں ۔ اکثر افسانوں کا اختتام بھی ایک تحیّر خیز جملے پر ہوا ہے جو ادراک کی تہوں کو مرتعش کر دیتا ہے ۔ اعلیٰ ادبی سطح پر جمالیاتی تجسس اور تاثر کی فضا برقرار رکھنا ایک مشکل فنی وصف ہے ۔

یہی وصف ان کی مکالمہ نگاری میں بھی بہ درجہ ، اتم موجود ہے ۔ وہ مکالموں ہی کے ذریعے کہانی کا کوئی واقعاتی موڑ بڑے اختصار کے ساتھ بیان کرجاتے ہیں ۔ یا پھر دو ایک جملوں میں ہی کسی پے چیدہ کردار کا تعارف کرادیتے ہیں ۔ افسانہ " ایک چابی " میں سدھیر کی بیوی ازدواجی زندگی کی بے آہنگی سے ذہنی انتشار و اضطرار میں مبتلا ہے ۔ سدھیر اس سے کہتا ہے :

" تم ہمیشہ وہاں رہنا چاہتی ہو جہاں نہیں ہو ۔ جہاں ہو اس سے کبھی مطمئن نہیں ہو

۔ ۔ ۔ اور تمھیں خود بھی نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو ۔ کہاں رہنا چاہتی ہو ۔ "

" دھواں " کے پہلے دو افسانے " بملرا " اور " سن سیٹ بولیوارڈ " فلمی دنیا کی دو اہم ہستیوں پر لکھے گئے ہیں ۔ ۔ ۔ بمل رائے اور چارو لتا ۔ ایک عظیم ڈائرکٹر اور دوسری بنگال کی بے مثال اداکارہ ۔ دونوں افسانوں میں شدت کا تاثر ہے جو اس کرب کو بے نقاب کرتا ہے جو یہ عظیم آرٹسٹ اپنے وجود کے نہاں خانوں میں دبائے جیتے رہے ۔ کئی بڑے فن کار اسی طرح اپنے دلوں کی گہرائیوں میں کوئی درد ، کوئی تڑپ چھپائے زندگی بھر دنیا کو اپنے کمال سے محظوظ کرتے ہیں ۔ اس حقیقت کو گلزار نے اپنے اظہار کے اچھوتے اسلوب کے سہارے دل نشین افسانے میں ڈھال دیا ہے ۔ " سن سیٹ بولیوارڈ " پڑھ کر ختم کرنے کے بعد لگتا ہے جیسے ایک دل میں اتر جانے والا ٹیلی فلم دیکھ کر اٹھے ہیں ۔ اس مجموعے کی سب سے اچھی کہانی کون سی ہے ۔ یہ کہنا مشکل ہے ۔ " بملرا " ، " سن سیٹ بولیوارڈ " ، " خوف " ، " لیکن " ، " ایک چابی " ، " راوی پار " ، " خیرو " ، " فصل " ، " دھنواں ، " کس کی کہانی " ۔ ۔ ۔ سب ہی عمدہ کہانیاں ہیں ۔ پھر بھی افسانہ " ایک چابی " کا ذکر بہ طورِ خاص ضروری محسوس ہوتا ہے ۔ یہ عورت اور مرد کے رشتے اور ذہنی الجھنوں کے تصادم (Mental Conflict) کی کہانی ہے جس کو بڑی چابک دستی سے کہانی کار نے اپنے فنی اسلوب میں بیان کیا ہے ۔

۔ ۔ ۔ ۔

انسانی رشتے کہاں تک حقیقت ہیں اور کب فریب کی حدوں میں داخل ہوجاتے ہیں ۔ کیا رشتوں کی شکست و ریخت کا یہ عمل بہ ذاتِ خود کسی لاشعوری ردِ عمل کا احساس ہے ، جو زندگی کے دھاروں کو موڑ دینے کا متقاضی ہوجاتا ہے ۔ کیا خود فریبی بھی ایک حقیقت نہیں ہے جس کے سہارے زندگی گزرجائے ؟ ۔ ۔ ۔ افسانہ " ایک چابی " کا تانا بانا اسی قسم کے نفسیاتی سوالات ذہن میں ابھارتا ہے ۔ اس کا ایک اقتباس درج ہے :

" قانونی طور پر کوئی شوہر نہیں ہوتا ۔ قانونی طور پر کوئی بیوی نہیں ہوتی ۔ ہم خواہ مخواہ ان رشتوں پر قانونی مہریں لگاتے ہیں ۔ ان مہروں سے راشن کارڈ بن سکتے ہیں " رشتے نہیں بنتے ۔ "

" خوف " فسادوں اور مذہبی جنون پر لکھی ہوئی ایک منفرد کہانی ہے ۔ بلاشبہ اس زمرے میں لکھی ہوئی بہترین کہانیوں میں شمار کی جاسکتی ہے ۔ کہانی جس محور کے گرد گھومتی ہے وہ مذہبی جنون سے پیدا شدہ خوف و دہشت کی وہ فضاء ہے جو انسانی ذہن سے سوچ کی طاقت سلب کرلیتی ہے ۔

افسانہ " لیکن " ایک فینٹسی کی مثال ہے ۔ جو دکھاتا ہے کہ حقیقت اور واہمے کے درمیان کتنا کم فاصلہ رہ جاتا ہے ۔ " زندگی اور موت دونوں ہی واہمے ہیں ۔ ایک ذہنی کیفیت سے نکل کر ہم دوسری ذہنی کیفیت میں داخل ہوجاتے ہیں ۔ اور جو حقیقت ہے اسے ہم واہمہ یا سراب یا مایا کہتے ہیں " ۔ ۔ ۔ اسی افسانے کا ایک اور اقتباس :

" وقت ختم نہیں ہوتا ۔ زندگی ختم ہوجاتی ہے ۔ وقت تو خرچ ہوتا ہے ۔ ہوتا رہتا ہے ۔ پھر بھی ختم نہیں ہوتا ۔ "

" خیرو " ایک نہایت مختصر لیکن شدتِ تاثر سے بھرپور افسانہ ہے ۔ خیرو گاؤں کا ایک قطعی غیر اہم لیکن معصوم صفت اور خوش ذوق لڑکا ہے ، جس کی کسی کو ضرورت نہیں ہے ۔ پھر بھی وہ خود ہی اپنے فطری خلوص کے تحت ہر جگہ ہر ایک کے کام میں ہاتھ بٹاتا پھرتا ہے اور خود میں مگن رہتا ہے ۔ اسے گانے اور بانسری کا شوق ہے ۔ نہ اس کی کوئی منزل ہے ، اور نہ خوابوں کا زادِ راہ ۔ نہ وہ کسی کی خوشی ہے اور نہ ناخوشی ۔ پھر بھی جب ہر روز آدھی رات کو خیرو چوپال میں پڑ کر گانے لگتا تو کئی لوگ ہڑبڑ ضرور جاتے ۔ اور پھر جب ایک روز اچانک خیرو غائب ہوگیا تو سارا گاؤں بے چین ہوگیا ۔ جیسے کوئی ضروری چیز کھو گئی ہو ۔ آدھی رات چوپال سے گانے کی آواز نہیں آئی تو سارا گاؤں جاگ رہا تھا ۔

اتنے چھوٹے سے افسانے میں گلزار نے خیرو کو ایک نہ بھولنے والا کردار بنادیا ہے ۔

ایک اور افسانہ " کس کی کہانی " میں گاؤں کے ایک لڑکے انو کو اسکول کے زمانے سے ہی کہانیاں لکھنے کا شوق تھا ۔ اس نے گاؤں کے موچی بھیکو پر بھی کہانی لکھ کر سنائی تھی ۔ بڑا ہوکر انو خاصا مشہور افسانہ نگار بن گیا ۔ ایک دن گاؤں واپس آکر بھیکو کے چپ بیٹھے گھسیٹا کی موجودگی میں لوگوں کو افسانے کی دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ترقیوں کی باتیں سنانے لگتا ہے ۔ جس پر گھسیٹا بول اٹھتا ہے ۔ ۔ ۔

(باقی ص ۱۱۴ پر)

نقد و نظر

{ تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں روانہ کی جائیں ۔ ادارے کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ۔ }

نام کتاب : موسمی پرندے (افسانے) مصنف : انل ٹھکر تبصرہ نگار : قدیر زماں

انل ٹھکر گذشتہ کوئی تین دہوں سے لکھ رہے ہیں ۔ افسانے بھی اور ڈرامے بھی ۔ اس وقت ان کے افسانوں کا مجموعہ "موسمی پرندے" میرے زیر مطالعہ ہے ۔ کل نو افسانے ہیں ۔

انل ٹھکر کے ان افسانوں کو میں نے جب پڑھنا شروع کیا تو ایک یا دو صفحے پڑھنے کے ساتھ ہی یہ خواہش ہوئی کہ افسانے کے اختتام تک کوئی ٹیلیفون کی گھنٹی نہ بجے اور نہ ہی کسی اور وجہ سے میرے مطالعے میں مداخلت ہو ۔ ابھی نصف افسانہ ہی پڑھتا ہوں تو ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہوتا ہوں کہ اب یہ کس طرح تکمیل کو پہنچے گا ۔ لیکن اختتام کو پہنچ کر آخری چند لفظ پڑھ کر حیرت و استعجاب کا سامنا ہوتا ہے کہ انل ٹھکر نے اپنی بات بڑی خوبی سے مکمل کرلی ہے ۔ افسانے کا انجام کچھ اور بھی ہوسکتا ہے لیکن ٹھکر کے قلم کوئی لغزش نہیں کھا سکتا ۔ انجام وہی ہے جو فطرت کا تقاضا ہے ۔ ۔ ۔ نہیں شاید ایسا نہیں ہے ۔ فطرت کے تقاضے تو کچھ اور بھی ہوسکتے ہیں لیکن انھوں نے فطرت کے صرف ایسے تقاضوں کو پورا کیا ہے جہاں قاری اپنی فکر اور اپنے احساس دونوں کو اتھل پتھل سوس کرتا ہے ۔ اور یہی ان کے فن کا کمال ہے ۔

افسانہ "موسمی پرندے" ہی کو لیجیے ۔ احمد اللہ خاں بخاری ریٹائرڈ جج ہائی کورٹ امریکہ روانہ ہونے والے اپنے اکلوتے بیٹے اور بہو کو دس سال قبل ایرپورٹ پر خدا حافظ کہہ چکے تھے ۔ اس وقت ان کی بیوی بھی ساتھ تھیں ۔ دس سال بعد بیٹا اور بہو آتے ہیں تو ان کے دو بچے ساتھ ہیں ۔ گھر پہنچنے سے پہلے راستے ہی سے بیٹے کا ماں کی قبر کی زیارت کا اصرار بڑا فطری ہے ۔ ایسے ہی فطری تقاضوں کو پورا کرتا ہوا افسانہ جب امریکی نژاد پوتری کے الڑھ پن اور جسٹس بخاری کے جذباتی ٹکراؤ سے گزرتا ہوا وداعی کے لمحات تک پہنچتا ہے تو ٹڈی بیر کو ہاتھ میں لیے پوتی کے رخساروں پر دادا جی کے بوسوں کی بوچھار قاری کے آنکھوں سے آنسو رلاسکتی ہے ۔

"ننھے شہسوار" میں داداجی اور ان کے پوتے بٹو سے ملیے ۔ داداجی نے اپنے ایوارڈ کا کاغذ چار دن سے میز پر رکھ چھوڑا ہے ۔ انھیں حسرت ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہیں پایا ہے ۔ اس کا انجام یوں ہے کہ بٹو نے میز پر کے سارے سامان کو بکھیر دیا ہے ۔ فرش پر بیٹھے ، ایک پاؤں موڑے ، دوسرا پسارے وہ سند پہ الٹی سیدھی لکیریں کھینچ رہا ہے ۔ داداجی کمرے میں پہنچ کر ، پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے اور پاگلوں کی طرح چلا کر جب یہ کہتے ہیں " یہ کیا کر رہے ہو بٹو " تو بٹو کے لکیریں کھینچنے کی رفتار بڑھ جاتی

ہے ۔ پھر بہو جب وہ کاغذ دادا کی جانب بڑھا دیتا ہے اور اپنی چھوٹی چھوٹی باہیں دادا کے گلے میں ڈال دیتا ہے تو دادا کا گلا بھر آتا ہے اور پرنم آنکھوں سے وہ صرف اتنا کہہ پاتے ہیں " واہ میرے یار ۔ میرے ننھے شہسوار ۔ "

" معجزہ " کا موضوع ویسے نیا نہیں ہے لیکن جس خوب صورتی سے انل ٹھکر نے افسانے کا تانا بانا جوڑا ہے یہ انھیں کا حق ہے ۔ پورا افسانہ فلیش بیک تکنیک میں ہے ۔ مرنے والے کی استھیاں اس کا بیٹا ایک چھوٹی سی ہنڈیا میں سمیٹ کر گنگا کنارے لے آیا ہے ۔ استھیاں قاری کو اپنی کہانی سنارہی ہیں کہ وہ پہلی بار کب اس گنگا سے روشناس ہوا تھا ۔ پھر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے کس طرح اس نے آشرم کے پجاری سے آشیرواد حاصل کرنا چاہی تھی ۔ آشیرواد کے پھل کو پاکر اور اپنے خیاب میں حاملہ ہوئی اپنی پتنی کو قے کرتے دیکھتے ہوئے مرکزی کردار کے احساس تک پہنچنے کے لیے قاری کو کئی اور مقامات سے گزرنا ہوگا ۔ آپ گنگا میا کی پناہ میں ہردوار تک جائیں ، ندی کے بہتے ہوئے پانی کے تیز دھارے کا نظارہ کریں ، بندروں کی ٹولیوں کو دیکھ کر لطف اٹھائیں ، دھرم شالاؤں میں قیام کریں ، گاندھی جی اور پنڈت نہرو سے بھی ملاقات کریں ۔ پھر ان تصویروں کو بھی دیکھیں جن میں چند وحشی لوگوں کے خوب صورت تراشے ہوئے جسم ہیں ۔ مجسمے جیسی عورتیں ، اپنے برہنہ جسم کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہیں ۔ اور پھر بدری ناتھ سے لاتے ہوئے ناریل کو وتس کے ہاتھوں میں دے کر پوجا کے پھولوں کو بھگتن کے آنچل میں باندھ کر سوامی جی کا آشیرواد حاصل کرنے والی اس معصوم پتنی سے ملیں جس نے ایک پتر کو جنم دیا ہے اور جو اپنے پتا کی استھان کو انتم سنسکار کے لیے گنگا کنارے لے آیا ہے ۔ پتا اور پتر کا رشتہ ویسا ہی پوتر ہے جیسا ہونا چاہیے ۔ انل ٹھکر نے کثیف سے کثیف واقعے کو لطیف ترین جذبے میں منتقل کردیا ہے ۔

ایک اور افسانے کا ذکر کیے دیتا ہوں ۔ " سانسیں اپنی قبروں میں " افسانہ پڑھ کر شاید آپ کو یہ لگے کہ عنوان متن سے میل نہیں کھاتا ۔ لیکن سچ پوچھیے تو یہ عنوان بڑا عجیب سا ہو کر بھی اپنے متن کا بھرپور نمائندہ ہے ۔ اس میں کردار نگاری اس قدر برجستہ اور بے ساختہ ہے کہ مجھے راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ببل یاد آگیا ۔ بڑے ہی پے چیدہ واقعات کو بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے ۔ سارے کردار اپنی جگہ بے حد فطری ہیں ۔ انل ٹھکر کے افسانے واقعات ہی ہوتے ہیں لیکن اس مجموعے کا یہ آخری افسانہ اپنے انوکھے پن کے باوجود اپنے میں پریم چند کے افسانے " کفن " جیسی کیفیت کا حامل ہے ۔ ایک بے کس فاقہ زدہ عورت اور اس کے دو بچوں کی کہانی ۔ یکے بعد دیگرے دو مرد اس عورت کی زندگی کو کس طرح روندتے ہیں ، جو عارضی راحتیں ہیں ان میں اور عذاب کی صورتوں میں ان بچوں کی جو حرکات و سکنات ہیں ان کے احساسات کی عکاسی انل ٹھکر کے قلم کی گرفت میں کس حسن و خوبی سے آئی ہے اسے افسانہ پڑھ کر ہی سمجھا جاسکتا ہے ۔

اس مختصر سے تبصرے میں تمام افسانوں کا جائزہ تو میں لے نہیں سکتا جب آپ پڑھیں گے تب ہی ان کی اہمیت آپ پر واضح ہوگی ۔ جزوی واقعات اور قلبی واردات کو اکثر تمثیلوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے ۔ ان متاثر کن تمثیلوں کی ایک طویل فہرست بن سکتی ہے ۔ فی الوقت ان کے ذکر سے اجتناب کرتے ہوئے میں اپنے تئیں ان افسانوں کو گذشتہ دس سال میں پڑھے گئے اہم ترین

افسانوں کی فہرست میں شامل کرتا ہوں ۔

● ۱/۸ ڈیمائی سائز ● صفحات ۱۴۴ ● قیمت سو روپے ● ملنے کا پتہ : ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس دریا گنج ۔ دہلی ۱۱۰۰۰۲ ۔

000 ●●● 000

کتاب کا نام : روپیوں کا پیڑ	مصنف : رشید انور	تبصرہ نگار : رخسانہ سلطانہ

" روپیوں کا پیڑ " رشید انور کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے ۔ میں نے پہلی مرتبہ رشید انور کو پڑھا اور میرے لیے یہ مجموعہ رشید انور کا بلاشبہ اہم تعارف ہے ۔

یہ افسانے زندگی کی قدروں اور مسائل سے جڑے ہوئے ہیں ۔ زندگی کا کوئی بھی مسئلہ ہو ، وہ انسان کی فطرت کے کسی نہ کسی روپ کی عکاسی کرتا ہے ۔ رشید انور یقیناً وسیع مشاہدے اور کھلے ذہن کے تخلیق کار ہیں ۔ ان کے افسانے زندگی سے عبارت ہیں ۔ ان کے یہاں ایسا محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی فرضی قصے سے دوچار ہیں بلکہ افسانے کے فارم میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھتے ، سنتے اور پڑھتے یہ احساس ہوتا ہے کہ واقعی یہ افسانے زندگی کے عکاس ہیں ۔

رشید انور اپنی تخلیقیت کو افسانویت اور افسانویت کو حقیقت میں کچھ اس طرح بدلتے ہیں کہ وہ بہ یک وقت " افسانہ " اور " حقیقت " کے حسین و جمیل اظہار کے علاوہ زندگی کی کڑواہٹ اور حزن کو ایک صدمے کے ساتھ بیان کرجاتے ہیں ۔ ان کے افسانے ہماری سوسائٹی کے منظر نامے پیش کرتے ہیں اور مختصر افسانوں کا یہی حسن ہے کہ بات مختصر ہو مگر سیدھی دل میں اتر جائے ۔ رشید انور نے بلا شبہ یہ حسن برقرار رکھا ہے مگر افسانہ " آخری گلاب " اور افسانہ " نقشِ قدم " میں اس حسن کو برقرار رکھنے سے قاصر رہے لیکن ساتھ ہی ان منظر ناموں میں چھوٹی چھوٹی مگر گھریلو نفسیاتی الجھنیں اور ذاتی لمحے حیات کی صداقت کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں ۔

اس افسانوی مجموعے میں ایک افسانہ " روپیوں کا پیڑ " بھی ہے ۔ یہ ایک غریب الوطن ہندستانی کی کہانی ہے جو اپنے گھر کے معاشی حالات سدھارنے کے لیے اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک جاتا ہے ۔ بے شمار دولت کمانے کے باوجود وہ نفسیاتی اور روحانی سطح پر کنگال ہی رہتا ہے اور وہ اپنوں کے لیے روپیوں کے پیڑ کے سوا کوئی دوسری حقیقت نہیں رکھتا ۔

رشید انور کے افسانوں میں جہاں افلاس زدہ طبقے کا بیان ملتا ہے وہیں وہ متوسط طبقے اور اعلیٰ طبقے کی نمائندگی بھی کرتے ہیں ۔ وہ ہر طبقے کے ماحول کی فضا آفرینی پر یکساں قدرت رکھتے ہیں وہ چاہے " نیا حساب " کے زلفومیاں کا غربت زدہ ماحول ہو یا " دستک " ، " سجدہ " ، " خون کی تاثیر " کے پسماندہ طبقے کی نمائندگی ہو یا پھر سرمایہ دارانہ ماحول کے " چھوٹی سی ایک آرزو " ، " آخری گلاب " اور " پہلی اڑان " ہی کیوں نہ ہوں ۔

افلاس زدہ طبقے کا ایک کردار رشید انور کے افسانے " ورثہ " میں بڑا جان دار معلوم ہوتا ہے یہ ایک کڑوی حقیقت ہے

خواب اور حقیقت کا حسین سنگم باندھا گیا ہے۔ خواب اور حقیقت کی جنگ میں ہمیشہ حقیقت ہی جیت جاتی ہے۔ "[illegible]" کے [illegible] کو آخر میں حقیقت ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ غلطی ہی اس کا ورثہ تھی۔

موجودہ دور کی سچائیاں اور کڑواہٹیں۔ زلفو میاں۔ بھیم بہادر۔ کرمو۔ ملک جی۔ اختر۔ شی جیسے کرداروں میں نظر آتی ہیں زندگی اور سماج کے بدلتے ہوئے رجحانات افسانہ "نیا حساب" کے اس جملے سے ظاہر ہوتے ہیں،

"بیٹا اس وقت تک ہی بیٹا کیوں رہتا ہے جب تک اس کی شادی نہ ہوجائے؟"

یا پھر افسانہ "پہلی اڑان" کے ہیرو کے یہ جملے،

"ہم کیوں اپنے بچوں کو اپنے سانچوں میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے وقت میں زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہم کیوں وقت کی سوئی کو پیچھے کی طرف گھمانے کے آرزو مند رہتے ہیں۔"

یا پھر "دریا جب چڑھتا ہے تو اپنا راستہ خود ہی بناتا چلا جاتا ہے۔"

پرانی قدروں کی شکست خوردگی کا احساس بھی ہمیں "آخری مقدمہ" اور "روپیوں کا پیسٹ" میں دکھائی دیتا ہے۔ دورِ حاضر کی چکا چوند میں صدیوں کی تہذیب اور اخلاقی روایات کی بددیانتی کرنے والے کردار افسانہ "چھوٹی سی ایک آرزو" کی ہیروئن عالیہ اور "آخری مقدمے" کے کردار زرینہ اور شہاب اور افسانہ "روپیوں کا پیسٹ" کی کردار ذکیہ، تہذیب کے اس المیہ کی عکاسی کرتے ہیں۔

رشید انور کا اسلوب پرکشش اور جان دار ہے۔ قاری کی توجہ شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ رشید انور پوری صلاحیت کے ساتھ اپنے مفہوم کو واضح کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ "روپیوں کا پیسٹ" واقعی افسانوی ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ ہوسِ زر اور اخلاقی گراوٹ، رشتوں کا بدلاؤ اور انسانیت کا نوحہ اور دم توڑتی ہوئی خواہشات ان کے افسانوں میں بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کہانی کا تانا بانا بنتے وقت رشید انور کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انھیں کہانی کہنے کا فن اور ماجرا سازی کا گر آتا ہے۔ ان کے افسانے پڑھنے کے بعد قاری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ کتابت اور طباعت بہت خوب صورت ہے۔

ooo ●●● ooo

کتاب کا نام: نگارستانِ تاریخ مصنف: کلیم سرونجی تبصرہ نگار: مسعود ادیبی

"نگارستانِ تاریخ" کلیم سرونجی کے قطعاتِ تاریخ کے مجموعہ کا تاریخی نام ہے جسے انھوں نے ۱۹۹۲ء میں ترتیب دیا تھا لیکن اس کی اشاعت ۱۹۹۶ء میں عمل میں آئی۔ اس کا دوسرا نام "قطعاتِ تنگ و تاز" ہے جس سے ۱۴۱۲ ہجری سنہ برآمد ہوتا ہے۔ ۱۲۱ [illegible] مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلیم صاحب کو تاریخ گوئی سے بڑی دلچسپی ہے۔ انھوں نے مختلف تقاریب مسرت و غم پر [illegible]

کمی ہیں۔ تاہم ایک اچھی تاریخ کہنے کے لیے جس نکتہ سنجی اور نکتہ فہمی کی ضرورت ہے اس کا ان میں فقدان نظر آتا ہے۔ ان تمام تر توجہ مطلوبہ سنہ برآمد کرنے پر لگی رہتی ہے۔ اچھی تاریخ وہ ہے جو برجستہ ہو، با معنی ہو اور واقعے سے مناسبت رکھتی ہو۔ تاریخ گوئی کے لیے ریاضت کے علاوہ اچھے مطالعے، غور و فکر اور ذوق کی ضرورت ہے۔ کلیم صاحب کے بیشتر مادہ ہائے تاریخ بے معنی ہیں واقعات سے مناسبت نہیں رکھتے مثلاً

- تاریخ وفات حافظ محمد اسحاق:

پے سال ہجری مجھ کو ہوئی فکر کہنے کی ہم کو
تو بے ساختہ بولا ہاتف کہ برجستہ تاریخ کہہ دو

۱۳۱۵

"برجستہ تاریخ" کے حروفِ مجمہ سے تاریخ نکالی گئی ہے۔

- تاریخ وفات ممتاز احمد سہا: مسعود تاریخ وفات سہا مجددی
۲۰۰۵ بکرمی

- تاریخ وفات اہلیہ باسط اوجینی: بکرمی سمت میں ہے تاریخ منقوطِ کلیم
ہیں ثبوت زندگی، یہ زندگی کے حادثات ۲۰۱۶ بکرمی

- تاریخ وفات محمد ابراہیم خلیل: تاریخ عالی نسب ۱۳۲۴ محمدی — احسن التواریخ ۱۳۹۰ بنگلہ

- تاریخ وفات ناطق: آہ تاریخ انتقالِ ناطق ۲۰۱۳ بکرمی

- تاریخ شہادت بابری مسجد: فصیح تاریخ ۱۳۹۹ بنگلہ — درصنعت مہملہ یا غیر منقوط ۱۳۷۹

اگرچہ بابری مسجد کی شہادت کی تاریخ فصیح تاریخ اور یا غیر منقوط کے اعداد سے برآمد تو ہوتی ہے لیکن بے حد ناموزوں اور بے معنی ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کلیم صاحب کے مادہ ہائے تاریخ میں نہ کوئی ادبی حسن ہے نہ واقعات سے کوئی مناسبت۔ تاریخ نکالنے کے شوق میں انھوں نے نہ زبان کے حسن کا خیال رکھا ہے اور نہ موضوع کا۔
اس مجموعے میں بہت کم تاریخیں ایسی ہیں جو برجستہ اور برمحل معلوم ہوتی ہیں۔

- تاریخ وفات حکیم ضیاالحسن : روح پرور آج آج رخصت ہوگیا
۱۹۵۸ء
- تاریخ وفات مخدوم : آہ مردِ نام ور مخدوم محی الدین
۱۳۹۰ ہجری
- تاریخ وفات فخرالدین علی احمد آہ عالی مرتبت صدرِ ہندوستان آہ
۲۰۳۳ سمت بکرمی
- تاریخ جوش ہائے ماہرِ فن شبیر حسن خاں جوش
۱۹۸۲ء

کلیم صاحب نے اردو و فارسی دونوں میں تاریخیں کہی ہیں ۔ عیسوی اور ہجری کے علاوہ سن نبوی ۔ محمدی ۔ سمت ۔ بنگلہ ۔ فصلی وغیرہ سنین سے بھی تاریخی مادے نکالے ہیں ۔

کتاب کے آخر میں کچھ تاریخی نام دیے گئے ہیں جن سے ۱۳۱۴ تا ۱۳۲۷ سنیں برآمد ہوتے ہیں اب تاریخی نام رکھنے کا رواج بہت کم ہوگیا ہے البتہ جو حضرات بچوں کے تاریخی نام رکھنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب سے استفادہ کرسکتے ہیں ۔ کتاب میں ڈکی تال گانوی ، ڈاکٹر عزیز اندوری اور ڈاکٹر شان فخری کے تاثرات شامل ہیں جن میں کلیم صاحب کی تاریخ گوئی کو سراہا گیا ہے ۔

● ۸/۱ ڈیمائی سائز ● صفحات : ۱۲۸ ● قیمت : چالیس روپے
● ملنے کا پتہ : کلیم سرونجی ۵/۳۳۱ وارڈ نمبر ۱ گاندھی نگر بھوپال ۳۶۲۰۳۶ ۔

○○○ ●●● ○○○

کتاب کا نام : مصباحِ تصوف مصنف : ڈاکٹر عقیل ہاشمی تبصرہ نگار : وہاب عندلیب

"مصباحِ تصوف" ڈاکٹر عقیل ہاشمی (ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی) کے مختلف سیناروں کے لیے تحریر کردہ مضامین کا مجموعہ ہے ۔ مصنف نے خانقاہی نظام شریعت اور تصوف ۔ سلاسلِ طریقت ۔ علم لدنی ۔ ترکِ دنیا ۔ پیام صوفیہ ۔ رواداری ، تصوف اور اصلاحِ معاشرہ جیسے موضوعات کا احاطہ کیا ہے ۔ حضرت سید شاہ محمد محمد لطیفی صاحب سجادہ نشین بارگاہِ بندہ نوازؒ نے اپنے پیش لفظ (یک تاثر) میں حیرت کا اظہار کیا ہے کہ بعض لوگ ہنوز تصوف کو غیر اسلامی فکرو کردار کا مظہر تصور کرتے ہیں ۔ حالاں کہ اس کی بنیاد قرآنِ حکیم اور سرچشمہ ۔ حدیث ہے ۔ محترم المقام نے اپنے اس ادعا کے ثبوت میں حضرت حمید الدین ناگوریؒ اور حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے اقوال بھی پیش کیے ہیں ۔

تصوف کے اشتقاق اور اس کی ماہیت کے بارے میں "کشف المحجوب" سے "مصباحِ تصوف" تک ہر کتاب میں کافی بحثیں اور وضاحتیں مل جائیں گی ۔ تمام صوفیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ تصوف اسلام سے علاحدہ کوئی نظام نہیں ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ تصوف کے علم صحیح اور عملِ صالح سے امامِ غزالیؒ اور امام ولی اللہؒ جیسے علمِ کلام کے علم بردار اور ابنِ سینا اور ابنِ طفیل جیسے فلسفی بھی متاثر ہوئے نیز حضرت امامِ شافعیؒ ، حضرت امام احمد حنبلؒ ، حضرت امام مالکؒ اور حضرت یحییٰ بن معینؒ نے بھی صوفیوں کی صحبت سے فیض پایا ۔ البتہ بعض علماءِ حق اصحابِ سلسلہ اور دانش ورانِ ملت نے رسمی و عجمی تصوف کے علاوہ جس تصوف کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنایا اس کا ماخذ اشراقیتِ سریت اور ویدانت ہے انھیں اس تصوف سے اختلاف نہیں جس کی بنیاد کتاب و سنت اور جس کا منتہیٰ رضائے حق ہے ۔

مصنف کے مطابق آج بھی دنیا کو تصوف کے اسی مصباح کی ضرورت ہے جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۴ سو سال قبل تزکیہ ، نفس و تربیتِ باطن کی شکل میں خیرِ امت کو سونپا تھا ۔ صاحبِ "مصباحِ تصوف" نے خانقاہ کو روحانی تربیت گاہ قرار دیتے ہوئے خانقاہوں کی موجودہ صورتِ حال کا جو حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے وہ خود احتسابی کا نادر نمونہ ہے ۔ فرماتے ہیں :

"اب تو خانقاہ ، محض ایک ایسی اصطلاح ہوگئی ہے جہاں عہدِ رفتہ کے قصوں اور کہانیوں میں بزرگی و عبادت اور واقعات کا اعادہ بہ طور تبرک و عقیدت کیا جاتا ہے " ۔ اس صورتِ حال کے باوجود مصنف کو یقین ہے کہ آج بھی خانقاہیں موثر اور کار گر ہوسکتی ہیں "مگر شرط یہ ہے کہ اہلِ خانقاہ ان اوصاف سے متصف ہوں جن کے وہ امین ہیں " ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے اسلامی تصوف کو علم و عمل کا امتزاج قرار دیا ہے ۔ ان کا یہ احساس ہے کہ "اسلامی تہذیب و تمدن کی آبیاری اور اصلاحِ معاشرہ کی جہتوں میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے بعد اگر کسی نے عمل کیا ہے تو وہ اولیاءِ عظام اور صوفیاءِ کرام ہی تھے ۔ اگر تاریخِ عالم سے ان بزرگانِ سلف کے حالات نکال دیے جائیں تو وہ محض سازشوں ، جنگوں ، فتوحات اور ملوکیت کی داستان سے زیادہ نہیں جو اسلام کا مقصود نہیں ہمارے بزرگانِ سلف اور اکابر صوفیہ نے جس راہِ سلوک کو اپنایا تھا مصنف اس کے احیا کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر چاہتے ہیں کہ اس کی ضیا پاشیوں سے اولاً خود اور بعدہ ، اپنے اہل و عیال ، متعلقین ، سماج ، قوم اور امن و سلامتی کی متلاشی دنیا بہرہ ور ہو "

صاحبِ "مصباحِ تصوف" نے واضح کیا ہے کہ اسلامی تصوف میں ترکِ دنیا یا ترکِ علائق کا کوئی تصور نہیں ہے ۔ دنیا اور خلائق سے علاحدگی ، گپھاؤں ، جنگلوں اور پہاڑوں میں چلہ کشی اور نفس کشی ، تصوف نہیں بلکہ رہبانیت ہے ۔ مصنف نے خدمتِ خلق اور حقوق العباد کے سلسلے میں صوفیہ کی خدمات کو ہماری تاریخ کا روشن باب قرار دیا ہے خانقاہی ربط و نسبت کے باوصف ، مصنف نے اہلِ خانقاہ کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنے ورثہ پر تکیہ کرنے اور اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنے کے بجائے جدوعمل کے ذریعے راہِ سلوک کو زندہ و تابندہ کریں ۔

● ۱/۸ ڈیمائی سائز ● صفحات : ۱۱۲ ● قیمت : پچاس روپے ● ملنے کا پتہ : حسامی بک ڈپو مچھلی کمان ، حیدرآباد ۔

نام کتاب : قصائد جذب شاعر : جذب گوپال پوری تبصرہ نگار : ڈاکٹر رفعت النساء بیگم

کہا جاتا ہے کہ یہ قصائد نگاری کا دور نہیں ہے ۔ اب وہ بادشاہ بھی کہاں رہے کہ جن کے لیے قصیدے لکھے جائیں لیکن ۔ ہے کہ قصیدے صرف بادشاہوں ہی کے لکھے نہیں گئے ۔ حمدیہ ، نعتیہ اور منقبتیہ قصائد پہلے بھی لکھے گئے ہیں اور آج بھی تے ہیں ۔ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے وہ پرشکوہ زبان ، شوکتِ الفاظ ، ہمہ لی ہوئی تشبیہات ، بلند آہنگی اور مرصع ۔ مسجع اسلوب خال خال ہی سی مگر آج بھی ہے ، قصیدہ نگاروں کے ہاں تو یہ رنگ اور کھل جاتا ہے ۔ ۔ ۔ اس دور میں ۔ زیادہ نہ سہی لیکن بعض ایسے ہیں کہ جن کو پڑھتے ہوئے نظر ٹھہر جاتی ہے ۔ ایسے ہی ایک قصیدہ نگار سید عباس علی جذب ی ہیں ۔

جذب گوپال پوری کو قصیدہ نگاری میں غیر معمولی ملکہ حاصل تھا لیکن اپنے مزاج کی شہرت گریزی کی وجہ سے وہ گوشہ ۔ سے باہر نہیں نکل سکے ۔ انھیں وہ مقام نہیں مل سکا جس کا وہ استحقاق رکھتے تھے ۔ جذب گوپال پوری کے قصائد کو ڈاکٹر ن عباس نے " قصائدِ جذب " کے عنوان سے شائع کیا ہے ۔ (۲۰) بیس قصائد پر مشتمل یہ مجموعہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ۔ میں سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ الزہرا حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت امام حسن کی شان میں تحریر کردہ یہ قصیدے ادبی اور فنی اعتبارات سے اعلیٰ معیارات پر پورے اترتے ہیں ۔ وہی کروفر ، آن بان ، لال ، روانی سلاست اور دل کشی ۔ ۔ ۔ اور جہاں تک احترام و عقیدت کا تعلق ہے اس کا پوچھنا ہی کیا ہے ۔ جذب نے تبار شخصیات کے عشق میں خود کو جذب کردیا ہے ، جذبات کا ایک سیلاب ہے کہ امڈا چلا آتا ہے پڑھیے اور ان شخصیات ن سے اپنی محبت و عقیدت کا تازہ و تابندہ کیجیے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں تحریر کردہ قصیدے کے چند اشعار ۔ ہیں :

حاکمِ اربابِ دین ، مخدومِ جبریلِ امیں — بامِ سدرہ کا مکیں ، عرش آستاں ، گردوں رکاب
صاحبِ لولاک منزل ، والیِ طٰہٰ مقام — بندہ ، اسریٰ مناقب ، خواجہ ، صلوا خطاب
لب کشائے سوسمار و نطق بخشِ لعل و سنگ — فرش پا ساز سپہ و چتر گردانِ سحاب
مہر اندازِ لبِ تحقیق و تفتیشِ جدید — درکشائے آسماں ، دونیم سازِ ماہتاب
چرخِ رفعت کا مکیں ، آیا ہے بالائے زمیں — ہے جلو میں نورِ عین ، خیلِ ملائک ہم رکاب
ہے دو عالم کے لیے اعلانِ عام کسبِ نور — آمنہ کی گود میں اترا ہوا ہے آفتاب

ڈاکٹر سید حسن عباس نے " سطورِ اولین " کے تحت جہاں جذب کی حیات کا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے گوپال پور کی ا فضا کو بھی اختصار کے ساتھ اجاگر کرنے کی سعی کی ہے ۔ یہاں تفصیل سے کام لیا جاسکتا تھا ۔ فی زمانہ جب کہ قصیدہ نگاری پر توجہ ہے " قصائدِ جذب " کی قدر افزوں ہوجاتی ہے ۔

● ۱/۸ ڈیمائی سائز ● صفحات : ۱۱۲ ● قیمت : ۴۰ روپے

● ملنے کا پتہ : مرکزِ تحقیقات اردو فارسی گوپال پور ، باقر گنج ضلع سیواں (بہار)

ooo ●●● ooo

نام کتاب : پرچھائیوں کے درمیاں　　شاعرہ : اوشا بھدوریہ　　تبصرہ نگار : ڈاکٹر رفعت النساء بیگم

اردو میں شاعرات کی تعداد بھی کافی ہے لیکن ہے یہی کہ رسمی اور روایتی شاعری زیادہ ہے ۔ کئی ایک کے ہاں تو احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ خاتون ہیں یا حضرت ! لیکن اب کیفیت بدلتی جارہی ہے ۔ خاتون شاعروں کے ہاں ان کے اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی ملنے لگی ہے ۔ اشعار میں اس کے دکھ درد آئینہ ہونے لگے ہیں ، محرومیاں اور تشنگیاں بار پانے لگی ہیں ، لگتا ہے کوئی خاتون ہی شاعری کر رہی ہے ۔ پاکستان میں ایسی شاعرات کی کمی نہیں فہمیدہ ریاض ، کشور ناہید ، شبنم شکیل ، پرو شاکر ، ستارہ شگفتہ ، عذرا عباس اور روبینہ راجہ وغیرہ اور ہمارے ہندستان میں نسبتاً کم ہی سہی نام ضرور ملتے ہیں اور ادھر ایک نام ! آیا ہے ، اوشا بھدوریہ کا ، جن کا شعری مجموعہ ہے " پرچھائیوں کے درمیاں " ۔ ۔ ۔ اوشا بھدوریہ کی مادری زبان ہندی ہے اور ہندی جو بندیل کھنڈ میں بولی جاتی ہے ۔ شعرو ادب کی زبان تو انھوں نے کہیں بعد میں سیکھی اور اس دوران جو اردو شاعر بالخصوص غزل کو سننے کا موقع ملا تو حالت یہ ہوگئی کہ انھوں نے اردو سیکھنی اور غزل لکھنی شروع کردی ۔ اردو شاعری کا مطالعہ جاری رہا لیکن بڑی حد تک دیوناگری رسم الخط میں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں ہندی الفاظ کی کثرت ہے اور جو بوجھل ہندی الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہاں ثقالت کا احساس ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر ان کے ہاں ایک حلاوت پائی جاتی خالص اردو غزلوں میں تو یہ شیرینی اور حلاوت افزوں ہے ۔ دل کو چھولینے والی کیفیت کہ پڑھنے والوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی لیکن اس اثر آفرینی کا سبب وہ درد و غم ہے جو انھوں نے سہا ہے ۔ وہ کڑے کوس ہیں جن کو وہ طے کر آئی ہیں " پرچھائیوں کے درمیاں " کے دیباچے " دہلیز " میں انھوں نے اپنی زندگی کے روز و شب پر ایمائی انداز میں جو روشنی ڈالی ہے اس کے مطالعے اندازہ ہوگا ۔ ان کے پاس ایک پیاس ہے ، ادھورے پن کا احساس ہے ایک خلش ، ایک کسک ، جو ظاہر ہی کو نہیں باطن بھی بے چین کیے رہتی ہے اور جب وہ الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہے تو غزل کے لیے اشعار کا روپ دھار لیتی ہے :

میں کہ اک سنگِ بے ہنر ٹھہری　　کر گیا کون بے صدا مجھ کو

کتنا محکم ہے یہ دستور مری دنیا کا — پھول مہکیں تو ہر اک شاخ جلادی جائے
ہے ایک پل کی جدائی عذاب صدیوں کا — یہ فاصلوں کا اندھیرا سہا نہیں جاتا
میں ہوں سوکھی ہوئی گمنام ندی کا آنچل — مجھ پہ برسا نہ کسی ابر کا ٹکڑا کوئی
میری سانسوں نے بھی خوش بو کا بدن مانگا تھا — ہاتھ کو چھوتے رنگوں کے سوا کچھ نہ ملا

اوشا بھدوریہ کے یہاں نسائی جذبات کا اظہار نہایت عمدگی سے ملتا ہے ۔ انھوں نے ان جذبات کو نہایت خوبی اور عمدگی سے پیش کیا ہے ۔ ان کی ہر غزل میں ایسے دوچار اشعار ضرور مل جائیں گے جہاں عورت بولتی ملتی ہے " پرچھائیوں کے درمیاں " ری نہیں اوشا بھدوریہ کی کتابِ دل بن جاتی ہے ۔ جذبات کا لستے سیدھے سادے ، رواں دواں اور ایسے بھرپور طریقے سے اظہار تصویریں سامنے آجاتی ہیں ۔ دھیمے دھیمے لہجے میں کہیں کہیں صدائے احتجاج بھی ملتی ہے ۔

میں نے سوچا تھا اس سے نہیں ملوں گی — لمحے صدیاں بنا گیا میں روک نہ پائی
آج جب تیری خوش بو مخاطب ہوئی — میری مرجھائی سانسوں کو راحت ملی
چاہے تو سمجھے نہ سمجھے میرے دل کا حال — تیری خاطر روز سنورنا اچھا لگتا ہے
بیٹھی ہوں گم سم سی اپنے کمرے میں — تو آئے تو نقشِ رفاقت پیش کروں
تیرا نام لبوں پر آیا — دل نے سمجھا تو گھر آیا
میں تمھاری زباں ، میں تمھاری غزل — تم مجھے گنگنانے کا وعدہ کرو

" پرچھائیوں کے درمیاں " غزلوں کے عام مجموعوں سے جداگانہ ہے ۔ نسائی جذبات و احساسات کی ترجمانی کے سبب یہ اور حیثیت رکھتا ہے ۔ اس کا مطالعہ اردو غزل کے ایک اچھے اسلوب سے روشناس کرائے گا ۔

● ۱/۸ ڈیمائی سائز ● صفحات : (۱۲۸) ● قیمت : (۶۰) ساٹھ روپے

● ملنے کا پتہ : ۳۰ ۔ ۲۹ ، این تھری ، ہوسٹل نمبر ۲ ، بی ۔ ایچ ۔ ای ۔ ال ، پپلانی ، بھوپال ۔

ooo ●●● ooo ●●● ooo ●●● ooo ●●● ooo ●●●

رپورٹ

نوآبادیاتی فکر کے منفی اثرات : اردو زبان اور ادبی نظریات پر

(سہ روزہ سیمینار)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت فروغ انسانی وسائل ، شعبہ ، تعلیم (حکومتِ ہند) کے زیرِ اہتمام تین روزہ سیمینار ۱۷ تا ۱۹ نومبر ۱۹۹۷ء ، نئی دہلی میں منعقد ہوا ۔ سیمینار کا عنوان تھا :

" نوآبادیاتی فکر کے منفی اثرات : اردو زبان اور ادبی نظریات پر "

یہ سیمینار اردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر مقالہ خوانی کے پانچ اجلاس اور اردو کے فروغ کے جامع منصوبے پر کے دو اجلاس پر مشتمل تھا جن میں ملک کے نامور ادیبوں ، دانش وروں ، تخلیق کاروں اور صحافیوں نے شرکت کی ۔

سیمینار کا افتتاح فرماتے ہوئے صدرِ جلسہ عزت مآب ایس ۔ آر ۔ بومئی وزیرِ فروغِ انسانی وسائل حکومتِ ہند (چیئرمین قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان) نے فرمایا کہ ان کی حکومت اردو کی ترقی و بقا کے لیے ہمیشہ کوشاں رہی ہے اور اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی ضرورت پر زور دیتی رہی ہے جس کی ایک اہم کڑی حیدرآباد میں قائم ہونے والی مولانا آزاد قومی اوپن یونیورسٹی ہے ۔ افتتاحی اجلاس کے مہمانِ خصوصی معروف شاعر و ادیب جناب علی سردار جعفری نے اردو زبان و ادب کی تہذیبی سنگم کی حیثیت مدلل گفتگو کے دوران صدرِ جلسہ عزت مآب ایس ۔ آر ۔ بومئی اور نائب صدر قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان اور معروف اردو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ ملک کے جن صوبوں میں ہندی بولی جاتی ہے ان میں اردو کی تعلیم کو ا قرار دینے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں ۔

افتتاحی جلسے کے آغاز میں ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے سامعین اور مہمانوں کو نوآبادیاتی فکر کی ماہیت اور اردو کے بیش قیمت تہذیبی و ثقافتی ، سرمائے کے حوالے سے سمینار کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا ۔

سیمینار کے مرکزی موضوع کا احاطہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کیا گیا تھا ۔

۱ ۔ ہندستان کا متنوع لسانی پس منظر اور اردو زبان

۲ ۔ اردو ادبیات میں ہندستانیت کی شناخت

۳ ۔ ہندستانی کلاسیکی روایات کی بازیافت

۴ ۔ مشترکہ تہذیب اور قومی زبان کا مسئلہ

۵ ۔ عہدِ حاضر میں مشرقی علوم کی معنویت

پہلا اجلاس پروفیسر طاہر محمود ، چیئرمین اقلیتی کمیشن کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ جس میں " ہندستان کے متنوع لسانی پس منظر اور اردو " کے عنوان پر جناب منظورالامین ، ڈاکٹر ایس ۔ جمال محمد ، ڈاکٹر انور پاشا اور جناب ابوالفیض سحر نے اپنے مقالے پیش کیے ۔ مقالہ نگاروں نے تہذیبی ، علمی اور لسانی سطح پر اردو ہم آہنگی کے عناصر کا جائزہ لیا اور موجودہ ملکی سیاست کی روشنی میں اس زبان کو درپیش مسائل پر بھی روشنی ڈالی ۔ صدر محترم پروفیسر طاہر محمود نے اس جانب اشارہ کیا کہ اگر چہ ملک کے آئین میں ہندی کو یونین کی سرکاری زبان بنایا گیا ہے اس کو قومی زبان کی حیثیت سے فروغ دیا گیا ۔ اس نکتے پر بعض وضاحتیں جناب نریندر لوتھر اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب کی طرف سے پیش کی گئیں ۔ دورانِ گفتگو نوآبادیات پر اصرار کی بھی وضاحت کی گئی کہ ادبی نظریات اور زبان کے متعلق رویوں پر نوآبادیات کے منفی پہلوؤں کو سمجھ کر ہندوستانیت کی قدر کو مضبوط کیا جائے ۔ پہلے اجلاس میں پروفیسر این ۔ ایس گوریکر اور جناب منظورالامین نے مبصر کے فرائض انجام دیے ۔

دوسرا اجلاس اردو ادبیات میں ہندوستانیت کی شناخت کے عنوان پر مشہور افسانہ نگار اور فلم نویس جناب کملیشور کی صدارت میں منعقد ہوا اور اس کے مبصرین تھے جناب جمنا داس اختر اور ڈاکٹر خلیق انجم ۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ، محترمہ جیلانی بانو ، پروفیسر سیدہ جعفر ، پروفیسر امیر عارفی ، پروفیسر محمد زماں آزردہ ، جناب این ۔ اے ۔ راہی اور پروفیسر انصار اللہ شامل تھے ۔ جملہ مقالہ نگاروں نے ادب کی تمام اصناف خواہ شاعری ہو یا فکشن یا قدیم داستانیں یا مختلف زبانوں سے اردو میں کیے گئے تراجم سب کو اپنی تحقیق و جستجو کا موضوع بنایا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستانیت کی تلاش صوفیوں کے ملفوظات سے لے کر دکنی مثنویں مراۃ العروس سے لے کر میرے بھی صنم خانے اور فائر ایریا تک عاشورنامے سے لے کر مرثیہ انیس و دبیر اور ان کے بعد کے شعرا تک کہیں بھی بے سود نہیں رہے گی اور یہ ہرچند کہ ان اصناف کو دیگر زبانوں سے اخذ کیا گیا ہے لیکن ان کا قالب ہندوستانی ہی ہے ۔

مقالہ نگاروں نے محسوس کیا کہ ایک زبان جس کا ادب ہندوستانیت میں پوری طرح رنگا ہوا ہے اس کا سیاسی استحصال اس ملک میں ہو رہا ہے اور اس کے خلاف باقاعدہ محاذ کھول دیا گیا ہے ۔ ایک حد تک اس کی ذمہ داری پوری نظامِ تعلیم پر ہے ۔

دوسرے اجلاس میں پیش کردہ مقالوں پر تبصرے کے دوران جناب جمنا داس اختر نے محترمہ جیلانی بانو کے اس احساس کے جواب میں کہ اجلاس کا موضوع کٹہرے میں کھڑے ملزم کا تاثر دیتا ہے یہ کہا کہ اردو والوں کو ملزم گردانتے والے خود ہی شرم سار ہوں گے ۔ اس کی وجہ جناب اختر نے یہ بیان کی کہ اردو نے دنیا کو جو کچھ دیا ہے اور دیتی رہے گی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے ۔

موصوف نے مزید کہا کہ اگر اردو کھچڑی زبان ہے تو یہ اس کا منفی پہلو نہیں ہے کیوں کہ انگریزی جس کا آج بول بالا ہے اس سے کہیں زیادہ کھچڑی ہے ۔ اردو اور ہندوستانیت کی ہم آہنگی کی ایک ٹھوس مثال اختسر صاحب نے علامہ اقبال کے ویدانتی فلسفے ، بھرت منی کے افکار اور اقبال کی سوامی رام تیرتھ سے گہری قربت و عقیدت سے پیش کی ۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے محترمہ جیلانی بانو کے تاثرات کے حوالے سے یہ خیال ظاہر کیا کہ مسلمانوں نے جن سے اردو کو وابستہ کیا جاتا رہا ہے سرسید کے زمانے سے ہی خود کو عدالت کے کٹہرے میں پایا ہے جب سرسید نے اردو ڈیفنس سوسائٹی قائم کی تھی ۔ انھوں نے کہا کہ جہاں تک بار بار اٹھنے والی اس آواز کا تعلق ہے کہ اردو والے اور خصوصاً مسلمان قومی دھارے میں شامل ہوں تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ اردو والے پہلے سے ہی قومی دھارے میں شامل ہیں ۔

جناب کملیشور نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ اردو ہندی کا بٹوارا اس وقت ہوا جب ہم غلام تھے اس پر ستم یہ کہ ایک اور بٹوارے نے ہندستان کی مشترکہ تہذیب کو زبردست صدمہ پہنچایا ۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ اردو مخالف رویہ کچھ اس طرح کا ہے کہ لوگ کام اردو میں کرتے ہیں نام ہندی کا ہوتا ہے ۔ اور اس رویے میں سیاست سے زیادہ تجارتی مقصد پوشیدہ ہوتا ہے ۔ انھوں نے اس مضحکہ خیز صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا کہ غلط انگریزی اور صحیح اردو سے فلمی دنیا کی زبان پیدا ہوئی ہے ۔ صدرِ جلسہ نے ایک اہم نکتہ کی طرف بھی توجہ دلائی کہ ہندی کو ہند توا کی طرف لے جانے کی کوششوں نے خود ہندی کو بھی نقصان پہنچایا ہے اور پہنچائیں گے ۔

" ہندستانی کلاسیکی روایات کی بازیافت " کے عنوان سے منعقد تیسرے اجلاس کی صدارت جناب علی سردار جعفری صاحب نے کی اور مبصرین میں پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر مغنی تبسم تھے ۔

محترمہ قرۃ العین حیدر نے ان خیالات کا اظہار کیا کہ اردو بول کر اس کو ہندی کا نام دینے کا رویہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک زبان کو یرغمال بنایا جارہا ہے اور اس ذہنیت کا اظہار ایک حلقے کے دعوے سے بھی ہورہا ہے کہ پریم چند ہندی کے ادیب تھے ۔ انھوں نے اس پر اظہارِ افسوس کیا کہ ہندی میں الفاظ کے صحیح تلفظ کی اہلیت پیدا کرنے پر اصرار ختم ہوگیا ہے اور اس طرح اردو کے الفاظ کو دانستہ مسخ کیا جارہا ہے ۔ انھوں نے اردو کتابوں اور میگزینوں کی اشاعت کی حالتِ زار کا بھی ذکر کیا اور کسی حد تک خود اردو والوں کو بھی اس کا ذمے دار قرار دیا ۔

جناب مجاور حسین نے اردو ادب میں ہندستانی کلچر پر اپنے مقالے میں کہا کہ بعض روایات اتنی تابندہ ہیں کہ ان کی باز آوری کی ضرورت پیش نہیں آئے گی ۔ دیگر شرکا میں جناب فضیل جعفری ، پروفیسر جعفر رضا ، پروفیسر حامدی کاشمیری اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی شامل تھے ۔ جعفری صاحب نے فنونِ لطیفہ ہندستانی فن کاروں کے کمالات کے حوالے سے تہذیبی ہم آہنگی کے آثار کی نشان دہی کی جب کہ مؤخرالذکر تین مقالہ نگاروں نے نو آبادیاتی فکر کے اثرات کے خصوصی حوالے سے گفتگو کی ۔ پروفیسر حامدی

کاشمیری نے کہا کہ شرکا نے خود اپنی تخلیقات میں ایسی نکات پیدا کیے ہیں جس کی روشنی میں ہمارے یہاں ایک نظام کی بنا ڈالی جاسکتی تھی ۔ پروفیسر ابو الکلام قاسمی نے اپنے مقالے میں اس جانب توجہ دلائی کہ مشترکہ کلچر سے رشتہ ٹوٹنا کب شروع ہوا اس کے لیے ۱۸۵۷ء کے زمانے کی تبدیلیوں کا احاطہ کرنا ضروری ہے ۔ ان کا خیال تھا کہ اردو کے ادبی اور علمی سرمائے کے سلسلے میں مغربی فکر کی دین سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ مگر انیسویں صدی کے اواخر میں برطانوی حکمرانوں نے اردو کے Discourse کو اپنے منصوبے کے مطابق تبدیل کرنے کی منظم کوشش کی ۔ اس ضمن میں قاسمی صاحب نے سرسید ، محمد حسین آزاد ، الطاف حسین حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کی ان کوششوں کا تجزیہ کیا جس کے نتیجے میں ہماری کلاسیکی روایت اور شعری سرمایہ بے وقعت ثابت کیا گیا ۔ اخیر میں مضمون نگار نے کہا کہ تہذیب و ثقافت کے حوالے سے ادبی قدروں کی نئے سرے سے بازیافت کی ضرورت ہے ۔

اس اجلاس میں اپنے تبصرے میں پروفیسر شمیم حنفی نے فرمایا کہ اردو کے خلاف رویوں میں بعض سنجیدہ فکر حضرات بھی شامل ہیں ، یہ افسوس کی بات ہے نیز یہ کہ اردو ہندی تفریق کی ذمہ داری صرف انگریزوں پر ڈالتے ہوئے تاریخ کے معروضی مطالعے کی روشنی میں اس تفریق کے لیے اپنی سرزمین کی زرخیزی کو بھولنا نہیں چاہیے اور یہ بھی قابلِ غور ہے کہ نوآبادیاتی فکر کے اثرات منفی بھی رہے ہیں اور مثبت بھی اور ہمارے جن شرکا نے نوآبادیاتی فکر کو آگے بڑھایا ان پر ایک پریشان فکری اور غیر فیصلہ کن کیفیت غالب تھی اور اس سے نکلنے کے لیے انھوں نے بعض راستے اختیار کیے تھے ۔

علی سردار جعفری نے محمد حسین آزاد اور حالی کے رویوں کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا کہ وہ دونوں اگر مخصوص طرز کی شاعری نہ کرتے تو شاید اقبال پیدا نہ ہوتے ۔

چوتھے اجلاس کا عنوان تھا " مشترکہ تہذیب اور قومی زبان کا مسئلہ " جس کی صدارت معروف صحافی جناب کلدیپ نیر نے کی اور مبصرین میں پروفیسر عبدالستار دلوی اور جناب نریندر لوتھر تھے ۔ اس میں جناب کشمیری لال ذاکر ، پروفیسر عبدالحق ، پروفیسر نصیر احمد خاں اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے مقالے پیش کیے ۔ جناب کشمیری لال ذاکر مذہبی صحائف سے لے کر دورِ جدید کی ادبی اور علمی کاوشوں کے مطالعے کی روشنی میں یہ خیال ظاہر کیا کہ ویدوں ، گرنتھ ، قرآن ان سب کے ارتقائی عمل میں جو مراحل آئے ان میں یک جہتی اور مشترکہ تہذیب کا تصور کارفرما رہا ہے ۔ ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقی اور فکری بصیرت کے حوالے سے مجروح ہوتی ہوئی انسانیت سے دردمندی اور دنیا کی بقا کے مسئلے سے ان کے سروکار کو انھوں نے اسی یک جہتی اور مشترکہ تہذیب کے جذبے سے مربوط کیا ۔

پروفیسر عبدالحق نے اردو ہندی کی مشترکہ صحافت کو اپنے مقالے کا موضوع بناتے ہوئے اور اس کو تاریخ سے جوڑتے ہوئے کہا کہ کوسی ، تاراچند اور ٹائن بی سبھی متفق ہیں کہ عہدِ وسطیٰ کے ہندستان میں دلی سے لاہور تک ایک ایسی تہذیب بن چکی تھی جو وسطِ ایشیا کی تہذیب کا نقشِ ثانی کہی جاسکتی ہے ۔ مزید یہ کہ مولانا آزاد کی مذہبی فکر اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ان سے پہلے برِ صغیر کے کسی عالم نے وحدتِ ادیان کا تصور سورہ ، انبیا کی تفسیر میں پیش نہیں کیا تھا ۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے مقالوں

پر تبصرہ کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ کثیر لسانی معاشرے میں قومی زبان کا مسئلہ زیادہ ابھر کر حصولِ آزادی کے بعد سامنے آیا ہے جب ملک کی تقسیم کی بنا پر زبانوں کی تقسیم ایک مسئلہ بن گئی ۔ موصوف نے یہ بھی کہا کہ تعلیمی اور قومی وحدت کے لیے ایک قومی زبان کا ہونا ضروری ہے ۔ ہندستان جیسے ملک میں علاقائی زبانوں کو بھی سرکاری سرپرستی میں ترقی کا موقع ملنا چاہیے ۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ہندستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد بھی اگرچہ اردو زندگی کی سطح پر ہر طرح فعال تھی لیکن اسے کم تر حیثیت کا حامل قرار دیا گیا ۔ ایسے کئی ممالک ہیں جہاں دو زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے ۔ اسی طرح ہماری دو سرکاری زبانیں بھی بن سکتی ہیں ۔

جناب نریندر لوتھر نے اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو غلط یا صحیح طور پر ایک فرقے سے وابستہ کردیا گیا ہے جس کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیے ۔ لوتھر صاحب نے اردو کے فروغ کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اس کی مطبوعات کی بہتر مارکیٹنگ کی ضرورت پر زور دیا ۔

اردو کے فروغ کے جامع منصوبے پر بحث کے لیے دونوں اجلاسوں میں تمام مقالہ نگاروں کے علاوہ معروف دانشوروں اور صحافیوں نے بھی شرکت کی ۔ کافی گفت و شنید اور غور و فکر کے بعد بعض تجاویز منظور ہوئیں اور یہ طے پایا کہ ان تجاویز کو اردو کی ترقی کے لیے ایک جامع منصوبہ کی شکل میں وزیر فروغ انسانی وسائل عزت مآب ایس ۔ آر ۔ بومئی اور عالی جناب وزیر اعظم آئی ۔ کے ۔ گجرال کے سامنے پیش کیا جائے ۔ تجاویز حسبِ ذیل تھیں :

- جن علاقوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد دس فی صد ہو وہاں اردو کے ذریعے تعلیم کا انتظام کیا جائے ۔
- قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ایک مانیٹرنگ ایجنسی کی حیثیت دے کر اردو کے ذریعے تعلیم اور اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے انتظامات کی نگرانی سونپی جائے ۔
- اردو کے اساتذہ کی تربیت کے لیے مراکز کھولے جائیں ۔
- اردو سکھانے والے مراکز میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ جیسی سہولیات فراہم کی جائیں ۔
- جن مراکز میں خطاطی سکھانے کا کام ہورہا ہے ان کو آڈیو وژول ایڈز سے آراستہ کیا جائے ۔
- اردو میں بچوں کے ادب کی تخلیق اور اس کو عام کرنے کی مہم پر خاص توجہ دی جائے ۔
- حوالہ جاتی کتب اور دیگر ضروری معلومات کے سلسلے میں اردو کا ایک ڈیٹا بیس مرکز قائم کیا جائے اور اسے انٹرنیٹ سے جوڑا جائے ۔
- مدارس کے تعلیمی نظام کی بہتر کارکردگی کے لیے معقول مالی امداد کا انتظام کیا جائے ۔

○○ ○ ● ○ ○○

ادارے کی خبریں

مرکزِ خطاطی ادارہء ادبیاتِ اردو :

۲۲ / ستمبر ۱۹۹۷ء کو ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے مرکزِ خطاطی ادارہء ادبیاتِ اردو ۔ اس موقع پر پروفیسر جعفر نظام ، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ، محترمہ جیلانی بانو ، پروفیسر احمداللہ خاں ، پروفیسر سلیمان اطہر ہ فاطمہ عالم علی خاں ، ڈاکٹر محمد انورالدین ، جناب اسامہ فاروقی اور دیگر اصحاب موجود تھے ۔ مرکزِ خطاطی کے تفصیلی معائنہ ر حمیداللہ بھٹ نے ادارے کی دیگر سرگرمیوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ادارے کے مختلف پراجکٹس کے تبادلہء خیال کیا ۔

امتحانات ادارہء ادبیاتِ اردو :

ادارہء ادبیاتِ اردو کے امتحانات (۹ / اکتوبر ۱۹۹۷ء تا ۱۲ / اکتوبر ۱۹۹۷ء) حیدرآباد اور اضلاع کے مراکز پر ایک ہوئے ۔ ذکور کے لیے اردو ہال حمایت نگر اور اناث کے لیے احاطہ دفتر روزنامہ سیاست میں مراکز قائم کیے گئے تھے ۔ اناث شہری مراکز کا معائنہ پروفیسر جعفر نظام صاحب صدر ادارہء ادبیاتِ اردو ، پروفیسر مغنی تبسم معتمد عمومی ادارہ و ، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی اور پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اور معتمد شعبہء امتحانات پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ نے کیا ۔ نگر ، گوداوری کھانی ، ورنگل کے مراکز کا معائنہ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید اور ڈاکٹر رحمت یوسف زئی نے کیا ۔

حیدرآباد شہر کے علاوہ ادارے کے امتحانات اضلاعی مراکز ادیبر ، اونگور ، یوچم پاڈ ، نیکمال ، سنگاریڈی ، شمس آباد ، لریم نگر ، گدوال ، کرنول ، محبوب نگر ، منچریال ، کمتھل ، من ملی (بیدر) ، نرساپور ، نرمل ، نارائن پیٹ ، گلبرگہ ، گوداوری آباد ، نارائن کھیڑ ، ورنگل اور نلگنڈہ پر منعقد ہوئے ۔

اردو ماہر میں (۷۱۴) اور اردو عالم میں (۱۲۹۷) اور اردو فاضل میں (۵۵۶) امیدواروں نے شرکت کی ۔

دارے کا معائنہ

۱۶ / اکتوبر ۱۹۹۷ء کو لفٹنٹ جنرل (رٹائرڈ) جناب گربچن سنگھ مشیر انڈین نیشنل ٹرسٹ فار آرٹ اینڈ کلچرل ہیریٹیج نئی ادبیاتِ اردو تشریف لائے ان کے ساتھ جناب رام چندر پنٹوکر فوٹو جرنلسٹ بھی تھے ۔ ادارے کے معائنے کے بعد دونوں ہ حسبِ ذیل تاثرات کا اظہار کیا :

It is a great pleasure and honour to visit this treasure house of Hyderabad History with its rich collection of manuscripts, books and paintings. The enthusiastic readiness of the secretary and staff in locating specific materials pertaining to the period of influence in the state has greatly facilitated my own work on behlalf of INTACH, in that period.

Gurbir Mansingh
Lt. General (Retd)
Consultant Indian National Trust for
Art and Cultural Heritage.
New Delhi.

I am really happy to be here today. It gives me great pleasure indeed to find such a treasure-trove of valuable antiques in this institution. This institution is like a goldmine for students and to people interested in history of Hyderabad.

Many many thanks to Mr. Mughni Tabassum for all the help and assistance rendered.

Ramchander Pentuker
Photo Journalist

● ۲۹ / اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ڈاکٹر محمد الیاس قدوسی سپرنٹنڈنگ ایپیگرافسٹ اے ۔ ایس ۔ آئی ناگپور اپنے ادارے کے لیے ادار ادبیاتِ اردو میں محزونہ کتبوں کے چربے حاصل کرنے کے لیے ایوانِ اردو آئے ۔ اپنے کام کی تکمیل کے بعد انھوں نے ادار کے بارے میں اپنی مفصل رائے تحریر کی ۔

I have been fortunate enough to be here in this reputed institution IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU, possesed with rare manuscripts and books of rare nature. It is a invaluable Treasure to the world of scholars. The collection here is both vast and varied, dealing with multifarious aspects of history, Arabic, Persian and Urdu Literature. Worth applause is the Nishans etc., and photographs and paintings of veteran personalities who played vital political cum military role in the medieval times.

I shall be failing in my duty, if I donot mention the name of my respected and revered Prof. Mughni Tabassum who was kind enough to acquaint me with the acadamic and literary activities of the institution. I wish him splendid success in his betetan guidance to the dignified IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU.

Dr. M. Ilyas Quddusi
Suprintending Epigraphist
A. S. I.
Nagpure.

- اردو کے ممتاز شاعر اور فلموں کے گیت نویس جناب ندا فاضلی نے جو ایک ہندوپاک مشاعرے میں شرکت کے لیے حیدرآباد آئے تھے ، ادارہ ، ادبیاتِ اردو تشریف لائے ۔ ادارے کے تمام شعبوں کا دل چسپی سے معائنہ کیا اور اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلم بند کیے :

ادارہ ، ادبیاتِ اردو میں نئی پرانی کتابوں کا بڑا ذخیرہ دیکھ کر یقین ہوجاتا ہے کہ سیاسی مخالفتوں کے باوجود اردو کا مستقبل نہایت تابندہ ہے ۔ جو زبان اپنے ماضی کی وراثت کی حفاظت کرنا جانتی ہے وہ حال سے نبرد آزمائی کے فرض کو بھی پہچانتی ہے ۔

ندا فاضلی ۔ بمبئی

- اردو کے ممتاز افسانہ نگار جناب محافظ حیدر حیدرآباد سے تعلق رکھتے ہیں ۔ طویل عرصے سے بمبئی میں مقیم ہیں ۔ انھوں نے کئی فلموں اور ٹی ۔ وی سیریلس کے مکالمے کہانیاں اور اسکرپٹ تحریر کیے ہیں ۔ عزیز و اقارب سے ملاقات کے لیے حیدرآباد آئے تو ڈاکٹر زور کی یاد انھیں ادارہ ، ادبیاتِ اردو کھینچ لائی ۔ انھوں نے ادارے کا معائنہ کرنے کے بعد اپنے تاثرات تحریر کیے :

ادارہ ، ادبیاتِ اردو میں نایاب کتب اور کتابت کے نمونوں کا ایک ذخیرہ دیکھا ۔ یہ ذخیرہ ایک خزانہ ہے جسے بڑی محنت اور کوشش سے باقی رکھا گیا ہے اور اسے باقی رہنا چاہیے ۔ ڈاکٹر زور کا صرف یہی ایک کارنامہ بھی اردو ادب کی تاریخ میں انھیں زندہ جاوید رکھنے کے لیے کافی ہے ۔

● شعبہ ۔ خواتین ، ادارہ ۔ ادبیاتِ اردو کا ادبی اجلاس ۲۹ / اکتوبر ۱۹۹۰ء ، ایوانِ اردو پنجہ گٹہ میں دن کے گیارہ بجے منعقد
اس اجلاس کی صدارت محترمہ رفیعہ منظور الامین نے کی ۔ اجلاس میں محترمہ زیب حیدر کا مضمون " خانم فرخ زاد ــــ شخصیت
شاعری " محترمہ سکینہ وسیم عباس کا افسانہ " روشنی کی پرتو میں " اور محترمہ سلطانہ شرف الدین صاحبہ کی شعری تخلیقات تبصرے
لیے پیش کی گئیں ۔ محترمہ فاطمہ عالم علی خان نے اجلاس کی کارروائی چلائی ۔

ابتداء میں ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید صاحبہ نے صدرِ اجلاس اور مہمانان کا تعارف کروایا اور کہا کہ بابعد آزادی خواتینِ دکن
اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے ۔ اور اردو ناول نگاری ، افسانہ نگاری ، غزل اور نظم گوئی ، تمثیل نگاری ، دیگر تمام اصنافِ سخن ؛
صرف طبع آزمائی کی بلکہ امتیازی مقام حاصل کیا ۔ محترمہ جیلانی بانو اور محترمہ رفیعہ منظور الامین ایسے ہی ناموں میں سے دو نام ؛
انھوں نے کہا کہ ان دونوں خواتین نے ادب کے ساتھ ساتھ میڈیا پر بھی خاص توجہ دی ۔

محترمہ زیب حیدر صاحبہ نے اپنے تحقیقی مضمون " خانم فرخ زاد ــــ شخصیت و شاعری " میں کہا کہ خانم فارسی کی ترقی
شاعرہ تھیں ۔ یہ طہران کے متوسط طبقے میں پیدا ہوئیں ۔ انھیں فارسی کے ساتھ فرانسیسی اور انگریزی شعریات پر خاص دسترس
تھی ۔ ان کی شاعری جذبات اور احساسات سے عبارت تھی ، غزل میں انسانی مسائل ، درد ناک احساسات کا اظہار ، ان کا
وصف رہا ۔ عشقیہ شاعری میں بھی ان کے لہجے میں متانت رہی ۔ محترمہ فرخ زاد نے صرف بتیس برس کی عمر پائی تھی ۔ مگر
قلیل مدت میں انھوں نے فارسی شعری ادب پر جو نشان چھوڑے وہ ان مٹ ہیں ۔ مضمون کے بعد سکینہ وسیم عباس نے افسا
روشنی کی پرتو میں " اور سلطانہ شرف الدین صاحبہ نے تین نظمیں تبصرے کے لیے پیش کیں ۔

تخلیقات پر تبصرے کا آغاز کرتے ہوئے بانو طاہرہ سعید صاحبہ نے کہا کہ وہ فرخ زاد کی شاعری کی شائق رہی ہیں ۔ ان ک
فارسی کے کسی بھی بڑے اور نام ور شاعر کے کلام سے کم نہیں ۔ انھوں نے کہا کہ اس جواں مرگ شاعرہ نے اپنی مختصر حیات میں
کا وہ طویل سفر طے کیا تھا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے ۔ جناب راشد آزر نے کہا کہ کسی بھی زبان کی شاعری کو اسی لب
میں پیش کرنا چاہیے ۔ فاضل مضمون نگار نے فارسی اشعار کو کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ سارا لطف جاتا رہا ۔ جناب منظور الامین صا
نے مضمون کی ستائش کی ۔ جناب دلشاد رضوی نے کہا کہ مضمون میں پیش کیے گئے اشعار کا اگر اردو ترجمہ بھی پیش کیا جاتا تو خوب
۔ بانوطاہرہ سعید صاحبہ نے افسانے کو متوسط طبقے کی ایک کامیاب کہانی قرار دیا ۔ جناب محمود حامد صاحب نے کہا کہ سکینہ وسیم ؛
صاحبہ کا فن ارتقا کی طرف گام زن ہے ۔ سلطانہ شرف الدین صاحبہ نے افسانے کی تعریف کی ۔ جناب منظور الامین ، جناب دلشاد رضو
بانو طاہرہ سعید صاحبہ نے سلطانہ شرف الدین صاحبہ کی شاعری کی ستائش کی اور انھیں ایک حساس نظم گو شاعرہ کہا ۔

رفیعہ منظور الامین صاحبہ نے ادارے کی سرگرمیوں اور شعبہ ۔ خواتین کی کارکردگی کی تعریف کی اور کہا کہ ایک دن شع
شعبہ اپنی پہلی سی استقامت اور پہلا سا وقار حاصل کرلے گا ۔ انھوں نے اجلاس میں پیش کی گئیں تخلیقات کی توصیف کی ۔ آخر

فاطمہ عالم علی خان صاحبہ نے شکریہ ادا کیا اور محفل کے اختتام کا اعلان کیا ۔

● شعبہ ، خواتین ، ادارہ ، ادبیاتِ اردو کا ماہانہ ادبی اجلاس ۳۰ / نومبر ۱۹۹۶ ، کو ایوانِ اردو ، پنجہ گٹہ میں پروفیسر حبیب ضیا ، سابق صدر شعبہ ، اردو ویمنس کالج منعقد ہوا ۔ اس اجلاس میں فریدہ زین کا افسانہ " سرائے کا نگہبان " ڈاکٹر اختر سلطانہ کا تحقیقی مضمون " غاروں کی تصویریں ــ ایک معمہ " اور ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کی شعری تخلیقات تبصرے کے لیے پیش کی گئیں ۔ اجلاس کی کارروائی قمر جمالی ، سکریٹری شعبہ نے چلائی ۔

آغاز میں فاطمہ عالم علی خان صاحبہ نے شعبے کی کارکردگی پر روشنی ڈالی ۔ اجلاس کا آغاز فریدہ زین کے افسانے " سرائے کا نگہبان " سے ہوا ۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب محمود حامد صاحب نے کہا کہ فریدہ زین کا یہ افسانہ خیال کا ایک متحرک اور خوش کن اظہار ہے ۔ ڈاکٹر اختر سلطانہ نے کہا کہ اس کا وحدتِ تاثر آخر وقت تک برقرار رہا ۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے کہا کہ غمِ دوراں دراصل تخیل کا سرچشمہ ہے ۔ جنھیں یہ دولت میسر ہے ان کی تخلیق میں جمالیاتی کیفیت وجدانی حد تک موجود ہوتی ہے ۔ فریدہ زین ایک درد مند دل رکھنے والی تخلیق کار ہے ۔ انھوں نے درد کو ایک آفاقی حیثیت عطا کی ہے ۔

ڈاکٹر اختر سلطانہ نے مضمون " غاروں کی تصویریں ــ ایک معمہ " میں اسپین کے ایک مقام لکاس میں التمیرا غاروں میں موجود صناعی کا ایک بھرپور جائزہ پیش کیا ۔ انھوں نے کہا کہ پندرہ ہزار سال پرانی صناعی کے یہ نمونے دسویں صدی قبل مسیح میں گلیشیرز کے پگھلنے سے ظہور میں آئے جنھیں ایک ہسپانوی ماہرِ آثارِ قدیمہ سوتیالا نے دریافت کیا ۔ التمیرہ کے ان غاروں میں سب سے زیادہ اور نمایاں اور متعدد تصاویر ارنا بھینسہ کی ہیں جو آج ناپید ہیں ۔ اس مضمون پر تبصرے کا آغاز کرتے ہوئے توفیق احمد صاحب نے کہا کہ اختر سلطانہ کا یہ مضمون بے حد معلوماتی ہے ۔ اس میں کئی باتیں خالص تحقیق سے متعلق ہیں ۔ باوجود اس کے کہ یہ ایک تحقیقی مضمون تھا محترمہ نے اس میں زبان کی شگفتگی برقرار رکھی ہے ۔ جناب دلشاد رضوی نے دونوں تخلیقات کی ستائش کی اور ڈاکٹر بانو طاہر سعید نے بھی انھیں سراہا ۔

اجلاس کے شعری حصے میں ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید صاحبہ نے (۸) ہائیکو ، ایک غزل ، چار نظمیں اور ایک سانیٹ پیش کیا ۔ ان کے ہائیکو ، بے حد پسند کیے گئے ۔ صدرِ محفل پروفیسر حبیب ضیا نے اجلاس میں پیش کی گئیں تمام تخلیقات کی ستائش کی اور شعبہ ، خواتین کی کارکردگی کو سراہا انھوں نے نوجوان نسل سے اپیل کی کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شعبے کے اجلاس میں شریک ہوں اور تخلیقات پر تبصرہ کریں ۔ آخر میں قمر جمالی کے شکریے پر محفل کا اختتام عمل میں آیا ۔

(ادارہ)

00●00

نتائج امتحانات " ادارہ ، ادبیاتِ اردو " حیدرآباد

منعقدہ اکتوبر ۱۹۹۷ء

اردو ماہر بہ لحاظ رول نمبر

درجہ اول ۲ تا ۶ ، ۱۰ ، ۱۵ ، ۱۸ تا ۲۳ ، ۲۵ ، ۲۷ تا ۳۳ ، ۳۶ تا ۴۰ ، ۴۳ ، ۴۵ تا ۵۰ ، ۵۲ ، ۵۵ ، ۶۶ ، ۸۰ ،
۸۲ ، ۸۳ ، ۸۵ ، ۹۳ تا ۹۷ ، ۱۰۱ ، ۱۰۳ ، ۱۱۵ ، ۱۱۸ ، ۱۲۵ ، ۱۲۷ ، ۱۳۰ تا ۱۳۲ ، ۱۳۶ ، ۱۳۸ ، ۱۴۰ ، ۱۴۱ ، ۱۴۳ تا ۱۴۷ ،
۱۵۲ ، ۱۶۳ ، ۱۶۶ ، ۱۷۶ ، ۱۷۷ ، ۱۸۷ ، ۱۸۸ ، ۲۰۶ ●

درجہ دوم ۱ ، ۷ تا ۹ ، ۱۲ تا ۱۴ ، ۱۷ ، ۲۶ ، ۳۵ ، ۴۱ ، ۴۲ ، ۴۳ ، ۵۱ ، ۵۳ ، ۵۶ تا ۶۲ ، ۶۳ ، ۶۸ تا ۷۹ ، ۸۱ ،
۸۳ ، ۸۶ تا ۹۰ ، ۹۸ تا ۱۰۰ ، ۱۰۳ ، ۱۰۵ ، ۱۰۷ تا ۱۱۲ ، ۱۱۹ ، ۱۲۱ ، ۱۲۳ ، ۱۳۵ ، ۱۳۹ ، ۱۵۱ ، ۱۵۲ ، ۱۵۳ ، ۱۶۳ ، ۱۷۱ ، ۱۷۳ ،
۱۸۲ تا ۱۸۴ ، ۱۸۶ ، ۱۸۹ ، ۱۹۷ ، ۱۹۹ ، ۲۰۵ ، ۲۰۶A ، ۲۰۷ تا ۲۱۱ ، ۲۰۷A تا ۲۱۲A ●

درجہ سوم ۱۶ ، ۵۴ ، ۶۴ ، ۱۰۶ ●

تکمیل ۹۱ ، ۹۲ ، ۱۲۸ ، ۱۵۰ ، ۱۹۷ ، ۲۱۲ تا ۲۱۵ ●

اردو عالم بہ لحاظ رول نمبر

درجہ اول ۶ ، ۸ ، ۱۳ ، ۱۹ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۴ ، ۲۸ ، ۳۱ ، ۳۶ ، ۸۶ ، ۱۰۷ ، ۱۱۰ ، ۱۱۶ ، ۱۲۰ ، ۱۲۳ ، ۱۳۶ ، ۱۳۷ ،
۱۵۳ ، ۱۵۸ ، ۱۹۷ ، ۳۶۱ ●

درجہ دوم ۱ تا ۵ ، ۷ ، ۹ ، ۱۵ تا ۱۷ ، ۲۰ ، ۲۳ تا ۲۵ ، ۲۷ ، ۲۹ ، ۳۰ ، ۳۲ تا ۳۵ ، ۳۷ ، ۳۸ ، ۴۲ ، ۴۳ تا ۴۹ ،
۵۱ ، ۵۳ تا ۵۶ ، ۶۲ تا ۶۶ ، ۶۸ تا ۸۳ ، ۸۵ ، ۸۷ ، ۸۸ ، ۹۰ تا ۹۲ ، ۹۳ تا ۹۶ ، ۹۸ تا ۱۰۳ ، ۱۰۵ ، ۱۰۸ ، ۱۰۹ ، ۱۱۱ تا
۱۱۳ ، ۱۱۵ ، ۱۱۷ تا ۱۱۹ ، ۱۲۱ ، ۱۲۲ ، ۱۲۳ تا ۱۳۵ ، ۱۳۷ تا ۱۴۳ ، ۱۴۶ ، ۱۴۸ تا ۱۵۳ ، ۱۵۵ تا ۱۵۷ ، ۱۵۹ ، ۱۵۹A ،
۱۶۰ تا ۱۶۳ ، ۱۶۵ ، ۱۶۶ ، ۱۶۸ تا ۱۷۱ ، ۱۷۵ تا ۱۸۰ ، ۱۸۲ ، ۱۸۵ تا ۲۱۶ ، ۲۲۰ تا ۲۲۳ ، ۲۲۶ تا ۲۲۹ ، ۲۳۸ ، ۲۴۰ ، ۲۴۲ ،
۲۴۳ تا ۲۴۷ ، ۲۵۱ ، ۲۵۲ ، ۲۵۹ ، ۲۶۳ ، ۲۶۶ تا ۲۷۰ ، ۲۷۲ ، ۲۸۳ ، ۲۸۵ تا ۲۸۷ ، ۲۸۹ ، ۲۹۳ تا ۲۹۵ ، ۲۹۸ ، ۳۰۳ تا

۳۰۵ ، ۳۰۸ ، ۳۱۱ ، ۳۲۱ ، ۳۲۲ ، ۳۲۳ ، ۳۲۶ ، ۳۳۳ ، ۳۳۸ ، ۳۳۹ ، ۳۵۶ تا ۳۵۸ ، ۳۶۰ ، ۳۶۱ ، ۳۶۵ تا ۳۷۳ ، ۳۷۸
۳۸۰ ، ۳۸۱ ●

درجہ سوم ۲۹ ، ۳۱ ، ۷۶ ، ۱۲۵ ، ۱۴۳ ، ۱۶۲ تا ۱۶۳ ، ۱۸۱ ، ۱۸۳ ، ۱۸۴ ، ۲۲۰ تا ۲۲۲ ، ۲۴۱ ، ۲۴۸ ، ۲۵۶ ، ۲۵۸
۲۶۰ تا ۲۶۳ ، ۲۶۵ ، ۲۸۳ ، ۲۹۶ ، ۲۹۹ ، ۳۰۹ ، ۳۲۸ ، ۳۲۹ ، ۳۳۶ ، ۳۵۹ ، ۳۶۳ ، ۳۶۴ ، ۳۷۷ ، ۳۷۹ ●

تکمیل ۱۰ ، ۱۸ ، ۵۸ تا ۶۰ ، ۱۰۹ ، ۲۱۶ ، ۲۷۳ ، ۲۷۴ ، ۳۳۱ تا ۳۳۵ ، ۳۳۸ ، ۳۵۱ ، ۳۵۲ ●

اردو فاضل بہ لحاظ رول نمبر

درجہ اول ۱۱ ، ۱۲ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۳۳ ، ۵۰ ، ۵۵ ، ۶۲ ، ۶۶ تا ۶۹ ، ۹۳ ، ۹۵ ، ۹۹ ، ۱۰۱ ، ۱۰۳ ، ۱۰۹ ، ۱۱۲ ، ۱۱۶ ، ۱۲۰ ،
۱۲۲ ، ۱۲۳ ، ۱۲۷ ، ۱۳۳ ، ۱۳۶ ، ۱۳۹ ، ۱۵۶ ، ۱۵۹ ، ۱۶۹ ، ۱۸۲ ، ۱۸۳ تا ۱۹۰ ، ۲۰۲ ، ۵۱۹ ●

درجہ دوم ۱ تا ۵ ، ۷ ، ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۸ ، ۲۰ ، ۲۲ تا ۲۳ ، ۲۶ ، ۲۸ تا ۳۵ ، ۳۸ ، ۴۳ ، ۴۵ تا ۴۹ ، ۵۱ ،
۵۳ ، ۵۶ تا ۶۱ ، ۶۳ تا ۶۵ ، ۷۰ تا ۷۳ ، ۷۵ ، ۷۶ ، ۷۸ تا ۸۳ ، ۸۸ ، ۹۰ تا ۹۲ ، ۹۳ ، ۹۶ تا ۱۰۰ ، ۱۰۲ ، ۱۰۵ ، ۱۰۷ تا ۱۱۱
۱۱۳ تا ۱۱۶ ، ۱۱۸ ، ۱۱۹ ، ۱۲۱ ، ۱۲۲ ، ۱۲۶ ، ۱۲۸ ، ۱۲۹ ، ۱۳۲ ، ۱۳۳ ، ۱۳۵ تا ۱۳۷ ، ۱۴۳ تا ۱۴۵ ، ۱۴۸ ، ۱۵۰ ، ۱۵۲ تا ۱۵۵
۱۵۶ تا ۱۶۵ ، ۱۶۶ ، ۱۶۸ ، ۱۷۰ تا ۱۷۲ ، ۱۷۴ ، ۱۷۸ ، ۱۸۰ ، ۱۸۱ ، ۱۸۳ ، ۱۹۳ تا ۱۹۹ ، ۲۰۲ تا ۲۰۸ ، ۲۱۲ ، ۲۱۳ ، ۲۱۵ تا ۲۱۹
۲۲۱ تا ۲۲۳ ، ۲۲۶ ، ۲۳۰ تا ۲۳۲ ، ۲۳۵ ، ۲۳۶ تا ۲۴۰ ، ۲۴۲ ، ۲۴۳ ، ۲۴۶ ، ۲۴۷ تا ۲۵۰ ، ۲۵۸ ، ۲۷۱ ، ۲۷۵ ، ۲۹۹
۳۰۳ ، ۳۰۶ ، ۳۰۷ ، ۳۱۳ ، ۳۱۵ ، ۳۲۰ ، ۳۲۱ ، ۳۲۷ ، ۳۲۹ تا ۳۳۱ ، ۳۳۲ ، ۳۳۳ ، ۳۳۸ ، ۳۴۰ ، ۳۴۶ تا ۳۴۸ ، ۳۵۲
۳۶۸ ، ۳۸۸ تا ۳۹۰ ، ۳۹۵ ، ۳۹۶ ، ۳۹۹ تا ۵۱۰ ، ۵۱۳ ، ۵۱۸ ، ۵۲۲ ، ۵۲۶ تا ۵۲۸ ، ۵۳۷ ، ۵۳۸ ، ۵۴۰ ، ۵۴۲ ●

درجہ سوم ۱۰۳ ، ۱۵۱ ، ۲۰۹ ، ۲۱۰ ، ۲۱۵ ، ۲۲۴ ، ۲۲۹ ، ۲۳۱ ، ۲۴۳ ، ۲۷۶ ، ۳۵۵ ، ۵۱۳ ، ۵۱۵ ، ۵۲۰ ، ۵۲۲
۵۳۹ ، ۵۴۳ ●

تکمیل ۸۵ ، ۸۶ ، ۱۲۵ ، ۱۹۱ ، ۱۹۲ ، ۲۲۸ ، ۲۴۹ ، ۲۶۳ ، ۳۸۰ ، ۳۸۶ ، ۳۹۳ ، ۴۱۹ ، ۴۲۰ تا ۴۲۲ ، ۵۲۹ تا ۵۳۱
۵۳۳ ، ۵۳۹ ، ۵۴۲ ، ۵۴۵ ، ۵۴۷ تا ۵۵۲ ، ۵۵۳ ، ۵۵۶ ، ۵۵۶۸ ، ۵۵۸ ، ۵۵۹ ، ۵۶۱ ، ۵۶۷ تا ۵۶۹ ، ۵۷۶ ، ۵۷۷ ●

کامیاب پارٹ فرسٹ ۸ تا ۱۰ ، ۲۷ ، ۱۳۲ ، ۲۴۰ تا ۲۴۲ ، ۲۴۳ ، ۲۴۴ ، ۲۴۶ ، ۲۴۹ تا ۲۷۹ ، ۲۸۱ تا ۲۸۵ ، ۲۹۲
۲۹۳ ، ۲۹۵ ، ۲۹۶ تا ۳۰۵ ، ۳۰۶ تا ۳۰۹ ، ۳۱۱ تا ۳۱۳ ، ۳۱۸ ، ۳۱۹ ، ۳۲۳ ، ۳۲۵ تا ۳۳۲ ، ۳۳۳ تا ۳۴۱ ، ۳۴۵
۳۴۹ ، ۳۵۱ ، ۳۵۳ ، ۳۵۵ ، ۳۵۸ تا ۳۶۰ ، ۳۶۲ تا ۳۶۴ ، ۳۶۶ تا ۳۷۰ ، ۳۷۲ تا ۳۷۳ ، ۳۷۷ تا ۳۷۹ ، ۳۸۱ تا ۳۸۳ ، ۳۸۸ ، ۳۸۹
۳۹۰ ، ۳۹۱ ●●●●●

سب رس کتاب گھر

فہرست کتب

مطبوعاتِ ادارہ، ادبیاتِ اردو ۔ حیدرآباد ۔

شاعری

صبر و شکر	تہنیت النسا بیگم	10=00
تنویرِ تخیل	الحق حیدرآبادی	20=00
دیوانِ داؤد اورنگ آبادی	مرتبہ : خالدہ بیگم	15=00
ما لا	عزیز احمد	15=00
ورق در ورق	سید مظفر الدین صاحب	25=00
انوار	علی اختر	20=00
سخن حیدر	مرتبہ : احمد پاشاہ قادری	15=00
سلسلہ در سلسلہ	مظفر الدین صاحب حیدرآبادی	8=00
آبگینہ ، شعر	بشیر النساء بیگم بشیر	30=00
آتشِ بے نام	صاحب حیدرآبادی	20=00
غالب و موہن	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	15=00
تسلیم و رضا	تہنیت النسا بیگم	10=00
ترجمانِ زندگی	سید علی منظور	20=00
گلستانِ حمد ، نعت ، منقبت	صاحب حیدرآبادی	25=00
نمودِ زندگی	سید علی منظور	20=00
سخن در سخن	صاحب حیدرآبادی	25=00
رمزِ سخن	محی الدین قادری زور	20=00
دیوانِ عشق	مرزا جمال اللہ عشق	25=00
انجمن در انجمن	صاحب حیدرآبادی	20=00
زبانِ شمع	صاحب حیدرآبادی	20=00
مہکتے ویرانے	بانو طاہرہ سعید	20=00
فیضِ سخن	شمس الدین فیض	
	/ مرتبہ : ڈاکٹر زور	25=00
سنگِ گوہرین	محمد جلال الدین اشک	15=00
کلام معظم بیجاپوری	مرتبہ : ابوالنصر محمد خالدی	20=00
۔ ارمغانِ جذب	راگھویندر راؤ	25=00

تاریخ

تاریخ گول کنڈہ (انگریزی)	عبدالمجید صدیقی	50=00
مسلمان شاہی خاندان	محمد عبدالرحمن خاں	40=00
قطب شاہی سلاطین (انگریزی)	ڈاکٹر زور	10=00
مل والوں کی سیر	مراد علی طالع	10=00

آصف سابع میر عثمان علی خان اور ان کا دور	طیبہ بیگم	125=00
مقدمہ ، تاریخ دکن	عبدالمجید صدیقی	20=00
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	میر حسن	25=00
محمد قلی قطب شاہ	ادارہ ، ادبیاتِ اردو	5=00
تذکرہ ، مخطوطات جلد اول (مرمہ ایڈیشن)	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	200=00
" " جلد دوم	" " "	30=00
" " جلد سوم	" " "	45=00
" " جلد ششم	اکبر الدین صدیقی ، / محمد علی اثر	45=00
تذکرہ ، نوادر ایوانِ اردو	ڈاکٹر زور	40=00
دارالعلوم کے سپوت	حافظ محمد مظہر	20=00
مرقع سخن (شعرائے عثمانیہ)	ادارہ ، ادبیاتِ اردو	40=00
سرگزشتِ حاتم	محی الدین قادری زور	20=00
جنوبی ہند میں رباعی گوئی	صاحب حیدرآبادی	45=00
رسائلِ طیبہ	سکینہ بیگم	45=00
دکنی ہندو اور اردو	نصیر الدین ہاشمی	30=00
سرگزشت ادارہ ، ادبیاتِ اردو	حمید الدین شاہد	35=00
تحفۃ الشعرا	مرزا افضل بیگ قاقشال	25=00
داستانِ ادبِ حیدرآباد	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	40=00

سوانح

جلال الدین اکبر	محمد نصیر الدین	5=00
سر سالار جنگ اعظم	فیض محمد	7=00
نواب عماد الملک	فیض محمد	7=00
سر سید احمد خاں	ظہیر الدین احمد	5=00
دادا بھائی نوروزجی	ظہیر الدین احمد	5=00
نظام الملک اول	مراد علی طالع	6=00
نواب سکندر جاہ ثالث	" "	6=00
نواب ناصر الدولہ رابع	" "	6=00
نواب افضل الدولہ پنجم	" "	6=00
نواب میر محبوب علی خاں سادس	" "	6=00
ملکہ حیات بخشی بیگم	نصیر الدین ہاشمی	10=00
سرگزشتِ غالب	سید محی الدین قادری زور	20=00
مرزا غالب	ڈاکٹر نتالیا پری گارینا / ترجمہ : اسامہ فاروقی	40=00

ڈرامے

ہیلینا	فضل الرحمان	15=00
وہمی	وزیر حسن دہلوی	15=00
تماشائے اہلِ ہنر	سید رشید الحسن	10=00
کاغذ کی ناؤ	محمد علی میکش	15=00
سانولی	اظہر افسر	20=00

افسانے اور ناولٹ

جم	سری کشن سنہا	12=00
۔ میں آگ	حامدی کاشمیری	20=00
ا اور رنگ محل	وزیر حسن دہلوی	15=00
نرگس	طیبہ بیگم	25=00
	عظیم النساء بیگم	15=00
ت کرو	زین العابدین	15=00

ادبِ اطفال

۔	شجاع احمد قاید	10=00
میں طالبِ علم تھا	شاہ غیاث	4=00
۔ اور عربستان	جہاں بانو نقوی	15=00
ابوالکلام آزاد	وقار خلیل	6=00
۔ اعظم	سیدہ مہدی جعفر	6=00

سائنس

۔ پھول	محمد سعید الدین	8=00
۔ کے کرشمے	میر حسن	8=00
۔ عجائبات	احمد حسن نقوی	8=00
پودے	محمد عبدالسلام	8=00
ز اور سرنگ	ادارہ ۔ ادبیاتِ اردو	6=00

تعلیم اور مکاتیب

تعلیم کا مسئلہ	رضی الدین صدیقی	15=00
علم خانہ داری	محمودہ صدیقی	15=00
معلم بالغان	سیدہ زاہدہ حسین	10=00
مکتوبات شاد عظیم آبادی	محی الدین قادری زور	20=00
خطوطِ عبدالحق	اکبرالدین صدیقی	40=00
مکتوباتِ سلاطینِ قطب شاہی	قاضی عبدالعلی طالقانی	35=00

متفرق

خطابیات	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	10=00
ہندستانی قومیت کا تمدنی پہلو	پروفیسر ایشور ناتھ ٹوپا	10=00
مخزنِ علوم و فنون	ادارہ ۔ ادبیاتِ اردو	25=00
دفتری معلومات	ظہیرالدین احمد	10=00
ٹھنڈی بجلیاں (مزاح)	بھارت چند کھنہ	15=00
حرفِ شیریں	قاضی غلام محمد	15=00
یارانِ شہر (خاکے)	طیب انصاری	20=00
تاریخِ سیاسیات (سیاسیات)	عبدالمجید صدیقی	25=00
سفر نامہ یورپ اور امریکہ (سفر نامہ)	لیاقت جنگ	30=00

●● ●●● ●●



جناب محافظ حمید ادارہ ، ادبیاتِ اردو میں

دائیں سے بائیں : جناب علی ظہیر ، جناب محافظ حمید ، پروفیسر مغنی تبسم اور جناب محمد ابراہیم ۔



شعبہ ، خواتین کا ادبی اجلاس (۳۰ نومبر ۱۹۹۰ ء)

دائیں سے بائیں : ڈاکٹر اختر سلطانہ ، فریدہ زین صاحبہ ، پروفیسر حبیب ضیا اور بانو طاہرہ سعید صاحبہ ۔



جناب ... قاضی ... میں

دائیں سے بائیں ڈاکٹر عالیہ خان ... محی الدین ، جناب ندا قاضی ،

پروفیسر مغنی تبسم اور جناب ذکی شاداب



پروفیسر عبدالستار دلوی ایوانِ اردو میں (۱۱ نومبر ۱۹۹۰ء)

دائیں سے بائیں : جناب محمد جعفر ، جناب حمایت اللہ ، جناب قاضی معین الدین صدیقی ،

پروفیسر عبدالستار دلوی ، پروفیسر مغنی تبسم ، ڈاکٹر عطاء اللہ خان اور جناب وقار خلیل

OCT, NOV & DEC, 1997

R.No. 10922/57
Regd. H/HD 134

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad - 500482 (A P)



داہنے سے بائیں: جناب محمد جعفر ۔ ڈاکٹر ایم الیاس قدوسی ۔ پروفیسر مغنی تبسم ۔
جناب نصـــ محی الدین ، جناب وقار خلیل اور جناب محمد ابراہیم



بائیں سے دائیں: لفٹیننٹ جنرل ز بیرمان سنگھ ، پروفیسر مغنی تبسم اور جناب رام چندر پینڈوکر